نقوش
سالنامہ

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

سالنامہ

جنوری ــــــ ۱۹۸۹ء
جلد (۲۲) ــــــ شمارہ (۱)

ایڈیٹر، ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال

سرورق : طالب خوندمیری ــــــ مینجر اعزازی (بی) فیاض احمد فیضی
کتابت : ــــــ محمد عبد الرؤف ؛ محمود سلیم ؛ مسعود انور
طباعت : ــــــ نیشنل فائن پرنٹنگ پریس۔ چار کمان حیدرآباد
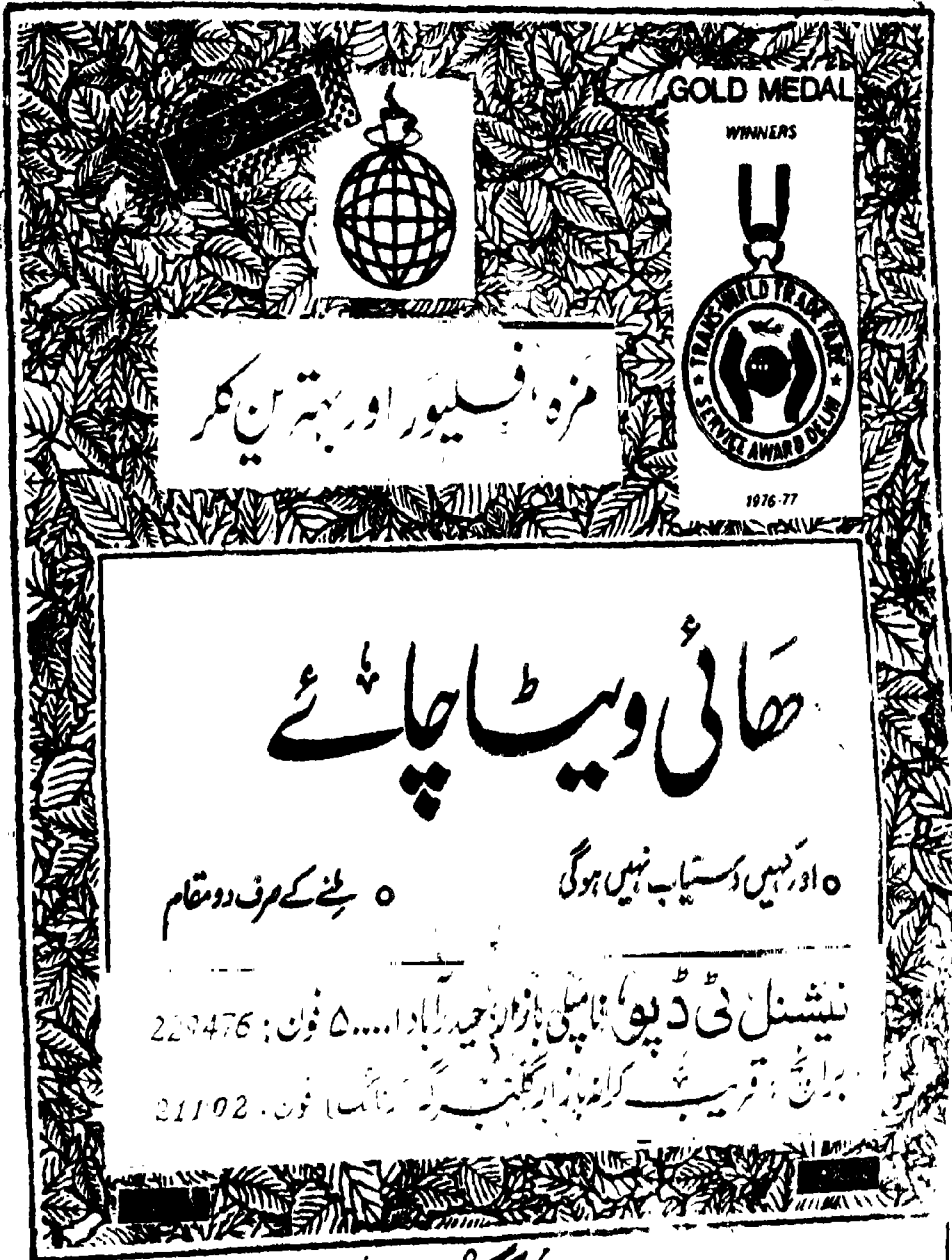
فی پرچہ : ۶/ روپے
زرِ سالانہ : ۵۰ روپے
عرب ممالک سے : ۱۵۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱ فون آفس : 6577
فون مکان : 521064

شگوفہ

کے بیس سال کی تکمیل پر شعری و نثری انتخاب بہت جلد شائع ہوگا۔!

مرتب: سید عبدالقدوس (ایڈوکیٹ)

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے

چورن (منظومات)

"سالِ نو"

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب
مکمل رپورٹ
} اَن پڑھ بھونگیری

گلبرگہ، بنگلور سے ۶۲۳ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے اور یہ ایک ریلوے ڈیویژن کا صدر مقام ہے۔ قلعۂ گلبرگہ میں پندرہ برج ہیں۔ فیروز شاہ نے عالیشان مسجد پرانے قلعہ میں ۱۳۸۷ء میں تعمیر کروائی یہ عالیشان مسجد، اسپین کی مسجد قرطبہ سے ملتی جلتی ہے۔ یہ ہندوستان کی واحد مسجد ہے جو مکمل طور پر مسقّف ہے۔

شہرۂ آفاق صوفی حضرت خواجہ سید محمد گیسو درازؒ (جو خواجہ بندہ نوازؒ کے لقب سے مشہور ہیں) اور جو خواجہ نصیر الدینؒ دہلوی کے مرید تھے ۱۴۱۳ء میں گلبرگہ تشریف لائے۔ بہمنی حکمران احمد شاہ (۱۴۲۲ تا ۱۴۳۶ء) نے حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کے نام ایک بڑی جاگیر وقف کردی اور آج بھی ان کا روضۂ شریف مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے فیوض و برکات کا مرکز ہے۔ روضہ کی دیواروں پر نفیس و اعلیٰ درجے کے نقش و نگار ہیں۔ اس کے وسیع احاطہ میں شہنشاہ اورنگ زیبؒ کی تعمیر کردہ ایک مسجد بھی موجود ہے۔

کرناٹک اسٹیٹ ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن KSTDC، ہوٹل میورا، بہمنی پبلک گارڈنس (ٹیلی فون نمبر 20644) میں سیّاحوں کے اطمینان بخش اور آرام دہ قیام کی سہولتیں فراہم کرتا ہے اور یہاں سنگل اور ڈبل بڈروم کی سہولتیں حاصل ہیں۔ نیز اجتماعی قیام کے لیے وسیع دالان بھی مہیا ہیں۔ گلبرگہ ہندوستان کے بڑے شہروں سے ریل اور بس کے ذریعہ مربوط ہے۔ مزید تفصیلات اور سفر کی سہولتوں کے لیے ربط پیدا کیجئے۔

کرناٹکا ٹورزم

نمبر ۹ اسٹیشن مارکس روڈ

ٹیلی فون: 19139

مجتبیٰ حسین

جی ہاں!
سوئیز بینک میں میرا کھاتہ موجود ہے

حضرات!
میں کسی مجبوری اور دباؤ
کے بغیر اور پورے ہوش و حواس
کے ساتھ یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ سوئیزرلینڈ
کے ایک بینک میں میرا کھاتہ موجود ہے۔ آپ اس بات کو
نہیں مانتے تو نہ مانیئے۔ میری بیوی بھی پہلے اس بات کو نہیں مانتی
تھی۔ اب نہ صرف اس بات کو مان رہی ہے بلکہ مجھے بھی ماننے لگی ہے۔ آپ
یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جب سارے لوگ اپنے کھاتوں کو پوشیدہ رکھنے کے
سو سو جتن کر رہے ہیں تو ایسے میں مجھے اپنے آپ ہی اپنے کھاتہ کی موجودگی کا اعلان کرنے کی
ضرورت کیوں پیش آرہی ہے۔ اس کے لیے میں بات کو ذرا شروع سے شروع کرنا چاہتا ہوں ـــــ تین مہینے
پہلے کی بات ہے ایک دن میں دفتر سے تھکا ماندہ گھر پہنچا تو بیوی نے کہا "آپ جو اتنا تھک جاتے ہیں تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ آپ دفتر میں کام بھی کرتے ہیں"ـــــ میں نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات
ہے۔ آدمی محنت کرنے سے ہی تو تھکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سیاستدان
اور مولوی کو تھکا ماندہ نہیں پایا"ـــــ بولی آدمی محنت کرتا ہے تو پھر اُسے
اس کا صلہ بھی ملتا ہوگا۔ تم جو اتنی محنت کرتے ہو تو تمہیں کیا مل رہا ہے؟
ظاہر ہے کہ اس مشکل سوال کا آسان جواب جب ملک کے
ماہرینِ معاشیات اور حکمرانوں کے پاس بھی نہیں
ہے تو میں کیا خاک جواب دیتا۔ سو میں
خاموش ہوگیا میں نے
سوچا کہ تیرہ

برسوں کی رفاقت میں میں نے اپنی بیوی کو روز کی خوشیاں اسی روز دینے کے سوائے اور کیا کیا ہے۔ اُس کی جھولی میں ایک ایک دن اور ایک ایک پل کے حساب سے جمع کیا ہوا تیس برس کا ماضی تو ہے لیکن آنے والے کل کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جسے عام زبان میں خوش آئند مستقبل کہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چلو آج اسے تھوڑا سا مستقبل بھی دے دیتے ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا "یہ تم کیا محنت اور اس کے صلہ کے پیچھے حیران ہو رہی ہو۔ آج میں تمہیں ایک خوشخبری سُنانا چاہتا ہوں۔ سوئیزرلینڈ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ موجود ہے۔"

یہ سُنتے ہی میری بیوی کا منہ حیرت سے کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔ بڑی دیر بعد جب وہ بند ہوا تو اُس نے اچانک گھر کے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیا۔

میں نے کہا "یہ کیا کر رہی ہو؟"

بولی "سوئیزرلینڈ کے بینک کے کھاتے کی بات کوئی یوں کھلم کھلا کرتا ہے، اگر بفرضِ محال سوئیزرلینڈ کے کسی بینک میں تمہارا کھاتہ ہے بھی تو تمہیں اس کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر مجھے اس کھاتے کا سراغ لگانا ہو تو میں کسی خفیہ ایجنسی کے ذریعہ اس کا پتہ لگا سکتی ہوں، یا پھر ایک دن ملک کے اخباروں میں تمہارے کھاتے کی نوٹو کاپی خود بخود چھپ جائے گی۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کیا سچ مچ سوئیزرلینڈ کے بینک میں تمہارا کھاتہ موجود ہے؟"

میں نے کہا "سچ بتاؤ آج تک میں نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے۔"

بولی "سو تو ہے۔ مگر یہ کھاتہ تم نے کھولا کب؟"

میں نے کہا "چار سال پہلے جب میں یورپ گیا تھا۔"

میرے اس جواب نے میری بیوی کو اور بھی حیرت میں ڈال دیا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ جب میں یورپ کے لیے روانہ ہوا تھا تو میری جیب میں صرف بیس ڈالر تھے۔ اگرچہ حکومت نے مجھے اجازت دی تھی کہ اگر میں بیرونی زرمبادلہ حاصل کرنا چاہوں تو پانچ سو ڈالر تک خرید سکتا ہوں لیکن بیرونی کرنسی خریدنے کے لیے پہلے مجھے ہندوستانی کرنسی کی ضرورت تھی۔ بیرونی کرنسی تو مجھے بہت مل رہی تھی لیکن اصل سوال ہندوستانی کرنسی کا تھا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کرنسی کو حاصل کرنا کتنا مشکل ترین کام ہے۔

اتنے میں میری بیوی دنیا کا نقشہ اُٹھا کر لے آئی اور بولی "ذرا دکھاؤ تو سہی۔ یہ نگوڑا سوئیزرلینڈ ہے کہاں اور اس میں ہمارا اکاؤنٹ کہاں رکھا ہوا ہے۔"

میں نے دنیا کے نقشہ میں اُسے سوئیزرلینڈ کو دکھانے کی کوشش شروع کر دی لیکن کمبخت سوئیزرلینڈ اتنا چھوٹا نکلا کہ اس پر جب جب اپنی انگلی رکھتا تھا تو پورے کا پورا سوئیزرلینڈ غائب ہو جاتا تھا۔ بالآخر پنسل کی نوک سے سوئیزرلینڈ کے حدود اربعہ اس پر واضح کیے تو بولی "یہ تو اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی بینک کی عمارت بھی شاید سما سکے۔ ہمارے بینک اکاؤنٹ کے سمانے کا نمبر تو بعد میں آئے گا۔"

میں نے کہا "تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے دوست کے ساتھ جب فرانس کے راستے سے بذریعہ موٹر سوئیزرلینڈ میں داخل ہوا تھا۔ اس ملک کا اتنا ذکر سُنا تھا سوچا تھا کہ ذرا ملک کے اندر پہنچ کر اس کا دیدار کر لیتے ہیں۔ میرا دوست بہت تیز موٹر چلاتا ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد سڑک پر کچھ سپاہیوں نے ہمیں روک لیا اور پوچھا

کہاں کا ارادہ ہے؟"

عرض کیا "ذرا سوئیزرلینڈ تک جانے کا ارادہ ہے"

سپاہیوں نے کہا "قبلہ! آپ جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں سے آپ واپس جارہے ہیں"

چاروناچار ہمیں پھر سوئیزرلینڈ میں واپس آنا پڑا اور موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑی کہ کہیں ہم تیز رفتاری میں کسی اور ملک میں نہ نکل جائیں"

بیوی نے کہا "مگر تم تو سوئیزرلینڈ سیر سپاٹے کے لیے گئے تھے۔ وہاں کے پہاڑ اور قدرتی مناظر دیکھنے گئے تھے۔ یہ اکاونٹ کھولنے والا معاملہ کب ظہور میں آیا؟"

میں نے کہا "بیگم کان کھول کر سن لو۔ یہ پہاڑ اور قدرتی مناظر سب بہانے ہیں۔ آج تک کوئی سوئیزرلینڈ صرف پہاڑ دیکھنے نہیں گیا۔ پہاڑ کی آڑ میں اور کچھ کرنے جاتا ہے۔ سوئیزرلینڈ کے پہاڑ اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ان کے دامن میں سوئیزرلینڈ کے وہ مشہور و معروف بینک ہیں جن میں اپنا پیسہ جمع کراؤ تو پیسہ جمع کرنے والے کی بیوی کو تک معلوم نہیں ہوتا کہ ان میں اس کے شوہر کا پیسہ جمع ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ بعض صورتوں میں تو خود بینک کے انتظامیہ کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے بینک میں کس کا کتنا پیسہ جمع ہے۔ ان بینکوں کو وہاں سے ہٹالو تو سوئیزرلینڈ کے قدرتی مناظر اور ان پہاڑوں کی ساری خوبصورتی دھری کی دھری رہ جائے گی۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نے پہلگام، گلمرگ اور پیر پنجال میں ہمالیہ کے پہاڑ دیکھے ہیں اُسے سوئیزرلینڈ کے پہاڑ کیا پسند آئیں گے۔ رہی برف کی بات تو اسے تو ہم ہر روز اپنے ریفریجریٹر میں دیکھتے ہی ہیں۔ اب بتاؤ سوئیزرلینڈ میں کیا رہ جاتا ہے۔ ہاں! کسی زمانے میں یہاں کی گھڑیاں بہت مشہور تھیں۔ اب جاپان نے ان کی بھی ایسی تیسی کردی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ گھڑی سازی کے معاملہ میں بھی ہر ملک کا ایک وقت ہوتا ہے۔ سوئیزرلینڈ کی گھڑی اب ٹل چکی۔ اب اُس کے بینکوں میں پیسہ جمع کرنے والوں پر گھڑی آئی ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ جو کوئی سوئیزرلینڈ جاتا ہے وہ وہاں اپنا پیسہ جمع کرانے جاتا ہے"

بیوی نے کہا "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سوئیزرلینڈ صرف اپنا کھاتہ کھلوانے گئے تھے"

میں نے کہا "اور کیا؟ پہاڑ دیکھنے تھوڑی گیا تھا"

بولی "جب کھاتہ کھلوانا ہی تھا تو ہندوستان کے کسی بینک میں رقم جمع کرا دیتے"

میں نے کہا "کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمارے بینکوں کی کیا حالت ہے۔ آئے دن تو ڈاکے پڑتے رہتے ہیں۔ لوگ بینکوں کے کھلنے کا اتنا انتظار نہیں کرتے جتنا کہ ڈاکو ان بینکوں کے بند ہونے کا انتظار کرتے ہیں"

اور یوں میں نے ایک خوش آئند مستقبل کے کچھ لمحے اپنی بیوی کو سونپ دیئے۔ اس بات کو ہوئے تین مہینے بیت گئے۔ نہ تو اُس نے مجھ سے اکاؤنٹ نمبر پوچھا، نہ اکاؤنٹ کا خفیہ نام پوچھا اور نہ ہی یہ پوچھا کہ اس اکاؤنٹ میں کتنی رقم جمع ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے وہ بہت خوش ہے۔ اُس کی زندگی میں ایک ایسا خوشگوار اعتماد پیدا ہوچکا ہے جس کی نظیر پچھلے تیس برسوں میں مجھے کبھی نظر نہ آئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس انکشاف کے بعد میں اپنے آپ میں اعتماد کی کمی محسوس کررہا ہوں۔

حضرات! یہ تو آپ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ بینکوں سے میرا کتنا تعلق ہو سکتا ہے۔ ایک محفل میں ایک مشہور و معروف ادیب سے ایک مشہور و معروف بینکر کا تعارف کرایا گیا تو بینکر نے ادیب سے کہا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے آج تک آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی"۔
اس پر ادیب نے کہا "مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک میں بھی کسی بینک میں داخل نہیں ہوا"۔

میں اتنا بڑا ادیب تو ہوں نہیں کہ کبھی کسی بینک میں قدم ہی نہ رکھ پاؤں۔ میں بینک ضرور جاتا ہوں۔ بینک میں میرا کھاتہ بھی موجود ہے۔ میری تنخواہ چونکہ چیک سے ملتی ہے اسی لیے بینک میں کھاتہ کھولنا ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میرا کھاتہ میرا اور میری بیوی کا "جائینٹ اکاؤنٹ" ہے۔ اس جائینٹ اکاؤنٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رقم جمع کرنے کی ذمہ داری تو میری ہوتی ہے مگر اس میں سے رقم نکالنے کا خوشگوار فریضہ میری بیوی کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اندرون ملک اپنی تو یہ مالی حالت ہے کہ کوئی آفت کا مارا مجھ سے بیس پچیس روپے بھی اُدھار مانگتا ہے تو میں اس کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں، اُسے رقم تو نہیں دیتا البتہ شکریہ اس بات کا ادا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اِس قابل تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے بیس پچیس روپے اُدھار مانگے جا سکیں۔

اس صورتِ حال کے باوجود سوئیزر لینڈ کے بینک میں میرا کھاتہ موجود ہے اور اس معاملہ کو آپ سب کے سامنے رکھنے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے میں عجیب و غریب کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں میں پوری رازداری اور ایمانداری کے ساتھ اپنے کھاتے کی اطلاع اپنی بیوی کو دی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ خاندان کے اس عظیم راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھے گی مگر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ راز کی روشنی دھیرے دھیرے ہمارے گھر کے اطراف پھیلنے لگی ہے۔ ایک مہینہ پہلے کی بات ہے میں محلّے کی ایک دکان سے موزے خریدنے گیا تھا۔ مجھے موزوں کی ایک جوڑی پسند تو آئی لیکن دکاندار نے اِس کی جو قیمت بتائی وہ ہندوستان میں میرے موجودہ بینک بیلنس کی بساط سے باہر تھی۔ میں دکان سے واپس جانے لگا تو دکاندار نے مجھے آنکھ مار کر کہا "صاحب! آپ یہ موزے لے لیجئے۔ بیس پچیس روپے کے فرق پر نہ جائیے۔ باقی پیسے بعد میں دیجئے جب سوئیزر لینڈ سے آپ کا پیسہ آجائے گا"۔ تھوڑی دیر کے لیے میں بھونچکا سا رہ گیا۔ لیکن پھر سوچا کہ ان دنوں چونکہ سوئیزر لینڈ کے بینکوں کا بہت چرچا ہے اس لیے دکاندار نے ازراہِ مذاق یہ بات کہی ہوگی۔ مگر رفتہ رفتہ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ محلہ کے وہ لوگ جو مجھ سے منہ چھپاتے تھے اب نہ صرف اپنا منہ دکھانے لگے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ سلام بھی کرنے لگے ہیں۔ پڑوسیوں کے بارے میں آپ تو جانتے ہیں کہ یہ صرف آپ کی خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں، اور اگر آپ کی زندگی میں دُکھ نہ ہوں تو انھیں پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ پڑوسی اب مجھے عجیب و غریب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میرے ایک پڑوسی کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں لیکن کپڑے کا کاروبار کرنے کا ڈھنگ کچھ ایسا ہے جیسے سارے ملک کو ننگا کر کے چھوڑ دیں گے۔ پیسے کی وہ ریل پیل ہے کہ نہ جانے اتنا پیسہ کہاں رکھتے ہیں۔ بیس برسوں کے پڑوسی ہیں لیکن ان سے تعلقات صرف پچھلے دو مہینوں میں ہی استوار ہوئے۔ اُن کی بیوی ان دنوں میری بیوی کی سب سے اچھی اور چہیتی سہیلی بنی ہوئی ہیں۔ دو تین مرتبہ مجھے بھی اپنے گھر بلا چکے ہیں۔

جب بھی بلاتی ہیں میرے ساتھ وہ سلوک کرتی ہیں جو اہلِ غرض بے ایمان وزیروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں
پچھلے ہفتہ میری بیوی نے بتایا کہ میرے پڑوسی کی بیوی اس سے یہ جاننا چاہتی ہے کہ سوئیزرلینڈ کے بینک میں کھاتہ کھولنے کا کیا طریقہ ہے۔

میں نے کہا "انھیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا کھاتہ سوئیزرلینڈ کے بینک میں موجود ہے"۔
بیوی نے کہا "تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو انھیں کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ سوئیزرلینڈ کے بینک میں تمہارا کھاتہ ہے۔ تم چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہو اس لیے تم سے کھاتہ کھولنے کا طریقہ جاننا چاہتے ہوں گے۔ بتانے میں کیا حرج ہے۔ آخر کو پڑوسی ہیں"۔

میں نے کہا "پڑوسی تو ہمیں برس سے ہیں لیکن پڑوسیوں کا سا سلوک صرف پچھلے دو مہینوں سے کیوں کر رہے ہیں؟"
میری بیوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر بھی میں نے کھاتہ کھولنے کا طریقہ انھیں بتادیا۔

یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ پرسوں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ میں صبح کے وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھا داڑھی بنا رہا تھا کہ ایک بھکاری میرے گھر پر آواز لگانے لگا۔ دوسرے بھکاری نے جو میرے پڑوسی کے گھر پر کھڑا تھا، میرے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے بھکاری سے کہا "میاں! اس گھر پر آواز لگا کر کیوں اپنا وقت اور گلا ضائع کرتے ہو۔ ان کا تو سارا پیسہ سوئیزرلینڈ میں ہے۔ پارلیمنٹ میں ان کے خلاف اتنی آوازیں اُٹھ رہی ہیں تو کچھ نہیں ہو رہا ہے، تمہارے آواز لگانے سے کیا ہوگا!"

پانی میرے سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو طلب کیا اور کہا تمہیں یاد ہوگا کہ تین مہینے پہلے میں نے تمہیں اس راز سے واقف کرایا تھا کہ سوئیزرلینڈ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ موجود ہے"۔
بیوی نے کہا "میں تو دن کے چوبیس گھنٹے اس بات کو یاد رکھتی ہوں۔ لیکن اب اچانک تمہیں اس اکاؤنٹ کی یاد کیوں آگئی؟ تم نے پہلی بار اپنے اکاؤنٹ کا اعتراف کیا تھا تو کیا وہ غلط تھا؟"

میں نے کہا "غلط تو نہیں تھا لیکن یہ اعتراف ادھورا ضرور تھا۔ میں نے تمہیں اپنے کھاتے کا نمبر کھاتے کا خفیہ نام اور کھاتے میں جمع رقم کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا"۔
بیوی نے کہا "میں خوب جانتی ہوں کہ تمہارے کھاتے کا نمبر پانچ ہزار پانچ سو چھپن ہے، کھاتے کا خفیہ نام گوبھی کا پھول ہے اور یہ کہ اس کھاتے میں سوئیزرلینڈ کے صرف دس فرانک جمع ہیں"۔
میں نے حیرت سے پوچھا "تمہیں کس نے بتایا؟"

بولی "سوئیزرلینڈ کے کھاتے ہمیشہ راز میں رکھے جاتے ہیں۔ اگر میں تم سے اس کھاتے کی تفصیلات پوچھتی تو یہ بداخلاقی کی بات تھی۔ یوں بھی ان کھاتوں کا سراغ لگانے کے لیے خفیہ ایجنسیوں کی خدمات حاصل کرنے کا رواج عام ہے۔ میں نے بھی ایک خفیہ ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں جس کا نام ہے "فیرسیکس ایجنسی" اب تو تم مطمئن ہو گئے"۔

میں نے کہا بات دراصل یہ تھی کہ سوئیزرلینڈ میں جب مجھے دیکھنے کو کچھ بھی نہیں ملا بلکہ وہاں رہنے کی جگہ بھی نہیں ملی تو میں نے واپس چلتے وقت اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ وہاں دس سوئیز فرانک پڑے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس رقم کو سوئیزرلینڈ کے کسی بینک میں جمع کرادوں۔ ہندوستان میں یہ سہولت ہے کہ کسی تاریخی مقام

کو دیکھنے جاتے ہیں تو اس مقام پر اپنا نام بھی لکھ کر آسکتے ہیں تاکہ اپنی نشانی اس جگہ باقی رہے۔"
سوئیزرلینڈ میں مجھے یہ سہولت میسّر نہیں آئی۔ لہٰذا میں نے یادگار کے طور پر اپنا اکاؤنٹ کھول دیا۔ سچ پوچھو تو دس فرانک کے اکاؤنٹ کی کوئی ہمت نہیں ہے اور تمہیں بھی اسے اہمیت نہیں دینا چاہیئے۔ بلکہ اب تو میں اس اکاؤنٹ کو بند کرنے کی سوچ رہا ہوں۔"

بیوی نے کہا "خبردار! جو تم نے اس اکاؤنٹ کو بند کرنے کا نام بھی لیا تو۔ آج سے اسے بھی مائنٹ اکاؤنٹ ہی سمجھو۔ جانتے نہیں ان دنوں سماج میں عزت اُس کی ہے جس کا سوئیزرلینڈ کے بینک میں اکاؤنٹ ہے۔ چار برس پہلے جب تم سوئیزرلینڈ گئے تھے تو ہندوستان میں سوئیزرلینڈ کے بینکوں کی مقبولیت کا یہ عالم نہیں تھا۔ تم نے تو جذباتی ہوکر غفلت میں اس اکاؤنٹ کو کھولا تھا۔ یوں بھی تم ہوشیاری اور ذہانت کے بل بوتے پر فائدہ کا کوئی کام کر ہی نہیں سکتے۔ فائدہ کا کام تم سے غفلت میں ہی سرزد ہوجاتا ہے۔ تم یقین کرو سوئیزرلینڈ کے بینک میں جمع کئے ہوئے تمہارے دس فرانک ہندوستان میں دس کروڑ کے برابر ہیں۔ دیکھتے نہیں سماج میں ہماری کتنی عزت ہورہی ہے۔ کتنی تو دعوتیں کھاچکے ہو۔ دکاندار تک اُدھار دینے لگے ہیں۔ جو لوگ برابری کے ساتھ ملتے تھے وہ جُھک جُھک کر ملنے لگے ہیں۔ اور جو جُھک جُھک کر ملتے تھے وہ زمین میں گڑے جارہے ہیں۔ اور تو اور محلّے کے لیڈیز کلب کے صدر کے طور پر آج میرا بلامقابلہ انتخاب ہورہا ہے۔ پہلے میں اردو کے ایک مُفلس ادیب کی بیوی تھی مگر اب ایک ایسی مایہ ناز ہستی کی بیوی ہوں جس کا اکاؤنٹ سوئیزرلینڈ کے بینک میں ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ابھی ازدواجی زندگی میں نے اب شروع کی ہے۔ یہ سب کس کی بدولت ہے۔ ذرا سوچو تو۔ ملک کے سارے شرفا اور معززین اب اپنے اکاؤنٹ سوئیزرلینڈ کے بینکوں میں کھولنے لگے ہیں اور تم اپنا کھاتہ بند کرنے چلے ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ۔۔ ایک اتفاقی غلطی کی وجہ سے تمہارا شمار بھی شُرفا میں ہونے لگا ہے ورنہ زندگی بھر ادبی جلسوں میں یونہی جوتیاں چٹخاتے اور جوتیاں چلواتے پھرتے۔"

یہ کہہ کر میری بیوی لیڈیز کلب کی صدر کے انتخاب میں حصّہ لینے کے لیے چلی گئی۔ اور میں دُنیا کے نقشہ میں پھر سے سوئیزرلینڈ کو تلاش کرنے لگا۔ سوئیزرلینڈ تو مل گیا لیکن وہ بینک نہیں ملا جس میں میرا اکاؤنٹ ہے۔ آپ بینک کی بات کرتے ہیں دُنیا کے نقشہ میں تو میں بھی اپنے آپ سے نہیں ملا۔

رضا نقوی واہی *

گٹھری واہیات کی

{ اردو کے قلمکاروں کے سامنے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اردو اکیڈمیوں اور دوسرے اداروں کی امداد سے اِن کی کتابیں چھپ تو جاتی ہیں، لیکن ان کتابوں کی نکاسی کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔ اس نظم میں اسی مسئلے کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ }

سرکار کی عنایت و بخشش سے جب بنی ۔۔۔ پٹنہ سے بمبئی تلک اُردو اکیڈمی
روزِ ازل سے قسمتِ شاعر جو بند تھی ۔۔۔ اک زوردار جھٹکے سے فی الفور کھل گئی
استاد و مبتدی و عطائی و تُک فروش ۔۔۔ اکثر کو بہرِ طبع و اشاعت رقم ملی
چالاک ان میں جو تھے رقم ہضم کر گئے ۔۔۔ اوروں نے جیسے تیسے کتاب اپنی چھاپ لی
پٹنہ سے بمبئی تلک آنے لگے نظر ۔۔۔ اک اک گلی میں صاحبِ دیواں کئی کئی!
اجراء کے جشن تک تو رہی خوب دھوم دھام ۔۔۔ مجموعہ جس کو مفت ملا اس نے داد دی
اجراء کے بعد آیا نکاسی کا مرحلہ ۔۔۔ ہر اک کتب فروش کی چھانی گئی گلی
لکھے گئے عزیز و اقارب کو بھی خطوط ۔۔۔ اخبار میں نکالا گیا اشتہار بھی
سعیِ بلیغ پر بھی نہ بر آئی آرزو ۔۔۔ دو ایک جلد بھی نہ کتابوں کی بِک سکی
بنیوں نے کی بچاروں کی تھوڑی مدد ضرور ۔۔۔ ردّی کے بھاؤ سے لیں کتابیں کبھی کبھی
ٹھونگا بنانے والے بھی کچھ لے گئے کلام ۔۔۔ شاعر کے خونِ دل کی کھپت یوں بھی کچھ ہوئی
گھر والیوں نے پھاڑ کے اوراق گاہ گاہ ۔۔۔ چولھے جلائے گرم کی سالن کی دیگچی
اولاد شاعروں کی تھی اُردو سے نابلد ۔۔۔ قدر ان کے دل میں ہوتی بھلا کیا کلام کی
گلدستۂ سخن سے بنائی گئی پتنگ ۔۔۔ چھوڑی گئی ڈرین میں کاغذ کی ناؤ بھی
ہوتا رہا یہ حشر نگاہوں کے سامنے ۔۔۔ ہمت نہ ہاری اہلِ سخن نے مگر کبھی
جیسے دہی فروش لیے سر پہ ٹوکرا ۔۔۔ بازار میں پکارتا پھرتا ہے۔ "لے دہی"
اب یوں ہی اپنے دوش پہ لادے ہوئے کتاب ۔۔۔ پھرتے ہیں صبح و شام سخنور گلی گلی

واہی بھی باوجودِ ضعیفی ہے ان کے ساتھ
گٹھری ہے اس کے کاندھوں پہ بھی واہیات کی

○

ڈاکٹر گیان چند جین
حیدرآباد

(بہ رنگِ شاد عارفی)
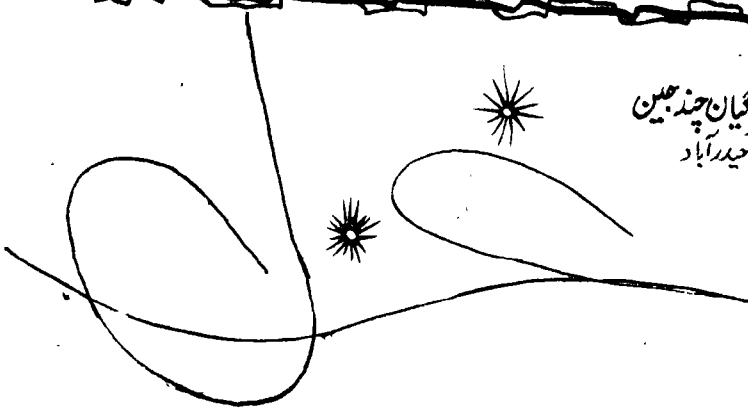
ساری دُنیا کی نظر میں جاہل مطلق ہے گو
ایک دانش گہ میں اُردو کا پروفیسر ہے وہ[1]

واہ یونیورسٹی کے ٹیچروں کا طمطراق
آؤ! زانوئے تلمذ تہہ کرو، جاہل بنو

آئے ·ن کرتا ہے اپنی چیلیوں کے ساتھ وصل
یہ کوئی پہنچا ہوا مردِ خدا ہے، ہو نہ ہو

تھے دِوانے عقد پر، اَب چکھ لیا اس کا مزہ!
کیوں تمہیں چپ لگ گئی! کچھ مُنہ سے پھوٹو عاشقو!

·ن کا چسکا ہو تو اِک ناری نکیتن کھول لو
زر جو چاہو، دیس کی سیوا کرو، لیڈر بنو

گر بڑے صاحب کے کمرے تک رسائی چاہیئے
پہلے چپراسی کے، پھر پی اے کے، تم چمچے بنو

خود کو گر تسلیم کروانا ہو اُردو کا زعیم
ایک بار امریکہ و برطانیہ کا حج کرو

گر نیا نقاد بننے کا تمہیں چرّائے شوق
کچھ عروض اور کچھ لسانیات کی باتیں کرو

گر سوئٹزرلینڈ میں کھاتا نہیں کھلوا سکے
ہو بڑے ٹٹ پونجیے تم سب، مخالف لیڈرو

دو وِدھایک[2] سینگ آپس میں پھنسا کر یوں لڑے
جنگ جو بکروں نے سوچا، ان کی شاگردی کرو

عمر بھر اُردو پڑھی لیکن میں بَنیا ہی رہا
نے کسی اَمرد کو چکھا، نے کباب و جام کو

[1] صوتی قافیہ
[2] مجلسِ قانون ساز کے رُکن

سارے جہاں کا درد اور ہمارا جگر

دلیپ سنگھ (نئی دہلی)

جب میری ملازمت سے
ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آگئی
تو مجھے فکر دامن گیر ہوئی کہ ریٹائرمنٹ
کے بعد کیا کروں گا کیسی زمانے میں جب کوئی
ریٹائر ہوتا تھا تو لوگ اسے کہا کرتے تھے کہ بھائی
بہتیرا کام کر لیا، اب عیش کر۔ لیکن آج کل نوکریاں کچھ
اس قسم کی ہو گئی ہیں کہ لوگ یوں کہنے لگے ہیں کہ بھائی بہت
عیش ہو چکا اب ریٹائر
ہو رہے ہو تو کوئی کام دھام
ضرور کرنا — مجھے ریٹائرمنٹ
کے بعد پیسہ کمانے کے لیے کام کرنے
کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ
آج کل سرکار نے پنشن خاصی معقول کر دی ہے اور دوسری
یہ کہ آدمی ریٹائرمنٹ تک پہنچتے پہنچتے اتنی بیماریوں کا شکار
ہو جاتا ہے کہ اسے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہی نہیں رہتی
دانت ہی نہیں ہوں گے تو چبائے گا کیا؟ اور معدہ ہی
کام نہیں کرے گا تو کھائے گا کیا؟
اس کے علاوہ میرے دونوں لڑکے برسر
روزگار تھے۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے
امید تھی کہ وہ میرے
بڑھاپے کا سہارا بنیں گے
بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب انھیں
میرے سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔
یہ الگ بات ہے کہ اپنے ذاتی اور اچھے
خاصے مکان ہوتے ہوئے بھی وہ میرے چھوٹے
سے مکان کی طرف اس طرح دیکھا کرتے تھے جیسے
آنکھوں ہی آنکھوں میں
کہہ رہے ہوں کہ اے بکرے
کی ماں تو کب تک خیر منائے گی۔
اقتصادی حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے
مجھے کام کی ضرورت نہیں تھی لیکن وقت
گزارنے کے لیے تو کوئی مصروفیت چاہیے تھی۔ دوستوں
نے مشورہ دیا کہ سوشل سروس کرو۔ وقت بھی گزر جائے
گا اور سوسائٹی کا بھلا بھی ہوگا۔ لیکن جب اس میدان کی
طرف غور سے دیکھا تو احساس ہوا کہ سوشل سروس اتنا
کار آمد شغل بن گیا ہے کہ سوشل
سروس لوگ کچھ اس طرح سے کرتے
ہیں کہ جب وہ ایک مندر بنانے کے لیے

چندہ اکٹھا کرتے ہیں تو اُن کے ذاتی مکان کی دوسری منزل مندر سے کئی مہینے پہلے اپنے آپ تیار ہوجاتی ہے۔ شاید سوشل سروس کرنے والوں کو بھگوان اس لیے پہلے نواز دیتا ہے کہ آخر وہ بیچارے کم از کم گھر سے تو اس ارادے سے ہی نکلے تھے کہ بھگوان کے لیے گھر تعمیر کریں گے۔

بہت سوچ وبچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ لوگوں کے دُکھ میں شامل ہونے سے بہتر کوئی کام نہیں ہے کیوں کہ دکھ بانٹنے سے کم ہوتا ہے۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ خوشی بھی بانٹنے سے دوبالا ہو جاتی ہے۔ لیکن جوانی میں میں نے یہ کام کرنے کی کوشش کی تھی اور نتیجہ اس کا میرے حق میں کچھ اچھا نہیں نکلا تھا۔ جوانی میں میں اور میرے چند عزیز دوستوں نے فیصلہ کیا تھا: کیوں نہ ہم لوگ بنی نوع انسانوں کی خوشی میں شامل ہوکر ان کی خوشی کو دوبالا کیا کریں۔ چنانچہ کوئی بارات جاری ہوتو ہم اس میں شامل ہوجایا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلتے تھے۔ ان کے بینڈ کی دھن پر بھنگڑا کرتے تھے اور اُن کے ساتھ لنچ کھانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ لیکن لوگ شاید آج کل خوشی بانٹنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے ایک شادی میں باقاعدہ ہم سے پوچھا گیا کہ ہم کس طرف سے ہیں۔ لڑکی کی طرف سے یا لڑکے کی طرف سے۔ ہمیں یہ سوال بڑا عجیب سا لگا۔ یہ کوئی لڑائی کا میدان تو تھا نہیں کہ کوئی ہم سے سوال کرے کہ ہم کس طرف ہیں؟ سکندر کی طرف یا پورس کی طرف؟ ہم تو دونوں طرف کے لوگوں کو خوشی بانٹ رہے تھے۔ (فلاسفی سے قطع نظر ہم اُس وقت بریانی کی طرف تھے) لیکن شادی والے گھروں کو ہمارا خوشی بانٹنا پسند نہ آیا۔ اور اُنھوں نے ہمیں دھکے مار کر پنڈال سے باہر کیا۔ اُن کا خیال تھا کہ ہم وہاں صرف مفت کی روٹیاں توڑنے آئے تھے۔ شاید یہ صحیح تھا لیکن یہ بھی صحیح تھا کہ کسی اور نے بھی وہاں روٹیاں توڑنے کے پیسے نہیں دے رکھے تھے، سوائے لڑکی کے باپ کے۔

اس واقعہ کو ذہن میں رکھ کر ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ لوگوں کے دُکھ میں شامل ہونا چاہیئے۔ وہاں تو کوئی یہ نہیں کہہ سکے گا کہ ہم وہاں مُفت کی روٹیاں توڑنے آئے ہیں۔

دلّی جیسے شہر میں یہ معلوم کرنا کہ کون دکھی ہے اور کون نہیں، ذرا سا مشکل کام ہے کیوں کہ جس چہرے کو بھی دیکھئے اس پر جلی حروف میں دکھ لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑے شہروں میں دُکھ بھی کئی طرح کے ہوتے ہیں۔ کوئی اس لیے دکھی ہے کہ اس کے پاس فون نہیں ہے۔ اور کوئی اس لیے دکھی ہے کہ اس کے پاس فون تو ہے پر اس پر کوئی نمبر نہیں ملتا۔ لیکن میں اس طرح کے معمولی دُکھوں میں شامل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا ارادہ ان دکھوں میں شامل ہونے کا تھا جنھیں واقعی دکھ کہا جاتا ہے۔ جیسے کسی کے بچھڑ جانے کا دکھ، کسی کے یتیم ہوجانے کا دُکھ۔ فون نہ ملنے کا دکھ میں کیسے بانٹ سکتا تھا جب کہ خود مجھے بھی کئی سالوں کی کوشش کے باوجود فون نہیں مل سکا تھا۔

دُکھی لوگوں کی تلاش میں میں نے اتوار کے اخبار میں موت کا ایک اشتہار دیکھا جو قریب آدھے صفحے پر پھیلا ہوا تھا۔ اشتہار سے پتہ چلتا تھا کہ مرنے والے نے اپنی زندگی میں بہت محنت کی تھی۔ نتیجے کے طور پر وہ تین فیکٹریوں اور دس فلیٹوں کا مالک بننے کے علاوہ چھ بچوں کا باپ بنا تھا۔ بچوں کے علاوہ پوتے پوتیوں کی تعداد بھی اچھی خاصی تھی۔ اشتہار سے عیاں تھا کہ اس کے وارثین بے حد دکھی تھے کہ وہ ایک رہنما سے محروم ہو گئے۔ اُن کے دُکھ کا سب سے بڑا ثبوت یہ اشتہار تھا کیوں کہ اس کی چھپائی پر کم از کم پانچ ہزار روپے ضرور خرچ ہوئے ہوں گے۔

میں نے سوچا اِن لوگوں کا دکھ بانٹنے ضرور جانا چاہیے۔ چنانچہ کریا کی تاریخ پر اُن کے گھر پہنچ گیا۔ لیکن دیکھ کر حیران ہوا کہ پورے گھر میں غم کا نام و نشان نہیں تھا۔ مختلف لوگوں سے بات چیت کرنے سے پتہ چلا کہ بزرگوار نے دولت تو بہت پیدا کی لیکن اِس دولت پر سانپ بن کر بیٹھا رہا۔ بچوں کو اوّل تو عیاشی کے لیے کچھ دیتا نہیں تھا! اور جب دیتا تھا تو بعد میں اُس کا حساب مانگتا تھا۔ اب آپ ہی فیصلہ کیجیے عیاشی کا کوئی حساب دے سکتا ہے بھلا؟ مزید چھان بین کرنے پر پتہ چلا کہ اخبار میں چھپا ہوا اشتہار رونے رُلانے کا نہیں تھا بلکہ شکرانے کا تھا۔ ورثاء اشتہار کے ذریعے اس دکھ کا اظہار نہیں کر رہے تھے کہ تین کمپنیاں اور دس ٹیلی فونوں کا مالک چلا گیا بلکہ اس بات کے لیے شکرگزار تھے کہ مرنے والا یہ کمپنیاں اور فون اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔

اگلے ہفتے میں نے اخبار میں 'برسی' کا ایک اشتہار دیکھا۔ ایک نوجوان کی تصویر کے نیچے لکھا تھا کہ آج اُن کی موت کو ایک سال ہو گیا ہے لیکن آج بھی ہم اسی طرح سوگوار ہیں جیسے ایک سال پہلے تھے۔ میں نے سوچا اس جوان کی برسی کے موقع پر جا کر اس کے رشتہ داروں کا غم بانٹنا چاہیے۔

پتے پر پہنچا تو گھر میں کوئی نہیں تھا سوائے ایک منشی کے۔ میں نے پوچھا "بھیا! گھر کے لوگ کہاں ہیں"، کہنے لگا "کشمیر گئے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا "لیکن آج تو اُن کے فلاں رشتہ دار کی برسی ہے، جو پچھلے سال جوانی میں وفات پا گئے تھے۔ انھوں نے خود اخبار میں اشتہار دیا ہے۔ آج تو وہ غم سے نڈھال ہوں گے، پہاڑ پہ کیسے چلے گئے؟"

منشی نے جواب دیا "حضور، پہلی بات تو یہ ہے کہ مرنے والا اسّی سال کی عمر میں فوت ہوا تھا، جوانی میں نہیں۔ آپ کو جو غلط فہمی ہوئی ہے وہ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر سے ہوئی ہے۔ وہ تصویر جوانی کی تھی۔ دوسری بات یہ کہ اخبار میں اشتہار اُن کے ورثاء نے خود نہیں دیا، ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کی معرفت دیا گیا ہے۔ اب رہ گئی یہ بات کہ وارثین پہاڑ پر کیوں گئے ہیں تو بھیّا رونے کے لیے یہ ضروری تو نہیں کہ آدمی سخت گرم آب و ہوا میں ہی رہ سکتا ہے۔ کشمیر میں ڈل لیک میں شکارے میں بیٹھ کر رونے میں کیا برائی ہے۔"

اس کی بات سن کر مجھے احساس ہوا کہ واقعی کوئی بُرائی نہیں۔ بلکہ اُسی شکارے میں بیٹھ کر میں اگر اُن کا دُکھ بانٹ سکتا تو کتنا اچھا ہوتا۔

میں نے منشی جی سے اتنی شکایت ضرور کی کہ انھیں مرنے والے کی جوانی کی تصویر شائع نہیں کروانی چاہیے تھی کہ اس سے خواہ مخواہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ منشی کہنے لگا "آخری عمر میں بزرگوار کو لقوہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُن کی تصویر بڑی بھیانک آتی تھی۔ ایسی تصویر چھپوا کر ورثاء شرمسار نہیں ہونا چاہتے تھے کہ وہ کسی ٹیڑھے میڑھے بزرگ کے رشتہ دار ہیں۔"

دو بار ناکام ہونے کے باوجود بھی میں ہمت نہیں ہارا۔ ایک دن میں نے اخبار میں ایک ایسے بزرگ کی موت کا اشتہار پڑھا جو ورثاء کی طرف سے نہیں، بلکہ اس بزرگ کی کمپنی کے ملازمین کی طرف سے دیا گیا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ مرنے والا ایک شفیق مالک تھا جس کے مرنے سے اُس کے ملازمین سوگوار ہیں۔

میں اُس بزرگ کی یاد میں منعقد کی گئی میٹنگ میں شامل ہونے کے لیے چل دیا۔ میٹنگ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ملازمین سوگوار تو ہیں لیکن بزرگ کی موت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ بزرگ کے نوجوان بیٹے نے زبردستی ملازمین کی تنخواہ سے پیسے کاٹ کر اخبار میں اِس میٹنگ کا اشتہار دیا تھا۔

اِس واقعہ کے بعد میں تھوڑا سا مایوس ہوگیا۔ مجھے لگا جیسے میں زندگی بھر کسی کا غم نہ بانٹ سکوں گا۔ جب سوگواروں کے پاس بانٹنے کو کچھ ہے ہی نہیں تو میں بانٹوں کیا؟

انہی دنوں میرے دفتر کے ایک ساتھی کی موت ہوگئی۔ سعید حیدرآباد کا رہنے والا تھا اور دلّی میں ملازمت کے لیے آیا ہوا تھا۔ وارثین کو اطلاع دی گئی لیکن ریلوے میں ہڑتال ہونے کی وجہ سے کوئی وقت پر پہنچ نہ پایا۔ مجبوراً ہم دفتر کے کچھ ساتھی اُسے دفنانے کے لیے نکل پڑے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ اُسے جامعہ ملیہ کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔

جنازہ پہلے مسجد میں لے جایا گیا تاکہ نماز جنازہ ادا کی جا سکے۔ اِتفاقاً اس دن جمعہ تھا۔ بے شمار لوگ جمعہ کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں موجود تھے۔ وہ سب سعید کے جنازے میں شامل ہو گئے۔ بہت سے لوگوں کو جنازے کے ساتھ دیکھ کر کسی کو خیال ہوا کہ کوئی بہت بڑا آدمی فوت ہوگیا ہے۔ چنانچہ اُس آدمی نے میرے قریب آ کر پوچھا "کون صاحب تھے۔ کسی بڑے عہدے پر تھے کیا؟"

میں نے جواب دیا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میری طرح معمولی ملازم پیشہ آدمی تھے"۔

"کیا دلّی کے کسی بڑے خاندان سے تعلق تھا اِن کا" اُنھوں نے پوچھا۔ میں نے کہا "دلّی کے تھے ہی نہیں۔ حیدرآباد کے تھے اور خاندان بھی معمولی تھا"۔

تب تک ہم قبرستان پہنچ چکے تھے۔ قبر کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر وہ کہنے لگا "قسمت والا تھا کہ دیارِ غیر میں موت ہوئی لیکن پھر بھی جنازہ میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے اور پھر قبرستان میں ایسی جگہ نصیب ہوئی کہ ایک طرف میجر جنرل نواز خاں لیٹے ہوئے ہیں اور ایک طرف پرنسپل برکت علی صاحب ہیں۔ اور ایک طرف جناب علی محمد سابق ممبر پارلیمنٹ"۔

مجھے اُس شخص کے غمزدہ چہرے کو دیکھ کر بہت ترس آیا۔ میں نے کہا "حضور اگر آپ چاہیں تو آپ اُس قبر میں لیٹ جائیں اور اِن بڑے آدمیوں کی صحبت کا لطف اُٹھائیں۔ میں اپنے دوست کو کہیں اور لے جاتا ہوں"۔

میں تو سمجھتا تھا کہ میں نے اس شخص کا غم بانٹنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے دوستوں کا خیال ہے کہ میرے جملے میں تضحیک کا پہلو نکلتا ہے۔

میں پریشان ہوں کہ کس طرح لوگوں کے غم میں شمولیت کروں۔ کس طرح اُن سے درد کا رشتہ قائم کروں۔ اِس سلسلے میں مجھے دوستوں کے مشوروں کی ضرورت ہے۔ ہے کوئی کرم فرما جو میری رہنمائی کرے؟"

مضطر مجاز
حیدرآباد

یہ کیا ضرور کہ سب ٹھیک ٹھیک شعر کہو
مشاعروں کے لیے کچھ رکیک شعر کہو

رسالے ریڈیو ٹی وی سبھی سے پینگ بڑھاؤ
ہر اک سے رکھ کے علیک و سلیک شعر کہو

ہمیشہ کرتے رہو فکر و فن کی ناک میں دم
ادب کو جب تلک آئے نہ چھینک شعر کہو

اگرچہ وقت تمھیں ڈسٹ بن[1] میں پھینکے گا
سمجھ کے خود کو مگر والمیک شعر کہو

علاج زہر کا ہوتا ہے زہر سے بھی کبھی
کہ شعر سے جو تمھیں آئے ہیک شعر کہو

لکھو کہانیاں LATIN میں تاکہ سمجھے نہ کوئی
اسی طرح بہ زبانِ گریک[2] شعر کہو

تمھارا شعر ہے یا کاسۂ گدائی ہے
ہر اک سے داد کی مانگو نہ بھیک شعر کہو

نہیں ہے شاعری نقلِ فراق و فیض و فراز
خود اپنی ذات میں ہو کر شریک شعر کہو

قدیم ہے نہ ترقی پسند ہے نہ جدید
ازل نہاد، ابدی، لاشریک شعر کہو

پلاٹ لو کہیں مضطر، مکان بنواؤ
کہا یہ کس نے کہ اے مردِ نیک شعر کہو

DUST-BIN ۱؎
GREEK ۲؎

غزلیں

ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

آیا ہے نیا سال، نیا سال مبارک
ہر شخص ہے بدحال، نیا سال مبارک

روٹی ہے نہ اب دال، نیا سال مبارک
کچھ بھی ہو بہرحال، نیا سال مبارک

جس ہاتھ میں گلدستہ تھا، اس ہاتھ میں دیکھو
بندوق کی ہے نال، نیا سال مبارک

بارش کے نہ ہونے سے بھی تھا قحط کا عالم
بارش سے بھی ہے کال، نیا سال مبارک

اچھا نہیں ہر سال یہی "دڈو کا پہاڑا"
اک "جوتشی" پہ فی الحال نیا سال مبارک

ہر ووٹ پہ اِک نوٹ کا پھر آگیا موسم
بچھتا ہے نیا جال، نیا سال مبارک

اُردو کے لیے کوئی ریاست ہے نہ مرکز
ہاں وعدے ہیں ہر سال، نیا سال مبارک

ہر چیز کی اِفراط کا دعویٰ سہی راہیؔ
ہر چیز کا ہے کال، نیا سال مبارک

اقبالؔ ہاشمی
(حیدرآباد)

ایک ہی راگ سُنانے کی ضرورت کیا ہے
بے سبب ہم کو ستانے کی ضرورت کیا ہے
جب کہ ہر روز ہی چلتا ہے سڑک پر جُوتا
پھر نیا سال منانے کی ضرورت کیا ہے
خود ہی آجاتا ہے چپ چاپ نیا سال تو پھر
اس قدر شور مچانے کی ضرورت کیا ہے
رات کے بارہ بجے کھول کے بوتل اپنی
چھینٹے اوروں پہ اُڑانے کی ضرورت کیا ہے
صبح دم بھی تو نئے سال سے مل سکتے ہیں
رات بھر نیند اُڑانے کی ضرورت کیا ہے
ہاشمیؔ پاؤں زمیں پر نہیں ٹکتے ہیں اگر
آسماں سر پہ اٹھانے کی ضرورت کیا ہے

○

ناچ تگنی کا نچاتی ہے نئے سال کے ساتھ
بھاؤ مہنگائی دکھاتی ہے نئے سال کے ساتھ
ڈسکو ناچو کہ بریک ڈانس تمہاری مرضی
"زندگی ساز اٹھاتی ہے، نئے سال کے ساتھ
پھیر کر سال گزشتہ سے نگاہیں اپنی
زندگی آنکھ لڑاتی ہے، نئے سال کے ساتھ
ایک لمحے کی خوشی اور سدا کا رونا
مفلسی ناچتی گاتی ہے نئے سال کے ساتھ
نوجوانوں کی تڑپ ہاشمیؔ دیکھو تو سہی
خاک سڑکوں کی اڑاتی ہے نئے سال کے ساتھ

مسیح انجم

شاعروں اور ادیبوں کی کالونی!

اِدھر گزشتہ
چند برسوں سے "پچھڑی جاتیوں"
کے ساتھ انصاف ہونے لگا ہے۔ ایک
دَور وہ بھی تھا جب ان کے ساتھ چشم پوشی کا
عمل روا سمجھا جاتا تھا لیکن اب یہ عالم ہے کہ ان کی ستر پوشی
فری میں کی جارہی
ہے۔ یہی نہیں ان کی
بازآبادکاری کے لیے "لو انکم گروپ"
[LOW INCOME GROUP] کے نام کی
کالونیاں بھی بنائی جارہی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اب ہمارے
نیتا "ویلفر اسٹیٹ"
کا مطلب کچھ کچھ سمجھنے لگے
ہیں (اس 'کچھ کچھ' سے آپ یہ نہ سمجھیں
کہ دال میں کچھ کچھ کالا ہے!) جب بات اِنکم
[INCOME] کی چل نکلی ہے تو یہ بتا دینا بھی مناسب
ہے کہ آج کل
انسانوں کو آمدنی کے لحاظ
سے مختلف گروپ میں تقسیم کیا جارہا
ہے، اور خارج قسمت کی مناسبت سے ڈاکٹرس
کالونی، پروفیسرس کالونی، مڈل انکم گروپ کالونی، لو اِنکم
گروپ کالونی، این جی اوز کالونی، جی اوز کالونی ——
حتیٰ کہ "جی حضوروں" کی کالونیاں تک وجود
میں آگئی ہیں۔ لیکن شاعروں اور ادیبوں
کے لیے کوئی کالونی، زیرِ تعمیر
تو خیر دور کی بات
ہے، زیرِ غور بھی نہیں ہے۔ حالانکہ معاشی نقطۂ نظر سے
اگر آپ ان کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ شاعروں
اور ادیبوں کا مالیہ ہمارے بعض نیتاؤں
کے کردار کی طرح انتہائی
مخدوش ہوتا
ہے۔ اور ان کو بڑی آسانی سے "پچھڑی جاتیوں" کے زمرے
میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہمارے
شاعر اور ادیب (ادیب کم اور شاعر
زیادہ) سال میں دو چار
مواقع ایسے
فراہم کر ہی لیتے ہیں جب کہ ان کی گلپوشی ہو ہی جاتی ہے
لیکن گلپوشی کے ساتھ ساتھ ستر پوشی اور تاجپوشی
کی رسم کی ابھی داغ بیل نہیں ڈالی
گئی ہے۔ اب محض گلپوشی
کی بنیاد پر شاعر

یا ادیب کو صاحبِ جائیداد منقولہ [یا غیر منقولہ] سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔

جب شاعروں کو نئی نئی زمینیں وضع کرنے اور ادیبوں کو افسانوں اور ناولوں کے پلاٹ ہموار کرنے سے فرصت ملی تو انھیں خیال آیا کہ ہماری بھی ایک کالونی ہونی چاہیئے۔ لیکن اُس وقت تک شہر کے مضافات کی ساری اراضیات ختم ہو چکی تھیں: ؎

گاڑی نکل چکی تھی پٹری چمک رہی تھی !

تاہم انھوں نے حکومت کی خدمت میں ایک ناقابلِ اشاعت میمورنڈم پیش کیا جس میں بے زمینی دربدری اور خانہ بدوشی کی حکایات درج تھیں۔ حکومت نے میمورنڈم ملاحظہ فرمانے بغیر ہی شاعروں اور ادیبوں سے وضاحت طلب کی کہ آخر آپ لوگ اب تک کہاں تھے؟ اور کیا کر رہے تھے؟

جواب دیا گیا کہ ہم دیر سے سونے اور دیر سے جاگنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم اپنے افسانوں کے پلاٹوں، غزلوں کی زمینوں اور نظموں کی مدتوں میں اُلجھے ہوئے تھے!"

اس اعتراف پر شاعروں اور ادیبوں سے پوچھا گیا کہ آخر آپ لوگوں کی انکم [INCOME] کیا ہے؟ اور آپ لوگوں کو کس انکم گروپ [INCOME GROUP] میں شامل کیا جانا چاہیئے؟" جواب دیا گیا کہ "ہماری نہ تو کوئی انکم [INCOME] ہوتی ہے اور نہ کوئی انکم گروپ! ہمارا تو صرف ایک ہی گروپ ہوتا ہے ـــــ ٹانگ کھینچنے والا گروپ ـــــ ہمیں بڑی آسانی سے نو انکم گروپ (NO INCOME GROUP) میں شامل کیا جا سکتا ہے!"

اس معقول جواب پر شاعروں اور ادیبوں کو "پھرتی جاتیوں" کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ اور پھر ان کے لیے نو انکم گروپ [NO INCOME GROUP] کے عنوان سے ایک کالونی جنوب کی سمت میں شہر سے کوئی دس کلو میٹر کے فاصلے پر بنائی گئی تاکہ شاعر پھر شہر کا رُخ ہی نہ کر سکیں۔ اُس کالونی کا نام "مخدوش مالیہ نگر" رکھا گیا! ـــــ اور پھر ایک دن شہر کے سارے شاعر اور ادیب اپنی نزاکتوں اور نحوستوں کے ساتھ اپنے اپنے بال پن [BALL PEN] کانوں پر رکھے "خامہ بگوشوں" کی طرح "نو انکم گروپ" کالونی میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح شہر کا سارا لٹریچر [مطبوعہ کم اور غیر مطبوعہ زیادہ] مخدوش مالیہ نگر میں منتقل ہو گیا۔ اور پھر کالونی آباد ہو گئی۔ اس طرح شاعری کے میدان میں نئی زمینوں کی تلاش میں رہنے والے شاعروں کو اور جدید ادب کے نام پر مغربی افسانوں اور ناولوں کے پلاٹ چرانے والے ادیبوں کو سچ مچ کی زمین مل گئی!

"کالونی کیا آباد ہوئی، اُس طرف سے بلاؤں کا داخلہ شہر میں بالکل بند ہو گیا۔ شہر کی ایک جانب سے بلاؤں کے اس مستقل بند و بست پر شہر والوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ تو یہ بھی سوچنے لگے تھے کہ کاش شہر کی باقی تین سمتوں میں بھی شاعروں اور ادیبوں کی اسی قسم کی کالونیاں ہوتیں تو بقیہ تین سمتوں سے بھی شہر میں بلاؤں کے داخلے کی روک تھام کا معقول بند و بست ہو چکا ہوتا!

کالونی کیا تھی؟ ـــ منی کوارٹرس [MINI QUARTERS] کا ایک مجموعہ تھی۔ شاعروں اور ادیبوں کی کثرت اور جگہ کی قلت نے ایک نئی وضع کی کالونی کو جنم دیا تھا۔ شاعروں اور ادیبوں کو جو کوارٹرس الاٹ کئے گئے تھے، وہ ہو بہو آج کل کی منی کہانیوں کے مشابہ تھے۔ کالونی کے کوارٹروں میں گھر کے مفہوم کو تلاش کرنا گویا منی کہانیوں میں کہانی کے مفہوم کو تلاش کرنے کے برابر تھا۔ کالونی کی تعمیر میں اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا

کہ کسی شاعر کی بھی انفرادیت محفوظ نہ رہے۔ کوارٹرس اس حد تک مشابہ تھے کہ ایک ہی شعر کے دو ہم قافیہ اور ہم ردیف مصرعے معلوم ہوتے تھے۔ اس یکسانیت کی وجہ سے کوئی بھی شاعر یا ادیب کسی دوسرے شاعر یا ادیب کے کوارٹر کو اپنا کوارٹر سمجھ کر داخل ہوتا اور حسب حیثیت بے آبرو ہو کر نکلتا۔ ایک بار یوں بھی ہوا کہ ایک شاعر حالتِ ترنگ میں رات کے وقت ایک دوسرے شاعر کے کوارٹر کو اپنا کوارٹر سمجھ کر گھس گیا۔ اس بے ساختہ تشریف آوری پر صاحب خانہ پہلے تو ہڑبڑا گئے، اور پھر اُس شاعر کو دھکے دیتے ہوئے ایک چمن میں لائے اور پھر تحت اللفظ میں خوب صلواتیں سنائیں۔ جب وہ تھک کر خاموش ہو گئے تو ممدوح نے فرمایا: "گالیاں دینی ہی تھیں تو گھر پر ہی دے دیتے! یہاں چمن میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟" شاعر بولا "تم بھی ایک عجیب چمن ہو! ہوش کے ناخن لو! تم جنھیں گالیاں سمجھ رہے ہو، وہ دراصل ایک جدید معرا نظم ہے جس کا عنوان ہے: "ایک غصیلی نظم!"

اگر میں گھر پر ہی یہ نظم سنا دیتا تو گھر میں سوئے ہوئے چھوٹے بڑے بے بحر مصرعے جاگ جاتے اور پھر ہوٹنگ شروع ہو جاتی!"

چنانچہ اس قسم کے حادثات اور کوارٹروں کی یکسانیت سے بچنے کے لیے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے کوارٹروں کے نام کی تختیاں لٹکا دیں۔ مثلاً:

"خوابگاہِ خرگوش" — "کاشانۂ گل فروش" — "آشیانۂ برائلر مرغ" — "گوشۂ احسان فراموش" — "کنج قفسِ سوختہ" وغیرہ وغیرہ!

کالونی میں منتقل ہونے کے چند دن بعد شاعروں اور ادیبوں نے "مخدوش مالیہ نگر" کا شارٹ فارم یعنی تخلص "یم یم نگر" [M.M. NAGAR] رکھا۔ کیونکہ کالونی کے نام کا ایک جز "مخدوش مالیہ" ہونے کی وجہ سے دکانداروں نے شاعروں اور ادیبوں کو غلّہ اور سودا ادھار دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے شاعر اور ادیب "مخدوش مالیہ نگر" کا نام لیتے ہوئے یوں شرمانے لگے تھے جیسے کوئی ہندوستان کی دیہاتی عورت اپنے شوہر کا نام لیتے ہوئے شرماتی ہے۔ پھر تو ہر شاعر اور ادیب کے نام کے ساتھ "یم یم نگری" کا دُم چھلا نکل آیا۔ ان یم یم نگریوں کی کثرت سے تنگ آ کر بالآخر ایک دن ایک ستم ظریف نے ایک یم یم نگری کو پکڑ ہی لیا اور پھر پوچھ بیٹھا "تم کونسے یم یم نگری ہو؟ تھرٹی فائیو یم یم یا سیونٹی یم یم؟" وہ یم یم نگری بھی کچھ کم نہیں تھا۔ تفنن طبع کا دلدادہ اور چھوٹی بحر کا شاعر۔

بولا "چھوٹی بحر کا شاعر ہوں! یعنی تھرٹی فائیو یم یم! لیکن ایر کنڈیشنڈ نہیں!

ستم ظریف نے چونک کر پوچھا "یہ ایر کنڈیشنڈ کا کیا مطلب؟"

شاعر نے جدید لب و لہجے میں جواب دیا "ایر کنڈیشنڈ کا مطلب یہ ہے کہ میں ہوادار کپڑے نہیں پہنتا! حیادار ہوں سلیقے کے کپڑے پہنتا ہوں! جسم کو ہوا نہیں کھلاتا!"

مخدوش مالیہ نگر میں بعض ایسے شاعر بھی ایسے تھے جو توارد کے نام پر دوسرے شاعروں کے معروف مصرعے اُڑا لیتے تھے۔ اور بعض ادیب ایسے بھی تھے جن کا کام افسانوں کے پلاٹ چُرانا تھا۔ پھر تو کالونی میں چوری کا بازار گرم ہو گیا۔ شاعر ایک دوسرے کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگے لیکن اس

سے باوجود مصرعوں کے لڑ جانے، خیال کے ٹکرانے اور زمین کو چُرانے کی شکایتیں عام ہوگئیں۔ اور عام بھی اتنی کہ نقصِ امن کا اندیشہ لاحق ہوگیا تھا۔ نتیجتاً پولس کو حرکت میں آنا پڑا۔ ایک دن بعد برخواستِ مشاعرہ دو شاعروں میں خیال کے ٹکرانے، مصرعوں کے لڑ جاتے اور زمین کو چرانے کے موضوع پر زبردست بحث چھڑ گئی۔ اور نوبت بہ ایں جا رسید کہ ہاتھا پائی شروع ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ کوئی بیچ بچاؤ کرتا، ایک پولس والا میدانِ سخن کے اُن دو پہلوانوں کو تھانے میں لے آیا۔ شاعروں پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر نے پوچھا "کون ہیں یہ دونوں؟ اور کیا حرکتیں کر رہے تھے؟"

کانسٹبل نے اٹینشن ہوکر کہا "سر! یہ دونوں مصرعہ لڑا رہے تھے اور زمین چُرا رہے تھے"، انسپکٹر حیران کہ یہ مصرعے لڑانا کیا ہے؟ اور زمین چُرانا کیا ہے؟ کیوں کہ وہ تو صرف سرکاری زبان جانتا تھا۔ اور اردو سے اس حد تک واقف تھا کہ مقامی گالیاں دے سکتا تھا۔ ایسے انسپکٹر سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ شاعری کی اصطلاحوں "مصرعہ" اور "زمین" کا مفہوم سمجھ پائے گا۔ چنانچہ انسپکٹر نے "لڑنے" اور "چُرانے" کی مناسبت سے "مصرعہ" کو غنڈے کا نام سمجھ کر تحکمانہ انداز میں پوچھا؟ "Who is Missra"

دو شاعروں میں سے ایک شاعر نے موقع کی نزاکت کو بھانپ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں یوں وضاحت کی "مصرعہ کسی کا نام نہیں ہے صاحب! پوئٹ .... پوئٹ .... پوئم لائن!" انسپکٹر نے شاعر کو سر سے پیر تک گھورتے ہوئے پوچھا؟ "You are a poet" شاعر نے "you" کی جگہ "I" کو رکھ کر جھٹ سے جواب دیا: "Yes, I are a poet!"

انسپکٹر نے شاعر کی انگریزی کو تو معاف کردیا لیکن ابھی غزل کی زمین کا مسئلہ حل طلب تھا۔ وہ اپنے تئیں غزل کی زمین کو "لینڈ" [LAND] سمجھ بیٹھا تھا۔ چنانچہ اس کا محل وقوع جاننے کے لیے پوچھا: "Where is the disputed land?" شاعر نے فوراً جواب دیا "In my pocket!"

انسپکٹر ... زمین جیب میں کس طرح سما سکتی ہے؟ شاعر نے انسپکٹر کی حیرانی کو بھانپ کر بڑے فخر سے کہا: "انسپکٹر صاحب! یہ شاعری ہے، شاعری! پولس کی ڈائری نہیں ہے۔ شاعر زمین کو تو کیا سورج کو بھی اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ بادلوں کو مرغا بنا سکتا ہے۔ ہوا کے سگریٹ بنا کر انھیں پانی سے سلگا سکتا ہے۔ اور تو اور اردو کا شاعر تو مرنے کے بعد بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ آپ نہ تو شعر فہم ہیں اور نہ آپ کا اسٹاف سخن شناس! آپ سب کے سب بھرتی کے شعر کے مماثل ہیں۔ یہ شاعروں اور ادیبوں کی کالونی ہے۔ یہاں صرف سخن فہم اور شاعر شناس پولس ہی رہ سکتی ہے۔ آپ فوراً یہاں سے تبادلہ کرا لیجئے۔ ورنہ ہم احتجاج کریں گے"! اتنا کہنے کے بعد شاعر نے اپنی جیب سے وہ متنازعہ غزل نکالی جس کی زمین کے دعویدار دو شاعر تھے۔ چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن اس انسپکٹر کا تبادلہ کردیا گیا اور اس کی جگہ ایک ایسا انسپکٹر آیا جو نہ صرف سخن فہم تھا بلکہ شاعر شناس بھی۔ اس مسرت میں شاعروں نے تھانے میں ایک محفلِ شعر زیرِ صدارت انسپکٹر آف پولس منعقد کی جس میں سامعین کے طور پر کانسٹبل شریک ہوئے۔ جنھیں صدرِ مشاعرہ نے ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعہ شاعروں کے کلام پر داد دینے کے لیے اُکسایا۔ شاید یہ پہلا موقع تھا جب کہ شاعروں نے پہلی بار ایک غلط آدمی کو صحیح مقام پر بٹھایا تھا!

اگر ہم شاعروں اور ادیبوں کی کالونی اور وہاں کے شب و روز کی داستانِ خونچکاں بیان کرتے ہی جائیں تو اندیشہ ہے کہ ملک میں نیوز پرنٹ کی قلت پیدا ہو جائے گی۔ اور ہماری عمر بھی وفا نہ کرے گی۔ البتہ اتنا ضرور بتاتے ہیں کہ کالونی میں سب کچھ تھا ــــ ادیب تھے۔ شاعر تھے۔ ادب تھا۔ سڑکیں تھیں۔ بھٹر ا خانے تھے۔ لڑکھڑا کر گرنے کے لیے گڑھے تھے۔ ہوا تھی۔ سورج تھا (جو دن کے گیارہ بجے طلوع ہوتا تھا)۔ اکاڈمی تھی۔ پیروڈیاں تھیں۔ انعامات تھے ــ غرض کہ ہر چیز تھی۔ لیکن سامع یا قاری نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر اتفاق سے کبھی کوئی بھولا بھٹکا سامع اُدھر آ نکلتا تو شاعر اُسے یوں گھیر لیتے جس طرح شکر کی قلت کے زمانے میں شکر کے ایک ذرّے کو بیسیوں مکھیاں گھیر لیتی ہیں۔ وہ ادیب اور شاعر جو کبھی آپسی چندہ سے کافی خانے میں چائے پی کر ادب عالیہ تخلیق کیا کرتے تھے، کالونی میں منتقل ہونے کے بعد فرمائشی، نمائشی، نمائشی اور انعامی ادب تخلیق کرنے لگے جس میں قاری یا سامع کے دل کی دھڑکن تو کجا، خود فنکار کے دل کی دھڑکن سنائی نہیں دیتی تھی!

محمد سلطان

پھر آیا نیا سال، نیا سال مُبارک — مانا ہے بُرا حال، نیا سال مُبارک
ہنسنا ہے تمہیں خوب ہنسو اور رہو خوش — ہنسنا ہے بہرحال، نیا سال مُبارک
ہر ایک علاقہ کا زباں کا ہے نیا سال — دہلی ہو یا بھوپال، نیا سال مُبارک
بریانی کیک مُرغِ مسلّم شراب ہے — اپنے لیے ہے دال، نیا سال مُبارک
ہوٹل جہاں منایا گیا جشنِ سالِ نَو — وہ بن گئی ہے ہال، نیا سال مُبارک
ہم رقص ہیں ملے ہوئے لیکن نہیں ہٹی — شانوں سے اُن کے شال، نیا سال مُبارک
رقص و سرور جشن سے کیا فائدہ حضور — حالت ہے حسبِ حال، نیا سال مُبارک
آزاد کر کے جشنِ غلامی عطا کیا — انگریز کی یہ چال، نیا سال مُبارک
ووٹر کو پھانسنے کے لیے دیش کے نیتا — بُنتے ہیں نیا جال، نیا سال مُبارک
اس ختم سال پر تو دجے واڑہ جل گیا — جنتا کا تھا جلال، نیا سال مُبارک
کل لکھ پتی جو لوگ تھے کنگال ہو گئے — برتن رہا نہ تھال، نیا سال مُبارک
قانون کے رکھوالے ملوث تھے لوٹ میں — نکلا ہے گھر سے مال، نیا سال مُبارک
اکیس سال پورے شگوفہ کے ہو گئے — واہ مصطفیٰ کمال، نیا سال مُبارک
زندہ دلوں کو ناز ہے، ہے اُن کا رہنما — لو تھر سا بے مثال، نیا سال مُبارک

احمد میاں اب اپنی کہو سب کی کہہ چکے
بدلو کچھ اپنی چال، نیا سال مُبارک

رشید عبدالسمیع جلیل

نئے سال کا منشور

مُبارک سالِ نَو کہہ کر ذرا سا مسکرا دیجے
گلے احباب سے مِل کر ثبوت اخلاق کا دیجے

بڑوں کو چائے کافی اور چھوٹوں کو دُعا دیجے
اگر یہ بھی نہ ہو ممکن، سلیقہ سے بھگا دیجے

کرایہ دار سے کہہ کر کرایہ بھی بڑھا دیجے
اگر پچھلا بقایا ہو تو صلوٰتیں سُنا دیجے

بُرا کہتا ہے کوئی آپ کی بے اعتدالی پر
اُسے اک کان سے سُنئے تو دوجے سے اڑا دیجے

نئی ساعت، نئی رنجش بھی اپنے ساتھ لائی ہے
ظرافت کے سہارے، آپ لوگوں کو ہنسا دیجے

اداکاری سے پردہ ڈالئے اپنی جہالت پر
سمجھ میں کچھ نہ آتا ہو تو بس گردن ہلا دیجے

ہمیشہ مست رہیئے حال میں اپنے بلا وحشت
گزشتہ سال کیا کچھ ہو گیا اُس کو بھلا دیجے

یہی یہ چار باتیں کام کی ہیں آزما لیجے
پھر اگلے سال تک فرصت ہے رنگ اپنا جما لیجے

پرویز ید اللہ مہدی [بمبئی]

مارکیٹنگ گائیڈ جدید

[باتصویر]

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، ہم اپنے چند قریبی احباب کے ہمراہ حسبِ معمول مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، میں بیٹھے حسبِ عادت ایک "آن لمیٹڈ" بحث میں مشغول تھے کہ اچانک ایک اجنبی شخص جو بڑی دیر سے مختلف کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور صورت سے گاہک معلوم ہوتا تھا ہماری بحث میں دخل درنا معقولات فرما کر بولا "معاف کیجئے، اس وقت آپ لوگ جس موضوع پر بحث کر رہے ہیں اس کے تعلق سے مجھے بھی کچھ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیے۔" ہم نے اس زحمت کو سعادت سمجھ کر موصوف کو مطلع کیا۔ "جناب اس وقت ہم پچھلی رات دوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے پروگرام" اردو غزل میں محبوب کی جنس کا مسئلہ" پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں۔" اس انکشاف پر شخص مذکور نے متحیر لہجے میں فرمایا۔ "تعجب ہے دوردرشن سے پروگرام بھی ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں"۔ اب ہمارے چونکنے کی باری تھی، ہم نے غیر یقینی لہجے میں کہا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب کیا آپ کو پتہ نہیں دوردرشن سے مختلف نوعیت کے پروگرام اور سیریلس بھی تو ٹیلی کاسٹ ہوتے ہیں" اس نے بڑی ہی معصومیت سے جواب دیا۔ "یقین مانئے بھائی صاحب، مجھے اس کا بالکل پتہ نہیں تھا، میں تو آج تک اس مغالطے میں تھا کہ دُوردرشن صرف ایک مارکیٹنگ گائیڈ ہے، کیوں کہ میں جب بھی ٹی۔ وی کا سوئچ آن کرتا ہوں، یا تو اشتہارات کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ میرا منہ چڑھاتا ہے یا نیوز ریڈروں کے بدلتے ہوئے جوڑے، خبروں کے ہوائی گھوڑے، میرے اوپر چھوڑتے دکھائی دیتے ہیں، خدا آپ کا بھلا کرے آج آپ کی زبانی پہلی بار یہ علم ہوا کہ دوردرشن والے اشتہارات کے بیچ بیچ میں پروگرام وغیرہ بھی دکھاتے ہیں۔" مذکورہ بالا تبادلۂ خیال کے نتیجے میں شخص مذکور کی معلومات میں واقعی کوئی اضافہ ہوا یا نہیں، ہم نہیں جانتے البتہ ہماری آنکھیں ضرور کھل گئیں چنانچہ اگلے دن ہم نے اپنی کھلی آنکھوں سے دُوردرشن سے ٹیلی کاسٹ ہونے والے تمام پروگرام مع اشتہارات، دیکھ ڈالے تب پہلی بار یہ عرفان ہوا کہ دُوردرشن محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اچھی خاصی مکمل و مفصّل مارکیٹنگ گائیڈ ہے اور اس کے ساتھ یہ عقدہ بھی کھلا کہ ٹی۔ وی کی ایجاد کا مقصد تفریح کے بجائے "افراتفری" پھیلانا ہے،

ظاہر ہے یہ افراتفری ان اشتہاری فلموں کے ذریعہ پھیلائی جاتی ہے جو عموماً مختلف اوڑھنے، پہننے، کھانے پینے، چوسنے، چبانے، نہانے، دھونے کی روزمرہ اشیاء پر مشتمل ہوتی ہیں۔ "پبلسٹی" کی اس اندھی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں ان اشیاء کی تشہیر اس قدر بڑھا چڑھا کر ڈھول تاشے بجا کر کی جاتی ہے کہ بیشتر ناظرین بالخصوص خانہ دار خواتین، آنکھ موند کر ان اشتہاری ہتھکنڈوں پر نہ صرف ایمان لے آتی ہیں بلکہ بازار سے تشہیر شدہ سامان بھی لے آتی ہیں اور یوں یہ جدید مارکٹنگ گائیڈ، بیویوں کو گائیڈ اور شوہروں کو "مس گائیڈ" کرنے کا مستقل فریضہ بڑی چترائی سے انجام دیتی ہے، اب آپ سے کیا چھپانا ابھی پرسوں ہی ہم ایک اشتہاری اسٹنٹ کے ہتھے چڑھ چکے ہیں۔ ہوا یوں کہ اس روز بیگم صاحبہ نے صبح صبح حکم صادر فرمایا۔ "شام میں دفتر سے لوٹتے ہوئے رجب علی اینڈ سنس کے ڈپارٹمنٹل اسٹور میں ملئے۔ میں وہیں آپ کا انتظار کروں گی!"

ہم نے اپنی جیب کی خیر مناتے ہوئے گھگھیا کر پوچھا۔ "کیوں؟ کچھ خریدنا ہے کیا؟"

بولیں۔ "ہاں! ایک نیا پریشر ککر خریدنا ہے"

ہم نے گڑبڑا کر پوچھا۔ "پچھلے پریشر ککر کو کیا ہوا؟"

چٹاک سے بولیں۔ "آپ کی طرح تھک چکا ہے، سیٹی اسی طرح بجاتا ہے جیسے ہچکیاں لے رہا ہو، بھاپ اس طرح چھوڑتا ہے جیسے آخری سانس لے رہا ہو"

ہم نے جھنجھلا کر کہا۔ "ٹھیک ہے، لیکن آپ جو یہ نیا پریشر ککر خریدنا چاہتی ہیں اس میں ایسی کیا خاص بات ہے"؟

ترنم میں بولیں۔

"اس سے جو بھاپ نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے"

اس شاعرانہ حوالے کے بعد نثر میں بولیں۔ "ذرا یاد کیجئے دوردرشن والی وہ اشتہاری فلم جس میں ایک معمّر دکاندار ایک نوبیاہتا جوڑے سے اس پریشر ککر کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے۔ اگر اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے اپنی پتنی کی جان تو یہی پریشر ککر خرید کر دیں گے شریمان"

اس اشتہاری تاویل پر ہم نے پینترا بدل کر کہا۔ "بیگم وہ پریشر ککر صرف نئے جوڑوں کے لیے ہے، ہمارے جیسے ادھیڑ عمر کے جوڑوں کے لیے نہیں جن کے ہر جوڑ میں "توڑ پھوڑ" کا عمل شروع ہو چکا ہو"

منہ بنا کر بولیں۔ "صاف کیوں نہیں کہتے، اب آپ کو میری جان، اپنی جان سے زیادہ پیاری نہیں رہی لیکن اس کے باوجود میرا ظرف دیکھئے میں اس نئے پریشر ککر کے وسیلے سے شادی کے بیس سال بعد بھی آپ کو محلے بھر میں ایک جانثار، وفادار شوہر ثابت کرنا چاہتی ہوں، ذرا سوچئے محض ایک معمولی اور حقیر پریشر ککر آپ جیسے حقیر فقیر شوہر کو بھی ایک غیر معمولی شوہر کے روپ میں پیش کر کے ساری شوہر برادری کو آپ کی طرف رشک سے دیکھنے پر مجبور کر دے گا"

ہم نے فوراً ٹکڑا لگایا۔ "جی ہاں اور جب یہ غیر معمولی شوہر نیا پریشر ککر اٹھائے آپ کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا

گھر کی طرف لوٹے گا تو لوگ اس حقیر فقیر کی طرف اشارہ کر کے کہیں گے کہ دیکھو ؎
وہ آ رہا ہے کوئی شبِ غم گزار کے"

اگرچہ کہ اس اشتہاری پریشر ککر نے ہمیں خاصاً بلڈ پریشر" دیا اس کے باوجود ہمیں ان اشتہاروں سے کوئی گلہ نہیں البتہ ارباب دور درشن سے اتنی شکایت ضرور ہے کہ ان اشتہاروں کے ٹیلی کاسٹ کے سلسلے میں ترتیب کا خیال بالکل نہیں رکھا جاتا مثال کے طور پر مختلف صابنوں کے اشتہار یکے بعد دیگرے اس قدر تسلسل کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں کہ دماغ پر لاکھ زور دینے کے باوجود یہ یاد نہیں رہتا کہ کون سا صابن کپڑے دھونے کا ہے کون سا نہانے کا اور کون سا بال بڑھانے کا ایک۔ جیسے اشتہاروں کی اس بھرمار اور افراط و تفریط سے کبھی کبھی ڈر لگتا ہے کہ غلطی سے کہیں صحیح صابن کا غلط استعمال نہ ہو جائے اور بیٹھے بٹھائے کھوئے ہوئے بالوں کی بازیافت کی جگہ بچے کچھے بالوں کا بھی صفایا نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ جس طرح کی اشتہاری فلمیں ان چیزوں کی پبلی سٹی کے لیے بنائی جاتی ہیں وہ بھی اکثر عجیب و غریب غلط فہمیاں کھڑا کر دیتی ہیں، مثلاً ایک صابن کی اشتہاری فلم میں میاں بیوی اور ان کے شیر خوار فرزند، تینوں ایک ساتھ ایک ہی صابن سے ایک ہی حمام میں نہاتے ہوئے نظر آتے ہیں، اس سے ایک عام دیکھنے والے کو یقیناً یہ غلط فہمی ہو سکتی ہے کہ اس صابن کا استعمال صرف اسی صورت میں کیا جا سکتا ہے جب تمام افرادِ خاندان مل کر ایک ہی حمام میں ایک ساتھ "باجماعت" غسل کرنے کو تیار ہوں۔ اسی طرح ایک ٹوتھ پاوڈر کی اشتہاری فلم میں دو پہلوانوں کو پہلے تو کشتی لڑ کر ایک دوسرے کے دانت توڑنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے دکھایا جاتا ہے پھر ایک پہلوان کو بھٹے کی مدد سے اپنا دانت شہید کرتے دکھایا جاتا ہے، اس کے بعد ٹوتھ پاوڈر کی خوبیوں کے بارے میں بتلایا جاتا ہے اس سے بعض معصوم ناظرین کو یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ اس ٹوتھ پاوڈر کے استعمال سے پہلے کشتی لڑنا پھر بھٹے کی مدد سے دانت تڑوانا ضروری ہے۔

یہاں ہم اس اشتہاری فلم کا ذکر بطورِ خاص کرنا چاہیں گے جو ایک زمانے تک ہمارے حق میں معمّہ بنی رہی اگر آپ بھی ہماری طرح ٹی۔ وی گزیدہ ہیں تو یقیناً وہ فلم آپ نے بھی دیکھی ہوگی جس میں کچھ خوبصورت لڑکیاں ایک لڑکی کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے چھیڑتی ہیں، ایک عرصہ تک ہماری سمجھ میں نہیں آسکا کہ یہ لڑکیاں آخر کس چیز کی پبلی سٹی کر رہی ہیں؟ اصل بھید اس وقت کھلا جب ایک مرتبہ اس اشتہاری فلم کی ٹیلی کاسٹ کے دوران ہم نے بیگم سے کہا۔ 'دیکھو، دیکھو بیگم، یہ لڑکیاں تمہارے پسندیدہ کھیل 'اندھا پاشا' کی پبلی سٹی کر رہی ہیں'۔ بیگم ہنسی سے دہری ہوتی ہوئی بولیں "اجی ہوتے پاشا، یہ 'اندھا پاشا' کی پبلی سٹی نہیں، ساڑیوں کی پبلی سٹی ہے، دیکھو کتنی خوبصورت ساڑیاں ہیں مجھے بھی ایک ایسی ہی ساڑی دلائیے نا پلیز"

ہمارے ایک پڑوسی ہیں مسٹر کانچ والا، آدمی واقعی کانچ کی طرح نازک ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کی نزاکت آبگینوں کو دیکھ کر گمان ہوتا ہے جیسے اوپر والے نے غلطی سے "زنانے" کی چیز "مردانے" میں بھیج دی ہے انھیں دور درشن کا ایک اشتہار اس قدر پسند ہے کہ اس ایک اشتہار کے دیدار کی خاطر "ٹرانسمٹر" شروع ہوتے ہی ٹی۔ وی اسکرین کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بیٹھ جاتے ہیں پلک تک نہیں جھپکاتے محض اسی ڈر سے کہ پلک جھپکنے کے دوران اگر ان کا مرغوب اشتہار نکل گیا تو ان کی رات کی نیند اور اگلے دن کا چین حرام ہو جائے گا، ایک عرصہ تک موصوف

نے اپنے پسندیدہ اشتہار کو بڑے حکیم صاحب کے مردانہ کمزوری کو صیغۂ راز' میں رکھنے والے اشتہار کی طرح دنیا بھر سے پوشیدہ رکھا لیکن ایک دن ہم نے ان سے یہ راز اگلوا ہی لیا تاہم اس راز کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہمیں ان کی کانی پہیلیاں بوجھنی پڑیں کہ موصوف عموماً پہیلیوں ہی میں گفتگو فرماتے ہیں' چنانچہ ہم نے گفتگو کا آغاز اس استفسار کے ساتھ کیا: "آخر وہ کون سا اشتہار ہے؟" کسی اڑیل معشوق کی طرح منہ بنا کر بولے۔ "ہے ایک اشتہار' آپ کو کیوں بتاؤں؟" ہم نے ان کے مزاج کی مناسبت سے پینترا بدل کر پوچھا: "ٹھیک ہے سیدھے سیدھے نہ سہی اتا پتا ہی بتا دیجیے' کیا اس کا تعلق کھانے پینے کی چیزوں سے ہے؟
بڑے ٹھسکے سے نفی میں گردن ہلا کر بولے۔ "اونہوں"!
ہم نے اگلا پتا پھینکا۔ "پھر ضرور کوئی لگانے کی چیز ہوگی جیسے کریم' لوشن"۔
پھر اسی ٹھسکے کا مظاہرہ کیا۔ "اونہوں۔"!
ہم نے ایک اور پتا پھینکا۔ "کیا اوڑھنے پہننے کی چیز ہے؟"
خوشی سے لپک کر بولے۔ "اللہ بڑی جلدی نزدیک پہنچ گئے' واقعی اس کا تعلق پہننے کی چیزوں سے ہے۔"
ہم نے برجستگی سے کہا "یعنی سوٹنگ شرٹنگ والا اشتہار؟"
بُرا سا منہ بنا کر بولے "تو بہ ہے آپ منزل کے قریب پہنچ کر پھر بھٹک گئے"
ہم نے فوراً بات کو اُچک کر کہا۔ آپ کا اشارہ زیر جاموں کی طرف ہے؟"
بچوں کی طرح تالیاں بجا کر بولے۔ اللہ کتنے ہشیار ہیں آپ' کتنی جلدی پہچان گئے۔ اب بوجھیے وہ کونسا اشتہار ہے؟
ہم نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو نہیں جس میں چند خوبصورت لڑکیاں بکنی' پہن کر جل پریوں کی طرح' سوئمنگ پول" میں تیرتی ہیں؟
ناراضگی سے بولے۔ "ہٹیے مجھے ایسا چھچھورا مذاق بالکل پسند نہیں' بکنی پہنی ہوئی لڑکیوں کا کیا میں اچار ڈالوں گا"
آپ تو جانتے ہیں میری طبیعت اُدھر بالکل نہیں آتی"' ہم نے بیزارگی سے پوچھا۔ "پھر آپ کا محبوب اشتہار کونسا ہے؟"
رال ٹپکاتے ہوئے بولے۔ دی بنیان اور انڈر ویر والا' جس میں سیلز مین دارا سنگھ کے تگڑے مسلز (MUSCLES) کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے' ہمارے انڈر ویر اور بنیان مضبوط اتنے' دارا سنگھ جتنے"
جو لوگ دیش کی ترقی اور خوشحالی کو ننگے بھوکے عوام میں جا کر ڈھونڈتے اور اس کے نہ ملنے پر قوم کے غم میں ڈٹ کر ڈنر کھاتے ہیں انھیں ہماری ناچیز رائے میں خوشحالی کی تلاش میں کہیں جانے کی قطعی ضرورت نہیں' اس کے لیے بس ڈنر کھاتے ہوئے دوردرشن سے بلاناغہ ٹیلی کاسٹ ہونے والے اشتہارات کو دیکھ لینا کافی ہے کیوں کہ جتنی ترقی' جس قدر خوشحالی ان اشتہاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے آتی کہیں اور نظر نہیں آتی' غالباً دوردرشن کے ان اشتہارات سے چھلکتی' اُبلتی خوشحالی کو دیکھ کر ہی کسی شاعر نے فرمایا ہے ؎

سب کچھ ہے اپنے دیس میں روٹی نہیں تو کیا

اس کے علاوہ ان اشتہاری فلموں کی تفہیم و تجسیم کے سلسلے میں جس فراخدلی کے ساتھ "ماڈلس" MODELS کے روپ میں خواتین کا استعمال کیا جاتا ہے اس سے گھر بیٹھے ہم جیسے غافلوں کو بھی یہ پتا چلتا ہے کہ آج کی ناری' ترقی کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے کل تک جو عورت گھر کی چار دیواری میں قید تھی وہ اب

دوردرشن کی مہربانی سے کھلے عام "باتھ ٹب" میں "معرکۂ تر" کی طرح لیٹ کر جملہ افرادِ خاندان کے روبرو نہانے سے نہیں جھجکتی، سوئمنگ کا سٹوم زیب تن کر کے آج کی ماڈرن ڈن پانی میں غوطہ زن ہوتے سے نہیں گھبراتی، ایسے نسوانی مسائل جن کا علم پہلے صرف خواتین کو ہوا کرتا تھا یا پھر کسی پیشہ ور دایا کو آج کی اشتہاری ناری انھیں ہر سرِ عام بیان کرنے سے نہیں شرماتی۔ ہو سکتا ہے اس قسم کی تر بتر اشتہاری فلمیں دیکھ کر کچھ بدخواہ، خواہ مخواہ ناک بھوں چڑھاتے ہوں، اصل میں یہ لوگ عورت کی ترقی سے جلتے ہیں، خیر اب چاہے یہ دقیانوسی لوگ جلیں یا بھنیں آج کی بھارتی ناری، حقیقی زندگی میں نہ سہی کم سے کم دوردرشن کے اشتہارات میں ترقی کے راستے پر آگے قدم بڑھا چکی ہے اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی!

کبھی کبھی ہم سوچتے ہیں اگر خدانخواستہ اربابِ دوردرشن، اشتہارات کی ٹیلی کاسٹ پر مکمل امتناع عائد کر دیں تو سگھڑ بیبیاں کسی سے صلاح مشورہ کر کے سستی اور فالتو چیزیں مہنگے داموں خریدا کریں گی حالانکہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں دوردرشن والے گھاٹے کا یہ سودا کبھی منظور نہیں کریں گے تاہم اگر کبھی ایسا وقت آگیا تو ایکبار پھر گھر گھر گلی گلی لوگوں کی اکثریت نت نئے ٹوتھ پیسٹوں کی جگہ مسواک، داتنوں، اور کوئلے کے اور بیجل منجن سے دانت مانجھتی اور بیشتر خواتین ماڈرن شیمپو اور صابنوں کے بجائے ریٹھے، سے اپنے بال اور کپڑے دھوتی نظر آئیں گی اب رہے مہنگے تیل صابن ٹوتھ پیسٹ وغیرہ تیار کرتے والی فیکٹریوں اور کمپنیوں کے اربابِ حل و عقد تو یہ حضرات اپنے آرام دہ دفتروں سے نکل کر، سڑک چھاپ دوا فروشوں کی طرح اپنے اپنے پراڈکٹس (PRODUCTS) فٹ پاتھوں پر سجائے رستے کا مال سستے میں بیچتے ہوئے دکھائی دیں گے۔!!
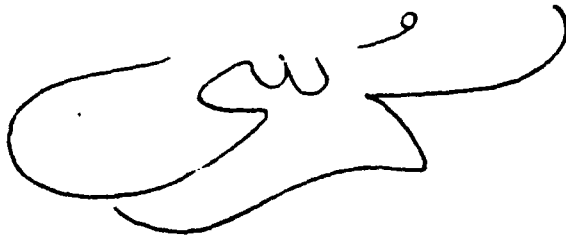
ایت علی خاں
حیدرآباد (سندھ) پاکستان

کیا بات ہے کُرسی تری، کیا بات ہے واللہ

حجّام کو مِل جائے تو الحاج بنادے — کنگلے کو مہاراج اُدھیراج بنادے
بُدّھو کو خردمندوں کا سرتاج بنادے — داہر ہو تو پل میں اُسے حجاج بنادے

کیا بات ہے کُرسی تری، کیا بات ہے واللہ

بدنام کو مِل جائے تو ہو جائے نکو نام — گو شکل کا حبشی ہو یہ کہلائے وہ گلفام
پڑ جائے نظر جس پہ، بنے بندۂ بے دام — ہوں دیدہ و دل فرش ہزاروں ہی بہر گام

کیا بات ہے کُرسی تری، کیا بات ہے واللہ

پھولا نہ سمائے جسے مِل جائے خوشی میں — سر اُس کا کڑھائی میں ہو اور پانچوں ہوں گھی میں
دروازے پہ ٹی وی کی کھڑی رہتی ہوں ٹیمیں — کرتا ہو دھڑلّے سے سماتی ہو جو جی میں

کیا بات ہے کُرسی تری، کیا بات ہے واللہ

اوّل تو کچھ اِس ڈھب سے رجھاتی ہے کہ توبہ! — وہ سبز گھنے باغ دِکھاتی ہے کہ توبہ!
پھر سر میں وہ خنّاس سماتی ہے کہ توبہ! — آخیر میں دُرگت وہ بناتی ہے کہ توبہ!

کیا بات ہے کُرسی تری، کیا بات ہے واللہ

کیا تجھ میں سمائے ہیں طلسمات نگوڑی — مفلوج کے ہاتھوں میں تھماتی ہے ہتھوڑی
لیکن ہیں تری ساری کرامات بھگوڑی — ذی ہوش تجھے کہتے ہیں "شیطان کی گھوڑی"

کیا بات ہے کُرسی تری کیا بات ہے واللہ

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

بے ضابطہ اشتہارات

"روزنِ دیوار
سے" کے فلیپ پر جناب
احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے کہ
"شائستگی کو مزاح کی ضد سمجھا جاتا ہے"۔۔۔
اس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "اردو ادب میں
طنز و مزاح" کے تعارف میں پروفیسر حمید احمد خاں نے
ارشاد فرمایا کہ "۔۔۔مزاح کا وجود تہذیب کے
لوازم میں سے ہے"۔۔۔ پروفیسر
حمید احمد خاں کا موقف
بظاہر جناب
احمد ندیم قاسمی
کے خیال کی نفی کرتا ہے
تاہم غور سے دیکھئے تو قاسمی صاحب
کی رائے میں بھی جزوی صداقت کا عنصر موجود
نظر آتا ہے۔ ہمارے ہاں مزاح اور فکاہ میں حدِ فاصل
قائم نہیں کی جاتی اور اکثر پھبتی، جگت، طعنہ، طنز حتیٰ کہ
دشنام کو بھی مزاح میں شامل کر لیا جاتا ہے۔
تہذیبی شائستگی واقعی ایسے مزاح کو
قبول نہیں کرتی۔
سید احمد خاں

کے زمانے میں
تربھون ناتھ ہجر، مچھو بیگ ستم
ظریف اور منشی جوالا پرشاد برق وغیرہ
نے لفظی عیاریوں سے کام لیا۔ ادبی تمسخر سے
ظرافت پیدا کی اور یوں قاری کی تفننِ طبع کے لیے قلابازیاں
لگانے سے بھی گریز نہ کیا۔ اس دور میں اکبر الہ آبادی نے
سید احمد خاں کی ہموار شخصیت کے خلاف ردِ عمل
کا اظہار کیا اور اس کی میکانکیت توڑنے
کے لیے انگریزی الفاظ
کو اردو شاعری
میں یوں سمویا کر
اس تہذیب کے ناہموار
کنارے نمایاں ہوتے چلے گئے، اور
قاری نے اس ناہمواری کو نہ صرف محسوس کیا
بلکہ اس کے بین السطور مقصد کو پانے کی کوشش بھی کی۔
اکبر الہ آبادی کے زمانے سے لے کر آج تک لفظ کی تحریف
الٹ پھیر اور رعایت وغیرہ کو تخلیقِ مزاح کے لئے
ایک مؤثر حربہ شمار کیا گیا ہے
اور اسے بیشتر مزاح نگاروں
نے بڑی کامیابی

سے استعمال کیا ہے۔ اس کے دقیع نمونے ہمیں ظفر علی خاں، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک اور مجید لاہوری کے ہاں اور نسبتاً غیر دقیع نمونے حاجی لقلق، خضر تمیمی اور ملا حسین مہر وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں۔ اور یہ شائستہ مزاح کے بجائے نکاہ پیدا کرتے ہیں۔ ایسے نکاہات کو چوں کہ تہذیب کے لوازم میں شمار کرنا ممکن نہیں اس لیے انھیں ایسا مزاح قرار دینا مناسب ہے، جو بقول احمد ندیم قاسمی شائستگی کی ضد سمجھا جا سکتا ہے۔

اکبر الٰہ آبادی نے زندگی کی میکانکی ہمواریوں کو انگریزی الفاظ کی ناہمواریوں سے ابھارا تھا جدید مزاح نگاری میں اس قسم کا رویہ پنجابی الفاظ کے مضحک استعمال سے ظاہر ہو رہا ہے۔ چنانچہ بعض نکاہ نگاروں نے نہ صرف لِتّر، چھتّر، ناڑا، کوڑھ کِرلی، اِٹ کھڑکا، ٹوٹے ہٹّے، اڈّی پچڈی وغیرہ الفاظ سے اپنی رگِ ظرافت کو مہمیز لگائی بلکہ بعض اوقات خواجہ سراؤں کے استعمال میں آنے والے پنجابی محاوروں کو بھی برت ڈالا، اور ایسا دنداں نما قہقہہ ابھارا جس میں مسخرہ پن زیادہ اور شائستگی کم ہے۔ اس قسم کے نکاہات سے اگر پنجابی الفاظ نکال دیئے جائیں تو مزاح اور خود مزاح نگار کی بساطِ ادب سمٹ جاتی ہے۔

بلا شبہ مزاح کا وجود تہذیب کے لوازم میں سے ہے۔ اس لیے مزاح نگار اپنی یا معاشرے کی یا زبان کی صورت بگاڑنے کے بجائے قاری کو حقیقی زندگی کی ناہمواریوں کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اور لفظوں کو [illegible] کے بجائے صورتِ واقعہ کو اہمیت دیتا ہے اور اس سنجیدگی سے مزاح پیدا کرتا ہے جس کی یبوست قاری کے مزاج پر بار بننے لگتی ہے۔ ذہن میں چند ایسے واقعات جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو قاری کی سوچ کو مہمیز بھی لگاتے ہیں اور اس کے ہونٹوں پر ایک بے نام سی مسکراہٹ بھی بیدار کر دیتے ہیں۔ پیشِ نظر اخبار کے وہ اشتہارات ہیں جو ایک ضابطے کے ماتحت شائع ہوتے ہیں اور ایک سماجی ضرورت کو پورا کرتے ہیں۔ لیکن جب مزاح نگار ان پر نظر ڈالتا ہے تو ان کی صورت بدل جاتی ہے۔ تحریف یا پیروڈی کا یہ حربہ سید ضمیر جعفری، ابن انشاء اور محمد خالد اختر نے کامیابی سے استعمال کیا ہے اور اب عطاء الحق قاسمی اس میں نام پیدا کرنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اندازہ لگائیے کہ مندرجہ ذیل ٹکڑوں کا اقتباس کس مزاح نگار سے لیا گیا ہے؟

صحیح نام بتانے والوں کو آئندہ شمارہ مفت پیش کیا جائے گا۔

ایک اڑتالیس سالہ نوجوان کے لیے سڈول اور کمزور لڑکی کا رشتہ مطلوب ہے۔ لڑکی رشتہ مطلوب ہے:- خوش شکل، خوش وضع، خوش خصال اور خوشحال ہو، فیشن ایبل پارٹیوں میں شریک ہونے اور "انجمن بہبودِ گنہگاراں" کے لیے چندہ جمع کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، خوشحال ازدواجی زندگی کے لیے مناسب بنک بیلنس، نقل و حرکت کے لیے کار، رہائش کے لیے بنگلہ اور بچے پالنے کے لیے آیا کا ساتھ لانا ضروری ہے۔ عمر اور جہیز کی کوئی قید نہیں۔ مطلقہ خاتون کو بھی ترجیح دی جا سکتی ہے۔

معرفت پوسٹ بکس نمبر ۵۵۵۔ روزنامہ "فردوسِ حیات"

ایک تعلیم یافتہ خاتون کی ضرورت ہے:- گلبرگ لاہور

ایک ایسی تعلیم یافتہ خاتون کی ضرورت ہے جو فروغِ فیشن کے ایک مثالی ادارے میں داخلے کے لیے صرف طالبات کو ترغیب دے سکے۔ یہ ادارہ فیشن کے جدید اصولوں کے مطابق کھولا گیا ہے۔ اور اس میں طالبات کو معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ اس ادارے کی فارغ التحصیل طالبات لاہور

کراچی، لندن، بنکاک میں کئی نائٹ کلب اور بیوٹی سیلون کامیابی سے چلا رہی ہیں۔ اور لاکھوں میں کھیلتی ہیں۔ منتخبہ خاتون کو تنخواہ کے علاوہ ادارے کی آمدنی سے کمیشن بھی دیا جائے گا۔

الف، الف، الف، معرفت ماہنامہ قلمی مشورہ ۔ لاہور

سیلز مین کی ضرورت ہے :- ضرورت ہے ایک ایسے سیلز مین کی جو خواتین کی نفسیات کو سمجھ سکے اور ہماری مصنوعاتِ زیبائش کو زیادہ داموں فروخت کرسکے۔ قیمتِ خرید پر پانچ سو فیصد منافع حاصل کرنے والے سیلز مین کو ترجیح دی جائے گی، سیلز مین کا چرب زبان اور حاضر جواب ہونا ضروری ہے۔ واضح رہے کہ ہماری دکان پر خواتین زیادہ تعداد میں تشریف لاتی ہیں اس لیے سیلز مین کا خوش شکل اور ہنس مکھ ہونا بھی ضروری ہے۔ [منیجر منور ما ڈسنٹر، کلفٹن، کراچی۔]

ایک اہم ادبی اعلان :- من مسمّی بے کار خان بیکار بقائمی ہوش و حواس اعلان کرتا ہوں کہ میں نے پا بنا شاعری سے توبہ کرلی ہے۔ اور اب میں نے نثری نظمیں لکھنا شروع کردی ہیں میں مزید اعلان کرتا ہوں کہ میں نے حلقہ اربابِ ذوق ادبی و سیاسی و لوہاری گیٹ سے علیحدگی اختیار کرکے "حلقہ اربابِ نثری نظم" قائم کرلیا ہے۔ اس حلقے کی نشست روزانہ شام کو ٹی ہاؤس کے سامنے والے میز پر منعقد ہوتی ہے۔ شاعر بننے اور شہرت حاصل کرنے کے خواہشمند نوجوانوں کو صلائے عام ہے۔ نئے ادبا کو چائے مفت پیش کی جاتی ہے۔ خالد احمد اگر اس حلقے میں شامل ہونا چاہیں تو ان کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

ضرورت ہے سہرا لکھنے والوں کی :- ہمیں ایک ایسے قادر الکلام شاعر کی ضرورت ہے جو اعلیٰ سہرا لکھنے کی صلاحیت سے بہرہ مند ہوں، ہمارے پاس چند پرانے سہرے بھی موجود ہیں اور ان میں حسبِ ضرورت نام تبدیل کرکے کام چلایا جاسکتا ہے۔ جو شعرا عروض میں دسترس رکھتے ہوں ان کے لیے نادر موقع ہے۔ تقریبِ عروسی میں ترنم سے سہرا پڑھنے والوں کو ترجیح دی جائے گی، جز وقتی ملازمت پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔

انتباہ :- بعض ناہنجار مدیرانِ جرائد میری غزل شائع کئے بغیر مجھے رسالہ وی پی پی کردیتے ہیں ایسے غیر ذمہ دار مدیرانِ جرائد کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اس قبیح حرکت سے باز آجائیں اور آئندہ صرف وہ رسالہ وی پی پی کے ذریعہ بھیجیں جس میں میری غزل شامل ہو۔

دل گردہ بادی شاگرد حضرت جگر قلب آبادی

حال ساکن چیچو کی ملیاں ضلع شیخوپورہ۔

ایک نوجوان بیوہ کی ضرورت ہے :- " ایک ایسی بیوہ یا مطلقہ نوجوان خاتون کی ضرورت ہے جو بڑھاپے کی طرف علالت میں ہمارے پیارے ابّو کی نگہداشت کرسکے۔ ابّو کے چار شادی شدہ بیٹے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں لیکن دوسرے قومی کاموں کی وجہ سے انھیں یا ان کی بیگمات کو ابّو کو دیکھنے کی فرصت نہیں۔ ابّو کی رہائش کے لیے الگ کمرہ مہیا ہے۔ اور اس میں سہولت کی سب چیزیں دستیاب ہیں مہمانوں کی آمد سے ابّو کی کھانسی میں مزاحمت نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ ابّو نے اپنی تمام جائیداد اپنے پیارے بچوں کے نام منتقل کردی ہے۔ خاتون اگر ابّو سے عقد کرنے کی خواہشمند ہوں تو ابّو کے فرمانبردار بچوں کو اس پر کوئی

اعتراض نہ ہوگا۔"

اراضی برائے فروخت:- "ملتان روڈ پر برلب سڑک چار کنال کا ایک قطعہ اراضی فروخت کے لیے موجود ہے۔ اس قطعے پر کسی زمانے میں قبرستان آباد تھا۔ پھر یہاں سبزیاں اگانے کا کام شروع کیا گیا۔ آخر میں نواحی فیشن ایبل بستیوں کو اینٹیں فراہم کرنے کے لیے بھٹہ لگایا گیا۔ جس سے زمین ذرا اونچی نیچی ہوگئی، اطراف وجوانب کے فلم اسٹوڈیوز کا گندہ پانی اس نشیب کی طرف بہنے لگا اور اب یہ قطعہ صورتِ تالاب نظر آتا ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ فروغِ امراض کے لیے یہاں مچھروں اور مکھیوں کا ایک فارم قائم کیا جا سکتا ہے۔ ملیریا اور ہیضے کے جراثیم کی افزائش بھی کی جا سکتی ہے۔ ادویات سازی کے اداروں کے لیے نادر موقعہ ہے۔ یک مشت ادائیگی پر اراضی کا قبضہ فوری طور پر دے دیا جائے گا۔ ضرورت مند اصحاب براہِ راست رابطہ قائم کریں اور پراپرٹی ڈیلروں کے نرغے میں نہ آئیں۔"

گم شدہ پالتو:- ہمارا پیارا پالتو اچانک پُراسرار طور پر غائب ہوگیا ہے۔ پرسوں شام جب ہم ٹی ہاؤس میں "سگنا" سُنا رہے تھے تو وہ باہر پان والے کے پاس ایک دیسی کتیا کے ساتھ کورٹ شپ کرتا دیکھا گیا۔ ہمارے ایک شناسا نے اسے سرزنش کی اور برسرِ عام کورٹ شپ سے منع کیا جس پر پیارا پالتو ناراض ہوگیا اور ہم سے مشورہ کئے بغیر کہیں چلا گیا۔ جس کسی کو ملے ہمیں اطلاع دے۔ ہمارا ٹیلیفون نمبر ۵۵۵۵۵۵ ہے۔ پیارا پالتو اگر خود پڑھے تو بلاخوف وخطر واپس آجائے۔ اسے اور اس کی محبوبہ کو کچھ نہیں کہا جائے گا۔

عاق نامہ:- میرے بیٹے مسمّی بے کار خان بیکار نے پابند شاعری سے منہ موڑ کر نثری نظمیں لکھنا شروع کردی ہیں۔ اور اپنی سابقہ تمام تصانیف سے دستبرداری کا اعلان کردیا ہے۔ اِس لیے میں اسے اپنی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ مسمّی بیکار خان سے لین دین کرنے والا نتائج کا خود ذمہ دار ہوگا۔

ایک ٹیوٹر کی ضرورت ہے:- ہمیں اپنے بیٹے غبی ابجد کے لیے جو ایف ایس سی سکنڈ ایئر کا طالب علم ہے ایک ایسے ٹیوٹر کی ضرورت ہے جو اسے امتحان ایف ایس سی میں سات سو کے لگ بھگ نمبر دلا سکے۔ غبی ابجد نے گزشتہ دو سالوں کے دوران غیر نصابی سرگرمیوں میں سرگرم حصہ لیا ہے۔ اس لیے امتحان کے لئے تیاری نہیں کرسکا۔ ٹیوٹر کے لیے کمرۂ امتحان میں نقل کا اہتمام، نگران عملہ سے رابطہ، اور ممتحنوں تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔ نقل وحرکت کے لیے کار اور خرچ اخراجات کے لیے چیک بک ٹیوٹر صاحب کی دسترس میں رہے گی۔ اس خدمت کے لیے بالمقطع ٹھیکہ پر بھی غور کیا جا سکتا ہے۔

کار برائے فروخت:- ماڈل ۱۹۷۷ء کی ٹیوٹا کار "جہاں اور جیسی حالت" کی شرائط پر فروخت کے لیے موجود ہے۔ یہ کار بقائمی ہوش وحواس مال روڈ پر دفتر ادبی دنیا کے سامنے کھڑی تھی کہ یونیورسٹی کے چند طالب علموں کو پسند آگئی۔ اور وہ اسے لے کر چہل قدمی کے لیے گلبرگ کی طرف نکل گئے، راستے میں ایک بدقماش درخت نے روکنے کی کوشش کی، جس سے گاڑی کے معصوم انجن کو چوٹیں آئیں اور جسم مجروح ہوگیا۔ نتیجتاً نوجوان طلبہ اسے لاوارث چھوڑ کر روپوش ہوگئے۔ انجن کے علاوہ باقی سب پرزے درست ہیں۔ کار کو کھینچنے کے لیے بیل گاڑی کی خدمات دستیاب ہیں۔ ٹائر ٹیوب ڈالنے کی ضرورت بھی ہے۔

ماہر سیاست کی ضرورت:- ایک ایسے ماہر سیاست کی ضرورت ہے جو ہمارے اُمیدوار اسمبلی کے لیے تقریریں لکھ سکے۔ جلسے جلوسوں اور سامعین کا اہتمام کر سکے۔ نعرے لگانے، تالیاں پیٹنے اور حسبِ ضرورت مخالفین پر خشت باری اور دشنام طرازی میں مہارت رکھتے ہوں۔ ایسے امیدوار کو جو پولیس سے تعلقات استوار کرنے اور خفیہ فنڈ سے رقوم فراہم کرنے کے طریقے جانتے ہوں ترجیح دی جائے گی۔ وزارت ملنے پر منتخب اُمیدوار کو خبر کا عہدہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔

ضرورت ہے ایک کاتب کی:- ہمیں اپنے ماہنامہ "جادوگر بالما" کے لیے ایک ایسے کاتب کی ضرورت ہے جو خود بھی شاعر ہو اور نئے لکھنے والوں کے مضامین سے صرف نحو، عروض اور املا کی اغلاط درست کر سکے۔ ہم ادبا کے مضامین معاوضہ لے کر شائع کرتے ہیں۔ کاتب کو وصول شدہ معاوضہ کا پندرہ فیصد کمیشن دیا جائے گا جو خاصہ معقول ہے۔ سرورق پر کاتب کا نام شائع ہوگا اور اس کی قیمت وصول نہیں کی جائے گی۔ عینک لگانے والے کاتب درخواستیں بھیجنے کی زحمت گوارا نہ کریں۔

خالد عرفان
(کراچی)

ہوٹلوں میں شاعری

ہوٹلوں میں شاعروں کا شور کرنا عام ہے
غیر شاعر کو یہاں بھی بور کرنا عام ہے

ہوٹلوں میں خدمتِ شعر و سخن ہونے لگی
سطح ناہموار پر تعمیرِ فن ہونے لگی

ہوٹلوں میں شب گذاری شاملِ آداب ہے
شاعرِ کل وقت کا یہ پارٹ ٹائم جاب ہے

میں یہاں آیا ہوا ہوں اک ضروری کام سے
ایک مصرعہ ذہن میں اٹکا ہوا ہے شام سے

ہوگیا کل ایک ہوٹل میں ہمارا بھی گزر
اور ہم آدابِ محفل سے مکمل بے خبر

لوگ سمجھے میں غزل اپنی سُنانے آگیا
اپنا لیٹر پوسٹ کرنے ڈاک خانے آگیا

میزبان فن کار مجھ کو ویلکم کہنے لگے
آج کی محفل کا صدرِ محترم کہنے لگے

کیا خبر تھی رات اتنی مختصر ہو جائے گی
ایک ہی شاعر سے ملنے میں سحر ہو جائے گی

چاہتے سب تھے کہ یہ مُرغا ہمارے پاس آئے
وہ سمجھ بیٹھے تھے گویا مجھ کو قربانی کی گائے

میں بہ مجبوری ادب کے اس گڑھے میں دھنس گیا
چند شاعر خوش ہوئے لو ایک سامع پھنس گیا

حاضرینِ بزم میں کچھ برہمی ہونے لگی
شاعروں کے درمیاں سامع کشی ہونے لگی

ایک صاحب تو بہت ہی خوش مزاجی سے ملے
تاکہ وہ جاری کریں شعر و سخن کے سلسلے

اپنے پہلو میں مجھے تشریف رکھنے کو کہا
پھر مخاطب ہوگیا مجھ سے ادب کا اژدہا

آپ اس محفل میں آئے ہیں تو کچھ کھائیں حضور
چائے بسکٹ پان کافی شوق فرمائیں حضور

آپ بسکٹ لیجئے نمکین لینا فرض ہے
میں نے جب بسکٹ لیا بولے کہ مطلع عرض ہے

ہوگئے اسٹارٹ پھر وہ مطلع فرمانے کے بعد
اک ترے آنے سے پہلے، اک ترے جانے کے بعد

وہ مری نازک سماعت پر ستم ڈھاتے رہے
شعر کے جوڈو کراٹے مجھ پہ برساتے رہے

ہم بطورِ داد اُن کے شعر دہراتے رہے
شاعرِ شیریں بیاں کا ہم نمک کھاتے رہے

بوریت سے آگئے تھے میری پیشانی پہ بَل
اور وہ بھُگتا رہے تھے اپنی پندرھویں غزل

با ترنم جب وہ ہوٹل کی فضا پر چھا گئے
داد دینے کے لیے ہوٹل کے بیرے آگئے

سب ذخیرہ کر چکے جب ختم وہ استاذِ فن
پیٹ میں میرے بھی پھر ہونے لگا دردِ سخن

بولے کچھ تم بھی سُناؤ شاعرِ دامن تہی
گر نہیں تازہ غزل کوئی رُباعی ہی سہی

وقت کافی ہو چکا ہے آپ جلدی کیجئے
میں نے جب مطلع پڑھا، بولے اجازت دیجئے

وجاہت علی سندیلوی

جشنِ بہاراں کی رسمِ اجرا

بات کچھ بھی نہیں تھی لیکن وہ بتنگڑ محض اس لیے بن گئی
تھی کہ اس میں ہمارے دوست حسن طاہر قاضی
جو اپنے آپ کو ایچ، ٹی، قاضی اور ہم
سب ان کے دوست انہیں
ہیٹ ٹرک قاضی
کہتے، کسی جملہ
معترضہ کی طرح گھس پڑے
تھے۔ اُن پر کچھ ترمیم کے ساتھ
غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے ؎

گرمی سہی مزاج میں لیکن نہ اس قدر
کی بات جو بھی اُس میں حماقت ضرور کی!

ہمارے دوست گلشن پرشاد گلشن کا مجموعہ غزلیات 'جشنِ بہاراں'
صدر اُردو اکیڈمی کی عنایت اور اکیڈمی
کی اعانت سے شائع ہوا
تو اتنا تو گلشن
صاحب اور ہم
اس کے مقدمہ نگار بھی
جانتے ہیں کہ اس مجموعے کی اشاعت
سے ہم دونوں کے مکانوں کے آگے پھکورا
الانے میں کوئی آگ نہیں لگ جائے گی' دو معلم الملکوت
نسم کے جگادری نقادوں اور اُن کے قبیلوں کے
درمیان اردو شاعری کے اظہار و ابلاغ کے متعلق
پانچ سال سے جو قلمی جنگ چھڑی ہوئی ہے
وہ بند نہیں ہو جائے گی یا ہمارے
محقق دوست علامہ
حوادث بیگپوری
اردو شاعری
کو کھنگال کرانے پسندیدہ
ساڑھے چار شاعروں کی جو فہرست
بنائے پھرتے ہیں اس میں بیچارے گلشن صاحب
کا نام نہیں شامل ہو جائے گا، لیکن اس کے باوجود ہمیں
اپنے علم دوست اور ادب نواز قصبے کے اربابِ ذوق سے
ایسی کبھی تنگ دلی بلکہ سنگدلی کی اُمید نہیں تھی کہ
وہ اس کا ایک سرے سے کوئی نوٹس
ہی نہیں لیں گے جیسے کچھ ہوا
ہی نہ ہو۔ اور کسی
گوشے سے 'واہ'
نہ سہی 'آہ' کی بھی صدا سنائی
نہیں دے گی۔ گویا سانپ سونگھ گیا ہو
سب کو ــــ گلشن صاحب بیچارے اپنے
مجموعے کی پچیس تیس جلدوں پر بہت خوشخط 'عقیدت اور
احترام کے ساتھ خزاں رسیدہ گلشن کی جانب سے فلاں صاحب

کی نذر لکھ کر پورے قصبے کے ہر اُس فلاں صاحب جس کا کوئی تخلص تھا، کی خدمت میں خود جا کر ایک ایک جلد پیش کرائے تھے لیکن کسی بھی فلاں صاحب کو ٹھیک سے شکریہ ادا کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔ بلکہ گلشن صاحب کی روایت کے بموجب بعض حضرات نے تو کتاب کھول کر دیکھی بھی نہیں بلکہ اُسے صرف سونگھ کر اپنے سے دور ایسے رکھ دیا جیسے اس میں کوئی قابل دست اندازیٔ پولس والی چیز چھپی ہونے کا اندیشہ ہو۔

مانا کہ کسی ہمعصر کی تعریف کرنے کو اکثر لوگ کم ظرفی سمجھتے ہیں لیکن آخر اُس ہیں کیڑے نکال لینے سے انھیں کس نے روکا تھا۔ کچھ نہیں تو جشنِ بہاراں کے لیے یہی کہہ دیا جاتا کہ یہ ایک تیسرے درجے کے شاعر کا چوتھے درجے کا کلام ہے جس پر ایک پانچویں درجے کے مقدمہ نگار نے ایسا واہیات مقدمہ لکھا ہے کہ خود اس پر مقدمہ چلا دیا جانا چاہیئے۔ کچھ غزلوں کو خارج از بحر قرار دیا جاتا، کچھ ترکیبوں کو غلط اور کچھ بندشوں کو ڈھیلی بتا دیا جاتا، کہیں الف کے گرنے اور کہیں عین کے دبنے کی شکایت کر دی جاتی، کسی شعر پر سرقہ یا پھر سرقے میں توارد کا الزام لگا دیا جاتا، کوئی تنافرِ لفظی یا شکست ناروا ہی پکڑلی جاتی تو بھی مجموعے کے مصنف اور ۔۔۔نگار کے بہت کچھ آنسو ڈھل جاتے۔ وہ آپس میں کچھ اس قسم کی باتیں کرکے کہ ہوتا آیا ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں، قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند جوہری، بندر کیا جانے سونٹھ کا مزا، شہرت شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنے اپنے دلوں کو بہلا لیتے۔ بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کے مصداق یہ تسلی بھی کم نہیں تھی کہ ہماری تخلیق کے وجود کو کسی نہ کسی طور سے تسلیم تو کیا گیا اور لاکھ ڈنڈی ماردی گئی ہو ۔۔۔ اور وہ کب نہیں ماری جاتی، اُسے نقد و نظر کے ترازو پر تولنے کے لائق تو سمجھا گیا لیکن یہاں تو خاموشی تھی، سناٹا تھا، ہُو کا عالم تھا۔ قبرستان کا نہیں، قبر کے اندر کا اور بقول شخصے کوئی گھاس ڈالنے کا بھی روادار نہیں تھا۔

ہمارے لیے ذاتی طور سے قصبے میں ادب کے ٹھیکہ داروں کی بے رُخی کی یہ صورتِ حال ایک طرح سے اور بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ اور وہ یوں کہ ہم دیکھتے کہ خود گلشن صاحب اس پر نہ صرف شاکر بلکہ کچھ اس انداز سے مطمئن نظر آتے جیسے وہ کسی محفل میں اپنے ساتھ کوئی کیچڑ میں لت پت کتا لے آئے ہوں اور استقبال تو دور رہا وہ اِسی کو بہت غنیمت سمجھتے ہوں کہ کسی نے اُن پر نظر نہیں ڈالی اور کوئی اُن کو اور اُن کے کتے کو نکالنے کے لیے اُن کے پیچھے نہیں دوڑا۔ انھیں کچھ تو لحاظ چاہیئے تھا ہمارے مقدمے کا جو اُن کی تصنیف سے زیادہ عرق ریزی سے لکھا گیا تھا۔ اور انھیں کبھی تو ہمارے ساتھ اہالیانِ قصبہ کی بے اعتنائی کے شکوے میں شریک ہونا چاہیئے تھا۔ مگر اُن کی موٹی کھال پر کسی موسم کا کوئی اثر نہ تھا۔

ایک روز سویرے ہوا خوری میں ہیڈ ٹرک قاضی مل گئے اور ہماری جو شامت آئی تو ہم نے اپنا دردِ دل اُن سے بیان کر دیا۔ کچھ دیر خاموش اور سر ہلاتے رہے اور ہمیں توقع ہوئی کہ اب شاید وہ کوئی سنجیدہ مشورہ دیں لیکن اُنھوں نے ایک بالکل غیر متوقع سوال داغ دیا: "آپ کے جشنِ بہاراں کی رسمِ اجرا کس منتری نے کی تھی"؟ اور جب ہم نے جواب دیا کہ رسمِ اجرا ہی نہیں ہوئی تو اُلٹے ہم سے خفا ہو گئے "جب تک رسمِ اجرا نہیں ہوتی کوئی صاحبِ ذوق کسی کتاب کا نوٹس نہیں لیتا۔ میں خود شادی اور ناجائز تعلقات کے درمیان دعوتِ ولیمہ کو حدِ فاصل سمجھتا ہوں"۔

ہم نے جھنجھلا کر پوچھا "اور دیوانِ غالب کی رسمِ اجرا کب ہوئی تھی؟" قاضی نے ایسے خوش ہو کر جیسے خود ہم نے اُن کے دعوے کی دلیل پیش کر دی ہو جواب دیا: "تبھی تو آج تک کسی اکیڈیمی نے اُس پر کوئی انعام نہیں دیا"۔

اب ہمارے ہاں یہ آگیا کہ قاضی بی۔ اے کے امتحان میں تین مرتبہ علاحدہ علاحدہ تین مضامین میں کیوں فیل ہوئے تھے اور اُن کا نام ہیٹ ٹرک قاضی کیوں پڑا تھا۔ قاضی نے ہماری خاموشی کو ہماری جہالت پر محمول کیا اور اُسے دور کرنے کی کوشش میں بولے "برادرم آج کل کتاب لکھنا اور چھپوانا اتنا ضروری نہیں ہے جتنا کہ اس کی رسم اجرا کرنا۔ کسی کتاب کا دوسرا اڈیشن چھپتے کم دیکھا ہے لیکن ایک ہی کتاب کی دو دو تین تین بار رسوم اجرا میں شرکت کا اکثر موقع ملا ہے۔ فتنہ صاحب مسکین کی کتاب ابھی پریس ہی میں تھی کہ تضا کار اُن کے قصبے میں ایک منتری جی کسی اسکول کی لائبریری کا اُدگھاٹن کرنے آگئے۔ انھوں نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور اپنے دھوبی سے حساب کی کاپی ہی کو لپکے کو ٹے لگے ایک جزدان، میں لپیٹ کر رسم اجرا کا فرض پورا کر دیا اور پھر جب کتاب چھپی تو جھک مار کر اکیڈیمی والوں کو بھی اُسے انعام دینا پڑا۔ ابھی یہاں تک ہوا ہے کہ رسم اجرا کے بعد پھر کتاب کی اشاعت کی ضرورت ہی نہیں سمجھی گئی جیسے ہمارے قصبے میں تین منتری تین مرتبہ آکر آنکھوں کے اسپتال کا سنگ بنیاد رکھ چکے ہیں لیکن آج تک اسپتال بننے کی نوبت نہیں آئی۔"

ہم قاضی کی اس قسم کی گفتگو پر سوائے خاموش رہنے کے اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ ذرا دم لے کر قاضی پھر بولے "خیر رسم اجرا تو اب بھی ہو سکتی ہے۔"

"لیکن رسم اجرا میں خرچ ہوگا پیسہ اور گلشن صاحب جشن بہاراں کو چھپوا کر ہی اپنے اثاثے پر بجلی گرا چکے ہیں" ہم نے دبی زبان سے عرض کیا۔

"میاں! دوست آخر کس مرض کی دوا ہوتے ہیں۔" اور پھر قاضی نے اپنا سینہ ٹھونک کر کہا "رسم اجرا کے سب اخراجات میں برداشت کروں گا۔ دیکھنا کیسے دھاکڑ منتری کو لا کر کتاب کا فیتہ کٹواؤں گا کہ اغیار کے سینوں پر چھری چل جائے گی۔"

اب مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہا "تو کیا اب ادبی تقریبوں کے لیے بھی سیاسی پہلوانوں کی سرپرستی ناگزیر ہو گئی ہے۔ رسم اجرا کے لیے لائیے تو کوئی پروفیسر لائیے، نقاد لائیے اور کچھ نہیں تو کوئی شاعر یا ادیب ہی لائیے"

کچھ اور زیادہ بقراط بن کر قاضی نے کہا "آپ ان سیاسی پہلوانوں کو سمجھتے کیا ہیں کالجوں اور یونیورسٹی کی تقرری میں، اکیڈمیوں کے ممبروں کی نامزدگی میں، اداروں کے انعامات کی تقسیم میں، امتحانوں کے نتائج میں حتیٰ کہ رسالوں میں مضامین کی اشاعت میں شاعروں اور سیناروں کے دعوت ناموں میں غرض کہ ہر طوطی خانے میں ان کے ٹیلیفون کی گھنٹی کا نقارہ بج رہا ہے۔ آپ سیاسی داؤ پیچ سے بچ کر جائیے گا کہاں، جدھر دیکھیے منصور کے پردے میں خدا بول رہا ہے۔"

گھر واپس آکر میں نے ہیٹ ٹرک قاضی کے منصوبے کا تذکرہ گلشن پرشاد سے کیا تو وہ کانپنے اور بکلانے لگے "یہ کیا غضب کیا آپ نے۔ بخشو بی بی چوہا لنڈورا ہی بھلا! سوتے کتوں کو جگانا کون سی عقلمندی یا کارنواب ہے۔ قاضی کو سب جانتے ہیں اُس سے تو کوئی کچھ نہ کہے گا لیکن میں نقص امن کے سلسلے میں جیل بھیج دیا جاؤں گا۔"

گلشن پرشاد کی اکیلے قاضی کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوتی لہذا میں نے بہت شیر، چیتا بنا کر جمن خان کو جو روزنامہ "سرکاری آواز" کے غیر سرکاری نامہ نگار ہیں اُن کے ساتھ کر دیا۔ پورے پانچ گھنٹوں کے بعد یہ دونوں ہلدر جہ نڈھال واپس آئے جیسے کسی اکھاڑے میں کشتی لڑ کر لوٹے ہوں۔ گلشن میں بولنے کی سکت نہیں تھی وہ

آکر صرف صوفے پر گر پڑے۔ جمن خان نے اپنا منہ میرے کان کے پاس لاکر بڑی رازداری سے بتایا "رسم اجرا
نے معاف کردی لیکن اس کی خبر اخبار میں چھپے گی۔"

پندرہ روز بعد جشن بہاراں کی رسم اجرائی خبر "سرکاری آواز" کے پہلے صفحے پر بڑی آب تاب سے شائع ہوئی
ان رسمی باتوں کے علاوہ کہ ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے جشن بہاراں زند
اور حضرت گلشن زندہ باد کے نعرے لگائے جا رہے تھے اور رسم اجرا کمیٹی نے معزز مہمانوں کی پرتکلف
ضیافت کی وغیرہ وغیرہ، یاران نکتہ داں کے لیے اس خبر کے خاص اجزا تین تھے۔

۱۔ مکھ منتری اس جلسے کی صدارت کرنے والے تھے لیکن انھیں کسی ضروری کام سے عین وقت پر د
جانا پڑ گیا لہٰذا جلسے کی صدارت حسین طاہر قاضی نے کی۔

۲۔ ملک کے کئی نامور محقق اور نقاد جلسے میں موجود تھے اور سب نے متفقہ طور پر جشن بہاراں
دنیائے شاعری میں ایک گراں قدر اضافہ بتایا۔ کسی محقق یا نقاد کا نام بتانے کی ضرورت نہیں سمجھ
گئی تھی۔

۳۔ قصبے کے جملہ قابل ذکر شاعر اور ادیب جلسے میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ شریک تھے اور یا
یار جناب قاضی اور حضرت گلشن کی گلپوشی کر رہے تھے۔

'قابل ذکر' کے ٹکڑے نے وہی کیا جس کے لیے وہ استعمال کیا گیا تھا یعنی قصبے کے ادبی ہوس میں ایک
سے آگ لگ گئی۔ قصبے کے جو شاعر اور ادیب اب تک کانوں میں تیل ڈالے بیٹھے تھے وہ اپنے آپ کو ناقابل ذ
سمجھے جانے پر ایک دم سے ہڑبڑا کر جاگ پڑے اور انھوں نے اپنی توپوں کے دہانے جشن بہاراں اور حضرت گلشن
کھول دیئے اور ہر طرف شعلے بھڑک اٹھے۔

بالآخر ہوا یہ کہ جشن بہاراں کی جتنی جلدیں کتب فروشوں کے یہاں تھیں اُن کو نذر آتش کرنے کے لیے
شاعر اور ادیب خرید لے گئے جو مفروضہ رسم اجرا میں بلائے نہیں گئے تھے۔ اس کی رسم اجرا سے چونکہ مکھ منتر
کا نام کسی نہ کسی طرح سے منسوب تھا لہٰذا ریاستی اردو اکیڈمی نے اپنی تابناک روایت کے بموجب جشن بہاراں
شاعری سے متعلق اپنے سب سے بڑے انعام سے نوازا۔ گلشن صاحب اب قصبے کی کسی تقریب یا مشاعر
میں بلائے نہیں جاتے ہیں اور سربازار ہوٹنگ کے ڈر سے وہ قصبے کے اندر کی سڑکوں کے بجائے اس کے
کھیتوں کی پگڈنڈیوں سے ہو کر اپنے دفتر جاتے ہیں۔ ▲

نریندر لوتھر

دُنیا کا آخری مُلک

سفرنامہ امریکہ کی ایک قسط

ہم امریکہ علاج کروانے گئے تھے۔ سیر و سیاحت کے لیئے نہیں۔ لیکن ہم اکثر اپنی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ پھر ہم شام تک گھر واپس آجاتے ہیں، اس لیے پُرانے محاورے کے تحت ہمارا قصور معاف کر دیا جاتا ہے اور پھر سیر و سیاحت تو ایسی چیز ہے کہ خود بخود ہی ہو جاتی ہے۔

ہمارا ارادہ سفرنامہ لکھنے کا نہیں تھا۔ ہم بارہا کئی ممالک گئے ہیں لیکن کیا مجال کہ کسی کے بارے میں کبھی کچھ لکھا ہو۔ آج تک بیرونی سفروں کے دوران جو کچھ بھی ہم نے دیکھا یا بھالا یا پایا، وہ ہمارے اور اُس مُلک کے درمیان باہمی راز ہی رہا۔ اب تک ہم ایسے رازوں کو اپنے سینے میں چھپائے پھرتے رہے لیکن امریکہ میں علاج کے دوران ہمارا سینہ چاک کر دیا گیا اور اس طرح کئی راز فارش ہو کر باہر آگئے۔ علاج کے بعد زخموں کی وجہ سے سینہ میں راز رکھنا آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے ہمارے لیئے اور کوئی چارہ نہیں تھا سوائے اس کے کہ ہم نے امریکہ میں جو کچھ دیکھا، سُنا، محسوس کیا اُس سے آپ کو بھی واقف کروادیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان رازوں کو اپنے سینے کے لاکروں میں محفوظ رکھیں۔ ہمیں جب بھی ضرورت پڑے گی آپ سے پُوچھ لیں گے۔

ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ ہمارے مشاہدات موسم سرما میں کیے گئے سفر پر مبنی ہیں مکمل تصویر کے لیے ہمیں گرمیوں کے کچھ دن بھی امریکہ میں گزارنے چاہئیں تھے۔ سردیوں میں لوگ گھروں کے اندر رہتے ہیں، شہر اور پارک اور دریا اور نہریں برف کی چادر کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں دبکے رہتے ہیں۔ ہمیں ان سے ملنے کے لیے لوگوں کے گھروں اور پرندوں کے گھونسلوں میں جانا پڑا۔ لیکن مریض کو بیماری پر اور مسافر کو وقتِ سفر پر کوئی اختیار نہیں۔ اگر آپ کو ان مضامین میں کچھ سردی لگے تو گزارش ہے کہ پڑھنے سے پہلے انہیں تھوڑا گرم کر لیں یا کمرے میں ہیٹر جلا کر پڑھیں۔ پڑھنے کے بعد کتاب کو کسی خشک اور گرم جگہ رکھیں۔ گرمیوں میں یہ کتاب ٹھنڈک پہنچائے گی۔

امریکہ میں گو قدرتی نظارے کافی ہیں لیکن تاریخی مقامات کی مقابلتاً کمی ہے۔ کھنڈرات دیکھنے کے لیے وہاں

ی بوڑھی عورتوں سے ملاقات پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکہ کو دریافت کئے ہوئے صرف چار سو سال ہی تو ہوئے ہیں اور ایک آزاد ملک کی حیثیت سے امریکہ کی عمر صرف دو سو سال ہے۔ ایک ملک اور قوم کی تاریخ میں دو سو سال کوئی زیادہ عرصہ نہیں۔ اس لیے اکثر یورپی قومیں امریکہ کو ایک نابالغ قوم مانتی ہیں۔ اور انہیں اُجڈ اور جاہل کہہ کر چڑاتی ہیں۔۔۔ کلیمینسو (CLEMENCEAU) جیسے سیاست داں نے کہا تھا کہ امریکہ وہ ملک ہے جو تہذیب کے درمیانی دور سے گزرے بغیر جہالت سے سیدھا تنزل کے قرن میں پہنچ گیا ہے۔ پچھلی صدی کے بیشتر یورپی سیاحوں اور مبصروں نے امریکنوں کی خوامخواہ تھوکنے کی عادت پر طعنے کسے ہیں۔ شاید ہمارے وہاں جانے تک اُن کا تھوک ختم ہو چکا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم نے کسی امریکن کو خواہ مخواہ تو کیا بہ وقت ضرورت بھی تھوکتے نہیں دیکھا۔ جارج برناڈ شا نے ایک بار کسی کو بتایا تھا کہ بے شک یہ سچ ہے کہ مجھے کئی لوگوں نے امریکہ آنے کی دعوت دی ہے لیکن آپ انہیں میرے دوست کیوں کہتے ہیں!

امریکہ نے پہلی عالمی جنگ میں انگریزوں کی مدد کر کے اپنی طاقت کا لوہا منوایا۔ دوسری عالمی جنگ میں جرمنی اور جاپان کو مات دے کر اپنی "بہادری کا بم" منوایا۔ جب جرمنی اور جاپان ٹھنڈے پڑ گئے تو امریکہ کو ٹھنڈی جنگ کا آئیڈیا آیا۔ اس کے لیے روس سامنے آیا اور آج کل ان دونوں سورماؤں میں ٹھنڈی جنگ کا اہتمام ہے۔ ٹھنڈی جنگ کا مطلب بدکلامی اور گالی گلوج ہے یا کبھی کبھی اپنے چھوٹوں کو لڑانا ہوتا ہے۔ آپس میں ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آنے دی جاتی کہ یہ رئیس لوگوں اور ملکوں کا کام نہیں۔

اس کے باوجود یا شاید اسی وجہ سے یورپین لوگ اُنھیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اُن کو نو دولتیے سمجھتے ہیں۔ فرانسس ٹرالوپ کی شکایت (FRANCES TROLLOPE) ہے کہ کوئی امریکن ڈالر کے لفظ کے بغیر ایک فقرہ نہیں بول سکتا۔ یہ سچ ہے کہ ہندوستان تو کیا یورپ کے مقابلے میں بھی امریکہ کا تہذیبی ورثہ بہت کم ہے لیکن اس میں بے چارے امریکنوں کا کیا قصور ہے؟ کیا یہ کم ہے کہ دو صدیوں کے اندر وہ ایک کالونی سے دنیا کی سب سے زیادہ امیر اور طاقتور قوم بن گئے! امیر لوگوں کو دیکھ کر غریب لوگ حسد کرتے ہیں۔ یہی حال ملکوں کا بھی ہے۔ دنیا کے کچھ لوگ امریکہ سے رشک کرتے ہیں اور باقی کے حسد۔ امریکن بے چارے تاریخ، کلچر، تہذیب کی تلاش میں صحرا و بیاباں میں ہراساں پھرتے ہیں۔ ہندوستان بھی آتے ہیں۔ یہاں سے پرانی مورتیاں، آثارِ قدیمہ اور کئی قسم کی دستکاریاں خرید کے یا اسمگل کر کے لے جاتے ہیں۔ اس طرح وہ آہستہ آہستہ مہذب ہو رہے ہیں۔ ایسے معاملوں میں ہمیں ذرا صبر سے کام لینا چاہیئے۔ آخر یہ ایک آدھ شخص کے مہذب ہونے کا سوال نہیں، ایک پوری قوم کو ایک ایسا ورثہ سپلائی کرنا ہے جس پر وہ فخر کر سکے۔ حال ہی میں ہندوستان اور امریکہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا ہے جس کے تحت امریکہ ہندوستان کو سوپر کمپیوٹر دے گا اور اس کے بدلے ہندوستان امریکہ کو سوپر کلچر دے گا۔

امریکہ دنیا کے بیشتر پچھڑے ہوئے ملکوں کو مالی اور ہتھیاری 'ایڈ' دیتا ہے۔ جب کئی ملک صیغہ واحد کی 'ایڈ' سے مطمئن نہیں ہوے تو امریکہ نے 'ایڈس' دینا شروع کر دیا۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی جھگڑا ہو، تحریک آزادی ہو، انقلاب کی لہر ہو، رجعت پسندی کا ہنگامہ ہو، امریکن وہاں پہنچ جاتے ہیں بلکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ وہ وہاں پہلے ہی سے موجود ہوتے ہیں، اور بسا اوقات سب ہنگامے ان کی موجودگی کی وجہ سے ہی شروع ہوتے ہیں۔ ان حالات میں پہلے وہ ایک فریق کی مدد کرتے ہیں

پھر ثالث بن جاتے ہیں اور اگر کوئی اعتراض کرے تو دوسرے فریق کی مدد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح امریکن فوجوں کی پریکٹس جاری رہتی ہے اور وہ ہمیشہ 'فٹ' رہتی ہیں۔ امریکن فوجیں ہر گھڑی یا تو کسی ملک میں 'ورزش' کر رہی ہوتی ہیں یا حقیقی جنگ۔ دوسری فوجوں کی طرح وہ نکما بیٹھ کر مفت کا کھانا پسند نہیں کرتیں۔ اس طرح اُن کی سیر و سیاحت بھی ہو جاتی ہے امریکن لوگ کئی دوسرے لوگوں کی طرح کنجوس نہیں۔ وہ کشادہ نگاہ اور بڑے دل والے واقع ہوئے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے قول پر یقین رکھتے ہیں۔ "چین و عرب ہمارا، سارا جہاں ہمارا۔"

کئی لوگ امریکنوں کی خوشنودی، عالمی بھائی چارگی اور آفاقی نظریئے کو خواہ مخواہ شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس طرح امریکہ کے دُنیا کے غریب اور اُبھرتے ہوئے ملکوں کی بے لوث مدد کرنے کے نیک کام میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ امریکہ نے کوریا اور ویٹ نام میں کتنے سال اُن ملکوں کی مدد کی۔ ان کے نہ کہنے پر بھی وہ رُکے نہیں بلکہ ان کی مدد کرتے گئے۔ ویٹ نام کی تو انھوں نے خاص طور پر اتنی فراخ دلانہ مدد کی کہ وہ ملک جل کر خاک ہوگیا۔ اس کے بعد امریکہ نے اُس ملک کی تعمیرِ نَو میں مدد دی۔ امریکن حکومت کی دوستی بڑی پکّی ہے۔ ایران میں شاہ کی منیلا میں مارکوس کی اور کئی دوسرے ملکوں کے سربراہوں کی اُس نے ہر اچھے موقع پر مدد کی۔ جب وہاں کے عوام نے اپنے آقاؤں کو ملک بدر کر دیا تو امریکہ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا کیونکہ امریکہ ایک جمہوری ملک ہے اور جمہوریت میں آوازِ خلق کو نقّارہِ خدا سمجھا جاتا ہے۔

امریکہ کی خارجی پالیسی میں اندھیر بھی ہے اور دیر بھی۔ چین کے ساتھ اُس نے تیس سال تک بات نہیں کی اُس کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ پھر ایک دن اچانک اعلان کر دیا کہ چین تو ایک ٹھوس حقیقت ہے اُس سے کون مُنکر ہو سکتا ہے؟ اس طرح بے چارے چین کی پیدائش، اُس کے وجود میں آنے کے تیس سال بعد رجسٹر ہوئی۔ اِسی لیے کئی غریب اور غلام لوگ عافیت اِسی میں سمجھتے ہیں کہ امریکہ سے اجازت لے کر وجود میں آئیں تاکہ انہیں اپنے آپ کو تسلیم کروانے خواہ مخواہ انتظار نہ کرنا پڑے ویسے عموماً امریکہ نئے ملکوں کی پیدائش کے وقت خود ہی وہاں موجود ہوتا ہے تاکہ زچگی میں ... کر سکے۔

امریکہ ایک جمہوری مملکت ہے ... دُنیا کے اُس خطے میں غالباً یہ واحد جمہوریت ہے جو ہر طرف سے ڈکٹیٹر شپوں سے گھری ہوئی ہے۔ لیکن امریکہ کے جمہوری دستور میں آج تک کوئی خلل اندازی نہیں ہوئی۔ وہاں ہر بات کا فیصلہ ہر مسئلہ کا حل جمہوری طریقے سے ہوتا ہے۔ وہاں شخصی آزادی بہت مستحکم ہے۔ صحافت آزاد ہے۔ عدلیہ آزاد ہے۔ عورتیں آزاد ہیں، بچّے آزاد ہیں۔ وہاں والدین بچوں کا حکم مانتے ہیں اور اُن کے آگے کوئی بدتمیزی نہیں کرتے۔ وہاں پر اہم عہدہ الیکشن کے ذریعہ پُر کیا جاتا ہے، جج بھی چُنے جاتے ہیں۔

امریکہ اکیاون ریاستوں میں بٹا ہوا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اکیاون ریاستوں کے مِلنے سے امریکہ بنا۔ وہاں کی ریاستیں مرکز کے مقابلہ میں زیادہ وسیع دائرہ اختیار رکھتی ہیں۔ امریکن جھنڈے میں ہر ریاست ایک ستارے کے روپ میں نمایاں ہے۔ امریکن جھنڈا آسمان کا گریبان ہے جہاں اتنے چھوٹے رقبے میں اکیاون ستارے درخشاں ہیں۔ ایک دن اچانک امریکن حکومت نے محسوس کیا کہ چاند کے بغیر ستارے کسی کام کے نہیں۔ اس لیے اُس نے ایک انسان کو چاند پر بھیجا کہ اس کو امریکہ آنے کی دعوت دے۔ چاند کو گرین کارڈ دینے کی بھی پیشکش کی گئی لیکن چاند کی ماں (وہی بڑھیا جو چاند پر بیٹھی چرخہ کاتتی رہتی ہے) نہ مانی۔ لاچار آرم سٹرانگ خالی ہاتھ واپس آنے والا تھا کہ چاند نے اپنے کچھ ٹکڑے اُس کو بطور تحفہ دیئے کہ مہمان

کا خالی ہاتھ جانا اچھا نہیں لگتا۔ امریکی حکومت اتنی فراخدل ہے کہ انہوں نے ان چاند کے ٹکڑوں کو کئی ملکوں میں تقسیم کر دیئے۔ ایک چاند کا ٹکڑا، دلّی کے راشٹرپتی بھون میں پڑا ہوا ہے (ہماری مراد کسی شخص سے نہیں بلکہ اصلی چاند کے ٹکڑے سے ہے) ہم نے یہ ٹکڑا خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

امریکہ دنیا کا عجیب و امیر ملک ہے۔ اس میں دنیا کے ہر ملک اور خطّے سے لوگ آئے ہوئے ہیں اور ابھی تک آ رہے ہیں یہ دنیا کا واحد ملک ہے جس کے اصلی باسی باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے مقابلے میں تعداد میں بہت کم ہیں اور اُن کے مطیع ہیں پھر بھی یہ ملک آزاد کہلاتا ہے۔ حالانکہ اس ملک میں ہر زبان کے بولنے والے لوگ بستے ہیں لیکن یہاں کی قومی زبان انگریزی ہے۔ انگریزوں کی انگریزی سے تمیز رکھنے کے لیے امریکیوں نے کئی الفاظ کے معنی بدل دیئے ہیں اور جن الفاظ کے ساتھ یہ نہ کر پائے اُن کے ہجّے بدل دیئے۔ اب انگریز بھی یہاں انگریزی سیکھنے آتے ہیں۔

امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ اُسے دنیا بھر کے غریب ملکوں نے مل کر امیر بنایا ہے۔ یہ نیک کام وہ ابھی بھی کئے جا رہے ہیں۔ مثلاً ہم ہندوستان میں بے شمار پیسے خرچ کر کے ڈاکٹر، انجینئر، سائنسداں اور کئی قسم کے ماہر پیدا کرتے ہیں اور پھر انھیں دیوداسیوں کی طرح امریکہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔ اس طرح امریکہ کو بغیر کچھ خرچ کئے دنیا کے تمام کونوں سے ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان مل جاتے ہیں، ان کے بدلے میں امریکہ ان کے آبائی ملکوں کو ہتھیاروں کی مدد دیتا ہے تاکہ وہ آپس میں لڑ سکیں۔ کئی بار وہ اُن کو ڈالر بھی دیتا ہے اور اس طرح اُن کو اپنا مقروض اور احسان مند بنا کر رکھتا ہے۔ اگر اُن تمام لوگوں کی تعلیم پر خرچ کئے ہوئے پیسے کا حساب کیا جائے جو ہندوستان سے امریکہ گئے ہیں تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہندوستان نے امریکہ سے مدد لینے سے زیادہ اس کو مدد دی ہے۔ اس کے باوجود بھی امریکہ بارہا اپنے اکسپرٹ ہماری رہنمائی کے لیے بھیجتا ہے۔ یہ اکسپرٹ یہاں آکر بہت کچھ سیکھ جاتے ہیں اور پھر اور بھی بڑے اکسپرٹ بن جاتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ نے سائنس کے ہر شعبے میں ترقی کی ہے۔ میڈیکل سائنس میں بھی امریکہ سب سے آگے ہے۔ دل، دماغ، جگر، گردہ ــــ اُردو کے تمام شاعروں کے تخلصوں کا آخری علاج امریکہ ہی میں ہوتا ہے۔ بیشتر لوگ اسپیشل علاج و معالجہ کے لیے امریکہ جا کر ہی مرتے ہیں ــــ

امریکہ ہر وقت ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس رہتا ہے۔ ہر روز نئے نئے قسم کے ہتھیار بناتا ہے۔ ایٹم بم بھی امریکہ ہی نے ایجاد کیا تھا۔ لیکن وہ تو اب بچوں کا کھیل بن گیا ہے۔ امریکہ ہر نئی جنگ میں نئے ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ نئی نسل کے نوجوان سپاہیوں کو پرانے اور بوسیدہ ہتھیاروں سے مارنا اتنے بڑے ملک کے شایانِ شان نہیں۔ امریکہ کے پہلے پریذیڈنٹ واشنگٹن نے کہا تھا کہ ہم جتنا جنگ کے لیے تیار ہوں گے، جنگ کا امکان اُتنا ہی کم ہوگا۔ ابھی تک امریکہ اسی پالیسی پر عمل کرتا آ رہا ہے۔ واشنگٹن نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم جتنا زیادہ کھانا کھانے کے لیے تیار ہوں گے، اُتنی ہی ہمیں کم بھوک لگے گی۔ اگر بالفرض کبھی تیسری عالمی جنگ ہو جائے تو امریکہ سب کو مار کر ہی مرے گا، اس طرح وہ دنیا کا آخری ملک ہوگا۔

لیکن فی الوقت تو امریکہ کو نئی دنیا کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی تمام ٹریفک کا رُخ اسی ملک کی طرف ہے۔ وہاں ہر قسم کا کام کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ عیش و عشرت کے تمام سامان وہاں دستیاب ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہمارے نوجوان ہوش سنبھالتے ہی ہوش کھو بیٹھتے ہیں اور امریکہ کا رُخ کرتے ہیں لیکن مزے کی بات تو یہ ہے کہ جونہی اُن کی اپنی اولاد

جوان ہونے لگتی ہے تو وہی نوجوان جو اب ادھیڑ عمر کے ہوگئے ہوتے ہیں فکر کرنے لگتے ہیں کہ ان کی اولاد کہیں خراب نہ ہو جائے ہاتھوں سے نہ نکل جائے۔ اس لیے وہ اپنی اولاد کو ہندوستان واپس بھیجنے کی سوچتے ہیں۔ ظاہر ہے امریکہ ممنوعہ لذّتوں کا ملک ہے۔ جو خود کے لیے تو جائز لگتی ہیں، لیکن اولاد کے لیے حرام قرار دی جاتی ہیں۔ اگر "برروئے زمین جنّت اور دوزخ آنجبا زو اند"؟ تو وہ امریکہ میں ہی ہیں، امریکہ میں ہی ہیں، امریکہ میں ہی ہیں۔

امریکہ میں بیماری پر اتنا قابو پالیا گیا ہے کہ موت بڑھاپے سے بھی ڈرنے لگی ہے۔ نتیجتاً وہاں بوڑھے لوگوں کی آبادی کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ اس سے کئی مسئلے پیدا ہوگئے ہیں جنھیں حل کرنے کی کئی کوششیں کی گئی ہیں۔ والدین جب زیادہ بوڑھے ہو جاتے ہیں تو اولاد پر بوجھ بن جاتے ہیں اور پھر وہ خود بھی اپنی دیکھ بھال نہیں کر پاتے۔ اس صورت حال سے نبٹنے کے لیے وہاں "بوڑھے گھر" بنائے گئے ہیں۔ ان گھروں میں بوڑھے لوگوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ والدین کے نظروں سے دُور ہونے سے ہوسکتا ہے کہ اولاد اُن کو بالکل ہی بھلا دے۔ اس لیئے سال میں ایک دن "یوم والدہ" اور ایک دن "یوم والد" منایا جاتا ہے۔ اس سے اولاد کو یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کی اولاد ہیں۔ اُس دن نوجوان گرہستی پولیس کی مدد سے اپنے بوڑھے والدین کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مل جائیں تو اُن کے لیے تحفے لے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ اپنے بچوں کے ساتھ اُن کا تعارف کرواتے ہیں۔ کئی نوجوان تو جذباتی ہو کر پورا دن اپنے بوڑھے والدین کے ساتھ ضائع کر دیتے ہیں ——— کچھ ناعاقبت اندیش جوڑے تو پورے دن کے لیے انہیں اپنے گھر لے آتے ہیں۔ فرض پورا ہونے کے بعد سال بھر کے لیے اُن کو چھٹکارا مل جاتا ہے۔

امریکہ کی ایک اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ساس بہو کا جھگڑا نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں ساس اور بہو کبھی ساتھ نہیں رہتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ہندوستانی عورت اپنے خاوند کو امریکہ جانے کے لیے اُکساتی ہے۔ یہ ساس سے بچنے کا قانونی، مہذب اور نہایت ہی فائدہ مند طریقہ ہے۔ لیکن اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ امریکن گھروں میں ساس کے تعلق سے جھگڑا نہیں ہوتا۔ وہاں ماں اپنے بیٹے کے پاس رہنے کی بجائے بیٹی کے پاس رہتی ہے۔ اس طرح جو تلخی ہمارے ہاں ساس اور بہو کے تعلقات میں ملتی ہے وہ وہاں ساس اور داماد کے درمیان پائی جاتی ہے۔ ہر ہندوستانی عورت کو امریکہ کا رواج پسند ہے اور ہر امریکن مرد کو ہندوستان کا۔ امریکہ میں مردوں کی اپنی ساسوں کے خلاف بے شمار شکائیتیں اور گلے ضرب المثل بن گئے ہیں امریکہ کے سابق وائس پریذیڈنٹ ہیوبرٹ ہمفری نے ۱۹۶۴ء میں ایک تقریر میں کہا تھا کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک حیران ساس ہوتی ہے۔ کینیتھ ڈاڈ کا دعویٰ ہے کہ "میں نے اپنی ساس سے پچھلے اٹھارہ سال سے کبھی بات نہیں کی کیوں کہ میں اس کی باتوں کے تسلسل کو توڑنا نہیں چاہتا۔" امریکن ایکٹر جان بیری مور کو شکایت تھی "میری بیوی اپنی ماں کے بغیر کہیں جاتی نہیں۔ اور اس کی ماں یہاں سے جاتی نہیں"۔ ایک اور مشہور شخص نے اعلان کیا تھا کہ میں اپنی ساس سے نفرت کرتا ہوں۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی تو مجھے بیوی نہ مل پاتی — اور یہ اُس سے نفرت کرنے کی دوسری وجہ ہے۔ ایک اور شخصیت نے صلاح دی ہے کہ ساس سے چھٹکارا پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ بیوی کو طلاق دے دی جائے۔ ایک دلبر خاوند نے اپنی بیوی کی خوشامد کرتے ہوئے اُس سے کہا کہ ڈارلنگ مجھے تو اپنی ساس سے زیادہ تمہاری ساس اچھی لگتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ساس کا لفظ ہی کچھ ایسا ہے کہ ہر رشتے کو خراب کر دیتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ خصلتاً انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ زیادہ دیر تک اِکٹھا نہیں رہ سکتا۔ باغ عدن میں انسان تنہا تھا۔ نہ میاں، نہ بیوی نہ ساس۔ نہ کوئی اور رشتہ دار

بچوں کی تو ابھی ٹیکنالوجی بھی دریافت نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے باغِ عدن کو جنت کہتے ہیں۔ وہ تو یوں ہوا کہ حوّا کو ایک پاگل سانپ ڈس گیا تھا جس کے زہر سے یہ سب رشتے پیدا ہوئے۔ اسی لیے اب ہر انسانی رشتہ زہر آلود ہے۔ مسموم ہے۔!

امریکیوں نے اپنے اپنے سماج میں کئی تبدیلیاں لائی ہیں۔ انہیں تجربے اور اختراعوں کا بہت شوق ہے۔ غیر شادی شدہ لوگوں میں شادی کا اور شادی شدہ لوگوں میں طلاق کا رواج عام ہے۔ آج کل نوجوان بڑی چھوٹی عمر میں شادی کر لیتے ہیں ـــــ اسکول میں پڑھنے والی کئی لڑکیاں مائیں بن جاتی ہیں۔ وہاں کنواری مائیں دیکھنے کو بلکہ مزید مائیں بننے کے لیے کھلے بندوں ملتی ہیں۔ شادی کے تعلق سے تو امریکہ میں ایک مکمل انقلاب آگیا ہے۔ مشہور شاعر رابرٹ فراسٹ کو یہ بات بڑی عجیب لگتی ہے کہ جب کسی اچھے بھلے شخص کو دنیا کا کوئی فکر و فاقہ نہیں ہوتا وہ اٹھ کر شادی کر بیٹھتا ہے۔ روسی ادیب چیکوف CHEKOV نے وارننگ دی تھی کہ اگر تم تنہائی سے ڈرتے ہو تو شادی مت کرو۔ امریکن لوگ تنہائی سے ڈرتے ہیں لیکن پھر بھی شادی کر لیتے ہیں۔ اس سے اگر احساسِ تنہائی اور گہرا ہو جاتا ہے تو وہ یہی شادی توڑ کر نئی شادی کر لیتے ہیں۔ اور اکثر لوگ یہ تجربے ساری عمر جاری رکھتے ہیں۔ امریکن ایکٹرس بیٹ ڈیوس BETTE DAVIS نے کئی شادیاں رچائی تھیں۔ اس نے ایک بار اقبال کیا تھا ـــ "یہ صحیح ہے کہ مجھے شادی نہیں کرنی چاہئیے تھی۔ لیکن میں تنہا نہیں رہنا چاہتی تھی، محبت کرنا چاہتی تھی۔ روایت کے مطابق محبت کا انجام شادی ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا حشر بھی یہی ہوا۔" ایکٹر کوف مین نے بھی اعتراف کیا کہ "شادی ہونے تک مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اصلی خوشی کیا ہوتی ہے ـــــ لیکن تب تک پانی سر سے نکل چکا تھا۔"

امریکہ نے تجربات اور حادثات کی بنا پر ثابت کر دیا ہے کہ شادی، وہ سانحہ ہے جو محبت کو انتقام کے جذبے میں تبدیل کر دیتی ہے نتیجتاً امریکہ میں طلاق کی بھرمار ہے۔ کئی دانشوروں کا خیال ہے کہ طلاق امریکہ ہی کی ایجاد ہے۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے۔ طلاق ـــ امریکہ دریافت ہونے سے پہلے ایجاد کی جا چکی تھی۔ فرانسیسی فلسفر والٹیر کا کہنا ہے کہ شادی اور طلاق ایک ہی ساتھ ایجاد کئے گئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ طلاق شادی کے چند ہفتے بعد معرضِ وجود میں آئی کہ علاج بیماری کے بعد ڈھونڈا جاتا ہے۔ دوسرے موضوعات کی طرح شادی اور طلاق پر بھی امریکہ میں سب سے زیادہ ریسرچ ہوئی ہے۔ اتنی ریسرچ کے بعد انھوں نے کئی پرانے نظریوں اور مقولوں کی توثیق کر دی ہے جو محض تجربے کی بنا پر پرانے سماجوں نے صدیوں سے دریافت کئے ہوئے تھے مثلاً یہ کہ میاں اور بیوی ایک دوسرے کو محض اس لیے نہیں سمجھ پاتے کہ ان دونوں کا سیکس مختلف ہے۔ سقراط سے لے کر خاکسار تک، سب فلسفیوں، دانشوروں، ادیبوں، محققوں اور مزاح نگاروں میں اس موضوع پر حیران کن حد تک اتفاقِ رائے ہے۔ ہندوستان میں لوگ مانتے ہیں کہ شادی بیاہ، سنجوگ کا معاملہ ہے اس کی کامیابی کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ سب مذہبوں کا سرکاری نقطۂ نگاہ یہی ہے کہ شادی جنت میں بنائی جاتی ہے (اسی لیے وہ زمین پر کام نہیں کر پاتی)۔ آسکر وائلڈ کا نظریہ اس کے عین برعکس ہے۔ اس کا قول ہے کہ طلاق جنت میں بنائی گئی ہے۔ امریکنوں کی تو یہ دیرینہ خصلت ہے کہ کوئی بھی چیز کہیں بھی ملتی ہو اس سے انہیں سروکار نہیں، اگر وہ انھیں پسند آ جاتے تو جنت تو کیا جہنم سے اٹھا لائیں گے۔

ایسا نہیں کہ امریکن شادیاں کامیاب نہیں ہوتیں۔ اس کے برعکس حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک چلتی ہیں وہ بہت

کامیاب رہتی ہیں۔ جوں ہی ازدواجی تعلقات میں ترشی یا پھیکے پن کا احساس شروع ہوتا ہے، جوڑے میں سے ایک دوسرے کو طلاق کی تجویز پیش کر دیتا ہے۔ ہمارے ہاں کی طرح نہیں کہ جوڑے صرف اعداد و شمار کی خاطر اپنی شادی کی لاش کو کندھوں پر لیئے تمام عمر بجھے بجھے سے چلتے رہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ امریکن جوڑے اپنی شادی کو بچانے کی کوشش نہیں کرتے ایک ادیب نے جس کی شادی آخری دم پر تھی، ایک نامہ نگار کو بتایا "ہم میاں بیوی علٰحدہ علٰحدہ کمروں میں سوتے ہیں، ہم کھانا الگ الگ کھاتے ہیں۔ ہم چھٹیاں بھی الگ الگ مناتے ہیں۔ ہم اکٹھے رہنے کی ہر ممکنہ کوشش کر رہے ہیں!"

ہم نے ایک جوڑے سے ان کی کامیاب شادی کا راز پوچھا۔ خاوند نے جواب دیا "ہماری کامیاب شادی کا راز یہ ہے کہ ہم ہفتے میں دو دن اکیلے کھانا کھانے باہر جاتے ہیں، کسی اچھے رسٹورنٹ میں ــــ میں منگل کے دن جاتا ہوں اور میری بیوی جمعہ کے دن!"

ویسے امریکہ میں ازدواجی سکون کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ بیشتر جوڑے ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ اُن کا پیار کرنے اور کروانے کا جذبہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ وہ شادی کے بندھن سے بے نیاز پیار کئے جاتے ہیں۔ ایک بار جب ہم ایک ـــ امریکن سے طلاق کی شرح کے اضافے کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے تو ہم نے اس سے پوچھا کہ "ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے ملک میں طلاق اتنے زیادہ کیوں ہوتے ہیں۔ ہم نے اکثر دیکھا ہے کہ جب بھی امریکن مرد شام کو گھر آتا ہے تو عورت اس کا بوسے سے استقبال کرتی ہے، اُسے باہوں میں لے لیتی ہے۔ اُسے پچکارتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو ــ "آئی لو یو" "آئی لو یو" کہتے تھکتے نہیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟"

اُس نے دھیمے سے جواب دیا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد اپنے نہیں کسی اور کے گھر میں داخل ہو گیا ہے۔"

بہرحال ہم سمجھتے ہیں کہ امریکہ محبت کی تلاش میں سرگرداں اور پا بجولاں ہے اور وہ جلد ہی حقیقی اور دائمی محبت کا راز پالے گا۔ یاد رہے کہ امریکن فی کس سب سے زیادہ شادیاں کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اُن کو شادی کے تمام راز باقی سب لوگوں سے زیادہ معلوم ہوں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ وہ دن دُور نہیں جب امریکہ ہمیں ہتھیاروں اور کمپیوٹروں کی مدد دینے کے علاوہ اس میدان میں بھی ہماری اعانت کرے گا۔ ایک امریکن اکسپرٹ کی تجویز کے مطابق شادی ہمیشہ علی الصبح کرنی چاہیئے۔ اس طرح اگر شادی ناکام بھی ثابت ہو تو کم از کم سارا دن تو ضائع نہیں ہوگا۔

اب ہم بات یہیں ختم کرتے ہیں ورنہ امریکہ میں موضوعات کی کمی نہیں۔ قصہّ مختصر، امریکہ نئی دُنیا ہے امریکہ آزاد دُنیا ہے۔ امریکہ افراط کی دُنیا ہے، امریکہ صحت اور جوانی کی دنیا ہے۔ امریکہ ایجادوں کی دُنیا ہے۔ وہ کھلنڈرے لوگوں کا ملک ہے۔ اُبلے ہوئے انڈوں کا ملک ہے۔ لاابالی لوگوں کا ملک ہے۔ غوطہ لگایا تو سمندر کی گہرائیوں تک اُتر گئے۔ اُڑان بھری تو چاند پر جا اُترے۔ جنگ کی تو ملکوں کو تاخت و تاراج کر دیا۔ صلح کی تو وہاں کے بیابانوں کو سجا دیا۔ سیاسی دوستی کی تو وہاں کے غریبوں کو رئیس بنا دیا۔ منہ پھیرا تو ڈکٹیٹروں کو فقیر بنا دیا۔ عشق کیا تو شادی پر شادی، نفرت ہوئی تو طلاق در طلاق!

امریکن کھلے دل کے لوگ ہیں۔ اپنی دوستی پر دوسرے کی جان تک نچھاور کر دیتے ہیں۔ انھوں نے غریبی کو ملک بدر کر دیا ہے۔ بیماری پر فتح پائی ہے۔ صحت کو قابو میں کیا ہے۔ انسان کی عمر میں اضافہ کیا ہے۔ موت کو

انتظار کرنا سکھایا ہے ۔ قدرت کو مطیع کیا ہے ۔ فطرت کو بدل ڈالا ہے ۔

امریکہ سائنس کا ملک ہے ۔ معجزوں کا ملک ہے ۔ توہم پرستی کا ملک ہے ۔ کرامات کا ملک ہے ۔ محنت کشوں کا ملک ہے ۔ کام چوروں کا ملک ہے ۔ زمین کی وسعتوں کا ملک ہے ، نظریوں کی تنگی کا ملک ہے ۔ مشینوں کا ملک ہے ۔ سرمایہ داری کا ملک ہے ۔ سوشیل انشورنس کا ملک ہے ۔ گوروں کا ملک ہے ۔ کالوں کا ملک ہے ۔ المختصر ، ہر قسم کے تضاد کا ملک ہے ۔ امریکہ کا اپنا قومی ترانہ ہے ۔ اُسے اب ایک بین الاقوامی ترانے کی ضرورت ہے کیونکہ امریکہ ملکوں کا ملک ہے ۔

سچ ہے جس نے امریکہ نہیں دیکھا ، وہ پیدا ہی نہیں ہوا ۔ اب یہ مضمون پڑھنا چھوڑیئے ۔ اُٹھئے ، اپنی پیدائش کا انتظام کیجئے ۔ ہم ڈیلیوری رُوم کے باہر خوش خبری کا بے تابی سے انتظار کریں گے ۔

خدا حافظ قارئین ! خوش آمدید نو واردین !!

فیاض احمد فیضی

پھلوں میں رنگ بھرے

اچھے آدمی
اور اچھے پھل دونوں
کی کسوٹی مٹھاس ہے۔ اچھے پھل
کی پہچان غالب کے الفاظ میں یہ ہے کہ
میٹھا ہو اور بہت ہو۔ اچھے آدمی کی شناخت یہ کہ بہت
میٹھا نہ ہو، ورنہ اس پر سیاسی لیڈر، منافق، عاشق، سیلز مین یا
بیمہ ایجنٹ ہونے کا شبہ ہوتا ہے۔ اچھے آدمیوں کی تعداد بھی سماج میں
کم سے کم ہونی چاہیئے ورنہ زندگی بے مزہ اور دنیا بے رونق ہو جائے گی لیکن اچھے
پھل کا میٹھا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اچھے کریلے کا نیم چڑھا ہونا۔ ایک میٹھا پھل ہزار کھٹے پھلوں
سے بہتر ہوتا ہے بشرطیکہ اس میٹھے پھل پر آپ کا نام لکھا ہو، ورنہ پڑوسی کے باغ میں لگے تمام پھل کھٹے ہی
ہوتے ہیں۔ کیا آپ نے کھٹے انگور والی کہاوت نہیں سنی؟ **سنگترہ** :۔ لیکن سنگترہ ایک ایسا پھل ہے
جو اس کہاوت اور کلیے سے بالکل بے نیاز ہے۔ سنگترہ اس وقت تک ذائقہ دار نہیں کہلاتا جب
تک اس کی مٹھاس میں ہلکی سی ترشی موجود نہ ہو۔ اسی لیے پھلوں کے بیوپاری احتیاطاً کھٹے
اور میٹھے سنگتروں کو بڑے اہتمام سے ملا کر بیچتے ہیں تاکہ اگر آپ اچھی کوالٹی کے
ایک درجن سنگترے خریدیں تو ان میں تین یا چار میٹھے سنگترے شرطیہ
آپ کو مل جائیں۔ عام طور پر ایک عدد اچھے سنگترے کی
قیمت آدھے آم، دو چیکو یا تین کیلے کے برابر
ہوتی ہے۔ سنگترے کے مستقل خریدار
یہ فارمولا ہمیشہ یاد رکھتے
ہیں تاکہ نئی جگہ

کوئی انھیں ٹھگ نہ لے۔

سنگترہ تمام پھلوں میں سب سے خوش رنگ اور خوب صورت (انگریزی میں ہینڈسم) پھل مانا جاتا ہے اور حیرت انگیز طور پر اچھی صورت والے سنگتروں کی سیرت بھی اچھی ہوتی ہے۔ بدمزاج حسین عورتوں کو سنگتروں سے سبق لینا چاہیے۔ مٹی کے بنے ہوئے بے روح اور بے مزہ سنگترے اصلی سنگتروں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور کارآمد ہوتے ہیں اور عمر بھر ساتھ نبھاتے ہیں۔ جو لوگ اصلی سنگترہ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ مٹی کے بنے ہوئے سنگترے خرید کر شوکیس میں سجا لیتے ہیں اور بچوں کے سیانے ہونے تک انھیں بہلاتے رکھتے ہیں اور خود بھی بہلتے رہتے ہیں۔

سنگترے کا چھلکا جو بظاہر بڑا بے ضرر معلوم ہوتا ہے، بہت مفید چیز ہے۔ اگر اس کا استعمال سلیقے سے کیا جائے تو کسی کے بھی ہوش ٹھکانے لگائے جا سکتے ہیں۔ سنگترے کے چھلکے کو راستے میں اس طرح پھینکنا کہ اس پر دشمن کا پیر پھسل جائے، بڑی مہارت کا کام ہے۔ سنگترے کے چھلکے سے ایک عرق نکلتا ہے۔ اگر اس عرق کو دشمن کی آنکھوں میں ٹپکا دیا جائے تو وہ قدموں میں لوٹنے لگتا ہے۔ یہ شغل دوست کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے شوق سے بدرجہا بہتر ہے اور اس سے خیرسگالی کے جذبے کو فروغ ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو سنگترے کی قاشوں میں معشوق کے لبِ لعلیں کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہمارا اپنا خیال ہے کہ میٹھی اور ترش چیزوں کا موازنہ نمکین اشیا سے کرنا مناسب نہیں، دونوں کی اہمیت اپنی اپنی جگہ مسلّم ہے۔

محمد شاہ رنگیلے کو سنگترے سے بہت پیار تھا اور وہ اسے پیار سے رنگترہ پکارنے پر بضد تھا۔ اس نے جس آسانی کے ساتھ کوہِ نور ہیرا نادر شاہ کے حوالے کر دیا اس سے تو یہی پتہ چلتا ہے کہ اسے سنگترہ کوہِ نور سے بھی زیادہ عزیز تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کو جب بھی وقت ملتا (اور وقت کی اس کے پاس کوئی کمی نہ تھی) وہ اعلیٰ قسم کے سنگترے منگوا کر ان کا گودا نکلوا کر اسے قند کے شربت میں چند گھنٹے بھیگنے کے لیے رکھ دیتا تھا اور پھر تنہا یا پلاؤ کے ساتھ ہضم کر جاتا تھا۔ اس ڈش کا نام اس نے 'راحتِ جان' رکھ چھوڑا تھا۔ محمد شاہ نے جتنی دلچسپی سنگتروں اور ان سے ملتی جلتی چیزوں میں لی، اگر اتنی دلچسپی وہ حکومت کے کاموں میں لیتا تو تاریخ میں اس کا نام اتنا مشہور نہ ہوا ہوتا اور وہ بے چارہ گمنامی کی موت مر جاتا۔ سنگترہ سستی اور مہنگی دونوں قسم کی شہرت حاصل کرنے میں بے حد مددگار ثابت ہوتا ہے۔ بھوک ہڑتال کرنے والے لیڈر ہمیشہ اپنے ساتھ سنگترے کے جوس کا گلاس تیار رکھتے ہیں کہ پتہ نہیں کب کوئی وزیر باتدبیر آ کر ان کی مانگوں پر غور کرنے کا وعدہ کرے اور انھیں سنگترہ کا رس اپنے دستِ مبارک سے پیش کرے۔

ایک معصوم سنگترے پر اگر ظلم و ستم کی انتہا کر دی جائے تو وہ احتجاجاً آدھے گلاس آرینج جوس میں تبدیل ہو جاتا ہے، لیکن ہوٹل والے بڑی آسانی سے ایک سنگترے سے چار گلاس جوس تیار کر لیتے ہیں۔ کہا جاتا ہے اس کی ترکیب برسوں پہلے کسی گرو نے انھیں بتائی تھی تب سے آج تک یہ ان کا خاندانی راز ہے جسے وہ کسی کو نہیں بتاتے۔ جب کسی بیمار کو کوئی بھی غذا نرس کے ہاتھوں بھی ہضم نہ ہونے لگے تو اسے سنگترے کا رس پلایا جاتا ہے۔ جن حضرات نے محض بدہضمی کی وجہ سے شاعری کا پیشہ اختیار کیا ہوا ہے انھیں اور ان کی شاعری کو سنگترے کے رس سے افاقہ ہو سکتا ہے۔ سنگترہ مقویِ قلب و جگر بھی ہوتا ہے خصوصاً ناکام عاشقوں کو وقت پر سنگترہ کھلا دیا جائے تو وہ راہِ راست پر آ جاتے ہیں اور عشق و عاشقی سے ہمیشہ کے لیے توبہ کر لیتے ہیں۔ بعض تو اتنے پشیمان ہوتے ہیں کہ فوراً والدین کی پسند سے شادی کر لیتے ہیں۔

لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سنگترہ کھانے کے بعد دل بہت اُداس ہوجاتا ہے اور طبیعت کرکٹ کھیلنے یا گانا گانے کی طرف مائل نہیں ہوتی۔ ایسا اُس وقت ہوتا ہے جب تماشائی کرکٹ اسٹیڈیم میں خراب کھیل کھیلنے پر کھلاڑیوں کا استقبال سنگتروں سے کرتے ہیں یا ہال میں سامعین اُکتا دینے والی گائیکی کی تعریف سنگترہ پھینک کر کرتے ہیں جس سے کبھی کبھی بے قصور طبلچی کو خاصی چوٹ بھی آجاتی ہے۔ یوں بھی عام طور پر سنگترے کی ساخت کرکٹ کی گیند جیسی اور اس کا سائز پکا راگ گاتے ہوئے استاد کے کھُلے ہوئے منہ کے برابر ہوتا ہے۔

سنگترہ پڑھے لکھے، نفاست پسند اور کلچرڈ لوگوں کا پھل ہے اسی لیے امیر گھرانے کے لوگ اپنے ڈائننگ ٹیبل پر سنگترے بڑے اہتمام سے سجا کر رکھتے ہیں تاکہ اگر بھولے سے کوئی ایسا مہمان آجائے جسے ڈاکٹر نے گرم مشروبات استعمال کرنے کی ممانعت کر رکھی ہو تو اسے سنگترے سے بہلایا جائے۔ ایسے مریض مہمانوں کا انتظار کرتے کرتے جب سنگترے سوکھ جاتے ہیں تو انھیں بڑی دریادلی کے ساتھ نوکروں کے حوالے کر دیا جاتا ہے اور کھانے کی میز پر تازہ سنگترے چُن دیئے جاتے ہیں۔

لیچی :- ریاستِ بہار کی دو چیزیں ہندوستان بھر میں مشہور ہیں۔ ایک خود بہاری اور دوسرے لیچی۔ بہاری لوگوں کی تعریف الفاظ میں کرنا ممکن نہیں ہے، اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، آزمائش شرط ہے۔ ہندوستان میں سب سے عمدہ لیچیاں مظفر پور، بہار میں پائی جاتی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو مظفر پور میں سوائے لیچیوں کے کچھ اور ملتا ہی نہیں۔ ریزگاری اور چھوٹے نوٹوں کی قلت کے زمانے میں وہاں کے لوگ لیچی ہی کو کرنسی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ وہاں جہیز میں لیچی کے باغات کی فرمائش کی جاتی ہے۔ بنا لیچی سسرال پہنچ جانے والی دُلہنوں کو عمر بھر طعنے سُننے پڑتے ہیں۔ رشوت کے طور پر لیچی کے بکس افسروں کے گھروں پر پہنچائے جاتے ہیں۔

لیچی ان گنے چنے پھلوں میں سے ہے جنھیں کچی حالت میں نہ تو ترکاری کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اچار ڈالا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے آج تک لیچی کی شکل نہیں دیکھی ہے اور صرف نام سنا ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لیچی کسی چینی اداکارہ کا نام ہے لیکن جن لوگوں نے کسی چینی اداکارہ یا دانت کی لیڈی ڈاکٹر کو دیکھا ہے وہ لیچی کھانا ہی پسند کرتے ہیں۔ لیچی مونث ہے، یہ بات بچہ بچہ جانتا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کے نام کا آخری حرف "ی" ہو وہ مونث ہوتی ہے، دہی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ جو بات بچے بچے کو معلوم ہو وہ صحیح ہی ہو۔ آج کل جتنی غلط باتیں بزرگوں کے علم میں ہیں، اس سے کئی گنا زیادہ بچوں کو معلوم ہیں۔

لوگوں کا خیال ہے کہ لیچی گول ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ لیچی گول ہوتے ہوئے بھی گول نہیں ہوتی جو لوگ پھل کھانے سے پہلے پھل کی شکل و صورت پر غور کرنے میں وقت ضائع کرتے ہیں وہ اس حقیقت سے واقف ہیں لیچی کا رنگ سیاہی مائل گہرا سرخ ہوتا ہے۔ بعض لیچیاں زرد رنگ کی بھی ہوتی ہیں۔ شاید خون کی کمی یا اپنے انجام کے خوف کی زیادتی سے ان کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے مگر رنگت کی تبدیلی کا لیچی کے مزے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کسی بھی رنگ کی لیچی میٹھی، کھٹ میٹھی یا پھیکی ہو سکتی ہے۔ آخر کردار بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

لیچی کا چھلکا ذرا سخت ہوتا ہے جسے اُتارنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ اس کا گودا تو بہت زیادہ نرم ہوتا ہے اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ عموماً باہر سے سخت دکھائی دینے والے لوگ اندر سے بہت نرم دل ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ پتھر کے مجسمے بھی طبیعت کے بہت بھلے ہوتے ہیں۔ راستوں پر کھڑے مجسموں کے سر پر بیٹھ کر کوے کتنی شیطانیاں

کرتے ہیں مگر یہ اُف تک نہیں کرتے بلکہ مسلسل خلاء میں گھورتے رہتے ہیں۔ ڈپارٹمنٹل اسٹورز میں نصب مجسموں کو کوئی چھیڑ دے تو وہ حسین بُت ناراض نہیں ہوتے، بس مسکراتے رہتے ہیں۔ لیچی کے چھلکوں کو مزید سخت بنانے کے لیے قدرت نے اس پر نوکیلے دانے بنا دیتے ہیں۔ انھی کی وجہ سے لیچی کو اگر دوسرے سے چھیننے کی کوشش کی جائے تو ہلکی سی سزا اُسی وقت مل جاتی ہے۔ وہ لوگ جو ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں دکھائے جانے والے بلیڈ سے ڈاڑھی بناتے ہیں، کچھ عرصہ بعد ان کی ڈاڑھی، خصوصاً ٹھوڑی کا حصہ، لیچی کے چھلکے کی طرح خطرناک ہو جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک لیچی کے چھلکے پر تقریباً ڈھائی سو نوکیلے دانے ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو اس تعداد سے اختلاف ہے انھیں ہمارا مشورہ ہے کہ وہ لیچی کھائیں لیچی کے پیڑ یا اس کے چھلکے کے دانے نہ گنیں۔ لیچی کی طرح کٹھل میں بھی اسی طرح کے نوکدار دانے ہوتے ہیں لیکن لیچی اور کٹھل کا موازنہ کرنا ایسی ہی بات ہے جیسے ممولے کو شہباز سے لڑا دینا۔ علامہ اقبال کے بعد اس طرح کے مقابلے کا اہتمام کسی نے نہیں کیا۔ بہرحال لیچی اور کٹھل میں فرق یہ ہے کہ اگر پچاس فٹ کی بلندی سے کوئی لیچی آپ کے سر پر آگرے تو لیچی اور آپ کا سر دونوں ہی محفوظ رہیں گے لیکن کٹھل اگر محض پچیس فٹ کی اونچائی سے کسی پر گر جائے تو کٹھل پر قتل کا مقدمہ بآسانی دائر کیا جا سکتا ہے۔

اچھی لیچی کی پہچان یہ ہے کہ اس کو دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آتا ہے۔ اس کے علاوہ اچھی لیچی کا چھلکا اتارتے ہی اس کے خوشبودار رس کی دھار یوں بہتی ہے جیسے شیمپین کی بوتل کھل گئی ہو۔ جب لیچی سڑنے لگتی ہے تو اس کی رنگت آہستہ آہستہ مظلوم افریقیوں کی سی ہونے لگتی ہے۔ ان لیچیوں کو جوس سنیٹرز کے مالک بڑے چاؤ سے خرید کر لے جاتے ہیں اور ان کے رس میں اصلی دودھ اور شکر کی ملاوٹ کر کے 'لیچی ملک شیک' کا لیبل لگا کر اونچے دام وصول کرتے ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ لیچی بیمار ہونے کے بعد بھی قوم کی بھلائی کا خیال رکھتی ہے۔ رہنماؤں کی طرح نہیں کہ ذرا زکام ہوا اور قوم کے غم کو بھول کر کسی فائیو اسٹار اسپتال میں چیک اپ کے لیے داخل ہو گئے۔

مظفر پور اور بمبئی دونوں ہی جگہ لیچی وزن سے نہیں بکتی اور نہ ہی درجن کے حساب سے ملتی ہے بلکہ اس کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ ہمیشہ ۲۵، ۵۰ اور ۱۰۰ کی تعداد میں ایک ساتھ ملتی ہے۔ یہ سعادت کسی اور پھل کو حاصل نہیں ہے۔ ان لیچیوں کو دکان دار گچھوں کی شکل میں باندھ کر رکھتے ہیں اسی لیے ان کی خریداری میں بہت چوکس رہنا پڑتا ہے ورنہ دکان دار سے گنتی میں غلطی ہو جاتی ہے اور گھر پہنچ کر پتہ چلتا ہے کہ آج کتنی لیچیوں کی چپت پڑی۔ بیوی بچوں کی ڈانٹ پھٹکار الگ سننی پڑتی ہے اور منہ لیچی کی طرح لٹک جاتا ہے۔ دلّی میں البتہ لیچی وزن سے بکتی ہے اس لیے کہ دلّی والے چھوٹی موٹی بے ایمانیوں پر یقین نہیں رکھتے۔

لیچی حالاں کہ سب سے چھوٹے پھلوں میں سے ایک ہے لیکن پھر بھی یہ غریبوں کا پھل نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ لیچی مہنگی ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں پیٹ بھرنے کی صلاحیت بالکل نہیں ہوتی ہے۔ یہ صلاحیت کیلے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ اسی لیے ہندوستان کے کسی بھی اسٹیشن پر اتر جائیے وہاں پلیٹ فارم ہو نہ ہو، کیلا ضرور دستیاب ہوگا۔ اس قدر متضاد صلاحیتوں کی مالک ہونے کے باوجود لیچی اور کیلے میں بہت دوستی ہے۔ چنانچہ پیلے رنگ کے ننھے منے کیلے کو لیچی کیلے کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یوں تو بہت چھوٹے قد کے آدمیوں کو بھی 'لیچی' کا خطاب دیا جا سکتا ہے مگر خدشہ اس بات کا ہے کہ لیچیاں کہیں برا نہ مان جائیں۔

اردو شاعروں نے لیچی کے ساتھ بہت ناانصافی کی ہے۔ وہ چاہتے تو اس قدر لذیذ اور خوبصورت پھل
پر دیوان کے دیوان لکھ کر اردو اکیڈمی کے مالی تعاون سے شائع کروا سکتے تھے مگر ہمارے شاعروں کے اعصاب پر
دوسرے پھل (مثلاً آم) کچھ اس طرح حاوی رہے کہ لیچی کی طرف ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ غالب نے سُپاری کی مدح
سرائی میں اتنے اشعار لکھ دیے جب کہ لیچی سُپاری کی ہی ساخت کی اور سپاری سے کہیں زیادہ خوش نما اور لذیذ
چیز ہے۔ اگر غالب کو آموں کی طرح لیچیاں میسر ہو جاتیں تو سماج میں آج لیچیوں کا مرتبہ کچھ اور ہی ہوتا۔

سیب: برنارڈ شا، شیکسپیئر، گوئٹے، موپاساں، میکسم گورکی، آسکر وائلڈ، فرائڈ یا کسی اور مفکر کا قول ہے کہ جو شخص روزانہ ایک سیب کھا لیتا ہے اس کے گھر ڈاکٹر کبھی نہیں آتا۔ مشہور و معروف مفکرین
کے بہت سے دوسرے اقوال کی طرح یہ قول بھی سراسر غلط معلوم ہوتا ہے۔ آخر ڈاکٹروں کی بیویاں بھی روزانہ سیب کھاتی
ہیں مگر ان کے شوہر تو بلاناغہ رات کے دو بجے گھر پہنچ ہی جاتے ہیں۔ پھر لیڈی ڈاکٹر ہیں جو ہر روز کئی کئی سیب چٹ کر جاتی
ہیں پھر بھی ان کے گھر کئی کئی ڈاکٹر روز ملنے آ جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عام طور پر ڈاکٹر بھی انھیں مریضوں کے گھر جانا پسند
فرماتے ہیں جو روزانہ نہ صرف سیب بلکہ دنیا بھر کی مقوی اشیا کھاتے رہتے ہیں اور مزید کھانے کی استطاعت اور تمنا
رکھتے ہیں۔ دراصل سیب اور ڈاکٹر کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ آپ نے دیکھا تو ہوگا ہر اسپتال اور نرسنگ ہوم کے باہر
پھلوں کی ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے جس میں دوسرے پھلوں کے ساتھ سیب بھی سجے ہوتے ہیں۔ دوسرے پھل ممکن
ہے مریضوں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہوں لیکن سیب زیادہ تر ڈاکٹروں اور ان کی بدولت خوبصورت نرسوں
کے ہی کام آتے ہیں۔

دنیا کی تاریخ میں سب سے مشہور سیب وہ ہے جو نیوٹن کے سر پر گرا تھا اور جسے دیکھ کر اسے کشش ثقل کا خیال
آیا تھا جس طرح ارشمیدس کو نہانے کے ٹب سے پانی چھلکتے دیکھ کر وہ نادر اصول سمجھ میں آیا تھا جو آج طالب علموں کو
بار بار سمجھانے پر بھی یاد نہیں ہوتا۔ وہ زمانے لد گئے جب لوگ پانی کے چھلکنے اور پھل کے ٹپکنے سے سائنسی انکشافات
کیا کرتے تھے۔ آج پانی کے چھلکنے کا منظر دیکھ کر لوگوں کو میونسپلٹی کے زکام زدہ نل کی یاد آ جاتی ہے اور پھلوں کو دیکھ کر
سوئی ہوئی بھوک جاگنے لگتی ہے۔ سیب کا نام زمانۂ قدیم سے بطور علامت استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن اب وہ وقت
آ گیا ہے کہ اس علامت کے معنی سستے ہو گئے ہیں، علامت مہنگی ہو گئی ہے۔

ہمارے ملک میں ہر قسم کے لوگوں کے لیے الگ الگ قسم کے سیب دستیاب ہیں۔ اونچی اونچی عمارتوں کے پیچھے
ریلوے لائن کے اُس پار، فٹ پاتھوں کے اوپر اور غریبی کی لائن کے نیچے رہنے والے عوام کے لیے سڑے گلے سیب
مناسب دام پر اور کبھی کبھی مفت مل جاتے ہیں۔ ادھ کچے اور کھٹے سیب غریب لوگ تیوہاروں کے موقع پر یا گھر میں کسی
کے سخت بیمار پڑنے پر خریدتے ہیں یا پھر موٹی توند والے سیٹھ انسانیت نوازی کے جذبے سے سرشار ہو کر کبھی کبھی اس
قسم کے سیب اسپتالوں میں فوٹو گرافر کی موجودگی میں تقسیم کرتے ہیں۔ تیسری قسم کے سیب، دوسرے کی بیوی کی طرح
خوبصورت اور دور کے ڈھول کی طرح سہانے ہوتے ہیں مگر ان میں سے رس کی بجائے بھوسہ نکلتا ہے۔ یہ بھوسہ دار
سیب ذرا سستے ہوتے ہیں اس لیے یہ ہمارے ملک کے سب سے مظلوم یعنی متوسط طبقے کے سفید کالر والے ملازمت
پیشہ حضرات کے ٹفن کی زینت بنتے ہیں یا پھر اول درجے کے ریستورانوں میں فروٹ سلاد کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اب
رہ گئے اول درجے کے میٹھے، رس دار، خوش رنگ کشمیری سیب جو دیکھنے میں کشمیری لڑکیوں سے ذرا کم سرخ اور حسین

ہوتے ہیں کشمیری سیبوں کا مزہ جاننے کے لیے کشمیر نژاد ہونا ضروری نہیں ہے مگر ان کے دام لٹتے ہوتے ہیں کہ ڈاکٹروں کے علاوہ صرف اسمگلرز، ٹیکس بچانے والے بزنس مین، عرب ممالک سے تازہ تازہ لوٹنے والے ہندستانی ڈرائیور اور کلرک اور علاج لذت عیش کی غرض سے آئے ہوئے غیر ملکی بوڑھے ہی خرید سکتے ہیں بشرطیکہ ان کے منہ میں دانت اور دل میں سیب کھانے کی لگن ہو۔

بمبئی میں ملکۂ وکٹوریہ کے نام سے موسوم ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ اس اسٹیشن کے باہر بہت سے پھل والے خوانچہ لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بے چارے بہت خدا ترس اور رحم دل ہوتے ہیں اس لیے یہ بہت سستے داموں اچھی قسم کے سیب صرف ضرورت مندوں کو فروخت کرتے ہیں۔ ان سے اگر آپ ایک کلو سیب خریدنے کے بعد اپنے کسی شناسا دکان دار سے سیب کو دوبارہ تلوائیں تو ہر مرتبہ ٹھیک ساڑھے سات سو گرام سیب نکلتے ہیں، کبھی بھی کمی بیشی نہیں ہوتی۔

سیب وہ واحد پھل ہے جس سے آگ بھی لگائی جا سکتی ہے اور گرم کرکے کو ٹھنڈا بھی کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ سیب میں فاسفورس اور لوہا دونوں ہی کافی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ فاسفورس جو ماچس بنانے کے کام آتا ہے اور لوہے سے ایرکنڈیشننگ مشین بنتی ہے۔ سیب کے چھلکے میں بھی کافی وٹامن پائے جاتے ہیں اس لیے اسے اتار کر پھینکنا نہیں چاہیئے بلکہ وٹامن کا شوق رکھنے والوں کو تحفتہً پیش کر دینا چاہیئے۔ محتاط لوگ تو سیب کو محض اس ڈر سے نہیں دھوتے کہ کہیں وٹامن نہ دھل کر ضائع ہو جائیں۔ ویسے سیب کھانے کا سب سے رومانٹک طریقہ یہ ہے کہ براہ راست دانت سے توڑ کر دانتوں سے کاٹ کر کھایا جائے۔ اس سلسلے میں کسی کی بھی مدد لینے سے سیب کا مزہ خراب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔

سیب بہترین دماغی اور جسمانی غذا ہے لیکن اس کے لیے دماغ یا جسم کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چنانچہ وہ لوگ جو عقل سے بالکل پیدل ہیں یا جن کا حلیہ سائنسی لیبارٹری میں رکھے انسانی ڈھانچوں سے ذرا سا بہتر ہے، ایسے لوگوں کو اگر سیب کا پورا باغ بھی کھلا دیا جائے تو ان پر وہی اثر ہوگا جو کتے کی دم کو سات برس تک زمین میں گاڑنے کا ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ لوگ جو محض شہر بھر کی فکر میں دبلے ہیں، بھلے وہ قاضی ہوں یا نہ ہوں، اگر انھیں روزانہ چار پانچ سیب کھلا کر ایک سیر دودھ پلا دیا جائے تو چند ہفتوں میں کایا پلٹ ہو جاتی ہے، گال سرخ ہو جاتے ہیں اور آدمی سوشیل ورکنگ سے بالکل کنارہ کش ہو جاتا ہے لیکن بعد میں قرض خواہوں سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دماغی کام کرنے والوں کا تعلق ہے، وہ عمر بھر بھی اگر دماغی محنت کرتے رہیں تب بھی جی بھر کر سیب نہیں کھا سکتے۔ ہاں وہ اگر رشوت لینا شروع کر دیں تو بات اور ہے لیکن ہر شخص رشوت کا حقدار بھی تو نہیں ہوا کرتا۔ ایمان دار افسروں کی اکثر آج صرف اس لیے ایمان دار ہے کہ انھیں بے ایمانی کے مواقع فراہم ہی نہیں کئے گئے۔

اس لیے، آئیے ان بیماریوں کی بات کریں جو عموماً صرف دولت مندوں کے گھر تشریف لاتی ہیں اور جن کا علاج سیب سے کیا جا سکتا ہے۔ حکما کا کہنا ہے کہ جن لوگوں کو سوتے میں چلنے کی بیماری ہوتی ہے انھیں چاہیئے کہ رات کو نیند کی حالت میں گھر سے نکلنے سے پہلے آدھ درجن عمدہ قسم کے سیب پانی میں بھگنے کے لیے رکھ دیں اور اسی نیند کی حالت میں چہل قدمی کرنے نکل جائیں صبح سویرے اپنے گھر کا پتہ پولیس والوں سے معلوم کرکے گھر لوٹیں اور رات بھر بھیگے ہوئے سیبوں کا رس نکال کر نوش فرمائیں۔ انشاءاللہ بہت جلد شفا ہوگی اور فیملی ڈاکٹر اپنا سا منہ لے کر رہ

جائیں گے۔ حکمت کی کتابوں میں یہ بھی درج ہے کہ عادی شرابی کو دن میں کئی بار، جوش کیا ہوا سیب کھلائیں تو چند مہینوں میں ہی شراب کی لت چھوٹ جاتی ہے۔ اس میں کتنی حقیقت ہے یہ تو مرحوم و مغفور حکما ہی جانیں، ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس علاج میں قباحت یہ ہے کہ اول تو شرابیوں کو پھلوں سے خصوصاً تازہ پھلوں سے کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ ہم نے آج تک کوئی بھی ایسا شرابی نہیں دیکھا جو شراب چھوڑنا چاہتا ہو۔ اگر زبردستی سے کسی شرابی کو سیب کھلا کھلا کر شراب چھڑا بھی دی جائے تو پھر اسے سیبوں کی لت لگ جائے گی اور وہ سیب خریدنے کے لیے بیوی کے نقلی زیور تک بیچ دینے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ ۸۷

اعجاز وارثی
(سنبھل)

شوہر

جہاں دیکھو پریشاں حال اور پامال ہے شوہر
اٹھائے پھرتا ہے دُنیا کے غم، حمّال ہے شوہر
زباں شیریں کی ہر دم صورت مقراض چلتی ہے
مگر خاموش رہ کر آپ اپنی ڈھال ہے شوہر
جو بیٹیں لاڈلی میکے تو رو رو کر کہا ماں سے
مری امّی، بڑا دھوکا ہوا، کنگال ہے شوہر
نشانہ ہے غریب افلاس کی ضرب مسلسل کا
مگر فیاض بیگم کے لیے، ٹکسال ہے شوہر
ہمیشہ فیلڈ پر فرمائشوں کی دوڑا پھرتا ہے
پلییر فیل تن بیوی ہے اور فٹ بال ہے شوہر
یہ کمّو بی ہیں ان کو مرد کے سائے سے نفرت ہے
یہ فرماتی ہیں عورت کے لیے جنجال ہے شوہر
رفاقت اور وہ بھی عمر بھر کی، غیر ممکن ہے
کہ بیوی بھیرویں ٹھمری ہے اور بے تال ہے شوہر
یہ فرق گرم و سرد اب دیکھیے کیا گل کھلاتا ہے
کہ بیوی ہلدوانی ہے تو نینی تال ہے شوہر
بزرگوں کا مگر اس باب میں یہ قول فیصل ہے
ہزار آفات ہیں باایں ہمہ خوشحال ہے شوہر

۱ PLAYER

۲ نینی تال پہاڑ کے دامن میں ایک میدانی قصبہ

نسیم سحر
(جدہ)

غزل

کیں اور عنایات تو اغیار پہ اُس نے
ٹرخایا مجھے شربتِ دیدار پہ اُس نے
ڈھائے ہیں ستم اپنے طلب گار پہ اُس نے
باندھی ہے کمر مستقل انکار پہ اُس نے
ولیّن تھا کم بخت مگر بن گیا ہیرو
دی لفٹ مری جان کو جب کار پہ اُس نے
گوبھی کا، بڑے شوق سے مَیں لے کے گیا تھا
دے مارا مرے پھول کو دیوار پہ اُس نے
میں حلقۂ احباب میں شامل نہیں اُس کے
کچھ داد نہیں دی مرے اشعار پہ اُس نے
کب تک مَیں کئے جاؤں گا یک طرفہ محبّت!
کیوں مجھ کو لگا رکھا ہے بیگار پہ اُس نے
کیوں اس کے مقدّر پہ مجھے رشک نہ آئے!
اِک تِل جو سجا رکھا ہے رُخسار پہ اُس نے
کس طرح وہ "اگزام" میں یوں فرسٹ نہ آتا!
حل پہلے سے لکھ رکھے تھے شلوار پہ اُس نے
قاضی کو بُلائے کوئی جلدی سے خدارا
"ہاں" کر دی ہے آخر مرے اصرار پہ اُس نے
عاشق ہے نسیم سحر ایسا کہ کہا ہے
لبّیک ہی محبوب کے ہر وار پہ اُس نے

رؤف پاریکھ
کراچی (پاکستان)

خودی کو کر بلند اِتنا....

(روح اقبال سے معذرت کے ساتھ)

ہر سال یوم
اقبال پر ہمیں
سید ضمیر جعفری کا یہ شعر
ضرور یاد آتا ہے ؎
کبھی اک سال میں ہم جلسہ اقبال کرتے ہیں
پھر اس کے بعد جو کرتے ہیں وہ قوال کرتے ہیں
اور قوال اقبال کے ساتھ جو کچھ کرتے ہیں وہ
خاصا عبرتناک ہے۔ لیکن اقبالیات کے بعض ماہرین
قوال حضرات سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ آج اگر
اقبال زندہ
ہوتے تو وہ کم از
کم دو چیزوں پر ضرور
پابندی کا مطالبہ کرتے
ایک تو قوالوں کے کلام اقبال
گانے پر دوسرے اقبالیات کے ماہرین
پر۔ کیوں کہ اقبالیات کے بعض ماہر ایسے
بھی ہیں جن کا کام اقبال کی مدد سے اپنا اور
اپنے آبا و اجداد کا قد بلند کرنا ہے۔ دوسرے الفاظ
میں وہ اقبال
کی تعلیمات خودی

پر برابر عمل
پیرا ہیں البتہ کتابت
کی ذرا سی غلطی کی وجہ
سے وہ خودی کے بجائے
خود ہی کو بلند کرنے میں لگے ہوئے
ہیں ـــــ ایک ایسے ہی ماہر اقبالیات
جناب ڈاکٹر بے ہوش الٰہ آبادی ہمارے ہمسائے
ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ ڈاکٹر لگا دیکھ کر پہلے
پہل ہم سمجھے کہ یہ حضرت شاید اقبالیات میں پی ایچ ڈی
ہیں لیکن جب
ہم نے اقبال پر
ان کے خیالات اور ان
کی تصانیف پر غور کیا تو شبہ
ہونے لگا کہ موصوف زیادہ سے
زیادہ ہومیو پیتھ ڈاکٹر ہوں گے لیکن
کچھ عرصہ بعد انکشاف ہوا کہ انھوں نے گوجرانوالہ
کی شہرہ آفاق طبی درس گاہ پنجاب میڈیکل یونیورسٹی
سے گھر بیٹھے بذریعہ خط و کتابت چھ ماہ میں طب کی اعلیٰ
ڈگری بی آر ٹی
حاصل کی ہے۔

بی آرٹی کو وہ خود تو خدا جانے کس کا مخفف بتاتے تھے۔ لیکن ہم اسے بیچلر آف رینڈم تھراپی خیال کرتے تھے اس کا ثبوت انھوں نے محلّے کے کئی جاں بلب مریضوں کو نزع کی تکلیف سے بعجلت نجات دلا کر دیا تھا۔

اقبالیات کے ماہر کی حیثیت سے تو وہ محلے میں مشہور تھے ہی لیکن جب ان کا انٹرویو ایک ضلعی اخبار کے خصوصی ضمیمے میں چھپا تو ضلع بھر میں ان کی شہرت پھیل گئی بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کیونکہ کئی ثقہ قاری اس انٹرویو کو پڑھ کر آگ بگولا ہو گئے تھے جس کی وجہ اقبال کے بارے میں ان کی تحقیق تھی۔ اس تحقیق کی تفصیل اُنھوں نے اپنی کتاب مستطاب "موازنہ اقبال و گھائل" میں دی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے تو یہ کتاب اقبالیات کے موضوع پر ان کی چالیسویں تصنیف تھی اور جس کے ناشر بھی وہ خود تھے۔ جب اس تصنیف کو انھوں نے محلے میں مفت تقسیم کیا تو پورے ضلع کے ساتھ ساتھ پورے محلے میں بھی ان کی دھوم مچ گئی۔ ہمارے ہاں بھی اُنھوں نے اپنی اس بصیرت افروز تصنیف کی ایک جلد ازراہ تلطف بھجوائی جسے ہم نے پہلی فرصت میں پڑھ ڈالا اور آج تک اس شش و پنج میں ہیں کہ اقبال بڑے شاعر تھے یا گھائل؟

اب آپ ضرور دریافت فرمائیں گے کہ یہ گھائل صاحب کون بزرگ تھے؟ صد حیف ہے آپ کی ناواقفیت پر۔ افسوس کہ آپ اردو زبان کے عظیم بلکہ عظیم ترین شاعر سے واقف نہیں۔ موازانہ اقبال و گھائل کے مطالعے سے قبل ہم بھی ان سے واقف نہیں تھے اور اب واقف ہو جانے پر اپنی جہالت بلکہ جہل مرکب کا احساس ہوا ہے۔ آیئے آپ کا تعارف ان سے کرائیں۔ جناب گھائل الٰہ آبادی مشہور ماہر اقبالیات ڈاکٹر بے ہوش الٰہ آبادی کے دادا تھے۔ آپ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی (جیسے بعض کاتبوں نے تباہ آزمائی لکھ کر خداداد تنقیدی صلاحیتوں کا ثبوت دیا ہے) آپ نے غزل، نظم، قصیدہ، مثنوی، ہجو، رباعی، مرثیے، حمد، نعت، منقبت آزاد نظم، نظم معریٰ غرض ہر صنف کو طبع آزمائی کا موقع دیا۔ نظم میں خاص طور پر ید طولیٰ رکھتے تھے (بقول ڈاکٹر بے ہوش الٰہ آبادی صاحب کے بعد میں یہی چیز اقبال کے آڑے آئی)

گھائل اردو کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ گو ان کا کلام جو چالیس ضخیم جلدوں پر محیط ہے زمانے کی ناقدری نقادوں کی بدنیتی، اور اردو شعر و ادب کی بدقسمتی سے اب تک منظر عام پر نہیں آسکا۔ یہ چالیس جلدیں ان کے نبیرے بے ہوش الٰہ آبادی کے پاس محفوظ ہیں اور دھوبی کا حساب لکھنے کے علاوہ بچوں کے لیے کشتیاں اور ہوائی جہاز بنانے کے کام بھی آرہی ہیں۔ لیکن اس سے گھائل کی شاعرانہ عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا کیونکہ عظیم شاعری اشاعت کی محتاج نہیں ہوتی۔ (نئی زمانہ اس کے لیے صرف پبلسٹی اور پبلک ریلیشنگ کافی ہی ہے۔

گھائل کی فی البدیہہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ ہر واقعے اور ہر بات پر کوئی نہ کوئی شعر کہہ دیا کرتے تھے حتیٰ کہ مہترانی ایک دن جھاڑو دینے آئی تو اس سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً ڈھائی ہزار اشعار پر مبنی مثنوی مہترانی بطرز مثنوی معنوی از مولانا روم کہہ ڈالی۔ جس میں اسے ہر قسم کی رانیوں، بشمول مہترانیوں اور نوکرانیوں کی رانی قرار دیا۔

گھائل اقبال کے ہم عصر تھے۔ دونوں بزرگوں میں بہت دوستانہ تھا۔ بلکہ دوستانہ تو ہم نے احتیاطاً اور احتراماً لکھا ہے بقول بے ہوش الٰہ آبادی دونوں لنگوٹیے یار تھے بے ہوش صاحب کی اس کتاب سے نہ صرف آپ کی معلومات میں گرانبار اضافہ ہوگا بلکہ آپ اکثر مقامات پر انگشت بدنداں رہ جائیں۔ مثلاً مصنف کا یہ انکشاف ایک عظیم تحقیقی کارنامے کا درجہ رکھتا ہے کہ اقبال کسی زمانے میں غالب کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ

کر چکے تھے۔ انھوں نے یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ اقبال اکثر گھائل سے کہا کرتے تھے کہ "آؤ ہم دونوں اپنی اپنی بیاضیں بدل لیں۔ اگر پورا کلام نہیں تو کم از کم دو دو تین تین کتابیں ہی بدل لیتے ہیں تم مجھ سے بانگ درا اور بالِ جبریل لے لو اور مجھے بانگِ گھائل، نانک گھائل اور جانگ گھائل دے دو۔"

اس پر گھائل راضی نہ ہوتے اور ساتھ میں زبورِ عجم اور ضربِ کلیم کا بھی مطالبہ کرتے رہے۔ اس کے بعد دونوں بزرگوں میں بہت دیر بحث مباحثہ ہوتا اور پھر دونوں گوالمنڈی جا کر ماجھے پہلوان کی دکان سے لسی پیتے۔ ماجھا پہلوان جسے استاد شعراء کا بیشتر کلام حفظ تھا اکثر کہا کرتا تھا کہ گھائل صاحب! اردو زبان نے شاعر تو دو ہی پیدا کئے ہیں ایک غالب اور دوسرے آپ، ہاں اپنے اقبال صاحب بھی اچھے شعر کہہ لیتے ہیں۔ ان کو بھی شمار کرلیں تو ڈھائی پونے تین شاعر ہوئے۔

ڈاکٹر بے ہوش اس مقام پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اقبال کا ذکر تو ماجھا محض مروتاً کرتا تھا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ علامہ اقبال وہاں موجود ہوتے تھے۔ ورنہ ڈھکے چھپے لفظوں میں وہ کئی بار گھائل صاحب کو ملک الشعراء اور دبیر الملک کا خطاب دے چکا تھا بے ہوش الہ آبادی نے موازنۂ اقبال و گھائل میں جگہ جگہ ماجھے پہلوان کی اس وزنی رائے [آخر پہلوان تھا] ذکر کیا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ گھائل اقبال سے کہیں بہتر شاعر تھے اور ان کا شمار اساتذہ میں ہونا چاہیئے۔ بلکہ نقادوں نے غالب کو بھی خواہ مخواہ سر چڑھا رکھا ہے۔

"موازنۂ اقبال و گھائل" میں ایک جگہ مصنف نے اقبال سے اپنی ملاقات کا حال ان الفاظ میں رقم کیا ہے۔

والد مرحوم و مغفور حضرت اصغر الہ آبادی کے ہمراہ علامہ اقبال کی قیام گاہ جاوید منزل پر جانے اور ان سے ملنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ ایک دفعہ اقبال بنیان اور تہمد پہنے چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے حقہ پاس ہی دھرا تھا لیکن آپ کہیں دور کھوئے ہوئے تھے۔ آنکھوں سے سوچ اور بشرے سے اضطراب عیاں تھا۔ والد صاحب اور میرے جانے پر چونکے۔ بیٹھنے کو کہا لیکن میں اپنی کم سنی کے باوجود تاڑ گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ آج اقبال صحیح طور پر ملے نہیں۔ ورنہ پہلے تو ہمیں دیکھتے ہی لپک جھپک ہمیں بٹھاتے اور اپنے دیرینہ ملازم علی بخش کو لوازمات لانے کہتے۔ پھر دادا مرحوم حضرت گھائل الہ آبادی کو یاد کر کے آبدیدہ ہو جاتے کہ ایسا شاعر بے مثل چشم فلک نے نہ دیکھا ہے اور نہ دیکھے گا۔ اس دن ان کا عالم ہی کچھ اور تھا میں نے عرض کیا خیر باشد؟ بولے ایک مصرعہ موزوں ہوا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مطلع ہو جائے۔ میں نے کہا ارشاد، بولے ع

ع میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں

میں نے برجستہ دوسرا مصرعہ موزوں کر کے سنا دیا:

ع غلغلہ ہائے الاماں بت کدۂ صفات میں

اٹھ کر مجھے گلے لگا لیا اور بولے واللہ تین پہر سے فکر سخن میں غرق تھا اور زیر غور یہی پہلا مصرعہ تھا اس سے بہتر دوسرا مصرعہ ممکن نہیں، معنی کے لحاظ سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ پھر والد مرحوم سے مخاطب ہو کر بولے! اصغر! مجھے فخر ہونا چاہیئے کہ اللہ نے تجھے گھائل کی سی قابلیت رکھنے والا بیٹا دیا ہے۔ دیکھنا ایک دن چار دانگ عالم میں اس کے نام کے ڈنکے بجیں گے۔ اسی پر بس نہیں میں نے اس غزل کے بقیہ تمام اشعار اسی وقت کہہ کر دے دیئے۔ آج بھی آپ بالِ جبریل کے پہلے صفحے پر یہ غزل دیکھ کر اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ یہ بتانا کم ظرفی ہوگی کہ یہ غزل میں نے اقبال کی نذر کر دی تھی۔ انھوں نے البتہ بالِ جبریل میں اسے شامل کرنے سے قبل اجازت ضرور لی تھی اللہ اللہ اب ایسے بامروت لوگ کہاں ملتے ہیں۔

اس شاندار تحقیقی کتاب میں بے ہوش صاحب نے یہ ثابت کردیا ہے۔ کہ گھائل اقبال سے بہتر شاعر تھے۔ اُنھوں نے اعتراف کرلیا ہے کہ اقبال اکثر جگہ گھائل سے دب گئے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس سے یہ مُراد نہیں کہ اقبال کم تر درجے کے شاعر ہیں۔ اگر گھائل کے بعد اردو شاعری میں کسی کا درجہ ہے تو وہ بلاشبہ علامہ اقبال ہیں۔ بے ہوش صاحب کا یہ اعتراف بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ ورنہ باطل پرستی کے اِس دَور میں کون ادب کی قد آور شخصیات کے خلاف ایک لفظ بھی منہ سے نکالنے کی جرأت کرتا ہے۔

چلتے چلتے اقبال پر گھائل کے تفوق کی ایک اور وجہ بھی سُن لیجئے وجہ یہ ہے کہ گھائل ڈاکٹر بے ہوش الہ آبادی جیسے مایہ ناز شہرۂ آفاق اور جملہ علوم میں طاق عالم فاضل شخص کے دادا تھے اقبال اس فضیلت سے محروم رہ گئے تھے۔ چنانچہ گھائل کی برتری میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے۔ کتاب کے دوسرے حصّے میں فاضل مصنف نے اقبال کے اشعار کی جو تشریح کی ہے۔ وہ انشاء اللہ پھر کسی روز نذرِ قارئین کی جائے گی۔

۵۷

ڈاکٹر سیدہ جعفر شریکِ حیات اور ہمکارنا ؟

مقالہ نگار: ڈاکٹر بیگ احساس

گولڈن تھریشولڈ کے برآمدے میں ہم تمام طالب علم خوشگوار موڈ میں گپیں ہانک رہے تھے۔ ہرے رنگ کا چھوٹے پہیوں والا ایک اسکوٹر رکا۔ اس پر سوار جوڑا بھی نسبتاً کم قد تھا۔ بڑا ہی خوبصورت جوڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا ایک باوقار خاتون اسکوٹر سے اتری تھیں۔ چہرے پر ایک آب کی ہلکی تہہ جو سنجیدگی بڑھا رہی تھی اور شاید چہرے کے رعب کو چھپانے کے لیے چڑھائی گئی تھی۔ وہ ایک عالمانہ شان سے نپے تلے قدموں کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگیں ساتھ میں جو مرد تھا اس کی آنکھوں میں بے پناہ چمک تھی ایسی چمک جو شریر اور ذہین بچوں کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ میں نے سوچا خدایا اس شخص نے کیسے اس چمک کو اتنے دنوں تک آنکھوں میں محفوظ رکھا ہے جب کہ آج کل بچے بھی اپنی آنکھوں میں تلک کی پرچھائیں لیے گھوم رہے ہیں۔ آخر طالب علم احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا کہ کون ہیں؟ "سیدہ جعفر صاحبہ" ایک ساتھی نے بتایا۔ "اور وہ؟" "سید احمد مہدی صاحب!" دونوں کا رشتہ میں خود سمجھ گیا تھا۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ کیسا شخص ہے جس نے ایم۔ اے عثمانیہ سے کیا اور پہلی بار اس نے سیدہ جعفر صاحبہ کو دیکھا گولڈن تھریشولڈ میں ——— لیکن صاحبان یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میرا تعلق بھی ان افراد سے ہے جنھیں زندگی کی ایک ایک مسرت حاصل کرنے کے لیے طویل جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ میں نے بھی ایم۔ اے ایوننگ کالج سے کیا تھا اور دو برس میں ایک بار بھی پتھر کی اس پرشکوہ عمارت جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ ورنہ میں سیدہ جعفر کو ضرور دیکھ لیتا۔

یوں ہوا کہ جناب ہاشم علی صاحب نے تمام مخلوعہ جائیدادوں پر تقررات کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اردو لکچرر کی ایک جائیداد کا قرعہ میرے نام بھی اٹھا — ۸ مہینے سکندرآباد اور نظام کالج میں پڑھاتا رہا کہ ایک دن آرٹس کالج بلوایا گیا۔ شاذ مرحوم بیمار ہو کر طویل رخصت پر چلے گئے تھے۔ میں بہت گھبرایا!! ایک تو اس سنگ بستہ عمارت سے وابستہ کہانیاں۔۔ دوسرے شاذ صاحب جیسے مقبول شاعر اور اچھے استاد کی جگہ پڑھانا — پھر سیدہ آپا کی شخصیت کا رعب ——!! آرٹس کالج آیا تو سیدہ آپا کی شخصیت کی کچھ پرتیں کھلیں اور انھیں کسی حد تک قریب سے دیکھنے کا موقع ملا —— ہاشم علی صاحب کی خدمات علیگڑھ یونیورسٹی والوں نے حاصل کیں

لیکن جو خوشگوار روایت ہاشم علی صاحب نے قائم کی تھی وہ اسی طرح برقرار رہی کیوں کہ اسی جامعہ کی ایک باعزت شخصیت پروفیسر نوینت راؤ نے کرسی وائس چانسلری سنبھالی۔ اس لیے بھی ڈھارس ہوئی کہ چلو کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو مادری زبان میں اظہار مدعا کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تک اسی سہارے آرٹس کالج میں ہوں۔

میں نے دیکھا سیدہ آپا کالج آتے ہی مصروف ہو جاتی ہیں اور یہ سلسلہ ۴/۱/۲، ۵ بجے تک چلتا رہتا ہے۔ کلاس لینے کے بعد وہ فائلوں کو دیکھتیں، جوابات لکھتیں، ٹائپ کرواتیں۔ شعبہ کا ہر آدمی دوڑ رہا ہے۔ مصروف ہے۔ اس دوران لڑکوں سے بھی گفتگو کرلیتیں ان کے مسائل بھی سن لیتیں۔ لڑکوں پر سیدہ آپا کی شخصیت کا رعب چھایا ہوا تھا۔ بہت ہی ناگزیر صورتوں میں وہ آپا کے پاس جاتے۔ میں نے صدر شعبہ کے کمرے کے سامنے لڑکوں کو شش و پنج میں مبتلا دیکھا کہ جائیں نہ جائیں۔ شاید ہی کسی طالب علم نے اونچی آواز میں بات کی ہو۔ (اب یہی حال مغنی صاحب کے دور میں ہے) لیکن ایسا بھی نہیں کہ پورا دور پرسکون گزرا ہو۔ بعض ہاتھوں نے کچھ مچھلیاں "تالاب گندہ کرنے کے لیے چھوڑیں"۔ کم از کم میں ایسے طالب علم کو جانتا ہوں جو آپا سے بدتمیزی کرنے آیا تھا نہ صرف شرمندہ ہو کر لوٹا بلکہ بھری بزم میں راز کی بات بھی کہہ گیا۔ پھر آپا کو ایسے فون کئے جانے لگے جس میں انھیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ غیر شائستہ لفظوں کا استعمال کیا گیا اور نازیبا گفتگو بھی کی گئی۔ ایک دو بار بعض طالب علم اس نیت سے آئے بھی آپا نے انھیں ڈانٹ کر بھگادیا۔ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ایک ایسے دور میں جبکہ حاضری، چھٹیاں، امتحانات ہر معاملے میں طلبا اپنا عمل دخل چاہتے ہیں اساتذہ کو اپنی پگڑی سنبھالنا مشکل ہو گیا ہے کسی لڑکے کو اس طرح ڈانٹ پلانا، وہ بھائی، کھڑا ہو بڑی ہمت کا کام ہے۔ آپا میں بے پناہ خودداری اور خود اعتمادی ہے۔ وہ کبھی نہیں گھبراتیں۔ بہت سی عورتوں میں ذہانت، علمیت، گفتگو کرنے کا سلیقہ، انتظامی صلاحیت اور رکھ رکھاؤ تو ہوتا ہے لیکن عورت فطرتاً بزدل ہوتی ہے۔

سیدہ آپا کو میں نے کبھی گھبراتے ہوئے نہیں دیکھا اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہ اپنے پیشے اپنے قلم سے ایماندار ہیں۔ سازشیں نہیں کرتیں، اپنے عمل کا جواز رکھتی ہیں۔ اعمال کا محاسبہ کرتی ہیں۔ کوئی بات بے دلیل نہیں کرتیں۔ جو بھی کرتی ہیں کھلے عام کرتی ہیں۔ ببانگ دہل کرتی ہیں۔ سب کو شامل رکھتی ہیں۔ آپا پر کوئی یہ الزام نہیں رکھ سکتا کہ انھوں نے کسی باصلاحیت فرد کو نظر انداز کر کے کسی کو بے جا نوازا ہو۔ آپا انصاف کی حتی الامکان کوشش کرتی ہیں اب یہ اور بات ہے کسی بھی عمل سے کچھ لوگ خوش ہوتے ہیں اور کچھ ناراض ــــ!!

باہر سے ایک پروفیسر تشریف لائے تھے۔ وہ آپا کو سمجھانے بیٹھ گئے کہ انھیں "اپنوں" کو فائدہ پہنچانا چاہیے۔ وہ خود بھی یہی کر رہے ہیں۔ آپا کے چہرے پر بڑی ناگواری کے تاثرات ابھرے۔ آپا صرف اس لیے لحاظ کر رہی تھیں کہ وہ مہمان تھے۔ پروفیسر یہ بھول گئے تھے کہ آپا حیدرآبادی ہیں اور حیدرآبادی پروفیسر ہو کہ وی سی وہ حیدرآبادی ہوتا ہے ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، شیعہ سنی نہیں ہوتا۔ آپا کی سرد مہری سے وہ صاحب کھسیا کر کھسک گئے۔

آپا اردو کے اپنے جونیر افق اساتذہ کے ساتھ بڑا ہی شفقت آمیز ہوتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی اہم کام کر رہی ہوں، جونیر لوگ پہنچ جاتے ہیں تو وہ کام روک دیتی ہیں اور ہماری بات بڑی توجہ سے سنتی ہیں۔ بات غیر اہم بھی ہو تو اس وقت تک قلم نہیں کھولتیں جب تک ہم لوگ وہاں سے چلے نہ جائیں۔ گذشتہ برسوں سے وہ ایم فل کے [illegible] نام نہیں کروا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں جونیر اساتذہ کو ریسرچ کروانے کا موقع دینا چاہیے۔

اب تو آپا نے پی ایچ ڈی کے اسکالرز بھی لینے بند کر دیئے ہیں۔ بہت سے اسکالر آپا کے پاس سے بھاگ کر دوسروں کی پناہ میں آجاتے ہیں کیوں کہ آپا انھیں انگریزی کتابیں پڑھنے کو کہتی ہیں۔ چنانچہ آپا کے پاس اب یا تو ایسے اسکالرز ہیں جن کی عمریں ۵۰ برس سے تجاوز کر چکی ہیں اور جو اپنے فرائض سے سبکدوش ہونے کے بعد اس خواہش میں جی رہے ہیں کہ ادبی کام کرتے کرتے اس دنیا سے چلے جائیں تاکہ خاتمہ بالخیر ہو۔ یا پھر ایسی لڑکیاں ہیں جن پر بری نظر ڈالنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا۔ آپا اپنے اسکالرز کو خوب دوڑاتی ہیں۔ آپا کو بے عمل اور کاہل لوگ بالکل پسند نہیں۔ وہ ذہانت برجستگی اور موقع شناسی پر محنت اور عمل کو ترجیح دیتی ہیں چنانچہ آپا کو خوب گورے اونچی گردن کے سادہ لوح لیکن محنتی لوگ پسند ہیں۔ ان کی محنت کو محبت سے سراہتی ہیں۔ اور ان کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔

آپا احسان کرتی ہیں احسان مندی کو پسند کرتی ہیں اپنے محسنوں کو یاد رکھتی ہیں۔ چنانچہ وہ ڈاکٹر زور، پروفیسر مسعود حسین خان اور ڈاکٹر حفیظ قتیل کے نام بڑی عزت و احترام کے ساتھ لیتی ہیں ان کی خوبیاں اور کردار کے کچھ روشن پہلوؤں سے واقف کرواتی ہیں۔ آپا دوستوں کی دوست ہیں دشمنوں کو معاف کر دیتی ہیں ان کا نقصان نہیں کرتیں کسی کو اپنی فہرست سے خارج کر دیتی ہیں تو اس کا تذکرہ تک پسند نہیں کرتیں۔ آپا بہت ہی باخبر رہتی ہیں اور اپنی آنکھیں کھلی رکھتی ہیں ان کی اس باخبری میں مہدی بھائی کا بڑا حصہ ہے سنا ہے مہدی بھائی نے خفیہ طور پر ایک ٹیلی پرنٹر لگوا رکھا ہے جس پر ملک کی تمام یونیورسٹیز سے خبریں آتی ہیں۔

آپا کی دلچسپی تنقید اور دکنی ادب کی تحقیق سے ہے۔ تحقیق وہ بہت ڈوب کر کرتی ہیں۔ بہت تفصیلات اور جزئیات میں جاتی ہیں۔ جستجو اس قدر ہے کہ جس فرد کے بارے میں تحقیق کر رہی ہوں وہ اگر مرحوم ہے تو آپا تحقیق کرتے کرتے اس کی قبر تک پہنچ جاتی ہیں۔ قبر کی تصویر کھنچواتی ہیں۔ چنانچہ داغ پر تحقیقی مضمون لکھا تو ان کی قبر پر گئیں۔ قلی قطب شاہ کے بارے میں تحقیق کی تو ہر اس قبر پر گئیں جسے بھاگ متی کی قبر کہا جاتا ہے۔ بعض حلقوں کا کہنا ہے کہ آپا کی تحقیق کی کامیابی کی ایک وجہ علم کشفِ قبور سے واقفیت بھی ہے۔ اب تحقیق کے ایک نئے دبستان کا آغاز ہوا چاہتا ہے جسے "دبستانِ کشفِ قبور" کہا جائے گا آپا نے تحقیق کی ایک جدید تکنک بھی ایجاد کی ہے وہ قبر کی تصویر سے معلومات حاصل کرتی ہیں۔

عصری ادب پر بھی آپا کی نظر گہری ہے۔ وہ بڑی خوبی سے تخلیقی اور علامتی زبان کا استعمال بھی کرتی ہیں۔ اپنے گذرے ہوئے دنوں کے بارے میں آپا نے بڑا خوبصورت علامتی مضمون ریڈیو پر سنایا تھا۔

آپا کے اکثر اسکالرز کا خط بہت خراب ہوتا ہے۔ اکثر ایسا ہوا کہ آپا نے انداز سے تصحیح کر دی اور ایک اچھا مقالہ تیار ہو گیا۔

آپا یقین محکم عمل پیہم کے اصول پر یقین رکھتی ہیں میرا خیال ہے اقبال نے لفظ مردِ باعمل لوگوں کی علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ "حیدرآباد میں بیرونی شعرا" والے سمینار میں یونیورسٹی بعض وجوہات کی بناء پر مالی امداد فراہم نہ کر سکی اس کے باوجود یہ سمینار عالیشان پیمانے پر ہوا۔

آپا عام عورتوں سے بالکل مختلف ہیں۔ عام طور پر عورتوں کے موضوعات بچوں کی بیماریاں، شوہر کی سختیاں یا احمقانہ حرکتیں، کپڑے، زیور، فیشن ہوتے ہیں۔ میں نے آپا کو کبھی ان موضوعات پر گفتگو کرتے نہیں پایا۔ بلکہ نوازش کی شادی میں زیورات اور کپڑوں سے لدی احمق عورتوں میں بیٹھا دیکھ کر مجھے آپا کی قوت برداشت کا

بھی قائل ہونا پڑا۔ وہ عورت جس کی علمیت سے مردوں کو احساس کمتری ہوتا ہو وہ کیسے ان عورتوں میں رہتی ہوگی؟ گھر میں بھی آپا کے افراد خاندان میں وہ اکیلی عورت ہیں۔ اب ایک اور عورت یعنی بہو آگئی ہے باقی دو لڑکے اور مہدی بھائی ہیں۔ آپا ایک اچھی ماں ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ نوازش انجینئرنگ کالج میں لکچرر ہیں لیکن آپا بڑی چابکدستی سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو آہستہ آہستہ زہر دے رہی ہیں چنانچہ انھوں نے نوازش کی شادی کردی۔ دوسرا لڑکا حسین پائلٹ ہے۔ کسی پائلٹ کی ماں ہونا کتنا دل گردے کا کام ہے آپ سبھی جانتے ہیں۔

آپا میں حس مزاح بڑی طاقتور ہے مخصوص حلقوں میں لطیفے سناتی ہیں اور سنتی ہیں۔ خود لطیفے کہنے کے بجائے مہدی بھائی کو اکساتی ہیں۔ اور ان لطیفوں میں حسب ضرورت ترمیم و تصحیح کرتی جاتی ہیں اور جب لطیفے پر قہقہہ اٹھتا ہے تو اس طرح خوش ہوتی ہیں جیسے لطیفہ خود انھوں نے سنایا ہو۔

آپا کبھی کبھار لطیفے سنا بھی دیتی ہیں۔ آپا کے سنائے ہوئے لطیفے میں نے زندہ دلان حیدرآباد کی محفل لطیفہ گوئی میں سنا کر انھیں عام کیا۔ آپا اپنی حرکت اور عمل کا حساب رکھتی ہیں۔ جیسے کسی لطیفے پر اگر زوردار قہقہہ لگا دیا تو فوراً ہی ہونٹ سکیڑ لیں گی اور دوسرے لطیفے پر احتیاط سے قہقہہ لگائیں گی۔

آپا موسوی سید ہیں۔ سنا ہے ایسے لوگ جلالی ہوتے ہیں۔ میں نہیں جانتا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک طالب علم سے آپا سخت ناراض تھیں مجاور صاحب چاہتے تھے کہ آپا اسے معاف کردیں اپنی بات میں زور پیدا کرنے کیلئے مجاور صاحب نے کہا کہ اسے معاف کردیجئے۔ ورنہ آپ کی بد دعا سے وہ بندر بن جائے گا آپا نے کہا بننے دیجئے معمولی سی بات تھی مجھے یاد بھی نہیں رہی دوسرے روز گولو نظر [illegible] تو وہ طالب علم میرے عجیب سے انداز میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا پیٹھ میں کوب ابھر آئی تھی گردن اندر چلی گئی تھی۔ چہرہ سامنے جھک گیا تھا اور تلوے سپاٹ سے ہو رہے تھے مجھے انتظار حسین کا "آخری آدمی" یاد آگیا۔

—— لیکن وہ لڑکا سائنس گیا۔

سخت گرمیوں میں جب کہ ہر آدمی پانی کی بوند بوند کو ترس رہا تھا آپا کے گھر میں ایک بہت بڑا کنواں ہے جسے حیدرآبادی زبان میں "موٹھ کی باؤلی" کہتے ہیں اس میں پتہ نہیں کہاں سے پانی آرہا تھا۔ پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ پانی کہاں سے آرہا ہے آپا سے پوچھنے پر آپا صرف مسکرادیں۔ آپا جن سے ناراض ہوتی ہیں وہ بیمار ہو جاتے ہیں۔ وہ سنٹرل یونی ورسٹی وزیٹنگ پروفیسر بن کر چلی گئیں تو میں ان سے ربطہ نہ رکھ سکا اور پھر بیمار پڑ گیا۔ میں نے سمجھ لیا کہ آپا ناراض ہوں گی۔ اکثر مہدی بھائی بھی بیمار پڑ جاتے ہیں۔ ایسے میں آپا انھیں بار بار ٹیلیفون کر کے طبیعت پوچھتی ہیں اور مہدی بھائی کو صحت یاب ہونے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔

آپا بہت ہی مہمان نواز ہیں۔ اتنا کھلاتی ہیں کہ آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔ مہدی بھائی اسے چائے پلا کر ہوش میں لاتے ہیں۔ اور پھر اسے صحن میں بٹھا کر بہلانے کے لیے ایسی گفتگو چھیڑ دیتے ہیں کہ گھڑی میں تاریخ بدل جاتی ہے۔

آدمی ان کے گھر سے باہر نکلتا ہے تو ایک ہولناک سناٹا استقبال کرتا ہے۔ راستہ بھر بھوت پریت کا خوف، چوروں اور ڈاکوؤں کے وسوسے اور رہزنی کے ڈر سے دم نکلا جاتا ہے اور راستہ بھر

یہی دُعا کرتا ہے کہ اس بار بچ گیا تو کبھی وہ مغرب کے بعد سیدہ آپا کے گھر نہ جائے گا لیکن ہر بار یہ ارادہ یاجوج ماجوج کی کوشش ثابت ہوتا ہے۔

مہدی بھائی کے بغیر سیدہ آپا کی شخصیت مکمل نہیں ہو پاتی۔ مہدی بھائی آپا کے وہ نصف ہیں جس میں اخلاص، سادہ لوحی، شرافت، نیک نیتی، دوستی، بذلہ سنجی، مجلسی زندگی اور باغ و بہاریت شامل ہے۔ مہدی بھائی ہر اعتبار سے سیدہ آپا کے "شریکِ سفر" ہیں۔ مہدی بھائی کا ادبی ذوق بہت منجھا ہوا ہے دوستوں کے مخصوص حلقے میں ایکٹوٹی کرتے ہیں۔ کبھی کسی شوہر بیوی میں وہم کی دیوار کھڑی کر دی۔ کبھی کسی کہنہ مشق شوہر کا نام ادارہ بیابات میں درج کروا دیا۔ کسی کی ہجو لکھ دی۔ کسی کے معاشقے کو داستانی زبان میں لکھ دیا۔ مہدی بھائی کی ادبی صلاحیتوں کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مہدی بھائی بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھیں اور عنوان ہو — ڈاکٹر سیدہ جعفر "شریکِ حیات اور کارنامے"!

مختصر یہ کہ سیدہ آپا اور مغنی صاحب ہمارے شعبے کے ایسے پروفیسر ہیں ایسے اساتذہ ہیں جو ہمارے شعبے کا وقار بھی ہیں آبرو بھی۔ ان ہی لوگوں سے شعبے کا نام اور کام باقی ہے اللہ کرے ان کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم رہے۔ (آمین)!

△▽

عاتق شاہ
(حیدرآباد)

ناف

ناف ٹلنا ویسے
ایک محاورہ ہے لیکن سچ
پوچھئے تو یہ ایک ایسی خوفناک آندھی کا
نام ہے جو انسانی جسم کے اعصابی نظام کو
یکلخت معطل کردیتی ہے۔ اور آدمی نڈھال ہوکر
بستر پر پڑ جاتا ہے۔ جیسے الگنی پر پڑا ہوا ایک ایسا کپڑا
جسے ابھی ابھی پتھر پر پچھاڑ کر، دھوکر اور نچوڑ کر ڈال
دیا گیا ہو ــــ کسی نے اگر تڑپتی ہوئی مچھلی کو دیکھا ہو
تو اس کا تصوّر کرسکتا ہے کہ ناف ٹلا ہوا آدمی کس طرح
مچھلی سے مشابہ ہوتا ہے۔ حالانکہ آدمی اور مچھلی میں
زمین آسمان کا فرق ہے۔ اور ان دونوں کا مقابلہ کسی
طرح بھی ممکن نہیں لیکن جہاں تک تڑپنے کا تعلق
ہے یوں سمجھئے کہ آدمی دیکھتے ہی دیکھتے مچھلی بن جاتا ہے
ترم خاں اور تیس مار خاں جیسا شخص بھی ناف ٹلنے
سے بے بس ہوجاتا ہے۔ اور ان دونوں کی پہلوانی
آنکھ جھپکتے ہی ختم ہوجاتی ہے۔ اس خصوص میں
طاقتور اور کمزور دونوں برابر ہوجاتے ہیں
ویسے عورتوں کے مقابلے میں مردوں
کی ناف بہت [illegible]
[illegible]
میں

ایک آدھ واقعہ
سننے میں آیا تو آیا ورنہ نہیں۔
اگر کسی نے فلاں ابن فلاں کی ناف
ٹلنے کی اطلاع دی ہے تو فوراً یہ رائے
قائم کرلی جاتی ہے کہ خان صاحب نے ضرور
پانی کا کوئی بڑا گھڑا یا کوئی وزنی شے اُٹھائی
ہوگی۔ یا پھر محمد علی کلے بننے کے شوق میں کسی
باکسنگ کی ہوگی۔ اور مخالف پارٹی نے کھیل کے
آداب اور ریفری کی ہدایت کا خیال کئے بغیر ناف پر
ہاتھ چھوڑ کر گھونسہ مارا ہوگا۔ اگر ان دونوں صورتوں
کا ان پر اطلاق نہیں ہوتا تو ضرور کچھ ایسی ویسی بات
ہے۔ اور لوگ انھیں شُبہ کی نظروں سے دیکھنے
لگتے ہیں۔ اور ان کی ایک ایک حرکت اور چال پر
گہری نگاہ رکھی جاتی ہے۔ اور دیکھا جاتا ہے کہ
کہیں اُن کے [illegible] گفتگو [illegible] آواز میں تبدیلی تو
نہیں آرہی ہے! ــــ ان کے علاوہ بعض
مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی ناف ہی نہیں
ہوتی۔ اور اس طرح آنول کا مقدس
رشتہ جو ماں اور بچے کو آپس میں
ملاتا ہے ہیرے سے
[illegible]

جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ وہ مرد ہیں جنھیں ماؤں نے جنم نہیں دیا۔ اور نہ جن کا کوئی باپ تھا۔ آسمان نے انھیں نضا میں ایک سکے کی طرح اُچھالا۔ اور زمین نے انھیں اُچک لیا۔ اِس لیے وہ باپ کو پہچانتے ہیں اور نہ اپنی ماں کو۔ اگر جانتے ہیں تو خود کو۔ اپنی ذات کے علاوہ انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ اور نہ وہ کسی دوسرے کے بارے میں کچھ سوچنا چاہتے ہیں۔ اور نہ انھیں اِتنی فرصت ہے۔ صرف اپنی ذات کی شناخت کی کوشش میں دن رات لگے رہتے ہیں!

ماں، بہن اور محبوبہ میں وہ کوئی فرق نہیں کرتے۔ اِن کے تئیں سب عورتیں، عورتیں ہیں۔ اور عورت ہونا ہی ان کے خیال میں بڑی بات ہے۔ اور عورت کا وجود اس زمین پر اس لیے ہے کہ مرد اس سے دل بہلائے۔ آخر یہ ماں، بہن کیا چیز ہوتی ہے؟

بغیر ناف کے ان مردوں کا سماجی زندگی سے کیا ساری دنیا سے کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ہے کہ انھیں کسی جنگل میں رہنا چاہیے تھا لیکن وہ انسانی سماج میں آ گئے۔

صرف مرد ہی کیوں۔ بعض عورتیں بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں کوئی استثنائی صورت نہیں۔

ان عورتوں اور مردوں کو چھوڑتے ہوئے اکثر عورتیں اس خوفناک آندھی کا شکار ہوتی ہیں۔ اور کوئی بڑی بوڑھی اپنے مخصوص لب و لہجے میں پوپلائے ہوئے منہ سے کہتی ہے۔

ہائے، ہائے ـــ اری عورتو دیکھو تو میری بچی کو کیا ہوا؟

ایسے میں خود اس عورت کی آواز آتی ہے ـــ ہائے اللہ ـــ میں تو مرگئی!

سارے میں آواز گونجتی ہے۔ اور یہ فقرہ کسی لوک گیت کی طرح ایک عورت کے دل سے ہوتا ہوا دوسری اور تیسری سے لے کر کئی عورتوں کے دلوں میں سفر کرتا ہوا دُور دُور تک جا پہنچتا ہے۔ اور قریب قریب کی سب عورتیں اجتماعی طور پر اس مسئلہ سے نپٹتی ہیں۔ ورنہ نارمل حالات میں وہ ایک دوسرے کو لفٹ نہیں دیتیں۔ نجی زندگی میں داخل ہونے کی اجازت تو بڑی بات ہے!

تھوڑی دیر بعد وہ بوڑھیا یعنی لیڈر آف دی پارٹی کسی ملک کے وزیر اعظم کی طرح اعلان کرتی ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ چیختی ہوئی عورت کی عام صحت اچھی ہے۔ ایسی ویسی کوئی بات نہیں۔ اور نہ کسی مہمان کے آنے کے کوئی آثار ہیں۔ صرف ناف ٹل گئی ہے۔

کسی مہمان کی آمد، آمد ہو یا نہ ہو . . . لیکن ناف ٹلنے کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر عورتوں کی ناف کیوں ٹلتی ہے؟ جب کہ وہ مردوں کی طرح کوئی وزنی شئے نہیں اُٹھاتیں۔ اور نہ سخت محنت کا کام کرتی ہیں؟ اس کا جواب تو کوئی عورت ہی دے سکتی ہے لیکن کسی عورت سے یہ بات پوچھنا ایسا ہی ہے جیسے اکیلے میں دروازے کی کنجی والے سوراخ سے اس کمرے میں جھانکا جائے جہاں وہ اپنے محبوب کے ساتھ اپنی زندگی کے چند خوبصورت لمحے گذار رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ ایک غیر شریفانہ فعل ہے۔ اور کمینہ پن کی علامت بھی۔ یہی نہیں بلکہ عورتوں کی کلچرل ایکٹیویٹی میں ایک قسم کی مداخلت بیجا بھی۔ میں نہیں سمجھتا دنیا کا کوئی مرد ایسا غیر مہذب سوال کسی خاتون سے کر سکتا ہے جب کہ وہ خود ایسی تمام غیر مہذب حرکتوں کا ذمہ دار ہوتا ہے!

لیکن ایسی ایک بھول مجھ سے سرزد ہوئی [illegible] کی مجھے ایک بات یاد آ رہی ہے۔ ہوا یوں کہ خاندان کی ایک مامی اور چاچی قسم کی خاتون کی ناف ٹل چکی تھی۔ اور ہر گھر میں ان کی ناف پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ان ہی دنوں یہی خاتون

پریشان پریشان بہار سے گھر آئیں۔ اور بہت دیر تک شاید اسی موضوع پر گھر کی بزرگ خواتین سے سرگوشیوں میں بات کرتی رہیں۔ لیکن ایک بات جو میں نے ان کے تعلق سے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ وہ بار بار کمرے میں جاکر بستر پر دراز ہو جاتی تھیں۔ ان کی یہ حالت مجھ سے دیکھی نہ گئی۔ اچانک میں ان سے پوچھ بیٹھا۔ آنٹی۔ آنٹی! آپ کی ناف کو کیا ہوا؟

میں ناف کی تاریخ اور جغرافیہ سے قطعی واقف نہیں تھا۔ اس استفسار کے پیچھے دس گیارہ برس کے بچے کی وہ تشویش اور ہمدردی تھی جو اسے اپنی آنٹی سے تھی یا شاید اس کا وہ جذبہ تھا کہ ممکن ہے کہ وہ اپنی آنٹی کے کچھ کام آسکے۔

لیکن آنٹی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بڑی چبھتی ہوئی نظروں سے انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ پھر اپنے لال لال ہونٹوں کو دانتوں سے دباتے ہوئے، ہنسی کھکھلاتے ہوئے بولیں، بدمعاش! ذرا ٹھہر تو۔ میں تجھے بتاتی ہوں۔

وہ مجھے پکڑنے کے لیے آگے بڑھیں لیکن میں وہاں سے بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے میں نے دیکھا، آنٹی کی خوبصورت ناک کی نوک پر مسکراہٹ ایک بجلی کی طرح چمک رہی تھی۔

اور میں ــــ میں بھاگ گیا!

اور آج تک بھاگ رہا ہوں!

اُس تاریخ سے لے کر آج تک میں نے ایسا نامعقول اور بے ہودہ سوال کسی خاتون سے نہیں کیا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ناف کے تعلق سے میری معلومات اتنی ہی ناقص اور محدود ہیں جتنی پہلے تھیں۔ ویسے ناف کے بارے میں کچھ نہ جاننا ہی اچھا ہے۔ ورنہ یہ ایک ایسا بھنور ہے جس میں پھنسنے کے بعد کوئی باہر نہیں آتا!

انسانوں کی طرح قوموں اور ملکوں کی بھی ناف ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کسی نہ کسی اعصابی جھٹکے کی وجہ سے ٹل جاتی ہے۔ اور جب یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے تو فوراً ایک دوسری طاقتور قوم اپنی بحری، بری اور فضائی فوج کے ساتھ دوسرے کمزور ملک کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور بیمار قوم کے صدر اور وزیراعظم سے کہتی ہے، یور ہائنس! ہم آپ کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ کیوں کہ ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور اچھے دوست کی تعریف یہی ہے کہ دوسرے دوست کے کام آئے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری موجودگی سے کوئی اور قوم آپ کے ملک کی طرف بُری نظر سے نہ دیکھ سکے گی!

آپ کا ہمارا اتحاد زندہ باد

دنیا کا امن پائندہ باد!

عالمی انسانی بھائی چارگی زندہ باد!!

ملکوں، قوموں اور انسانوں کی طرح زمین کی ناف ٹل جاتی ہے تو ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ چاروں طرف دھواں اُٹھنے لگتا ہے۔ پھر آندھیاں آتی ہیں، سیلاب آتے ہیں۔ اور شدید زلزلے کے جھٹکوں کے ساتھ زمین شق ہو جاتی ہے۔ اور شہر کے شہر اپنے ہزاروں، لاکھوں زندہ انسانوں کے ساتھ زمین میں دفن ہو جاتے ہیں۔ اور ان کو بچانے کیلئے کوئی ملک آگے نہیں آتا۔ اور نہ ویٹو کا استعمال یہاں کام آتا ہے!

ایسے میں کہیں دور زمین کے کسی نہ کسی حصے میں کوئی دیہاتی عورت چیخ اٹھتی ہے ــــ

ہائے بھگوان ــــ میں تو مر گئی!

اسرار جامعی

نیا سال ۱۹۸۹ء

(۱)
نیا سال تم کو مبارک ہو لوگو ۔۔۔ یہ کیوں ہو مبارک یہ سنو جا بھی ہے
خوشی ہے کہ اس پُر خطر دور میں بھی ۔۔۔ یہ اک سال گزرا مگر تم نہ گزرے

(۲)
غم ہو کہ خوشی سب کو بہر حال مبارک ۔۔۔ جو مفت میں ملتا ہو ہر اک سال مبارک
لیکن یہ دعا دل سے نکلتی ہے کہ اسرار ۔۔۔ بوڑھا نہ بنائے تو نیا سال مبارک

(۳)
سوکھی ہوئی روٹی ہو کہ تر مال مبارک ۔۔۔ جو دال کے رسیا ہوں انھیں دال مبارک
بھوکوں کا شکم دیکھ کے کہتا ہے یہ اسرار
زردار کو اس ڈھول کی "ہڑتال" مبارک

رؤف رحیم

جنتا کو لوٹ کھاؤ نیا سال آگیا ۔۔۔ پھر قیمتیں بڑھاؤ نیا سال آگیا
کھاتہ نیا کھلاؤ نیا سال آگیا ۔۔۔ پچھلے کو بھول جاؤ نیا سال آگیا
سہلاؤ اپنے شعر سے زخمی دلوں کے گھاؤ ۔۔۔ جدّت کوئی دکھاؤ نیا سال آگیا
پچھلے برس چھپایا تھا دیوان آپ نے ۔۔۔ ردّی میں بیچ کھاؤ نیا سال آگیا
آبادی بڑھ رہی ہے تو کس بات کا ہے غم ۔۔۔ گل پھر نیا کھلاؤ نیا سال آگیا
اک سال عمر گھٹنے لگی یہ بھی جان لو ۔۔۔ ایسے نہ گل کھلاؤ نیا سال آگیا
کب تک پرانی غزلیں سناؤ گے اے رحیم
تازہ غزل سناؤ نیا سال آگیا

سراج نرملی

آگیا ہے دیکھئے اب سال ایٹی نائین کا ۔۔۔ یہ برس خوشیوں کا ہو اور ہو سکون و چین کا
لقمے لقمے کو ترستا میں رہا پچھلے برس ۔۔۔ اے خدا! بابک بنا دے گولڈ کی اک مائین کا
اس برس پہنوں گا مخمل سلک ٹیری کاٹ اولن ۔۔۔ اب نہیں پہنوں گا مطلق میں کوئی کپڑا سائین کا
شہر میں میرے ہے اک بیر برانڈی کی کنال ۔۔۔ اور سوئمنگ پول ہوٹل میں مرے ہو وائین کا
گھپ اندھیرا تھا جہاں محبوب میرا آگیا ۔۔۔ بزم روشن ہو گیا، دھوکا ہوا سن شائین کا
انگلیاں ہوں پانچ گھی میں، سر کڑھائی میں سراج
اور مبارک ہو تمہیں یہ سال ایٹی نائین کا

بچّو

نیاز سواتی (پاکستان)

★

ہے جواں اب تُو خود کما بچّو! میری انکم نہ اب اُڑا بچّو!
خود ہی شادی کی تجھ کو جلدی تھی اب شکایت نہ لب پہ لا بچّو!
ساتھ رہنے میں ہوتی ہے برکت ہو نہ ماں باپ سے جُدا بچّو!
فالتو شے مجھے سمجھتا ہے کیا یہی ہے مرا صِلہ بچّو!
تجھ سے پہلے ہوا ہوں میں پیدا آگے تُم مرے نہ جا بچّو!
زن مریدی کو چھوڑ بہرِ خدا ہے ہمارا یہ مشورہ بچّو!
بارھواں بچہ ہونے والا ہے ختم کر اب یہ سلسلہ بچّو!
سامنے والدہ کے، بیگم سے چونچلے کر نہ برملا بچّو!
اہلیہ کا ہر ایک ناز اُٹھا کام ماں باپ کے نہ آ بچّو!
کام بیرے کا والدہ سے لے اپنی بیگم کو مت تھکا بچّو!
غصّہ بیگم پہ ہے تجھے لیکن ڈانٹ بچّوں کو مت پلا بچّو!
چھوڑ ماں باپ کی دعاؤں کو لے سُسر ساس کی دُعا بچّو!

زندگی بھر مجھے ستاتا رہا
اب نہ برسی مری منا بچّو!

غزل

(جناب جمیل یوسف سے معذرت کے ساتھ!)

دیا نہ میری طرف کچھ بھی دھیان بھول گئے بُلا کے گھر میں مجھے میزبان بھول گئے
خیالِ حلوہ میں کھوئے تھے اس قدر واعظ نماز پڑھنے سے پہلے اذان بھول گئے
وہ پہلے چائے نہ لاتے تھے لائے چائے تو آپ جو ساتھ چائے کے لانے تھے نان بھول گئے
جنابِ سیٹھ تو دیتے ہیں جان دمڑی پہ میں کیسے مانوں وہ اپنا لگان بھول گئے
ہمارے در پہ برستی تھیں دیگیں شب کو نشے میں حضرتِ واعظ مکان بھول گئے
جہاں سے جیت کے ممبر بنے تھے چھنّن خان اُس اپنے گاؤں کا نام و نشان بھول گئے

وہ مجھ سے کرتے ہیں فرمائشیں چکن کی نیاز
میں اک کلرک ہوں یہ میہمان بھول گئے

عابد معز [حیدرآباد]

گھڑی نامہ

وقت کی قدر کیجیے، گیا وقت پھر ہاتھ نہیں آتا۔

اس قسم کے محاورے ہم بچپن سے سنتے آ رہے تھے لیکن ہمیں وقت کی اہمیت اور قیمت کا اندازہ کبھی ہوا ہی نہیں۔ ہم سوچتے رہتے کہ وقت کی قیمت اور اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔ ہمارے لیے صبح، دوپہر، شام اور رات سب برابر تھے۔ نیند سے بیدار ہوتے، اسکول جاتے تو صبح ہوتی، اسکول سے لوٹ آتے اور کھانا کھانے پر دوپہر ہوتی، کھیلنے جاتے تو شام ہوتی اور سوتے تو رات ہوتی تھی۔ میٹرک کامیاب کرنے کی خوشی میں ماموں جان نے ایک گھڑی دی تو ہمیں پتہ چلا کہ ایک دن کس طرح چوبیس گھنٹوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ ہر ایک گھنٹہ کی قیمت ساٹھ منٹ ہوتی ہے۔ ایک منٹ ساٹھ سکنڈ پر بھاری ہوتا ہے آپ چاہیں تو ہر سکنڈ کو چند حصوں میں تقسیم کر کے وقت کی قدر کر سکتے ہیں۔ اس دن سے آج تک کوئی نہ کوئی گھڑی کلائی تھامے ہم سے چمٹی رہتی ہے۔ ہم نے اور بھی لوگوں کو دیکھا جو گھڑیوں کو ساتھ چمٹائے پھرتے ہیں ـــــــ ہم سوچتے ہیں، اگر گھڑی نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ دنیا کیسے جاگتی شاید اب تک سوتی رہتی۔ ہم تو یہاں تک سمجھتے ہیں کہ جو گھڑی نہیں لگاتا وہ ترقی نہیں کر سکتا، اس لیے تو قدیم زمانے کے لوگ ہم سے کم ترقی یافتہ تھے جب گھڑی ایجاد ہوئی تو ہم نے وقت کی قدر کرنی سیکھی۔ حکومتوں نے عوام کو وقت کا احساس دلانے کے لیے جگہ جگہ گھنٹہ گھر بنوائے جہاں گھنٹے بجا کر وقت کا اعلان کیا جاتا تھا۔ وقت کچھ اور بڑھا تو مینار تعمیر کروا کر ان میں ایک، دو جگہ بلکہ چار سمتوں کے لیے چار گھڑیاں نصب کروائی گئیں۔ دیگر اہم عمارتوں پر بھی گھڑیاں نصب ہوئیں جو اپنے آپ گھنٹے بجا کر گویا وقت کی قدر کرنے کے لیے کہتی تھیں۔ جب گھڑیاں عام ہو چکیں، ہر دو میں سے ایک ہاتھ پر گھڑی آ چکی تو یہ تشویش معدوم ہوا۔ گھڑیوں کو اب اونچا اٹھانے کے بجائے کلائی پر باندھا جاتا ہے۔ ویسے بھی

صنفِ نازک کو گھڑی اور چوڑیاں
کلائی کا مقصد یہی ہے کہ اس پر گھڑی باندھی جائے یا چوڑیاں پہنی جائیں۔
پہننے میں تھوڑی سی الجھن پیش آتی ہے. فیصلہ نہیں کر پاتیں کہ چوڑیوں کے ساتھ گھڑی باندھی جائے یا نہیں۔
چوڑیوں کی جھنکار کے ساتھ گھڑی کی کھنکار کچھ عجیب سی لگتی ہے۔ اسی لیے بعض، ایک کلائی پر گھڑی باندھتی ہیں
تو دوسری میں چوڑیاں پہنتی ہیں لیکن انھیں دوسرے ہاتھ میں چوڑیاں نہ پہننے کی خلش رہتی ہے۔
بہترے لوگ اپنی گھڑیوں کو وقت سے دس پندرہ منٹ آگے رکھتے اور امید کرتے ہیں کہ وہ اپنا کام
اس ترکیب کی بدولت ٹھیک وقت پر انجام دے سکیں گے لیکن اپنی گھڑی کو وقت سے آگے رکھنے والے خود وقت
سے بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنے آپ کو وقت کے ساتھ رکھنے کے لیے اپنی
گھڑی کو وقت سے آگے رکھنا شروع کیا۔ پہلے دس منٹ گھڑی آگے ہوئی بیس منٹ تیس منٹ اور پھر منٹوں
سے گھنٹوں کے حساب گھڑی آگے چلنے لگی۔ آخر تنگ آکر انھوں نے گھڑی باندھنا ہی ترک کر دیا۔ کہتے ہیں جس نے
وقت کو پیچھے کر دیا وہ شخص اپنی زندگی میں کامیاب ہوا۔

یوں تو گھڑی کو وقت کے ساتھ چلنا چاہیئے لیکن اکثر گھڑیوں کا وقت اپنے مالک کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔
دفتر کے ملازمین کی گھڑیوں کے کانٹے کام شروع کرنے کے وقت پیچھے ہٹ جاتے ہیں اور دفتر کے اختتامی
وقت پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ لنچ کا گھنٹہ نوے منٹ کا ہو جاتا ہے۔ ہم ایک سکریٹری سے واقف ہیں جس کی گھڑی
میں دس اس وقت تک نہیں بجتے جب تک کہ باس کام پر نہیں آجاتا۔ باس کے دفتر چھوڑتے ہی سکریٹری کی گھڑی
پانچ بجاتی ہے۔ دن تمام سکریٹری باس کو دیکھ کر اپنی گھڑی کا وقت آگے پیچھے کیا کرتی ہے۔ اکثر گھڑیاں ریڈیو یا ٹی وی کا
سے ملائی جاتی ہیں۔ ریلوے کی گھڑیاں ہمیشہ ٹھیک وقت بتلاتی ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ریل گاڑیاں شاذ و نادر
ہی وقت پر چلتی ہیں۔ ہم اپنی گھڑی، ریلوے کی گھڑی سے ملا کر مطمئن رہتے ہیں کہ ہم ہی اکیلے نہیں اور بھی کئی لوگ وقت
سے پیچھے چل رہے ہیں۔

جس طرح ہمارے خیالات آپس میں نہیں ملتے، اسی طرح ہماری گھڑیوں کے وقت کبھی ایک دوسرے
سے نہیں ملتے۔ اس پر طرہ یہ کہ ہر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ اس کی گھڑی صحیح ہے۔ دلیلیں پیش ہوتی ہیں ۔ میری
گھڑی ٹی وی کے مطابق ہے۔ میری گھڑی بی بی سی سے ملی ہوئی ہے۔ میری گھڑی جاپان کی بنی ہوئی ہے جو کبھی
غلط وقت نہیں بتلا سکتی۔ میری گھڑی سوئس میڈ ہے وغیرہ وغیرہ۔

وقت کی قدر کی لوگوں پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن گھڑیوں کے لیے ٹھیک وقت بتلانا بہت ضروری
ہے گھڑیوں کے تھوڑا بھی آگے یا پیچھے چلنے پر انھیں بدل دیا جاتا ہے۔ آج کل دستیاب گھڑیوں کا ٹھیک وقت
بتلانے میں جواب نہیں ہے پھر بھی بعض گھڑیاں چلتے چلتے تھک کر سست ہو جاتی ہیں یا تیز چلنے لگتی ہیں۔ بعض
گھڑیوں پر موسم کا اثر ہوتا ہے۔ گرمی میں تیز تو سرما میں سست چلتی ہیں۔ بارش میں بھیگنے پر جہاں آپ نمونیا سے متاثر
ہو سکتے ہیں وہیں آپ کی گھڑی کو مرمت کے لیے دینا پڑتا ہے۔

جن کے پاس وقت کی کمی ہو وہ وقت دیکھنے کے لیے گھڑی لگاتے ہیں۔ ہم جیسے کئی لوگوں کے پاس وقت
بہت زیادہ اور کام کم ہوتا ہے۔ وقت دیکھ کر کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ہم کام کی نوعیت، لاپرواہی اور کاہلی
کی آمیزش سے وقت کا تعین کرتے ہیں۔ اب بھلا آپ ہی بتلائیے ہمیں وقت دیکھنے کے لیے گھڑی کی ضرورت

کیوں ہو۔ وہ ادر ہوں گے جو وقت کے غلام اور تابع ہوں گے ہم تو وہ ہیں جن کا وقت تابع ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم گھڑی لگاتے اور رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ ایک فیشن ہے۔ گھڑی سے ہماری اہمیت و امارت کا بھی اندازہ ہوتا ہے علاوہ وقت کے پابند ہونے کا دعویٰ بھی کرسکتے ہیں۔

گھڑیاں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ہاتھ پر باندھنے، جیب میں چھپانے، میز پر رکھنے دیوار پر لٹکانے اور ٹانکنے اور عمارتوں پر نصب کرنے کی ہمہ قسم کی گھڑیاں آج کل تیار کی جارہی ہیں۔ الارم والی گھڑیاں بہت کام آتی ہیں۔ عموماً نیند سے بیدار ہونے کے لیے الارم رکھا جاتا ہے اور الارم لگاکر سونے سے نیند بہت گہری اور میٹھی آتی ہے۔ اس نیند کو گھوڑے بیچ کر سونا بھی کہا جاتا ہے۔ اس نیند کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اس وقت تک نہیں ٹوٹتی جب تک کہ الارم نہ بجے۔ بعض مرتبہ الارم بجنے کے باوجود بھی گھوڑے بیچ کر سونے کا شغل جاری رہتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم چار بجے صبح کا الارم رکھ کر سو گئے۔ نیند شام کے چار بجے بجنے والے الارم سے بیدار ہوئی۔ ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں جو الارم رکھ کر سوتے تو ہیں لیکن اٹھتے ہماری وجہ سے ہیں ان صاحب کے الارم سے ہماری نیند ٹوٹ جاتی ہے اور ہم الارم بند کرانے کے لیے انھیں نیند سے اٹھاتے ہیں۔

بعض گھڑیوں میں کنجی بھری جاتی تھی۔ کچھ لوگ وقت پر کام کرنے کے عادی نہیں ہوتے لیکن کنجی ٹھیک وقت پر دیتے ہیں! انھیں وقت پر کنجی دینے کی لت پڑجاتی ہے۔ ہمارے ایک دوست کی گھڑی مرمت کے لیے گئی ہوئی تھی۔ جتنے دن گھڑی، گھڑی ساز کے پاس رہی، وہ پابندی سے ہمارے پاس صبح آٹھ بجے آتے ہمیں نیند سے بیدار کرتے اور گھڑی کی کنجی بھر جاتے تھے۔ ان معدودے چند لوگوں کو چھوڑ کر اکثر لوگ گھڑی کو کنجی دینا بھول جاتے ہیں۔ گھڑی کام کرنا بند کردیتی اور وقت رک جاتا ہے! اسی لیے اکثریت کی مدد کے لیے آٹو میٹک الکٹرانک، کوارٹز اور سولار گھڑیاں ایجاد ہوئیں۔ ان گھڑیوں کو نہ کبھی کنجی دینی پڑتی ہے اور نہ ہی یہ گھڑیاں کنجی نہ دینے سے رکتی ہیں۔ بلا تھکان صاحب گھڑی کو پیچھے چھوڑتی وقت کے ساتھ چلتی ہی رہتی ہیں۔

گھڑیاں ــــ مختلف شکل وصورت اور سائز میں دستیاب ہیں۔ کوئی چوکور ہے تو کوئی چاند جیسی گول کسی کی گھڑی بیضوی شکل کی ہے تو کسی کی لانبی جیسی گھڑیوں کا فیشن ختم ہوچلا ہے۔ جیب میں گھڑی رکھنے سے نقصان یہ تھا کہ ہم لوگوں کو تبلا نہیں سکتے تھے کہ ہمارے پاس گھڑی ہے۔ صنف نازک کی گھڑیاں، نازک، سبک اور چھوٹی ہوتی ہیں! بعض زنانی گھڑیاں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ چالیس سال کی عمر سے اوپر والی خواتین بمشکل وقت دیکھ سکتی ہیں آج فیشن کا تقاضا ہے کہ گھڑی کو اس طرح باندھا جائے کہ خود کو کم اور دوسروں کو زیادہ نظر آئے جب گھڑیاں فیشن کی خاطر پہنی جانے لگیں تو اسے زیور اور کپڑوں کی طرح بدلا بھی جانے لگا ہے مختلف تقاریب اور اوقات کے لیے مختلف گھڑیاں زیب کلائی ہوتی ہیں۔ کپڑوں سے میل کھاتی ہوئی گھڑیاں بھی بازار میں ملنے لگی ہیں۔ کلائی پر باندھنے کے علاوہ ہم نے گلے کے حسن میں لاکٹ کی جگہ اور انگوٹھی میں گھڑی لگی ہوئی دیکھی ہے۔ ادھر ہم نے موٹر اور اسکوٹر کے علاوہ سیکل کے ہینڈل قلمکار کے پن مزدور کے ہتھوڑے اور ڈاکٹر کے اسٹیتھسکوپ میں گھڑیاں لگی دیکھی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ آئندہ گھڑی کو تسمہ یا چین کی مدد سے قید رکھنے کا طریقہ ختم ہوجائے اور گھڑیوں کو راست جلد پر چپکایا جاسکے گا۔ یا پھر "پیس میکر" کی طرح جسم کے کسی موزوں حصّہ میں فٹ کردیا جائے گا جس سے وقت ہی نہیں اچھے اور برے وقت کا ویسے بھی اندازہ ہوسکے گا۔

تسمہ یا چین سے صاحب گھڑی کی امارت اور ان کے ذوق کا پتہ بھی چلتا ہے۔ ہم ایک مرد کے ہاتھ میں کنگن دیکھ کر حیران ہوئے لیکن استفسار پر پتہ چلا کہ وہ گھڑی کی طلائی چین تھی۔ سخت گیر قسم کے لوگ گھڑی کو کلائی پر اس طرح کس کر باندھتے ہیں کہ ہاتھ خون کی کمی سے نیلا ہو جاتا ہے۔ بعض نازک کلائیوں میں خاصی بڑی گھڑی مضبوط چین کے ساتھ لگی ہوتی ہے جسے دیکھ کر ہتھکڑی کی یاد آتی ہے۔

گھڑیوں کی بہتات کے اس دور میں چند اشخاص ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھڑی باندھنا پسند نہیں کرتے۔ بعض بے حد مصروف ہوتے ہیں صبح سے شام تک مصروف رہتے ہیں۔ انھیں گھڑی لگانے اور دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ دوسرے لوگ انھیں وقت کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ بعض حضرات گھڑی رکھنے والوں سے وقت پوچھتے ہیں۔ وقت معلوم ہونے کے بعد سوال کرتے ہیں "آپ کی گھڑی ٹھیک چل رہی ہے؟" سُست یا تیز تو نہیں، گھڑی کا وقت کہاں سے ملا ہوا ہے"۔ چند لوگ گھڑی تو باندھتے ہیں لیکن وقت دیکھنا بھول جاتے ہیں۔ ؎

ہاتھ پر یوں تو ہے گھڑی لیکن ÷ وہ نہیں جانتے بجا کیا ہے؟

گھڑی وقت تبلانے کے علاوہ اور بھی کئی کام کرتی ہے۔ تاریخ، دن و مہینہ اور سال تبلانا عام بات ہے موسمی پیش قیاسی بھی کرتی ہے۔ چند ایک گھڑیاں قلب کے مریضوں کو وقت کے ساتھ دل کا حال بھی تبلاتی ہیں۔ غائب دماغ لوگوں کے لیے گھڑی میں ان کی اپنی پہچان ہوتی ہے تو دیگر گھڑیوں میں ڈاٹا بینک کی سہولت ہوتی ہے۔ دوست احباب کے پتے اور ٹیلیفون نمبر معلوم کیجئے، تاریخ پیدائش، شادی کی تاریخ یاد کیجئے حساب کتاب کے لیے گھڑی میں کیلکولیٹر بھی موجود ہے سودا سلف خریدیئے اور حساب گھڑی پر کر لیجئے۔ مستقبل میں امید ہے کہ گھڑی میں ٹیلیفون ہوگا، ٹیپ بھی نصب ہو سکیں گے وقت کے لحاظ سے موسیقی بج رہی ہوگی جام جم سے بھی کسی معاملہ میں کم نہ ہوگی۔ بازار میں ہمہ اقسام کی گھڑیاں دستیاب ہونے کے باوجود ہمیں گھڑی سازوں سے شکایت ہے کہ وہ ایسی گھڑی کیوں نہیں بناتے جو ہم سب کو وقت کی قدر کرنا سکھائے! △▽

اسمٰعیل آذر (کٹک)

یہ آذر کی سائیکل وہ ان کی سڑک

وہ آذر سخن گو، ظرافت نگار
جو اردو کا شاعر ہے اک بے مہار

بفرمائش افسرانِ نگم!
کہ جن کی ہے شاعر پہ چشم کرم

لکھی ہے یہ اک نظم بے قیل وقال
کہ جس میں دکھائی ہے سیکل کی چال

جو سڑکوں پہ چل کر مچاتی ہے شور
اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

مرقع دکھانا تو دشوار تھا!
مگر بلدیہ کا یہ اصرار تھا

کہ دکھلاؤں ایسی "روانیِ فکر"
کہ سیکل سواروں میں ہو جس کا ذکر

عجب ہے نہ دیکھا خدا واسطے
کجا ایک شاعر کجا راستے

سڑک وہ بھی بی بلدیہ کی سڑک
کہ ہر موڑ پر دل کو بولے دھڑک

علاوہ ازیں یہ بھی تھا مسئلہ
سفر کا ہو کس طرح طے مرحلہ

کوئی ایسی سیکل تو کامل نہیں
جو ہے بھی تو سیکل میں داخل نہیں

نہیں اس میں موجود انگریزی آرٹس
وہ خود انڈین انڈین اسکے پارٹس

نہ رستم، نہ بھولو، نہ دارا ہے یہ
جو دیکھے وہ بولے "کھٹارا" ہے یہ

طبیعت میں شوخی نہ کوئی مذاق
وہ سڑکیں ادھر کس قدر طمطراق

یہ حالات تھے جن سے ڈرتا تھا جی
مگر سعیِ مشکور کرنی بھی تھی

جو تھیں دقتیں کہہ دیا برملا!
غرض دیکھئے یہ "کھٹارا" چلا

اچھلتا ہوا اور مچلتا ہوا
چنے مونگ سڑکوں پہ دلتا ہوا

دھواں داد میوزک بجاتا ہوا
نئے راگ سڑکوں پہ گاتا ہوا

پھٹی آستینیں چڑھاتا ہوا
مسافت کی پینگیں بڑھاتا ہوا

لچکتا ہوا، لڑکھڑاتا ہوا
لڑھکتا ہوا، بھڑبھڑاتا ہوا!

کبھی کوڑا کرکٹ مسلتا ہوا!
غلاظت کے سر کو کچلتا ہوا

یہ گایوں سے بھینسوں سے ہٹتا ہوا
وہ آوارہ سانڈوں سے کٹتا ہوا

بگڑتا ہوا تاؤ کھاتا ہوا!
وہ بھتّا کے پیڈل دباتا ہوا

سناسن سنن سنسناتا ہوا!
جھناجھن جھنن جھنجھناتا ہوا!

روانی میں کچھ زور کرتا ہوا!
رکاوٹ میں کچھ شور کرتا ہوا!

ادھر آٹو میٹک اترتا ہوا!
ادھر آٹو میٹک ابھرتا ہوا

یہ کٹ مار جبا دو جگاتا ہوا — وہ چو طرفہ مجمع لگاتا ہوا!
یہ لائسنس چک سے مکرتا ہوا — وہ نرغے میں آکر سُدھرتا ہوا!
یہ آگے سے سر کو پٹکتا ہوا — وہ پیچھے سے دُم کو جھٹکتا ہوا!
یہ نظروں سے اوجھل پھسلتا ہوا — وہ ہنس کر گڑھے سے نِکلتا ہوا!
رواں نالیوں کو بھنبھناتا ہوا — وہ رنگین فوٹو کھنچاتا ہوا!
وہ بالو کے ٹیلوں پہ جاتا ہوا — اچھلتا کدکڑے لگاتا ہوا!
زمیں کو یہ پینگ کرتا ہوا! — وہ جھرنوں میں جمپنگ کرتا ہوا!
کبھی بچوں جیسا ہمکتا ہوا! — کبھی مثلِ ہد ہد کی ہدکتا ہوا
ادھر آگئی سامنے شاہ راہ — ادھر نکلی بے ساختہ واہ واہ
دھڑلے سے اس سمت مڑتا ہوا — لپکتا ہوا بلکہ اڑتا ہوا!
محبت کا دم دل میں بھرتا ہوا — وہ سو جان سے اس پہ مرتا ہوا
وہ چہرے کا میک اپ اڑاتا ہوا — وہ ہونٹوں کی لالی چھڑاتا ہوا
زنخداں کے گڑھے پہ بھرتا ہوا — وہ دیوانہ ہو ہو کے گرتا ہوا
یہ چنچل ابھاروں سے ہٹتا ہوا — مروت میں پھنستا پھنساتا ہوا
یہ پبلک کو یکساں سمجھتا ہوا — ہر اک سے برابر الجھتا ہوا
یہ ریلے پہ ریلا لگاتا ہوا! — وہ ڈھیلے سے ڈھیلا بجاتا ہوا
ادھر ہے جو یاروں سے دل بستگی — ادھر ہمسفر سے بھی کچھ دل لگی
یہ تنگی کا باجا اٹھاتا ہوا — وہ شاعر کو پیہم نچاتا ہوا
وہ پل پل اُٹھا کر جھٹکتا ہوا — وہیں سیٹ پر پھر پٹکتا ہوا
یہ کیچڑ سے تن کو پٹاتا ہوا! — وہ شاعر کو تھوڑا چٹاتا ہوا
یہ سیلابی ندیا پہ آتا ہوا! — وہ شاعر کو بجرا بناتا ہوا
چلا تھوڑی منزل لٹکتا ہوا — کبھی لوٹ آیا بھٹکتا ہوا!
کبھی جی میں آیا کیا منہ سے پھُس — نکالی کبھی کِس کے آواز ٹھس
یونہیں ہے غرضِ یہ کھٹارا رواں — بس اب دیکھ لیں شاعرِ نکتہ داں

وہ سودی و اکبر کا اب لڑور
یہ آذر کی داہی تباہی کا زور

◎

رؤف خوشتر (بیدر)

پانچواں مہمان

بچے ڈاروِن کی تھیوری کے مثالی کردار کے اُچھلتے
کودتے دور کو پار کر کے تعلیمی دور میں قدم رکھتے ہی سنجیدہ، خاموشی
پسند، کتاب شعار اور گائیڈ شکار ہو جاتے ہیں جس سے گھر کا اچھا خاصا پُرشور اور
ہنگامہ پرور ماحول ٹھٹھک کر رہ جاتا ہے۔ ہم ایک عام ایشیائی کی طرح بیرونِ خانہ اور ایک عام
ہندوستانی کی طرح اندرونِ خانہ شور شرابہ اور ہنگامہ پسند کرتے ہیں۔ اب ہمارے گھر میں خاموشی
سے یوں لگتا ہے جیسے ہمارا گھر ہند اور ایشیاء سے کہیں باہر آگیا ہے ہمارا یہ گھر چار بچوں (TWO EACH)
اور ایک بھرپور بیگم سے بھرا پُرا ہے اب آپ کہیں گے اور بجا طور پر کہیں گے کہ گھر میں اتنا ہجوم ہونے پر بھی
خاموشی کیسی؟ دراصل تعلیمی نصاب کی بھرمار اور مہروں کی یلغار نے بالترتیب بچوں اور بیگم کی زبان ہر کر لی ہے!
عصری تعلیم میں کچھ بات ہو یا نہ ہو لیکن یہ تعلیم بچوں کے چہروں سے معصومیت اور سرپرستوں کی جیبوں
سے دولت غائب کر دینے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ بچے آگے اپنی زندگی میں ذمہ داریوں کا بوجھ
اُٹھائیں یا نہ اُٹھائیں اب وہ کتابوں اور بیاضوں کا بھاری بوجھ اُٹھا اُٹھا کر جھکے جا رہے ہیں اور چھوٹے
چھوٹے چہروں پر موٹے موٹے چشموں کے ساتھ زمین میں چھپی ہوئی دولت نہیں بلکہ اپنی صحت تلاش کر رہے
ہیں سنا ہے اسی کتابی مشقت اور بستہ برداری کی بہم ورزش کے سبب اب اسکولوں میں کھیل کود کا
پیریڈ نکال دیا گیا ہے اور گیمس ٹیچر کچھ کام نہ ہونے کے سبب ہوٹلوں میں بیٹھ بیٹھ کر چائے اور سگریٹ
پی پی کر اپنی دولت اور صحت برباد کر رہے ہیں۔ ہمارے بچے اور ان کے بستے دونوں طالبِ یکتا
ہیں کسی زمانے میں ہمارے گھر کے آگے ہاتھی گھوڑے کھڑے رہتے تھے اب مجبوری دور ہے
صبح ہی صبح دو سائیکل رکشے کھڑے رہتے ہیں۔ اگلے رکشے میں کتابوں اور بیاضوں
سے بھرے بستے اور پچھلے رکشے میں موزوں، جوتوں اور ٹائیوں سے گھرے
بچے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک گونہ خاموشی دونوں رکشوں میں
پائی جاتی ہے دیکھا گیا ہے کہ

میں ایک صحت مند چپراسی رکشوں میں بھرے ہوئے بستوں کو کلاس روم اور کلاس روم سے رکشوں تک لانے لیجانے کے لیے مامور ہے۔ بچے اسکول سے خالی توشہ دان اور بھرپور ہوم ورک کے ساتھ تھکے تھکے گھر واپس آتے ہیں اور آتے ہی اپنے ہوم ورک میں جُٹ جاتے ہیں۔ اور ہم اپنے ہوم ورک میں . . . . جی ہاں بچوں کے جوتے موزے اور یونیفارم نکالنا ہی کا اب ہمارا ہوم ورک ٹھہرا۔ یہ سب نکالتے ہوئے مصری تعلیم کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ ماں باپ کا کام بچے کریں یا بچوں کا کام ماں باپ کریں ایک ہی تو بات ہے۔ بھلا بتلایئے ایسے مصروف شب و روز میں بچوں کے لیے شرارت، ہنسی مذاق اور شور شرابے کی گنجائش کہاں نکل آتی ہے سو وہ خاموش رہتے ہیں۔

ایک اور ہستی جس پہ موقوف ہے گھر کی رونق یعنی بیگم صاحبہ . . . تو وہ بھی حالات کے پیشِ نظر اگلے وقتوں کی ہیروئن مینا کماری کی فلم "میں چپ رہوں گی" کے ٹائیٹل پر عمل پیرا ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ان کی زبان دانی اور چرب زبانی کے آگے ہم بھی پانی بھرتے تھے (عملاً پانی تو ہم اب بھی بھرتے ہیں) اب مکان میں مچھروں نے ایسی صورتِ حال پیدا کر دی ہے کہ ان کے جھرمٹ میں بیگم کی صورت بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ خون کے گھونٹ پی پی کر خون پینے والوں کا مقابلہ کرتی رہیں لیکن مچھروں نے ان کی گفتار کی رفتار بند کر دی لہٰذا اب وہ مون برت رکھ رہی ہیں اور تختی پہ سارے احکامات لکھ لکھ کر ہمیں تبلاتی ہیں اور ہم ایک سعادت مند شوہر کی طرح ان کے احکامات بجالاتے ہیں۔ تالیاں بھی بجاتے ہیں کہ مچھر چلے جائیں بلکہ مسل جائیں مچھر بھگانے کے لیے دوائیں دعائیں اور سارے حربے استعمال کرنے پر بھی مچھر ٹس سے مس نہیں ہوئے بلکہ مسائل اور قیمتوں کی طرح ان میں اضافہ ہوتا رہا ہر کمرے میں پنکھے لگائے گئے اس کے باوجود وہ گھر سے فرار نہیں ہوئے بلکہ گھر میں ہو لیتے رہے گویا ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ ہوا نے کام کیا

آخر کار مچھروں کو بھگانے کی ایک تدبیر سوجھی اور بازار سے نصف درجن ٹینس ریکٹ خرید لائے۔ پڑوسیوں نے سمجھا کہ اب کرشنن برادرس کی خیر نہیں ہم نے گھر کے ہر فرد کے ہاتھوں میں ایک ایک ریکٹ تھما دی اور اسے کمروں میں وقتاً فوقتاً لہراتے رہنے کہا۔ اس سے مچھر گھر بدر ہو جائیں گے اب ایسے ہی بہادری دکھلانے کے دن آ گئے ہیں اگلے وقتوں میں آباء و اجداد میدانِ جنگ میں تلوار چلاتے تھے اب ہم اپنے گھروں میں ریکٹ لہراتے ہیں اور اپنے حصہ میں آئے ہوئے دشمنوں یعنی مچھروں کو بھگاتے ہیں ریکٹ سے انڈور گیمس کھیلنے کا اعزاز بھی ہمیں حاصل ہو رہا ہے۔ بعض مچھر اتنے بے شرم ہوتے ہیں کہ وہ لانگ شاٹ لگانے پر ہی فرار ہوتے ہیں۔ جب کوئی ملاقاتی ہمارے یہاں آتا ہے تو ہم چائے بسکٹ بعد میں اور ریکٹ پہلے تھما دیتے ہیں۔ ایک دن بوم الدولہ ہمارے یہاں تشریف لائے حسبِ پروگرام ریکٹ ان کے ہاتھوں میں تھمانا چاہا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اور انھوں نے کانپتے ہاتھوں سے ریکٹ یوں لی جیسے فلم مغلِ اعظم میں اکبر اپنی رانی سے تلوار لیتا ہے وہ شاہانہ انداز میں گویا ہوئے :

بوم الدولہ :- ریکٹ نامور کھلاڑیوں کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے ناکام شاعر کے ہاتھ میں نہیں۔

ہم :- ایک غزل کی بنجر زمین سے سر ٹکرا ٹکرا کر مرنے اور مچھروں کے سامنے بے بس جینے سے بہتر ہے کہ ریکٹ بردار مچھروں کا مردانہ وار مقابلہ کیا جائے۔ لو یہ ریکٹ سنبھالو تم جس طرح یہ ریکٹ گھماؤ گے انھیں کروڑ مچھروں کی تقدیریں لرزنے لگیں گی، اُن کا مستقبل کانپنے لگے گا۔ خدا تمہیں اس جنگ میں جلالِ مچھر سے بچائے۔

بوم الدولہ :- یہ ریکٹ جس نے بڑے بڑے سورما مچھروں کا سر پھوڑ دیا ہے محافظ ہے نہ صرف میرا بلکہ میرے بیوی بچوں کا

بھی۔ لیکن کیلنڈر گواہ ہے کہ اس ظلِ زنانی نے مدت ہوئے ٹینس کھیلنا چھوڑ دیا ہے۔

ھم :- جان کی امانت پاؤں تو عرض کروں کہ آپ نے زندگی بھر کبڈی اور گلی ڈنڈے کے علاوہ کچھ اور کھیل نہیں کھیلا۔

الغرض ہم اس طرح مغلِ اعظم کے انداز میں گفتگو کرتے رہے اور خوش ہوتے رہے آخر ہم کو شاندار ماضی میں گم رہنے کا بڑا شوق ہے۔ ہم اپنے اپنے ریکیٹ لہراتے رہے اور مچھروں کو بھگاتے رہے ادھر مچھروں نے بھی مقابلے کی ٹھان رکھی تھی ہمارے خاموش ہوتے ہی غول کے غول ہم پر چھا جاتے اور مچھروں کی گھٹا ہم دونوں کے درمیان دیوار بن جاتی۔ اصول، سونا چاندی، کہر، اور اختلاف کی دیوار کے متعلق سنتے آئے تھے مگر اب مچھروں کی دیوار سے سر ٹکرا رہے تھے، مچھر اب اجتماعی طور پر بوم الدولہ کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ اب بوم الدولہ کے سر کو مچھروں سے بچانا ضروری ہوگیا۔ اس لیے زور دار انداز میں ہم نے جو ریکیٹ اِن کے سر کے اوپر چلائی تو چالاک مچھر دہشت پسندوں کی طرح غائب ہوگئے مگر بوم الدولہ کا خالی سر ریکیٹ کی بھرپور زد میں آگیا اور وہ سر کو پکڑ کر بیٹھ گئے۔ اور بول اُٹھے ؎

کیا یہ نمرود کی پیٹائی ہے ٭ مہمانی میں میرا بھلا نہ ہوا!

ھم :- حضرت ایک طرح سے ہم سب نمرود کے ساتھی ہیں وہ تو اعلانیہ شیطان کا حامی تھا ہم نے اپنے اپنے دلوں میں انا کے بت سجا رکھے ہیں اور اس کی دیکھ بھال میں لگے رہتے ہیں۔ ہم لوگوں کو ایسے ہی لانگ شاٹ چاہئیں اسی وقت ہمارا دماغ ٹھکانے آسکتا ہے"۔ ابھی ہم کچھ اور کہنا چاہتے تھے کہ زنانے سے بیگم صاحبہ نے زوردار مغلیہ انداز میں تخلیہ کہا تو بوم الدولہ ہمارے ریکیٹ اور [illegible] کے ساتھ فرار ہوگئے جنھوں نے شاید فلم مغلِ اعظم دیکھی تھی اور تخلیہ کے معنی جانتے تھے۔ نئی نسل مچھروں [illegible] مسلمانوں کی اردو اور وہ بھی یہ گاڑھی اردو کیا جانے سنا ہے اپنے گھر میں بوم الدولہ بیوی اور نصف درجن بچوں کو کئی سو مچھروں سے بچانے کی کوشش میں ریکیٹ ہوا میں لہراتے ہوئے گا رہے ہیں "کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں تمہاری، سو بار لے چکا ہوں میں امتحاں تمہارا"۔ اور افسوس کر رہے ہیں کہ ریکیٹ کو فضا میں لہرانے سے اُن کے وہ قلعے اور محلات مسمار ہو رہے ہیں جن کو اُنھوں نے ہوا میں بنائے تھے۔

تو صاحب جو کام ہم نہیں کر سکے وہ کام مچھروں نے کر دکھایا یعنی بیگم کی زبان بند کر دی اور یوں بھی بیگم چوہوں اور مچھروں سے ہی ڈرتی ہیں اب وہ تختی پر شعر لکھتی ہیں ؎

سُنے جاتے نہ تھے تم سے میرے دن رات کے شکوے
ریکٹ لہراؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ!

اس طرح بچے اور بیگم چُپ چُپ ہیں اور ہمارا گھر خاموشی کا شکار ہو کر رہ گیا ہے۔ سوچا کہ شور شرابے اور چہل پہل کے لیے چار بچوں کے بعد پانچویں مہمان کا آنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ ہمارے یہاں دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں اب یہ خواہش ہوئی کہ نیا مہمان تیسری صنف سے ہو اور یوں بھی آج کل سیاسی زبان میں تیسری دنیا، نفسیات میں تیسری آنکھ، ادب میں تیسرا درجہ، اور فلموں میں تیسری منزل مشہور ہے اس لیے ہم بھی تیسری صنف کے خواہشمند ہوتے نئے مہمان کے لیے جیب کا بھاری ہونا بھی ضروری ہوگیا، ہم نے تنخواہ میں کچھ پس انداز کر کے پانچویں مہمان کی آمد کی تیاریاں شروع کر دیں۔ کسی طرح سے یہ بات بچوں کو معلوم ہوگئی۔ وہ خوش تھے کہ ان کی دلچسپی کا سامان آرہا ہے۔ آخر وہ مبارک ساعت آپہنچی

جب ہمارے یہاں پانچواں مہمان آگیا۔ بے حد خوبصورت، دیدہ زیب، پیارا پیارا، بچے بڑے خوش تھے اور غیر متوقع طور پر گا رہے تھے ؎

آگیا آگیا جلوہ والا آگیا.... آگیا آگیا جلوہ والا آگیا!
رنگ جمانے آگیا کھیل دکھانے آگیا.... آگیا آگیا جلوہ والا آگیا!

محلے والوں میں مٹھائی تقسیم کی گئی تو تعجب سے کہنے لگے کہ اس گرانی اور پریشانی کے زمانے میں بھی آپ پانچویں مہمان کی ہمت کر بیٹھے۔ بڑا رنگین ہے آپ کا پانچواں مہمان... !جی ہاں پانچواں مہمان ویڈیوکان... (VIDEO CON) بے شمار ٹی وی سیٹوں کی بھیڑ میں ہم نے ویڈیوکان ٹی وی کا انتخاب اس لیے کیا کہ اس کا تعلق احمد نگر سے ہے چونکہ ہمارا تعلق شہر بیجاپور سے ہے اور ہم نے تاریخ میں پڑھا ہے کہ بیجاپور کے سلطان علی عادل شاہ احمد نگر سے بیوی لائے تھے تو ہم نے سوچا کہ بیوی نہ سہی ٹی وی ہی احمد نگر سے لائیں۔

کسی زمانے میں مسلم علاقے ہی سلم (SLUM) علاقے ہوا کرتے تھے اب حالات بدل گئے ہیں اب گھروں میں رفیع ہی نہیں ریفریجریٹر بھی ہے۔ بیوی اور ٹی وی ساتھ ہیں۔ مہ جبین، زہرہ جبیں ہی نہیں کپڑے دھونے کی مشین بھی ہے۔ تو اب خوشحالی آگئی ہے۔ بگڑے دہاب، اے مسبب الاسباب ہمیں اتنی خوشحالی نہ دے کہ کیسٹوں اور ٹی وی پروگراموں میں اذان کی آواز سنائی نہ دے اور ہمارے ہاتھوں سے تسبیح کے دانے بکھر پڑیں اور ان کی جگہ ریموٹ کنٹرول لے لیے۔

ہمارے گھر پانچویں مہمان کے آتے ہی محلے کے لوگ چلے آئے جن کو دیکھ کر ہم گھر سے فرار ہو گئے ہمیں کیا پتہ تھا کہ ہمارا پانچواں مہمان اپنے ساتھ پچاس مہمان لائے گا۔ ہمارا دیوان خانہ مہمانوں سے بھر جائے گا۔ کوئی پانی مانگ رہا تھا، کوئی پنکھا چلانے کہہ رہا تھا، کوئی اپنے بچے بہلانے کی فرمائش کر رہا تھا، کوئی ہمیں اپنے نئے جوتوں کی دیکھ بھال کے لیے کہہ رہا تھا۔ ہم برامدے میں بیوی اور بچوں کے ساتھ کھڑے کھڑے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کو دیکھ رہے تھے جو اندر بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے، محلے والوں کے لیے پانچواں مہمان ڈیلی ویژن (دوردرشن) اور ہمارے لیے نیلی ویژن (دُور درشن) ہو گیا بچے چپ چپ تھے اور اپنا جلوہ والا گیت بھول گئے تھے لیکن ہمیں فلم مدر انڈیا کا گیت یاد آ رہا تھا جس کو ہم حسبِ عادت تھوڑا سا بدل کر گا رہے تھے ؎

دُکھ بھرے دن بیتے رے بھیا، اب دُکھ پاؤ رے

بھرتے ہو تو پانی بھر

شکیل اعجاز (اکولہ)

گرمیوں کے دن تھے۔ رات مچھروں سے لڑتے ہوئے گذری۔ گرمی کے سبب ہم قمیض اور بنیان کے بغیر سو رہے تھے۔ باقی آدھے جسم پر پتلی سی رضائی اوڑھ رکھی تھی۔ مچھر پیٹھ پر کاٹتے تو تلملا کر چت سو جاتے۔ پیٹ پر کاٹتے تو کروٹ لے لیتے۔ لیکن مچھروں نے کسی کروٹ چین نہ لینے دیا۔ ساری رات مچھروں کو مارنے کے جوش میں خود کو چانٹے لگاتے رہے۔ پورا جسم اپنے ہی چانٹوں سے سُرخ ہو گیا۔ مزید جھنجلاہٹ یہ کہ رات بھر میں ایک بھی مچھر ہمارے ہاتھ سے مر نہ سکا۔ اپنے اس حال پر بہت غصہ آیا۔ اب غصہ اتارتے ہیں تو اس کا مطلب یہ کہ خود کو مزید چانٹے لگائیں۔ اپنے نقصان کا ڈر ہو تو آدمی فوراً ٹھنڈے دماغ سے کام لیتا ہے چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا اور مچھروں کو اپنے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ صبح چار بجے ذرا آنکھ لگی تھی کہ باہر زور زور سے ٹین کے ڈبے کھڑکھڑانے اور لوہے کی بالٹیاں بجنے کی آوازیں آئیں۔ تھوڑی دیر بعد یہ آوازیں آدمیوں اور عورتوں کی آوازوں کے نیچے دب گئیں۔ پھر آدمی خود ایک دوسرے کے نیچے دبنے لگے۔ ہم نے آہستہ سے کھڑکی کھولی تو سمجھ میں آ گیا کہ نل پر پانی کے لیے جھگڑے ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر قبل کالو نے چھوٹو کو نالی میں گرا دیا تھا جس سے اس کا آدھا چہرہ کالا ہو گیا تھا۔ اس نے رخصت مٹانے کے لیے کالو کو اس بُری طرح دھکا دیا کہ وہ لڑکھڑا کر گرا تو سر میں بالٹی پہن لی۔ چنانچہ دونوں اپنی اپنی خفتیں مٹانے کے زعم میں خود مٹ جانے کو تیار ہیں۔ جھگڑا جاری رکھنے کی دوسری وجہ آس پاس کی چند کھڑکیاں ہیں جن پر رُعب جما کر ہیرو شپ حاصل کرنا ہے۔ بھاگ دوڑ چیخ پکار سن کر محلے کے بہت سارے لوگ اپنی اپنی نیندوں کے خوبصورت پیالے توڑ کر جلتے تو تماشا کی طرف آنے لگے ہیں۔ سمندر کی طوفان میں

گھری ہوئی کشتی کا منظر بہت دل چسپ ہوتا ہے بشرطیکہ دیکھنے والا کشتی پر نہیں، ساحل پر ہو۔ لڑائی جھگڑے بھی بہت پُر لطف ہوتے ہیں لیکن دور سے دیکھنے والوں کے لیے! اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس میں شدّت آتی رہے۔ تماشہ کبھی ختم نہ ہو۔ فریقین کے دُور کے رشتہ داروں نے مداخلت کر کے جھگڑے کی شدّت کو کم کیا۔ دلچسپی کم ہونے پر تماش بین ناامید ہو گئے کہ خواہ مخواہ اتنی لذیذ نیند گنوائی۔ نہ کسی کا سر پھوٹا نہ نصیب۔ کسی کا دل ٹوٹا نہ ٹانگ۔ جنازہ تو کیا خون بھی نہیں نکلا۔ موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دو تین دور اندیش اور تجربہ کار قسم کے نوجوان، جو فریقین کے قریبی رشتہ دار تھے انھیں الگ الگ لے جا کر بظاہر سمجھانے لگے کہ بھائی محلّہ میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے رہنا چاہیئے۔ نفرت سے باز آؤ۔ لیکن ان کے جملے صاف بتا رہے تھے کہ وہ جھگڑا بڑھانے کے لیے ساز باز کر رہے ہیں۔ دوسرے نے کہا ــــ

"کیوں اس غریب کو ڈانٹتے ہو بھائی۔ جھگڑا تو دوسرے گدھے نے شروع کیا تھا۔ شرافت کی دنیا نہیں ہے۔ جو ڈرتا ہے سب اُسی کو ڈراتے ہیں"؛

"میں کہاں ڈرتا ہوں۔ ابھی اُس کا سر توڑ دوں گا۔ مجھے چھوڑ دو"۔

[نوجوان نے فوراً امر) کا ہاتھ چھوڑ دیا اور بولا ــــ]

"بولنے کی باتیں ہیں بھیّا۔ کوئی کسی کا سر وَر نہیں توڑتا۔ سب اپنی اپنی جان کو ڈرتے ہیں"؛

"یہ دیکھو اس کے سر سے خون نکل رہا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے خود اپنے کانوں سے دیکھا کہ اس کے سر میں بالٹی پھنس گئی تھی"

"نہیں۔ بالٹی میں میرا سر پھنس گیا تھا"؛

"ایک ہی بات ہے اور یہ ادھر اُدھر کٹی پتنگ کی طرح ڈول رہا تھا۔ کوئی بھی مدد کے لیے نہ آیا"۔

"ناک بھی دیکھو کیسی چھل گئی ہے تمہاری"؛

"اور چپٹی بھی ہو گئی ہے"؛

"چپٹی تو پہلے ہی سے ہے"

"اور اُدھر دیکھو وہ مسٹنڈا کیسے دانت نکالے کھڑا ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا ابھی اس کی چٹنی بنا ڈالتا۔"

"جانے دو یار۔ ہم لوگ کتنا بھی لڑ لیں۔ آخر رہنا تو ایک ساتھ ہی ہے"؛ (ایک نئے لڑکے نے بیچ میں کہا)

"وہ تو ٹھیک ہے بے وقوف (نظر بچا کر آنکھ ماردی) لیکن روز روز مار کھا کر جینا بھی کوئی جینا ہے۔ کل ظفر نے بھی تو مارا۔ شریفوں کا زمانہ نہیں ہے۔ میرا بس چلے تو ایک ایک کی چٹنی بنا دوں"۔

"کس کی۔ شریفوں کی"۔

"نہیں یار۔ بدمعاشوں کی چٹنی"۔ (چٹنی والے لڑکے کو اس کے والد نے ڈانٹا کہ زیادہ چٹنی چٹنی مت کر۔ تجھے cIDITY کی شکایت ہے۔ کل ہی ڈاکٹر نے چٹنی کا پرہیز بتایا ہے۔ خبردار چٹنی تو کیا اس کا نام بھی زبان پر لایا تو۔) اس دوران بات سُن سُن کر جیکیو کو وہ جوش آیا کہ کالو کے پیٹ میں دو تین زوردار گھونسے اور لاتیں جما دیں۔ وہ زور سے اپنا پڑوسی کا پاجامہ پکڑ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پڑوسی کے پاجامہ کا کمر بند اس جھٹکے سے کھل کر نیفے میں چلا گیا تھا۔ اُسے خطرہ کا احساس ہوا تو اپنی گود کا بچہ زمین پر دے ٹپکا اور دونوں ہاتھوں سے پاجامہ کو اُوپر کھینچتے ہوئے پہلی دفعہ حلق

آواز نکالی کہ یہ کیا تماشہ مچا رکھا ہے۔ تم لوگ جھگڑا دیکھنے آئے ہو یا جھگڑنے۔
"دیکھنے" (پتہ نہیں کس نے کہا)
"صادق بھائی۔ جب سے یہ بلا شروع ہوئی۔ تم تو بڑا لطف اٹھا رہے تھے اب یہ اچانک کس گھبراہٹ میں پاجامہ ڈھیلا ہو رہا ہے؟"

اُدھر جوابی حملے کے طور پر چیکو کے سر میں کالو کے بھائیوں نے ایک ساتھ دو تین بالٹیوں کا تاج پہنا دیا تھا جسے سنبھالنا اس کے لیے مشکل ہو گیا۔ لڑائی میں دوبارہ شدت آگئی۔ واپس جاتے ہوئے لوگ پُر امید ہو کر لوٹ آتے۔ اور بظاہر "ارے روکو۔ ارے یہ کیا لگا رکھا ہے" کہنے لگے۔ کھڑکیاں اب پہلے سے زیادہ کھل گئیں۔ سارے جھگڑے، پانی کے لیے ہو رہے تھے اور اس افراتفری میں نل خالی بہہ رہا تھا۔ ایک لڑکی جس کا نمبر سب سے آخر میں تھا اپنی پھوٹی ہوئی بالٹی لگا کر چپ چاپ پانی بھرنے لگی۔

پیٹ اور پاجامہ پکڑ کر زمین پر بیٹھے ہوئے کالو کے بڑے بھائی آنکھیں ملتے ہوئے لنگی اور لنگی پہنے ہوئے باہر آئے۔ (پہلی لنگی جہاں سے پھٹی ہوئی تھی اُسے چھپانے کے لیے دوسری لنگی ڈال رکھی تھی) انھوں نے جس انداز سے گھر سے باہر گلی میں قدم رکھا اُسے دیکھ کر صاف سمجھ میں آگیا کہ اندر سے کسی نے زبردستی باہر دھکیلا ہے! انھیں جھگڑے سر پیر معلوم نہ تھا اور نیند بھی پوری طرح ٹوٹی نہ تھی۔ چنانچہ زور زور سے چلّانے والے ہر شخص کے پیچھے پیچھے دس قدم شمال کی طرف چلتے۔ پھر دس قدم جنوب کی طرف۔ اس دوران کالو اپنے پڑوسی کا پاجامہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ پڑوسی سید اپنے گھر کی طرف لپکے اور کمرے میں پہنچ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ پاجامہ رُسوائی سے بچنے کا ایک ذریعہ ہے لیکن یہ ہمیشہ پاجامے کے ذریعہ رُسوا ہوتے ہیں۔ پچھلے ماہ سیّد صاحب سے ان کی لڑائی ہو رہی تھی یہ اُن پر بھاری پڑ رہے تھے کئی دھواں دھار گھونسے جما چکے تھے کہ بے خیالی میں سید صاحب کا پاؤں اِن کے پاجامے پر پڑ گیا۔ رات کے ذرا سے اِنٹرول لے رہا تھا۔ پاؤں پڑنا تھا کہ جھٹکے سے کمر بند کھلا اور نیفے میں چلا گیا۔ انھیں پتہ نہ چلا۔ تھوڑی دیر بعد احساس ہوا کہ کوئی چیز جسم سے پھسل رہی ہے۔ ایک ہاتھ سے پاجامہ پکڑ کر دوسرے سے لڑنے لگے۔ لیکن پاجامہ قابو میں نہ آتا تھا۔ مجبوراً اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنا پڑا۔ اب کے سید صاحب نے گھونسوں کی وہ بارش کی کہ دیکھتے ہی بنی۔ آخر آخر میں سید صاحب بڑے اطمینان سے کبھی ان کی ناک پکڑتے کبھی کان کھینچتے۔ یہ خود اتنا غصّہ میں تھے کہ آس پاس دروازے کھڑکیوں میں عورتیں نہ ہوتیں تو اُسی حالت میں دو دو ہاتھ کر لیتے۔ لیکن قسمت ہے۔ ایک پاجامہ کے ہاتھوں رسوا ہونا پڑا۔ اور اپنے گھر کے دروازے تک پاجامہ پکڑے مار کھاتے کھاتے آنا پڑا۔ بعد میں بیوی سے بہت جھگڑا کیا کہ کمر بند ذرا لمبا رکھنے میں تیرے باپ کا کیا جاتا ہے؟ کہتے ہیں بعد میں کئی دنوں تک ایک پر ایک دو پاجامے پہن کر آتے اور جھگڑے کے لیے لوگوں سے خود گھسیٹتے رہتے۔ بدقسمتی سے آج پھر نیند کے غلبہ کے سبب ایک ہی پاجامہ پہن آئے تھے۔ اب کمرے میں بیٹھے ٹوتھ برش سے کمر بند کھینچنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ لیکن نیفہ میں پھنسا ہوا کمر بند بھی قسمت کی طرح ہے کہ ہاتھ آتے آتے نکل جاتا ہے۔ ایسے وقت میں جی چاہتا ہے کہ ہم کسی جادو سے چھوٹے ہو جائیں اور نیفہ میں گھس کر اس کم بخت کو دونوں ہاتھوں سے کھینچتے ہوئے باہر لائیں۔ (اس سراسیمگی میں نیفہ بھی پھٹ جائے تو پرواہ نہیں۔ دیکھ لیں گے) خصوصاً ایسے نیفے کا کمر بند جسے ہم خود پہنے ہوئے ہوں کبھی کبھار بہت جان لڑانے، کئی ترکیبیں استعمال کرنے کے بعد کمر بند کے دو تین دھاگے ہاتھ لگتے ہیں ہم کمالِ احتیاط سے انھیں انگوٹھا کر کمر بند کی گردن پکڑتے ہیں پھر

دوسری ٹانگ نیفے میں اس طرح ڈالتے ہیں کہ کمربند کو اس کی خبر نہ ہو۔ اب اچانک حملہ کرکے اُسے گردن سے پکڑ کر نیفے سے باہر لاتے ہیں۔ انتقامی جذبے سے سرشار ہو کر اُسے اتنا باہر کھینچتے ہیں کہ وہ نہ صرف دوسری طرف سے اندر چلا جاتا ہے بلکہ تھوڑی دیر بعد پورا کمربند ہمارے ہاتھوں میں آجاتا ہے۔ ایسے موقع پر آدمی انڈرویئر پہنے ہو تو ٹھیک، ورنہ اُسے دوبارہ نیفے میں ڈالنے کے لیے کمرہ اندر سے بند کرنا نہایت ضروری ہے۔ ہندوستان اور پاکستان میں کھدائی کے دوران کبھی عجیب و غریب چیزیں دریافت ہوتی ہیں اور کبھی کارآمد۔ لیکن پچھلے دنوں پاکستان میں کھدائی کے بغیر ایک پاجامہ دریافت ہوا ہے یہ عجیب و غریب تو نہیں عام پاجاموں جیسا ہے لیکن بہت کارآمد ہے اسی لیے بہت سے لوگ اس پر اپنا حق جتانے کے لیے کمربند کسی پر اتر آئے ہیں۔ یہ پاجامہ فیض احمد فیض کا ہے۔ پاجامہ کے بھی کیا نصیب کھُلے۔ خدا جسے چاہے عزت دے شکر ہے پاجامے کے لیے یہ چھینا جھپٹی فیض کے انتقال کے بعد یعنی اُس وقت شروع ہوئی جب اُنھوں نے اسے پہننا چھوڑ دیا ہے۔ فیض کو انتقال سے قبل ذرا سا بھی اشارہ مل جاتا کہ ان کے بعد پاجامے کو یہ شہرت ملنے والی ہے تو ممکن ہے ذرا اچھے قسم کا خصوصی پاجامہ سلواتے۔ اوروں کا تو حال معلوم نہیں لیکن ہمارے ایک بڑے سے شاعر اس واقعے کے بعد اپنے پاجاموں پر خصوصی توجہ دینے لگے ہیں۔ پتہ نہیں لوگ فیض کے پاجامے کو پہن کر زندگی کے کس شعبے میں بہتر کارکردگی کی اُمید باندھے بیٹھے ہیں۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ جملہ معترضہ بہت طویل ہوگیا۔ یوسف ناظم صاحب اسی لیے ہم پر ناراض ہوتے ہیں کہ تم کو عنوان رکھنے کی تمیز نہیں۔ عنوان کچھ رکھتے ہو، لکھتے کچھ اور ہو۔ محلّے میں نل پر لڑائی ہو رہی تھی۔

بلڈنگ کی کھڑکیوں کی طرف دیکھ کر کالو گالیاں دینے لگا۔ اس کے پہلوان بھائی اس کے پیچھے کھڑے ہو کر صرف ہاتھ نچانے لگے اور آواز کے بغیر ہونٹ ہلانے لگے۔ کالو نل کی طرف گیا یہ بھی گئے۔ اس نے وہاں سے اپنا پچکا ہوا ڈبہ اُٹھایا اُنھوں نے بھی کسی کی بالٹی اٹھالی پھر کچھ سوچ کر واپس رکھ دی اور اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے نکڑ تک آئے۔ وہ اہلیانِ محلّہ کو ثبوت کے طور پر ڈبے کی حالت بتانے لگا کہ دیکھو غلطی کس کی ہے۔ اس دوران وارڈ ممبر اپنے کھیر خوار بچے کو لیے آئے۔ لڑکے نے کہا صاحب، جب سے آپ وارڈ ممبر ہوئے ہیں محلّے میں جھگڑے بہت بڑھ گئے ہیں۔

"ہاں ہاں بہت بڑھ گئے ہیں" (ایک ساتھ کئی لوگوں نے غصّہ میں کہا)

اس سے پہلے کہ تنازعہ کچھ اور بڑھتا شیرو بھائی بیچ میں آگئے بولے ـــــ

"جھگڑو مت بھائیو۔ ایک واقعہ سنو۔ سب لوگ عید کا چاند دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کسی کو نظر نہ آتا تھا آخر ایک آدمی نے چلّا کر کہا "دیکھو دیکھو وہ میری انگلی کی سیدھ میں۔ وہ ہری بلڈنگ پر"۔ لوگوں نے کہا چاند کہاں ہے وہ تو اپنا وارڈ ممبر ہے۔ اُس آدمی نے کہا دیکھ لو جی بھر کے۔ یہ بھی کبھی کبھی نظر آتا ہے"۔

"خواہ مخواہ ہنسی میں بات مت ٹالو (اب ایّوب بھائی کو غصّہ آگیا) ان وارڈ ممبر سے پوچھو کہ ہر سال گرمیوں میں ہمارے ہی محلہ میں پانی کی تکلیف کیوں ہوتی ہے۔ آپ لوگ آس پاس کے کسی بھی محلّہ میں جاتیے۔ سندھی کیمپ ہو یا رن بسیس نگر یا کچھ اور کہیں پانی کی تکلیف نہیں۔ اس وقت وہاں نل بے کار بہتے رہتے ہیں۔ سارے زمانے کی تکلیفیں سالا اپنے ہی نصیب میں آگئی ہیں"۔

گورنمنٹ اپنی ہمدرد ہے۔ ستا ستا کر تکلیف پروف بنا دینا چاہتی ہے۔ کیوں راہی صاحب۔ وہ کہتے ہیں نا کہ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہوجانا۔

"لیکن سوچنے کی بات ہے کہ جب سے یہ وارڈ ممبر ہوئے ہیں جھگڑے بڑھ گئے ہیں۔"

"اس میں ضرور پڑوسی وارڈ ممبر کا ہاتھ ہے جو جھگڑے بڑھا کر میری مقبولیت کو دھکا لگانا چاہتا ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ یہ صرف ایک معمولی محلہ کا معاملہ ہے اور تم محض ایک چھٹ بھیے وارڈ ممبر ہو کسی دیش کے وزیراعظم نہیں کہ لوگ سازشیں کریں گے۔"

کالو کے پہلوان بھائی نے ہاں میں ہاں ملائی کہا "ہاں کسی دیش کے وزیراعظم نہیں کہ لوگ . . . "

اب کالو کو اپنے بھائی پر ہی غصہ آگیا پیچھے پلٹ کر بولا "آپ کو کچھ خبر بھی ہے کہ صبح سے یہاں کیا ہورہا ہے بس ہر بات میں ہاں میں ہاں ملا رہے ہو۔ آپ کو سونے سے فرصت ملے تو پتہ چلے کہ صبح پانی بھرنے میں کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ ہزار بار کہا کہ غیر ضروری کاموں میں اتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں ایک پرائیویٹ نل لے لو۔ لیکن آپ کو یہ فضول خرچی نظر آتی ہے۔ ٹی وی خریدنا بہت ضروری تھا کہے نا؟ اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کر ڈالو تو ایک بوند پانی نہ ملے۔ اب اسی سے پیاس بجھاؤ۔ جس سے تفریح کی پیاس پوری نہیں مٹتی اس سے پانی کی پیاس کیا مٹے گی۔ خود کو پانی بھرنا پڑے تب پتہ چلے۔"

حاضرینِ جھگڑا کے سامنے اور خصوصاً اپنی بیوی کے سامنے پہلوان نے یہ زبان درازی سنی تو دست درازی پر اتر آئے۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چانٹا بھائی کے لگا دیا۔ اب یہی دونوں لڑنے لگے لوگ ہنسنے لگے۔ ہنستے ہنستے ایک سترہ اٹھارہ برس کے لڑکے کا پاؤں قریب رکھی ہوئی بالٹی میں پڑ گیا۔ وہ گرا اور بالٹی کو لے کر پھسلتا ہوا قریب بیٹھے ہوئے آدمی کی پیٹھ پر رک گیا۔ آدمی غصہ میں اٹھا اور دو تین طمانچے جڑ دیئے۔ ابھی وہ خود کو مزید مارا ماری کے لیے آمادہ کر ہی رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ وہ خود اسی کا فرزند ارجمند ہے چنانچہ کچھ نہ کرسکا۔ لیکن سخت غصے کے باعث "اُستے گدھے کے بچے" کہہ کر اطمینان کرلیا۔ دونوں بھائی اُدھر لڑ ہی رہے تھے قبل اس کے کہ وہ دست و گریبان ہوجاتے ان کے ہاں سے عورتیں آئیں اور دونوں کو زبردستی گھر لے جاکر دروازہ بند کرلیا۔ ایک بچہ باہر ہی رہ گیا تھا۔ توتلی زبان میں سب سے کہنے لگا "یہاں تھڑے تھڑے تیا تماشہ دیکھتے ہو۔ تلو اپنے اپنے دھردں میں۔" [یہ جملہ بھی اس نے محلہ میں لڑائیاں دیکھ دیکھ کر ہی سیکھا تھا]۔ بچے کی بات پر بہت سے لوگ مسکرا دیئے۔ اس کی دادی بھی اس ذہنی تناؤ کے باوجود منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنسنے لگی۔ بعض چھوٹے بچے گھر میں گھسنے کی تیاری میں تھے لیکن دادی نے اندر سے مضبوط کنڈی چڑھا دی۔ اس کے باوجود حاضرین ٹلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ اندر سے ڈانٹ ڈپٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ کچھ بچے دروازے کی درازوں سے کان لگائے کھڑے ہوگئے جیسے جیب میں پیسے نہ ہونے کی صورت میں تھیٹر کے دروازوں پر کان لگائے [آنکھیں بند کئے] اسٹوری سنتے ہیں۔ بہرحال لوگ اب دھیرے دھیرے جانے لگے۔ عورتیں البتہ زور زور سے ہنسنے لگیں تھیں۔ تمام کارروائی کی دوبارہ کامنٹری ایک دوسرے کو سنا رہی تھیں کچھ اس طرح ــــ

"زنانہ وہ تین نمبر والوں کو دیکھا تم نے۔ کتنی بڑی نیکر پہن کر چلے آئے تھے۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ انھیں نیکر پہنے ہوئے دیکھا۔"

"اور اندر سے باریک باریک ٹانگیں کیسی لگ رہی تھیں جیسے چھڑی کی ڈنڈی۔"

"باقر بھائی تو ہاتھ میں منجن کی بڑی شیشی لے آئے تھے کہ اب اطمینان سے یہیں دانت گھستے رہیں گے۔"

"اقبال کیسا بنا سنورا رہتا ہے ہمیشہ۔ گھبراہٹ میں کیسی بُری صورت لیے آگیا تھا۔"

"اور نیند کے بوجھ سے آنکھیں کھل ہی نہ رہی تھیں۔ باریک باریک بھینچی ہوئی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔"

"اور اپنے محلّے کے دو مجنوں۔ ہمیشہ۔ کوئی کاہے میں کوئی کاہے میں۔ یہ دونوں لڑکیاں دیکھنے میں آگے تھے۔ سب لوگ لڑائی دیکھنے میں لگے ہوئے اور یہ دونوں باہر کھڑی ہوئی لڑکیوں کو دیکھنے میں لگے تھے۔"

"باہر کی کیا بات ہے۔ کھڑکیوں میں کھڑی ہوئی لڑکیوں اور نئی دلہنوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔"

"سب کو دیکھتے ہیں۔ کسی ایک کو نہیں۔"

"اچھا ہوا خوبصورت نہیں ہیں دونوں۔"

"نہیں نہیں۔ ایک ذرا اچھا ہے۔ شاہین کو بُرا لگے گا۔"

"خیر وہ اتنا ندیدہ نہیں جتنا دوسرا ہے۔ موٹا۔ تمباکو کا پنڈا!"

"تیری اُسی سے شادی کرا دیں گے۔"

"میں اور اُس سے؟ تھوکتی ہوں اس پر۔"

"وہ دیکھ کیا حیاتی ہے! ابھی تک منڈلا رہا ہے۔ آخ تھو۔"

"خاص بات تو یہ ہے کہ شفیق نے گڑبڑ میں پاجامہ ہی اُلٹا پہن لیا تھا۔"

"اری شکر کر۔ اُلٹا ہی سہی، پہنا تو تھا۔ اُسے تو بھولنے کی بڑی عادت ہے۔"

"اور نبیل تو بغیر پاجامے کے ہی چلا آیا تھا۔"

"نیکر پہنی ہوگی۔"

"نہیں وہ بھی نہیں۔"

"چل ہٹ۔ جھوٹی۔ کونسا نبیل؟"

"سنجیدہ بھابی کا لڑکا۔ ایک سال دو مہینے جس کی عمر ہے۔"

بہت سی مترنم گھنٹیاں ایک ساتھ بجیں تو محلّے کے ایک بزرگ نے جو فجر کی نماز کے بعد باغیچہ کی سیر سے لوٹ رہے تھے۔ ذرا بلند آواز میں کہا ـــــ

"اب صبح کی چائے پانی کا بندوبست کرنا ہے کہ نہیں؟ یا یہیں باتیں ہوتی رہیں گی۔ بچّوں کا اسکول کا وقت ہو رہا ہے امتحانات کا زمانہ ہے۔ چلو اپنے اپنے گھروں میں۔"

ہر چند کہ اس زمانے میں کوئی کسی کی نہیں سُنتا۔ اور جن بزرگ نے یہ بات کہی وہ ان عورتوں میں سے کسی کے رشتہ دار بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے پیچھے منہ چھپاتی، گرتی پڑتی اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں۔ کچھ کنواری لڑکیاں ڈھٹائی سے کھڑی رہیں۔ صرف یہ جتانے کے لیے کہ ہم کسی سے نہیں ڈرتے۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں جو اِن دنوں ٹی وی پر عورتوں کے سدھار والے مخصوص پروگرام دیکھ کر بگڑنے لگی تھیں۔

اب یہاں کوئی نہیں ہے۔ صرف بچے رہ گئے ہیں جو اپنے ننھے منے ہاتھوں سے دُعا کر رہے ہیں کہ یا الٰہی

روز اسی طرح جھگڑے ہوتے رہیں تو کتنا اچھا ہو۔ آج کل تو ٹی وی اور فلموں میں بھی اتنا مزا نہیں آتا۔ بچے بڑے پیار سے نل کے آس پاس اُوپر نیچے بیٹھ گئے جس کے دَم سے یہ رونق اور چہل پہل ہے۔ آفس کا وقت ہونے لگا تھا اس لیے ہم نے بھی کھڑکی بند کرلی اور ایک تشکر آمیز نظر اس پر ڈالی۔ پھر تفکر آمیز لہجے میں خود سے کہا کہ لوگوں کے لیے ٹیلی ویژن ایک کھڑکی ہے۔ ہمارے لیے یہ کھڑکی ہی ٹیلیویژن ہے — !

▲▼

صبغت اللہ شہاب
(حیدرآباد)

عید کا چاند

○

کل جنتری میں عید کی تعطیل درج ہے
پھر بھی یہ عید ہو کہ ہوا اعتبار کیا
انسان ہیں ہم تو سوچئے انسان کو بھلا
علماء کے علم و فضل پہ ہے اختیار کیا

ہم آسماں کو دیکھنے آئے ہیں عمر بھر
کس شیخ کا ہے چاند کدھر کس کو ہے خبر
اک شیخ کے نواسے نے رو رو کے یہ کہا
درزی نے ہم کو عید کا جوڑا نہیں دیا

نانا ہمیں تو عید کا جوڑا دلا دیجئے !
یا ایک روز عید کو آگے بڑھا دیجئے !
بولے نہ ہم کہیں تو کہاں ہے ہلال عید
رویت نہیں ہماری زباں ہے ہلال عید

اک اور سمت چاند کا یہ ماجرا ہوا
پیشِ حضور شیخ تھا کوئی کھڑا ہوا
کہنے لگا حضور کا دل سے مرید ہوں !
بندہ ہوں اور طالبِ فرمانِ عید ہوں !

کس طرح قطرہ قطرہ سے دریا بنایا ہے
کس کس جتن سے دودھ میں پانی ملایا ہے ۱
کیوں ہو غرض ہلالِ سرِ آسمان سے
سرکار چاند ڈھالئے اپنی زبان سے

یوں رویت ہلال پہ علماء میں ٹھن گئی
اس کشمکش میں لوگوں کی جانوں پہ بن گئی
پھر اہلِ اعتقاد کی فوجوں میں رن پڑا
ایک اک نے حق ادا کیا جس سے جو بن پڑا

اک کیفیت عجیب ہر اک جان و تن میں تھی !
دل شکستہ نگر میں عید تھی ماتم بپا میں تھی
اک بھائی کی تھی مطلع مدراس پہ نگہ
چھت سے ہلال عید کو تکتا تھا دوسرا

دہلی کے آسماں پہ تھی اک اور [illegible]
علماء کی طرح بٹ گیا آخر ہلال عید
اک چاند کے لیے ہوئے اپنے جدا جدا
تھی اک زمین پھر بھی تھے مطلعے جدا جدا

بہباٹ نے کہا کہ یہ جھگڑے مٹائیے
نسخہ فقیر کا ہے اسے آزمائیے
بہلا کے اپنے چاند کو بالائے بام لائے
جو چاہے ڈیڑھ اینٹ کی عید اپنی خود منائے

○

چار مصرعے

ہے لو اسی نقاب سے باہر
نانی چلتی ہے اوڑھ کر برقعہ
الٹا منظر یہ بارہا دیکھا
راکھ پردے میں آگ بے پردہ

شیخ رحمٰن اکولوی

اردو میں محاورتاً
کہا جاتا ہے کہ فلاں
کی زبان قینچی کی طرح چلتی
ہے۔ عام طور پر "فلاں" سے مراد
کوئی عورت ہی نہیں ہوتی ہے
لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آرہی تھی
کہ آخر کون سی قینچی کو ذہن میں رکھ کر مذکورہ
محاورہ گھڑا گیا ہوگا؟ ویسے بغور جائزہ لیں تو معلوم
ہوگا کہ قینچی کے مقابلے میں عورت کی زبان کئی "کٹ" آگے
ہے۔ قینچی چلتے چلتے گرم ہو جاتی ہے، تھک جاتی ہے اس
کے بلیڈ جام
ہونے لگتے ہیں۔ عورت
کی زبان نہ تو گرم ہوتی
ہے اور نہ تھکتی ہے بلکہ
جوں جوں یہ چلتی جاتی ہے اس کی
روانی اور تیزابیت میں اضافہ ہوتا جاتا
ہے۔ حالانکہ قینچی دو بلیڈ رکھتی ہے جب کہ
عورت کی زبان "یک بلیڈی" ہے۔ عورت چاہے
انگریزی بولے، فرانسیسی بولے یا پنجابی

رکھتی وہ عورت
کی زبان ہی ہے۔
مشہور شاعر ملٹن سے
جب پوچھا گیا کہ "تم اپنی بیٹی کو
کتنی زبانوں میں ماہر بنانا چاہتے ہو"
تو اس نے برجستہ کہا "عورتوں کی ایک زبان
سے بیچارے مردوں کو پناہ نہیں ملتی۔ اگر دو چار
ہو گئیں تو خدا کی پناہ۔" زبان کو جب قینچی سے تشبیہ
دی جاتی ہے تو آئیے دیکھیں کہ قینچیوں کی آخر کتنی قسمیں
ہوتی ہیں؟ ۱۔ **بزاز کی قینچی** : بزاز جب کپڑا پھاڑتا
ہے تو اس کا
ہاتھ تیزی سے
آگے کی طرف سرکتا جاتا
ہے اور کپڑا کٹتا جاتا ہے بکتا
ہے کپڑا قینچی سے نہیں اس کے ہاتھ
کے اشارے سے کٹ رہا ہے۔ قینچی کو
اس صفائی سے چلانا کسی اور کے بس کی بات
نہیں ہے۔ بزاز کا کمال یہ بھی ہے کہ وہ کاٹتا تو تین
میٹر کپڑا ہے مگر گاہک کے ہاتھ لگ جاتا

پونے تین بیڑ ہے۔ بزاز کی قینچی اس شرارتی بچے کی طرح ہوتی ہے جو موقع ملتے ہی ماں کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ اسی لیے بزاز اس کے ڈوری باندھ دیتا ہے اور وقتِ فرصت ڈوری کھینچ کر اپنے سامنے حاضر کرلیتا ہے۔

۲. درزی کی قینچی: قینچیوں میں درزی کی قینچی نے سب سے پہلے زمانے کے اس چلن کو جانا، مانا اور اس پر عمل کیا کہ "دباؤ (PRESSURE) کی بڑی اہمیت ہے"۔ یہ نسبتاً تمام قینچیوں سے وزنی ہوتی ہے۔ پھسلنے والا کپڑا بھی اس کے وزن کے دباؤ کی وجہ سے پھسلنے نہیں پاتا اور "حسبِ قینچی" کٹ جاتا ہے۔ بزاز اگر چور ہے تو اس چور کا بھائی درزی گرہ کٹ۔ اس کی "چور کاٹ" کی بدولت ہی لیڈیز رومال، اسکارف، ٹائیاں اور نیپکن وغیرہ وجود میں آئے۔ سوچیے اگر لیڈیز رومال نہ ہوتے تو خواتین اپنا میک اپ کاہے سے لگاڑتیں؟ شوہر کی جیب سے نکالے ہوئے پیسے کہاں رکھتیں؟ اسکارف اور ٹائیاں نہ ہوتیں تو مرد گرگٹ کے سر سے مشابہ ٹینٹوے کے بدنما ابھار کو کیسے اور کس چیز سے چھپاتے؟ مختلف کپڑوں کے ٹکڑوں سے سلے ریڈی میڈ کپڑے اسی قینچی کی دین ہیں۔ یہ کپڑے "اتحاد" کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ انسانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیے۔

۳. مالی کی قینچی: مالی کی قینچی "کنگ سائز" ہوتی ہے۔ اس کے بلیڈ تقریباً ایک فٹ لانبے ہوتے ہیں۔ نثری نظم کے مصرعوں کی طرح۔ اسے پودوں کی تراش خراش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دیکھنے میں بھیانک لگتی ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ مالی کو تنخواہ پوری؛ وقت پر اور بن مانگے مل جاتی ہے۔

۴ سنسر کی قینچی: اس کی بڑی دھاک ہے انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ کے قلم کے بعد اگر فلم والے کسی سے ڈرتے ہیں تو وہ فلم سنسر بورڈ کی قینچی ہے۔ اس قینچی سے فلم کو حسبِ منشا بچا لینا خاصا مشکل کام ہے۔ ہاں پروڈیوسر اپنی نوٹوں بھری جیب کھلی رکھیں تو ان کی فلم بغیر کاٹ چھانٹ کے "آرٹ فلم کے نام سے" یو" سرٹیفکٹ کے ساتھ پاس ہوسکتی ہے۔

سنسر کی قینچی سے جو بارہا اور بال بال بچتے آئے ہیں وہ اخبارات و رسائل ہیں۔ انگریزی دورِ حکومت میں بھی ان کی آزادی کو سنسر کی قینچی کے تیز بلیڈ زیادہ دن پکڑے نہیں رہ سکے۔ یوں بھی اخبارات و رسائل پر پابندی عائد کرنا انسان کے بنیادی حقوق پر قینچی چلانے کے مترادف ہے۔ اور جو قوم تنقید کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی اس کی قدر نہیں کرتی، اس کا نوٹس نہیں لیتی، ترقی نہیں کرسکتی۔

۵. محبت کی قینچی: دکانوں، ریستورانوں، ڈھابوں میں ایک مقولہ آپ نے لکھا دیکھا ہوگا کہ "ادھار محبت کی قینچی ہے"۔ جب ہم نے اس پر غور کیا تو لگا کہ یہ تو سراسر بہتان ہے۔ اس مقولہ میں اُدھار، محبت اور قینچی تینوں کے ساتھ بڑی زیادتی کی گئی ہے۔ بتلایئے تو سہی کہ زندگی کا وہ کونسا "گوشہ" ہے جہاں ان کا عمل دخل نہیں؟ ان کے بغیر تو زندگی پھیکی پھیکی بدمزہ سی معلوم ہو۔ اُدھار نے تجارت اور صنعت و حرفت کو بے پناہ فروغ دیا ہے۔ ۷۵ فیصدی بزنس CREDIT پر چلتا ہے۔ آپ نے کوئی چیز خریدی قیمت چکائی، معاملہ ختم ہوگیا۔ آپ نے CREDIT پر کوئی چیز حاصل کی۔ دکاندار اور آپ کے بیچ تعلق قائم ہوگیا۔ وہ وقتاً فوقتاً آپ کو سلام کرنے لگا (اُدھار کی یاددہانی کے لیے) اڑوس پڑوس والوں پر اس کے سلاموں کا رعب پڑا۔ ان کی نظروں میں آپ کی پوزیشن بڑھی۔ ضرورت پڑنے پر آپ نے اس پوزیشن کو ان لوگوں سے اُدھار لیکر

[illegible]ن کرلیا۔
ایک بار کہیں سے اُدھار مل جائے تو سمجھ لیجئے کہ کھاتا کھُل گیا۔ پچھلا بل وصول کرنے کی آس میں دکاندار
[illegible] کو مزید ادھار لینے سے نہیں روک سکتا۔ (یہ اُدھار ہی کی طاقت ہے کہ ایک غریب آدمی ہاتھی خریدنے
[illegible]یار ہو جاتا ہے)۔ جتنا لین دین بڑھتا جائے گا، آپ کے اور دکاندار کے تعلقات بڑھتے جائیں گے۔
کسی کا بھولا بسرا اُدھار چکا دیجئے پھر دیکھئے کہ تجدید تعلقات کے سوتے سے نئی نویلی محبت کے کتنے جھرنے
[illegible]ٹ پڑتے ہیں۔ اب تبلائیے کہ "اُدھار محبت کی قینچی" کیسے ہوئی؟ یہ تو تعلقات بنانے اور بڑھانے کا موثر ذریعہ
[illegible]۔ رہی بات مذکورہ مقولے کی تو اس میں تھوڑی سی ترمیم کرکے اسے اس طرح قابل قبول بنایا جا سکتا ہے کہ
[illegible]مارنہ لوٹانا محبت کی قینچی ہے"۔ ویسے اس طرح کے مقولوں کی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ یار لوگ ہوٹل میں اس
[illegible]دھواں دھار سیاسی مباحثے کرتے ہیں جہاں یہ تختی آویزاں ہوتی ہے کہ "سیاست پر باتیں نہ کریں"؛ اور اکثر و بیشتر
[illegible]ل کا مالک بھی ان مباحث میں شریک ہو جاتا ہے۔
رشوت کیا ہے؟ یہ بھی ایک طرح کا اُدھار ہی تو ہے۔ رشوت کے دن بدن بڑھتے ہوئے کاروبار کے تحت
[illegible]ت سارے سماج پر ان معنوں میں چست ہوتی ہے کہ ؎

رشوت سے کس کو رستگاری ہے
آج اس کی کل اپنی باری ہے

فتتاحی قینچی: ڈاکٹر، بزاز۔ درزی۔ لوہار۔ فلم سنسر بورڈ والے سب اپنی اپنی قینچیاں رکھتے ہیں۔
اگر نہیں رکھتے تو افتتاح کرنے والے۔ یہ بس اپنی خدمات پیش کرتے ہیں یعنی
[illegible]ل قینچی" نہیں ہوتے صرف اہل فن ہوتے ہیں۔ افتتاحی فنکشن قینچی کی معراج ہے۔ اس موقع پر اسے چاندی
[illegible]نے کے ورق چپکا کر، مخمل بچھی طشتری میں سجا کر بڑے احترام کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اور جیسے ہی یہ فیتہ
[illegible]ن ہے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے، مبارک بادیوں کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں، مٹھائیاں تقسیم
[illegible]باتی ہیں۔ یہ دراصل قینچی کی عزت افزائی کا جلسہ ہوتا ہے (اور افتتاح کرنے والا سمجھتا ہے کہ اس
عزت افزائی کی جارہی ہے)۔

پان کاٹنے والی قینچی: ٹین کے پترے سے بنی، دھان پان سی، مفلوک الحال نظر آنے والی یہ
قینچی امن پسند اور منکسرالمزاج ہے۔ اس کے دھار نہیں ہوتی۔ یہ شور و غل
[illegible]، دُور رہ کر خاموشی سے کام کرنا پسند کرتی ہے۔ پان کو اس کی یہی ادائیں لبھاتی ہیں اور وہ "سر تسلیم خم ہے جو
[illegible]ج یار میں آئے"، کے مصداق خود کو بصد شوق اس کی زد پر لے آتا ہے۔

لوہا کاٹنے والی قینچی: لوہے کے پترے کاٹنے والی اس قینچی نے اردو زبان کو یہ تجربہ بطور
محاورہ سکھایا کہ "لوہا ہی لوہے کو کاٹتا ہے"۔

[illegible]اکٹر کی قینچیاں: ڈاکٹری سے متعلق قینچیاں عجیب الخلقت ہوتی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں
کوئی آپریشن ہو ہی نہیں سکتا۔ ان کی مدد سے ڈاکٹر مریض کی موت سے جنگ
[illegible]ا اور نئی زندگی بخشتا ہے۔ ان قینچیوں کو ہمارا سلام۔

۱۔ قینچی گُل افشاں : قینچی صرف لوہے کا ایک بے جان ٹکڑا نہیں ہے۔ وہ نرم و نازک احساسات بھی رکھتی ہے۔ رنگ برنگے کاغذوں کی مدد سے اپنے ان احساسات کا اظہار کرتے ہوئے یہ وہ گُل افشانیاں کرتی ہے کہ کچھ نہ پوچھئے۔ اس کے تراشیدہ کاغذی پھول حقیقی پھولوں کو شرمانہ دیں تو جو کالے چور کی سزا وہ ہماری۔

اگر ہم بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ قینچی ہماری روزمرّہ زندگی کا حصّہ بن کر رہ گئی ہے۔ صبح سویرے ڈاڑھی بنانے کے بعد کسی وجہ سے مونچھ نہ تراشی جاسکے تو زندگی میں خلاء سا محسوس ہونے لگتا ہے۔ ایک اُلجھن سی دل و دماغ پر چھا جاتی ہے جو آہستہ آہستہ بے کیفی میں تبدیل ہونے لگتی ہے۔ طبیعت بہلانے کے لیے لان میں جائیے تو وہاں کرسی پر بیٹھے بیٹھے جب تک ایک پیر کو دوسرے پیر پر رکھ کر قینچی نہ دے لیں، سکون نہیں ملتا۔ سامنے کوئی بیٹھا ہو تو اس طرح قینچی مار کر بیٹھنے کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مقابل دوسرے درجے کی چیز معلوم ہونے لگتا ہے۔ انا کی تسکین ہوتی ہے۔ دوپہر میں بوریت بڑھ گئی تو فون کرکے چار دوستوں کو جمع کر لیا۔ پتے پہلے ہی سے لگا لیئے تھے۔ دوستوں کے سامنے خواہ مخواہ قینچی ماری اور پتے بانٹ دیئے۔ پہلے ہی داؤں میں یار لوگ یوں چت ہو گئے جیسے دارا سنگھ نے اپنے مقابل کو قینچی داؤں [DEATH LOCK] آزمایا ہو۔ سہ پہر کو بچی سیر کرنے کے لیے ضد کرنے لگی، اس سے کہہ دیا کہ خود ہی قینچی اسٹائل میں سائیکل چلا کر گھوم آئے۔ وہ خوشی خوشی روانہ ہوئی۔ فوٹو گرافر دوست نے تصویر کھینچنے کی فرمائش کی۔ دونوں ہاتھ باندھ کر اور پیروں میں قینچی دے کر کھڑے ہو گئے پوز اسٹائلش ہو گیا۔ شام کو ٹہلنے نکلے پُشت پہ ہاتھوں کی قینچی بنالی خود کو زیادہ RELAX محسوس کرنے لگے۔ رات ہوئی، بستر پر جا لیٹے نیند نہیں آرہی ہے۔ بے چینی کا عالم ہے۔ پیروں کو ایک پر ایک رکھ کر قینچی بنالی اور قینچی سگریٹ سلگا کر کش لینے لگے سگریٹ کے ساتھ بے چینی کا بھی خاتمہ ہو گیا نیند آگئی خواب خرگوش کے مزے لینے لگے۔

قینچی کے اجزائے ترکیبی مختصر ہیں۔ ہینڈل بمعہ دو بلیڈ۔ اور بلیڈوں کو جوڑے رکھنے والا نٹ اور بولٹ۔ بلیڈ اگر اس کا جسم ہے تو نٹ بولٹ اس کا دماغ۔ نٹ ضرورت سے زیادہ کس دیا جائے تو اس کے بلیڈ جام ہو جاتے ہیں، یہ ٹھیک سے کام نہیں کر پاتی اور اگر نٹ بولٹ ایکدم ڈھیلا ہو جائے تو تب تو یہ کسی کام کی نہیں رہتی۔ اس انسان کی طرح جس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو اور جسم سے دماغ کا تعلق ٹوٹ گیا ہو۔

قینچی کے ہینڈل کی گولیاں دیکھ کر تصوّر میں پھٹی پھٹی سی غصیلی آنکھیں گھوم جاتی ہیں، گھر کے بڑے بوڑھوں کی جہاندیدہ آنکھیں۔ جب یہ آنکھیں اپنے مخصوص انداز میں گھر میں نظریں دوڑاتی ہیں تو خاموش سنسرشپ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لڑکیاں اپنے آنچل ٹھیک کر لیتی ہیں لڑکوں کی چال متوازن ہو جاتی ہے۔ عورتوں کی گفتگو سرگوشی میں بدل جاتی ہے۔ منّے میاں بستہ کھول کر پڑھائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس طرح بہت سی بیہودگیوں اور بے قاعدگیوں پر پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ ڈسپلن کی فضا قائم ہو جاتی ہے۔ گھر میں بڑے بوڑھوں کی موجودگی اسی لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔

اب اس سے پہلے کہ مدیر کا قلم، سنسر کی قینچی کی طرح، ہمارے اس مضمون کو طوالت کی بناء پر سنسر کرنے کا ارادہ کرے ہم اسے یہیں ختم کرتے ہیں۔ ! — "قینچی زندہ باد"

رشید الدین
(حیدرآباد)

غزل کی لے دے

بات زیادہ پرانی
نہیں ہے بلکہ یہی کوئی
تیس پینتیس سال پہلے کی
ہے لیکن آج بھی ہمارے حافظہ
میں ایسی تازہ ہے کہ مانو کل ہی کی
بات ہو (اوائل شباب کا زمانہ جو تھا) یہ
شگوفہ ایک صاحب
کا چھوڑا ہوا تھا جو گمان غالب
ہے کہ ترقی پسند تھے۔ اب نہ تو
ویسے ترقی پسند رہے اور نہ ویسی
تحریک۔ ادب میں نت نئے شگوفے
چھوڑے جا رہے
تھے جن میں سے ایک
یہ تھا کہ غزل ایک فرسودہ
صنف ہے اسے ختم ہوجانا چاہیے
کیوں کہ موجودہ زمانہ میں اس کی کوئی
ضرورت نہیں یہ صنف
از کار رفتہ ہو چکی ہے
اور نئے زمانے اور نئے خیالات
کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ غزل کے
ذریعہ انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ مغربی
زبانوں میں اس کا
وجود نہیں۔ قافیہ پیمائی کا نام
شاعری نہیں ہو سکتا۔ وغیرہ وغیرہ
چنانچہ اس سلسلہ میں ایک صاحب نے
(جو اپنی دانست میں نابغہ (یعنی دانشور تھے) ایک
عدد مضمون غزل کے خلاف لکھ کر ایک رسالہ کو بھجوایا
جس کا عنوان تھا
"غزل۔ ایک فرسودہ صنف"
رسالہ کے ایڈیٹر صاحب
جو پریشان تھے کہ بہت دن سے
کوئی شگوفہ نہیں چھوٹا بڑے خوش
ہوئے چنانچہ انھوں
نے وہ مضمون خاص اہتمام کے
ساتھ اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ
شائع کردیا اور ببانگ دہل اعلان کردیا
کہ اردو ادب میں ایک نئے نقاد کا اضافہ
ہوگیا ہے ——
اس مضمون کا چھپنا تھا
کہ سارے ملک میں دھوم مچ
گئی۔ برسوں کے رکے ہوئے دل
کھل پڑے۔ اردو ادب میں جو جمود کے

بادل چھانے لگے تھے وہ یکلخت چھٹ گئے اور مطلع صاف ہوگیا۔ کسی نے مخالفت میں اور کسی نے موافقت میں دفتر تیار کر دیئے۔ رسالے والے بہت خوش ہوئے ماہنامہ "قاہرہ" نے تو ہر ماہ غزل سے متعلق مضامین کے لیے چند صفحے مختص کر دیئے۔ چنانچہ بے چاری غزل کی وہ لے دے چلی کر توبہ ہی بھلی۔

ایک نقاد نے (جو باہر سے پڑھ کر آئے تھے) اور جنھیں اردو ادب میں کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا ایک کتاب "اردو شاعری پر ایک ترچھی نظر" لکھ ماری۔ یوں تو اس میں انھوں نے ساری اردو شاعری ہی کو آڑے ہاتھوں لیا لیکن غزل کے پیچھے تو وہ ڈنڈا لے کر پڑ گئے۔ اس کتاب میں شروع سے لے کر آخر تک غزل کی مذمت کے علاوہ اور کچھ نہیں ملیگا۔

ایک اور شاعر صاحب نے بھی جو اپنے آپ کو انقلابی شاعر کہتے ہیں (لیکن جنھیں لوگ رومانی شاعر سمجھتے ہیں) اور جن کا خیال ہے کہ ان کے کلام میں داخلیت زیادہ ہوتی ہے (لیکن لوگوں کا خیال ہے کہ ان کے کلام میں خارجیت زیادہ ہوتی ہے) اپنی ایک نظم "شغل بازی" میں غزل بے چاری کی خوب خبر لی۔

اس ہنگامے اور گڑبڑ میں بھی بعض وفادار دوستوں نے غزل سے منہ نہیں موڑا اور برابر اس کی تائید کرتے رہے غزل گو شاعروں نے (جن کی تعداد ہمارے ادب میں کچھ زیادہ ہی ہے) جب یہ دیکھا کہ ان کے چاہنے والے بھی موجود ہیں تو انھوں نے اور زیادہ لکھنا شروع کر دیا۔ ماہنامہ "قاہرہ" بھی نظموں سے زیادہ غزلیں چھاپنے پر مجبور ہوگیا۔ لیکن اس کی غزل کی مخالفت والی تحریک برابر چل رہی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ماہنامہ "قاہرہ" پر غزل کی مخالفت ہی کی وجہ سے قہر نازل ہوا۔

یہ تو سب ہو رہا تھا۔ مخالفت اور موافقت میں مضامین لکھے جا رہے تھے لیکن مجھ جیسے شخص ناہنجار کے لیے کیا ضروری تھا کہ خواہ مخواہ "ہونٹوں میں دولہے کی خالہ" کے مصداق بیچ میں کود پڑا۔ غزل کے حامیوں کا کچھ زور دیکھ کر ہماری بھی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور ہم نے بھی غزل کی تائید کا اعلان کر دیا۔ ایک مقامی اخبار میں ایک عدد مراسلہ داغ دیا۔ جواب الجواب کا سلسلہ بھی چل پڑا۔ اس کے علاوہ زبانی طور پر بھی ایک مہم حق غزل شروع کر دی۔ جو شخص بھی ملتا اس سے وہی غزل کی بات چھیڑ دیتا لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ غزل کا رونا رونے لگتا۔ اور غزل کی مخالفت میں اس کے بند ھے ٹکے جملے سن کر ہمارا خون کھولنے لگتا۔ اب تو ہم دل ہی دل میں پشیماں بھی ہو رہے تھے کہ خوامخواہ غزل کی تائید کا اعلان کر دیا۔ اگر مخالف گروپ میں شامل ہو جاتے تو شاید مزے میں رہتے۔

رفتہ رفتہ سارے شہر میں غزل کے کٹر حامی کے طور پر ہماری شہرت ہوگئی غزل کے حامی نقاد ہمارے نام کا حوالہ دینے لگے کہ دیکھو فلاں شخص بھی غزل کی تائید میں ہے۔ ایک دن ہم جب اکیلے اپنے گھر کے دلوان خانے میں بیٹھے غزل کی تائید میں چند اچھے فقرے سوچ رہے تھے کہ ایک بزرگ آ موجود ہوئے۔ منہ پر گز بھر داڑھی۔ لمبا کرتا اور لنگی پہنے ہوئے جن کے ہاتھ میں ایک عدد موٹا سا ڈنڈا بھی تھا۔ بلا اجازت وہ ہمارے دلوان خانہ میں داخل ہو گئے اور فرش پر ڈنڈا پٹختے ہوئے گویا ہوئے:

"کیا آپ ہی شہر میں غزل کی شان میں قصیدے گاتے پھرتے ہیں"؟

"فرمایئے خاکسار آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہے"؟

ہم نے بمشکل حلق سے تھوک نیچے نگلتے ہوئے کہا

"نعوذ باللہ کیا واہیات صنف سخن ہے"!

انھوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔ "ایسی عریاں شاعری سے ہماری آنے والی نسل پر کیا اثر پڑے گا۔
اخلاق بھی تو کوئی چیز ہے۔ غزلیں پڑھ پڑھ کر ہمارے بچے کیا خاک اُجالا ڈالیں گے۔"

"آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" ہم نے خفت مٹاتے ہوئے پوچھا۔

"تف ہے ایسی صنف پر اور ایسی صنف کی تائید کرنے والوں پر"

انھوں نے اٹھتے ہوئے کہا اور جاتے جاتے بڑے ہی خطیبانہ انداز میں کہا:

"قسم ہے اس خداوند عالم کی جس نے یہ زمین و آسمان بنایا اور جس کے قبضہ میں میری جان ہے یہ اس صنف
اردو شاعری سے اکھاڑ کر نہ پھینک دوں تو . . . . . ."

اور اس کے آگے ہم کچھ نہ سن سکے کیوں کہ وہ باہر جا چکے تھے۔

ایک دن ہم ایک ضروری کام سے کہیں جا رہے تھے کہ ہمارے ایک ترقی پسند دوست مل گئے جو
ل کے زبردست مخالف تھے۔ ہم نے ان سے ... چاہا لیکن ان کی عقابی نظروں نے ہمیں دبوچ ہی لیا۔ اور دُور
سے چلّا کر آواز دی اور گویا ہوئے

"یار تم ٹھیک ... ہو۔ کتنی رجعت پسند صنف ہے یہ۔ اس میں تو نئے زمانے کا ساتھ دینے کی ذرا
صلاحیت نہیں۔ اور اب وہ آنچل اور کنگھی چوٹی کا زمانہ اب بھلا کہاں رہا۔ اب تو بالکل ٹھیٹ شاعری
چاہیے۔ جیسے وہ مشہور ترقی پسند شاعر علی قلی زعفرانی کی نظم ہے۔ کیا نام ہے اس کا ؟ کم بخت یاد ہی نہیں آرہا
ہے۔ ہاں — یاد آیا فرزندانِ آدم — ہابیل اور قابیل کو سلام۔ ذرا دیکھیے کلائمکس کس بلا کا ہے اس نظم کا۔ وہ
پوری نظم تو اِس وقت مجھے یاد نہیں لیکن اس کا مطلب کچھ اس قسم کا ہے کہ شاعر پہلے ہابیل اور قابیل کی خدمت میں
سلام عرض کرتا ہے۔ پھر اس کے بعد ان دونوں سے کہتا ہے کہ تمہارے والد پہلے انسان آدم تھے۔ اس وقت زمانہ ترقی
یافتہ نہ تھا۔ اب زمانہ بہت ترقی کر چکا ہے اور تمہارے والد آسمان سے زمین پر پھینکے گئے تھے مگر یہ آدم تو زمین سے
نکلیں گے اور آسمان کی طرف کوچ کریں گے اور یہ خالص ترقی پسند ہوں گے۔"

وہ صاحب پوری شد و مد کے ساتھ کہے جا رہے تھے اور ہم بُت بنے کھڑے تھے۔ انھیں ہمارے اس طرح
خاموش کھڑے رہنے پر بہت تعجب ہوا۔ کیوں کہ غزل کی مخالفت ہو اور ہم خاموش رہیں۔ یہ واقعی پہلا موقعہ تھا۔

"ارے لیکن آج تم خاموش کیوں ہو؟" انھوں نے تعجب سے پوچھا۔ "یار میں ذرا ضروری کام سے جا رہا تھا۔" ہم
نے روکھے پن سے جواب دیا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔" انھوں نے اطمینان کی سانس لی اور پھر خرچ ہو گئے۔ "تم ہی کہو . . .
کیا اس کو بھی چھوڑ دو۔"

وہ ہماری خاموشی سے پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ "وہ "قاہرہ" کے ایڈیٹر ظلِ سبحانی نے کتنی عمدہ بات کہی
ہے کہ غزل جاگیردارانہ دور کی یادگار ہے۔ تم ہی کہو پھر اسے ترک کر دینا چاہیے یا نہیں؟"

اب تو ہم سے رہا نہیں گیا کیوں کہ اچانک ہمیں وہ کہاوت "خاموشی نیم رضا مندی" یاد آگئی تھی۔ چنانچہ ہم نے پوری
بے ...ت سے کہنا شروع کیا۔

"صرف غزل ہی جاگیردارانہ دور کی یادگار ہے اور پھر یہ ہمارا سارا ادب کس دور کی یادگار ہے؟" ان سے
جواب نہیں بن پڑا۔ اُدھر وہ خاموش ہوئے اور ادھر ...

اس واقعہ کے دوسرے ہی دن ملک کے نامور رسالہ "دیا" میں ایک صاحب کی نظم چھپی۔ عنوان تھا "ہم تو ڈوبے ہیں صنم"۔ نظم آزاد تھی۔ اس لیے شاعر نے آزادی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ اس کا تھیم کچھ اس قسم کا تھا کہ شاعر ایک شخص سے مخاطب ہے جس کا نام بہرام ہے۔ بہرام نوجوان ہے۔ سمجھدار ہے، پڑھا لکھا ہے، لیکن بے کار ہے۔ چنانچہ وہ بے کاری سے اکتا کر خودکشی کی سوچتا ہے۔ [انقلاب لانے کی نہیں] چنانچہ شاعر اس سے کہتا ہے کہ تو جو خودکشی کی سوچ رہا ہے وہ بہت اچھی بات ہے کیوں کہ بیکاری کی زندگی سے موت اچھی ہے۔ لیکن تو مرنے سے پہلے ایک کام کر۔ وہ یہ کہ سامنے کی دوکان والے سیٹھ کو قتل کردے اور اس کی ساری دولت لے جاکر سمندر میں پھینک دے۔ اس کے بعد تو بھی سمندر میں کود جا۔ نظم آزاد تھی لیکن اس کا آخری مصرعہ پابند تھا اور غزل ہی کا تھا۔ جس پر نظم ختم ہوگئی تھی یعنی ۔

ع ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔

اس کے دوسرے ہی صفحہ پر ہمارے ایک غزل گو دوست کی غزل چھپی تھی اور بڑی خوبصورت غزل تھی۔ بس ہمیں ایک نادر موقع ہاتھ آگیا ہم فوراً پرچہ بغل میں دبائے ہوئے نکل کھڑے ہوئے اور جو بھی ملاقاتی ملتا اسے پہلے نظم سناتے اور پھر غزل۔ پھر نظم کی خامیاں گنواتے اور غزل کی خوبیاں۔ اور اس وقت تک اس شخص کو نہیں چھوڑتے جب تک کہ وہ ہماری ہاں میں ہاں نہ ملاتا۔ [مرضی سے کہیئے یا زبردستی]۔

اتفاق سے وہ نظم والے شاعر صاحب بھی ہمارے ہی شہر میں رہتے تھے جس کا ہمیں قطعی علم نہ تھا ورنہ ہم ایسی جرأت ہرگز نہ کرتے۔ جب ان صاحب کو ہماری اس حرکت کا علم ہوا تو وہ بہت چیں بہ جبیں ہوئے لیکن وہ صرف تھوڑی پر بل ڈال کر رہ جاتے تو پھر بھی ٹھیک تھا لیکن انھوں نے تو باضابطہ ہاکی اسٹک ہاتھ میں لیے شہر میں ہماری تلاش شروع کردی۔ لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی ناٹواپ ایکشن لیتے ہم نے روپوشی اختیار کی اور اپنے اس غزل گو دوست سے جس کی غزل کی تعریف میں ہم زمین و آسمان کے قلابے ملاتے پھر رہے تھے ان کی نقل و حرکت کی خبر لیتے رہے اور احتیاطاً اسی غزل گو دوست کے گھر منتقل ہوگئے۔

جب چوتھے دن ہمیں یہ اطلاع ملی کہ مطلع صاف ہوگیا ہے۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا ایک رات آہستہ سے ہم اپنے گھر آگئے۔ گھر آتے ہی ہم نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ غزل کی تائید سے تائب ہوگئے۔ اور وہ ساری تختیاں جو ہم نے غزل کی تائید میں اپنے دیوان خانہ میں لگا رکھی تھیں نکال کر پھینک دیں۔ اور دوسرے ہی دن علی الصبح وہ شہر بھی چھوڑ دیا کہ جان سے زیادہ عزیز تو انسان کو کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ہم نے ایک دور دراز دیہات میں جاکر پناہ لی اور ادبی زندگی سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرلی۔

ایک عرصہ کے بعد خاکسار پھر شہر واپس آیا۔ شہر آکر سب سے پہلے ہم اپنے اسی غزل گو دوست سے ملے جس کی زبانی معلوم ہوا کہ اب غزل کی لے دے ختم ہوچکی ہے اور ایک بار پھر ادب اعتدال پر آچکا ہے۔

"ارے -- یہ تمہارے ہاتھ میں کونسی کتاب ہے؟"

ہم نے اپنے دوست سے پوچھا۔ کیونکہ چور چوری سے جاسکتا ہے ہیرا پھیری سے نہیں۔

"یہ کتاب نہیں رسالہ ہے"۔ انھوں نے رسالہ ہمارے ہاتھ میں تھما دیا ہم نے دیکھا یہ وہی ماہنامہ "قاہرہ" [illegible] کتابی سائز میں نکل رہا تھا۔ اور بہت ہی مختصر ہوگیا تھا اور ہاں ظل سبحانی کی بجائے اب مدیر کی

حیثیت سے کوئی اور ہی نام تھا۔

مگر اگر ہم نے اپنے تمام اخبارات اور رسائل جس میں غزل کی بحث تھی۔ نذر آتش کر دیئے۔ تمام جلے ہوئے رسائل کی راکھ سامنے رکھ کر ہم نے تقریر کرلی کہ اب کبھی ادب کے ہنگاموں میں حصہ نہیں لیں گے یہ تو ان نقادوں ہی کا دل گردہ ہے کہ ہر ادبی معرکہ میں حصہ لیتے ہیں اور پھر صحیح و سالم بچ جاتے ہیں۔

بہر حال ہمیں تائب ہونے کے باوجود اس بات کی خوشی ہے کہ نہ صرف غزل اس وار سے بچ گئی بلکہ اس کے بعد اردو میں ایسی خوبصورت غزلیں لکھی گئیں کہ میر اور غالب کی روحیں بھی شرما جائیں۔ اردو شاعری میں یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے خصوصاً ہمارا پڑوسی ملک اس معاملہ میں ہم سے بھی آگے ہے۔ آخر میں یہی دعا ہے کہ اردو غزل کو:

؎ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے

سب کچھ حاصل ہوتا ہے”
جواہر لال نہرو
یہ الفاظ جواہر لال نہرو نے 26 اکتوبر 1930ء کو
اپنی بیٹی اندرا پریہ درشنی کو ایک خط میں لکھے تھے۔
آج، اس سال، یوم جمہوریت کے موقع پر
جب ہم جواہر لال نہرو کی صد سالہ سالگرہ منا رہے
ہیں، ہمیں اُن کے الفاظ یاد آتے ہیں اور ساتھ ہی ہم
اُن سب بہادر بچوں کو بھی یاد کرتے ہیں جنہوں نے
ذاتی فائدے سے اوپر اٹھ کر بے مثال بہادری
اور خدمت کا نمونہ پیش کیا۔
davp 88/617

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سہ روزہ سالانہ تقاریب

(عملی رپورٹ)

زندہ دلانِ حیدرآباد کے زیرِاہتمام
۲۱ر نومبر تا ۲۶ر نومبر ۱۹۸۸ء شاندار پیمانے پر بڑے
ش کا سا سماں تھا۔ تینوں مختلف اجلاسوں میں سامعین

ادبی اجلاس

تقاریب کا آغاز
ہال میں ہوا، مسلسل
ے گونجتا رہا۔ تمام میزبان اور مہمان مزاح نگاروں
ارشات کے ذریعہ طنز و مزاح کے پرستاروں
ممتاز و نمائندہ مزاح نگار جناب
۔ بمبئی کے بزرگ و منفرد مزاح نگار
چسپ انداز میں کارروائی چلائی۔
ر دلی سے آئے ہوئے مشہور
ان خصوصی کی حیثیت سے
اب مجتبیٰ حسین نے کہا کہ
ں کے اطراف ساری
م رہا ہے۔ انھوں نے
شو کی حکمرانی تھی، اس
بنالیا اور آج حیدرآباد
رانی ہے۔ اُنہوں نے بتایا کہ
یا تھا حیدرآبادی ہی ہنستا
آخر میں اپنا ایک دلچسپ مزاحیہ
انہ موجود ہے" کے عنوان سے پیش
سند سے بھرپور اس مضمون پر بے ساختہ
مارے جہاں کا درد اور ہمارا جگر" کے موضوع
ے "کُتّے" کے موضوع پر اپنے مضمون میں ہمارا
تا ہے اور دُم دار کُتّے اپنے توازن کی برقراری
ہا کہ آج مسلسل انگریزی میڈیم کے اسکول کھل رہے
ر زور تالیوں کی داد میں جناب نریندر لوتھر نے اپنی
امور مزاح نگار جناب پرویز یداللہ مہدی اپنے نام کا اعلان
یر عنوان اپنا مضمون سنایا۔ تالیوں کے شور میں پرویز صاحب

حیدرآباد میں حسب روایت سہ روزہ سالانہ تقاریب
تزک و احتشام کے ساتھ منعقد ہوئیں۔ اس ہفتہ شہر میں ایک
کی کثیر ترین تعداد نے شرکت کی۔
۲۴ر نومبر جمعرات ۵ بجے شام گاندھی بھون کے آڈیٹوریم
تین گھنٹوں تک سارا ہال قہقہوں اور پرزور تالیوں
نے اپنی شگفتہ، پُرمزاح اور طنز سے بھرپور
کو بے ساختہ قہقہے لگانے پر مجبور کردیا۔ برصغیر
مجتبیٰ حسین نے اس محفل قہقہہ کی صدارت
جناب یوسف ناظم نے نہایت
کئی ایک ٹی وی سیریلس کے خالق
مزاح نگار جناب دلیپ سنگھ نے
شرکت کی۔ صدارتی خطبہ میں
حیدرآباد ہی وہ محور ہے
تہذیب اور طنز و مزاح
کہا کہ طنز و مزاح پر پہلے
کے بعد لاہور نے اسے
کے ہاتھوں میں اس کی
لندن، واشنگٹن اور شکاگو
ہوا نظر آیا۔ جناب مجتبیٰ حسین
مضمون "جی ہاں سوئز بنک میں میرا
کیا' جسے سامعین نے بے حد پسند کیا'
داد ملی۔ جناب دلیپ سنگھ' دہلی نے
پر اپنا شگفتہ مضمون سنایا۔ جناب نریندر لوتھر
"کتوں کو بہادر بنانے کے لئے ان کی دُم کاٹ
کے لئے ہمیشہ زبان نکالے ہوتے ہیں' انہوں نے
ہیں تاکہ کتوں سے انگریزی میں صحیح بات کی جاسکے۔"
نشست سنبھالی۔ پھر بمبئی سے آئے ہوئے سرو قامت
سُن کر مائیک سنبھالنے آئے اور "مارکیٹنگ گائیڈ" کے
واپس ہوئے اور خواہ مخواہ (بمبئی) آئے۔ انھوں نے اپنا مضمون

"ضعیفی" پیش کیا۔ اس کے بعد حیدرآباد کے ہر دلعزیز و منفرد مزاح نگار جناب مسیح انجم نے مخصوص انداز سے اپنا پُرمزاح مضمون "مشاعروں اور ادیبوں کی لا لو نقی" پیش کیا۔ جناب مسیح انجم کے اس مضمون پر ہال میں بار بار قہقہے بلند ہوتے رہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر حبیب ضیاء نے "اکثر ایسا نہیں ہوتا" کے عنوان سے اپنے مضمون میں کہا کہ عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ خواتین میں جھوٹ کی عادت بڑھ جاتی ہے۔ جناب رشید الدین نے "پرانے کپڑے اور نئے برتن" کے زیر عنوان مضمون سنایا۔ اس موقع پر دہلی میں فکر تونسوی کی برسی کے موقع پر منعقدہ تحریری مقابلوں میں کامیاب حیدرآبادی لڑکی مس اسریٰ عزیز کو انعام دیا گیا۔ جناب بوگس حیدرآبادی نے شکریہ ادا کیا۔ مسرز محمد حمایت اللہ مصطفےٰ علی بیگ۔ ڈاکٹر مصطفیٰ کمال۔ وہاب قیصر اور دوسرے عہدیداروں نے مہمانوں کا استقبال کیا۔ زندہ دلان کی ان تقاریب کے موقع پر ماہنامہ "شگوفہ" کے خصوصی شمارہ سووینیر کی اشاعت عمل میں آئی جس میں ملک کے سرکردہ طنز و مزاح نگاروں کی منظوم و نثری تخلیقات شامل ہیں

محفلِ لطیفہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سہ روزہ سالانہ تقاریب کے دوسرے دن ۲۵ ر نومبر جمعہ ۵ بجے شام اُسی مقام پر کل ہند محفلِ لطیفہ گوئی کا کامیاب انعقاد عمل میں آیا۔ جہاں تین گھنٹوں تک مسلسل قہقہوں کی بارش ہوتی رہی، اس زعفران زار محفل کی صدارت ملک کے ممتاز مزاح نگار جناب دلیپ سنگھ (دہلی) نے کی۔ جناب ذہانت علی بیگ کنوینر محفل نے نہایت عمدگی سے کارروائی چلائی۔ شہر کے ممتاز فزیشین ڈاکٹر رام پرشاد نے روزانہ مریضوں اور ان کے درمیان ہونے والی دلچسپ گفتگو کو لطیفوں کی شکل میں خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ کم سن لڑکی بے بی فاریہ مسعود نے انتہائی روانی کے ساتھ اچھے لطیفے سناکر سامعین کو ہنسنے پر مجبور کر دیا۔ لندن سے آئے ہوئے مہمان جناب محمد علی منگلی نے لندن کے واقعات کو ٹھیٹ حیدرآبادی انداز میں سناکر خوب ہنسایا جناب موہن پرشاد نے ریاستی چیف منسٹر مسٹر این ٹی راما راؤ کی جانب سے حال ہی میں سڑک پر لیٹ جانے اور گنڈی پیٹ کے قریب کار چلاتے ہوئے ایک سنگ میل کو ٹکر مارنے کے واقعات کے پس منظر میں کئی لطیفے سنانے اور سامعین کو بے حد محظوظ کیا۔ جناب خواہ مخواہ (بمبئی) نے اپنے دلچسپ لطیفوں کے ذریعہ سامعین کو لطف اندوز کیا۔ جناب محمد حمایت اللہ نے اپنے مخصوص اور منجھے ہوئے انداز میں بہترین لطیفے سناکر زبردست داد وصول کی۔ جناب طالب خوندمیری کے طنز سے بھرپور اور نئے انداز کے لطیفوں کو بہت پسند کیا گیا۔ جناب طالب خوندمیری نے کنوینر محفل کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ اس لطیفہ کا کنوینر صاحب جو بھی جواب دیں گے 'ہاں' یا 'نہیں' میں، وہیں سے آپ حضرات محظوظ ہوں گے۔ یہ کہہ کر طالب صاحب نے صرف اتنا پوچھا کہ "کیا آپ کی بیوی نے آپ کو مارنا چھوڑ دیا ہے؟" اس سوال نما لطیفے کو سن کر قہقہوں سے محفل کی چھت اُڑ گئی۔ جناب منور علی مختصر نے بھی خوب رنگ جمایا۔ مشہور مزاح کار جناب دولت رام نے لطیفوں کو خاکوں کے امتزاج میں پیش کر کے قہقہے بکھیرے۔ کہنہ مشق و نامور مزاح کار جناب محمد سلیمان نے بھی اپنے اس فن کا شاندار مظاہرہ کیا۔ جناب مصطفےٰ علی بیگ۔ جناب صبغۃ اللہ بھٹ۔ جناب اسلم فرشوری۔ جناب کلیم صدیقی۔ جناب نریندر لوتھر۔ کماری رجا سیٹھ۔ ماسٹر عرفان خوندمیری نے اپنے اپنے انداز میں [illegible] کئے اور ایک سے بڑھ کر ایک ثابت ہوئے۔ آخر میں صدر محفل جناب دلیپ سنگھ نے لطیفے سنانے سے پہلے دلچسپ اور پُرلطف انداز میں صدارتی کلمات بھی ادا کئے اور اپنے تازہ ترین لطیفوں کے ذریعہ بھی حقِ صدارت ادا کر دیا آخر میں کنوینر جناب ذہانت علی بیگ کے شکریہ پر اس خوشگوار محفل کا اختتام عمل میں آیا۔ گاندھی بھون تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا تھا اور لطیفہ گو حضرات نے اپنے تازہ ترین و پُرمزاح لطیفوں سے موسم سرما کی اس شام کو گرما دیا تھا۔

اس محفل کے منتخب لطائف پیش خدمت ہیں۔

■ جناب ذہانت علی بیگ نے محفل لطیفہ [illegible] کرتے ہوئے کہا۔ ایک ڈاکٹر کے پاس ایک صاحب نے اپنے دوست کو بھیجا اور کہا آپ ڈاکٹر سے میرا نام لے لیجئے۔ وہ [illegible] اعلان [illegible] گئے۔ دو تین دن بعد وہ دوست ملے، تو پوچھا گئے تھے ڈاکٹر کے پاس؟

جی ہاں ؟

میرا نام لیا ؟

جی ہاں !

کیا کہا میرا نام سُن کر ؟

ڈاکٹر نے آپ کا نام سنتے ہی مجھ سے کہا، فیس پہلے دے دیجئے

- **دلیپ سنگھ** نے زندہ دلان کی اس محفل لطیفہ میں کئی لطیفے سنائے۔ ایک آپ بیتی پر مبنی لطیفہ بھی شامل تھا۔

دلیپ سنگھ کی بیوی نے کہا۔ "آپ تو آپ حیدرآباد میں مقبول ہوگئے ہیں۔ لوگ آپ کو دعوت پر بلائیں گے لیکن آپ وہاں بریانی نہ کھائیں چونکہ آپ دل کے مریض ہیں۔ کوئی بریانی پیش کرے تو صاف انکار کر دیجئے۔" واپس دہلی گئے تو بیوی نے پوچھا "حیدرآباد میں بریانی سے انکار کیا ؟"

دلیپ سنگھ نے کہا "نہیں"

بیوی نے کہا۔ "نہیں ! میں نے تو منع کیا تھا اور کہا تھا کہ انکار کردیں ؟"

دلیپ سنگھ نے کہا "ارے کوئی پیش کرتا تو انکار بھی کرتا۔"

- **دلیپ سنگھ** :- میرے ٹی وی سیریل "اُلٹا پلٹا" میں جو ہیروئن تھی اس کی شادی کا کارڈ ملا۔ میں نے سمجھا کہ یہ اسی لڑکے کے ساتھ شادی کر رہی ہے جو شوٹنگ کے وقت ساتھ رہتا تھا۔ ریسٹورنٹ میں، پارک میں ہر جگہ دونوں ساتھ گھومتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ شادی کے دن وہ کھڑا دروازے پر مہمانوں کو خوش آمدید کہہ رہا ہے، میں نے کہا "بھئی تم دولہا ہو تمہیں تو اندر ہونا چاہئے"

اس نے کہا "میں دولہا نہیں ہوں"

مجھے حیرت ہوئی۔ اس نے پھر کہا۔ "دراصل میں بہت دیر تک اس کے ساتھ تھا لیکن سیمی فائنل میں نکل گیا۔"

- **نریندر لوتھر** :- کسی مغربی ملک میں ایک گدھا ٹرانسسٹر نگل گیا۔ دھوبی بڑا پریشان ہوا، اس کو لے کر دواخانہ جانے لگا ٹرانسسٹر سے گانے آرہے تھے۔ اچانک وہاں کے سربراہ کی تقریر آنے لگی۔

ایک دیہاتی گذر رہا تھا، اس نے سربراہ کی تقریر جو سنی تو ٹھٹک گیا اور ادب سے گدھے کے آگے کھڑا ہوگیا۔

دھوبی نے کہا۔ "بھئی کیا تم نے کبھی سربراہ کی تقریر نہیں سُنی"

دیہاتی نے کہا، "نہیں ایسا نہیں ہے، تقریر تو بہت سُنی لیکن دیکھنے کا پہلا موقع ہے۔"

- **مجتبیٰ حسین** :- دہلی کے کافی ہاؤز میں ایک نوجوان صاحب ایک صاحب سے کہہ رہا تھا۔ "بھئی، آپ کے کوئی اولاد نہیں ہے تو مجھے آپ اپنا بیٹا بنا لیجئے۔"

اس شخص نے کہا۔ "وہ کیوں بھئی ؟"

نوجوان نے کہا "اس لئے کہ آپ نے اولاد کا سکھ نہیں دیکھا، میں نے اپنے باپ کا دکھ نہیں دیکھا۔"

- **ڈاکٹر رام پرشاد** :- ایک صاحب اپنی بیوی کا اسکان (SCAN) کروانے آئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "دیکھئے لائٹ کا مسئلہ ہے، اب تو پاور شٹ ڈاؤن ہے، ایسا کیجئے آپ شام کو آجائیے، میں آپ کی بیوی کا اسکان وغیرہ لے لوں گا۔"

ان صاحب نے کہا "کیا ہماری بیوی کو ساتھ لانا ضروری ہے"

- **موہن پرشاد** :- لندن میں ایک حیدرآبادی خاندان عرصہ سے مقیم تھا اور وہ اپنی لڑکی کی شادی حیدرآباد میں ہی کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ لڑکی والے لندن کے تھے اسی لئے مطالبات بھی خوب ہوئے کہ یہ دیجئے وہ دیجئے وغیرہ۔

لڑکی کے والد نے کہا "بھئی عجیب بات ہے، یہاں پر لڑکی کو بھی دینا پڑتا ہے اور جہیز کو بھی دینا پڑتا ہے۔"

اس پر لڑکے والوں نے کہا، "آپ کو اگر اس پر تعجب ہے تو ایسا کیجئے، جہیز دیجئے۔ لڑکی روک لیجئے۔"

■ **دولت رام :** ایک صاحب کا کان جل گیا تھا۔ دوست نے پوچھا، کس طرح جل گیا؟

وہ بڑے شرمائے اور جواب دینے سے کترانے لگے۔ بہت اصرار پر کہا۔ "بھئی میں استری کر رہا تھا کہ کان جل گیا"

"استری کرنے سے کان کیسے جل سکتا ہے"۔ ان صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔

"تو سنو، میں استری کر رہا تھا، اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی، میں نے عجلت میں استری کان کو لگالی"

■ **محمد علی مشکل (لغزان) :** ایک بڑھیا سڑک پار کر رہی تھی، دوسری طرف سے موٹریں آرہی تھیں، ٹریفک کانسٹیبل بڑھیا کو روکنے کے لئے سیٹیاں بجائیں، آوازیں دیں۔ بہرحال بڑھیا نے کسی نہ کسی طرح سڑک پار کرلی۔ کانسٹیبل نے اس کو دوسری جانب جاکر روک لیا اور برہم ہو کر کہنے لگا۔ "بڑی بی! ٹریفک کی زد میں آجاتیں تم، میں نے تمہیں روکنے کیلئے کتنی سیٹیاں بجائیں؟"

بڑھیا نے کہا۔ "ارے میاں وہ زمانہ گیا جب میں ایک ہی سیٹی میں پلٹ کر دیکھتی تھی"

■ **صبغتہ اللہ بھیا تک :** ایک صاحب پہلی بار طیارہ میں سفر کر رہے تھے۔ ایک دوست سے پوچھا کہ بھئی مجھے انگریزی تو آتی نہیں، طیارہ میں کس طرح بات کروں۔ دوست نے کہا، بھئی دو تین جملے یاد کرلو، وہی بولنا مثلاً کوئی خاتون اگر تمہارے برابر بیٹھ جائے تو اس سے کہنا میڈم ایکسکیوز می! کیا آپ کی شادی ہوگئی ہے؟ "ARE YOU MARRIED" پھر کہنا کتنے بچے ہیں وغیرہ وغیرہ دوست نے رٹ لیا۔ طیارہ میں اتفاق سے دو خواتین ان کے آس پاس بیٹھ گئیں۔ یہ بڑے خوش بھی ہوئے اور پریشان بھی ... تھوڑی دیر بعد انھوں نے ہنستے ہنستے انگریزی میں پوچھا! میڈم، کیا آپ شادی شدہ ہیں؟ — "جی نہیں" جواب ملا۔

"تو آپ کو کتنے بچے ہیں" اس پر ایک تھپڑ پڑا۔ وہ صاحب سمجھ گئے کہ ترتیب غلط ہوگئی۔ دوسری خاتون سے پوچھا۔

"میڈم! آپ کو کتنے بچے ہیں"

جواب ملا۔ "تین"

"آپکی شادی ہوگئی ہے" - پھر ایک تھپڑ پڑا۔

■ **منور علی :** ایک صاحبہ بڑی پریشان سڑک پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ ان کے گود میں بچہ تھا۔ لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ ادھر سے ایک صاحب کار میں گذر رہے تھے۔ یہ گڑبڑ دیکھ کر رک گئے اور پوچھنے لگے۔ کیا ہوا؟

کسی نے بتایا کہ اس بچے نے اٹھنی نگل لی ہے اور حلق میں پھنس گئی ہے۔

ان صاحب نے کہا "فکر کی کوئی بات نہیں ہے"۔ بچہ کے قریب گئے، کہا منہ کھولو"

بچے نے منہ کھول دیا۔ ان صاحب نے اس کے حلق کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ اٹھنی باہر آگئی۔ لوگ بہت خوش ہوئے۔ کہا آپ کون ہیں؟ اس کے ماہر ڈاکٹر ہیں؟

ان صاحب نے کہا۔ "جی نہیں میں ڈاکٹر نہیں ہوں، میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں"

■ **عرفان اللہ خوندمیری :** ایک زن مرید شکاری اپنی بیوی پر رعب ڈالنے کے لئے گھر میں گھس کر کہا۔ "بیگم! ذرا یہ تو بتاؤ؟ اگر میرے سامنے اچانک بڑے بڑے دانتوں اور لمبے لمبے سینگوں والا خونخوار جانور آگیا ہے، تو بتاؤ کہ اس کا کیا ہوگا"

بیوی نے جل کر کہا۔ "کیا ہوگا! آگے بڑھ کر آئینے پر پردہ ڈال دیا ہوگا۔"

■ **کلیم صدیقی :** ایک صاحب نے سڑک پر چار یا پانچ غنڈوں کی بیک وقت پٹائی کردی، لوگ بہت حیرت زدہ ہوگئے کہ ایک شخص نے اتنے مشہور غنڈوں کو تنہا مار پیٹ کر بھگا دیا۔ کسی نے پوچھا،

"بھئی بہت خوب! آپ کی رگوں میں کوئی بہادر خاندان کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ آپ کے ددھیال کی بہادری ہے یا ننھیال کا خون دوڑ رہا ہے؟"

ان صاحب نے کہا: "ان میں سے کسی کا بھی نہیں ہے، بلکہ "بلڈ بینک" کا خون دوڑ رہا ہے۔"

▪ اظہر افسر: ایک صاحب بس میں سفر کر رہے تھے: انہوں نے دو ٹکٹ لئے۔ کنڈکٹر حیران ہو کر کہنے لگا۔ "دو ٹکٹ کیوں لیا؟"

"بھئی ایک گم ہو جائے تو دوسرا رہے گا۔"

کنڈاکٹر نے ازراہ مذاق کہا "بھئی دونوں گم ہو جائیں تو؟"

"تو کیا، میرے پاس بس پاس بھی ہے۔"

مالک:- ارے آج تم نے شیو کے لئے اتنا گندہ پانی کیوں رکھ دیا؟

ملازم: شیو کے لئے پانی؟ میں نے تو آپ کیلئے چائے رکھی تھی۔

▪ طالب خوندمیری: ایک دوست اپنے ڈاکٹر دوست سے ملے جو ڈینٹسٹ تھے، اور کہا کہ "بھئی تم آنکھوں کے علاج کے ماہر تھے، ڈینٹسٹ کیسے بن گئے؟"

دوست نے کہا۔ "بھئی آنکھوں کے علاج میں کوئی "اسکوپ" نہیں تھا۔"

"ارے وہ کیسے؟ اس میں بھی کافی مریض آتے ہیں۔"

"نہیں بھئی، سیدھی سی بات ہے، آنکھیں دو ہوتی ہیں اور دانت (۳۲) ہوتے ہیں۔"

▪ محمد سلیمان: ایک ہوٹل میں ایک صاحب کھانا کھاتے ہوئے بہت بُری طرح ہڈیاں چبا رہے تھے، جس سے آوازیں آرہی تھیں۔ دوسرے صاحب جو دوسری میز پر کھیر کھا رہے تھے، بڑے جز بز ہو رہے تھے۔ انہوں نے دانت پیس کر کہا: "کیجئے! جناب آپ کے ہاں کتے کیا کھاتے ہیں؟"

ان صاحب نے کہا "جی وہ کھیر کھاتے ہیں۔"

▪ محمد حمایت اللہ نے یہ لطیفہ سنایا کہ دو بہنوں کی شادیاں ہوئیں۔ بڑی بہن مزے میں تھی، چھوٹی پریشان حال۔ لوگوں نے پوچھا ایسا کیوں؟ حالانکہ چھوٹی اور بڑی لڑکی کا شوہر دونوں ایک ہی محکمے میں ہیں۔ ماں نے کہا "چھوٹا داماد رشوت نہیں لیتا۔"

تو ان کی سہیلی نے کہا۔ "پہلے ہی دریافت نہیں کروانا تھا؟"

▪ مصطفےٰ علی بیگ: ایک صاحبہ طوطے خریدنے گئیں۔ مالک دوکان سے کہا۔ "کیا آپ کی طوطا کو اُردو بولنا آتا ہے؟"

دوکاندار نے سر پیٹ لیا اور کہا "محترمہ خدا کے لئے چلے جائیے۔ آپ کی وجہ سے میرے طوطے کی زبان خراب ہو جائیگی۔"

کل ہند مزاحیہ مشاعرہ

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ "تقاریب" کے آخری دن ۲۶ نومبر ہفتہ ٹھیک ۸½ بجے شب نمائش میدان پر عظیم الشان کل ہند مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس زعفران زار محفل کی صدارت محترم نواب شاہ عالم خان صاحب نے فرمائی۔ سردی کے باوجود سامعین کی ریکارڈ تعداد موجود تھی جس میں خواتین بھی شامل تھیں۔ موسم سرما کے پیش نظر مشاعرہ گاہ میں سردی سے بچنے کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے تھے۔ معتمد عمومی جناب مصطفےٰ علی بیگ نے خیر مقدم کیا۔ محترم نواب شاہ عالم خان صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں زندہ دلانِ حیدرآباد کی ستائش کرتے ہوئے فرمایا کہ "زندہ دلانِ حیدرآباد انسانوں پر کام کے بوجھ کے باعث دماغ پر موجود دباؤ کو کم کرنے کا کام کر رہا ہے، جو ایک ڈاکٹر بھی نہیں کر سکتا۔" انہوں نے کہا کہ طنز و مزاح کا ادب ہی انسان پر چھائے ہوئے بوجھ کو کم کر سکتا ہے۔ سلسلۂ تقریر کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس پریشانی کے دور میں زندہ دلان سالانہ "تقاریب" منعقد کر کے عوام کو زندگی بخش رہے ہیں۔ جناب نریندر لوتھر صدر زندہ دلانِ حیدرآباد نے بھی مخاطب کیا ——— ابتداء میں بوگس حیدرآبادی نے اردو

- میں جناب طالب خوندمیری نے عوام کے اصرار پر مشاعرے کی کاروائی چلائی۔ طالب صاحب کی نظامت کی خصوصیت یہ تھی کہ کسی شاعر کے کلام سُنانے کے بعد فوراً وہ اسی زمین میں جواباً فی البدیہہ اشعار سنا رہے تھے اس مشاعرے میں حصہ لینے والے شعراء کا کلام نذرِ قارئین ہے۔

▪ جناب سرپٹ حیدرآبادی

:- قطعات :-

کہیں بھی سکھ نہیں دل کو کہاں جائیں کدھر دیکھیں
وہیں سکھ پائے شاید دل چلیں دِلسکھ نگر دیکھیں
دکن تک لکھنؤ سے گردشِ تقدیر لے آئی
مقدر میں تھا کھٹّا۔ چاکنہ۔ املی، جگر دیکھیں

-۲-

مجھ کو نل پرسنٹ پاکر کوئی کام آیا تو کیا
نزع کے عالم میں لب پر اُس کا نام آیا تو کیا
جستجو ہے مجھ کو اپنے گھر کی میرے سامنے
باغِ عام آیا تو کیا دارالسلام آیا تو کیا

غزل

سُنی ہے گالیاں، جوتے بھی کھا چکا ہوں میں
جہاں حسین ملے چکنے، پھسل پڑا ہوں میں
کبھی کبھی یہ عجب خواب دیکھتا ہوں میں
میاں ہے وہ مرے اور اُنکی اہلیہ ہوں میں
چُرا کے نظریں کسی دن وہ مجھ سے رہ نہ سکے
خود اُن کی نظروں میں گھس کر سما گیا ہوں میں
دبوچ بیٹھوں کہیں دفعتاً نہ میں اُن کو
وہ دور بچ کے رہیں مجھ سے سرپھرا ہوں میں
سمجھ کے مجھ کو گدھا خوش ہیں وہ اگر مجھ سے
خوشی سے مجھ کو بھی منظور ہے۔ گدھا ہوں میں

◯

▪ جناب احمد سلطان

بونس ہے نہ بھتّہ ہے حیران زمانہ ہے
قرضہ ہے نہ ایل ٹی سی سیونگ بہانہ ہے
انسانوں سے اچھے ہیں پتھر کے یہ گوتم بدھ
ان کے لئے سب کچھ ہے اور سارا خزانہ ہے

-۲-

ساری دولت دیش کی اب جاہلوں کے پاس ہے
اک سفارش ہی نہیں رشوت بھی ان کے پاس ہے
کیا ترقی ہے کہ چپراسی بھی بی اے پاس ہے
نان میٹرک جو منسٹر ہے ہمارا باس ہے

-۲-

عدمِ تعمیلِ سگنل پر کبھی ہلمٹ پر جرمانہ
سواری والا پولیس کے ہے گھیراؤ سے دیوانہ
اُدھر ہے حادثہ لیکن اِدھر جاری ہے نذرانہ
"اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر آتا ہے پروانہ"

▪ جناب رشید عبدالسمیع جلیل

۲ شعر

یہ سوچا ہی نہیں ہم نے کہ دیوانی کا کیا ہوگا
ہمیشہ جینس ہی پہنے تو شروانی کا کیا ہوگا
خبر یہ ہے کہ بعد از عقد غائب ہے کہیں نوشہ
ولیمہ ملتوی ٹھہرا تو بریانی کا کیا ہوگا

:- غزل :-

نہ پوچھیے بات اِنکم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے
پوزیشن راج رتنم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے
سرینڈر مل گیا ہے، جانے ترپن دن کا کیا ہوگا
وہی سرکار پٹنم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے
سڑک پر سو گئے فوراً نہ کچھ دیکھا نہ کچھ سوچا
روایت تلگو دیشم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

وہی رنگین کپڑے، کان میں بالی، وہی ایکٹنگ
وہی رفتار سی۔ایم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

درآمد اور ہوگا شہر میں کیا دیکھتے جاؤ
پلاننگ میرے ہمدم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

مکمل ہوگئی ہے گرچہ سطحِ آب جھیلوں میں
وہی اک بوند شبنم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

اگرچہ دو روپے کیلو ہے چاول سبز کارڈ پر
مگر سپلائی بیتم کی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے

گرانی بڑھ گئی حتیٰ کہ مرچی تک ہوئی مہنگی
حماقت پھر بھی بیگم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

کھنکتی چوڑیاں، کانوں میں جھلکے، پیر میں پائل
وہی جھنکار میڈم کی، جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

نہیں واقف اگرچہ زلفِ عنبر ہیر آئیل سے
نزاکت زلفِ برہم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

فریبِ جامہ زیبی ہے لگے دھوتی نما ورنہ
وہی شلوار ریشم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

نہیں بدلی فضا دیکھو بھی، یہ سب رونق پرانی ہے
وہی ہر چیز کھسم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

ہزاروں ٹوکرے آلو، ٹماٹو، رات دن لڑھکے
وہ منڈی میر عالم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

وہی آدابِ مجلس ہیں، وہی اندازِ نوابی
وہی تہذیب ویلکم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

کہوں میں کیا جلیبی اپنی وہی دن رات ہے کھانسی
خرابی پورے سسٹم کی جو پہلے تھی سو اَب بھی ہے

-۲- -۲- -۲-

۔ جناب معین امر بمبو

قطعات

ہو چیکنگ کتنی بھی مشکل چال چل جاتے ہیں لوگ
روڈ پر پولیس کی نظروں سے پھسل جاتے ہیں لوگ

لازمی ہیلمٹ ہوئی ہے جب سے بمبو کیا کریں
چکنی ہنڈی پر کلر کرکے نکل جاتے ہیں لوگ

-۲-

اداکاری سے اپنی مسکرا کو ٹال رئیں انّا
تم اپنے چمچوں کو خطرے کے ویسا پال رئیں انّا
الیکشن ہے قریب معلوم ہے انجام کیا ہوگا
ابھی سے روڈ پہ سونے کی عادت ڈال رئیں انّا

غزل

پولیس والے سڑکوں پو تختیاں لگا رئیں
ہٹو بازو سب، سی یم موٹر چلا رئیں
امانان بھی کٹے پو چیخوں کی آ رئیں
بتاں لائن میں انّا تم کو بلا رئیں
تمہیں جانا ہے جا کو امّاں سے مل لیو
مرے گھر میں کائیکو قیامت بلا رئیں
مرے دل کی دنیا میں ہو رائے اندھیرا
اُنوں کالے ہونٹوں پہ مسّی لگا رئیں
شہر تو یہ اُردو کی بریانی کا ہے
زبردستی تلگو کا دوشہ کھلا رئیں
یہ سی یم شہر کے تو اچھے ہیں بمبو
مگر دونوں داماداں چھلکے لگا رئیں

-۲- -۲- -۲-

۔ جناب رؤف رحیم

دعائیہ غزل کے کچھ شعر:۔

کوئی آثار بڑھاپے کے نہ ظاہر ہوں کبھی
کالے بالوں میں مری عمر چھپا دے یا رب (جناب طالب خوندمیری کیلئے)

آدھے شعروں کو چراتے ہیں جناب بوگس
پوری غزلوں کا انھیں چور بنا دے یا رب (جناب بوگس حیدرآبادی کیلئے)

میں ترنم سے گلا پھاڑ رہا ہوں کب سے
اَب کرم کر مجھے قوال بنا دے یا رب (ذان پڑھ پیرنگیری کیلئے)

- جناب کشن لال خنداں دہلوی

کالے محبوب ارے معاذ اللہ
پر نہیں اور ہوا میں اُڑتے ہیں
دانت ان کے قطار میں جیسے
بگلے کالی گھٹا میں اُڑتے ہیں
کالے محبوب ارے معاذ اللہ

یہ اندھیرے میں بھی چمکتے ہیں
کالی صورت پہ پاؤڈر جیسے
جامنوں پر نمک چھڑکتے ہیں
کالے محبوب ارے معاذ اللہ

میں نے جب اُن کا فوٹو کھنچوایا
بولے فوٹوگرافر اے خنداں
یہ نگیٹو کہاں سے لے آیا
کالے محبوب ارے معاذ اللہ

-٭- -٭- -٭-

- جناب سراج نرملی

قطعات

پھوری، ھونڈی، سڑی کی طرف نہیں دیکھا
بساندی، باسی کرٹی کی طرف نہیں دیکھا
سراجؔ گھر میں سکنڈ وائف جب سے آئی ہے
پلٹ کے تب سے بڑی کی طرف نہیں دیکھا

-٭-

بس سلامت رہے، کرسیٔ وزارت میری
دن بہ دن بڑھتی رہے شان اور شوکت میری
خوش رہیں بیٹے و داماد، نواسے، پوتے
بھاڑ میں جائے رعایا و ریاست میری

-٭- -٭- -٭-

- جناب وینوگوپال بھٹڑ (ہندی)

نیتا جی ہاتھ جوڑ کر بولے
بھائیو اور بہنو
نمسکار
میرا چناؤ چِنہ ہے
'لنگوٹی'
گاندھی جی نے لنگوٹی لگائی تھی
دیش کو آزادی دلائی تھی
میں بھی گاندھی جی کے سدھانتوں کو نہیں توڑوں گا
سارے دیش کو لنگوٹی لگوا کے چھوڑوں گا

-٭-

شہر کے ویکتیوں کا ڈیپوٹیشن
نیتا جی کے پاس پہنچا
اور بولا، شریمان
ہم نے شہر میں ایک نیا شمشان گھاٹ بنایا ہے
اور طئے کیا ہے کہ اُس کا اُدھ گھاٹن
آپ کے دوارا ہی کرائیں گے
آدھے کرپا کر آپ جلدی سے مر جائیں گے
تو پہلا مردہ آپ کا ہی جلائیں گے

-٭-

ہم نے ایک نیتا جی سے پوچھا کون ہیں آپ
وے بولے ہم ہیں کمبھ کرن کے باپ
کمبھ کرن کے جیسے لڑکے تو ہماری جیب میں ہوتے ہیں
وہ چھ مہینے تک سوتا تھا، ہم پانچ سال تک سوتے ہیں

-٭-

شریمان جی اپنے آپ کو بیور ویجیٹیرین بتلا رہے ہیں
حالانکہ بات یہ ہے کہ دو گھنٹے سے میرا بھیجا کھا رہے ہیں

-٭-

بھیک میں دیا ہوا دس پیسے کا سکہ
جب بھکاری نے مجھے واپس لوٹا دیا
تو میں نے کہا جناب، میرا ایک اُصول ہے کہ
میں کسی کو دس پیسے سے زیادہ نہیں دیتا
بھکاری بولا حضور، میرا بھی ایک اُصول ہے
میں کسی بھکاری سے بھیک نہیں لیتا

-٢-

رامچندر جی کے درشن کر
مندر سے جوں ہی باہر نکلا
تو دیکھا، جوتے غائب
ویسے ہی مندر واپس پہونچا
بھگوان سے شکایت کرنے
HEY پربھو
تیرے دربار میں چلے گئے
ہمارے جوتے چلے گئے
تو پربھو مسکرائے
اور انھوں نے اپنے ننگے پیر مجھے دکھائے، بولے بھکت
جس نے تیرے جوتے چُرائے
اُس نے میرے بھی نہیں چھوڑے
حیران ہوں
میں بھی تیری طرح پریشان ہوں۔

-٢-

ہے (HEY) راون!
تیرے دس سروں میں بیس آنکھیں
کمال ہے
جب تو روتا ہوگا تو وہ سین بڑا عجیب ہوتا ہوگا
راون بولا، بے وقوف، ایسا نہیں ہوتا
راون کے راج میں جنتا روتی ہے، راون نہیں روتا!

-٢- -٢- -٢-

جناب موہن ملکش

غزل

میں لنگڑا، لولا، کالا ڈانبر سے ہوں نرالا
ہے کوئی مجھ کو اپنا جنوئی بنانے والا
جاوا تو سب ہی دیتے فیئٹ مجھے دلا دو
کچھ ہی دنوں میں ہوں میں دوبئی کو جانے والا
چہرے پہ تل تو ہوگی آنکھوں میں پھول ہے میرے
سڑکوں پہ چلتے چلتے ہوں دھکے کھانے والا
دھوکا کسی کو دینا آتا نہیں ہے مجھ کو
لیڈر بنا ہوں میں تو نعرے لگانے والا
دیکھا ملکش تم نے، لیڈر بنا ہے وہ بھی
سڑکوں پہ بیٹھ کر اک پنکچر بنانے والا

-٢- -٢- -٢-

جناب محمد علی ننگلی (لندن):-

قطعہ

زندگی پھر نئے انداز سے میں ڈھالوں گا
عہدِ ماضی کا ہر اک نقش مٹا ڈالوں گا
سسر کے دفتر کی اگر کنجیاں مل جائیں مجھے
امشلہ جات پرانے میں جلا ڈالوں گا

-٢- -٢- -٢-

جناب صبغتہ اللہ بمباٹ

قطعہ

روشن خیال بیبیاں اب گل کھلائیں گی
وہ کونسا بھی کام ہو کرنے کو جائیں گی
بمباٹ تم بھی دیکھ لو وہ دن نہیں ہیں دور
سڑک کے سڑک پہ لڑکیاں رکشے چلائیں گی

-٢- -٢- -٢-

ـ جناب اشرف خوندمیری

کانا دجّال

(گستاخِ رسول سلمان رشدی کی ماں کی بد دُعا)

کائیکو تو اِتا کھتّال پیدا ہُوا ئے
کائیکو رے کنتری مال پیدا ہُوائے
کائیکو رے بن کو تو کالے خنزیر کی
مُرڈُمڑی ناک کا بال پیدا ہُوائے
کیسی ٹھُمری کا سُر تال پیدا ہُوا ئے
کائیکو کی کانا دجّال پیدا ہُوائے

سُن نارے، بیندرسے، بے شرم بےحیا
تیرے امّاں کے دل کی ہے یہ بددُعا
تو جلینگا رے دوزخ کی آنگار میں
بکتے پیارے نبی کو تو گالی دیا
ہو ندی صورت کا چنڈال پیدا ہُوائے
کائیکو کی کانا دجّال پیدا ہُوائے

تیری صورت کو تیدس کی گولی لگو
پاواں گھس گھس کو ایڑیاں لگڑ کو مرو
چوطرف تیرے مُردے کو اللہ کرے
بِپلکاں، بچھواں، ناگ سانپاں ملو
جان کا بن کو جنجال پیدا ہُوائے
کائیکو کی کانا دجّال پیدا ہُوائے

اچھی اولاد کے سپنے دیکھی تھی میں
گود میری جلینگی نئیں سمجھی تھی میں
میرے مالک تو اولیاد کائیکو دیا
ایسی اولیاد سے بانجھ اچھی تھی میں
میرے گھر میں بداعمال پیدا ہُوائے
کائیکو کی کانا دجّال پیدا ہُوائے

ـ جناب اقبال ہاشمی

ـ قطعہ :ـ

ہم نے بیمار کو فٹ پاتھ پہ سوتے دیکھا
بےکس و مفلس و نادار کو سوتے دیکھا
ایک چوپائے کو سوتے ہوئے دیکھا تھا جہاں
آج خود اپنی ہی سرکار کو سوتے دیکھا

غزل

کیوں بنا بیٹھا ہے اپنے آپ کا بھگوان تو
ناچ گانے کی طرف پھر لوٹ میری جان تو
تو سڑک پر نیند کی دیوی سے ہم آغوش ہے
اپنے بھگتوں کو بھی دیدے نیند کا وردان تو
شہر کا ہر موڑ تیرے واسطے اسٹیج ہے
اک نیا ناٹک دکھائے ہر گھڑی ہر آن تو
شہر کے تالاب سارے پاک تو نے کردیئے
تلگو گنگا میں کرے گا جانے کب اشنان تو
ہر عدالت نے کئے ہیں فیصلے تیرے خلاف
اور اِن سب فیصلوں کا بن گیا شمشان تو
کس کو فرصت ہے کہ رکھے جھوٹے وعدوں کا حساب
جو بھی تیرے من میں آئے کردے وہ اعلان تو
کل جھکے گا تیرا سر اُردو کے آگے سوچ لے
جاری کرلے آج تلگو میں سبھی فرمان تو
اپنے بھگتوں کو فقط تہہ دید شستوں پہ ٹال دے
اپنے داما دوں کو دیدے عیش کا سامان تو
کل نہ جانے کون سا چولا یہ بدلے ہاشمی
آدمی کے بھیس میں گرگٹ ہے یہ پہچان تو

ـ۰ـ ـ۰ـ ـ۰ـ

ـ اَن پڑھ بھونگیری

ـ قطعات ـ

کارنامہ یہ کر دکھانا ہے
روڈ پر پھر انھیں سلانا ہے
چند گھنٹوں کی نیند کیا ہوگی
اب انھیں عمر بھر سلانا ہے

•

سب آپ کی طرح کہاں کمر ہلاتے ہیں
جو رہنما ہیں آگ میں بھی کود جاتے ہیں
دعویٰ ہے رہبری کا تو سُن لیں یہ آپ بھی
موقع پڑے تو رہنما لٹ بھی گھماتے ہیں

غزل

جو مجھے ہاتھ دینے والا ہے
ہم نوالہ ہے ہم پیالہ ہے
اب زنانے کو اک طرف کردو
وجد مُرشد کو آنے والا ہے
میکشی سے نہیں ہیں جو واقف
ان کے ہاتھوں میں کیوں پیالا ہے
سلمیٰ آغا سے بچ کے آئے تھے
سری دیوی نے مار ڈالا ہے
چالو مرشد کا حال سُن لیجے
چہرہ روشن، ضمیر کالا ہے
سسرا چپکا سو بن گیا چمچو
ساس اب تک گرم مسالہ ہے
لڑکی بی۔اے ہے، دنیا دیکھی ہے
لڑکا اَن پڑھ ہے گاؤں والا ہے

• • •

ـ جناب پاگلؔ عادل آبادی

قطعہ

دفتر سے جب لوٹی بیوی دیکھا بچہ روتا تھا
ڈانٹ کے بولی شوہر سے اِک لوری گاتے اچھا تھا
شوہر بولا، سُن کر لوری بولے پڑوسی، پاگلؔ جی
آپکی لوری سے تو اچھا بچے کا ہی رونا تھا

غزل

آیا سو میرے گھر میں گھس کو ماشی جا کس کا ہے کی
کانڈی مرغی میری کا ہے لیکن لنگڑا یہ مُرغا کسکا ہے کی
کھا کو نکل روں پی کو نکل رواں بڈیاں بوٹیاں ثابت نگل رو
کھانے کی دعوت کھا تو رہا ہوں پر یہ ولیمہ کسکا ہے کی
مالِ غنیمت ہاتھ یہ آیا ساتھ جہیز میں اِس کو پایا
جتنے ہیں کالے اُتنے ہیں میرے گورا یہ پوتا کسکا ہے کی
اپنا ٹفن تو سب کو کھلایا سب کے ٹفن میں گھر کو بھجایا
بیگن کا بھرتا تو میرا تھا لیکن دم کا یہ مرغا کسکا ہے کی

• • •

ـ جناب اسمٰعیل ظریفؔ

قطعات

کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے
ہمیشہ کیوں نہیں آتا کبھی کبھی کیا ہے
پکارو نام سے شوہر کو اب یہ فیشن ہے
مگر یہ طرزِ تخاطب اجی اجی کیا ہے

•

کل رات نل کے پاس، انھیں دیکھنے کے بعد
پھر بڑھ گئی ہے پیاس، انھیں دیکھنے کے بعد
پچیس سال بعد نظر آئے وہ ظریفؔ
ٹوٹی نہیں ہے آس، انہیں دیکھنے کے بعد

فہرست جہیز میں کار بھی ہے ٹی وی بھی ہے لیکن
اک انجن ریل گاڑی کا بھی لکھواتے تو اچھا تھا
کہا بیٹے نے باوا سے چچا کا کیا بھروسہ ہے
رقم جوڑے کی لانے آپ خود جاتے تو اچھا تھا

-:-

چوّا مرے آگے کبھی چھکّہ مرے آگے
کرکٹ کا ہے گلیوں میں تماشہ مرے آگے
جب جم کے پڑی گیند تو یاد آیا یہ مصرعہ
"بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے"

مشورہ

کہا لڑکے نے اپنی پگلی محبوب سے اک دن
میں کرنا چاہتا ہوں مشورہ شادی کے بارے میں
شریک زندگی میں ایسی لڑکی کو بناؤں گا
جو جھاڑو تک لگا سکتی ہو گھر میں اپنے ہاتھوں سے
کہا لڑکی نے یہ سنکر بہت اچھا ارادہ ہے
خیالات اور جذبات بے شک ہیں بہت اونچے
تمہیں کل ہی ملا دوں گی میں اپنی نوکرانی سے

لال گھوڑا

کہا پوتے نے دادا سے ہمیں سرکس دکھا دیجے
نہیں بیٹے بھلا اس بڑھاپے میں تمہیں کیسے دکھائیں گے
کہو تم اپنے ابا سے کہ وہ تم کو دکھا لائیں
ہمیں ایکبار ابا نے دکھایا ہے مگر ہم اور دیکھینگے
وہاں ایک گوری لڑکی
پہن کر نیکر اور چڈی
کمال اچھے دکھاتی ہے وہ اپنے لال گھوڑے پر
[illegible] سن کر
اگر یہ بات ہے تو پھر چلو ہم ہی دکھا دیں گے
[illegible] سے نہیں دیکھا ہے ہم نے بھی کوئی گھوڑا

▪ جناب مصطفےٰ علی بیگ

معصوم قطعہ

ٹوئینکل ٹوئینکل لٹل اسٹار
اتنا بتا دے میرے یار
سارے ستارے ان کی قسمت
اپنا ستارہ کیوں ڈ مدار

غزل

اُن کے افسر کا بس اتنا سا ہے فسانہ
سنڈے کسی سے ملنا منڈے کو بھول جانا
مدت کے بعد مجھ سے ملنے وہ آ گئے ہیں
اے میرے پیارے لیڈر کرفیو ذرا لگانا
فہرست لکھ رہے ہیں ڈیڈی مطالبوں کی
اپنی ہے لومیرج تنکا بھی تم نہ لانا
آواز ریڈیو پر سُن کر میں ڈر گیا تھا
اتنی سی التجا ہے ٹی وی پہ تم نہ آنا
وہ میرے گھر میں آکے رہتے تھے ساتھ میرے
افسوس تو یہی ہے بچپن کا تھا زمانہ

-:- -:- -:-

▪ جناب ساغر خیامی (دہلی)

بیٹیاں ور پائیں بہتر کس قدر دشوار ہے
اس مہذب دور میں بھی پیار کاروبار ہے
جیت جس کو کہہ رہے ہیں وہ ہماری ہار ہے
آدمی رسوا جہاں میں، چور عزت دار ہے

-:-

جب پولیس والے ہی چوروں کی مدد فرمائیں گے
چور جمنا سے کسی دن پُل اُٹھا لے جائیں گے

-:-

قندیلِ آفتاب فلک پر جلائی ہے
پھولوں سے پتیوں سے یہ دھرتی سجائی ہے

جمنا یہیں پہ پیار کی گنگا بہائی ہے
دنیا برائے عشق خدا نے بنائی ہے

-٥-

یہ جان لو زمین پہ جو بلوا مچائے گا
اللہ اس کو عرش پہ مرغا بنائے گا

-٥-

بولا دوکاندار کہ کیا چاہیئے تمہیں
جو بھی کہو گے میری دوکان پر وہ پاؤ گے
میں نے کہا کہ کُتّے کے کھانے کا کیک ہے؟
بولا یہیں پہ کھاؤ گے یا لیکے جاؤ گے؟

کرکٹ

ٹی وی پہ چل گیا ہے کرکٹ کا جو چلن
ہر شخص محو دید ہے دولھا ہو یا دولہن
اک مولوی سے پوچھا جو حوروں کا بانکپن
داڑھی کھجا کے بولے وہ ہینڈرڈ فار وَن

میں نے کہا یہ وقت ہے حق کی اذان کا
بولے کہ میں تو فین ہوں عمران خان کا

جس کی طرف بھی دیکھئے صورت سوال ہے
صدمے سے زرد کوئی مسرت سے لال ہے
اک شعر گھر میں بیٹھ کے کہنا محال ہے
بچوں کا ذکر کیا ہے، یہ بیگم کا حال ہے

پوچھا کسی نے آپکے وہ ہیں، مکان پر
بولی وہ کیچ ہو گئے کب کے میدان پر

بچے تمام رات ہمیں ٹھیلتے رہے
کرکٹ کا میچ خواب میں وہ کھیلتے رہے
کہنی سے لات سے وہ ہمیں ریلتے رہے
ہم بھی ترقی دیکھ کے سب جھیلتے رہے

سوتے میں گیند آن کی ماری جو آف میں
چانٹا پڑا بچا نخ سے منہ پر لحاف میں

-٥- -٥- -٥-

جناب مختار یوسفی

قطعات

تھے دونوں ہی ذرا تر چھے ملے چنگو جو منگو سے
نماز عید کی خاطر نہائے تھے وہ خوشبو سے
ادائے فرض میں سوچا کہ سنت ہے گلے ملنا
گلے ملنے بڑھے لیکن، نکل آئے وہ بازو سے

-٥-

پولیس کے سائے میں لیڈر کا جب جواب ہوا
نظر ملا نہ سکا ایسا بے نقاب ہوا
ہمیشہ رہتا تھا پیچھے جو ہم جماعت سے
ملازمت میں وہی لڑکا کامیاب ہوا
ہمیشہ فیل جو ہوتا رہا کلاس میں
اسمبلی میں وہی شخص کامیاب ہوا

-٥-

اشعار سُن کے اپنے ہی بیگم کے سامنے
کس سادگی سے واہ کئے جا رہا ہوں میں
سسرالی فوج دیکھ کے مختار نے کہا
"کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں"

-٥-

برائی ہے اگر مجھ میں، تو پھر میرا نہ بن ساقی
سلامت تو، ترا میخانہ، تری انجمن ساقی
سنبھال اب میکدہ اپنا، میں اپنا کام کرتا ہوں
"چُرانے جا رہا ہوں قبر سے تازہ کفن ساقی"

-٥-

روز کے جھگڑوں سے داماد نے تنگ آ کے کہا
ٹھوکریں ماریئے، دھتکاریئے، دیجے گالی
اپنا گھر چھوڑ کے ہم آپ کے گھر آئے ہیں
"ہم سے اب دوسری ہجرت نہیں ہونے والی"

-٥- -٥- -٥-

• اعجاز الدین پاپولر میرٹھی

قطعات

عشق میں ہم بن کے اُلّو رہ گئے
اَب تصور کے قلعے بھی ڈھ گئے
اُن کے بچے ہم کو ماموں کہہ گئے
دل کے ارماں آنسوؤں میں بہہ گئے

•

عشق اور میرا کامیاب نہیں
آپ کی عقل تو خراب نہیں
اُن سے ہم روز یوں نہیں ملتے
کہ مکمل ابھی شباب نہیں

•

بیوی یہ کہہ رہی تھی کہ امریکہ جا بسیں
گرمی میں سارا زورِ جوانی چلا گیا
اس ملک میں رہا نہیں جینے کا اَب مزہ
بجلی چلی گئی، کبھی پانی چلا گیا

•

لوگ الزام یہ الزام دیئے جاتے ہیں
کیا ملا مجھ کو تری زلف کا قیدی ہوکر
عشق کی راہ میں پہنچے ہیں مسلسل صدمے
اُڑ گئے بال مرے نذرِ سفیدی ہوکر

•

ان ٹوٹکوں سے زندہ ہے رودادِ حسن و عشق
البم کے بیچ پھاڑ کے چولہے میں ڈالئے
ان مفت کی غزلوں سے ملا خاک پاپولر
بہتر یہی ہے پھر بکری کو پالئے

•

بسیل باٹم میں گھسا ہے عاشقِ دورِ جدید
زیست پہلے حسن کا پیکر بھی اَپ ٹو ڈیٹ ہے
آئی لَو یُو لکھ کے اُس کو میں نے جب لیٹر دیا
ہنس کے یوں کہنے لگا اِس کا اونچا ریٹ ہے

غزل

شراب پیتے ہی بلّا پچھا دیا میں نے
گلی کے کتے کو جینا سکھا دیا میں نے
نظر سے تو کیا گراتا کہ اس سے پہلے ہی
ترے مکان کا چھجّہ گرا دیا میں نے
اب اور اہلِ وفا کا اَچار ڈالوں گا
رقیب کا تو مربّہ بنا دیا میں نے
جو داؤ پیچ میں خود کو 'کلے' سمجھتے تھے
غزل سُنا کے ٹھکانے لگا دیا میں نے
مجھے تو اس نے بنایا تھا گاؤں کا مجنوں
اُسے بھی شہر کی لیلیٰ بنا دیا میں نے
وہ روز عالمِ بالا کی بات کرتے تھے
جناب شیخ کو چھت پر چڑھا دیا میں نے
نکاح تجھ سے پڑھا کر جو فیس لے کے چلے
تو قاضی جی کا ہی بٹوا اُڑا دیا میں نے
میں ایک ہفتہ کو اسے پاپولر بنا مجنوں
پھر اُس کے بعد انگوٹھا دکھا دیا میں نے

• • •

• جناب طالب خوندمیری

کسی خاتون نے اپنی پڑوسن سے کہا اک دن
سُنا ہے تم پرائی عورتوں سے، اپنے شوہر کی شکایت کرتی پھرتی ہو

یہ بات اچھی نہیں آپا
نہایت نامناسب ہے
مجھے دیکھو
میرا شوہر گدھا ہے، ایڈیٹ ہے، وہ لفنگا ہے، نرا اُلّو کا پٹھا ہے

مگر تم ہی کہو
میں نے کسی سے آج تک اُس کی شکایت کی

بڑی افسردگی سے ایک لڑکے نے کہا ماں سے
بہت تکلیف دہ منظر تھا اُس کی موت کا اُمّی
پریشاں ہوکے اسکی ماں نے پوچھا، کیا ہوا اُس کو
یہ کس کی موت کا ذکر کرتا ہے
کہا لڑکے نے
ایک لیڈر نے کل ایک سانپ کو کاٹا
وہ منظر یاد کرتا ہوں تو میرا جسم جیسے کانپ اُٹھتا ہے
اور مری آنکھوں کے آگے وہ تڑپتا، سر پٹکتا، مر گیا آخر
میں بے بس اسکو مرتا دیکھتا بس رہ گیا اُمّی
بچارا، بچارا سانپ کتنا خوبصورت کتنا پیارا تھا!

قطعہ

اک دلفریب سین لگا ہوں سے ہٹ گیا
احساس برتری ہمارے دل سے چھٹ گیا
خوش ہو رہا تھا پیٹ کے بیگم کو خواب میں
لیکن کھلی جب آنکھ تو نقشہ پلٹ گیا

پنجیری (نئی صنف)

(۱)

کل اک دوکان پہ اک سیلس مین ہنس ہنس
یوں کر رہا تھا گفتگو۔ میاں چپل کے
شوہروں میں کچھ ایسے کہ پیٹھ پر جن کی
اُبھر رہے ہیں برابر نشان چپل کے
جو شاہکار ہیں اس بے زبان چپل کے

(۲)

اک خلائی سائنسداں سے اُس کی بیوی نے کہا
آگیا ہے آپکے قدموں کے نیچے آسماں
جتنے بھی خلا تھے آپ نے پار کر لئے

ملئے مگر کیوں نہیں کر سکتے ہو میرے میاں
اک ذرا سا فاصلہ جو ہے ہمارے درمیاں

● جناب مقرب حسین مقرب

بیوی کے آنسو

ایک انسان نے بیوی کو جو روتے دیکھا
اس نے حیرت سے بڑے پیار سے اُس سے پوچھا
کیا کہیں درد ہے، تکلیف ہے یا چوٹ لگی
یا محلے میں کسی بات پہ تکرار ہوئی
یا کسی بچے نے کہنا نہیں مانا تیرا
یا مری ماں نے کوئی دے دیا تجھ کو طعنہ
اور اس بات پہ حیرت تھی بہت شوہر کو
سُنکے انکار سے بیوی نے ہلایا سر کو
کیا کوئی بات ہے ایسی جو بتائے نہ بنے
کیا کوئی غم بھی ہے ایسا جو سُنائے نہ بنے
کس لئے روتی ہے تو مجھ کو جلانے کے لئے
کیا تری آنکھ کے موتی ہیں لٹانے کے لئے
تو جو چاہے تو ترے قدموں میں دولت رکھ دوں
دے اگر حکم تو جاں اپنی نچھاور کر دوں
اب نہ یوں مجھ سے چھپا کونسا غم ہے تجھکو
کچھ تو بتادے مرے سر کی قسم ہے تجھکو
جب قسم دی ہے بتانا ہی پڑے گا تم کو
قصۂ درد سنانا ہی پڑے گا تم کو
وہ جو لائے تھے کبھی آپ ہمارا طوطا
دو بجے دن کو وہ جنت کو سدھارا طوطا
اس کے مرنے سے مرا دل نہیں لگتا گھر میں
اتنا روئی ہوں بہت درد ہے میرے سر میں

صبح ہوتے ہی کیا کرتا تھا وہ مجھ کو سلام
آنکھ مٹکا کے لیا کرتا تھا وہ میرا نام
کہا شوہر نے کہ کرتا ہوں تمہیں میں بھی سلام
دن میں سو بار نکلتا ہے تمہارا ہی نام

کہا بیوی نے کہ یہ عادت نہیں اچھی لگتی
تم ہر اک بات میں لے آتے ہو ہستی اپنی
تم کو چاہت ہے تو کیا، تم تو مرے شوہر ہو
تم کو الفت ہے تو کیا، تم تو مرے شوہر ہو
مرنے والے کو خدا بخشے تھی الفت مجھ سے
جانور ہو کے بھی کرتا تھا محبت مجھ سے

ذکر طوطے کی محبت کا جو شوہر نے سنا
اپنی ناکام محبت پہ ہی سر پیٹ لیا

اور دل میں کیا اللہ کا وہ شکر ادا
چلو اچھا ہی ہوا مر گیا سالا طوطا
سوچا شوہر نے کہ ہے یہ تو عورت کا دماغ
یہ وہ سورج ہے دکھا سکتے نہیں جس کو چراغ
کہا شوہر نے ترے غم کا ہے احساس مجھے
بات جو تو نے کہی اسکا بھی ہے پاس مجھے

میں نے سوچا ہے کہ بازار گھما دوں تم کو
ایک سونے کی انگوٹھی بھی دلا دوں تم کو

کچھ نہ کچھ غم کا تو ماحول بدل جائے گا
دل ناداں انگوٹھی سے بہل جائے گا
سُن کے بیوی نے بڑے ناز سے نخرے سے کہا
یہی الفت ہے کیا کرتے تھے جس کا دعویٰ
کہیں سونے کی انگوٹھی سے بھی غم جاتا ہے.
ویسے جاتا تو ہے لیکن وہ ذرا کم جاتا ہے.

غم جو طوطے کا ہے وہ مجھ کو بھلانا ہوگا
تم کو سونے کا مجھے ہار دلانا ہوگا

اُس طرف حسن کے ہونٹوں پہ ہنسی سی آئی
قلب شوہر پہ ادھر غم کی گھٹا سی آئی
نظم لکھنے کی مقرب یہ مری ہے منشا
کوئی بھی بھول کے پالے نہیں ہرگز طوطا
یا الٰہی کسی دشمن کے نہ ہوں ایسے نصیب
اُس کے گھر میں ہی رہے ٹھاٹ سے خود اُسکا رقیب

گھر کا مالک کبھی دیہات میں شہروں میں رہے
حسن بیوی کا مگر طوطے کی نظروں میں رہے

گھر میں تنہا پڑھے اخبار پتی دیو غریب
بیوی بیٹھی رہے طوطے ہی کے پنجرے کے قریب
یہ نہیں شوق کہ شوہر سے ملاقاتیں ہوں
بس یہی فکر ہے طوطے سے بہت باتیں ہوں
بات کرنے کو تو شوہر سے بھی پل بھاری ہے
گھنٹوں طوطے سے کھڑے رہ کے مغز ماری ہے

رات شوہر کو تو پانی نہ پلایا جائے
آم طوطے کو بہر حال کھلایا جائے؟

گھر میں بیوی کو نہیں رہتا ہے کچھ اسکا دھیان
یعنی شوہر کی بھی کچھ ہو گئی میلی بنیان
پاس بیوی کے نظر کا کوئی آلہ ہی نہیں
اس گلستاں میں کوئی دیکھنے والا ہی نہیں
کتنی شوہر کی قمیصوں کے بٹن ٹوٹے ہیں
ان گنت کرتے سلائی کیلئے روٹھے ہیں

اب تو اس بات پہ دل کھول کے رویا جائے
پنجرہ طوطے کا مگر روز ہی دھویا جائے

یہ حقیقت ہے میاں کوئی نہیں افسانہ
بعد طوطے کے ہی ملتا ہے پتی کو کھانا
ایسے گھر میں ہو بھلا کس طرح شوہر کی گذر
جس کی بیوی پہ رہے گھر کے ہی طوطے کی نظر

ایک انسان نے بیوی کو جو ہنستے دیکھ

-٢ -٣- -٤-

• جناب خواہ مخواہ

قطعات

چہرے پہ مسرت کے برسوں کی تھکاوٹ ہے
دل میں کئی اَن دیکھے اندیشوں کی آہٹ ہے
کوئی بھی خوشی ہم کو خالص نہ ملی اب تک
سوچا تھا زہر کھالیں، اس میں بھی ملاوٹ ہے

•

جب نیا گُل کوئی کھلاتے ہیں
وہ ہمیشہ ہی منہ کی کھاتے ہیں
سستی شہرت کے واسطے یارو
بیچ رستے میں لیٹ جاتے ہیں

غزل

سچ بولا تو پول کھلیگا دیکھو پہلے بول دے روں
نئیں سو اک ہنگامہ ہوئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
دل میرا اَب تک خالی ہے دروازہ بھی کھلا ہے
کوئی گھُسا تو نئیں نکلینگا دیکھو پہلے بول دے روں
ہاتھ مرا دیکھا تو مجھ سے ایک نجومی یہ بولا
میں بولا سو ہو کو رہینگا دیکھو پہلے بول دے روں
شادی کر کو اپنے پاؤں پو آپ کلہاڑی مت مارو
سال کو سال اک بچّہ ہوئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
قرضہ لیکو شادی کر روں بولو میرے سالے کو
اُن کیئں [illegible] نا پکڑا یینگا دیکھو پہلے بول دے روں
دوست کا جوتا پین کو آؤں گا چوری نئیں کرتا بولو
میں تو ایک دھیلا نئیں دونگا دیکھو پہلے بول دے روں
گھوڑا جوڑا کچھ بھی مکّو میرے کو دولن ہونا
دولن نئیں تو کیا کیا آئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
پکڑلے تھے تو دے رئیں نا تھوڑا اَب زیور بھی دیو
دس تولے سونا تو رہینگا دیکھو پہلے بول دے روں
مصری بادام، طعام ولیمہ، قاضی صاحب کا محنتانہ
سب سسرے کے ذمہ رہینگا دیکھو پہلے بول دے روں
بریانی کے ساتھ اُنوں کیئں سادہ کھانا رکھ دیں گے
قربانی کا میٹھا رہینگا دیکھو پہلے بول دے روں
میں ہی ان کا ساتھ نبھاؤں گا دوسرا کوئی مرتے وقت
منہ میں پانی نئیں ڈالینگا دیکھو پہلے بول دے روں
مظلوموں کی ہائے لئے تو ایسی حالت ہو جائینگی
گھر جا کو ڈھیلا نئیں رہینگا دیکھو پہلے بول دے روں
لوٹ کو اپنی دوزخ بھر لیو لیکن اتنا یاد رکھو
اک دن کھائے سو سب نکلینگا دیکھو پہلے بول دے روں
طاقت کے بل بوتے پر تم آج اُچک لیو لیکن کل
تخت تمہارا تختہ ہوئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
آج اداکاری کرلیو تم جب بھی میک اپ اُترینگا
تم کو کُتّا نئیں پوچھینگا دیکھو پہلے بول دے روں
تم داماد کو اپنا سمجھیں اُن ایسی جھاڑو دینگا
پورے گھر کو صاف کریں گا دیکھو پہلے بول دے روں
جیتنا رتھ چمبو ہوگئی اَب تو ہوش کے ناخن لیو
نئیں تو پھر ایکسیڈنٹ ہوئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
کچھ بھی کرلیو، کیا بھی کرلیو پرائم منسٹر بننے کا
خواب پورا کبھی نئیں ہوئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
ہم نے دیکھا، ہم دیکھیں گے، آخر کب تک دیکھینگے
بھاشن سے نئیں کام چلیں گا دیکھو پہلے بول دے روں
جھاڑ ہے گر جمہوریت تو اقلیت ہے جڑ اس کی
جڑ ہل گئی تو جھاڑ گرینگا دیکھو پہلے بول دے روں
زیادہ دن بھی نئیں گزرے ہیں گر تم چوکس نئیں رہے تو
پھر وئی نقشہ فٹ ہو جائینگا دیکھو پہلے بول دے روں
سوکھا اور سیلاب تو پہلے برسوں میں [illegible] آتا تھا
نئیں سدھرے تو ہر سال آئینگا دیکھو پہلے بول دے روں

اُردو دشمن نیتا اب سے اُردو میں بھاشن دیکو
ووٹ کی بھیک بھی نیئں مانگینگا دیکھو پہلے بول دے روں
دیش کی "کشتی" ٹھیک کرالو بھندے میں چھیداں ہوگئیں
نیئں تو پانی اندر آئینگا دیکھو پہلے بول دے روں
"ہاتھ" کو اپنے صاف رکھو تم ناخن زیادہ بڑھ گئے تو
دنیا بھر کا میل جمینگا دیکھو پہلے بول دے روں
سڑکوں میں کھڈے پڑگئے ہیں "سیکل" پو نکّو نکلو
اک دن پہیّہ بنڈ ہو جائینگا دیکھو پہلے بول دے روں
خواہ مخواہ کی برسی ہوئی تو چانول تھوڑے زیادہ لیو
نیئں تو کھانا کم پڑ جائینگا دیکھو پہلے بول دے روں

غزل

پریشانی سے دن کٹتے تیئں پیسوں کی تنگی میں
نہ اُلجھاؤ جی اُتا ہم کو اپنی خانہ جنگی میں
ذرا باتاں کرتے تو لڑلیے جیسا نظر آتا ئے
حکومت کا چلیں گا کام کیسا کیا ملنگی میں
کرو اُردو میں ہم سے گفتگو گر بات کرنی ہے
اگر لڑنا ہے تو بیشک لڑو ہم سے تلنگی میں
اُٹھاؤ ہر قدم اپنا ذرا سنبھل کر یہ سیاست ہے
تخت تختہ نہ بن جائے تمہارا خانہ جنگی میں
سُنا ہوں میں تمہارے گھر میں بھوکے بلیاں رہتیں
سنبھل کو رہو ذرا اُن سے پھرو نکّو جی لنگی میں
منسٹر کیا بنیں بنگلے میں رہ کو بھول گئے وہ دن
تمہارا ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا تھا نارسنگی میں
زمانہ ایک وہ بھی تھا، سیاست تھی بہت سادہ
پر اب تقسیم ہو کو رہ گئی رنگی برنگی میں
تعصب سے تمہارا دل تو پہلے تنگ ہو کو ہے
جگہ اُردو کو اب کاں سے ملینگی ایسی تنگی میں
پڑوسی کے بگھونے میں پکے سو گوشت میں نیئں ہے
مزہ وہ دال میں ہے جو پکی ہو گھر کی ہنڈی میں
ہمیشہ نت نئی ترکاریاں کھانے میں آتی ہیں
کبھی آلو ٹماٹے میں، کبھی بیگن ہے بھینڈی میں
ترستا ہے مرا دل تب سے اب تک گوشت کھانے کو
بسا جب سے مرا سسرال میر عالم کی منڈی میں
کمیلے سے چکا کر لالیا تھا بھوت سستے میں
مگر بھیجا پچ نیئں تھا کمبخت بکرے کی منڈی میں
بٹن دیتے ہوئے درزی کو بولا ایک ہولا یوں
ذرا یہ کوٹ اچھا ٹانک دینا میری گنڈی میں
جلے نہ بستیاں جب تک وہ دیوالی نہیں ہوتی
بہے نہ خون جب تک کیا مزہ ہولی دھولنڈی میں
نزع کی کیفیت چہرے پو میرے خواہ مخواہ نیئں ہے
غزل لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں میں تلنگی میں

دے کے خط [مراسلے]

حمد خدا کی کرتا ہوں میں ۔ نام نبی پر مرتا ہوں میں!
حق نے زباں کیا پیاری دی ہے ۔ اردو تم اردو ہی خوشی ہے
اردو میں پڑھتا لکھتا ہوں ۔ اردو میں کہتا بکتا ہوں
ملک دکن میں ہے اک پرچہ ۔ اس کے نام کا ہے اک چرچا
اس پرچہ کا نام "شگوفہ" ۔ دل والوں کا ہے یہ تحفہ
"اس ہتھیلی کے پیچھے بیٹھے" ۔ "مال مفت" اور "اڑیں گے پرزے"
اس کی منظومات ہیں "ہجو زن" ۔ جیسے تبسم کا اک "گلشن"
ہنسنے پر مجبور کریں گے! ۔ سارے غموں سے دور کریں گے
اور ڈرامے افسانے بھی ۔ مدہوشی کے پیمانے بھی
"دے کے خط" گویا دفتر ہے ۔ اس دفتر کا اک افسر ہے
اس کی ہستی ذات تبسم ۔ رکھتا ہے وہ زور تکلم
شوخی لہو کی فطرت میں ہے ۔ درد محبت سیرت میں ہے
اس نے ایسا کام کیا ہے ۔ جگ میں اپنا نام کیا ہے
مضمون اپنا جب چھپتا ہے ۔ سب کی آنکھوں میں کھپتا ہے
راہ محبت میں سب گم ہیں! ۔ کیا منظور ہیں کیا انجم ہیں
اس کی حمایت کرتے ہیں سب ۔ چرخ جنوں کے سارے کوکب
"بھانت" کے بازار میں پیارے ۔ "بادست" بک جاتے ہیں سارے
"لذت" کو جب پڑھتا ہوں میں ۔ روتے روتے ہنستا ہوں میں
بیچ چوکیا ایک نام وہی ہے ۔ اس گلبن کا نام وہی ہے
"آدمی نامہ" جس نے لکھا ہے ۔ اور لکھے وہ میری دعا ہے
"بالآخر" الغرض کہوں گا! ۔ مقطع بھی اس طرح لکھوں گا
مشتاق سارے اہل شگوفہ
ایک سے ہوں سب ایک مجموعہ

عباس متقی (حیدرآباد)

برادر گرامی قدر!
سلام مسنون!
ماہنامہ شگوفہ کا اس حق آپ کی نظمیں بھی دیکھیں۔ شکریہ اپنی ایک تازہ کتاب "ستم ظریف" ارسال کر رہا ہوں یاد نہیں پڑتا کہ یہ کتاب پہلے آپ کو دی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ جب آپ پاکستان تشریف لائے تھے اس وقت یہ چھپ چکی تھی۔ انشاءاللہ جنوری میں شگوفہ کا جاپانی جشن بھی باقاعدہ منعقد ہو جائے گا۔ سید شگوفہ حسین یاد (لاہور)

(سلسلہ صفحہ ۱۲۲ پر)

ماہنامہ
شگوفہ
حیدرآباد

جلد ۲۱ ★ شمارہ ۲ ★ فروری ۱۹۸۹ء

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر
ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

مجلسِ ادارت
حمایت اللہ ● محمد منظور احمد ○ مسیح انجم

مجلسِ مشاورت
مجتبیٰ حسین ○ یوسف ناظم ○ نریندر لوتھر ○ بھارت چند کھنہ
فیاض احمد فیضی : منیجر (اعزازی)

○

کتابت : محمد عبدالرؤف
طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس، چارکمان حیدرآباد

○

○ قیمت فی پرچہ ۲/۵۰
○ زرسالانہ : ۲۵ روپے
○ غیر ممالک سے ۱۵۰ روپے

○

خط و کتابت کا پتہ

○

ادارۂ شگوفہ، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد 557716
فون : 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے ۔۔۔ [فہرست]

تپِ دق سے جنگ
۱- اگر آپ دو ہفتے سے زیادہ سے کھانسی میں مبتلا ہیں یا ... آتے ہیں تو آپ ...
۲- اپنا طبی معائنہ کرائیں، خاص طور پر بلغم کا۔ یہ معائنہ پرائمری ہیلتھ سینٹر، ڈسپنسری یا ٹی بی سینٹر میں کرا سکتے ہیں۔
۳- تپ دق کا مکمل علاج ہو سکتا ہے بشرطیکہ ڈاکٹر کی تجویز کی ہوئی دوائیں پابندی سے مقررہ مدت تک کھائی جائیں۔
۴- پرہیز علاج سے بہتر ہے، اس لئے اپنے بچے کو بی سی جی کا ٹیکہ لگوائیں۔
سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو (ڈی. جی. ایچ. ایس)
وزارت صحت و خاندانی بہبود، کوٹلہ روڈ، نئی دہلی 110002

یوسف ناظم

خطبۂ صدارت

جناب ظفر پیامی صاحب، جناب شریف الحسن نقوی صاحب، جناب مجتبیٰ حسین صاحب اور خواتین و حضرات!

دلّی اُردو اکادمی کی طنز شناسی، مزاح پسندی اور زندہ دلی کا ثبوت طنز و مزاح کا یہ دو روزہ ہند پاک سیمینار ہے جو اس شہر کے سرد موسم میں شاید اس لیے منعقد کیا گیا ہے کہ ظرافت کی مدد سے شہر کے درجۂ حرارت کو مزید نیچے اترنے سے منع کیا جا سکے لیکن طنز و مزاح کا قصہ یہ ہے کہ اس کا کام ٹھنڈک پہنچانا ہے آتش زنی نہیں ہے گرمیِ بازار کے لیے دوسری اصنافِ ادب بہتر مانی گئی ہیں اور طنز و مزاح تو الگ سے کوئی صنف ہے بھی نہیں۔ البتہ ایک کام یہ ہو سکتا تھا کہ میری جگہ کسی شعلہ زبان مقرر کو اس اجلاس کا صدر مقرر کیا جاتا تو وہ یقیناً اپنے موضوع سے ہٹ کر ایک مفصل اور غیر ملل تقریر کرتا اور سامعین کو آتش زیر پا بنا دیتا۔ پتہ نہیں یہ لفظ میں نے صحیح تلفظ کے ساتھ استعمال کیا یا نہیں۔ یہ شبہ میرے دل میں اس لیے پیدا ہوا کہ ان دنوں ایک نئے مرزا غالب دُور درشن پر نمودار ہو رہے ہیں جن کی زبان اعلیٰ، ترنم ارفع (مرزا غالب اور ترنم) اور تلفظ عمدہ ہے۔ نئے مرزا غالب نے ترنم بڑی محنت سے اور تلفظ بڑی مشقت سے سیکھا ہے۔ انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اصلی مرزا غالب کا اندازِ بیان اور تھا یا نہیں لیکن نئے مرزا غالب کا اندازِ بیان واقعی اور ہے۔ انھوں نے تو غالب کے اشعار کی اصلاح بھی فرما دی ہے۔ پوری ایک صدی تک یہ اشعار اصلاح کے بغیر یونہی پڑے رہے۔ آتش زیر پا کے لفظ کو اُنھوں نے جب اضافت کے ساتھ آتشے زیر پا پڑھا تو یہ خاکسار زیر ہو کر رہ گیا۔

اصل مرزا غالب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ میر تقی میر کے بہت معتقد تھے اور میر کے طالبان کو انھوں نے "کم از گلشن کشمیر نہیں" کے الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا تھا لیکن یہ مرزا غالب جب میر کا بتا تیا بوٹا بوٹا والا شعر کسی فقیر کی زبان سے سنتے ہیں تو دوسروں سے دریافت فرماتے ہیں کہ یہ شعر کس کا ہے۔ میر صاحب کی روح بعد اصلی مرزا غالب کی روح کتنی خوش ہوتی ہوگی۔

مرزا غالب کے تعلق سے میں دور درشنی شہ پارے میں جو ریسرچ ہوا ہے اس سے دو چار ہوتے ہوئے دولاب کے ایک طالب علم نے یہ رائے دی کہ یہ جنت نگاہ اور فردوس گوش سیریل غالباً اس شخص کے بارے میں ہے جو اسد تخلص کرتا تھا اور جس کی وجہ سے مرزا اسد اللہ خان نے اپنا تخلص اسد سے بدل کر غالب اختیار کر لیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ رائے غلط نہ ہو۔ جب الحاقی ادب ہوسکتا ہے تو الحاقی منظرنامے کیوں نہیں ہوسکتے۔ نئے مرزا غالب کی ٹوپی اسی لیے اتنی اونچی بنائی گئی ہے کہ ان کا قد اصلی مرزا غالب سے اونچا ہو جائے۔ اس سے زیادہ اونچی ٹوپی بنی ذرا مشکل تھی۔

یہ ایک جملۂ معترضہ تھا اور میں نے اس لیے استعمال کیا کہ آج کل ہر تقریر میں دو چار جملۂ معترضہ ہونے ہی چاہئیں ورنہ سامعین کو اعتراض ہوتا ہے اور وہ پوائنٹ آف آرڈر پیش کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ پوائنٹ آف آرڈر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انتشار پھیلانے کے لیے سب سے زیادہ کارآمد چیز یہی پوائنٹ ہے۔ اسی لیے ہمارے سیاسی ایوانوں میں مباحث کم اور پوائنٹ آف آرڈر زیادہ ہوتے ہیں۔ ڈِس آرڈر پھیلانے کے لیے اگر یہ حربہ کارگر نہ ہو تو واک آؤٹ سے کام لیا جاتا ہے۔

مرزا غالب کے سیریل کے ذکر سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ طنز و مزاح کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور سنجیدہ سے سنجیدہ موضوعات میں بھی ظرافت 'فیاضی' کے ساتھ استعمال ہو رہی ہے۔ جن لوگوں کی نظر ادب پر گہری ہے ان کا خیال ہے کہ ہماری تنقید میں بھی ظرافت کا خاص طور پر خیال رکھا جا رہا ہے بلکہ بعض لوگ تو کہتے ہیں کہ تنقیدی مضامین اور مقالوں میں مزاح اتنی کثرت سے استعمال ہو رہا ہے کہ ان میں تنقید کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ آئندہ چند سال بعد جب ظرافت کی اقسام کی فہرست بنے گی تو اس فہرست میں تنقید شامل رہے گی۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے ظرافت کو اس نظر سے دیکھا جاتا تھا جو جہیز نہ لانے والی بہوؤں کے لیے مخصوص ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ناقدینِ ادب کے آمرانہ رویے میں اب تبدیلی عمل میں آئی ہے اور اس خوشگوار تبدیلی کا سہرا خود انہی کے سر ہے۔ ظرافت نگاروں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یوں بھی ظرافت نگاروں میں اگر ہوتے بھی تو صرف ادیب ہوتے ہیں ظرافت کے نقیب نہیں ہوتے۔ ظرافت عطر وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہے بھی نہیں کہ اس کی کشید کی جائے اور عطار اسے مشتہر کریں۔ اس لیے بھی مزاح کا درجہ بلند ہے بلکہ یہی ایک حس ہے جو حواس خمسہ کے بعد مشہور ہے

ظرافت کوئی تحریک نہیں ایک شائستہ عمل ہے اور ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہے کہ اس کا کوئی نقیب یا پریس اٹیچی نہیں ہے۔ یہ اس لیے بھی مفید ہے کہ ہمارے یہاں جب بھی کسی صنفِ ادب کی حمایت میں کچھ لکھا گیا تو اس تحریر سے متعلقہ صنف ادب کو فائدہ تو کچھ نہیں پہنچا اس پر ضرب کاری ہی پڑی۔ اصلی مرزا غالب نے کیا خوب کہا ہے:

ہوئے تم دوست جس کے اس کا دشمن آسماں کیوں ہو

جو جادو سر پہ چڑھ کر بولتے ہیں ان میں ظرافت بھی ایک ہے لیکن یہ جادو صحیح ہونا چاہیے ورنہ خود پر لوٹ آتا ہے۔ ظرافت کا اب سنجیدگی سے مطالعہ کیا جا رہا ہے بلکہ اس پر سیر حاصل بحث کی جا رہی ہے۔ صرف سیر نہیں ہو

اس سمینار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اسے پانچ اجلاسوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس تقسیم کا فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ جہاں منتظمین صدارت کو موقع ملا وہیں مجھ جیسے مساکین کے لیے بھی گنجائش نکل آئی اور میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم بھی ہیں پانچویں سواروں میں۔

حضرات! مجھے احساس ہے کہ میں زیادہ بول رہا ہوں۔ اس لیے میں دلّی اردو اکادمی کے دلی شکریے پر اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے دلّی اردو اکادمی کے سکریٹری شریف الحسن نقوی کے بارے میں د

بات دوبارہ کہوں گا جو میں نے پہلے کہی تھی کہ یہ نہ صرف اسم بامسمیٰ ہیں بلکہ شریف ہونے کے ساتھ ساتھ ظریف بھی ہیں بشرافت اور ظرافت آم کی وہ اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے نام دسہری اور فجری ہیں۔ دعا گو ہوں کہ ظرافت کے ساتھ اُن کا رشتہ ہمیشہ استوار رہے اور یہ صرف ادبی اور شعری نہ ہو بلکہ شرعی بھی ہو جائے۔ میرا یہ خطبۂ صدارت ایک لحاظ سے خطبۂ نکاح بھی ہے۔

ظفر پیامی صاحب اور مجتبیٰ حسین میمنہ اور میسرہ ہے۔ قلب کی جمعیت تو بعد میں آگے بڑھتی ہے میمنہ اور میسرہ کو پہل کرنی پڑتی ہے۔ اس اتحاد ثلاثہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ یہ اتحاد امن وسلامتی زندہ دلی اور خوش مزاجی کے لیے تشکیل پایا ہے جنگ کے لیے نہیں۔

ان حضرات کی خدمت میں مبارکباد! ۸۷

[دلی اُردو اکادمی کے زیرِ اہتمام منعقدہ ہند پاک طنز و مزاح کانفرنس ۲۴ و ۲۵ دسمبر ۱۹۸۸ء کے دوسرے اجلاس میں پڑھا گیا ــــ]

رضا نقوی واہی
(پٹنہ)

"پڑوسن بھی بے نظیر ملی"

"دامنِ کوہ کی فضا سے لطیف
امنِ عالم کی راہ گیری ملی
سارک دیشوں کو گھپ اندھیرے میں
روشنی کی نئی لکیر ملی
ان ممالک کے دل کی ہر دھڑکن
ایک ہی زلف کی اسیر ملی
کیا ہی موقعے کے ہیں ہلال کے شعر
داد جن پر انھیں کثیر ملی
تیرے خوابوں کی سربراہِ وطن
کیسی تعبیرِ دل پذیر ملی

"رشک ہوتا ہے تیری قسمت پر
کیا ترے ہاتھ کی لکیر ملی
اور سب نعمتیں ملی تھیں تجھے
اب پڑوسن بھی بے نظیر ملی"

اُلّو کا بُت

مشکور حسین یاد
(لاہور)

عہدِ حاضر کے انسان کا ایک عام لیکن اہم کردار

بے سمت کھڑا ہوا ہے اُلّو
موتی سا جڑا ہوا ہے اُلّو
ویسے ہی نہیں ٹیک پڑا ہے
پل پل کے بڑا ہوا ہے اُلّو
ٹٹو تو تمام چل پڑے ہیں
اب صرف اڑا ہوا ہے اُلّو
منہ سے نہیں بولتا تو کیا ہے
مشکل میں پڑا ہوا ہے اُلّو
اب اس کی کرے گا مٹھی چاپی
جس جس سے لڑا ہوا ہے اُلّو
سچ پوچھیے گر تو مثلِ خنجر
سینوں میں گڑا ہوا ہے اُلّو

اپنوں کے ہجوم میں بھی مشکور
بیگانہ کھڑا ہوا ہے اُلّو

ابراہیم یوسف
(بھوپال)

گالیوں کی ثقافتی اہمیت

گالی کلچر کا ایک حصہ اور سماجی ضرورت ہے بعض حضرات بڑی بے تکلفی اور روانی کے ساتھ اور بعض تکیہ کلام کے طور پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ گالی سب سے پہلے کس قوم کس زبان میں کب استعمال کی گئی فی الحال تاریکی میں ہے مگر ہمارے ایک عالم فاضل دوست وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ سب سے پہلی گالی حضرت آدم نے مایوسی کے عالم میں جھنجھلا کر شیطان کو دی تھی اس کے بعد گڑگڑا کر خدا سے اپنی نافرمانی کی معافی مانگنے کا خیال آیا تھا۔ اس طرح گالی اولاد آدم کو وراثت میں ملی اور دنیا میں خوب پھلی پھولی۔ گالی کا تعلق کسی ایک ملک، قوم یا زبان سے نہیں ہے ہر ملک اور قوم کے مرد عورت، بچے بوڑھے، جوان ادیب شاعر، سیاستداں غرض یہ کہ ہر طبقہ کے لوگ اس کا بے دریغ استعمال کرتے ہیں بالخصوص فرقہ پرستوں کو اس سے خاص رغبت ہے۔ بعض ماہر لسانیات کا خیال ہے کہ جس زبان میں جتنا زیادہ گالیوں کا ذخیرہ ہوگا وہ زبان اتنی ہی مالدار ہوگی اور کسی زبان کے معیار کو اس زبان کی گالیوں کے معیار سے جانچا جا سکتا ہے۔

گالی دینا ایک آرٹ ہے اس کے لیے بڑی سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے گالی دینے والے کو وقت، موقع اور جسے گالی دی جا رہی ہے اس کی عمر اور مرتبہ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے اس سلسلے میں مرزا غالب بڑے گالی شناس تھے انھوں نے گالیوں کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر فرمایا تھا کہ بچے کو ماں کی گالی دو جوان کو بیوی کی اور بوڑھے کو بیٹی کی اس سے ان پر خاطر خواہ اثر پڑے گا انشاء مصحفی اور سودا نے اردو کو گالی ادب سے مالا مال کیا اور میاں نظیر نے گالی ادب کی تخلیق میں عوام کی پسند اور ناپسند کا خصوصیت سے خیال رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ آغا حشر بھی بڑے ماہر گالیات تھے وہ نئی نئی گالیاں اسی طرح تخلیق کرتے تھے جس طرح نئے نئے ڈرامے اور نئی اور بھلی گالی سن کر ایسے باغ باغ ہو جاتے تھے جیسے اپنے ڈرامے کو اسٹیج پر سپر ہٹ ہوتے ہوئے دیکھ کر ہوتے تھے۔ ہر دور کے شاعر اور ادیب اس کار خیر میں حسب توفیق ہاتھ بٹاتے رہے اور اردو کے گالی ادب کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا اردو ان کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ خیر یہ تو ایک جملۂ معترضہ تھا۔ گالی کی اپنی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امیر غریب جیسے طبقات میں بٹی ہوئی نہیں ہے بلکہ اپنے غیر طبقاتی کردار کے باعث سب کی چہیتی ہے لیکن سماج کے ریاکار اس کے لیے بکنا جھکنا تو تحقیر آمیز لفظ استعمال کرتے ہیں حالانکہ یہ اپنی مقبولیت ہمہ گیری اور کثرت استعمال کے پیش نظر اس کی مستحق

ہے کہ اس کے لیے فرمانے کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے مثلاً آپ کو گالی فرمانے کا خاص ملکہ ہے اور آپ کے گالی فرمانے کا جواب نہیں وغیرہ۔ ریاکاری کی انتہا تو اس وقت ہوتی ہے جب گالی فرمانے کو شرافت کے منافی قرار دیا جاتا ہے حالانکہ شرافت کے یہ علم بردار گالی فرمانے میں کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ فرق صرف اس قدر ہوتا ہے کہ گالی فرماتے وقت وہ اپنی آواز کا خون کر کے ہونٹ ہلا کر رہ جاتے ہیں جب کہ غیر ریاکار بلند آواز سے گالی فرما کر اپنی آواز کا خون نہیں کرتے اور نہ اس گھٹن سے دوچار ہوتے ہیں جو صرف ہونٹ ہلانے سے پیدا ہوتی ہے اس طرح وہ اپنی صفائی قلب کا پورا پورا ثبوت دیتے ہیں۔ اگر گالی فرمانا شرافت کے منافی ہوتا تو لیڈر لیڈر کو، شاعر شاعر کو، ادیب ادیب کو افسر ماتحت کو ماتحت افسر کو اور پڑوسی پڑوسی کو کیوں گالیاں عطا فرماتے۔ گالی کے ثقہ ہونے کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ اب شاگرد خشوع و خضوع کے ساتھ استاد کو گالی پیش کرتا ہے اور استاد خلوص قلب سے انھیں قبول کرتا ہے۔ اگر گالی شرافت کے منافی ہوتی تو سماج کے یہ معززین گالی کا اس قدر شوق کیوں فرماتے بہر حال گالی کو شرافت کے منافی کہنا ریاکاری کے علاوہ کچھ نہیں۔

گالی کا ذخیرہ کبھی محدود نہیں رہا جدت پسند طبیعتیں اس میں برابر اضافہ کرتی رہتی ہیں اور اعلیٰ ادبی تخلیق کی طرح یہ لسان کا قابل فخر اثاثہ بن جاتی ہیں۔ ہندوستان کا محکمۂ پولس قابل صد ستائش ہے کہ اس نے گالی فرمانے کو اپنے ملازمین کے لیے لازمی قرار دے رکھا ہے بہت ممکن ہے کہ پولس کا کوئی ایسا اسکول ہو جس میں گالی فرمانے کی ٹریننگ دی جاتی ہو اور وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ہی ملازم کو عملی میدان میں بھیجا جاتا ہے یہ بھی ممکن ہے کہ وہاں ڈپلوما اور ڈگریاں بھی دی جاتی ہوں بہرحال یہ ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سپاہی کو ڈگری اور افسران کو ڈپلوما دیا جاتا ہے۔ محکمۂ پولس گالی فرمانے کے میدان میں قابل فخر خدمات انجام دے رہا ہے۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کچھ گالیاں معیاری اور کچھ غیر معیاری ہوتی ہیں لیکن یہ ان کی خام خیالی ہے گالیاں سب معیاری ہوتی ہیں یہ خیال اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ بعض وقت جوش جذبات میں ایسی گالی فرمادی جاتی ہے جو اس موقع کے لیے مناسب نہیں ہوتی اس سے گالی کے معیار کے بارے میں شک پیدا ہوتا ہے یہ گالی کے معیار کا قصور نہیں بلکہ اس کے غلط استعمال کرنے کا ہے درحقیقت یہ خیال جاگیرداری دور میں طبقاتی نظام کے باعث پیدا ہوا کہ جاگیردار طبقہ نے کچھ گالیوں کا ذخیرہ اپنے لیے مخصوص کر لیا اور اسے معیاری قرار دیا اور کچھ رعایا کے لیے چھوڑ دیا اور اسے غیر معیاری کے نام سے موسوم کیا حالانکہ دیکھا گیا ہے کہ وہ عوام کے ذخیرہ کا بے دریغ سرقہ کرتے رہے اس تقسیم کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ چوں کہ جاگیردار اور رعایا میں ہمیشہ گالیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا اس لیے غیر معیاری گالیاں جاگیردار کی اور معیاری گالیاں رعایا کی جھولی میں پڑتی رہیں۔ پہلے جاگیردار کھلم کھلا بہ آواز بلند گالیاں فرماتے تھے اور رعایا دل میں ان کا جواب دیتی تھی جب سے سرمایہ دارانہ دور شروع ہوا ہے مزدور سڑکوں پر اور جلسے جلوسوں میں بہ آواز بلند سرمایہ دار کو گالیاں دیتا ہے اور سرمایہ دار دل میں جواب دیتا ہے صرف طریقۂ کار بدلا ہے گالی کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس لیے گالی پر کسی قسم کا بھی شک کرنا اس کے ساتھ انصاف نہیں ہے۔

جس زمانہ میں خواتین گھر کی چہار دیواری میں رہتی تھیں اس وقت وہ گالیوں کے محدود ذخیرہ سے کام چلا لیتی تھیں اس لیے نہیں کہ انھیں گالیوں کا علم نہیں تھا بلکہ اس لیے کہ مردوں اور عورتوں کی زبان اور محاورات میں جو تھوڑا بہت فرق ہے وہی فرق وہ گالیوں میں بھی برقرار رکھنا چاہتی تھیں لیکن جب سے عورتوں نے گھر کی چہار دیواری

کو خیر باد کہا۔ مردوں سے بے تکلفانہ میل جول بڑھا اور مردوں سے ہر لحاظ سے مقابلہ کا جذبہ پیدا ہوا ہے وہ مردوں کو گالی کے میدان میں بھی پچھاڑنے کا بیڑا اُٹھا چکی ہیں۔ غالب کا رقیب تو شیریں لبوں سے گالیاں کھا کر بے مزا نہیں ہوا تھا لیکن اگر آج غالب زندہ ہوتے تو وہ خواتین کی گل افشانی گفتار سن کر کچھ اور ہی مزا لیتے۔ بہرحال گالی کے میدان میں خواتین کا مردوں سے مقابلہ کا عزم ان کی آزادی اور ترقی کے لیے نیک فال ہے۔

گالیوں کی مختلف اقسام ہیں بعض حضرات غیظ و غضب کے عالم میں گالی فرماتے ہیں اس وقت ان کا چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے جسم کانپنے لگتا ہے آواز میں کرختگی آجاتی ہے چہرہ پر جلال ہو جاتا ہے اس وقت کی گالی کو جلالی گالی کہا جاسکتا ہے۔ بعض اوقات گالی فرمانے کا مقصد دوسرے پر رعب قائم کرنا اور اپنی بڑائی ظاہر کرنا ہوتا ہے اس گالی کو متکبرانہ گالی کا نام دیا جاسکتا ہے تیسری قسم وہ ہے جو غیر شعوری طور پر تکیہ کلام کے طور پر فرمائی جاتی ہے اس کا مقصد نہ تو کسی پر رعب جھاڑنا ہوتا ہے اور نہ کسی کی توہین کرنا ایسی گالی کو معصومانہ گالی کہا جاسکتا ہے گالی کی ایک قسم وہ ہے جو والدین اپنے بچوں کو محبت میں عطا فرماتے ہیں اس گالی کو مشفقانہ یا پدرانہ گالی کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے گالیوں کی ایک قسم وہ ہے جو بالعموم ایسے لوگوں کو عنایت کی جاتی ہیں جن کے ہاتھ میں طاقت اور اقتدار ہوتا ہے اور جس کا وہ صحیح کم اور غلط استعمال زیادہ کرتے ہیں اور جن کو ان کے فیصلوں سے نقصان پہنچتا ہے نقصان اُٹھانے والا انھیں غائبانہ طور پر گالیوں سے نواز کر اپنی اَنا کی تسکین کرتا اور مسرت حاصل کرتا ہے ایسی گالی کو راحت بخش گالی کا نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے علاوہ گالیوں کی اور اقسام بھی ہوں گی جو ہماری کم علمی کے باعث ہماری نظروں میں نہ آسکیں یونیورسٹی کا کوئی ریسرچ اسکالر چھان بین کر کے انھیں معلوم کر سکتا ہے۔

گالیوں کی نفسیاتی افادیت کی طرف ایک ماہر نفسیات نے ہمیں متوجہ کیا۔ ہمارے ایک قریبی دوست جو کافی عمر ہو جانے کے باوجود غیر شادی شدہ ہیں یکایک گالی فرمانے کے دورہ سے دوچار ہو جاتے ہیں اس وقت ان کی حالت قابل رحم ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ اپنے آپ میں نہ ہوں اس وقت وہ بے تکان گالیاں فرمانے لگتے ہیں منہ سے رال بہنے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ گالیوں سے لطف اور خاص قسم کا چٹخارہ حاصل کر رہے ہوں۔ تھوڑی دیر یہ کیفیت طاری رہتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آجاتے ہیں۔ ماہر نفسیات نے اس کا سبب یہ بتلایا کہ جب ان پر غیر معمولی جنسی دباؤ ہوتا ہے تو وہ جنون کی سرحد میں داخل ہو جاتے ہیں اگر وہ گالیاں نہ فرمائیں تو پاگل ہو سکتے ہیں گالیاں ان کے جنسی جذبہ کی تسکین کر دیتی ہیں اس نفسیاتی نکتہ سے گالیوں کی افادیت مسلم ہو جاتی ہے بلکہ اس میں بہت سے سماجی مسائل کا حل بھی نظر آتا ہے بعض حضرات اس وجہ سے شادی بیاہ سے احتراز کرتے ہیں کہ وہ بیوی بچوں کا اقتصادی بوجھ برداشت نہیں کر سکتے۔ ایسے لوگوں کے لیے گالیاں بے حد مفید ثابت ہو سکتی ہیں بس گالیاں فرمائیں جنسی جذبے کی تسکین کی اور بیوی کے نازنخروں سے بھی نجات پالی ہینگ لگی نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آیا۔ آج کل نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی کی شکایتیں عام ہیں سماج سدھار کا کام کرنے والے کارکن پریشان ہیں ان کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اس بے راہ روی کی روک تھام کس طرح کی جائے۔ ہمارا مشورہ ہے کہ محلے محلے ایسے مراکز قائم کیے جانا چاہیئے جہاں بے راہ روی کی عمر میں داخل ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کو گالی فرمانے کی ٹریننگ دی جائے یہ کام محلے کے بزرگوں کو سونپا جائے کہ وہ اپنے تجربات سے آنے والی نسل کو فیض پہنچا سکتے ہیں۔ ماہرین گالیات کی ایک کمیٹی مقرر کر کے گالیوں کا انتخاب بھی ترتیب دیا جانا چاہیئے۔

اردو اور ہندی میں الفاظ اور محاورات کے استعمال میں کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو گالیوں کے معاملے میں دونوں میں بڑا "بہن چارہ" ہے دونوں کی گالیاں مشترک ہیں جن پر نہ تو اردو اپنا حق جما سکتی ہے نہ ہندی۔ لندونوں کا مشترک سرمایہ ہونے کی وجہ سے وہ خالص ہندوستانی زبان کی ہیں۔ آج کے ماحول میں ان کا زبان کے تعصب سے پاک ہونا ان کے کردار کی عظمت اور بزرگی کی نشانی ہے۔ گالیوں کی تخلیق کچھ ایسے بزرگ اور بے ریا لوگوں کے ہاتھوں عمل میں آتی ہے کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ آل انڈیا ریڈیو کا بڑے سے بڑا پنڈت ان کا سنسکرت زدہ ہندی میں ترجمہ نہیں کرسکتا یہ ان کی عظمت کی ایک اور نشانی ہے زبان کی یک جہتی کے لیے قومی سطح پر گالیوں کو فروغ دینا قومی خدمت ہوگی۔

گالیاں جغرافیائی حدود اور زبان کے محدود دائرے کی قائل نہیں ہیں آپ بلا تکلف کسی بھی زبان کی گالی فرما سکتے ہیں یہ صرف پسند اور ناپسند کی بات ہے کچھ حضرات انگریزی زبان کی گالیوں کو پسند فرماتے ہیں تو کچھ فارسی زبان کی لیکن زیادہ تر حضرات قومی وراثت کے تحفظ کی خاطر صرف ہندوستانی زبان کی گالیوں ہی کو ترجیح دیتے ہیں وہ قوم کی اس عظیم وراثت سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے ان کا یہ قومی جذبہ قابل ستائش ہے کم از کم ہندو مسلمان گالیوں کے تحفظ پر متفق ہیں اور انھیں مشترکہ وراثت مانتے ہیں۔ گالیاں قومی یک جہتی کی عظیم خدمت انجام دے رہی ہیں۔

گالیوں کی ایک تہذیبی اور ثقافتی اہمیت اور بھی ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر ان کا استقبالیہ خطبہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یہ استقبالیہ خطبہ ڈورا طائفہ جنھیں میراثنیں کہا جاتا ہے باجے گاجے کے ساتھ خوش الحانی سے پڑھتا ہے اور آنے والے سمدھی اور سمدھنوں کا استقبال کرتا ہے اس استقبالیہ خطبہ میں سمدھی اور سمدھن کے مرتبہ کا پاس لحاظ نہیں کیا جاتا بیگم بھوپال جب بہو بیاہنے گئی تھیں تو ان کی شان میں بھی میراثنوں نے یہ خطبہ پڑھا تھا ہماری نانی نے جو اس تقریب میں شریک تھیں ہمیں بتلایا تھا کہ بیگم صاحبہ اپنی تعریف اور توصیف سن کر اس قدر خوش ہوتی تھیں کہ میراثنوں کو ایک بڑی رقم انعام کے طور پر عطا فرمائی تھی۔ غالب کو حسرت رہی کہ انھیں لوح گر رکھنے کا مقدور نہیں تھا لیکن وہ شاید کبھی سمدھی نہیں بنے ورنہ انھیں خواہ مقدور ہوتا یا نہ ہوتا شادی بیاہ کے موقع پر ان "گالی گردن" کو ساتھ رکھنے کی مقدرت ضرور پیدا کرنی پڑتی اور خود انھیں اپنی شان میں ایسے ایسے قصیدے سننا پڑتے کہ ان کے سامنے غالب کو اپنے فارسی قصیدوں پر شرم آنے لگتی اور ان قصیدوں کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتے میاں نظیر ان سے کچھ واقف تھے سمدھن کے سراپا میں اصول سمدھن کی خوب قصیدہ خوانی ہی ہے پڑھنے والا سمدھن کے ایسے ایسے پوشیدہ رازوں سے واقف ہوتا ہے جن کا علم خود سمدھن کے فرشتوں کو بھی نہیں ہوتا۔ بالعموم سمدھن کچھ رشوت دے دلا کر اپنے پوشیدہ رازوں کو راز ہی رہنے دینے میں عافیت سمجھتی ہے اور جب سمدھی کے رازوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے تو بڑے سے بڑے طرم باز سمدھی کی بھی مونچھیں نیچی ہو جاتی ہیں اور ساری طرمی کافور ہو جاتی ہے۔ اب اس استقبالیہ خطبہ کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے اس کو زندہ رکھنے کی اشد ضرورت ہے کہ یہ تہذیبی اور ثقافتی ضرورت ہے اس کے علاوہ یہ خطبہ ایک طبقہ کے لیے روٹی روزی کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے اس لیے ان کی افادیت سے انکار ہمارے نزدیک ان سے بے جا تعصب کے علاوہ کچھ نہیں۔ گالی کو برا کہنا اور انھیں چھوڑ دینے کا مشورہ دینا زبان کو ننگا کر دینے کے مترادف ہے گویا زبان سے ثقافتی جز نچوڑ لیا گیا اور زبان کا صرف چھلکا باقی رہ گیا۔ گالیوں کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ہی لغت نویسوں نے انھیں لغات میں جگہ دی ہے ایک وقت

گالی بچاؤ انجمن کے قیام کی سخت ضرورت ہے کہ ابھی تک صرف اس انجمن کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے۔

مختصر یہ کہ گالی ثقافتی، لسانی اور نفسیاتی خوبیوں کا مجموعہ ہے اسے سن کر انسان کے خفیہ احساسات بیدار ہو جاتے ہیں اور اس میں عمل و حرکت کی ایک نئی روح بیدار ہو جاتی ہے ہمارے ایک کرم فرما کا دعویٰ ہے کہ اگر رستم کو بھی بے دھڑک اور بے جھجک گالی سے نواز دیا جائے تو تھوڑی دیر کے لیے وہ ہکا بکا ہو کر سٹ پٹا جائے گا اور اس کی رستمی دھری کی دھری رہ جائے گی لیکن ہم اس تھوڑی دیر کے بعد کے نکلنے والے نتائج کو بھی نظرانداز نہیں کرتے کہ گالی عطا فرمانے والے کا حلیہ بگڑنے کے امکانات بھی روشن ہو جاتے ہیں۔!

اس سال

رؤف خیر
(حیدرآباد)

عورت تو دل پہ راج کرے یا نظر پہ راج
اس کا کہیں کہیں تو ہے دیوار و در پہ راج
دفتر میں ڈھاک، پارٹی میں شان، گھر پہ راج
حتیٰ کہ رکھ دیا گیا عورت کے سر پہ تاج
اس سال اور دینا پڑے جانے کیا خراج

اب تک تو چڑھ رہے ہیں اداکاریوں کی بھینٹ
کچھ ساؤتھ میں ہوئے ہیں ریاکاریوں کی بھینٹ
پنجاب میں ہوئے ہیں جو بازاریوں کی بھینٹ
کیا کیا نہ عصمتیں ہوئیں تاتاریوں کی بھینٹ
اس سال اور پھیلے گا یا سمٹے گا نراج

اب تک بھی بے اذاں ہے رسولوں کی سرزمیں
آباد جانے کب ہوں مکاناتِ بے مکیں
اک خوابِ کاغذی نہ فلسطین ہو کہیں
اتنا تو اس برس ہو کم از کم ہمیں یقیں
لاکر رہے گا رنگ لہو رنگ احتجاج

اے سال ذات پات کے جھگڑوں میں تو نہ بٹ
سالم ہے گھر کا کوئی دریچہ نہ کوئی پٹ
کب سے ہمارے سر پہ مسلط ہے راج ہٹ
کرکے بساط رکھ دی ہے جس نے الٹ پلٹ
ملتا نہیں کسی سے بھی فرعون کا مزاج

کھلتا نہیں ہے راز جو مودی کے قتل کا
تھا ہجر کا کمال کہ دھوکا تھا وصل کا
ہنگامۂ جنوں میں جو قائل تھا عقل کا
پاسنگ ہو گیا ہے وہ میزانِ عدل کا
اے سال تو بتادے وہ پتھر ہے یا زجاج

انیس سلطانہ (بھوپال)

صوتی آہنگ اور آہنگ زمانہ

علم صرف میں پڑھا تھا لفظ دو طرح کے ہوتے ہیں مہمل اور موزوں۔ فصیح اور غیر فصیح الفاظ کی شناخت بھی بخوبی کرادی گئی تھی۔ سوائی آسانی کے لیے ہم نے یہ کیا کہ ایسے تمام الفاظ جو کانوں کو بھلے لگتے ہیں انھیں نہ صرف فصاحت کی سند دیدی، بلکہ ان کے معانی کو بھی اپنے حسابوں دلکشی سے مالامال کر دیا۔ اس مہارت کا ذکر آئندہ آئیگا زور شور سے پڑھائی جاری تھی۔ مڈل اسکول کا امتحان تھا، معمولی بات نہ تھی۔ پڑھنے میں ہمارا دل کبھی نہ لگتا۔ چھپ چھپ کے ناولیں پڑھتے۔ ایسی ویسی ناولیں ہم سے چھپادی جاتیں۔ بڑے بھیا کتابوں کا کیڑا تھے۔ دفتر سے واپسی میں روز ایک ناول لیے ہوئے چلے آتے۔ ہم بھائی بہنوں میں سب سے چھوٹے نہ سہی، مگر چھوٹے ضرور تھے۔ ہمارا نمبر آخر میں آتا ہیں جو ناولیں پڑھنے کی اجازت تھی وہ یا تو جاسوسی ہوتیں یا اسلامی تاریخ پر مشتمل کہانیاں۔ ہم نے بھی اس اجازت سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ جاسوسی فکشن میں سلطانہ ڈاکو سے لے کر ابن صفی کی زبان کا چٹخارہ لیتے ہوئے ہم سراج الدولہ کو کھنگالتے رہتے۔ ہر چند کہ ہم اپنا کھویا ہوا طوطا تک نہ ڈھونڈ پاتے جو روز صبح اٹھ کر نبی جی بھیجتا اور رام نام کا جاپ کرتا اور نیشنل اکیڈمی کنونشن میں سونے کا تمغہ پانے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مگر جس نے بے وفائی میں نیا ریکارڈ قائم کر کے ہماری انا کو مجروح کر دیا تھا۔

دوسری طرف ہمارے بزرگ کوشش میں تھے کہ ہمیں زیور تعلیم سے آراستہ اور امور خانہ داری سے پیراستہ کردیں مگر اللہ کا کرنا یوں ہوا کہ ہماری سادہ روش نے ہمیں ہر طرح کی آرائش سے باز رکھا۔ بہشتی زیور کے واسطے سے جب ہم قالو میں نہ آئے تو اسلامی تاریخ کی کہانیوں کو ذریعہ تعلیم سمجھا جانے لگا۔

عبدالحلیم شرر، صادق صدیقی سردھنوی اور نسیم حجازی وغیرہ کی ناولیں پڑھ پڑھ کر ہم اپنے کو مورخ اعظم گردانتے۔ صلیبی لڑائیوں میں جب کشتوں کے پشتے لگتے اور جب سارے غنیم کھیت ہو جاتے تو ہم دو دو ہاتھ اچھلتے پھر اگر تلواروں میں گھرا ہوتا تو ہمارا دل بلیوں اچھلتا، کیوں کہ اس سے زیادہ کی مشق اسے نہ تھی۔

کرکٹ کے چوکوں اور چھکوں سے زیادہ ہم میمنہ اور میسرہ کی تیاریوں سے لطف لیتے اور قلب کی حفاظت کے خیال سے جب ہمارا قلب مضطر بے اختیار ہو جاتا تو کبھی کبھی باآواز بلند نا دبھی دیتے۔

اتنی سمجھ تو ہم میں تھی کہ آواز بلند نہ ہونے دیں، مگر جذبۂ بے اختیار میں اتنی عقل کہاں۔ چنانچہ دیوان خانے

تک آواز جاتی تو ڈانٹ بھی پڑتی۔ اور نہ جانے تب بھی پڑتی۔ کہ لڑکیوں کو تو دبا کر رکھنا ہی مناسب ہوتا ہے آواز دبانا بھی اسی قبیل میں آتا ہے۔ وہ آواز جو پہلے سُنا ہے بڑی دبنگ تھی اب یوں گھُٹ کر رہ گئی ہے گویا کثرت استعمال سے ریکارڈ گھس جاتے۔ خیر گردش ایام کو پیچھے کی طرف لوٹائیں۔

ہم سراپا مارالمطالعہ بنے ہوئے تھے۔ اسکول میں ششماہی امتحان ہونے والے تھے۔ زمانہ بدل گیا مگر امتحان کا طریقہ آج تک نہ بدلا board Pre کی تیاری میں اب بھی اسی طرح طلباء مصروف ہوتے ہیں اور کھانا پینا بھی بھول جاتے ہیں۔ یا وہ نہ بھولیں تو بھلا دیئے جاتے ہیں۔ ہمارا حال دگرگوں تھا۔ کورس کی تیاری بالکل نہ تھی۔ چہرہ کا رنگ اڑا جاتا تھا، دل بیٹھا جا رہا تھا اور ہم پچھلا تمام کورس ایک ہی دن میں یاد کرنے کے چکر میں کسی تنہا گوشہ کی تلاش میں تھے جو آج تک نہیں مل سکا۔ اس اُدھیڑ بن میں ہم لوگوں نے اسکول پہنچ کر ایک کام نہایت سلیقہ سے کیا کہ بلیک بورڈ کو چمکا کر روز اول کا سا بارونق کر دیا۔ کیوں کہ ہمارے حسابوں ہمیں بورڈ پر لکھ کر جوابات دینا تھے۔ اور کہ جس کی مشق ہمیں بالکل نہ تھی۔ مشق تو ہمیں کاغذ اور قلم سے لکھنے کی بھی نہ تھی اور آج بھی نہیں ہے — خیر — !!

مگر ہماری عجلت کا ٹھکانا نہ تھا۔ یہ جو اتنا مطالعہ کر رکھا تھا، کس دن کام آتا۔ اردو کے پرچہ میں مضمون لکھنا تھا۔ "چاندنی رات میں دریا کی سیر" — پر۔ چاندنی راتیں تو ہم نے دیکھی تھیں۔ البتہ دریا کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھوپال میں رہتے تھے اور رہتے ہیں مگر اپنا بھوپال تال تک نہ دیکھا تھا۔ مگر ہم نے خوب سیر کی۔ ایسا سماں باندھا کہ ممتحن عش عش کر اُٹھے۔ ہمیں اچھی طرح یاد تھا کہ صادق صدیقی کی ہیروئن، آنچل کو لہراتی مستی کے عالم میں جب ٹہلنے نکلتی ہے تو سرزمین عرب کے چرند و پرند کلیلیں کرنا بھول جاتے ہیں۔ ادھر سے اتفاقاً گھوڑا دوڑاتے ہوئے ہیرو بھی چلا آتا ہے۔ بادِ سموم کے جھونکے چل رہے ہیں۔ دونوں کی پیشانی عرق آلود۔ جسے ہم شرم کا پسینہ سمجھتے تھے۔

بس اسی پس منظر کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے لکھ دیا کہ — "بادِ سموم کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے چل رہے تھے اور ہم کنارے پر کشتی کے منتظر تھے —" منظر کا حسن اسی رعایت سے بڑھتا چلا گیا۔ اور کم سے کم دس بار بادِ سموم کے جھونکے ضرور چلے۔ اس انشاء پردازی کا انجام ظاہر ہے۔ مگر ہماری استاد نے جا بجا مضمون کے ان حصوں کو قلم زد کرنے پر اکتفا کی۔ ہماری ہمت نہ تھی کہ ان سے اس قلم زدگی کی وجہ پوچھتے۔ ہمت تو آج بھی نہیں ہے کسی بھی قسم کی زدگی کی وجہ سے پوچھنے کی۔ مثلاً ستم زدوں سے کچھ پوچھنے کی، قلم زدوں سے فیشن زدوں یا ہم زدوں سے کچھ پوچھنے کی۔ بس ہماری تو عادت تھی اپنے میں مست رہنے کی۔ سو ہمیں یہ لفظ "سمومیت" بڑا بھلا لگتا تھا۔ کانوں میں امرت گھولتا تھا۔ (ہر چند کہ لغات اس لفظ کے زہریلے ہونے کی گواہی دیتی ہیں)

چاندنی راتیں اب بھی آتی ہیں۔ سچ مچ کے دریا کی سیر بھی بارہا کر چکے ہیں۔ اب تو دریائے خوف سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور اگر قرۃ العین کو پڑھنا ہو تو آگ کے دریا سے بھی گزرنا پڑے گا۔ لیکن تیز و تند ہواؤں کو بھی اب "بادِ سموم" نہیں کہا جاتا۔ شکر و شہد میں ڈوبی ہوئی ہماری زبان، پس پشت زہرخند کرنے والی مصلحت اندیشی یقین و تشکیک کے دوراہے پر کھڑی بے شمار اخباروں اور رسالوں سے مالا مال، لیکن قاری، باذوق قاری کو ترستی ہوئی یہ زبان، شاید اسی لیئے لاقاری کی ضرورت پیش آئی۔ لا (قانون) کا طالب علم نہ سمجھے گا؛ ورنہ لاقانونی داؤ پیچ کے بیچ یہ زبان غریب اور بھی پس کر رہ جائے گی۔

آج کا طالب علم زیادہ ذہین ہے۔ ٹی وی نے اس کے علم کو آٹھ دس چاند لگا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں پہلے صرف چار چاند کیوں لگتے تھے؟ ہم نے سوچا آج یہی عنوان مضمون لکھنے کے لیے دے دیا جائے۔ ایک کاپی میں لکھا ہوا تھا۔

"یہ مضمون کسی گائیڈ میں دیا ہوا نہیں ہے"۔ گائیڈ تیار کرنے والوں کی کور ذوقی پر ہمیں بڑا غصّہ آیا۔ ایک جگہ تحریر تھا۔ "ہم نے آج تک دریا کی سیر نہیں کی"۔ ان کے والدین پر غصّہ آیا۔ کیا ہوتا جو ذرا دریا کی سیر کروا دیتے۔

اور ایک کاپی دیکھی۔ اپنی بہت کو داد دی۔ لکھا تھا "ہم چاندنی رات میں دریا سے ڈر لگ رہا تھا اور اندھیرا بھی تھا ہم لکھ نہیں سکتے تھے"۔ ایک اور کاپی کے محرر داستان جن کا سینہ علم کی روشنی سے مالامال تھا، چاندنی راتوں کو صرف چار دن کی چاندنی بتا کر اسے مانگے کا اجالا کہہ کر گزر گئے تھے۔

گرمی کا موسم، کہ موسم امتحان بھی کہلاتا ہے جیسے جیسے پتّے جھڑتے ہیں، نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ اگلے پچھلے سارے گناہ یاد آتے ہیں۔ بغیر گناہ کے ارتکاب کے توبہ کی جاتی ہے جو کبھی کبھی امتحان ہال میں اور کبھی نتیجہ نکلنے پر قبول ہوتی ہے۔ پُرانی مشکلیں حل ہوتی ہیں، نئی مشکلیں پیدا ہوتی ہیں طالب علموں کے علاوہ اساتذہ کی بے چینی بھی بڑھتی ہے کہ دیکھیں جو جو سوالات ہم نے دیئے ہیں، ان کے جواب ویسے ہیں یا نہیں کہ نہیں جیسے طلباء چاہتے ہیں۔

ہم کاپیاں کھولے ہوئے نمبروں کی بارش کر رہے تھے۔ اُوپر پنکھا اور باز میں کولر چل رہا تھا۔ کاپیاں دیکھ دیکھ کر ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ مگر بادِ سموم اپنا کام کر گئی تھی یعنی کوئی طالب علم فیل نہیں تھا۔ اور نہ کسی کے نمبر امتیازی نمبروں سے رتی بھر کم تھے کہ یہی آہنگ زمانہ ہے!

(خمار صاحب کی ردیف سے معذرت کے ساتھ)

عنایت علیخان
حیدرآباد (سندھ)

ان سے نظر ملائے زمانے گزر گئے
گویا ادھار کھائے زمانے گزر گئے

پوچھی جو وجہِ وحشتِ دل ہم نے قیس سے
بولا مجھے نہائے زمانے گزر گئے

ہر چیز آ رہی ہے امارات سے مگر
شوہر کو گھر پہ آئے زمانے گزر گئے

اس سیم تن کی ناف ہے اب تک ملی ہوئی
حالانکہ گدگدائے زمانے گزر گئے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
ہم کو تو مات کھائے زمانے گزر گئے

بلبل کو پھر سے کوڑے لگانے سے کام ہے
کلیوں کو مسکرائے زمانے گزر گئے

سوچو تو یار اک سے الکشن نہیں ہوا
یعنی فریب کھائے زمانے گزر گئے

اس چشمِ پُر فسوں میں بھی اترا ہے موتیا
ہم کو بھی خط بنائے زمانے گزر گئے

تنخواہ مل رہی ہے عنایت کو مفت کی
محنت کی اس کو کھائے زمانے گزر گئے

○

غزلیں

کرشن پرویز
کھرڑ (پنجاب)

دیکھے نہیں ہیں آپ نے اس دلربا کے ہاتھ
اک بار دیکھ لیجئے ان کو لگا کے ہاتھ

پچھتا رہے ہیں وہ بھی چلا کر زبان کو
نادم ہوئے ہیں ہم بھی تو اپنا چلا کے ہاتھ

اصرار جب بھی شب کو ملاقات کا کیا!
چپکے سے اٹھ کے چل دیئے اکثر دبا کے ہاتھ

ہٹلر ہی بچ سکا نہ ہلاکو ہی بچ سکا!
سب نے ہی مات کھائی ہے دیکھ قضا کے ہاتھ

منزل سے پہلے کیوں نہ لٹے گا وہ قافلہ
رہزن ہی بن گئے ہوں اگر رہنما کے ہاتھ

پرویز یہ ازل سے ہی دنیا کی ریت ہے
اس کا ہی جام ہے جو اٹھائے بڑھا کے ہاتھ

رؤف پاریکھ
کراچی (پاکستان)

کاغذی ہے پیرہن

اخبار بڑے کام کی چیز ہے۔ اس سے آپ مکھی مچھر اور کھٹمل مار سکتے ہیں، نلکی بنا کر لاؤڈ اسپیکر کا کام لے سکتے ہیں۔ اسی نلکی سے بچوں کی تہذیب اور تادیب میں مدد لی جاسکتی ہے۔ اخبار کو آپ بارش اور دھوپ سے بچاؤ کے لیے چھاتے کے طور پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کو اشیائے خوردنی پر ڈھک سکتے ہیں۔ بچھا کر حسب موقع بیٹھ یا لیٹ سکتے ہیں۔ اخبار سے دسترخوان کا کام لے سکتے ہیں۔ اس سے ہاتھ منہ پونچھ سکتے ہیں۔ سردیوں میں اس سے آگ تاپی جاسکتی ہے۔ گرمیوں میں پنکھا جھل سکتے ہیں۔ ردی میں بیچ کر رقم بھی کھری کی جاسکتی ہے حتیٰ کہ اسے اخبار کی پالیسیوں کے خلاف بطور احتجاج نذرِ آتش بھی کیا جاسکتا ہے۔ غرض کہ اخبار سے کئی مفید کام لیے جاسکتے ہیں۔ اور ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ ہم اخبار خریدتے ہی اس لیے ہیں کہ اس سے اتنے سارے کام لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے زیادہ کثیر المقاصد شے ہم نے کوئی اور نہیں دیکھی۔

البتہ بعض حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ اخبار کا ایک اور استعمال بھی ہے اور وہ ہے مطالعہ۔ جس پر ہمیں ازحد حیرت ہوتی ہے۔ اگر اخبار صرف پڑھنا ہی ہے تو خریدنے کی کیا ضرورت ہے یہ کام تو پڑوس کے اخبار سے بھی لیا جاسکتا ہے۔ اخبار چھاپنے کا اصل مقصد اگر پڑھنا ہے تو یہ مقصد صرف انگلستان تک محدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر انگریز کو اخبار خرید کر پڑھنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ملک بڑی حد تک اس لعنت سے محفوظ ہے۔ اول تو بہت کم لوگ اخبار پڑھتے ہیں، اور جو پڑھتے ہیں، وہ بھی اڑوس پڑوس سے مانگ تانگ کر، نائی کی دکان پر، کتب خانوں میں اور بسوں ریل گاڑیوں میں ایک دوسرے کے کندھوں سے جھانک کر اخبار پڑھ لیتے ہیں۔ البتہ جو معدودے چند لوگ اخبار خرید کر پڑھنے کی علت میں مبتلا ہیں، وہ جب تک صبح سویرے تازہ اخبار کے درشن نہ کرلیں، ان کے حلق سے ناشتا نہیں اترتا۔ اخبار کے ناغے والے دن ان کو زندگی میں ایک طرح کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ سارا دن پژمردہ اور ملول سے رہتے ہیں۔ ان حضرات کو اخبار کی چھٹی والے دن باسی اخبار بھی پڑھتے دیکھا گیا ہے، لیکن تعجب اس بات پر ہے کہ یہ اخبار میں پڑھتے کیا ہیں؟ آخر اخبار میں ہوتا ہی کیا ہے؟

مثال کے طور پر صفحۂ اول کو لیجیے۔ اس صفحہ پر چند تصاویر اور کئی سرخیاں ہوتی ہیں۔ یہ تصاویر یا تو کسی خوب صورت کھلاڑی کی ہوں گی یا کسی بدصورت سیاست داں کی، جنھیں دیکھ کر صرف وہ خود ہی خوش ہوسکتے ہیں۔ بعض اوقات

کھدی ہوئی سڑکوں، اُبلتے ہوئے گٹروں، کوڑے کے انبار سے بند گلیوں اور پانی سے محروم نلوں کی تصاویر بھی اخبار کی زینت بنتی ہیں، لیکن یہ سب تو آپ اپنے محلے میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے لیے اخبار کی کیا ضرورت ہے؟

باقی رہیں سرخیاں! سو وہ ان بیانات پر مشتمل ہوتی ہیں جو سیاست داں، سرکاری افسران اور وزرا عوام کی تفریحِ طبع کے لیے دیتے ہیں۔ لیکن ان بیانات سے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہو پاتے۔ چوں کہ اخبار میں مزاحیہ کالم بھی ہوتا ہے لہٰذا قارئین ہنسنے ہنسانے کے لیے اس کالم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ ان خبروں کو صرف محکمۂ اطلاعات کا عملہ ہی توجہ سے پڑھتا ہے اور وہ بھی محض اس لیے کہ انھیں اس کام کے پیسے ملتے ہیں۔

اگر کسی اداکارہ کی ساتویں طلاق اور آٹھویں شادی کی بھی خبر ہوتی ہے، جس میں اس کے سابقہ شوہر اور جملہ امیدوار بھی دل چسپی لے سکتے ہیں۔ باقی رہ گئیں قدرتی آفات وحادثات مثلاً سیلاب، زلزلہ، بجٹ، الیکشن وغیرہ کی خبریں تو جناب! بہت سے ہوشیار مدیر ایک ہی حادثے یا واقعے کی تصاویر کو ادل بدل کر سارا سال، بلکہ سالہا سال آفات وحادثات کی خبریں چھاپتے رہتے ہیں۔ مثلاً پچھلے سال اگر موسلا دھار بارشوں کی وجہ سے ٹھنڈی سڑک پر پانی جمع ہو گیا تھا اور اس کی تصویر فائل میں موجود ہے تو اس سال بوندا باندی شروع ہوتے ہی ایڈیٹر صاحب اس کو صفحۂ اول پر چھاپ دیں گے، کیوں کہ انھیں یقین کامل ہے کہ ٹھنڈی سڑک پر نکاسیِ آب کا نظام ہنوز توجہ طلب ہے اور اس موسم برسات میں بھی وہاں پانی ضرور جمع ہوگا۔ یہی تصویر اگلے سال سیلاب کے موقع پر بھی کام آئے گی اور اسے پانی کی پائپ لائن پھٹنے اور گٹر اُبلنے کی خبروں کے ساتھ بھی وقتاً فوقتاً چھاپا جائے گا۔

ان خبروں کے علاوہ اخبارات کی محبوب خبر برطانیہ کے شاہی خاندان سے متعلق ہوتی ہے۔ اگر کسی شاہی شخصیت کو چھینک بھی آجائے تو یہ خبر چار کالمی سرخی میں چھپتی ہے جس کے اردگرد سیاہ ماتمی حاشیہ ہوتا ہے، ساتھ ہی ایک تصویر ہوتی ہے کہ "شہزادی فلاں چھینک مارتے ہوئے"۔

برطانیہ کے شاہی خاندان کے افراد کی ذاتی زندگی کی تمام تفصیلات آپ تک نہایت تسلی بخش طریقے پر پہنچائی جاتی ہیں۔ مثلاً کس شہزادے کا معاشقہ کس اداکارہ کے ساتھ چل رہا ہے یا ہجر و وصال کے کن کن مراحل سے گزر رہا ہے۔ کون سی شہزادی طلاق لینے والی ہیں یا شاہی تخت کے وارثوں میں ایک آدھ کا مزید اضافہ فرمانے والی ہیں۔ اس طرح آپ کی معلومات میں ہر روز بیش بہا اضافہ کیا جاتا ہے۔ ان خبروں کے بغیر آپ حالاتِ حاضرہ سے افسوس ناک حد تک ناواقف رہیں گے۔ شاہی خاندان کی مایوسی اور دل گرفتگی اس پر مستزاد ہے۔

اب وہ صفحہ کھولیے جس پر اداریہ شائع ہوتا ہے۔ یہ بات تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ اخبار کا اداریہ پڑھنے کی چیز نہیں ہے۔ اسے اخبار کا کوئی قاری نہیں پڑھتا، یہاں تک کہ کاتب بھی اسے بغیر پڑھے کتابت کر لیتا ہے، کیوں کہ اسے علم ہے کہ ہر اداریے کا موضوع، لہجہ، متن اور الفاظ تک بعینہٖ وہی ہوں گے جو روزِ اول سے چلے آرہے ہیں۔ بعض ماہر اداریہ نویس تو مہینے بھر کے اداریے ایک ساتھ لکھ ڈالتے ہیں۔ روز روز کون بور ہونا پسند کرتا ہے؟ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اداریہ چھاپنے کا مقصد آخر کیا ہے؟ اس کا جواب بہت سیدھا سادہ ہے۔ اگر اداریہ نہ چھاپا جائے تو خالی جگہ بہت بری معلوم ہوگی۔

خواتین کا صفحہ بھی اخبار میں ہوتا ہے۔ اس صفحے پر ایک بڑی سی رنگین تصویر ہوگی، جس میں میک اپ میں لتھڑی ہوئی ایک بانو دانت نکالے بیٹھی ہیں۔ ان محترمہ کے انٹرویو میں لکھا ہوگا کہ انھیں گانے کا بے حد شوق ہے، خدمتِ خلق کا شدید دورہ

پڑتا ہے اور علاج کے لیے مجبوراً اخبارات میں تصویر اور خبر دینا پڑتی ہے کہ محترمہ فلاں سماجی خدمت کے کئی اداروں کی سربراہ اور سرپرست ہیں۔ قصابوں کی عالمی کانفرنس ہو یا شوقیہ حلق پھاڑنے والوں کا مقابلۂ موسیقی، فیتا کاٹنے کے لیے انھی کو بلایا جاتا ہے۔ انھیں بالعموم کھانا پکانے کا شوق ہوتا ہے، جس کا خمیازہ ان کے اہل خانہ کو اکثر بدہضمی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ کھانے میں تھائی کا بینگن، کپڑوں میں بے تکا پاجامہ اور ریشمی نما دوپٹا اچھا لگتا ہے۔ پھولوں میں گوبھی کا پھول اور رنگوں میں چیک بک کا رنگ بہت پسند ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ سماجی خدمت کے بعد بقیہ زندگی سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں پر یا دلی میں گزار دیں۔ اب اگر آپ اس بصیرت افروز انٹرویو سے محروم رہ جائیں تو واللہ کتنی بڑی نعمت سے محروم رہ جائیں گے۔ یہ انٹرویو آپ کی فہم و دانش کو دوچند کرتا ہے، اسی لیے اسے ہر ہفتے شائع کیا جاتا ہے۔ بس تصویر اور خاتون کا نام تبدیل کر دیا جاتا ہے تاکہ آپ یکسانیت کی وجہ سے بے زار نہ ہو جائیں۔

اخبار میں ہر ہفتے ایک کالم "یہ ہفتہ آپ کے لیے منحوس رہے گا" کے عنوان سے شائع کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ہم نے اپنے چار سالہ "ولی عہد" کی قسمت کا حال جاننا چاہا۔ ہمیں مندرجہ ذیل تحریر نظر آئی:

"آپ کا ستارہ مریخ اس وقت زہرہ سے عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ یہ بات زحل کو بہت ناگوار گزرے گی اور وہ مریخ پر دھاوا بول دے گا۔ اس کے نتیجے میں آپ کے حالات دگرگوں ہو جائیں گے۔ کاروبار تباہ ہو جائے گا۔ بچوں کی صحت خراب رہے گی۔ ملازمین غبن کریں گے۔ بیوی سے ناچاقی کا امکان ہے۔ والدین سے اختلافات کا اندیشہ ہے، حادثے کا خطرہ ہے۔ لیکن اگر مشتری مریخ کی مدد کو آگیا تو پھر وارے نیارے ہو جائیں گے۔ ہُن برسنے لگے گا۔ علم و ادب کی طرف رجحان رہےگا۔ بیرون ملک سفر کریں گے۔ کنوارے ہیں تو شادی ہو جائے گی اور شادی شدہ ہیں تو دوسری شادی ہوگی، بلکہ تیسری شادی کے بھی امکانات ہیں۔ البتہ قمر کا زوال آپ پر زوال لا سکتا ہے۔ ادھر پلوٹو کی شمس سے ناچاقی ہوگئی ہے۔ ادھر عطارد، مریخ کے گھر میں ہے اور مریخ زہرہ کے گھر میں۔ خود زہرہ خدا جانے کہاں ہے؟ اگر یہ وضع فلکی یوں ہی برقرار رہی تو آپ کا اللہ ہی حافظ ہے، کیوں کہ زہرہ کے گھر میں مریخ کو ہبوط ہوتا ہے۔ اتوار اور پیر نحس ہیں۔ منگل بدھ سعد ہیں۔ جمعرات یونہی سا ہے۔ جمعہ ٹھیک ٹھاک ہے اور ہفتہ کوئی خاص نہیں۔"

وہ تو خیریت گزری کہ ہمارے چار سالہ بچے کو اس درہم برہم قسم کے نظامِ شمسی کی اطلاع نہ مل سکی اور وہ ستاروں کے اشاروں پر نہ چل سکا ورنہ بڑی تباہی پھیلتی اور وہ ہفتہ صاحب زادے کی سوانح عمری کا ایک ناقابل فراموش باب ہوتا۔

اب اگر اخبار میں یہی کچھ ہوتا ہے تو لوگ اخبار کیوں پڑھتے ہیں؟ ہر شخص اخبار بینی کے لیے مختلف وجہ رکھتا ہے، مثلاً کچھ لوگ محض اس لیے اخبار کا مطالعہ کرتے ہیں کہ بین الاقوامی سیاسیات اور اقتصادیات کے ان مسائل پر خون کھولا سکیں جن کے بارے میں مٹھیاں بھینچ بھینچ کر بحث کرنے کے باوجود وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ حضرات کی اخبار بینی محض فلموں کے اشتہارات تک محدود ہوتی ہے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ فلم "جٹ دا پتر" کون سے سنیما میں چل رہی ہے اخبار ان کے لیے کاغذ کا ایک لمبا چوڑا ٹکڑا رہ جاتا ہے جس پر وہ فلم دیکھنے کے دوران پکوڑے اور گنڈیریاں رکھ کر کھا سکتے ہیں۔ بعض باذوق حضرات فلمی صفحے پر بھی نظرِ کرم ڈالتے ہیں اور عمر رسیدہ ہیروئن کو تو ندیل ہیرو کے پہلو میں دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ ایک صاحب دل صرف یہ جاننے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں فلم اسٹار مس دل آرام کی شادی تو نہیں ہوگئی اور یہ معلوم کر کے ان کے دل کو آرام آجاتا ہے کہ موصوفہ ہنوز کنواری ہیں۔

سماج سدھار تحریک سے وابستہ ایک بزرگ یہ دیکھنے کے لیے اخبار پڑھتے ہیں کہ کہیں اس میں کوئی خبر یا تصویر تو شائع نہیں ہوگئی جس سے بچوں اور نوجوان کے اخلاق کو ناقابل تلافی ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو۔ چناں چہ کن انکھیوں سے تصویر کو دیکھتے جاتے ہیں اور لاحول پڑھتے جاتے ہیں۔ چوں کہ انھیں نئی نسل کے اخلاق کی بے حد فکر ہے، لہٰذا ان کو دن میں کئی بار لاحول پڑھنا پڑتا ہے۔ لاحول تو خیر ہم نہیں پڑھتے لیکن ان لوگوں پر ملال ضرور ہوتا ہے جو اخبار پڑھ کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں اور نہ صرف قیمتی وقت، بلکہ اخبار بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اخبار کے جو مفید استعمال ہم نے شروع میں بتائے ہیں ان سے وہ ناواقف ہیں۔ شکر ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں جو اخبار بینی جیسی بری عادت میں مبتلا ہیں۔ اللہ آپ کو بھی امان میں رکھے!

۵۷

انوار انصاری (رانچی)

"عادت ہی بنالی ہے پیچھے پڑ جانے کی"

ہر انسان کی الگ الگ عادت ہوتی ہے مثلاً کسی کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے تو کسی کو چاپلوسی کرنے کی، کسی کی عادت غیبت کرنے کی ہوتی ہے تو کوئی خوشامد اور موقع پرستی کو اپنا شعار بناتا ہے۔ کوئی افواہ پھیلانے پر یقین رکھتا ہے تو کوئی امن کا شیدائی ہوتا ہے۔ کسی کو نمک مرچ لگاکر واقعہ بیان کرنے کی عادت ہوتی ہے تو کبھی کو طوطا چشمی کی، کسی کو سگریٹ نوشی کی عادت ہے تو کوئی پان کی گلوریوں سے لطف و سرور محسوس کرتا ہے۔ کوئی باغیانی کی جانب مائل نظر آتا ہے تو کوئی مفت خوری ہی کو زندگی کا ماحصل سمجھتا ہے۔ کسی کو چائے سے سکون حاصل ہوتا ہے تو کوئی شعر و شاعری سے دل بہلاتا ہے۔ غرض کہ عادت کا کیا کہنا۔ جس طرح جتنے منہ اتنی باتیں اسی طرح جتنے انسان اتنی عادتیں۔ اس دنیا میں نہ تو رنگ برنگے انسانوں کی کمی ہے اور نہ عادتوں کی۔ شومئ قسمت سے میں بھی اِن دنوں ایک عادت کا شکار ہو چکا ہوں یعنی اب میں نے عادت ہی بنالی ہے پیچھے پڑ جانے کی۔

خاکسار پیچھے پڑ جانے کی عادت میں زمانے کے نشیب و فراز کی وجہ سے مبتلا ہو گیا۔ خاکسار میں دوسری خوبیاں ہوں یا نہ ہوں (جس کا علم تو خاکسار کو نہیں ہے) مگر دوسروں کی بُرائی کا پتہ لگانے میں خاصی مہارت حاصل ہے۔ جس گھر میں امن و سکون کا ماحول خراب کرنے میں اکثر میرا ہاتھ ہوتا ہے۔ میں پیچھے پڑ جانے کے فن کو اپنا کر صاحبِ خانہ کے شب و روز کا احوال بڑی رازداری سے حاصل کرتا ہوں۔ نمک مرچ لگاکر دروغ بیانی سے کام لیتا ہوں اور پڑوسیوں، رشتہ داروں، ملنے جلنے والوں کے سامنے حقیقت بیان کرتا ہوں۔ ان کی اُلٹی سیدھی باتیں اغیار تک پہنچاتا ہوں اور پھر یکسوئی سے پیچھے پڑ کر ان کے گھر کا امن و سکون درہم برہم کرتا ہوں اور دل ہی دل میں اپنی کامیابی پر نازاں ہوتا ہوں۔

میں اپنے شہر کے ایک شاعر سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ بھی میری ہی طرح پیچھے پڑ جانے میں ماہر ہیں۔ وہ وقت بے وقت ناگہانی حادثے کی طرح بازار میں نمودار ہوتے ہیں۔ پہلے سنجیدگی سے ملتے ہیں اور پھر حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ فرماتے ہیں۔ بعدہٗ باتوں میں بہلا پھسلا کر نزدیکی چائے کی دوکان پر لے جاتے ہیں چائے کا آرڈر دے کر جیب سے خستہ حال دیوان نکالتے ہیں۔ چائے کی چسکیوں کے ساتھ چھ سات غزلوں کا مکمل سیٹ سننے پر مجبور کرتے ہیں۔ جب ان کی غزلوں سے اکتا کر کسی نہ کسی بہانے اُن سے چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کریں تو شاعر موصوف اپنے شعری کو بالائے طاق رکھ کر خاکسارانہ انداز میں عرض کرتے ہیں کہ بھائی صاحب جلد بازی میں گھر سے پیسے لانا ہی بھول گیا۔

ذرا بل کی جانب توجہ کریں۔ بل کی ادائیگی کے بعد وہ حضرت پان اور سگریٹ سے شوق فرمائیں گے اور آپ کو بھی مجبور کریں گے کہ آپ بھی اُن کا ساتھ دیں۔ آپ کو ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کی عجلت ہوگی اور حضرت شاعر کو پیچھے پڑے رہنے کا شوق ہوگا۔ رخصت ہونے سے پہلے شاعر موصوف اپنا یہ شعر ضرور گوش گذار کریں گے۔

کھانسی بھی ہے بخار بھی ہے دردِ سر بھی ہے
صاحب ہمارے حال کی تم کو خبر بھی ہے

ہمارے شہر کے ایک پیشہ ور بزرگ ہیں جن کو شادی بیاہ کے رشتے طے کرانے میں مہارت حاصل ہے۔ ان کے محلے میں نیک نامی کا طوق پڑ چکا ہے۔ آج زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ شادی بیاہ کے رسم و رواج لین دین طور طریقوں میں دھیرے دھیرے نمایاں تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ اِن دنوں موزوں رشتوں کا ملنا محال ہے۔ کیوں کہ کہیں ذات پات کی خلیج حائل ہے تو کہیں غربت اور امارت کا مسئلہ ہے کہیں بڑھتی ہوئی عمر کی وجہ سے رخنہ ہے تو کہیں تعلیم کی کمی بیشی کی وجہ سے معاملہ سلجھ نہیں رہا ہے۔ کہیں جہیز کے لین دین کی وجہ سے بات آگے نہیں بڑھ رہی ہے مگر فلاں بھا کرے بزرگوار حقّو صاحب کا پیچھے پڑے رہنے کے آرٹ سے ہم سے زیادہ واقف ہو چکے ہیں۔ شادی بیاہ طے کرانے میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔ بغیر کسی جھجک کے معمولی نہیں پر دونوں فریقین کے پیچھے پڑ کر معاملہ کو سلجھاتے ہیں اور اس وقت تک دونوں سمدھی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں جب تک کہ شادی بیاہ بہ خیر و خوبی انجام نہ پا جائے۔

پیچھے پڑے رہنے کی عادت میں کچھ خوبیاں ایسی شامل ہو گئی ہیں کہ اس کا بول بالا دفتروں میں بھی زیادہ ہے۔ طالب علموں نے بھی اس کو اپنا لیا ہے۔ اب استاد طالب علم کے پیچھے نہیں پڑتا بلکہ طالب علم ہی استاد کے پیچھے پڑے رہتے ہیں کیوں کہ اکثر یونیورسٹیوں میں امتحانات وقت پر نہیں ہوتے ہیں اور نتیجہ بھی وقت پر برآمد نہیں ہوتا۔ استادوں کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے بچوں کی تعلیم پر خاطر خواہ اثر پڑ رہا ہے۔ اس لیے طالب علم اگر استادوں کے پیچھے نہ پڑیں تو کیا کریں؟ اس طرح اب طالب علم خاطر خواہ نتیجہ حاصل کرتا ہے۔ طالب علموں ہی کی طرح بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بھی پیچھے پڑے رہنے کے آرٹ سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں۔ وہ صبح و شام، موسم گرما ہو یا موسم سرما، موسم بہار ہو یا موسم خزاں، جلسہ گاہ ہو یا مشاعرہ گاہ، قوالی کی محفل ہو یا شادی بیاہ کی تقریب، کھیل کا میدان ہو یا سیاست کا ایوان، ایسی تمام جگہوں پر وہ شکار کو بغیر اطلاع دیتے آدبوچتا ہے اور کسی طرح پیچھے پڑ کر ایک عدد پالیسی لینے پر مجبور کرتا ہے۔

پیچھے پڑے رہنے کی عادت میں میری ہی طرح مذہبی پیشوا، قومی رہنما، فلمی ستارے، معصوم بچے، عاشق معشوق، دوکاندار اور گراہک سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں۔ وقت بھی ایسا پنچھی ہے جو انسان کے پیچھے ہی ہمیشہ لگا رہتا ہے۔ بچپن سے بڑھاپے تک انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ بچپن کی لذتوں سے انسان اچھی طرح سرشار نہیں ہو پاتا ہے کہ جوانی کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ جوانی میں ہر چیز پر بہار آجاتی ہے۔ ہر چیز حسین معلوم ہونے لگتی ہے مگر جوانی کا دور پلک جھپکتے گزر جاتا ہے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے بڑھاپے کا جان لیوا دور شروع ہو جاتا ہے۔ وقت کا پنچھی نہ صرف انسان کا پیچھا کرتا رہتا ہے اور انسان کا احساس اس وقت جاگتا ہے جب اس پر حواس باختگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں یعنی پژمردہ چہرہ، بے ترتیب بال، شب و روز کے کوائف سے بے خبری، الجھی ذہنیت اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ شمع کی لو ماند پڑنے لگتی ہے۔ زندگی کی رفتار مدھم ہو جاتی ہے مگر وقت کا پنچھی دبے پاؤں انسان کا پیچھا کرتا ہے۔ ازل سے ابد تک اس سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ دیکھ انور اب تو بھی سنبھل جا ؛ نیا زمانہ پیچھے پڑا ہے

مفلس قارونی
بارسی ٹکلی

موا کہیں کا

گلنار سا وہ بھائی اور موا کہیں کا
فقرے اچھالتا ہے مجھ پر موا کہیں کا

چلتا ہے جب لچک کر رک رک کر مٹک مٹک کر
لگتا ہے ہو بہو بس بندر موا کہیں کا

صورت تو اس کی دیکھو حلیہ تو اس کا دیکھو
سر تا پا لگ رہا ہے جوکر موا کہیں کا

رومال ہے گلے میں، مونچھیں چڑھی ہوئی ہیں
شہدا موا کہیں کا لوفر موا کہیں کا

لے لے کے نام میرا آہیں بھرے ہے ہر دم
رسوا کرے ہے مجھ کو گھر گھر موا کہیں کا

ملتی ہے جب اکیلی میری کوئی سہیلی
اس پہ بھی پھینکتا ہے کنکر موا کہیں کا

بچپن سے میں منسٹر کے خواب دیکھتی ہوں
اور وہ کہ دو ٹکے کا لاکر موا کہیں کا

میں کر سکوں گی اس سے کیوں کر نباہ آخر
بن جائے وہ جو میرا شوہر موا کہیں کا

سنتا نہیں کسی کی اپنی ہی ہانکتا ہے
منہ پھٹ موا کہیں کا لچر موا کہیں کا

شوہر مرا تو کوئی گبرو جوان ہوگا
اور وہ کہ ہڈیوں کا پنجر موا کہیں کا

کہتا ہے بوجھ میرا سارا اٹھائے گا وہ
حالت تو اس کی دیکھو مچھر موا کہیں کا

بکرے کی طرح ہر دم کرتا ہے وہ جگالی
چرتا ہے ہوٹلوں میں دن بھر موا کہیں کا

اک عارضہ ہے لاحق فلمیا کا اس کو
ہر روز دیکھتا ہے پکچر موا کہیں کا

مجھ کو بھی ہو چلا ہے کچھ کچھ یقین اس کا
سچ مچ ہی مرتا ہے مجھ پر موا کہیں کا

جی جان سے میں بس اک مفلس کو چاہتی ہوں
رضیہ کا ہے وہ لیکن شوہر موا کہیں کا

ظفر چکدینوی
(بہار)

غزل

بچپن میں تو جناب تھے اک گائے کی طرح
لیکن جوان ہوتے ہی قصاب ہو گئے

کانٹے سے اس کے حسن کے ہم ہو گئے شکار
دیکھا اسے تو ماہی بے آب ہو گئے

ہم دشمنوں سے صلح پہ بھی خوش نہ رہ سکے
پیاسے ہمارے خون کے احباب ہو گئے

بھٹکے ہے خیالوں میں تم میری کروٹیں
تم ہی سبب مرے لیے بے خواب ہو گئے

کھدر بھی انقلاب زمانہ کے فیض سے
اس طرح لگے ریشم و کمخواب ہو گئے

ہر گھر اکھاڑہ آج الیکشن کا بن گیا
باپ اور بیٹے رستم و سہراب ہو گئے

چل بت کدوں کو چھوڑ کے سوئے حرم ظفر
کمزور تیرے جسم کے اعصاب ہو گئے

غزل

اسمٰعیل ظریفؔ
(حیدرآباد)

عاشق فراقِ یار میں جو بیقرار ہے
ہذیان بک رہا ہے اُسے تیز بخار ہے

پکچر کا بھوت لڑکے کے سر پر سوار ہے
فلمی پری کے عشق میں وہ بیقرار ہے

سالا جو ہے وزیر کا وہ ٹھیکیدار ہے
گنٹور میں بھی اُس کا بڑا کاروبار ہے

اب اس غزل کی داد مجھے نقد چاہیئے
کچھ سابقہ کی داد بھی تم پر اُدھار ہے

ماں باپ سے بنی نہیں شاید اسی لیے
بیوی کو لے کے بیٹا جو گھر سے فرار ہے

فیشن زدہ بھتیجے کے اخلاق دیکھئے
ماچس چچا سے مانگ کے پیتا سگار ہے

کالا کلوٹا لڑکا ہے لڑکی حسین ہو
پیر میں اس کے رشتے کا آج انتظار ہے

جوڑے کی اس کو دے کے رقم کیجئے مدد
پیدائشی نکمّہ ہے بے روزگار ہے

سودے میں مارتا ہے، وہ پیسے کبھی کبھی
نوکر ہمارا واقعی ایماندار ہے

میک اَپ کا دور ہے میاں فیشن بدل گیا
بستی کی اب دھڑی ہے نہ سولہ سنگھار ہے

ماڈل پرانا اور کلر بھی بگڑ گیا
بھاتی کی اب سواری میں جو کالی کار ہے

واعظ بھی بیٹھے ہوں گے وہاں انتظار میں
اب بار میں چلیں گے فضا خوشگوار ہے

یہ لیڈری بھی کھیل نہیں ہے کوئی حضور
پبلک جہاں بگڑ گئی جوتوں کا ہار ہے

اپنے پرانے شہر کا نقشہ تو دیکھئے
کچرے کا ڈھیر ہے کہیں گرد و غبار ہے

یہ جو خزاں کے بعد خزاں ہے یہاں ظریفؔ
لگتا ہے اب بہار چمن سے فرار ہے

"سڑکوں پہ سُلا دیتے ہیں"

یوسف یکتاؔ

لوگ جو روز پلا دیتے ہیں!
ہم انھیں، دل سے دُعا دیتے ہیں!

مفت میں لوگ پلا دیتے ہیں!
اور سڑکوں پہ سلا دیتے ہیں!

میرے بچے بڑے ضدی ہیں میاں!
ناچ تگنی کا نچا دیتے ہیں!

میں نے مانگا ہے نقط "ڈی کاشن"
جانے کیا کیا وہ ملا دیتے ہیں!

تمنا مظفرپوری

گِس پیپر [ایم۔ اے۔ اردو]

سرکار کی نئی تعلیمی پالیسی میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اب ایسی تعلیم دی جائے جس سے بچے پڑھ لکھ کر روزگار کی تلاش میں مارے مارے نہ پھریں چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی کے پیش نظر ہم نے طلباء کی سہولت کے لیے ایک گس پیپر مرتب کیا ہے۔ کیوں کہ ہمارے طلباء کی ساری اسٹڈی گس پیپروں کے سوالات پر ہی انحصار کرتی ہے۔ ۱۹۸۹ء میں اردو کے طالب علموں کے لیے آنے والے سوالات بطور گس پیپر شائع کئے جا رہے ہیں تاکہ طالب علموں کو اس گس کی مدد سے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل ہو سکے اور ملک کی معیشت میں بھی سدھار لایا جا سکے۔

سوالات: ۱۔ بجلی کی قلت اور لوڈ شیڈنگ کے زمانے میں آتش کی شاعری آپ کے امتحان کی تیاری میں کتنی معاون ثابت ہوگی؟ آتش لکھنوی کے اشعار کے حوالے سے ثابت کریں۔ یا

کیا موسم سرما میں لکھنؤ اور دہلی کے شعراء و ادباء آتش کے دیوان سے انگیٹھی کا کام لے سکتے ہیں؟

۲۔ درد کے دیوان کے مطابق درد کی کتنی قسمیں ہیں؟ سبھی اقسام کے لیے کون سی (ANALGESIC TABLETS) انلجیسک ٹکیہ مفید ہوگی اور کیوں؟ مثال کے ساتھ پیش کیجئے۔

۳۔ "طوفان نوح" حضرت نوح ناروی مرحوم کا دیوان ہے؟ کیا طوفان نوح کو مدنظر رکھ کر بہار، یوپی، بنگال اور آسام کے سیلاب کا مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے؟ اشعار کے حوالے سے تحفظ سیلاب پلان تیار کیجئے۔ یا

داغ کی شاعری میں جو داغ ہے اسے صاف کرنے کے لیے کون سا ڈٹرجنٹ پاؤڈر یا صابن بہتر ہوگا! مثال دے کر سمجھائیے۔

۴۔ بقول طالب خوندمیری "غالب ایک اچھے معمار تھے"، غالب کے اشعار سے ثابت کیجئے یا

"بے در و دیوار سا اک گھر بنانا چاہیئے" ہاؤزنگ اسکیم کے تحت ہندوستانی عوام کا رہائشی مسائل حل کیجئے۔

۵۔ ابو الکلام آزاد بہت بے باک اور نڈر صحافی تھے۔ مگر منسٹر بننے کے بعد کیا وہ مصلحت پسند ہو گئے تھے؟ "انڈیا ونس فریڈم" کے پس منظر میں تشریح کیجئے۔ یا

کیا حضرت نیاز فتح پوری، حضرت جگر مرادآبادی کے رقیب تھے؟ نگار کے جگر نمبر کے حوالے سے روشنی ڈالیں۔

۶۔ "سلیم الدین احمد اردو کے بڑے اور معتبر ناقد تھے"! اپنی تنقید کی حمایت اور وکالت میں انھوں نے پچیس ۲۵ نظمیں اور ہائیکس نظمیں تخلیق کیں۔ سلیم الدین احمد کی تنقید کی روشنی میں ان کی نظموں کا جائزہ لیجیے۔

۷۔ کیا یہ سچ ہے کہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، شاعر جمال تھے اور جمال کے فراق میں رہا کرتے تھے؟ ان کی بیگم کے حوالے سے ان کی تخلیق اور شاعری کا جائزہ لیجیے۔

۸۔ مشہور افسانہ نگار آنجہانی کرشن چندر، فلمی گائیک کشور کمار دونوں ایک ہی ذہنیت کے مالک تھے؟ کیا آپ اس بات سے متفق ہیں؟ اگر ہیں تو کیوں؟ اور نہیں ہیں تو کیوں نہیں؟ کم از کم پانچ سو الفاظ میں دلیل پیش کریں۔

۹۔ "سرسید احمد بڑے ذہین اور دوراندیش تھے" یہ بات ان کی داڑھی سے ظاہر ہوتی ہے"۔ ثابت کیجیے۔

۱۰۔ "بشیر بدر کی شاعری بڑی حسین ہے"۔ ان کی شاعری کا تقابل ان کے حسن سے کیجیے۔ مثال کے طور پر کم از کم پانچ اشعار کا حوالہ پیش کیجیے۔ یا

بدنام نظر ایک اچھے شاعر ہیں۔ ان کے متعلق ایسی ویسی غلط بات کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، پھر بھی وہ بدنام ہیں۔ کیوں؟

نوٹ: جن طلبا کو دوسرے پیپرس کا گس درکار ہو وہ مرتب سے براہ راست رجوع کر سکتے ہیں
اسپیشل گس بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔

شاطر گورکھپوری

غزلیں

صفائی ہاتھ کی ہم یوں دکھایا کرتے ہیں
پڑوس والوں کی مرغی چرایا کرتے ہیں

شبِ فراق جب اُنکو بلانا ہوتا ہے
تو چھت پہ ٹارچ جلایا بجھایا کرتے ہیں

جو چائے پانی سے کرتا ہے روز آؤ بھگت
غزل ہم اپنی اسی کو سُنایا کرتے ہیں

کبھی جو سامنا ہو جانے پر بدکتے تھے
وہ اب تو سامنے بے پردہ آیا کرتے ہیں

ہمیں پہ کچھ نہیں مخصوص اُن کی مشقِ فریب
وہ سبز باغ ہر اک کو دکھایا کرتے ہیں

پھلا کے دامِ تصور اب اُن کی یادوں میں
تمام رات ہم اُلّو پھنسایا کرتے ہیں

ہوا ہے ترکِ تعلق کو اک زمانہ مگر
گلی میں ان کی ابھی آیا جایا کرتے ہیں

سبھی اسی لیے ہمیں کہتے ہیں ماسٹر شاطر
کہ بینڈ باجا ہم اکثر بجایا کرتے ہیں

اُن کی اب پٹتی نہیں ہم سے پچھتّر فیصدی
وہ رہا کرتے ہیں برہم سے پچھتّر فیصدی

جیسے سو فیصد خطا کارِ محبت ہیں ہمیں
ملتے ہیں یوں کٹ کے وہ ہم سے پچھتّر فیصدی

عشق میں کھائی ہیں ایسی ٹھوکروں پر ٹھوکریں
ہو گیا مانوس دل غم سے پچھتّر فیصدی

جب سے سو فیصد گرانی بڑھ گئی بازار میں
رہتی ہے اَن بَن سی بیگم سے پچھتّر فیصدی

دل کی کشتی کو بچا لایا میں طوفاں سے مگر
فاصلہ اب بھی ہے سنگم سے پچھتّر فیصدی

ہم سے تو رکھتے ہیں سو فیصد ہو پر اُمیدِ وفا
خود ملاتے ہیں نظر ہم سے پچھتّر فیصدی

ساقی کے مٹکے سے اک چوتھائی میں نے کھینچ لی
اور اڑا لی ساغرِ جم سے پچھتّر فیصدی

تازہ دم رہتے تھے جو کل عاشقی کی دوڑ میں
اب نظر آتے ہیں بیدم سے پچھتّر فیصدی

ایسی گھر گرہست بیوی کی ضرورت ہے مجھے
جو بچا لے میری انکم سے پچھتّر فیصدی

بے حجابانہ ملا کرتے ہیں وہ اغیار سے
پردہ فرماتے ہیں محرم سے پچھتّر فیصدی

شیخ صاحب جو تو قسم کھاتے تھے کی تھی اس میں سے بھی
گر گئے چٹ مانگ کر ہم سے پچھتّر فیصدی

مائلِ لطف و کرم کرنا ہے گر شاطر انھیں
کام لینا چشمِ پُرنم سے پچھتّر فیصدی

آزادی کے بعد!

اشرف مالوی

ہوگیا انصاف کو طاعون آزادی کے بعد
مٹ گئے سب قاعدے قانون آزادی کے بعد

بھوک، افلاس و گرانی فرقہ وارانہ فساد
کیا خبر تھی ہوں گے یہ مضمون آزادی کے بعد

کہتے تھے الراشی والمرتشی فی النار جو
رشوت ان کا ہے عمل مسنون آزادی کے بعد

اتحاد و امن و قومی ایکتا کے نام پر
ہوگیا پانی سے سستا خون آزادی کے بعد

اپنی من مانی کرے شرم و حیا کو چھوڑ کر
ہوگئی آزاد ہر خاتون آزادی کے بعد

جن کو اُٹھنا بیٹھنا اور بولنا آتا نہیں
وہ بناتے ہیں نئے قانون آزادی کے بعد

رہنمائے قوم انگوٹھا ٹیک کلو چودھری
جانتے ہیں خود کو افلاطون آزادی کے بعد

کیا وزیر اعظم تھا تمہارا کیا ادیب اور کیا خطیب
ہے کوئی محفوظ اور مامون آزادی کے بعد

اب وہ شاعر ہے جو ناموزوں غزل گاکر پڑھے
کون سیکھے فاعلن، فعلون آزادی کے بعد

کیا اسی دن کے لیے اشرف لڑے انگریز سے
پیٹ بھر روٹی نہیں دو جون[1] آزادی کے بعد

(1۔ دو وقت)

غزل

مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

بستی، بستی، تعصب نفرت کی بیماری جی
کوچہ کوچہ شہر شہر ہیں لاشوں کے بیوپاری جی

حق کی بات کرو تو بھیا زنداں اور زنجیریں ہیں
مظلوموں پر اب ظالم شیوہ ہے سرکاری جی

میرے سیاسی بازیگر و یہ تم نے کبھی سوچا ہے
خاک وطن کو کردے گی یہ نفرت کی چنگاری جی

دنگا کرا کر دوڑا آئے اور بہائے آنسو بھی
دلداری کی آڑ میں دیکھو مشق ستم ہے جاری جی

مہنگائی کو دے ہے بڑھاوا لے کر تھیلی سیٹھوں سے
بھولا بن کر آج کا لیڈر کرتا ہے مکاری جی

قدم قدم پہ دھوکا دھڑی ہے چلنا پھرنا مشکل ہے
بزمی جی پر آج کی شب ہے پربت سے بھی بھاری جی

فاروق نشتر (میسور)

ایک معتقدِ ابوالکلام کا کھلا خط

مولانا آزادؔ کے نام

میسور فٹ پاتھ، بھارت

صدیقِ مکرم!

رات کے بارہ بجے ہیں اور میں تنِ تنہا رات کے اندھیرے میں فٹ پاتھ پر کسی اُلّو کی طرح بیٹھا ماچس کی روشنی میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ گزشتہ تین روز سے پیٹ اور شہر میں گڑبڑ ہے۔ میں ایک غیر آباد سرکاری پُل کے نیچے بیٹھا ہوا تھا لیکن جب ذہن سے خوف رفع نہ ہوا تو اس خوف کو دُور کرنے کے لیے فٹ پاتھ پر آ بیٹھا۔ شہر سے فوج اور پولس کے چلے جانے کے باوجود شہر میں خوف کی حکمرانی ہے اور مختلف قسم کی افواہیں گرم ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا میں نے اس غیر آباد پُل میں پناہ لی ورنہ وہ نیزہ جو میرے ساتھی کے پیٹ میں گھس چکا تھا، میری پیٹھ میں بھی گھس چکا ہوتا۔ گزشتہ دنوں آپ کے چھپائے ہوئے "تیس صفحات" ایک برس کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس طرح منظرِ عام پر لائے گئے جس طرح ایک پاک دامن دوشیزہ کو طوائف کے روپ میں پیش کیا جائے۔ ان صفحات کی رونمائی کے ساتھ آپ کی یادوں اور فسادات کے سلسلے بھی تازہ ہو گئے۔ آپ کو تو فسادات سے بہت زیادہ سابقہ پڑا تھا۔

گزر چکی تھی یہ فصلِ "فساد" آپ پر بھی

میں آپ کی خدمت میں ایک بڑے فساد کا چھوٹا سا منظر ضرور پیش کرتا لیکن گزشتہ دنوں کے بھیانک مناظر اور فوجی گاڑیاں گزرنے کے مناظر اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ کوئی منظر بھی خالص نہیں رہا۔ حالانکہ میں نے "غبارِ خاطر" سے مناظر کی عکاسی اس خوبی سے سیکھی ہے کہ ایک فلمی اسکرپٹ رائٹر نے مجھے دعوتِ اسکرپٹ رائٹنگ دی ہے۔ آپ تو صرف نام کے آزاد تھے لیکن آج ہر تحریر فیشن ایبل عورتوں کی طرح آزاد ہے۔

میں تو چاہ رہا تھا کہ کسی منظر کی منظر کشی میں اپنا وقت اور کاغذ ضائع نہ کروں کیونکہ ہمارے یہاں گرانی کی وجہ سے کاغذ کھانے اور انسان جلانے کے کام آنے لگے ہیں۔

مولانا! ابھی پچھلے گزشتہ ہفتہ میں نے آپ کے نام پر منائی جانے والی ایک تقریب میں شرکت کی۔ ان تقریبات کی وجہ سے سیاست والوں کو سستی شہرت کے مواقع ہاتھ آ گئے ہیں۔ بعض گمنام سیاست داں آپ کے فن، شخصیت اور خدمات پر روشنی ڈال ڈال کر اپنا مستقبل روشن کر چکے ہیں اور وہ صرف آپ ہی کے لیے وقف ہو کر

رہ گئے ہیں یعنی وہ آئی اسپیشلسٹ (EYE SPECIALIST) کی طرح صرف آزاد اسپیشلسٹ ہو کر رہ گئے ہیں ـــــ یہ لوگ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے، آپ کے نام، آپ کے کام اور آپ کے فن کے تذکرے کر کر کے دست بہ گریبان ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے مولانا آزاد ایک مکمل لیڈر تھے تو کوئی اس بات پر زور لگاتا ہے کہ آپ مکمل صحافی تھے اور کوئی استدلال پیش کرتا ہے کہ آپ پورے ادیب تھے۔ بلکہ ایک شخص نے تو آپ کو "مچھلی" کا لقب دیا ہے جو اُردو کے سمندر میں تیرتی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ میرا یہ خط پڑھ کر بور ہوں لیکن میں آپ کو دنیا کا اصلی رنگ دکھلا کر ہی دم لوں گا۔
یہ لوگ اس قسم کی حرکت صرف آپ کے ساتھ ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ ہر بڑا ادیب و شاعر ان حضرات کے چنگل میں چوہے کی طرح پھنسا ہوا ہے۔ کوئی غالب پرست ہے تو کوئی غالب شکن۔ میں نے ایسے نقاد بھی دیکھے ہیں جو اقبال کی شاعری میں اپنے دماغ کے کیڑے نکال کر ڈال لیتے ہیں۔ بہرحال "انڈیا ونس فریڈم" کے منظر عام پر آنے سے بزرگ سیاست دانوں پر روزگار کے دروازے کھل گئے ہیں۔ اور وہ اپنے آپ کو "قطب مینار" تصور کرنے لگے ہیں۔ بعض تو آپ کی تقلید میں سلیمانی چائے سڑکوں پر پینے لگے ہیں۔

خیر، مولانا! آپ دلبرداشتہ مت ہو جائیے۔ اچھا۔ اب اجازت دیجیے کیوں کہ وہ دیکھیے، چند لوگ میرے ساتھی کی لاش کی طرف دوڑے آ رہے ہیں، شاید انھیں میری بھی تلاش ہو۔ میں پھر سے اس پل کے نیچے قید ہو جاتا ہوں۔ فقط آپ کا معتقد

۸۵

محمد طارق (امراؤتی)

سرد سانسیں

لوگوں میں یہ عادت بہت ہی [illegible] ہے کہ چلّاتے خوب ہیں۔ واویلا بھی بہت مچاتے ہیں اور گھبراتے ایسے ہیں جیسے اختلاج قلب کا دورہ پڑ گیا ہو۔ ہوتا کچھ بھی نہیں ۔ ہوتا وہی ہے جو اُن کے خدا چاہتے ہیں ۔ ۔ ۔

اُن کے خدا : افسران ۔ اعلیٰ عہدہ دار ۔ نیتا ۔ لیڈر ۔ منی لیڈر ۔ لیڈر کے چمچے (ودکر) وغیرہ ۔ ۔ ۔ مگر کون سمجھائے انھیں ۔ بڑے بڑے دانشور سمجھاتے سمجھاتے اُن لوگوں کی طرح ہی مر گئے جنھیں وہ ساری زندگی جینے کا سلیقہ سکھاتے رہے تھے ۔ کیا ملا انھیں ؟! پھر ہم کس کھیت کی مولی!

پھر بھی ہم نے بارہا سوچا ۔ جانے کیوں سوچا کہ کیوں نہ ہم بھی مفکّروں اور فلاسفروں کی طرح اپنی سوچوں کے کٹوروں کو اُن کے سامنے انڈیل دیں، مگر ہمیں خدشہ ہے کہ کہیں ہمارے خیالات کے انبار کو وہ سونگھیں اور کتوں کی طرح ٹانگ اُٹھا کر ۔ ۔ ۔ بھونکنا شروع کر دیں ۔ ہماری اپوزیشن میں ۔

کسے اپنی پوزیشن کی فکر نہیں ہوتی! ہم اُن لوگوں میں سے نہیں ہیں جو اپنی پوزیشن کی خاطر اپنے اطراف اپوزیشن پیدا کر لیتے ہیں ۔ اس لیے سمجھ دار دانشور کی طرح خموش رہنا ہم نے بہتر سمجھا ۔ یا یوں سمجھ لیجئے ہمارے اندر وہ بندر سا گیا جو ہمارے آفس کی پختہ دیوار پہ کا [illegible] ایک [illegible] پر بنا ہوا ہے ۔ اپنے منہ پر ہاتھ رکھے وہ [illegible] کے درمیاں براجمان ہے ۔ کاش! ہم سچ مچ بندر ہوتے ! ڈاروِن کا نظریہ اگر صحیح ہے تو ہمارا یہ ارتقائی سفر [illegible] ارتقائی سفر بن رہا ہے ۔ ۔ ۔

مار دھاڑ ۔ چھینا جھپٹی ۔ لوٹ کھسوٹ، قتل و غارت گری ۔ ۔ ۔ جنگ ۔ [illegible] کی سعیٔ پیہم، کیا ہم اپنی مکروہ غرضوں کی سواریوں پر بیٹھے جو سفر کر رہے ہیں وہ [illegible] ترقی کی [illegible] پہنچا سکتا ہے ۔ ۔

فرشتوں نے روزِ ازل سچ کہا تھا ۔ ۔ ۔ اور خدا نے ۔ ۔ ۔

کسی نے ہمارے ٹیبل پر پیپر ویٹ پٹخا ۔ ہمارے خیالات کا شیرازہ ایسے بکھر گیا جیسے بماری سے زندگی ۔ اور زندگی کی ساری رونقیں بکھر جاتی ہیں ۔ برباد ہو جاتی ہیں ۔

ہم نے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھا ۔ وہ کوئی غیر نہیں تھا ۔ ۔ وہ ہمارا ہم پیشہ "بڑا بھائی" تھا ۔ [illegible] اُس کے چہرے سے تیسی ایسے جھانک رہی تھی جیسے تڑپتے ہوئے سینا پھل (شریف) سے [illegible]

اس کے بیچ۔

اُس نے اپنے موٹے موٹے لبوں میں اپنی ہنسی چھپائی۔ مسکرایا۔ پھر چہکا "کس سوچ میں کھوئے ہو؟"

"کہاں کچھ نہیں — کچھ بھی تو نہیں، سوچنے کی فرصت کہاں ہے بھئی۔ اس تیز رفتار زمانے میں جو روشنی سے بھی آگے دوڑ رہا ہے۔" ہم نے اُس دکاندار کی طرح جھوٹ بولا جو گودام میں اشیاء بھر کر "آؤٹ آف اسٹاک" کا بورڈ دروازہ پر لگا دیتا ہے۔ "معلوم ہے کچھ" —! بڑا بابو ہماری آنکھوں کے سامنے ٹیڑھی انگلیاں کرکے ہاتھ نچا کر بولا۔ "کیوں کیا ہوا!" ہماری بھوئیں سکڑ گئیں۔

"زیرو بجٹ کا آرڈر آ گیا" بڑے بابو کی بھوئیں پیشانی پر چڑھ گئیں۔

"وہ تو آنے ہی والا تھا — مگر اس سے ہمیں کیا خطرہ، تمہیں کونسی پریشانی، تم بڑے بابو ہو، اور ہم چھوٹے بابو! تمہارا کام رشوت وصول کرکے بڑے صاحب کو پہنچانا ہے اور ہمارا کام رشوت لے کر چھوٹے صاحب کو دینا ہے، تمہارا کمیشن زیادہ ہے — ہمارا کمیشن کم، ہمیں کیا خطرہ —!

جب ہم جیسے لوگ خطرے میں پڑ جائیں گے تو افسران کی کرسیوں کی ٹانگیں لرزنے لگیں گی۔ جب افسران کی کرسیوں پر لرزہ طاری ہوگا۔ تو منسٹروں کی کرسیاں ہلیں گی — ہمارا کمیشن کم، ہمیں کیا خطرہ —!

جب ہم جیسے لوگ خطرے میں پڑ جائیں گے تو افسران کی کرسیوں کی ٹانگیں لرزنے لگیں گی۔ جب افسران کی کرسیوں پر لرزہ طاری ہوگا۔ تو منسٹروں کی کرسیاں ہلیں گی — سمجھے، ہمارا کچھ نہیں ہوگا زیرو بجٹ میں!"

"ہاں — یار بڑے پتے کی بات بولتا ہے تو، تو!!" بڑا بابو جو ہماری چائے پی کر ہم ہی سے بے تکلف ہو گیا تھا ہماری پشت پر دھپ جما کر بولا "اپن کو تو کوئی خطرہ نہیں، آنچ آ سکتی ہے اُن ملازمین پر جو ڈپارٹمنٹ میں نوزائیدہ ہیں۔ نونہال ہیں — گیلے ہیں۔ . . گیلے ہیں . . ." بڑا بابو شیطان کی طرح قہقہہ مارنے لگا۔

"ہاں . . . !" ہم ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے . . .

ہماری سرد سانسیں کیا کر سکتی ہیں —؟!

کیا "رمیش" کی ملازمت کو نیا جیون دے سکتی ہیں جس کے باپ نے کڑی مزدوری کرکے اُسے پڑھایا لکھایا! اور بڑی جد و جہد کے بعد بھی اپنا گھر بار بیچ کر اُسے "بھینٹ" دینی پڑی تھی۔ ملازمت کے لیے۔ ابھی ایک سال بھی نہیں ہوا اُسے کیا ہوگا اس کا — وہ جو اپنے ماں باپ کا اپنے بھائی بہنوں کا تنہا ہی تو سہارا ہے۔

اور کیا ہوگا اُس رحیم کا جس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد انجینیرنگ کی ڈگری حاصل کی تھی اس کے باپ نے بڑی امیدوں اور آرزوؤں سے اپنی ساری کمائی اُس کی تعلیم پر لگا دی تھی — ابھی ڈیڑھ سال بھی نہیں ہوا۔ ملازمت دینے والوں کو اُس نے اپنی ماں کے زیور بیچ کر "نذرانہ" دیا تھا — وہ زیور جو اُس کی ماں نے بڑے جتن سے اپنی جوانی کی صلیب پر لٹکی ہوئی بیٹی کے لیے اُٹھا رکھے تھے — کیا ہوگا اس کا؟!

زیرو نہیں بن جائیں گی اُن سب کی زندگیاں زیرو بجٹ سے!

. . . . ہم سرد سانسیں بھر رہے ہیں۔ حالانکہ ہم خوب جانتے ہیں ہماری یہ سرد سرد سانسیں سوائے ہمارا لہو سرد کرنے کے اور کچھ نہیں کر سکتیں!

انور سدید
(لاہور)

سدیدیات

میٹھی میٹھی مسکراہٹیں...

بعض لوگ مزاح نگار نہیں ہوتے لیکن تالیاں اس انداز میں بجاتے ہیں کہ موروثی مسخرے بھی ان کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں موروثی مسخروں اور خود ساختہ مزاح نگاروں میں ایک فرق یہ بھی ہے کہ موروثی مسخرہ جس کا کھاتا ہے اس کا گن گاتا ہے، اور ممدوح کے سر سے ہما کا سایہ ہٹ جائے، تو آنکھیں نہیں پھیرتا بلکہ ممدوح کو باور کراتا ہے کہ وہ امیر ابن امیر ابن امیر ہے اور دولت کی چھاؤں ڈھل گئی ہے تو کوئی بات نہیں اس کی زندگی اپنے آباؤ اجداد کے سایہ سے محروم نہیں ہوئی۔ خود ساختہ مزاح نگار تو سرکس کے مسخرے کی طرح ہے جو ہنسانے کے علاوہ اسی وقت حاصل کر لیتا ہے ممدوح کو نہیں دیکھتا اس کے اقتدار کی کرسی کو دیکھتا ہے کرسی دالابل جائے یا کسی حادثے میں معدوم کا شکار ہو جائے تو پریشان نہیں ہوتا کرسی کا قصیدہ جاری رکھتا ہے اور کرسی سے اٹھ جانے والے کی ہجو اور نئے آنے والے کی مدح کرتا ہے اور اکثر اوقات ہوا کا رُخ پہچان لیتا ہے اور احتیاطاً اپنے نئے ممدوح کا قصیدہ وقت سے پہلے تیار کر کے اسے کسی معاندانہ اخبار میں بے نظیر انداز میں چھپوا بھی دیتا ہے تاکہ سورج کی ضیا معدوم ہو تو اس قصیدے کی روشنی ابھر آئے اور مزاح نگار کے دندان آز چمکنے لگیں۔

یہ جو ہم نے تمہید باندھی ہے اس سے اگر آپ کو مرزا غالب کی تصویر نظر آ جائے تو آپ ہمیں شرمندہ نہ کریں، ہمارا مقطع سخن غالب کی طرف ہرگز نہیں ہم مزید وضاحت کر دیں کہ ہمارا روئے سخن کسی کی طرف بھی نہیں خود اپنی طرف ہے کیونکہ دینی گھرانے میں پیدا ہو جانے اور شہر میں مولوی صاحب کا بیٹا اور اپنے نام کے ساتھ ظلد گرامی کی جدگی کی وجہ سے "میاں" کا سابقہ لگانے کے باوجود ہم نے متذکرہ بالا تمام خصلتیں اپنے زمانے سے حاصل کی ہیں۔ زندگی بھر انھیں پالا ہے۔ اپنی فلاح کا راستہ نکالا ہے۔ [illegible] کی طرح ہو تو بیاہ ... اور جو کوئی خود ہماری تمہید کو کھینچ کر اپنے اوپر سجا لے تو یہ اس کی اپنی ہی ذمہ داری ہے۔ ہم ہر کسی کو بروقت منع کرتے ہیں کہ اس آئینے میں اپنا چہرہ نہ دیکھیں۔

آؤ ہم مزاح اور طنز نگاروں کی طرف لے دھیان آئے ہمارے ذہن میں عملی مزاح کی جو مثال تھی وہ اپنے [illegible] رشک کی تھی۔ اور سلطان رشک وہ شخص ہے جو حکیم یوسف حسن کی مسند پر بیٹھا ہوا

لیکن حکمت نہیں کرتا نیرنگ خیال چھاپتا ہے۔ جو اردو کا ایک عہد ساز پرچہ ہے۔ اس دور کے رسالے کیا فنون، کیا اوراق، کیا سیپ، کیا تخلیقی ادب، کیا نیا دور سب اس کے سامنے ماند ہیں۔ اس پرچے پر سلطان رشک کا نام جلی قلم سے بطور مدیر چھپتا ہے۔ لیکن اس پرچے میں سلطان رشک نے مزاح نگار ہونے کا کبھی عملی ثبوت نہیں دیا۔ مزاح نویسی کے لیے اس نے ایک الگ پرچہ "اردو پنچ" جاری کر رکھا ہے۔ لیکن اس پرچے پر ان کا نام باریک قلم سے چھپتا ہے۔ بلکہ سچ پوچھئے تو اردو مزاح کی تین بڑی اور گرانڈیل، عمارتوں یعنی ضمیر جعفری، کرنل محمد خاں اور ڈاکٹر صفدر محمود کے نیچے دبا ہوا ہے۔ بس مزاح کا یہی عملی مظاہرہ ہے جس نے آج صبح سویرے ہمیں نال کیا کہ ہم اپنا کالم سلطان رشک کے ذکر سے ابتدا کریں جو چاہتے تو اپنا نام سید ضمیر جعفری سے اوپر بھی لکھوا سکتے تھے۔

اس کالم میں طنز و مزاح کی طرف رخ کرنے کا دوسرا باعث یہ ہے کہ ہمیں راولپنڈی سے "اردو پنچ" کا چودھواں اور حیدرآباد دکن کے نکلنے والے رسالہ "شگوفہ" کی ۲۱ ویں جلد کا آٹھواں شمارہ اکٹھے موصول ہوتے ہیں۔ اور طنز و مزاح کا اتنا وافر مواد میسر آجائے تو سنجیدہ موضوعات خامہ فرسائی کرنے کے بجائے مسکراہٹیں بانٹنے کے لیے دل بے اختیار کرتا ہے ہم مسکراہٹوں کی اس تقسیم کے لیے کسی شکریے کے حق دار نہیں ہم نے یہ عمل مرحوم صدیق سالک سے سیکھا ہے۔ جو سفارشی کام کرانے اور فرد کو مادے کے بوجھ تلے داب دینے کے بجائے لوگوں کو مسکرانے اور مادے کے بوجھ کو ہلکا کرنے کی عادت ڈالتے تھے۔ ہاں "اردو پنچ" کے مدیر سلطان رشک اور "شگوفہ" کے مدیر ڈاکٹر مصطفےٰ کمال ہر قسم کے شکریے کے مستحق ہیں۔ کیوں کہ سلطان رشک پاکستان میں اور ڈاکٹر مصطفےٰ کمال برصغیر میں بقول شخصے فی کس مسکراہٹوں کی تعداد بڑھانے میں قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ گویا صدیق سالک کی وفات کے بعد اگرچہ ان کا جسد خاکی ہم میں موجود نہیں اور ان سے سفارشی کام کرانے والے ان سے منہ پھیر چکے ہیں۔ لیکن ان کے اصلی مشن کو جاری رکھنے والے لوگ ابھی تک سرگرم عمل ہیں۔ اور فرد کے تشنج کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں۔ لوگوں میں مسکراہٹیں بانٹ رہے ہیں۔

"اردو پنچ" قدرے ضخیم پرچہ ہے ہر تین ماہ کے بعد چھپتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھ مٹھی بھر مسکراہٹیں لانے کی بجائے مسکراہٹوں اور قہقہوں کا ٹوکرا بھر کر لاتا ہے۔ تاہم مٹھی مٹھی مسکراہٹیں بھی تقسیم کریں تو بزرگ خانہ کے لیے پھر بھی کچھ مسکراہٹیں بچ جائیں۔

مسکراہٹوں کی تقسیم کا ذکر آیا ہے، تو سنئے ہم نے رضیہ فصیح احمد کا مزاح پارہ "دودھ سے دانہ گندم تک" اپنی بیوی کی نذر کیا ہے۔ ایک تو یہ خندہ آور مضمون لکھنے والی خود خاتون ہیں۔ دوسرے وہ اپنے مزاح پاروں میں مسکراہٹیں نسوانی انداز میں پیدا کرتی ہیں، پھر دودھ اور گندم میں جو غذائی زاویہ ہے اس کے ساتھ تو ہمارے گھر کی ساری معیشت بندھی ہوئی اور ہماری بیوی صاحبہ چونکہ دودھ اور گندم کے اخراجات ہی سے زیادہ نالاں ہیں۔ اس لیے ہم نے انھیں رضیہ فصیح احمد کے حوالے کر دیا ہے، بمصداق کند ہم جنس با ہم جنس پرواز . . . اب دونوں آنگن میں بیٹھی دودھ اور گندم کی چڑھتی ہوئی قیمتوں پر تبادلہ خیال کر رہی ہیں اور ہم اطمینان سے اردو پنچ پڑھ رہے ہیں۔

ارشد میر کا مضمون "مجھ سے میرے دوستوں کو بچاؤ" ہم نے اپنے پڑوسی صابر لودھی صاحب کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ یہی لاہور میں آباد کرنے کا غیر ذمہ دارانہ کام انھوں نے ہی سرانجام دیا تھا۔ اب وہی ہماری دوستی سے نالاں ہیں اور گھر چھوڑ کر دوسری جگہ جا چکے ہیں اس مضمون کی زیادہ داد وہی دے سکتے تھے۔ ہم چاہتے تو یہ مضمون ڈاکٹر

سلیم اختر کی نذر بھی کر سکتے تھے۔ نذر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جس زمانے میں وہ ہم سے خوش تھے تو وہ ہمیں اپنے سچے دوستوں میں شمار کرتے تھے۔ ہم نہ بھی کہتے تو ہماری کتاب پر فلیپ لکھ کر پبلشر کے حوالے کر آتے اور اتنا جھوٹ لکھتے اتنا مبالغہ کرتے کہ ہم خود شرمندہ ہو جاتے اور درخواست کرتے کہ خدا کے لیے اپنا فلیپ واپس لے لیجئے لیکن وہ شماتت ہمسایہ کی پروا نہ کرتے۔ اور فلیپ چھپوانے پر اصرار کرتے۔ ناراض ہو جاتے تو ہمارا دیباچہ اپنی کتاب سے خارج کر دیتے اور اپنی بدترین "تاریخ ادب اردو" سے ہمارا نام کھرچ کھرچ کر مٹا دیتے، اپنے دوستوں کی فہرست سے ہمارا نام خارج کر دیتے۔

ان دنوں ہم سلوک کی اسی منزل سے گزر رہے ہیں، اس لیے ہمارا اندازہ ہے کہ سلیم اختر صاحب ارشد میر کے مضمون کا مزا نہیں اٹھا سکیں گے۔ لیکن ہم بھی ارشد میر چونکہ رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری جنرل ہیں اس لیے ڈاکٹر صاحب ان کے سامنے مسکرانا بھی ان کی توہین سمجھتے ہیں۔ اسے حد ادب کی مثال سمجھئے۔

فکر تونسوی مرحوم کا مضمون "کلچرل کی کھونٹی" ہم نے ڈاکٹر وزیر کو پیش کر دیا ہے۔ حقدار تو اس کے ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب تھے لیکن وہ ان دنوں فیض احمد فیض پر یادگاری مقالہ پڑھنے کے لیے لندن گئے ہوئے ہیں، وہ واپس تشریف لائے تو ہم ان کی خدمت میں، قدیم ترین تذکرہ دبستان سرگودہا پیش کر دیں گے۔ یہ تحقیقی مضمون ہے اور اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہمارا لکھا ہوا ہے۔ اس مضمون کی تحقیق میں جو ہم نے خود جوکھم اٹھایا ہے اس کی داد ہم ڈاکٹر جمیل جالبی سے لیں گے۔ یہ مضمون ہم نے دانستہ مشفق خواجہ کی نذر نہیں کیا حالانکہ وہ بھی ہمارے پائے کے ادیب ہیں اور شاید دنیا کے واحد محقق ہیں جنھوں نے کرم خوردہ کتابیں اور گڑے مردے اکھاڑنے کے بجائے زندہ لوگوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کا کام سنبھال لیا ہے ایک مردے کو ہم زیر زمین آتا سنتے ہیں، تو خواجہ صاحب کسی اور ادیب کا سر قلم کر ڈالتے ہیں پچھلے دنوں پہلے شکور حسین یاد کی شاعری کی گردن ان کے زیر قلم آئی پھر ملک حسن اختر کی تحقیق کی گردن کٹ گئی اور اب راغب شکیب اپنا سفرنامہ "سفر ہم سفر" چھپوانے پر شرمندہ ہیں۔ اور کشتوں کے پشتے میں اپنا سر تلاش کر رہے ہیں۔

ادھر لاہور میں تو باقاعدہ انسداد دہشت گردی کے لیے کانفرنسیں اور مذاکرے منعقد ہو رہے ہیں۔ کبھی اورنگ زیب بلاک میں، کبھی نرسنگ داس گارڈن میں ایک بندۂ گستاخ کا منہ بند کرانے کے منصوبے بن رہے ہیں ان منصوبوں، بازوں کی خدمت میں ہم نے "چلنیجر برائے زوجت" اپنی جیب سے دام ادا کر کے پیش کر دیا ہے۔ جمیل آذر کا مضمون، فرسٹ کلاس سلیپر ہم نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کے سپرد کیا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ وہ ہاتھ کے سلیپر اور ریلوے کے سلیپر میں کوئی امتیاز نہیں کرتا۔ اور اب یہ مضمون پڑھنے کے بعد ہر وقت مسکراتا رہتا ہے۔

جیلانی اصغر صاحب نے اپنے بہجت افزا خطوط میں جمیل یوسف کو عشق کرنے کے آزمودہ نسخے بتائے ہیں یہ نسخے خود ہمارے لیے بھی مفید ہیں۔ دسمبر میں ہمارا ریٹائرمنٹ ہو رہی ہے اس کے بعد ہمیں عشق کرنے اور مچھر مارنے کی فرصت ہو گی مچھروں کو ابھی سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ ادھر ادھر بھاگتے نظر آتے ہیں لیکن طبقہ نسواں کا ہم پر اعتماد بڑھ رہا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ ہمارا گنج گراں مایہ تصویر میں تو صاف نظر آتا ہے لیکن اسے ہم ہر وقت ٹوپی میں چھپائے رکھتے ہیں۔ اپنی سفید کنپٹیوں کو نکھار رکھتے ہیں انھیں خضاب سے بھی آلودہ نہیں کرتے۔ بس اسی عمل سے ہمارا اعتماد طبقہ نسواں پر قائم ہو جاتا ہے اور بہت جوان نظموں اور رومانی غزلوں کا مواد مل جاتا ہے مطلوبہ زحمت اٹھانا نہیں

پڑتی اس عمل میں غلام جیلانی اصغر کا مضمون بہت مدد دیتا ہے۔ آپ کا جی چاہے تو آزما دیکھئے لیکن واضح رہے کہ یہ مضمون انھیں لوگوں کے کام کا ہے۔ جن کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہے۔

حضرات بدرجہ تمام ہوا اور مسکراہٹوں کی تقسیم کا عمل جاری ہے۔ ہمارے پاس "اردو پنچ" کے بہت سے مضامین بچ گئے ہیں۔ آپ کا ارادہ مسکرانے کا ہو تو ہم سے بلا قیمت طلب کیجئے، ڈاک کا خرچ بھی ہم خود ادا کریں گے۔ اور اگلے ہفتے آپ کو "شگوفہ" کے ذکر میں شامل کریں گے۔

روزنامہ "حریت" (پاکستان) سے

محمد یوسف الدین خاں
(لندن)

حبیب حیدرآبادی کی نثری تصانیف

ایک جائزہ

"گزشتہ تیس برس سے ہم برطانیہ میں مقیم ہیں۔ ہماری زندگی کے بہترین اور مثالی گناہ اسی سرزمین پر سرزد ہوئے" یہ ہیں حبیب حیدرآبادی۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان کی تحریروں کی روشنی میں ان کی شخصیت پر گفتگو کروں۔ دراصل ان کے اس اعترافِ گناہ کے بعد اب ان کا نامۂ اعمال دیکھنے اور دکھانے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ ویسے بھی نامۂ اعمال کھولنے کے لیے گھر کا بھیدی داورِ محشر سے کچھ کم نہیں ہوتا۔ اقبال نے داورِ محشر کو رازداں[1] بنایا اور رسوائی مول لی لیکن یہ رازداں کم از کم ان پردہ نشینوں[2] کے ناموں کو راز ہی میں رکھے گا جو ان کے نامۂ اعمال میں آتے ہیں۔

آپ نے بارہا سنا ہوگا کہ فلاں کی شخصیت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ حبیب کے بارے میں شاید اس کا برعکس اظہار زیادہ درست ہوگا۔ ان کی تصانیف ان کی شخصیت کی بھرپور آئینہ دار ہیں۔ ان کے تحریر کردہ ہر ہر لفظ اور ہر ہر فقرے سے ان کی شخصیت عیاں ہے۔ ان کی تصانیف کا جب ذکر ہو تو ان کی پہلی تصنیف "انگلستان میں" کو نظرانداز کرنا مناسب نہ ہوگا۔ اس میں ان کا مضمون "اپنے بارے میں" ملاحظہ فرمائیے کس بے باکی و جرأت کے ساتھ انھوں نے صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ نہ شرم نہ خفت اور نہ ہی کوئی ذہنی تحفظ۔ اپنے بارے میں سب کچھ کس مزے سے کہہ ڈالا۔ ہم لوگوں میں کتنے ہی ایسے ہیں جنھوں نے دنیا بھر کی تکلیفیں اٹھائیں، مصیبتیں جھیلیں اور محنت مزدوریاں کیں۔ لیکن یا تو اپنے اس ماضی پر خفیف ہیں یا پھر اپنے حال کی سنہری گرد میں اس کو چھپا دیا۔ حبیب نے صرف ایک ہی بات راز میں رکھی، اور آج میں اس بھری بزم میں وہ راز کی بات کہنے کی بے ادبی کر رہا ہوں۔ انھوں نے جب ناٹنگھم NOTINGHAM چھوڑنے کا فیصلہ کیا تو اس مسکین طبع حبیب نے تلاشِ بسیار کے بعد ایک ایسی جگہ ڈھونڈھ نکالی جو ان کے مزاج اور طبیعت سے مناسبت رکھتی تھی، اس جگہ کا نام مسلیم روڈ تھا۔

بے محل نہ ہوگا اگر "انگلستان میں" کے ایک اہم باب "آصف سابع" کے بارے میں دو چار فقرے عرض کروں۔

---

[1] عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی۔ داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں۔

[2] داورِ محشر مرا نامۂ اعمال نہ دیکھ ۔ اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

جہاں تک میں واقف ہوں حبیب پہلے جراءت مند اور شریف الطبع انسان ہیں جنھوں نے آصفِ سابع کو اس طرح کھلے عام خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ورنہ تو آصفِ سابع کو برا بھلا کہنا پچھلے چالیس سالوں سے مذہبی وظیفہ کے طور پر انجام دیا جارہا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم ہوں کہ ان کی بدحالی ہو۔ ان کی تمام تر ذمہ داری ان لیڈروں پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے مسلمانوں کی نمائندگی کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ نہ کہ آصفِ سابع پر۔ حضرت عیسیٰ نے تمام انسانوں کے گناہوں کو اپنے سر لیا تھا یا نہیں یہ ایک اختلافی موضوع ہے، لیکن آصف سابع نے کتنے ہی لیڈروں کے گناہوں کو اپنے سر لے لیا اور بقول حبیب کے اپنی صفائی میں کچھ کہنا اپنی شان کے خلاف سمجھا۔
اس تصنیف کے صفحات سے جھلکنے والی حبیب کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور اس کی کئی تہیں ہیں۔ یہ ایک شریف اور ذمہ دار شوہر، شفیق باپ، سعادت مند اولاد و شاگرد اور ایک اچھے اور مخلص دوست ہونے کے علاوہ یہ اپنی زندگی کے آپ معمار ہیں اور تارکینِ وطن کے لیے ایک خاموش رہنما۔ حسرت نے جیل میں کہا تھا کہ

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی ۔ اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

لیکن حبیب نے چکی کی مشقت سے زیادہ سخت مشقت کی اور نہ صرف مشقِ سخن جاری رکھی بلکہ سخن کی محفلوں کو آراستہ کیا۔ اس ملک میں اردو کی بقاء کے لیے حبیب نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں وہ ایک ضخیم کتاب کا موضوع بن سکتے ہیں۔
یہ بات اکثر سامعین کے لیے باعثِ حیرت ہوگی کہ ان کی ایسی تمام خدمات کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ وہ اپنی ذات سے ایک وسیع انجمن ہیں۔ اردو کی تعلیم و ترویج کے لیے خاموشی سے جتنی ٹھوس خدمات انجام دی ہیں وہ شاید انجمنوں کے بھی بس کا روگ نہیں۔ برس ہا برس تک یہ ہر سال مختلف عمروں کے طالب علموں کے، ان کی عمر اور تعلیمی لیاقت کے مطابق، تحریری مقابلے کرواتے رہے اور اپنے ہی خرچ سے ان مقابلوں کی ملکی سطح پر تشہیر بھی کروائی اور انعامات بھی دیئے۔ یہ بات میں اس وثوق سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ کئی سالوں تک میں نے ان مقابلوں میں 'حکم' کا رول ادا کیا ہے۔ اردو مرکز، اردو مجلس، انجمن ترقی اردو برطانیہ، بزمِ اقبال، بزمِ فیض اور نہ جانے کتنی ایسی انجمنیں ہیں جو اردو کے ادیبوں اور دانشوروں کے مراکز کے طور پر کام کر رہی ہیں لیکن یہ تمام انجمنیں تو حال کی قائم کردہ ہیں ان انجمنوں کے قیام سے پہلے مقامی ہوں کہ مہمان، ادیبوں اور دانشوروں کا ایک ہی مرکز تھا۔ حبیب کی قیام گاہ۔ اردو کے ہر بڑے ادیب و دانشور کے اعزاز میں ان ہی کی قیام گاہ پہ تقریبیں اور محفلیں ہوتی تھیں۔ ان تمام محفلوں اور تقریبوں کے پیچھے نہ تو آرگنائزیشن کا ہاتھ ہوتا تھا اور نہ کسی کونسل کی پشت پناہی ان کے لیے نہ کبھی چندہ اکٹھا ہوتا اور نہ ہی عطیات وصول کیے جاتے تھے۔ اپنی زبان اور ادب سے ان کی یہ وابستگی اس وقت بھی اتنی ہی گہری تھی جس وقت وہ شب و روز سخت مشقت کیا کرتے تھے۔ حالات کا ہمیشہ ثابت قدمی سے مقابلہ کرتے رہے اور وضع داری میں کبھی فرق آنے نہ دیا۔ اردو کی اس قدر لاجواب لائبریری کہ بڑی انجمنیں بھی رشک کرتی ہیں۔ اس لائبریری میں، ادب، فلسفہ، تاریخ اور مذہب پر اس قدر ذخیرہ موجود ہے کہ پڑھنے والا برسوں گذار دے لیکن کتابیں ختم نہ ہوں۔ حبیب نے اپنی معاشی جد و جہد کا آغاز ایک مزدور کی حیثیت سے کیا اور کشاں کشاں اپنی زندگی کا سفر مکمل کر رہے ہیں۔ اس سفر میں کئی مقامات ایسے آئے جن پر شاید منزل کا دھوکہ ہو سکتا تھا لیکن حبیب نے ان مقامات کو غبارِ راہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی یا زیادہ سے زیادہ انھیں سنگِ میل سمجھا کیونکہ ایسے لوگ اپنی تمنا کی تکمیل سمجھتے ہیں۔ انکی تمنا کے قدم ہمیشہ آگے کی طرف ہی بڑھتے ہیں۔ اس ملک میں تارکینِ وطن کا وقار جن لوگوں نے

نے بلند کیا اور تارکینِ وطن کو معتبر بنایا ان میں حبیب کا نام پیش پیش ہے۔ ان کی استقامت اور ثابت قدمی ہماری اور ہماری آنے والی نسل کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے گی۔

حبیب کے بارے میں ابھی جو باتیں میں نے عرض کیں ان کی گواہی حبیب کی تصانیف دیں گی۔ بہت کم نثر نگار ایسے ہیں جن کی تحریریں پڑھ کر ان کی شخصیت کا اتنا مکمل نقشہ آپ کے ذہن میں بنتا ہو۔ حبیب کے وہ احباب جو ان کی تصانیف سے بے خبر ہیں اگر رسم و رہِ آشنائی کا مطالعہ کریں تو بے ساختہ کہہ دیں گے کہ یہ تحریر بہ حرف حبیب ہی کی ہو سکتی ہے۔ وہ طبعاً ظریف ہیں، ان کی شخصیت کو ان کی ظرافت سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ جب وہ خاکے نہیں لکھتے تھے تب بھی یہی کچھ باتیں کیا کرتے تھے جواب رقم کرتے ہیں اس موقع پر ایک واقعہ کا بیان بے محل نہ ہوگا اور آپ اندازہ کر سکیں گے کہ رسم و رہِ آشنائی کے مصنف اور روز مرہ کے حبیب میں سرِ مو اختلاف نہیں ہے۔ کینیڈا جاتے ہوئے میری ساس صاحبہ نے دو ماہ کے لیے میرے ہاں قیام کیا تھا۔ حبیب ان سے ملنے کے لیے حاضر ہوئے۔ عقیدت و احترام کے ساتھ آداب کیا اور ان کی دعائیں لیں۔ میری ساس صاحبہ ایک خاموش مزاج، سیدھی اور نیک خاتون ہیں، میری بیوی کے برعکس سینکڑوں خوبیوں کی مالک۔ بعد از سلام حبیب نے سب سے پہلی بات جو کی وہ یہ کہ "خالہ جان جہاں آپ قیام فرمائی تھیں اس کے قریب میں کوئی باؤلی یا کنواں نہیں تھا؟" انھوں نے جواب دیا "کیوں بابا۔ ایک باؤلی تو خود ہمارے گھر ہی میں تھی"۔ "تو پھر خالہ جان اپنی بیٹی کو اس میں ڈھکیل دیا ہوتا۔ اپنی بیٹی کو یوسف کے حوالے کرنے سے تو کچھ بھی بہتر ہوتا"۔ ایک سیدھی سادی نیک خاتون ایک اجنبی ملک میں پہلی بار اپنی بیٹی اور داماد کے گھر جائے اور وہاں داماد کے عزیز دوست اس طرح معروض ہوں تو اس خاتون پر کیا گزرے گی آپ ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

کہتے ہیں اب زمیں یہ کہاں آسماں نہیں

حبیب کے خاکے "انجمنِ انسدادِ بے رحمی شوہراں" "ہماری ہجرت"، "ہماری شاعرہ بیگم صدیقہ"، یا پھر کوئی اور خاکہ ایک عام قاری کے لیے ظرافت کا عمدہ نمونہ ہو سکتا ہے لیکن حبیب کے دوست جانتے ہیں کہ ان خاکوں کے ایک ایک لفظ کے پیچھے خود حبیب کی ہنستی ہوئی شخصیت موجود ہے۔ حبیب فطرتاً ایک بے حد حساس اور ظریف انسان ہیں۔ وہ ظریف ہیں اس لیے بے حد حساس ہیں اور حساس ہونے کی وجہ سے زندگی اور اپنے ماحول کی بے ڈھنگیوں اور ناہمواریوں کا شعور رکھتے ہیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہتے ہیں اور خوش رہنا جانتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ دوسروں کو خوش رکھنا بھی ان کی زندگی کا ایک نصب العین ہے۔ یہ اپنے کردہ گناہوں کو یاد کر کے خوش ہوتے ہیں اور ناکردہ گناہوں پر بھی اتنے ہی مسرور رہتے ہیں، دوستوں کو خوش دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، عزیزوں کا سکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، اچھی موسیقی سن کر خوش ہوتے ہیں، اچھا شعر سن کر خوش ہوتے ہیں، کھا کر خوش ہوتے ہیں، کھلا کر خوش ہوتے ہیں اچھی صورت اور ریکھا کے ناچ دیکھ کر کچھ زیادہ ہی خوش ہوتے ہیں۔ جہاں حسینوں کا جمگھٹ دیکھا۔ "چیزیم نیست ورنہ خریدارِ ہر ششم" والی کیفیت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر بات میں ظرافت اور مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتے ہیں۔ حبیب طبعاً ایک صوفی مزاج، سادہ منش اور مرنجاں مرنج قسم کے انسان ہیں انھیں اصلاحِ اہلِ ہوش کا یارا نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں تلخی اور طنز کا زہر نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس شوخی اور ظرافت ہے۔ ان کی تحریروں میں طنز کی زہرناکی نہیں بلکہ مزاح و ظرافت کی گل افشانی ہے۔ ان کی تحریروں میں

بے شمار مقامات ایسے ملیں گے جہاں طنز کے نشتر ڈوب کر مزاح و ظرافت کے نگینے بن گئے اور اگر کہیں طنز کیا بھی ہے تو بہت ہلکا سا جو اکثر و بیشتر استہزاء سے آگے نہ بڑھ سکا۔ کلیجہ کاٹ کر رکھ دینا حبیب کے مزاج کے خلاف ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں: آج کل تو ناچ گانے اور موسیقی کے لیے بھی اسکول قائم ہو گئے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تک ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ صرف شاعری ہی ایسی یتیم صنفِ ادب ہے جس کا کوئی وارث نہیں۔ جس کا جی چاہے اس پر ہاتھ صاف کرے۔ شاعری کے لیے تو نہ علم کی قید ہے اور نہ ہی تجربے کی۔ بس سر میں سودا سما جائے یہی کافی ہے۔ اسی لیے اردو دنیا میں شاعروں کی بہتات ہے۔" یہاں تک تو ہلکا پھلکا ہی سہی اچھا خاصا طنز تھا لیکن حبیب کی اعتدال پسند طبیعت اس طنز کے زہر کو ظرافت کا تریاق دے کر ایک خندۂ زیرلبی کی شکل عطا کرتی ہے۔ آگے کہتے ہیں اور اردو ادب کی اس افراتفری سے فایدہ اٹھاتے ہوئے ہم بھی چپکے چپکے شعر کہتے رہتے ہیں اور ہماری بیگم ہم سے کہتی رہتی ہیں کہ آخر آپ شاعری کیوں کرتے ہیں۔ یا پھر اسی انشائیہ میں طنز ملیح کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے:

"تعلیم کے فقدان کی وجہ سے ہر شخص شاعری کی طرف مائل تھا۔" "ہماری ہجرت" نہایت دل چسپ اور شگفتہ خاکہ ہے کہتے ہیں "ہمارے اپنے وطن میں ہمارا اپنا مکان تھا۔ ملازمت تھی، ماں باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، دوست احباب ہم کو قرض دے کر ہم سے دعوتیں کھانے والے، ہم سے قرض لے کر روپوش ہونے والے۔ ان سب کو چھوڑ چھاڑ کر ہم لندن جیسی اجنبی سرزمین پر پہنچ گئے۔ یہاں حبیب گہرا طنز بھی کر سکتے تھے لیکن یہ بات ان کے مزاج کے خلاف ہے مرہم رکھنے والا زخم نہیں دے سکتا۔ حبیب کا کام تو صرف مسرور رہنا اور خوشیاں بانٹنا ہے مسرور رہنا اپنے وسیع تر مفہوم میں زندگی آزمائی ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں: "لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں لیکن نہیں جانتے کہ یہاں سب سے بڑا کام خود زندگی ہے۔ یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا" یہی نہیں ایک فرانسیسی مفکر" تو خوشی کو محض احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک بڑی اخلاقی ذمہ داری قرار دیتا ہے! اپنی اس اخلاقی ذمہ داری کو کس طرح نبھاتے ہیں اس کی دو تین مثالیں ملاحظہ ہوں: ۱۹۷۴ء کی بات ہے۔ حبیب اپنا مکان فروخت کر رہے تھے اور میں بھی اسی ایڈمبرا میں تھا۔ ان دنوں مکانات کی فروخت نسبتاً کم آسان تھی۔ تاخیر کے سبب ہم ایک دوسرے کو دم دلاسا دیا کرتے تھے۔ میرا اصرار تھا کہ وہ اپنے مکان کو تھوڑے بہت نقصان ہی سے سہی جلد فروخت کر دیں۔ انسان کو بے شک منکسر ہونا چاہیے اور طبیعت کا مسکین بھی لیکن اس کے لیے مسکین روڈ میں جا کر رہنا کچھ ضروری نہیں۔ ایک دن فون پر کہا کہ "یوسف امید کی کرن نظر آ رہی ہے" میں نے پوچھا کہ "کیا کوئی خریدار ملا ہے" کہنے لگے "نہیں۔ میں نے چند مکانات پر SOLD کے بورڈ دیکھے ہیں" میں نے کہا "اس سے کیا ہوتا ہے" کہنے لگے "خوشی ہوتی ہے۔ چند دن پہلے تو SOLD کے بورڈ ہی نظر نہیں آتے تھے۔ اب کم از کم نظر تو آ رہے ہیں۔ دوسروں کے گھروں پر ہی سہی SOLD کے بورڈ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ آج وہاں بورڈ لگا ہے کل اپنے ہاں بھی لگ جائے گا۔ آج وہ کل ہماری باری ہے" اور پھر ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی میں شامل ہونے کے بجز میرے لیے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک اور واقعہ بھی کافی دل چسپ ہے حبیب سے میری پہلی ملاقات کسی اور سرسری قسم کی ہوئی تھی۔

یعسوب صاحب حبیب کے ہم سفر بلکہ ہم جہاز تھے (بحری جہاز) جب یہ دونوں انگلستان آ رہے تھے تو

اس وقت دوران سفر سمندر میں زبردست ہلچل کی وجہ سے تقریباً تمام ہی مسافر بیمار ہو گئے۔ حبیب کے خیال میں صرف یہ اور یعسوب ہی دو ایسے مسافر تھے جن کا سفر حلال کی کمائی پر ہو رہا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے انھیں اس بیماری سے محفوظ رکھا۔ ایک موقع پر تو ڈائننگ ہال میں شاید یہ دو ہی تھے اور باقی ہال خالی تھا حبیب کے خیال میں ڈائننگ ہال اس وقت نہایت ہی بارونق نظر آ رہا تھا۔ خوب کھاتے تھے اور لوگوں کی حالت زار کو دیکھ کر ہنس ہنس کے پاگل ہوتے تھے۔ یہی طرز حبیب کا رسم و رہ آشنائی میں بھی ہے ہر بات میں ظرافت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ ہر واقعہ میں سے ہنسی کے لیے کچھ نہ کچھ صورت پیدا کر لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو کھلے عام غالبی کہنے سے گھبراتے ہیں اس کے باوجود ان کے ہاں غالب کی ظرافت کی جھلکیاں مل جاتی ہیں:

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں یارب ؎ سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غالب کی اس طرح کی شوخی و ظرافت حبیب کی نثر میں ہمیں جابجا ملتی ہے۔ غالب کی ظرافت کی طرح حبیب کی ظرافت کو ایک خندۂ زیر لبی کہا جا سکتا ہے ان کی نثر پڑھ کر قاری مسکراتا ہے اور اکثر کھلکھلا کر ہنس دیتا ہے۔ پاگلوں کی طرح قہقہے نہیں لگاتا۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کے مزاح کی کوالٹی کمتر ہے بلکہ صرف اس لیے کہ بعض دفعہ مزاح میں شدت بھی کسی نہ کسی کی دل شکنی کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ اس طرح کے مزاح کو پورے مضمون یا خاکے پر پھیلانا اتنا آسان نہیں ہے۔ قہقہوں والا مزاح وقفہ وقفہ سے آتا ہے اس کے برعکس حبیب کے مزاح سے پیدا ہونے والا تبسم دیرپا ہوتا ہے جو خاکے کے اختتام تک جاری رہتا ہے اور یہ حبیب کا خاص آرٹ ہے۔

حبیب کی نثر کی ایک خاص خوبی اور بھی ہے۔ ان کے انشائیے جہاں فن کے معیار پر پورے اترتے ہیں وہیں ان میں مجلسی گفتگو کا لطف و رنگ بھی موجود ہے۔ کسی بھی انشائیے کو ملاحظہ فرمائیے یوں لگتا ہے کہ آپ کسی محفل میں حبیب سے محو گفتگو ہیں۔ وہی برسبیل تذکرہ شگوفے کبھی کبھی موضوع سے ذرا سا گریز اور ایک آدھ لطیفے کے بعد دوبارہ موضوع پر آجانا، لفظوں کی جادوگری لیے ڈھنگیوں کا بے تکلف اظہار یہ کیفیتیں جہاں ان کی محفلوں کی ہیں وہیں یہ ان کی تحریروں میں بھی موجود ہے۔ ان کا انشائیہ "ہماری وضع داری" ملاحظہ فرمائیے۔ سعادت مند اولاد، مخلص دوست معقول انسان اور کامیاب شوہر بننے کے سارے ہتھکنڈے کس وضع داری سے بیان کیے ہیں۔ انشائیے کو مجلسی گفتگو اور مجلسی گفتگو کو انشائیہ کا رنگ دینا حبیب کا خاص آرٹ ہے اور یہ خوبی انھیں اردو کے مزاح نگاروں میں ایک منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ اور کمال کی بات تو یہ ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری کی عمر کو دنوں میں گنا جا سکتا ہے۔

حبیب کی دوسری کتاب برطانیہ کی سیاسی جماعتیں اور پارلیمنٹ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اپنی اس کتاب میں حبیب نے اس ملک کی سیاسی جماعتوں کی مکمل تاریخ ان کے وجود میں آنے کے اسباب و محرکات ان کی آپسی سیاست اور خود انگلستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے نشیب و فراز کی ساری داستان نہایت خوش اسلوبی سے دہرادی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان تمام شخصیات کے بارے میں بھی ڈھیر ساری معلومات فراہم کر دی ہیں جن کے اثرات سے یہاں کی سیاسی جماعتیں اور سیاسی و سماجی زندگی خمیدہ پشت رہی ہے۔ یہ کتاب نہیں بلکہ اپنے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ حبیب بلا شبہ چھپے رستم نکلے۔ اس کا اندازہ ہی نہیں ہونے دیا کہ انھوں نے اتنی ساری

معلومات کس طرح اکٹھا کریں۔ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک عام تعلیم یافتہ انگریز کو بھی شاید اس موضوع پر اتنی معلومات نہیں ہیں جس قدر کہ انھوں نے اپنی کتاب میں اردو دانوں کے لیے فراہم کی ہیں۔ موضوع اور اس کی وسعت کے پیش نظر آپ شاید یہ توقع کریں گے کہ اس کتاب کی زبان شاید پروفیسر مجیب کی زبان ہوگی یا اس کا انداز ڈاکٹر حمید اللہ کا انداز ہوگا۔ لیکن کمال یہ ہے کہ یہاں بھی وہی ان کے انشائیوں کا اسٹائل اور وہی مجلسی گفتگو کے انداز ملیں گے۔ اس کتاب میں کہیں بھی وہ علم سیاسیات کے مبصر کے طور پر نہیں اُبھرتے اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی یہ کتاب بھی اسی قبیل کی دوسری کتابوں کی طرح یا تو طاقوں میں سجادی جاتی یا پھر کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بنی رہتی۔ لیکن اس کتاب کا ہر باب ایک انشائیہ ہے اور انشائیہ کوئی محدود صنفِ ادب نہیں ہے۔ خاک کے ذرّوں سے لے کر فلک کے ستاروں تک ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے صرف چند مثالیں اپنے اس بیان کی تصدیق کے لیے دوں گا۔ ڈزرائیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ڈزرائیلی پیدائشی یہودی تھا، ناول نگار تھا، انتہائی ذہین تھا اور سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ ابن الوقت تھا"۔ ڈزرائیلی پر بھر مار تھی دشناموں کی کہ اچانک مسز تھیچر کے جاپان کے سفر کا قصہ نکل آیا۔ کوئلے کے کانوں کے مزدوروں کی ہڑتال کا ذکر کرتے ہوئے جملۂ معترضہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ "یہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور مسز مارگریٹ تھیچر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں اپنی چھٹیاں منا رہی تھیں"۔ ڈگلس ہوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "خاموش شرمیلے، وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی موجودہ صدی کی سیاست ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے سینے پر سوّر کا بال نہیں تھا"۔ مارگریٹ تھیچر کے باپ کی گروسری کی دوکان کا ذکر بھی کچھ اسی طرح کرتے ہیں کہ جیسے وہ کوئی پاک فوٹو اسٹور رہی ہو پھر موقع سے فایدہ اُٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وزارتِ عظمیٰ کو حاصل کرنے میں ان کی خاندانی و پیدائشی گروسرانہ ذہنیت اور رویّہ کا بڑا دخل رہا ہے۔ آگے چل کر اپنے خاص انداز میں اپنی برہمی کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ "عام عورتوں کی طرح وہ بھی ایک ضدی عورت ہیں۔ اپنے شوہر کو اپنے پیچھے پیچھے لیے پھرتی ہیں۔ ایک سطر اور آگے بڑھیے TYPICAL حبیب یہاں اس طرح جلوہ گر ہیں: اپنی نسوانی خصوصیات کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے ایڈورڈ ہیتھ جیسے مقبول اور کارگزار کنزرویٹیو کو خانہ نشین کر دیا۔ غرض اس طرح کے شگفتہ فقروں سے کتاب بھری پڑی ہے پوری کتاب میں حبیب نے کہیں بھی آپ کو INDOCTRINATE کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے تبصرے ہمیشہ آپ کو ان کی ذاتی رائے کی شکل میں ملیں گے۔ نہ وہ آپ کو EAD کرتے ہیں اور نہ ہی آپ پر مسلّط ہوتے ہیں۔ البتہ ایک بات کھٹکتی ہے۔ برطانیہ کے سیاسی افق پر نمودار ہونے والے واقعات میں کبھی کبھی ایسے اسکنڈل بھی آئے جن سے پارٹیوں کے امیج پر گہرا اثر پڑا ہے ایسا ہی ایک اسکنڈل جان پروفیومو اور کرسٹین کیلر کا تھا اور حیرت اس بات کی ہے کہ حبیب یہاں سے سرسری گزر گئے حالانکہ وہ تو ایک جہانِ دیگر تھا اس واقعہ کی تفصیل میں زیبِ داستاں کے لیے کیسے کیسے نام آ سکتے تھے۔

حبیب کو حبیب بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ صدیقہ کا ہے حبیب جیسے اڑیل انسان کے ساتھ اس قدر کامیاب زندگی گزارنا صدیقہ کا کمال ہے ہر ہر موقع اور ہر ہر مقام پر صدیقہ نے حبیب کو جس طرح سہارا دیا، ان کی پشت پناہی اور ہمت افزائی کی وہ لائقِ تحسین ہے۔ یہ کہنا شاید درست ہوگا کہ حبیب صدیقہ کا شاہکار ہیں۔ حبیب کی

تحریروں میں "ہماری بیگم" کا ذکر بہت ملے گا۔ اس ذکر سے مزاح بھی کافی پیدا کیا گیا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے مزاح نگاروں کا تو یہ وطیرہ رہا ہے کہ مزاح کی تخلیق کے لیے ایک خاص کردار کی تخلیق کر لیتے ہیں ان کرداروں کا فرضی ہونا بھی کچھ ضروری نہیں بلکہ اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ کردار اصلی ہوتے ہیں اور مزاح نگار ان کرداروں کو اپنے مقصد کے لیے بڑی فنکاری اور مہارت سے استعمال کرتے ہیں اردو میں مرشد، مرزا، عبدالودود، شیطان اور حکومت آپا وغیرہ جیسے کرداروں کے علاوہ حبیب کا کردار "ہماری بیگم" ایک نہایت ہی خوشگوار اضافہ ہے۔

ان دونوں اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کے لیے میں بھائی حبیب کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور شکر گزار بھی ہوں کہ انھوں نے ان کتابوں کے ذریعہ ہمیں ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کیے اور ایک بہت ہی بڑی سماجی خدمت انجام دی ہے۔

نذیر دہقانی (مرحوم)

○

میرے ہر شعر میں جو "سکتا" ہے گا کو پڑھنے سے عیب ڈھکتا ہے
نکتہ چیں میرے منہ کو تکتا ہے بڑبڑاتا ہے، کیا کیا بکتا ہے

اس کی حالت پہ مسکرا دیتا ہوں
ایک تازہ غزل سنا دیتا ہوں

○

رات بھر محفلوں میں گاتا ہوں گھر کو پیدل اکیلے جاتا ہوں
میں غزل گانے جب بھی کھڑا جاؤں پھر تو جھنڈے کے سر کا گڑ جاؤں

○

ڈاکٹر دل کا حال دیکھا تو چھٹے پڑ گئے سوگال دیکھا تو
سکتے رگوں کا جال دیکھا تو دھیمی ناڑی کی چال دیکھا تو

اس کا خود ہارٹ فیل ہو جاتا ہے
ایک حباندہ کا کھیل ہو جاتا ہے

معلومات کس طرح اکٹھا کریں۔ یہ بات دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ایک عام تعلیم یافتہ انگریز کو بھی شاید اس موضوع پر اتنی معلومات نہیں ہیں جس قدر کہ انھوں نے اپنی کتاب میں اردو والوں کے لیے فراہم کی ہیں۔ موضوع اور اس کی وسعت کے پیشِ نظر آپ شاید یہی توقع کریں گے کہ اس کتاب کی زبان شاید پروفیسر مجیب کی زبان ہوگی یا اس کا انداز ڈاکٹر حمید اللہ کا انداز ہوگا۔ لیکن کمال یہ ہے کہ یہاں بھی وہی ان کے انشائیوں کا اسٹائل اور وہی مجلسی گفتگو کے انداز ملیں گے۔ اس کتاب میں کہیں بھی وہ علم سیاسیات کے مبصر کے طور پر نہیں ابھرتے اگر وہ ایسا کرتے تو ان کی یہ کتاب بھی اسی قبیل کی دوسری کتابوں کی طرح یا تو طاقوں میں سجا دی جاتی یا پھر کتب خانوں کی الماریوں کی زینت بنی رہتی۔ لیکن اس کتاب کا ہر باب ایک انشائیہ ہے اور انشائیہ کوئی محدود صنفِ ادب نہیں ہے۔ خاک کے ذرّوں سے لے کر فلک کے ستاروں تک ہر چیز انشائیہ کا موضوع بن سکتی ہے صرف چند مثالیں اپنے اس بیان کی تصدیق کے لیے دوں گا۔ ڈزرائیلی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ڈزرائیلی پیدائشی یہودی تھا، ناول نگار تھا، انتہائی ذہین تھا اور سونے پر سہاگہ یہ تھا کہ ابن الوقت تھا۔" ڈزرائیلی پر بھرپور تھی دشنامول کی کہ اچانک مسز تھیچر کے جاپان کے سفر کا قصہ نکل آیا۔ کوئلے کے کانوں کے مزدوروں کی ہڑتال کا ذکر کرتے ہوئے جملۂ معترضہ کے طور پر لکھتے ہیں کہ "یہاں یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور مسز مارگریٹ تھیچر سوئٹزرلینڈ اور آسٹریا میں اپنی چھٹیاں منا رہی تھیں۔" ڈگلس ہوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "خاموش شرمیلے، وضع دار اور رکھ رکھاؤ کے آدمی موجودہ صدی کی سیاست ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ان کے سینے پر سوّر کا بال نہیں تھا۔" مارگریٹ تھیچر کے باپ کی گروسری کی دوکان کا ذکر بھی کچھ اسی طرح کرتے ہیں کہ جیسے وہ کوئی پاک فوٹو اسٹور رہی ہو پھر موقع سے فایدہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وزارتِ عظمیٰ کو حاصل کرنے میں ان کی خاندانی و پیدائشی گروسرانہ ذہنیت اور رویّہ کا بڑا دخل رہا ہے۔ آگے چل کر اپنے خاص انداز میں اپنی برہمی کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ "عام عورتوں کی طرح وہ بھی ایک فسادی عورت ہیں۔ اپنے شوہر کو اپنے پیچھے پیچھے لیے پھرتی ہیں۔ ایک سطر اور آگے بڑھیے TYPICAL حبیب یہاں اس طرح جلوہ گر ہیں: اپنی نسوانی خصوصیات کو کام میں لاتے ہوئے انھوں نے ایڈورڈ ہیتھ جیسے مقبول اور کارگزار کنزرویٹو کو خانہ نشین کر دیا۔ غرض اس طرح کے شگفتہ فقروں سے کتاب بھری پڑی ہے۔ پوری کتاب میں حبیب نے کہیں بھی آپ کو INDOCTRINATE کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے تبصرے ہمیشہ آپ کو ان کی ذاتی رائے کی شکل میں ملیں گے۔ نہ وہ آپ کو LEAD کیا کرتے ہیں اور نہ ہی آپ پر مسلّط ہوتے ہیں۔ البتہ ایک بات کھٹکتی ہے۔ برطانیہ کے سیاسی افق پر نمودار ہونے والے واقعات میں کبھی کبھی ایسے اسکنڈل بھی آئے جن سے پارٹیوں کے امیج پر گہرا اثر پڑا ہے ایسا ہی ایک اسکنڈل جان پروفیومو اور کرسٹین کیلر کا تھا اور حیرت اس بات کی ہے کہ حبیب یہاں سے سرسری گزر گئے حالانکہ وہ تو ایک جہانِ دیگر تھا اس واقعہ کی تفصیل میں زیبِ داستاں کے لیے کیسے کیسے نام آ سکتے تھے۔

حبیب کو حبیب بنانے میں سب سے بڑا ہاتھ صدیقہ کا ہے حبیب جیسے ازلی انسان کے ساتھ اس قدر کامیاب زندگی گزارنا صدیقہ کا کمال ہے ہر ہر موقع اور ہر ہر مقام پر صدیقہ نے حبیب کو جس طرح سہارا دیا، ان کی پشت پناہی اور ہمت افزائی کی وہ لائقِ تحسین ہے۔ یہ کہنا شاید درست ہوگا کہ حبیب صدیقہ کا شاہکار ہیں۔ حبیب کی

تحریروں میں "ہماری بیگم" کا ذکر بہت ملے گا۔ اس ذکر سے مزاح بھی کافی پیدا کیا گیا ہے اعلیٰ درجہ کے مزاح نگاروں کا تو یہ وطیرہ رہا ہے کہ مزاح کی تخلیق کے لیے ایک خاص کردار کی تخلیق کر لیتے ہیں ان کرداروں کا فرضی ہونا بھی کچھ ضروری نہیں بلکہ اکثر تو یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ کردار اصلی ہوتے ہیں اور مزاح نگار ان کرداروں کو اپنے مقصد کے لیے بڑی فنکاری اور مہارت سے استعمال کرتے ہیں اردو میں مرشد، مرزا، عبدالودود، شیطان اور حکومت آپا وغیرہ جیسے کرداروں کے علاوہ حبیب کا کردار "ہماری بیگم" ایک نہایت ہی خوشگوار اضافہ ہے۔

ان دونوں اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کے لیے میں بھائی حبیب کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور شکرگذار بھی ہوں کہ انھوں نے ان کتابوں کے ذریعہ ہمیں ہنسنے ہنسانے کے مواقع فراہم کیے اور ایک بہت ہی بڑی سماجی خدمت انجام دی ہے۔

نذیر دہقانی (مرحوم)

○

میرے ہر شعر میں جو "سکتا" ہے — گا کو پڑھنے سے عیب ڈھکتا ہے
نکتہ چیں میرے منہ کو تکتا ہے — بڑبڑاتا ہے، کیا کی بکتا ہے
اس کی حالت پہ مسکرا دیتا ہوں
ایک تازہ غزل سنا دیتا ہوں

○

رات بھر محفلوں میں گاتا ہوں — گھر کو پیدل اکیلے جاتا ہوں
میں غزل گانے جب بھی کھڑا ہوں — پھر تو جھنڈے کے سر کا گڑ جاؤں

○

ڈاکٹر دل کا حال دیکھا تو — سُتے پڑ گئے سوگال دیکھا تو
تختے رنگاں کا جال دیکھا تو — دھیمی ناڑی کا حال دیکھا تو
اس کا خود ہارٹ فیل ہو جاتا ہے
ایک جادو کا کھیل ہو جاتا ہے

ان پڑھ جونگیری

جیسا ہے؟...

اب کھلانے نہ کھاتے جیسا ہے
پورا سسرال آتے جیسا ہے

سیندھی خانہ بسانے جیسا ہے — جھاڑو گھر میں پھرانے جیسا ہے
نانی مہندی لگانے جیسا ہے — نانا باڑوں میں لاتے جیسا ہے۔
چوکرا اپنے واسطے لے کر — جھٹ سے اُن کو دلاتے جیسا ہے
جب سے آیا ہے دیکھو گھر داماد — گھر کے ہنڈیاں اُٹھاتے جیسا ہے
چال اکڑی ہے پھر کو ہے گردن — جا کو دوبئی کو آنے جیسا ہے
پہلے پھندے سبا کو سڑکوں پو — ہم کو مُرغا بنانے جیسا ہے
نوی چینک تو لے کو رکھا ہوں — روڈ پر کیا چلانے جیسا ہے
کالے دھندے میں پھانس کر مجھکو — منہ کو کالک لگانے جیسا ہے
روز لوٹے نکال کر جی او! — سب کو لمبا سُلاتے جیسا ہے
جان بنکو غزل کی بیٹھے ہیں — اب غزل کیا سُنانے جیسا ہے
اُن کی آنکھی میں پھول کھلنے کو — موتیا بیچ آنے جیسا ہے
ایسا نکلا ہے بڑا بن ٹھن کے — نوی دلہن کو لاتے جیسا ہے
دارُو دوزی میں ہو گئے بے دم — کیا نیا گھر بسانے جیسا ہے
کھڈے لوگاں کے واسطے کھودا — سامنے میرے آنے جیسا ہے
جن کو آسیب سب مرنے خاباں — آنگ پو اُن کے آتے جیسا ہے
لڑ کھڑا کو وہ گر کو پڑتے ہیں — تاز بن [illegible] کو آنے جیسا ہے
ہچکیاں آ رہی ہیں تھم تھم کر — آج ہم کو بلانے جیسا ہے
میری بیگم بھی بن گئی شاعر — ناک میری کٹانے جیسا ہے
چین کو بستہ بکنے پڑھنے کا — مجھے جاہل بنانے جیسا ہے
اپنا عاشق بنا کے وہ مجھکو — سوکھی کھجلی لگانے جیسا ہے
علی صائب کے بعد دکنی میں! — کون شعراں سُنانے جیسا ہے

آج ان پڑھ بھی شعر کہتا ہے
فن کو چکلے لگاتے جیسا ہے

رپورٹ

ہندپاک طنز و مزاح کانفرنس

زیر اہتمام دہلی اردو اکیڈمی

زندہ دلانِ حیدرآباد کی انجمن پچھلے ۲۵ سال سے طنز و مزاح کے نثری اجلاس، مشاعرے اور کبھی کبھار تنقیدی اجلاس کا بھی اہتمام کرتی رہی ہے۔ لیکن طنز و مزاح پر دو روزہ سیمینار کے انعقاد کا سہرا دہلی اردو اکیڈمی کے سر ہے مختلف اہم موضوعات پر سیمیناروں کے انعقاد کے اور بھی کئی "سہرے" اس اکیڈمی کے "سر" کی زینت ہیں۔ لیکن یہ اپنی نوعیت کا منفرد سیمینار تھا۔ جو ۲۴ اور ۲۵ دسمبر ۱۹۸۸ء کو غالب اکیڈمی دہلی میں منعقد ہوا۔ طنز و مزاح کے فروغ کے سلسلہ میں جو بھی ہنگامہ آرائی پچھلے بیس بائیس برسوں میں ہوئی ہے، اس کے پیچھے مجتبیٰ حسین کا نام ضرور چھپا ہوتا ہے۔ لیکن اس بار وہ "چھپے" نہ رہ سکے اور دلی کی سخت ترین سردی میں طنز و مزاح کی گفتگو سے گرمی پیدا کرنے والے دو روزہ ہندپاک طنز و مزاح سیمینار کے ڈائرکٹر بنا دیئے گئے تھے۔ اس کانفرنس سے یقیناً طنز و مزاح کے وقار اور مرتبہ میں اضافہ ہوا۔ جس کے لیے دلی اردو اکیڈمی اور اس کے صدر پروگرام کمیٹی دیوان سنیدر ناتھ (ظفر پیامی) اور سیکریٹری سید شریف الحسن نقوی خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

طنز و مزاح کانفرنس کا افتتاح جناب پی شیو شنکر مرکزی وزیر برائے انسانی وسائل نے کیا۔ جناب مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص مزاحیہ رنگ میں خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ان دنوں نہ صرف سیمینار ہوتے ہیں بلکہ سیمیناروں پر بھی سیمینار ہوتے ہیں۔ اور جو شخص زندگی بھر سیمیناروں کا مخالف رہا خود اس کو اس بار ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ تعجب یہ پیش کی گئی کہ "تمہارے آفس میں ساری زندگی کام کرو گے تو بھی ڈائرکٹر نہیں بن سکو گے۔ بہتر ہے سیمینار کے ڈائرکٹر ہی بن جاؤ"۔ جناب ظفر پیامی نے اپنی دلچسپ خیر مقدمی تقریر میں کہا کہ ہنسانے والوں کو نظر انداز کر کے ہم نے خود اپنے رونے کا انتظام کیا ہے۔ آج کے عہد میں لکھنے اور پڑھنے والے کا رشتہ اتنا گہرا ہے جتنا جتنا اصلیت کا رشتہ۔ اردو اور ہندی کے مزاح نگار دونوں زبانوں کو قریب لانے میں اہم حصہ ادا کر رہے ہیں۔ طنز و مزاح کے ذریعہ دلوں کے ساتھ دو ملکوں کو بھی قریب لانے کا کام انجام دیا جا رہا ہے۔ انھوں نے سوال کیا کہ ادب کے سرکس میں طنز کو صرف جوکر کا مقام کیوں دیا جائے؟

جناب شیو شنکر نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے کیا رنگ جما دیا ہے جس کی وجہ سے میں اس جلسے میں حاضر ہوں۔ انھوں نے بڑے شگفتہ لب و لہجہ میں اردو کی مقبولیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان نے بین الاقوامی سرحدوں کو پار کیا ہے۔ جناب ظفر حسین برنی نے صدارت کا حق ادا کرتے ہوئے ایک جاپانی مصنف کے حوالے سے کہا کہ سب سے بہتر قوم وہ ہے جس کی SENSE OF HUMOUR اچھی ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ملک میں طنز و مزاح کو ابھی تک وہ مقام اب تک نہیں ملا ہے۔ امریکہ میں ٹی وی پر ۱۵ ۲۴ چینلوں پر پروگرام پیش ہوتے ہیں

جس میں اکثر تفریحی نوعیت کے ہوتے ہیں ۔ جبکہ ہمارا ٹی وی کھولئے تو صبح سے ہی کوئی نہ کوئی "رونا" چلتا رہتا ہے۔ اُنھوں نے یہ بھی شکایت کی کہ ہند و پاک مزاح نگاری کی "بیڑی" میں شل کمزور ہوتے جارہے ہیں۔ شوکت تھانوی کے بعد مزاحیہ ناول نگاری پر توجہ کم ہوگئی ہے۔ سفرناموں کی بھی کمی ہے۔ گوکہ مجتبیٰ حسین نے "جاپان چلو" لکھ کر اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جاپان کے سفرناموں کے سلسلے میں انھوں نے ہنگری کے جارج کے سفرنامہ LAND OF THE RISING YEN کا ذکر کیا۔ جناب برنی نے ڈرامہ نگاری کی کمی پر بھی اپنے افسوس کا اظہار کیا۔

ہند و پاک طنز و مزاح کانفرنس کے افتتاحی اجلاس ہی سے اندازہ ہوگیا کہ یہ اپنی نوعیت کی بے مثال اور کامیاب ترین کانفرنس ہے۔ اکیڈمی کے سکریٹری جناب نقوی نے اس کی کامیابی کے لیے مجتبیٰ حسین اور ظفر پیامی کو اور کوتاہیوں کے لیے خود کو ذمہ دار ٹھہرا کر طنز و مزاح کی اس روایت پر عمل کیا جس میں خود کو ہدف بنایا جاتا ہے۔ یہ کانفرنس رواروی کی قائل نہ تھی۔ بلکہ مختلف موضوعات پر بڑی عرق ریزی کے ساتھ لکھے گئے مقالے پڑھے گئے۔ یہاں تک کہ (بقول شریف الحسن نقوی) مہمان خصوصی جناب شیوشنکر بھی "ہوم ورک" کر کے جلسہ گاہ پہنچے تھے!

کانفرنس کے پہلے تحقیقی اجلاس میں پروفیسر شمیم حنفی نے اردو طنز و مزاح اور ہماری معاشرتی صورت حال پر ایک معرکۃ الآرا مقالہ پڑھا۔ جس میں اُنھوں نے کہا کہ مزاح نگار کو مسخرا سمجھنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے۔ اس گروہ میں اب دانشور اور مفکر بھی شامل ہو چکے ہیں۔ مزاح نگار ہر طرح کے انحراف کو طنز و ظرافت کا نشانہ بناتے ہیں۔ اردو میں طنز اور ظرافت کے کئی امکانات موجود ہیں۔ انھوں نے یہ بھی شکوہ کیا کہ اردو طنز و مزاح پر فکری سناٹے کی کیفیت چھائی ہوئی ہے اچھی ظرافت کے لیے اعلیٰ درجہ کی زبان پر گرفت ضروری ہے بلکہ بقول یوسف ناظم "نئے لکھنے والے زبان نہ جاننے کو حسن سمجھتے ہیں"۔ پروفیسر شمیم حنفی نے پاکستان میں طنز و مزاح کی روایت کو زیادہ مستحکم قرار دیا۔ اور کہا کہ دوسری زبانوں میں ان کے بتانے میں اردو طنز و مزاح موضوعات کی تکرار اور بصیرت کی کمی کے باوجود دوسری زبانوں سے آگے ہے ہندی اور اردو میں طنز و مزاح [illegible] اطمینان کیا اور کہا کہ ابن انشا کی نثر [illegible] منتقل ہو چکا ہے انھوں نے کہا کہ اردو ہندی کے شاعروں اور کوی سمیلن سے پستی اور بد مذاقی کو بڑھاوا مل رہا ہے۔ آج جب کہ ادب میں نظریاتی جنگ کا دور دورہ ہے کہ طنز و مزاح زیادہ روادار ہے اور نظریاتی اختلافات کی چکر میں نہیں پڑتا ہے۔ دنیا لفظوں سے نہیں بدلتی لیکن لفظوں کا اثر بھی ہوتا ہے۔ جس سے طنز کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اس مقالہ پر مباحث میں حصہ لیتے ہوئے مشہور افسانہ نگار جوگندر پال نے کہا کہ وہ PURIST کی طرح طنز و مزاح کو روا رکھنے کے خلاف ہیں۔

نامور مزاح نگار یوسف ناظم نے کہا کہ ایک زمانہ کے بعد ایک ایسا تنقیدی مضمون سننے میں آیا جس کی زبان تنقیدی ہے۔ جناب ظفر پیامی نے بحث میں کئی نئے سوال اُٹھائے اور کہا کہ کیا کوئی صنف ایسی ہے جسے باقاعدہ طنز یا مزاح کا نام دیا جائے؟ انھوں نے کہا کہ طنز نگار STATUS QUO کا قائل کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہندی مزاح کے بارے میں اُنھوں نے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہندی کے "ہاسیہ کوی [illegible]" کا معیار معمولی شاعروں سے بھی کم تر ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی نے جوابی تقریر میں کہا کہ معاشرہ کا ہر شستہ شخص وہی ہے جو ہنستا ہے ایک عام خیال یہ

نے کچھ ایسی فضاء باندھی کہ سامعین کے دلوں میں فکر کی یاد کے دیپ جل اٹھے۔ اور آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ جلسہ کی کارروائی ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے چلائی۔ سیکریٹری اردو اکیڈمی جناب شریف الحسن نقوی کا یہ احساس تھا کہ فکر تونسوی کے انتقال کے بعد اردو اکیڈمی پر ایک قرض تھا جو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ادا ہوا۔ جناب ظفر پیامی نے کہا کہ نقاد تسلیم کریں یا نہ کریں فکر نے عوام سے تو رشتہ قائم رکھا۔ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد نے فکر کی کالم نگاری پر لکھے گئے مضمون میں بتایا کہ انھوں نے ۱۱ ہزار کالم لکھے۔ وقتی موضوعات میں دلچسپی پیدا کرنے کی ان میں خوب صلاحیت تھی۔ انھوں نے دنیا کو کتابوں کی مدد سے نہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور زندگی کی ان ناہمواریوں کو اپنے قلم کی تیزی عطا کی۔

ڈاکٹر شیر جنگ گرگ نے کہا کہ کالموں کے علاوہ فکر تونسوی کی آٹھ کتابیں ہندی کا رسم خط میں شائع ہو چکی ہیں انھوں نے ہندی کے مزاح نگاروں کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بھی عوام کے لیے لکھنے لگے۔ ان کے اسلوب کی وجہ سے ہندی والے اردو سیکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ ہندی میں ان کے چاہنے والوں کی تعداد اردو کے مقابلے میں کم نہ تھی ڈاکٹر گرگ نے اس بات پر مسرت کا اظہار کیا کہ اردو والے ہندی قاری کو متاثر کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر مجتبیٰ حسین ہندی میں اس سلیقہ سے چھپ رہے ہیں کہ ہندی والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ اردو کے ادیب ہیں یا ہندی کے۔ فکر تونسوی کے ایک قریبی رفیق دوست اور پنجابی و اردو کے ادیب جناب تارا سنگھ کامل نے فکر کی زندگی کے پُر لطف واقعات سنا کر محفل کو زعفران زار بنایا۔

ڈاکٹر سلیم اختر (پاکستان) نے کہا کہ فکر نے صحافتی تقاضوں کے باوجود فن کے آئینہ کو گرد آلود نہیں ہونے دیا۔ ان کی تحریروں میں ان کی ذات استعارہ کی صورت میں ملتی ہے جس پر وہ نشانہ لگاتے رہتے ہیں۔ اور وہ مشتاق احمد یوسفی کی طرح ذات میں محبوس نہیں رہتے بلکہ باہر نکل کر معاشرتی تضادات اور کج روی کو پیش کرتے ہیں۔

بلونت گارگی نے کہا کہ فکر تونسوی فسادات کے زمانہ میں لاہور ہی میں رہے چودھری نذیر احمد کے دفتر سے انھیں عشق تھا۔ فسادیوں نے ایک بار حملہ بھی بول دیا۔ لیکن کسی طرح فکر کی جان بچ گئی۔ پھر بھی انھیں لاہور چھوڑنا پڑا۔ بعض ترقی پسندوں نے فکر کو بورژوا قرار دیا تھا کہ میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ حالانکہ فکر نے ترقی پسندوں کا نخلستان اخبار کی دنیا میں آباد کیا تھا۔

جناب منیر احمد شیخ (پاکستان) نے بتایا کہ فکر کے قلب پر حملہ ہوا تو وہ ان کے گھر گئے۔ جس پر فکر نے کہا تھا کہ وہ پہلے شخص ہیں جو تیرے دیس سے میری خبرگیری کے لیے آیا ہے۔ منیر شیخ نے کہا کہ فکر اگر پاکستان میں ہوتے تو زیادہ لوگ انھیں پڑھ پاتے، کیوں کہ پاکستان میں کالم نویسی کو زیادہ شہرت حاصل ہے۔ فکر آج جسمانی طور پر ہم میں نہیں لیکن "نہ وہ یہاں مرا نہ پاکستان میں" کہ ان کی تحریریں انھیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔

ڈاکٹر محمد حسن نے کہا کہ سماجی شعور کو تسلیم کئے بغیر طنز و مزاح ممکن نہیں۔ ادب کی کسی صنف میں سماجی شعور کو وہ اہمیت حاصل نہیں جتنی کہ طنز و مزاح میں اہمیت ہے۔ فکر تونسوی اور مخلص بھوپالی نے نچلے اور بانکے نچلے طبقہ کے کرداروں سے متعارف کروایا۔ دونوں نے ناہمواری، عدم مساوات، اقدار کی پامالی اور منافقت کو اپنا موضوع بنایا۔ فکر نے کوشش کی تھی کہ سر کے بل پر کھڑے ہوئے سماجی نظام کو پیروں کے بل پر کھڑا کر دیا جائے۔ ان کے ہاں عورت کا کردار بھی بندھوا مزدور کے کردار کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ ان کی تحریروں میں جا بجا اقدار کا ماتم ملے گا۔

ان کا سماجی شعور طرح طرح کے نقش و نگار بناتا ہے۔ وہ سوتے ہوئے انسان کی محبت کو بیدار کرنا چاہتے ہیں۔
مہمان خصوصی جناب سید ہاشم علی اختر وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے فکر تونسوی کو فکر انگیز شخصیت قرار دیا۔ جنھوں نے اتنا ہنسایا کہ آنسو نکل پڑے۔
صدر جلسہ جناب آئی کے گجرال نے فکر سے اپنی دیرینہ دوستی کا ذکر کیا۔ جس کی ابتداء لاہور سے ہوئی تھی انھوں نے کہا کہ فکر کی تحریروں کی وجہ سے وہ اور ان جیسے بے شمار لوگ 'ملاپ' اخبار پڑھنے پر مجبور ہوتے گجرال صاحب نے بتایا کہ انفرمیشن کے وزیر کی حیثیت سے فکر کو پدم شری کا خطاب دینے کی چھ سال تک سفارش کرتے رہے لیکن کبھی ان کی تجویز پر عمل نہیں ہوا قطعی فہرست میں فکر کا نام نہ دیکھ کر انھیں احساس ہوتا تھا کہ پدم شری کی توقیر میں کمی ہوتی ہے!
جناب مجتبیٰ حسین نے آخر میں اپنے رفیق دیرینہ کو خراج عقیدت پیش کرنے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس یادگار اجلاس کے انعقاد کے ذریعہ فکر تونسوی کی یاد کو تازہ رکھنے پر اظہار اطمینان کیا۔
کانفرنس کا آخری اجلاس ممتاز افسانہ نگار جوگیندر پال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں طنز و مزاح کو درپیش مختلف نوعیت کے مسائل سامنے آئے اور مختلف علاقوں اور زبانوں میں طنز و مزاح کی رفتار کا جائزہ بھی لیا گیا ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے جو پچھلے بیس سال سے برصغیر کا واحد اور منفرد ماہنامہ شگوفہ شائع کرتے ہیں۔ اپنے مقالہ میں دکن میں طنز و مزاح کا احاطہ کیا اور بتایا کہ اس وقت حیدرآباد طنز و مزاح کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا ہے جہاں ہر سال قومی سطح کی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں ہند پاک کے علاوہ ایک بار عالمی سطح کی کانفرنس کا بھی اہتمام ہو چکا ہے۔ زندہ دلان حیدرآباد کی سرگرمی میں کئی طنز و مزاح کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور شگوفہ کی وجہ سے متعدد نئے لکھنے والے روشناس ہو سکے ہیں۔

جناب لوگیندر بالی چیف آف دی بیورو ٹائمز آف انڈیا نے دور درشن کو دور کے ڈھول سہانے کا نام دیا۔ کہ صحیح مذاق کی ترجمانی نہیں ہو رہی۔ آج مسکرانے کے لیے سخت محنت کرنی پڑ رہی ہے انسان ہنستا بھی ہے تو معلوم ہوتا ہے جھوٹ بول رہا ہے۔ طنز و مزاح کے پرستاروں کی کمی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کو زندگی میں اہم مقام دیا جائے۔ جناب لوگیندر بالی نے طنز و مزاح کے فروغ کے لیے مختلف تجاویز رکھیں۔ جن میں مختلف یونیورسٹیوں میں طنز و مزاح پر تحقیقی و تنقیدی کام کروانے، ہندوستان اور پاکستان کو قریب لانے کے لیے طنز و مزاح نگاروں کی خدمات سے استفادہ، عالمی طنز و مزاح کانفرنس کے پھر ایک بار انعقاد اور دہلی اردو اکیڈیمی کے تحت خالص طنز و مزاح کی کتابوں پر مشتمل لائبریری کا قیام شامل ہے۔
پروفیسر شاہد احمد فاروقی نے "دہلوی زبان میں طنز و مزاح" کے زیر عنوان مقالہ پڑھا۔
پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے "طنزیہ و مزاحیہ شاعری آزادی کے بعد" کے موضوع پر اپنے مضمون میں کہا کہ اردو کے سارے شعری سرمایہ میں طنزیہ لب و لہجہ ملتا ہے۔ انھوں نے شاد عارفی کو خالص طنز نگار کے طور پر پیش کیا۔ جن کے ہاں طنز اور سیاست کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد مزاحیہ شاعری کا معیار پست ہوتا جا رہا ہے۔ مزاحیہ شاعری میں ذہانت، بصیرت اور شعور کا فقدان ہے۔ دو چار شاعروں کے سوا عام طور پر شاعری کی سطح کم تر ہوتی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر رشید موسوی نے "طنز و مزاح کے فروغ میں خواتین کا حصہ" کے زیرِ عنوان مضمون میں شکایت کی کہ مردوں نے خواتین کو ہمیشہ اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ لیکن اب خواتین بھی طنز و مزاح کے میدان میں اہم مقام حاصل کر رہی ہیں۔

پاکستان کے مہمان نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ کسی قوم کے مزاج کا مخصوص لطیفوں کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو قوم کے اجتماعی ذہن کا علم ہوتا ہے۔ پاکستان میں طنز کے اونچے معیار کا اکثر نقادوں نے ذکر کیا جس پر انھوں نے کہا کہ "اس کی بھاری قیمت بھی ہم ادا کرتے رہتے ہیں" پاکستان میں طنز و مزاح کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر نے کہا کہ کالم نگاری کو آج خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ انتظار حسین شخصیات میں کیڑے ڈالتے ہیں اور مشفق خواجہ شخصیات میں سے کیڑے نکالتے ہیں۔ پاکستان میں طنز و مزاح نے عصری شعور کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور فوجی بھائیوں کا دبستان مزاح بھی الگ صحت پذیر ہوا ہے!

اس اجلاس میں جناب ظ۔ انصاری نے اپنی خاص زبان اور لہجہ میں ایک پر معنی طنزیہ مضمون سنایا۔

اجلاس کے آخر میں مباحث میں حصہ لیتے ہوئے جناب ظفر پیامی نے کہا کہ سنجیدہ ادب کو سنجیدہ اس لیے نہیں کہتا کہ کوئی سنجیدگی سے نہیں پڑھتا۔ ہندوستان میں اردو کی جو صورتِ حال ہے اس میں طنز و مزاح تو کیا کوئی بھی ادب پنپ نہیں سکتا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ دہلی اردو اکیڈیمی کی جانب سے ہر سال طنز و مزاح کا جلسہ منعقد کیا جائے گا اور ایک الگ لائبریری بھی قائم کی جائے گی۔

جناب انجم عثمانی (دوردرشن) نے سوال اٹھایا کہ دکن میں طنز و مزاح کیوں فروغ پا رہا ہے؟ اور فیشن کے طور پر مزاح لکھنے والوں کو اہمیت کیسے دی جائے گی؟

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے جواب دیا کہ ادب کے کارواں میں مستقل اور غیر مستقل دونوں طرح کے لکھنے والے ہمیشہ شامل رہے ہیں۔ ہر دور میں ہر صنف میں فیشن کے طور پر لکھنے اور ادب میں مقام حاصل کرنے کی بعض لوگ کوشش کرتے ہیں لیکن ان میں تخلیقی صلاحیت رکھنے والے ادیب ہی جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ دکن میں مزاح لکھنے والوں کی بہتات کا سہرا زندہ دلانِ حیدرآباد اور شگوفہ کے سر ہے ان اداروں نے طنز و مزاح کے فروغ کے لیے جو فضا بنائی ہے اس کی وجہ سے ادیب و شاعر مزاح لکھنے کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔

جناب جوگیندر پال نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ طنز و مزاح غیر یقینی چیز ہے۔ اور اس کے لکھنے کے اتنے ہی طریقے ہیں جتنے سامعین ہنسنا اور رونا زندگی میں رچ بس کے ہوتو صحیح ورنہ غلط یہ ضروری ہے کہ طنز ہو یا مزاح بڑے ادب کی طرح ہمیں DISTURB کرے۔ جب تک سماجی شعور نہ ہوگا اس وقت تک ویسا طنز نہ ہو پائے گا۔

آخری اجلاس کے اختتام پر سمینار کے ڈائرکٹر نے اس امر پر اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ اب تک ۴۴ مندوبین کو مدعو کیا گیا تھا۔ جن میں سے نہ صرف یہ کہ ہر ایک نے شرکت کی بلکہ اس تعداد میں اضافہ بھی کرنا پڑا۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ اس سمینار سے طنز و مزاح کے لیے سازگار اور ہمدردانہ فضا ملی اور سارے ملک میں پیدا ہوگی۔ جناب شارب الحسن نقوی معتمد اکیڈیمی نے اس سمینار کو کامیاب ترین سمینار قرار دیتے ہوئے سب کے تعاون کا شکریہ ادا کیا۔ سمینار کے اس آخری اجلاس میں بھی غالب اکیڈیمی کا ہال بھرا ہوا تھا۔

۹۔ رؤف پاریکھ نے گھائل الہ آبادی جیسے عظیم شاعر کا قلمی خاکہ (دراصل ہوائی خاکہ) رکھ کر ثابت کر دیا کہ فرضی خاکہ حقیقی خاکے سے کہیں بہتر ہوتا ہے۔

۱۰۔ ڈاکٹر بیگ احساس کا مقالہ "ڈاکٹر سیدہ جعفر شخصیت، حیات اور کارنامے" مواد اور معیار کے اعتبار سے کافی وقیع ہے مگر اس مقالے کو پڑھ کر یہ انکشاف بھی ہوا کہ خالص طنز و مزاح کے ترجمان "شگوفہ" میں کبھی کبھی سنجیدہ تحریریں بھی اس طرح گھس پڑتی ہیں جس طرح خواتین کے ریلوے کمپارٹمنٹ میں کبھی کبھی مرد گھس پڑتے ہیں۔

۱۱۔ ناک ٹلنے اور ناف کے ٹلنے سے بعض وقت لوگوں کے مرنے تک کے واقعات تو ہم نے سنے تھے مگر عاتق شاہ نے "ناف" کو باضابطہ ایک مضمون کی شکل دے کر ایک گمنام ہستی "ناف" (جس کو کئی برسوں سے قلمکار نظر انداز کرتے آرہے تھے) کا مقام بلند کر دیا۔

۱۲۔ زندہ انسانوں کے خاکے (ایسے انسانوں کے بھی جو گھڑی کی طرح سست اور تیز بھی ہوتے ہیں) ہم نے بہت سے پڑھے ہیں مگر ایک بے جان چیز (مصنوعی جاندار) کا خاکہ "گھڑی نامہ" میں پہلی بار پڑھنے کو ملا۔ عابد معز کی یہ کاوش خوب رہی۔

۱۳۔ رؤف خوشتر بوم الدولہ کے ساتھ مل کر اپنے مکان میں روز مچھروں کے ساتھ مقابلہ کر رہے تھے کہ ایک دن ان کے گھر "پانچواں مہمان" ٹی وی کی شکل میں آ دھمکا اور سکتے ہی رؤف خوشتر اور بوم الدولہ کو ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا پھر کیا تھا مچھر موج اڑانے لگے بچے کتابیں جلانے لگے اور پڑوسی مفت میں ٹی وی کا مزہ اٹھانے لگے۔

۱۴۔ "بھرتے ہو تو پانی بھریئے" میں شکیل اعجاز نے اپنی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کالو اور چیکو کی لڑائی جھگڑے اور گالی گلوج کے منظر کو ٹی وی کا اسکرین سمجھ کر جو لطف اٹھایا اس دن سے ہم بھی ہماری کھڑکی کے ٹی وی اسکرین سے ہمارے پڑوس کی دو لڑاکو خواتین کی آپسی جنگ و جدال (جس میں گالیوں کی گولیاں چلتی ہیں تو بے ہودہ باتوں کے بم پھٹتے ہیں) کا مزہ لینے لگے ہیں۔

۱۵۔ شیخ رحمن اکولوی نے "قینچی" کی مختلف قسمیں دکھا کر ثابت کر دیا کہ ان کی زبان قینچی کی طرح چلتی ہو یا نہ چلتی ہو البتہ ان کا قلم ضرور قینچی کی طرح چلتا ہے۔

۱۶۔ رشید الدین نے "غزل کی لے دے" پر جو لے دے کی ہے ہمیں خوف ہے کہیں رشید الدین پر شعراء کی لے دے نہ شروع ہو جائے۔

ان پڑھ بھونگیری سکھ "زندہ دلان حیدرآباد کی سہ روزہ سالانہ تقاریب کی رپورٹ ویڈیو فلم کی طرح ہے۔

کالم "دے کے خط" میں عباس متقی کی غزل یا نظم (جو بھی ہو) پڑھ کر لگا اب یہ کالم "انتخاب کلام" ہوتا جا رہا ہے۔

"پھر ملیں گے اگر خدا لایا" میں شگوفہ کے قلمی معاونین اور نئے قلمکاروں کے لیے اس بار کارآمد باتیں نہیں ہیں (شاید شگوفہ کے قلمکار اب کافی سمجھدار ہو گئے ہیں)

اس شمارے میں شامل تمام شعری تخلیقات ایک سے بڑھ کر ایک ہیں ان پر تبصرہ کر کے ہم اپنی کم علمی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہتے۔

سرورق ٹھیک تو ہے مگر سرورق پر سیاہ رنگ کے دھبے کچھ ٹھیک نہیں لگتے ۱۹۸۸ء انسانیت کے منہ پر سیاہ رنگ مل گیا کیا اب ۱۹۸۹ء بھی انسانیت کا منہ کالا کرنے والا ہے —

نوٹ:- اس بار سالنامہ شگوفہ میں یوسف ناظم کو نہ دیکھ کر جہاں مایوسی ہوئی وہیں حیرت اس بات پر ہوئی کہ یوسف ناظم کی تحریر کے بغیر شگوفہ کے سالنامے کو منظر عام پر آنے کی ہمت کس طرح ہوئی؟ ٭ ص ۵۷ پر

ہمیں خوش رہیے!

سالنامہ ۸۹ء بڑا بہت خوب ہے۔ مبارکباد قبول کیجئے۔ حصہ نثر روایت کے مطابق اعلیٰ درجے کا ہے۔ حصہ نظم بھی بہتر ہے۔ یہ آپ کا کارنامہ ہے کہ ڈاکٹر گیان چند جین کو تحقیق کی کھدکھاد سے تھوڑی دیر کیلئے آزادی دلا کر ان سے ایک خوبصورت ظریفانہ غزل لکھوائی۔ البتہ احمد سلطان کی نظم۔ نیا سال مبارک۔ پڑھ کر مایوسی ہوئی۔ وہ انشاء کے ایک ہم عصر شاعر کی طرح۔ بحر رجز میں ڈال کے بحر رمل چلے۔ اور کئی مصرعوں میں ٹھوکر کھا گئے۔ اگر ان کی نظم جدید تر شاعری کا نمونہ ہے تو مجھے کچھ کہنا نہیں، کیونکہ بعض جدت پسند حضرات روایت سے مکمل انحراف کے قائل ہیں یہاں تک کہ اوزان و بحور میں بھی توڑ پھوڑ کو روا رکھتے ہیں لیکن اگر یہ بات نہیں تو احمد سلطان صاحب سے مودبانہ گزارش ہے کہ اپنی نظم پر نظر ثانی کریں۔

نظم شروع کی گئی ہے "پھر آیا نیا سال نیا سال مبارک" مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن کے وزن میں تین اشعار تو اس وزن میں ٹھیک چلے لیکن اس کے بعد گاڑی نے پٹری بدل لی اور دس اشعار کے پہلے مصرے مثلاً "ہر بیان کیک ہر رنگ مسلم شراب ہے" مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن کے وزن کی زد میں آگئے۔ آٹھ اشعار کے دوسرے مصرے اور نویں اور بارھویں شعر کے پہلے مصرے ڈی ریل ہو کر ناموزوں ہو گئے۔ جیسے شالوں سے ان کے شالٔ نیا سال مبارک" یا "لوٹا سا ہے شالٔ نیا سال مبارک"۔ والسلام

رضا نقوی واہی، پٹنہ

مزاح کا بیر العلم بصورت "سالنامہ" دستیاب ہوا۔ مزاح نگاروں کا قافلہ رواں دواں ہے۔ جہاں مزاح کو بہت فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ یہ سب آپ کے خاموش مثبت اور گرم دم جستجو ادصاف کی وجہ سے ہے۔ مزاح نگاروں کے جھرمٹ میں جناب یوسف ناظم کی غیر حاضری سے یوں لگا جیسے باراتی ہوں اور نوشہ غائب۔

آپ امپورٹیڈ مزاح (پاکستان) سے بھی روشناس کروا رہے ہیں یہ بڑی خدمت ہے۔

رؤف خوشتر (بیدر)

شگوفہ پابندی سے مل رہا ہے دونوں یعنی سادہ اور سالنامہ میں شامل سبھی تخلیقات نہایت ہی مزیدار اور معیاری رہیں خدا کرے کہ یہ معیار ہمیشہ برقرار رہے۔

امجد علی فیض، گلبرگہ

نیا سال خوشیاں لائے۔

آپ مل گئے۔ اچھا ہوا۔ جی خوش ہوا۔ دل کا غبار بھی نکل گیا۔ میں ۱۹۸۹ء میں پورے زوروں سے کام کروں گا۔ نیاز مند

رام لعل نابھوی (پنجاب)

شگوفہ کا سالنامہ ۸۹ء پڑھا بہت خوب ہے۔

طالب خوندمیری صاحب کے ٹائٹل سے لے کر بنجارہ کنسٹرکشن کمپنی کے اشتہار تک ہر چیز معیاری ہے۔ خوبصورت ہے اور دلفریب ہے۔ مجتبیٰ حسین، دلیپ سنگھ، مسیح انجم اور پروفیسر یداللہ مہدی کے مضامین زندہ دلان کے سالانہ جلسہ میں خود ان ہی اصحاب کی زبانی سن چکا تھا۔ البتہ حصہ نظم میں ڈاکٹر گیان چند جین اور مضطر مجاز کی چیزیں مزہ دے گئیں۔ یہ دونوں اچھے طنز ملیحے ہیں۔ سالنامہ میں یوسف ناظم صاحب کی کمی بری طرح محسوس ہوئی شاید یہ پہلا سالنامہ ہے (شگوفہ کا) جو ان کی غیر موجودگی میں شائع ہوا ہے۔ ٭

رشید الدین، حیدرآباد

٭ جناب یوسف ناظم کا "خطبۂ صدارت" ڈاک کی بدانتظامی کی وجہ سے بڑی تاخیر سے ملا۔ اس لیے سالنامہ میں شامل نہ ہو سکا۔ جس کا ہمیں افسوس ہے۔

(مدیر)

جلد: ۲۲ شمارہ: ۳
مارچ ۱۹۸۹ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

سرورق: "پودا" سے

فی پرچہ: ۴ روپے ۵۰ پیسے
زرسالانہ: ۵۰ روپے
عرب ممالک سے: ۱۵۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف، محمود سلیم
طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار محل
حیدرآباد ــــ ۲

خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۔ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد۔
فون آفس: 557716 مکان: 521064

اِس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

فارم IV حسب قاعدہ 8 بابت شگوفہ حیدرآباد

۱. مقام اشاعت : ۳۱ مجرد گاہ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۱....۵

۲. وقفہ اشاعت : ماہنامہ

۳. ۴. ۵ پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر کا نام : سید مصطفےٰ کمال ۷۶۸-۶-۱۷ ادبیر پورہ حیدرآباد ۲۳

۶. مالک : قیصر کمال، ۷۶۸-۶-۱۷

دبیر پورہ، حیدرآباد ۲۳

میں سید مصطفےٰ کمال تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط

سید مصطفےٰ کمال

یکم مارچ ۸۹ء

آئندہ ماہ کے شمارے سے شگوفہ کی قیمت میں اضافہ! ـــــــ فی شمارہ: ۵/- روپے

مجتبیٰ حسین

میرا دوست

وقار لطیف

[لندن میں مقیم حیدرآبادی ممتاز ادیب اور دانشور وقار لطیف ۲۴ جنوری ۸۹ء کو حیدرآباد آئے تھے اور ۲۸ جنوری ۸۹ء کو حیدرآباد ہی میں انتقال کر گئے۔ مجتبیٰ حسین کے وہ قریبی دوستوں میں تھے۔ وقار لطیف کے افسانوں کے مجموعہ کی تقریب رونمائی لندن میں منعقد ہوئی تھی مجتبیٰ حسین کا ایک خاکہ اس جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ مجتبیٰ حسین نے مذکورہ خاکہ کسی قدر ترمیم کے ساتھ شگوفہ کو عنایت کیا ہے۔ (ادارہ)]

۱۹۵۶ء کے نومبر کا مہینہ تھا جب وقار سے میری پہلی ملاقات اورینٹ ہوٹل میں ہوئی تھی۔ پتہ چلا انجینئرنگ کا طالب علم ہے لیکن اردو میں افسانے لکھتا ہے اُن دنوں وہ بے حد جذباتی اور رومانی ہونے کے ساتھ ساتھ بے حد خود آراء خود بین اور خود پسند نوجوان تھا اورینٹ ہوٹل کے ٹائیلیٹ میں جتنی بار وہ اپنی شکل دیکھتا تھا شاید ہی کوئی اور دیکھتا ہو۔ وہ بے حد سنجیدہ متین اور حساس تھا اسی لیے دوستوں کے انتخاب کے معاملے میں بے حد محتاط تھا۔ مجھے اکثر حیرت ہوتی تھی کہ وہ آخر میرا دوست کیسے بن گیا۔ وہ اپنے بارے میں کسی کا چبھتا ہوا فقرہ یا تبصرہ برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ دوستوں سے ناراض ہو جاتا اور حسب توفیق کئی کئی دن اداس رہتا تھا وہ میری جملہ بازی سے اکثر پریشان تو ہو جاتا تھا لیکن ناراض نہیں ہوتا تھا بلکہ بعض صورتوں میں تو میری جملہ بازی سے متفق بھی ہو جاتا تھا۔ اکثر اوقات وہ دوستوں سے خفیہ طور پر یہ جاننے کی کوشش بھی کرتا تھا کہ میں اس کے غیاب میں اس کے بارے میں کیا کہتا ہوں۔ وہ نہایت عمدہ لباس پہنتا تھا جب کہ میں لباس کے معاملے میں نہایت لاپرواہ اور بے نیاز رہتا تھا مزاج اور عام سماجی رویوں کے اعتبار سے ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے بڑے "مشکل دوست" تھے لیکن پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ وقار سے ایک دن بھی ملاقات نہ ہوتی تھی تو دل بے چین ہوا اٹھتا تھا۔

اس ذہنی اور جذباتی قربت کی وجہ غالباً ادب اور آرٹ میں ہم دونوں کی دلچسپی تھی۔ میں ان دنوں لکھتا نہیں تھا البتہ دنیا بھر کے ادب کو پڑھنے کا چسکا لگ چکا تھا۔ وقار کے افسانے "ادب لطیف" "سویرا" اور "ساقی" جیسے رسائل میں چھپتے تھے ان افسانوں کی اشاعت سے پہلے وہ مجھے اپنے افسانے

ضرور سُنا دیتا تھا۔ افسانہ سُنانے اور پڑھنے کے معاملے میں اس کا اصول یہ تھا کہ افسانہ میں کوئی اچھا فقرہ یا جملہ آجاتا تو پڑھتے پڑھتے فوراً رک جاتا تھا اور اپنا سر پیٹنے لگ جاتا تھا۔ کہتا تھا "یار مجتبیٰ! دیکھو تو کیسا جملہ لکھا ہے ہائے ہائے غضب کا جملہ ہے"۔ اور میں کہتا "ابھی تو تم صرف اپنا سر پیٹ رہے ہو جب یہ چھپ جائے گا تو کیا عجب کہ پڑھنے والے اپنے سر پیٹنے کے علاوہ تمہیں بھی پیٹنے لگ جائیں"۔

وہ افسانے سناتے ہوئے بے حد جذباتی ہو جاتا تھا اور اکثر اوقات مجھ جیسا آدمی بھی جذباتی ہونے پہ مجبور ہو جاتا تھا مجھے اس کے افسانوں کی فضا بہت پسند تھی۔ ایسی فضا جو ان دنوں ہمارے مزاج اور ماحول سے بہت مطابقت رکھتی تھی ایک دن وہ اورینٹ ہوٹل میں ملا تو میں نے پوچھا "لگتا ہے آج تم نے بہت زیادہ مطالعہ کیا ہے"؟ حیرت سے پوچھنے لگا؟ "ہاں! آج میں نے ٹامس مان کی پوری کتاب پڑھ ڈالی ہے۔ مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آج میں نے بہت زیادہ پڑھائی کی ہے"۔

میں نے کہا "تمہاری پیشانی جو لال ہوتی جا رہی ہے نہ صرف لال ہو رہی ہے بلکہ سوج بھی گئی ہے۔ اتنا مطالعہ کیوں کرتے ہو کہ مرہم پٹی کے لیے ڈاکٹر کے پاس جانے کی نوبت آجائے"۔

یہ سن کر وہ پہلے تو اپنی پیشانی سے پسینہ کے قطروں کو پونچھتا رہا پھر اچانک اُٹھ کر ٹائیلیٹ میں چلا گیا۔ واپس آیا تو بڑی دیر تک مجھ سے اس مسئلہ پر بحث کرتا رہا کہ "میری پیشانی اتنی لال تو نہیں ہے کہ تم یہ اندازہ لگا سکو کہ میں نے ٹامس مان کو پڑھا ہے۔ پھر ہر دوست کے سامنے اپنی پیشانی پیش کی اور ٹامس مان کا حوالہ دیا حتیٰ کہ اس نے اپنی پیشانی اور پشیمانی دونوں کو ہمارے ایک ایسے دوست کے سامنے پیش کیا جو وقار کی پیشانی کو تو جانتا تھا لیکن ٹامس مان کو بالکل نہیں جانتا تھا۔ لہٰذا وقار پھر اپنی پیشانی کو پیٹ کر رہ گیا۔

مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ انگریزی کے بہت سے ادیبوں کو میں نے صرف وقار لطیف کے اُکسانے پر پڑھا۔ وہ رہتا بھی انگریزوں کی طرح تھا۔ انگریزی بھی بی بی سی کی انگریزی کے معیار کی بولتا تھا مغربی موسیقی کا بھی وہ دیوانہ تھا اس کے پاس مغرب کے سارے عظیم موسیقاروں کے لانگ پلے ریکارڈز تھے۔ اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنی عمر عزیز کی کتنی قیمتی ساعتیں وقار کے گھر پر بیتھوون۔ موتزارٹ باخ۔ واگنر۔ چیکووسکی کی سمفنیوں کو سننے میں گذار دیں۔ رات کا پچھلا پہر آجاتا تھا اور ہم سمفنیوں میں کھوئے رہتے تھے وقار جب ۱۹۶۴ء میں انگلستان گیا تو میں نے اپنے دوستوں سے مذاق میں کہا تھا "وقار کا انگلستان جانا ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تابوت میں آخری کیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہندوستان کی آزادی تو آج مکمل ہوئی ہے"۔

وقار کے انگلستان جانے سے مغرب سے میرا جو راست تعلق تھا وہ تقریباً ٹوٹ سا گیا۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ میرے وہ سارے دوست جن کے وسیلے سے میں مغرب کے ادیبوں۔ فنکاروں اور موسیقاروں سے جڑا ہوا تھا ایک ایک کر کے انگلستان چلے گئے جیسے تقی تنویر۔ پروفیسر حسن عسکری۔ ڈاکٹر یوسف علی خان۔ اور میں یہاں خالص ہندوستانی زندگی جینے کے لیے رہ گیا۔ وہ محفلیں اُجڑ گئیں وہ دن ہوا ہوئے مگر ان دنوں کی یاد اب بھی دل میں تازہ ہے۔ کبھی بیتھوون کے سمفنی کی آواز کانوں میں پڑتی ہے تو بیتھوون کی نہیں وقار کی یاد آتی ہے موتزارٹ کو سن کر موتزارٹ کی نہیں تقی کی یاد آتی ہے۔ نطشے کی کوئی کتاب پڑھتا ہوں تو حسن عسکری ذہن میں اُبل پڑتے ہیں۔ چیکووسکی کی موسیقی ڈاکٹر یوسف کی یاد کو جگا دیتی ہے۔ یاروں نے اپنی بستیاں اتنی دور

نہیں کہ انھیں اب ایسے ہی غیر شخصی حوالوں کے ذریعہ یاد کیا جا سکتا ہے اگرچہ انگلستان جانے کے بعد
سے گہرا ربط ضبط نہیں رہا مگر شاید ہی کوئی ہفتہ ایسا جاتا ہو جب اس کی یاد نہ آتی ہو۔ انگلستان جاکر وہ
شاعر بن گیا۔ اس کا کلام بھی پڑھا۔ شاعری سمجھ میں نہیں آتی اس لیے وقار [illegible] جاتے نہیں دی۔ ۱۹۶۴ء
کے بعد اس سے حیدرآباد میں صرف ایکبار ملاقات ہوئی اور وہ بھی سرسری سی۔ البتہ ۱۹۸۴ء میں جب ایک مہینہ کے قیام
کے لیے لندن گیا تو وقار سے بے شمار ملاقاتیں رہیں۔ اس کے گھر بھی جانا ہوا میں نے بیتھوون کی سمفنی سننے کی خواہش
کی اس نے روی شنکر کے ستار کا کیسٹ بجادیا اور اپنا سر پیٹنے لگا۔ میں نے واگنر کا نام لیا تو اس نے مہدی حسن
کی غزلوں کا کیسٹ بجادیا اور حسب معمول سر پیٹنے لگا۔ میں نے ٹامس مان کا حوالہ دیا تو وہ کلیات فیض کے حوالے
سے اپنے سر تک پہنچ گیا۔

میں نے کہا "یار وقار! اگر تمہیں انگلستان آکر ان باتوں پہ یہی سر پیٹنا تھا تو پھر یہ کام تو ہندوستان میں رہ کر
کیا جا سکتا تھا"

وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔۔۔ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگ آستاں کیوں ہو

گمبھیر لہجہ میں بولا "اب اگر زخموں کو کریدنے کی کوشش کروگے تو میں تمہیں پیٹنے لگ جاؤں گا۔"

ایک مہینہ نہ جانے کس طرح بیت گیا اگرچہ ہم سب انگلستان میں تھے لیکن انھیں باتوں کو یاد کرتے تھے جن
کا انگلستان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ایک بار ہم سب دوست لندن میں عامر موسوی کے گھر پر جمع ہوئے حسن عسکری بھی تھے اور نقی تنویر بھی۔
ابو یوسف علی خاں بھی تھے اور عباس زیدی بھی۔ وقار لطیف تو تھا ہی۔ ہائے ہائے کیا محفل تھی۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ
سب دوست اب پھر کبھی ایک ہی وقت میں ایک ہی مقام پر جمع بھی ہو سکیں گے یا نہیں وہ دوست جو تیس پینتیس برس
پہلے ہر شام کو اورینٹ ہوٹل میں ملا کرتے تھے اتفاق سے سب کے سب کئی برس بعد ایک جگہ جمع ہو گئے تھے آپ اس
محفل کی ہنگامہ خیزی اور گرما گرمی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ رات دیر گئے تک محفل جمی۔ رات کے پچھلے پہر سب کے سب
موسوی کے گھر میں ہی پڑ رہے۔ کون کہاں سویا اس کا مجھے بھی اندازہ نہیں تھا۔ میں اور نقی تنویر ایک کمرے میں سو گئے
صبح آنکھ کھلی تو میں نے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ وقار اور حسن عسکری کس کمرے میں سو رہے ہیں تاکہ انھیں
جگایا جا سکے میرا کمرہ نیچے تھا۔ اتنے میں اوپر کی منزل سے کھانسی کی آواز سن کر ایک کمرہ پر دستک دی۔ وقار نے
دروازہ کھولا بڑی گرمجوشی سے بغلگیر ہوا۔ پوچھا "تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں اس کمرہ میں سو رہا ہوں؟"

"میں نے کہا تمہاری کھانسی کی آواز پر یہاں پہنچا ہوں"۔

وقار نے حیرت سے پوچھا "میری کھانسی"؟

میں نے کہا "ہاں ہاں تمہاری کھانسی" ابھی ابھی تو تم کھانس رہے تھے اسی کھانسی کی ڈور کو پکڑ کر تو تمہارے
کمرے تک پہنچا ہوں"۔

وقار نے اچانک اپنے سر کو پیٹتے ہوئے کہا "یار مجتبیٰ حد کرتے ہو۔ میری کھانسی! یار میری کھانسی؟ تم
اتنے پرانے دوست ہو میری کھانسی کو نہیں پہچانتے" میں نے کہا ہو سکتا ہے مجھ سے غلطی ہو گئی ہو عسکری
شاید کھانسا ہو اور میں نے اسے تمہاری کھانسی سمجھ لیا ہو"۔

اس کے جواب میں وقار نے زور سے اپنا ماتھا پیٹا اور مجھے کمرے سے باہر لے گیا۔ بولا "یار اب تو تم اور بھی حد کر رہے ہو کہاں میری کہانی اور کہاں عسکری کی کہانی؟" میں نے کہا "یار! اس میں اتنا سنجیدہ ہونے کی کیا بات ہے کبھی کبھی کہانی میں توارد بھی تو ہو سکتا ہے"۔

بولا "یار! یہ توارد نہیں۔ کہانی کا سرقہ ہے سرقہ۔ تم عسکری کی کہانی کو مجھ پر مسلط کر رہے ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ تم میرے اتنے پرانے دوست ہو مگر میری کہانی کو نہیں پہچانتے"۔

میں نے کہا "یار! میں عسکری کی چھینک سے تو واقف ہوں لیکن ان کی کہانی سے میری آئی آشنائی نہیں ہے غلط فہمی میں اگر میں نے ان کی کہانی کو تمہاری کہانی سمجھ لیا تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے"۔

بولا "کہانی تو ایک ذیلی اور ذرمی چیز ہے اصل بات رشتہ کی ہے اگر تم میرے دوست ہو تو تمہیں میری کہانی سے بھی واقف ہونا چاہیئے میری کہانی میرے وجود کا حصہ ہے"۔

اس نے نچلی منزل سے نقی کو بلایا اور پوچھنے لگا "یار! یہ بتاؤ میری اور عسکری کی کہانی میں کہیں کوئی مماثلت ہے۔ کوئی یکسانیت ہے"۔ پھر اس نے اپنی کہانی کہانی کر دکھائی۔ پھر نمونے کے طور پر عسکری کی کہانی کی بھی نقل اتار دی اور پوچھا بتاؤ ان دونوں کہانیوں میں کوئی قدر مشترک ہے"۔ نقی اسی وقت نیند سے جاگا تھا اس نے ٹالنے کے لیے کہہ دیا "بھئی ان دونوں کہانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وقار کی کہانی میں جو گہرائی ہے جو تہہ داری ہے اور جو قلندرانہ شان ہے وہ عسکری کی کہانی میں کہاں؟ عسکری کی کہانی تو بہت سطحی اور عامیانہ سی ہے۔ وقار بولا "دیکھو مجتبیٰ! یہ ہے میرا سچا دوست نقی تنویر جو نہ صرف مجھے جانتا ہے بلکہ میری کہانی کو اور اس کی انفرادیت کو بھی جانتا ہے۔ تم کیسے دوست ہو آخر؟" میں نے اس سے معافی مانگی۔ اس نے معاف بھی کر دیا۔ لیکن وقار کی کہانی اب تک میرا پیچھا کرتی ہے۔ کیا میں وقار کو اس کی کہانی کو جانے بغیر جان نہیں سکتا

اس واقعہ کو سنانے کا مقصد وقار لطیف کی کہانی پر روشنی ڈالنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ میرا پیارا دوست وقار سب سے الگ تھلگ ہے اس کی ہر بات الگ اور منفرد ہے وہ دنیا میں اپنی شناخت کو الگ سے برقرار رکھنا چاہتا ہے افسانہ سے لے کر کہانی تک وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کا قائل ہے اور وقار کی یہی ادا مجھے سب سے زیادہ بھاتی ہے۔

یاد بخیر! تیئیس برس پہلے جب وقار مجھ سے ملا تھا تو اس وقت ہم دونوں کی عمریں بیس اکیس برس کی ہوں گی۔ ہائے وہ بھی کیا دن تھے جب سینہ گلاب تھا دنیا کو کتنی حیرت، تجسس اور اشتیاق کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ رات تو رات ہے دن کو بھی خواب دیکھا کرتے تھے حیدرآباد کے اورینٹ ہوٹل کی وہ شامیں یاد آتی ہیں تو یقین ہی نہیں آتا کہ ان شاموں سے ہم گذر چکے ہیں یا یہ شامیں ہم پر سے گذر چکی ہیں۔ آدمی کی زندگی میں وہ مرحلہ بڑا عجیب و غریب ہوتا ہے جب اسے اپنا ہی ماضی کسی اور کا ماضی نظر آنے لگے۔ بظاہر ان تیئیس برسوں میں کچھ بھی نہیں ہوا۔ وہی دنیا ہے۔ وہی چاند اور وہی سورج ہے۔ سڑکوں کا وہی حال ہے۔ البتہ وقار اب لندن میں ہے میں دہلی میں ہوں۔ اورینٹ ہوٹل کی جگہ کئی منزل والی عمارت کھڑی ہو گئی ہے اب ہم ان لمحوں کی زندگی شاید کبھی جی نہیں سکیں گے جو تیئیس برس پہلے ہمارے حصہ میں آئے تھے۔ کہنے کو تو دنیا ایک ہی ہے لیکن اس ایک دنیا میں بھی لاکھوں، کروڑوں دنیائیں آباد ہیں جذبوں کی دنیائیں۔ لمحوں کی دنیائیں رشتوں کی دنیائیں۔

تیس پینتیس برس پہلے ہم ایک ہی لمحہ میں صدیوں کی زندگی جی لیتے تھے اب کئی کئی برس گزار لیتے ہیں لیکن وہ لمحہ میسر نہیں آتا جس میں آپ سچ مچ زندہ رہ سکیں۔ اور اب تو وہ ساتھی بھی بچھڑنے لگے ہیں جنھوں نے زندگی کو ایک نیا مفہوم اور نیا آہنگ عطا کیا تھا۔ جب بھی ایسا کوئی دوست دنیا سے اُٹھ جاتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اپنے وجود کے ایک حصّہ کی موت واقع ہوگئی ہے۔ انسان قسطوں میں اسی طرح تو مرتا ہے۔ وقار کے مرنے کی خبر ملی تو یوں لگا جیسے میرے وجود کا ایک بڑا حصّہ بھی اس کے ساتھ مرگیا۔

۵۷

ہرفن لکھنوی
(کراچی)

ہماری بد دعاؤں میں اثر پروردگار آئے
ملے غیروں سے وہ جس دن اسی دن سے بخار آئے

موجل کے معانی ہر لغت میں جب ادھار آئے
تو اپنی زندگی بھر موجل پر گزار آئے

رہیں تاجر سلامت اب ملاوٹ کا یہ عالم ہے
میں کھاؤں گھی اگر اصلی تو چربی کی ڈکار آئے

کسی کے ہاتھ میں بلّا کسی کے ہاتھ میں ہاکی
ذرا میری گلی میں گردشِ لیل و نہار آئے

صحافت بھی بکاؤ جنس ہے خود تجزیہ کر لو
مرے مزدور اخباروں میں ذکر مال دار آئے

پولیس سے میری یاری ہے میں کسٹم میں ملازم ہوں
جو چاہوں تو مرے گھر پر نئی اِک روز کار آئے

سیاست داں تم سب سے بہت اونچا شکاری ہے
مرو بھوکو چھری مارو کہاں سے اب شکار آئے

فقط تم ہی نہیں دس بیس حوریں اور پالی ہیں
دل ایسا اصطبل ہے جس میں اونٹوں کی قطار آئے

پڑوسی کی ذرا سنیئے وہ اک مرغی کو روتا ہے
اگر موقع ملے اِنسان کو ہاتھی ڈکار آئے

شراب ایسی بنا پیرِ مغاں جس میں یہ ٹیکنک ہو
پیئیں گر اہلِ ثروت ہم غریبوں کو خمار آئے

نہ گلشن کی ملے یارو تو فلمی ہی بلا لینا
کسی بھی شکل میں ہو میرے کمرے میں بہار آئے

یہ امریکہ عرب والے سیانے ہو گئے سارے
اک ایسا ملک اب ڈھونڈو جہاں سے کچھ ادھار آئے

شکن آلود بستر کی طرح جب ہو گیا چہرہ
وہ پہنچے بیوٹی پارلر بڑھاپے کو سنوار آئے

کبھی بینگن کھلاؤ تم کبھی آلو کا بھرتا دو
اگر مہمان مرغی خور گھر میں بار بار آئے

سیانا ہو گیا ہے اس محلّے کا ہر اِک بنیا
نئی دوکان اب ڈھونڈو جہاں سے کچھ ادھار آئے

رقیبوں کے سروں سے بھوت الفت کا اتر جاتا
یہ ان کی خوش نصیبی ہے کہ ہم جوتا اتار آئے

بُرا جب وقت تھا ہرفن کسی نے بھی نہیں پوچھا
الیکشن کے زمانے میں ہزاروں غم گسار آئے

عابد معز (حیدرآباد)

فارغ البال

مضمون کا عنوان سمجھنے کے لیے آپ کو تھوڑی تکلیف اُٹھانی پڑے گی۔ حضرات! ہاتھ اٹھائیں اور اپنے سر پر پھیریں۔ اگر آپ کا ہاتھ بالوں کے جنگل میں اُلجھتا ہے اور آپ ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کر سکتے ہیں تو اس مضمون کا موضوع آپ نہیں ہیں۔ اگر آپ کا ہاتھ چٹیل میدان پر نا کام پھیرا لگا کر مایوس لوٹ آئے تو جانیئے کہ اس مضمون کا موضوع گو آپ نہیں ہیں لیکن آپ جیسے فارغ البال لوگ ہیں۔ صاحب مضمون کا شمار بھی فارغ البال زمرے میں ہوتا ہے۔ خواتین بغیر سر پہ ہاتھ پھیرے مضمون پڑھ سکتی ہیں۔ خواتین کو ایسی فارغ البالی نصیب نہیں ہوتی۔ اکثر فارغ البال لوگوں کا خیال بلکہ تجربہ ہے کہ خواتین فارغ البال تو ہوتی نہیں، فارغ البالی کی وجہ ضرور ہوتی ہیں۔

لوگ یونہی راتوں رات فارغ البال نہیں ہو جاتے۔ یہ ایک درد بھری داستان ہوتی ہے۔ ہر فارغ البال شخص کا کبھی سر سبز و شاداب ہوا کرتا ہے۔ اس نے بھی کبھی بالوں میں تیل ڈالا، کنگھی کی اور بالوں کو مختلف فلمی ستاروں کی طرح سجایا ہوگا۔ بادِ صبا اس کے بالوں سے کبھی اٹکھیلیاں کر چکی ہوگی۔ بال ماتھے پہ گرائے ہوں گے۔ محبوبہ نے اپنی لانبی انگلیوں سے اس کے بال کبھی سنوارے ہوں گے۔ زندگی کے کسی موڑ پر سینگ کی مانند سر سے بال ایسے غائب ہونے لگتے ہیں جیسے پہلے کبھی تھے ہی نہیں۔ نئی نویلی دلہن صبح اُٹھ کر جس طرح، کان کا بالا بستر میں تلاش کرتی ہے ایسے ہی یہ حضرت تکیہ پر داغِ مفارقت دے گئے بالوں کو جمع کرتے ہیں۔ ان کی گنتی کرتے ہیں مرحوم بالوں کی یاد میں چند منٹ خاموشی اختیار کر کے آئینہ دیکھتے ہیں۔ کہیں کہیں بالوں کے درمیان سے چندیا چمکنے لگتی ہے۔ بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہیں تو چند بال ہاتھ کو چمٹے چلے آتے ہیں۔ کنگھی کرنے پر مزید کئی بال سر کا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔ پانی نہانا غضب ڈھاتا ہے۔ پانی بے یار و مددگار بالوں کو بہا لے جاتا ہے۔

جوں جوں بال گرتے جاتے ہیں تشویش بڑھتی جاتی ہے۔ بال گرنے کی وجہ پانی کا کھارا یا میٹھا ہونا سمجھی جاتی ہے تو کبھی تیل، کریم، صابن یا شیمپو کی خرابی قرار پاتی ہے۔ گرتے بالوں کی جڑوں کو مضبوط کرنے کی کوششیں شروع ہوتی ہیں۔ اخبارات اور رسائل کے مشوروں پر مختلف قسم کے تیل سے سر پہ باغبانی کا عمل شروع کیا جاتا ہے۔ ایک ایک بال کی جڑ میں تیل پہنچایا جاتا ہے۔ گرتے ہوئے بالوں کی لے کر سنوارا جاتا ہے ہمہ قسم کے صابن اور شیمپو کی مدد

سے بالوں اور سر کو صاف رکھنے کی سعی کی جاتی ہے۔ تمام تر کوششوں کے باوجود سر سے بالوں کی خیرات جاری رہتی ہے۔ دوسرے لوگ بھی خبردار کرتے لگتے ہیں "آپ کے بال جھڑتے لگے ہیں۔ ابھی سے کچھ کیجئے، بعد میں پچھتانے سے کیا حاصل"۔ حجام سے لے کر ڈاکٹر تک ہر ایک سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ حجام مختلف علاج بتلاتے ہیں۔ بار بار سر منڈھوایئے سر منڈھوانے کے بعد لگانے کے لیے لیپ دیتے ہیں۔ اگر آپ سر منڈھوانا نہ چاہیں تو حجام ہر دن اپنا تیار کیا ہوا تیل لگا کر مالش کرتے ہیں۔ نتیجتاً سر فارغ البالی کی طرف تیزی سے رواں دواں ہوتا ہے۔ سر پر خراشیں اور زخموں کے نشان الگ پڑ جاتے ہیں۔ سر درد کا عارضہ لاحق ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کرنے پر وہ اپنی مثال پیش کرتے ہوئے اپنے فارغ البال سر پر ہاتھ پھیر کر صبر کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کہتے ہیں فارغ البالی وراثت میں ملتی ہے۔ ابھی تک اس کا علاج دریافت نہ ہوسکا۔ اگر علاج دریافت ہوا تو پہلے میں استعمال کروں گا اور پھر تجربہ کی بنیاد پر آپ کو مشورہ دوں گا۔

مرض [illegible] ان ہوں دوا کی والا معاملہ رہتا ہے۔ دوا دوڑی کے باوجود بالوں کے گرنے کا عمل اپنی رفتار سے جاری رہتا ہے۔ اب فارغ البالی مسلمہ حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ سر پر کہیں کہیں بچے کچے بال منہ چڑانے لگتے ہیں۔ کسی کے سر پر چوتھی تاریخ کے چاند کی شکل میں دونوں کانوں کے درمیان گردن پر چند بال بچ رہتے ہیں بعض کے سر پر پیشانی کے آس پاس اور سر کے اطراف "ن" کی شکل میں بال بچے رہتے ہیں۔ چند فارغ البال اشخاص کے سر کے اطراف اور بیچ میں بچے بال "لا" کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چند سروں کے بیچ میں چاند، سورج یا تارے کی شکل بن جاتی ہے جس طرح طوفان سے پہلے پتہ نہیں چلتا کہ پانی کہاں سے سب کچھ بہا لے جائے گا اور کہاں خشکی چھوڑ جائے گا، ایسے ہی کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ آیا فارغ البالی کے بعد سر پر بال بچ رہیں گے اور اگر بچ بھی گئے تو ان کی شکل کیا بنے گی۔

فارغ البالی کی اصلی وجہ ڈاکٹر اور وہ بھی بالوں کے اسپیشلسٹ جانتے ہوں گے۔ عام طور پر مختلف لوگ مختلف وجوہات بتلاتے ہیں۔ بعض کے خیال میں کہنہ نزلہ زکام اور آنکھوں کی کمزوری بالوں کو لے ڈوبتی ہے۔ پانی کی خرابی بالوں کو بہا لے جاتی ہے تو غذا میں بے قاعدگی بالوں کو کمزور کر دیتی ہے۔ علم نجوم پر یقین رکھنے والوں کا خیال ہے کہ فارغ البالی معاشی خوشحالی کی علامت ہے۔ اس ضمن میں بعض نجومی ہاتھ کی طرح سر بھی پڑھتے ہیں۔ ہماری دادی ماں بتلاتی تھیں کہ زیادہ لکھنے اور پڑھنے سے فارغ البالی میسر آتی ہے۔ دماغی الجھنوں اور پریشانیوں کو بھی فارغ البالی کی وجہ قرار دیا جاتا ہے بعض فارغ البال اشخاص کا خیال ہے کہ فارغ البالی زائد مردانگی کی نشانی ہے۔ جو شاید بالوں کے ذریعہ ضائع ہوتی رہتی ہے۔ خیال اپنا اپنا، اور فارغ البالی اپنی اپنی۔

بال گرنے کے بعد پرانی شکل سے نئی صورت ابھر آتی ہے۔ سر کے گڑھے اور ابھار نمایاں ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا کہاں پیشانی ختم ہو رہی ہے اور کہاں سے سر شروع ہو رہا ہے۔ وضو کرتے وقت، کبھی پیشانی تو کبھی تالو کا مسح ہوتا ہے۔ پیشانی کے بل سر پر بھی جا پڑتے ہیں۔ چہرے کے کیل، مہاسے اور پھنسیاں سر پر بھی نکل آتی ہیں۔ بال گرنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگوں کی تالو پختی عمر میں بھی نہیں بھرتی، تیل ڈالنے کی گنجائش باقی و برقرار رہتی ہے۔ سر کے بالوں نے چہرے کے جو نقص چھپائے ہوتے ہیں وہ فارغ البالی میں عیاں ہو جاتے ہیں۔ بڑی ناک بہت بڑی نظر آتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں تقریباً بند لگتی ہیں۔ موٹے ہونٹ مزید موٹے دکھائی دیتے ہیں۔ پچکے گال مزید پچک جاتے ہیں۔ ٹھوڑی نمایاں ہو جاتی ہے تو سر چھوٹا دکھائی دیتا ہے سمجھائی نہیں دیتا کہ مونچھ اور داڑھی رکھیں یا نہ رکھیں۔

داڑھی رکھنے سے بعض مرتبہ ایسے لگتا ہے جیسے گردن پر چہرہ اُتار کر رکھ دیا گیا ہو۔

فارغ البال سر پہ ادھر اُدھر چند گنے چنے بال عجیب لگتے ہیں، اُس پر اُن بالوں کو سجانے کا انداز غضب ڈھاتا ہے۔ چند بالوں سے چندیا کو ڈھانکنے کی ناکام کوشش کی جاتی ہے۔ نتیجتاً مضحکہ خیز شکل تیار ہوتی ہے۔ سر کے پیچھے سے چند بالوں کو سائبان کی طرح تالو اور سر پہ لایا جاتا ہے۔ سیدھے کان کے پاس سے بچے کچھے بالوں کو سر کا طواف کروا کر بائیں کان کے پاس چھوڑا جاتا ہے۔ چار چھ بالوں کو اس کان سے اُس کان تک اس طرح جماتے ہیں کہ سر دو حصّوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ بعض لوگ سر کے اطراف بچے کچھے بالوں کو ضرورت سے زیادہ لانبا چھوڑتے ہیں۔ ایسے لگتا ہے جیسے گرما میں پانی ٹھنڈا رکھنے کے لیے مٹلیکے اطراف جھالر باندھی گئی ہو۔ فارغ البال سر کو بچے کچے بالوں سے سجانے کے اور بھی انداز ہیں۔ قارئین آس پاس فارغ البال سروں پر نظریں دوڑائیں اور لطف اٹھائیں۔

چونکہ فارغ البال شخص کو بال کم سے کم ہوتے ہیں انھیں سنوارنے اور سنبھالنے کی ضرورت نہیں پڑتی وہ تیل، کریم اور کنگھی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ کچھ پیسے بھی بچتے ہوں گے۔ اکثر لوگوں کی طرح ہماری یہ خام خیالی حقیقت کے برعکس ثابت ہوتی۔ گنے چنے بالوں کو اِدھر اُدھر گھمانے کے لیے کنگھی چاہیے اور انھیں ان کے مقام پر چپکانے کے لیے قیمتی کریم چاہیے جو صرف بالوں کو لگی رہے لیکن چندیا کو نہ چکائے۔ محنت اور مشقت سے جمائے بال کچھ ہی دیر اپنی جگہ پر قائم رہتے ہیں۔ ہوا کے ہلکے جھونکے سامنے والے شخص کا زور سے بات کرنا، ٹھنڈی سانس لینا، کھانسنا یا چھینکنا، فارغ البال شخص کے بالوں کے نظام کو درہم برہم کر دیتا ہے گنے چنے بالوں کو سمیٹنے اور انھیں پھر سے سر پہ سجانے کے لیے ہر دم کنگھی چاہیے۔ اگر آپ کو کنگھی کی ضرورت پڑے تو بلا جھجک فارغ البال شخص سے مانگئے، وہ آپ کو ناامید نہیں کریں گے۔ (لیکن ایک روایت کے مطابق آپ کے بالوں کی خیر نہیں)۔

فارغ البالی سے شناخت آسان ہوتی ہے۔ حلیہ بتلاتے میں سہولت رہتی ہے۔ ہمارے ایک دوست کا حلیہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ فارغ البال سر کو چار حصّوں میں تقسیم کیجیے۔ بائیں کان والے حصّہ میں ایک کالے رنگ کا مسئلہ ہے۔ ایک اور فارغ البال شخص کا حلیہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ موصوف کا سر آئینہ کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ دونوں کانوں کے درمیان چند گنے چنے بال ہیں اور بائیں طرف دس پندرہ بالوں کے درمیان سے مانگ نکالتے ہیں۔

فارغ البال سر کے بچے کچے بالوں کو تیل لگانا ایک آرٹ ہے۔ ذرا سی بد احتیاطی چکنائی کو سر پہ پھیلا دیتی ہے۔ سر چکنے لگتا ہے۔ بعض سر آئینہ کا کام بھی دیتے ہیں۔ ہم اپنے ایک دوست سے واقف ہیں جن کی بیوی کا میک اپ اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے شوہر کی چندیا میں اپنا عکس نہ دیکھ لیں۔ شوہر کے سر میں اپنا چہرہ دیکھ کر میک اپ کو فائینل ٹچس دیتی ہیں، ان کا سر پونچھتی ہیں اور پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پارٹی کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔

فارغ البال شخص کی بے بسی اور لاچارگی پر خود اپنے آپ کے بعد اگر کسی اور کو ہمدردی ہو سکتی ہے تو وہ حجام ہے۔ حجام فارغ البال شخص کا سر ایسی مایوسی کے عالم میں تکتا ہے جیسے کوئی کسان اپنی بنجر زمین کو دیکھ کر آہیں بھرتا ہے۔ بعض حجام بال برقرار رکھنے اور بال اُگانے پر تحقیق بھی کرتے ہیں۔ فارغ البال سر اُن کی تجربہ گاہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں جس دن بھی کوئی حجام یا خود فارغ البال شخص، فارغ البالی کا علاج دریافت کر لے گا وہ

اُسی رات مالا مال ہو جائے گا۔ حجام تجربہ کے لیے فارغ البال سروں کی تلاش میں رہتا ہے جب کہ فارغ البال اشخاص حجام سے منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ حجام کے پاس کیوں جائیں۔ دو چار بال خود ہی کیوں نہ کاٹ لیں حجام کے پاس جانے سے خدشہ لگا رہتا ہے کہ اس کی قلیچ تیچ کرتی تیز قینچی بالوں کی تلاش میں کہیں کان اور ناک بھی نہ لے۔ ویسے بھی حجام فارغ البال شخص کے سر پر بال تلاش کرنے اور اُن کے جمانے کا اندازہ دریافت کر کے بال کاٹنے کی اُجرت زائد لیتے ہیں۔

بچوں کو معلوم نہیں فارغ البال سر کیا اور کیسے لگتا ہے۔ اطراف گھوم پھر کر غور سے چکنے سر کا جائزہ لیتے ہیں۔ خوش ہوتے اور پھر سوال کرتے ہیں "انکل آپ کے بال کہاں گئے"؟ اس سوال کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ "بال چوہے کھا گئے" یا پھر یہ کہ "شرارت کرنے پر اللہ نے بال واپس لے لیے"۔ بعض بچے اپنے تجسس کا عملی اظہار بھی کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست کے لڑکے نے ہمارے فارغ البال سر کو دیکھ کر اپنی خواہش کا اظہار کیا "میں چاچا کے چاند پر جاؤں گا"۔ اس کے والد سمجھاتے رہے "بیٹا ایسے خطرناک کھیل نہیں کھیلا کرتے۔ وہاں پر کوئی سہارا نہیں ہے پھسل جاؤ گے"۔ لیکن لڑکے کی ضد بڑھتی گئی۔ آخر ہم نے کہا "کیوں بچے کو مایوس کرتے ہو"۔ ہم نے اپنا سر جھکایا اور لڑکے سے کہا "آؤ بیٹا اپنی خواہش پوری کر لو"۔ لڑکا ہمکتا ہوا آیا اور ہمارے شانوں پر سے ہوتا ہوا سر پر قدم رکھنا چاہتا ہی تھا کہ توازن برقرار نہ رکھ سکا لیکن نیچے گرنے کے بجائے فضاء میں قلابازی کھا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ لڑکے کے والد بہت خوش ہوئے "میرا لڑکا جمناسٹک کا کھلاڑی بنے گا"۔ ہمیں لقمہ دینا پڑا "باپ کا نام اور چچا کی چندیا روشن کرے گا"۔

سر اور چہرے کے بالوں سے عمر کم نظر آتی ہے ماتھے کی جھرّیوں پر سر کے بالوں کا پردہ کیجیے۔ گال اگر بڑھتی ہوئی عمر کی چغلی کھاتے ہیں تو داڑھی اور مونچھ رکھیے۔ برخلاف اس کے فارغ البال اشخاص اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتے ہیں۔ یوں بھی فارغ البالی بڑھتی ہوئی عمر کی نشانی ہے لیکن بعض لوگوں کو فارغ البالی اتنی جلد میسّر آتی ہے کہ محسوس ہوتا ہے موصوف کے ہاں جوانی آتی ہی نہیں، بچپن کے بعد سیدھے بوڑھاپا آیا۔ ہمیں خوب یاد ہے جب ہم اسکول سے کالج میں داخل ہوئے تو ہمارے ایک ہم عمر فارغ البال ساتھی کو ہم سبھی بشمول لڑکیاں "انکل" کہا کرتے تھے اور صاحب موصوف حسرت سے سر پر ہاتھ پھیر کر دُعا کرتے "خدایا تو سب کو گنجا کر دے یا میرا سر بالوں سے بھر دے"۔ اس ضمن میں ہم خود اپنی مثال بھی پیش کر سکتے ہیں۔ ہمیں اور ہماری بیگم کو ساتھ دیکھ کر کھسر پھسر ہوتی ہے "دیکھیے بزرگوار اپنی تیسری بیوی کے ساتھ آ رہے ہیں۔ یہ بوڑھے بھی نوجوان پہ ستم کرتے ہیں"۔ اب آپ ہی بتلائیں ایسے موقعوں پر فارغ البال لوگوں کو کیا کرنا چاہیئے۔

فارغ البال اشخاص کو بالوں کا سپورٹ نہ ہونے سے اپنے سر کی ضرورت سے زیادہ حفاظت کرنی پڑتی ہے۔ سر کو سردی اور گرمی زائد لگتی ہے۔ سر پر ذرا سی چوٹ بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ بال نہ ہونے سے بال بچنے کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ ایک فلسفیانہ خیال یہ بھی ہے کہ فارغ البال لوگ خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ایک احتیاطی تدبیر ہے۔ فارغ البال سر کا خوش اخلاقی سے پیش آنا ایک مجبوری ہے کبھی کبھی فارغ البال سر طنز اور ملامت کا نشانہ بن سکتا ہے۔ بالوں کے درمیان نہ ہونے سے بات ڈھول دھمکے تک بہت جلد جا پہنچتی ہے۔ فارغ البال اشخاص منکسر المزاج بھی ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ بال ویَر نہیں نکال سکتے۔ ان مجبوریوں

کے ساتھ فارغ البال سر کو کچھ فائدے بھی حاصل ہیں۔ کوئی ان کے بال بکھر نہیں سکتا، کوئی ان کے بالوں میں بندھ نہیں سکتا، جب بال ہی نہیں ہیں تو ظاہر ہے کبھی کبھی بات ہو، بال کھڑے نہیں ہو سکتے، کوئی ان کے بال کی کھال نہیں نکال سکتا اور نہ ہی کوئی ان کا بال بیکا کر سکتا ہے۔

فارغ البال سر کو ہماری فلموں میں بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ہیرو اپنے دوستوں سے فارغ البال سر جیت رسید کرنے کی شرط باندھتا ہے۔ گانے کے دوران فارغ البال سر پر طبلہ بجتا ہے۔ بعض سین میں اسکرین پر چمکتی چندیا کو مختلف زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے۔ تقریباً ہر فلم میں ویلن یا ویلن کا کوئی اہم چمچہ فارغ البال ہوتا ہے۔ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ہیرو کو للکارتا ہے۔ فارغ البال ویلن شاید فارغ البالی کی وجہ سے خطرناک اور لاقتور ثابت ہوتا ہے۔ ہیرو کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیتا ہے۔ ہیرو اس کے سر کا نشانہ لیتا ہے۔ دو تین مرتبہ خیر سے وہ بچ جاتا ہے لیکن آخر میں اس کی شکست فارغ البال سر میں چھوٹے شیشے، سیخ یا بندوق کی گولی سے دراڑ پڑنے پر ہوتی ہے۔

فارغ البالی کو یونہی خاموشی سے قبول نہیں کیا جاتا، فارغ البالی سے پیچھا چھڑانے کے لیے لاکھ جتن کیے جاتے ہیں۔ بالوں کو اگانے کے لئے دیسی طب کے مختلف نسخوں کو بھی آزمایا جاتا ہے۔ بال تو خیر سے نہیں نکل آتے لیکن بعض مرتبہ جلد داغدار ہو جاتی ہے۔ اس سائنسی دور میں جسم کے دوسرے حصوں سے بال نکال کر انھیں سر پر لگانے کی کوشش بھی ہوئی لیکن فارغ البال سر جیسی بنجر زمین پر نئی کونپلیں بھی نہ نکل سکیں آخر تمام تدابیر کے ناکام ہونے پر فارغ البال لوگ اپنے سروں کو نقلی بالوں سے سجاتے ہیں۔ اپنی پسند کے بالوں کی وگ پہننے لگتے ہیں۔ نقلی چیز آخر نقلی ہی ہوتی ہے۔ آسانی سے پہچان لئے جاتے ہیں۔ سر پر وگ رکھنے سے احتیاط بھی لازم ہوتی ہے۔ تیز ہوا کی لے پر وگ کے اُڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ سر کو زور سے ہلانے دوڑنے حتیٰ کہ رکوع میں جانے پر وگ جھکنے سر سے پھسل جانے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔ دھول دھپّے کے دوران بہت آسانی سے وگ دوسرے کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ غرض جناب فارغ البال سر کو وگ میں امان نہیں ملتی۔ اگر کہیں فارغ البال سر کی حفاظت ہو سکتی ہے تو وہ پگڑی باندھنے یا ٹوپی پہننے سے ہوتی ہے۔ یہ بات ہمارے ایک بزرگ نے بتلائی تھی۔

△▽

غزل

سرِ منبر ہیں جن کے لب پہ کوہِ طور کی باتیں
ہیں اُن کے تخلیئے میں دُخترِ انگور کی باتیں

خدارا چھیڑ اے ناصح شراب و حور کی باتیں
نہ کر ہم سے کفن کی، قبر کی، کافور کی باتیں

نہ اُس نے حالِ دل پوچھا نہ مَیں نے کچھ بتایا ہے
کئی گھنٹے ہوئیں ہم میں قریب و دُور کی باتیں

پسِ پردہ امیرِ شہر کے چمچوں میں شامل ہیں
جو ہر جلسے میں کرتے ہیں بہت جمہور کی باتیں

نئی یہ رسم نکلی ہے کہ سارے اہلِ سرمایہ
بڑے جذبے سے کرتے ہیں غمِ مزدور کی باتیں

ہم اپنے شہر کی کوئی خبر سُن پائیں، ناممکن
سُناتا ہے ہمیں ٹی وی ہمارا دُور کی باتیں

خداوندا، مجھے اک چانس ایسا دے کہ سُنواؤں
اُنہیں تنہائی میں اک دن، دلِ مہجور کی باتیں

مرا جی چاہتا ہے قتل ہی ناصح کو کر ڈالوں
اُنہیں اتنی پسند آئی ہیں اس لنگور کی باتیں

نسیم اب تو کلاشنکوف کلچر کا زمانہ ہے
کرو مت اب یہاں قانون کی، دستور کی باتیں

یوں زُہد کا اوڑھ کر لبادہ!
آسانی ہوتی ہے محتسب کو
پی سکتا ہے اب وہ مئے زیادہ!

○

عجب کتنا اُس کا موٹاپا لگے
ابھی عمر اُس کی ہے چودہ برس
مگر دیکھنے میں وہ آپا لگے

○

تحفہ اُلفت کا اَور کیا دوں گا؟
مَیں تو شاعر ہوں اس لیے اُس کو
اپنی تازہ غزل سُنا دوں گا

لیکر چمٹا یکدم
بیگم جونہی لپکی
شوہر سمٹا یکدم

* جاپانی صنفِ ہائیکو میں اُردو مزاح کی "ملاوٹ" کرکے یہ چند "مزاحیکو" تخلیق کئے گئے ہیں۔ پڑھیے اور اپنی رائے سے نوازیئے جس کا مزاحیہ ہونا ضروری ہے۔ (ن س)

انوار انصاری (رائچور)

تالیاں

تالیاں....

تالیاں... تالیاں...

کھیل کا میدان ہو یا شعر و ادب

اجتماع، محفل موسیقی کی رنگین بزم ہو یا تقسیم

اسناد کا جلسہ اولمپک کھیلوں میں اسپورٹس مین کی

پریڈ ہو یا کرکٹ کھلاڑیوں کو شیلڈ عنایت کرنے کا موقع، برتھ ڈے

منانے کا جگمگاتا ماحول ہو، یا کسی صاحب فن کو خوش آمدید کہنے کا سہانا سماں

ہر جگہ تالیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے گی گویا تالیاں ہماری رنگین زندگی کا ایک

حصّہ ہیں۔ ان سے بچنا محال ہے ــــــ تالیوں کا تعلق فتح و شکست سے وابستہ ہے کیوں کہ

فتح و شکست اس دور کا مقدر ہے۔ فتح و شکست سے متعلق نئے نئے خواب دیکھنا انسان کا پیدائشی حق

اور کوئی طاقت انسان کو اس حق سے محروم نہیں کر سکتی: تالیاں انسان کے حق میں اہم رول ادا کرتی ہیں ــــ

تالیاں ان

دنوں شہرت کا ذریعہ

ہیں: تالیوں ہی سے ملکی اور

بین الاقوامی رشتوں میں پائیداری آتی ہے۔

روس کے مشہور و معروف شاعر تالستائی نے مرتے وقت

دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک یہ کہ ان کی قبر مٹی کی بنائی جائے اور وہاں

بنائی جائے جہاں عام لوگ آسانی سے گزرتے ہوں اور دوسری یہ کہ

ان کی قبر پر پھول نہ چڑھائے جائیں۔ میرے شہر کے ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر کو

تالستائی کی یہ وصیتیں یاد نہیں تھیں مگر ایک بار کا ذکر ہے کہ محفلِ مشاعرہ میں آتے ہی انھوں نے

سامعین اور مشاعرہ کے کنوینر سے دو باتوں کی گذارش کی۔ اوّل یہ کہ ان کے اشعار پر داد کے ڈونگرے نہ برسائے جائیں بلکہ خراب شعر پر زور زور سے تالیاں بجائی جائیں اور دوم یہ کہ اختتامِ مشاعرہ پر شاعروں کو نذرانہ کی بجائے ان کو "تالیوں" کا ایک کیسٹ پیش کیا جائے۔

بچپن ہی سے محفلِ مشاعرہ میں شرکت کرنے کی تمنا میرے دل میں کروٹیں لے رہی تھی مگر ایسے مشاعرہ میں شرکت کا خاطر خواہ موقع نہیں مل رہا تھا۔ ایک بار مجھے ایک انشائیہ نگار دوست کی وساطت سے مشاعرے میں شرکت کا موقع نصیب ہوا۔ محفلِ مشاعرہ سے متعلق جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر اس محفل کو پایا۔ اس محفل میں شاعر کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور تالیاں بجا بجا کر ان کو خوش آمدید کہا گیا۔ حسبِ روایت شاعروں کے اچھے اشعار کو دبا دیا گیا اور ناقص اشعار کو بارہا سراہا گیا اور سامعین نے دل کھول کر داد دی یعنی تالیاں بجا بجا کر شاعروں کو سراہا جو گاگا کر اور ایکٹنگ کے ذریعہ اسٹیج پر اپنا کرتب دکھا رہے تھے۔

کئی بار مجھے سیاسی میٹنگوں میں بھی شریک ہونے کا موقع ملا ہے ان سیاسی جلسوں میں بھی میں نے لوگوں کو تقریر کے دوران تالیاں بجاتے دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تالی بجانا اب ہماری عادت بن چکی ہے کونسا نیتا چھوٹا ہے یا بڑا اس کا اندازہ آپ اس کے کارناموں سے نہیں لگا سکیں گے اس کا اندازہ تو صرف تالیوں سے لگایا جاتا ہے۔ جس نیتا کی تقریر میں جتنی زیادہ تالیاں بجتی ہیں سمجھئے وہ اتنا ہی بڑا نیتا ہے۔ مگر کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ دورانِ تقریر اگر کسی نیتا کی گاڑی لائن سے اترنے لگتی ہے تو لوگ تالیاں بجا کر اس کی غلطی کا احساس بھی دلاتے ہیں گویا تالیاں بریک کا کام کرتی ہیں اور گیر بدلنے کا بھی

انسان عمر سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے دل سے کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ ایک روز میرے شہر میں ایک ان "بر موسمی نیتا" مذہب کا لبادہ اوڑھے آئے۔ ویسے تو میں نے اپنی زندگی میں ہر قسم کے نیتا دیکھے ہیں لیکن یہ نیتا اپنے ڈیل ڈول اور رنگ ڈھنگ میں نرالے تھے۔ باوجود عمر رسیدہ ہونے کے لباس شوخ اور بھڑکیلا زیبِ تن کیا تھا۔ بہروپ بدلنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ خاموش رہتے تو معلوم ہوتا کہ کوئی سنیاسی حبسِ دم کئے جگ سے لو لگائے بیٹھا ہے اور جب بولنے پہ آتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے زلزلہ آرہا ہے اور گرد و پیش کی زمین حرکت کرنے لگی ہے۔ کبھی کبھی تقریر کے دوران زور سے نعرہ لگاتے۔ ان کے نعرہ پر تالیاں بجائی جاتیں۔ تالیوں کی آواز سن کر گرجدار نعرہ لگاتے اور اپنا رُخ جنس لطیف کی جانب پھیر دیتے کیوں کہ نیتا جی کا قول ہے کہ ہر انسانی فعل کا محرک جنسی میلان ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تاک جھانک اور اشارہ بازی کی حرکتوں سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ ابھی تو وہ جوان ہیں۔ ان کی اس حرکت پر دل کھول کر تالیاں بجائی گئیں۔

تالیوں کا شمار بھی اب فنونِ لطیفہ کے زمرے میں ہونا چاہیئے۔ تالیاں کب بجائی جائیں، کس طرح بجائی جائیں اور کس موقع پر بجائی جائیں اس کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ جس طرح قرض کا لینا اور دینا ایک فن ہے دوستی کو بڑھانا اور گھٹانا ایک آرٹ ہے، بیوی سے راز پوشیدہ رکھنا ایک ہنر ہے اسی طرح تالی بجانا بھی ایک فن ہے، تالی بجا بجا کر کسی کی آبرو پر ضرب لگانا ایک آرٹ ہے اور بے وقت تالی بجانا ایک ہنر ہے۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجائی جاتی ہے۔ اس کہاوت کے پیچھے یہ راز پوشیدہ ہے کہ دنیا میں انسان تنہا سب کام انجام نہیں دے سکتا ہے یعنی کسی کام میں جب تک دوسروں کا

شامل نہ ہوگی وہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ کیا خوب سود النقد ہے اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے! تالی جب تک دونوں ہاتھ سے نہیں بجائی جاتی اس میں آواز نہیں پیدا ہوتی۔

آئے دن تالیوں کے استعمال سے اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ زندگی میں اس کی اہمیت مسلّم ہو چکی ہے۔ تالیوں کی کمی بیشی یعنی اتار چڑھاؤ میں زیادہ دخل انسان کی ذہنی کیفیات کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ تالیوں سے انسان کے نفسیاتی پیچ و خم کا ازالہ ہوتا ہے۔ پریشان کن اور اداس زندگی میں تالیوں کی وجہ سے مسرّت و شادمانی کے کچھ لمحے اگر میسّر آجائیں تو بُرا کیا ہے؟!

غزلیں

اسمٰعیل ظریف
حیدرآباد

عاشق فراقِ یار میں جو بیقرار ہے
ہذیان بک رہا ہے اُسے چھپنے بخار ہے

پیچھے سا بھوت لڑکے کے سر پر سوار ہے
فلمی پری کے عشق میں [illegible] ہے

سالا جو ہے وزیر کا وہ ٹھیکیدار ہے
کنٹور میں بھی اُسی کا بڑا کاروبار ہے

اب اس غزل کی داد مجھے نقد چاہیئے
کچھ سابقہ کی داد بھی تم پر اُدھار ہے

ماں باپ سے بنی نہیں شاید اسی لیے
بیوی کو لے کے بیٹا بھی گھر سے فرار ہے

فیشن زدہ بھتیجے کے اخلاق دیکھیے !
ماچس چچا سے مانگ کے پیتا سگار ہے

کالا کلوٹا لڑکا ہے لڑکی حسین ہوا
پیپر میں اس کے رشتے کا آج اشتہار ہے

جوڑے کی اُس کو دے سکے رقم کیجئے مدد
پیدائشی نکمّا ہے بے روزگار ہے

سودے میں مارتا ہے وہ پیسے کبھی کبھی
نوکر ہمارا واقعی ایماندار ہے

میک اپ کا دور ہے میاں فیشن بدل گیا
بستی کی اب دھوتی ہے نہ سولہ سنگھار ہے

ماڈل پرانا اور کلر بھی بگڑ گیا!
بھائی کی اب سواری میں جو کالی کار ہے

واعظ بھی بیٹھے ہوں گے وہاں انتظار میں
اب بار میں چلیں گے فضا خوشگوار ہے

یہ لیڈری بھی کھیل نہیں ہے کوئی حضور
پبلک جہاں بگڑ گئی جوتوں کا ہار ہے

اپنے پرانے شہر کا نقشہ تو دیکھیے
کچرے کا ڈھیر ہے کہیں گرد و غبار ہے

یہ جو خزاں کے بعد خزاں ہے یہاں ظریفؔ
لگتا ہے اب بہارِ چمن سے فرار ہے

رؤف رحیم
(حیدرآباد)

○

قرض لے کر ادا نہیں کرتے
شاعر اس کے سوا نہیں کرتے

ہم کسی کا بھلا نہیں کرتے
کام بے فائدہ نہیں کرتے

سوکھے پیڑوں کی طرح یہ لیڈر
ہم پہ سایہ ذرا نہیں کرتے

لاکھ وعدے کریں گے وہ لیکن
کوئی وعدہ وفا نہیں کرتے

رکھ تو لیتے ہیں ہم مشیر اپنے
پر کبھی مشورا نہیں کرتے

پیروی کیا کریں گے غالبؔ کی
قرض کی جب پیا نہیں کرتے

آسماں کو زمیں لکھتے ہیں
لوگ جدت میں کیا نہیں کرتے

بال بلی کے مونڈتے ہیں رحیمؔ
لوگ فرصت میں کیا نہیں کرتے

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

مرو تو سارے...!

سُنتے ہیں کہ قبرستان ایک زمانے میں عبرت حاصل کرنے کا مقام ہوا کرتا تھا لیکن فی زمانہ حصولِ زر کا ذریعہ بنتا جارہا ہے۔ زمین جب سے قیمتی ہوگئی ہے لوگ قبرستانوں میں بسنے لگے ہیں۔ اب لوگ مرنے کا انتظار نہیں کرتے بلکہ مرنے سے پہلے ہی قبرستان میں جا مرتے ہیں۔ جہاں ایک قبر کی جگہ دیکھی وہاں ایک کُنبہ آباد ہوگیا۔ بعض وقت تو سرحدوں کا تعین تک مشکل ہوجاتا ہے کہ کہاں تک قبرستان تھا اور کہاں سے "مکانستان" شروع ہورہا ہے چنانچہ بعض گھروں میں قبریں ملتی ہیں تو بعض قبروں کے درمیان گھر۔

ایک دفعہ کی بات ہے کہ ہم ایک تقریب کے موقعہ پر ایک گھر میں مدعو تھے۔ ایک مقام سے ٹیک لگائے بیٹھ گئے ہندوستانی جوانی نے اس قدر بوڑھا کر دیا ہے کہ گاؤ تکیہ کے بغیر بیٹھا نہیں جاتا اور سہارا لیے بغیر ہم اُٹھ نہیں سکتے۔ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا تو الیکشن میں کھڑے ہونے سے زیادہ مشکل ہے۔ جب قدرے آرام مل گیا تو ہم نے اپنے گاؤ تکیہ کی سختی پر غور کرنا شروع کر دیا کیوں کہ زبان اور تکیہ سے متعلق ہمارا نظریہ ہے کہ ان دونوں کو نرم ہونا چاہیئے۔ قدرے ہاتھ بڑھا کر ٹٹولا۔ ایسا لگا گویا اونٹ کی پیٹھ سہلا رہے ہوں حیرت بڑھی تو بچشم سر ملاحظہ کیا۔ پتہ چلا کہ وہ کسی بدنصیب کے قبر کی تعویذ ہے۔ بدن میں جھرجھری سی پیدا ہوگئی۔ آنکھوں میں کفن پھر گیا۔ کانوں میں حضرات منکر نکیر کی صدائیں گونجنے لگیں۔ بغیر کسی سہارے کے فوراً ایستادہ ہوگئے جیسے ہم ہندوستانی جوان نہیں دوبئی کے بوڑھے ہوں اور پھر بھاگم بھاگ۔ اس دن سے ہم جب بھی کبھی تقریب میں جاتے ہیں پہلے خبر لے لیتے ہیں کہیں کوئی قبر نہ ہو۔

ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ آدمی قبر سے اتنا ڈرتا کیوں ہے جب کہ قبر شکم مادر کی طرح ناگزیر واقع ہوئی ہے۔ ایک مقام کہ موت سے قبل کا ہے تو دوسرا کہ موت کے بعد کا مفر دونوں سے غیر ممکن۔ ہمارا یہ عالم ہے کہ ہم ایک قبر سے اس درجہ وحشت زدہ ہوتے کہ بریانی کو قربان کر دیا حیرت ان لوگوں پر ہے جو کئی کئی قبروں کو نظر انداز کرتے ہوئے چار دن زندگی کو چالیس روزہ کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ چند دن پہلے جہاں جگمگاتی ہوئی قبریں اپنی کسمپرسی کا رونا رو رہی تھیں وہاں آج ایک عمارت کا ڈھانچہ ایستادہ ہے اور لوگ ہاتھ پاؤں پھیلا کر دوسروں کی قبروں پر سوتے ہیں اور خود اس بات سے بے خبر ہیں کہ ان کی قبروں پر کیا کیا جائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ ایسے بدبخت لوگوں کی قبریں ہی نہیں ہوں گی کہ اچھا یا بُرا حال ہونے کی اطلاع بھی ہوسکے۔

ہمارے ایک دوست جب ڈاکٹر ہو گئے تو ہم نے ان سے کہا کہ کیوں نہ ہم ایک بڑی بلڈنگ لے کر آدھی آدھی دوکان کھول لیں اُنھوں نے حیرت سے پوچھا کہ میں تو اپنا کلینک کھول لوں گا۔ تمہارا کیا ارادہ ہے۔ ہم نے بہت سکون سے کہا کہ جب تم ڈاکٹر ہو گئے ہو تو اب مجھے بادوہی کفن کی دوکان کھول لینا چاہیئے، خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے .... قبرستانوں سے متصل کفن کی دوکانیں بھی ملتی ہیں جن پر بیٹھنے والے کو لوگ مغموم لگا ہوں سے دیکھتے ہیں خواہ وہ شطرنج کھیلنے ہی کیوں نہ بیٹھا ہو۔ اشتہار بازی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے ایک کفن کی دوکان پر یہاں تک لکھا دیکھا کہ "دو بڑے کفن کے ساتھ ایک چھوٹا کفن فری"

جب سے ہم نے سنا ہے کہ تکفین و تدفین بہت مہنگی ہو گئی ہے ہم اپنے اور اپنے لواحقین کی درازی عمر کی دعائیں بہت پابندی سے کرنے لگے ہیں۔ ہم ایجاز بیانی کو اعجاز بیانی سمجھتے ہیں اس لیے زیادہ تر گفتگو اشاروں ہی میں کر گذرتے ہیں۔ لوگ سمجھ جاتے ہیں تو مسرور ہوتے ہیں اور اگر نہیں سمجھتے تو مغموم بھی نہیں ہوتے۔ ہمارا ایقان ہے کہ اگر اللہ والے اللہ کی قدرت سے اپنی قبروں سے برآمد ہوں تو وہ اپنی قبروں کے سارے غلاف ہندوستان کے یتیموں کے بدن اور بیواؤں کے سر ڈھانکنے میں صرف کر دیں گے۔ لیکن اس کے باوجود ہم ان کی مزاروں پر چادر اور غلاف چڑھانے کو ناجائز ہرگز نہیں سمجھتے۔

جب ہم بادشاہوں کے مزارات پر حاضر ہوتے ہیں تو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ انھیں مرنے کا مزید یقین تھا کہ اپنی زندگی میں اپنی قبر آپ تیار کروالیتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی قبریں بھی موتی محل سے کم نہیں ہوتیں۔ وہ وہ نقش و نگار اور وہ وہ زیب و زیبائش ہوتی ہے کہ جسے دیکھ کر واقعی مرجانے کو جی چاہے۔ تاج محل کو لیجئے محض دو عدد قبروں کے علاوہ اس میں اور کیا ہے لیکن سیاح ہیں کہ اُڑ کر آتے ہیں، شاعر ہیں کہ نظمیں کہتے ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ سیاحوں کے لیے کیا ہندوستان میں لے دے کے دو قبریں ہی رہ گئی ہیں حالانکہ شاید تاج محل سے زیادہ اہمیت اس بے یار و مددگار عورت کی ہے جو اپنے معصوم بچے کو بغل میں لیے نئے پل پر دسمبر کی راتیں کاٹتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اس آگ کو کون دیکھے گا انھیں آگرہ کافی ہے۔

ہم نے ایک روز باجے والوں سے دریافت کیا کہ تم لوگ قبرستانوں، درگاہوں وغیرہ کا بھی پاس و لحاظ نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا صاحب اگر ہم بھی قبرستانوں کا احترام کرنے لگیں تو پھر باجہ یا تو دولھے کے گھر بجے گا یا دولھن کے گھر، اور ہم باجے والوں کے بارہ بج جائیں گے۔

عموماً فوج کی چھاؤنیاں اور مُردوں کے قبرستان شہر کے باہر بنوائے جاتے تھے لیکن پیدا ہونے کی نرخ مرنے کی رفتار سے دو قدم آگے ہی رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ قبرستان شہر کے بیچوں بیچ ہو جاتا ہے اور نئے قبرستان پھر شہر سے دور بنائے جاتے ہیں۔ اس کلیہ غیر معتبر کے اعتبار سے ہمیں قبرستانوں کے بیچ شہر میں پائے جانے پر ہرگز حیرت نہیں ہوتی لیکن جب دو ایک قبروں کو عین سڑک کے بیچوں بیچ پاتے ہیں تو ان قبروں پر فاتحہ خوانی کے علاوہ ماتم حیرانی بھی کرتے ہیں کہ آخر اس جوڑے کو کیا سوجھی کہ عین سڑک پہ دراز ہو گئے حالانکہ بیچ سڑک پہ دراز ہو جانا تو عام آدمی کا کام نہیں یہ خاص کا کام تو صرف خاص خاص لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں۔ ہمیں یہ بھی خیال آتا ہے کہ ممکن ہے وہ یہ سمجھ رہے ہوں کہ امتداد زمانہ کے سبب یہاں اک اور تاج محل

جائے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی قبروں پر تاج محل بنے یا نہ بنے ان کی قبروں کے پاس تاج محل ہوٹل ضرور
ہو سکتی ہے۔ ـــــ ہم اپنی موروثی کمزوری کے سبب انسانوں کی بے حرمتی تو برداشت کرسکتے ہیں لیکن
ں کی بے حرمتی برداشت نہیں کرسکتے۔ ہمارا خیال ہے کہ مرنے کے بعد کسی کو زحمت دینا انسان سوز حرکت
. قبرستانوں کے اطراف قدآور دیواریں اٹھادی گئی ہیں۔ اس سے کوئی اور فائدہ ہو یا نہ ہو کم از کم فصیلوں کو
ئدہ مزید ہوا کہ اب اندر وہ کیا کر رہے ہیں کسی کو معلوم نہیں ہوتا۔ اس سہولت سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے
یت مند اپنی ہر ضرورت بغیر کسی جبر و اکراہ کے پوری کر گزرنے سے گریز نہیں کرتا۔

بعض قبرستانوں کی زبوں حالی دیکھ کر ہمیں اپنی زبوں حالی یاد آجاتی ہے۔ کچرے کا وہ ڈھیر کہ آدھی
بلکہ آدھا آدھا قبرستان انبار نجاست میں پوشیدہ نظر آتا ہے۔ بدبو کا یہ عالم کہ آدمی قبرستان جانے کو
ں قرار دے کر گھر ہی میں فاتحہ خوانی کرلیتا ہے۔ زندہ جانور مردہ جانور سے شوق فرماتے نظر آتے ہیں۔ دیوانے
بیٹھتے پھرتے ہیں۔ بکریاں قبروں پر چڑھ کر چڑھائی ہوئی چادریں دوسری قبروں پر لے جاتی ہیں۔ بعض قبروں
یوں پر گل و لالہ کی بجائے کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ کچھ نیم وا قبروں میں مختلف تعویذیں، گنڈے، فلیتے، پڑھے
لیمو اور جھاڑے ہوتے کیلے بھی جھانکتے نظر آتے ہیں۔ پہلے ملا کی دوڑ مسجد تک ہوا کرتی تھی اب قبرستان
ہے۔ بچے "اعل" بنا کر گولیاں کھیلتے ہیں اور بڑے "مانجھا" سوت کر "پتنگ" اڑاتے ہیں۔ مندرجہ بالا جاکول
شاہدہ کرنے کے لیے کسی عینک کی ضرورت نہیں کسی دن تن تنہا قبرستان چلے جائیے اور بہ نظارہ سے چشم بینا سے
آئیے۔

جب قبرستان میں جنازہ لایا جاتا ہے تو ہر کاندھا دینے والا کچھ نہ کچھ مشورہ دینے کو میت کے لیے کار ثواب
ہے اور وہ وہ مشورے دیتا ہے کہ مردہ بھی کفن پھاڑ کر فرار ہونے کی کوشش کرے۔ چنانچہ ایک دفعہ
جنازہ کو قبر میں اتارا جانے والا تھا۔ ہر شخص دوسرے سے کہتا تھا "آپ اترئیے" الغرض ایک صاحب نے
دیا اس کو زندگی بھر کے لیے اتر جانا ہے۔ ہم نے کمر ہمت باندھی اور قبر میں اتر گئے اب جو صاحب اوپر
ہ وہ ہدایات جاری ہوئیں کہ خدا کی پناہ۔ کوئی کہتا ہاتھوں پر لے لو۔ کوئی کہتا مضبوط پکڑو۔ کوئی بولتا
طرف ہٹ جاؤ۔ دوسرا کہتا وہیں کھڑے رہو اور سنبھال کر۔ کسی نے جھلا کر کہا تم احمق ہو اوپر آجاؤ۔ اس پر دوسرے
نہ آگیا زور سے وہ لاحول پڑھنے لگے۔ اب تو سبھی کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ ڈھیلے سرہانے۔ کفن کی ڈوری
ل دو۔ پوریا اس طرف۔ صورت دکھاؤ۔ مٹی گرنے نہ پائے۔ "بنڈہ" ہٹاؤ۔ یا دو ہٹو کفن بند کرو۔ چہرہ قبلے
انب۔ قل کے ڈھیلے۔ اور لو۔ یہ بھی لو۔ سیدھے ہاتھ سے۔ یہ تبارک کا بڑا ڈھیلا۔ یہ مشورے تھے کہ احکام
ہم عمل کیے جارہے تھے بے چوں و چرا۔ ہم نے سوچا کہیں خود مرے بھی ہیں ایک آدھ مشورہ سے نوازنے
کی کوئی گنجائش نہیں خوف تھا کہ اگر ہم ان حضرات کی رتی برابر بھی نافرمانی کریں تو ہمیں اوپر نہیں
یا جائے گا۔ اس دن ہم نے عہد کرلیا کہ اب قبر پر مر کر ہی جائیں گے کیوں کہ مرنے سے پہلے قبر میں
ا جیتے جی مرنے کے مترادف ہے اور ہم مرنے سے پہلے ہرگز مرنا نہیں چاہتے ۔!

◆◆

رشید عبدالسمیع جلیلؔ
(حیدرآباد)

غزل

خدا سرسبز رکھے اس زمینِ حسن افزاء کو
تولّد ہم ہوئے جس پر ستانے اپنی دایا کو

چلے آتے ہیں سہرا باندھ کر نواب زادے یوں
کہ ہے لائق نہ اب وہ منہ دکھانے اہلِ دنیا کو

اُچھل کر آ گری جوں ہی ڈلی مصری کی قدموں میں
اٹھا کر جیب میں رکھ لی کھلانے اپنی بٹیا کو

کبوتر پالنے ہیں شوق سے دانہ چگاتے ہیں
تمیز اتنی ہی بس باقی کہ نر کہتے ہیں مادہ کو

وہ ہم کو منع کرتے ہیں سدا سگریٹ نوشی سے
مگر خود پان میں کھاتے ہیں زردہ اور تمباکو

نئے عاشق جلانے پر تلے ہیں بستیاں اپنی
نکل جاتے گریباں پھاڑ کر وہ دشت و صحرا کو

نکل جائے گا یہ سرمایۂ شعری بھی ہاتھوں سے
پتہ چل جائے گا جس روز ٹاٹا اور برلا کو

بہت ہی مختصر ہے داستانِ دل جلیلؔ اپنی
لڑکپن ہی میں ہم نے کھو دیا تھا اپنی لیلیٰ کو

اسلم عمادی
(حیدرآباد)

دفتر کا خاص آدمی

(اختر الایمان کی نظم "شیشے کا آدمی" کی پیروڈی)

اٹھاؤ ہاتھ کہ حرفِ دُعا بلند کریں
ملازمت کا چلو ایک دن تمام ہوا

خدا کا شکر بجا لائیں آج کے دن بھی!
نہ کوئی کام کیا ہم نے اور نہ کام ہوا

کہ جس سے مسئلہ کوئی بھی حل ہوا ہوتا!
ضمیر جاگتا اور اپنا امتحاں ہوتا

خدا کا شکر بجا لائیں آج کا دن بھی!
اسی طرح سے کٹا، دیر سے گئے دفتر

پیالی چائے کی پی، خبریں دیکھیں کرسی پر
ثبوت بیٹھے بصیرت کا اپنی دیتے رہے

دو گھنٹہ قبل پلٹ آئے گھر جو شام ہوئی
اور اگلے روز کی تفریح کا خیال لیے

ڈرے ڈرے سے ہوئے بیوی کی تیز باتوں سے
لیے دیے یونہی بستر پہ جا کے لیٹ گئے

دلیپ سنگھ
(نئی دہلی)

محبت کا امپورٹیڈ نسخہ

کردار:-

۱. رام لال
۲. پاروتی
۳. رام پیارے
۴. روزی

(پہلا سین)

[رام لال کا گھر۔ پاروتی ٹفن میں کھانا رکھ رہی ہے۔ رام لال دکھائی نہیں دیتا لیکن اُس کے گانے اور پانی کے پینے کی آوازوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ غسل خانے میں نہا رہا ہے]

رام لال: [گاتا ہوا] اکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا جی چلے نہیں جانا۔ کہ چلے نہیں جانا۔ او چلے نہیں جانا۔

پاروتی: ہائے ہائے کیوں دماغ چاٹ رہے ہو؟ دو گھنٹے سے ٹیں ٹیں لگا رکھی ہے۔

رام لال: پاروتی، اگر تم کہیں قریب ہو تو ذرا تولیہ پکڑا دینا۔

پاروتی: آنکھیں کھول کر دیکھو تولیہ کھونٹی پر لٹک رہا ہے۔ میں کہتی ہوں دو گھنٹے ہو گئے ابھی تک تمہارا اشنان نہیں ہوا کیا؟ اندر کیا کر رہے ہو؟ اب نکلو بھی۔

رام لال: نہیں پاروتی ابھی باہر نہیں آ سکتا، مجبوری ہے۔

پاروتی: کیوں باہر کیا کرفیو لگا ہوا ہے؟

رام لال: جب تک بنٹی اسکول نہ چلی جائے میں باہر نہیں آ سکتا۔

پاروتی: بنٹی تو کب کی چلی گئی۔ اگر ہوتی بھی تو کیا وہ تمہیں کاٹ کھائے گی۔

رام لال: [باہر آتے ہوئے] اگر وہ چلی گئی ہے تو پھر ڈر کا ہے کا۔ لو باہر آ گیا۔

پاروتی: پہلے تو بس ایک مجھ سے ہی تنگ تھے اب کیا بیٹی سے بھی تنگ آ گئے ہو؟

رام پیارے: جنگ کے میدان میں کودنے سے پہلے پوری بات تو سُن لیا کرو ڈارلنگ۔ بنٹی صبح صبح اُٹھ کر مجھ سے سوال پوچھنے شروع کر دیتی ہے۔ تم جانتی ہو وہ پڑھتی ہے ماڈرن کانوینٹ میں اور مجھے گنگا داس بشن داس اسکول سے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک کئے بیس سال ہو چکے ہیں۔ اس کے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس لیے غسلخانے کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا ہوں اور نکلتا تب ہوں جب وہ اسکول چلی جاتی ہے۔

پاروتی: سب باپ اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں، بنٹی اگر تم سے کبھی کوئی سوال پوچھ لیتی ہے تو کیا گناہ کرتی ہے۔

رام لال : وہ تو ٹھیک ہے جناب پر اُس کے سوال تو سنو۔ کل پوچھ رہی تھی ڈیڈی دھرتی کا وزن کتنا ہے۔ ایک بار تو میں چکرا گیا لیکن ہوں تو اُسی کا باپ۔ گردن اکڑا کر کہہ دیا دس کھرب بارہ لاکھ ننانوے ہزار چھ سو بیاسی کلو گرام ابھی میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ کہنے لگی۔ اب اس میں سے ہمارے گھر کا وزن گھٹا کر بتاؤ باقی کتنا رہ گیا؟ اب تم ہی بتاؤ پاروتی غسل خانے میں نہ چھپ جاؤں تو کہاں جاؤں؟ . . . . .

[ایک وقفے کے بعد] پاروتی تمہیں اتنی ہنسی کی بات سنائی پر تمہیں ذرا ہنسی نہیں آئی۔

پاروتی : میرے پاس ہنسنے کا ٹائم نہیں ہے۔ چلو ناشتہ کر لو۔

رام لال : ارے گولی مارو ناشتے کو۔ ناشتے کے بغیر بھی آدمی زندہ رہ سکتا ہے۔ خوش رہنا سیکھو پاروتی خوش رہنا۔

پاروتی : [روتی آواز میں] ہاں ہاں مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ مجھے تو سبھی کچھ سیکھنا ہے۔ میں نالائق ہوں بیوقوف ہوں۔ جاہل ہوں۔

رام لال : ایسے جی پاروتی۔ کیوں بات کو الٹا پلٹا کر لڑنے کے راستے نکال لیتی ہو۔

پاروتی : جی ہاں مجھے تو سوائے لڑنے کے کوئی کام ہی نہیں ہے۔ بھگوان میں مر جاؤں تو اچھا ہے۔

رام لال : چلو چھوڑو۔ اس وقت شاید تمہارا موڈ کچھ اچھا نہیں ہے۔ لاؤ ناشتہ دو، دفتر کو دیر ہو رہی ہے۔

پاروتی : ناشتہ میز پر پڑا ہے کھا لو۔

رام لال : [میز کے پاس جا کر] واہ واہ بھرتہ بنا ہے۔ پاروتی تمہیں کیسے پتہ چلا کہ آج میں بھرتہ کھانے کی سوچ رہا تھا۔ [پاروتی کوئی جواب نہیں دیتی]

رام لال : [ذرا سا چکھ کر منہ بناتا ہے] پاروتی بھرتے میں نمک کچھ زیادہ ہے تم نے چکھ کر دیکھا۔

پاروتی : ضرور زیادہ ہوگا۔ مجھ سے کوئی کام ٹھیک کیسے ہو سکتا ہے۔ مجھے آتا کیا ہے؟ نہ گھر سنبھالنا نہ کھانا بنانا۔

رام لال : اصل میں میں جلدی میں غلط بول گیا۔ بھرتے میں نمک زیادہ نہیں ہے۔ نمک میں بھرتہ کم ہے۔

پاروتی : اب باتیں نہ بناؤ۔ میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ میرا [illegible]نا میرا اٹھنا، میرا بولنا، میرا چلنا، کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ [روہانسو انداز میں] بھگوان مجھے اس دنیا سے اٹھا لو تاکہ تمہیں مجھ سے چھٹکارا ملے۔ اسی وقت اٹھا لو۔

رام لال : ایسا نہ کہو پاروتی، دفتر کا وقت ہو رہا ہے پھر کبھی سوچنا۔ اور ویسے بھی . . . .

[دروازے پر دستک]

رام بلاس : [باہر سے] رام لال بھائی دفتر نہیں جانا کیا؟ دیر ہو رہی ہے۔

رام لال : آیا یار بس جوتے پہن رہا ہوں۔

رام بلاس : جلدی کرو بھائی، ورنہ بس نکل جائے گی۔

[رام لال باہر نکل جاتا ہے۔ جاتے ہوئے]

رام لال : [پاروتی سے] پاروتی دروازہ بند کر لو۔ میں گیا۔

پاروتی : اچھا اچھا۔

[دروازہ بند کرتی ہے]

[فیڈ آوٹ]

[دوسرا سین]

[دفتر کا ایک کمرہ]

[کمرے میں تین میزیں ہیں۔ دو میزوں پر اس قسم کے کاغذات رکھے ہیں جو عام طور پر کلرکوں کی میزوں پر ہوتے ہیں۔ تیسری پر ایک ٹائپ رائٹر رکھا ہے۔ کمرے میں ایک گھڑی

دیوار پر لگی ہوئی ہے جس پر ساڑھے نو بجے ہیں۔ رام لال اور رام بلاس اکٹھے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔]

رام لال : [گھڑی دیکھ کر] تم نے بھگا بھگا کر بُرا حال کر دیا اور ابھی کل ساڑھے نو بجے ہیں۔

رام بلاس : آدھ گھنٹہ پہلے ہی پہنچے ہیں نا۔ دیر سے تو نہیں پہنچے۔ اِدھر آؤ میری میز پر آدھ گھنٹہ گپ شپ لگاتے ہیں۔

[دونوں ایک ہی میز کے اِردگرد بیٹھ جاتے ہیں]

رام بلاس : رام لال ایک بات پوچھوں؟ بُرا تو نہیں مانو گے

رام لال : پوچھو پوچھو۔ بُرا ماننا ہم نے سیکھا ہی نہیں۔

رام بلاس : آج جب میں تمہیں بلانے تمہارے گھر گیا تھا تو گھر کے اندر سے کچھ اس قسم کی آوازیں آ رہی تھیں جیسے بھابی سے تمہارا کوئی معمولی سا جھگڑا ہو رہا ہو۔

رام بلاس : معمولی جھگڑا نہیں بھائی۔ باقاعدہ جنگ ہو رہی تھی۔ پاروتی مرنے کی دُعائیں مانگ رہی تھی۔

رام بلاس : تعجب کی بات ہے یار۔ تمہارے جیسا آدمی بھی بیوی کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ تم تو جانتے ہو تمہارے جیسا زندہ دل آدمی پورے دفتر میں نہیں ہے۔ دفتر میں اگر کبھی قہقہہ سنائی دیتا ہے تو محض تمہاری وجہ سے۔ تم تو روتوں کو ہنسانے والے آدمی ہو اور تمہاری بیوی تم سے جھگڑا کرے یہ بات کچھ جچتی نہیں۔

رام لال : لیکن یہ سچ ہے کہ پاروتی خوش نہیں ہے۔

رام بلاس : اُسے بھی کوئی چٹکلہ وٹکلہ سنا دیا کرو۔

رام لال : سناتا ہوں لیکن وہ خوش نہیں ہوتی۔

رام بلاس : تو پھر گدگدی کیا کرو بھائی۔ کہتے ہیں گدگدی کرو تو ہنسی ضرور آتی ہے۔

رام لال : تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے لیکن میرے لیے یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ ہے۔ تم تو جانتے ہو میں دفتر سے سیدھا گھر جاتا ہوں۔ پوری کی پوری تنخواہ پاروتی کو دے دیتا ہوں۔ کبھی کسی قسم کی پریشانی اُس کے لیے پیدا نہیں کرتا۔ لیکن پاروتی روز کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر مجھ سے لڑ ضرور لیتی ہے۔ رام بلاس کوئی طریقہ بتاؤ یار جس سے یہ روز روز کی پڑاپیچ بند ہو جائے۔

رام بلاس : گرو ٹانگ کھینچ رہے ہو؟

رام لال : نہیں یار میں بالکل سیریس ہوں۔

رام بلاس : پر دوست میری تو شادی بھی نہیں ہوئی۔ میں کیا جانوں بیوی کو خوش کیسے رکھا جاتا ہے۔

رام لال : تمہاری شادی تو نہیں ہوئی لیکن تم نے دنیا دیکھی ہے۔ تین سال لندن میں رہ چکے ہو۔ بڑی بات ہے بھائی۔ کوئی بتاؤ نسخہ یار۔

رام بلاس : مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟

رام لال : نہیں یار سچ کہہ رہا ہوں۔

رام بلاس : دیکھو رام لال میرے خیال میں سارا قصور تمہارا ہے۔

رام لال : میرا؟ میرا کیا قصور ہے؟ میں تو ساری تنخواہ اس کے حوالے کر دیتا ہوں۔

رام بلاس : تنخواہ! تنخواہ! تنخواہ! تم سمجھتے ہو صرف پیسہ ہی بیوی کو خوش رکھ سکتا ہے۔ پیسہ کوئی چیز نہیں ہے پیارے۔

رام لال : تو پھر اور کیا ہے؟

رام بلاس : رومانس! رومانس ہی ایک ایسی چیز ہے جو پتنی کو خوش رکھ سکتی ہے۔ لیکن تم ہندوستانی لوگ ایسے ہو کر رومانس بالکل کرتے ہی نہیں ہو۔

رام لال : شادی کے سال بعد تک تو رومانس کیا تھا لیکن اب تو یار شرم آتی ہے۔ چھ سال کی لڑکی کے ساتھ کیا رومانس لڑاؤں۔

رام بلاس : ارے بھائی رومانس کا مطلب وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو۔

رام لال: تو پھر اور کیا ہے۔

رام بلاس: رومانس کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی کے سامنے کبھی کوئی ایسی حرکت کرے جس سے بیوی کو ایک بار پھر یقین ہو جائے کہ میرا میاں مجھ سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ لندن میں مَیں نے دیکھا کہ شادی کو چالیس چالیس سال ہو گئے لیکن میاں بیوی ایک دوسرے سے بور ہونے کی بجائے اور محبت کرنے لگے۔

رام لال: سچ یار۔

رام بلاس: ہاں

رام لال: پھر تو یار مجھے بھی کوئی ایسا نسخہ بتاؤ کہ پاربتی مجھ سے پہلی سی محبت کرنے لگے۔

رام بلاس: لو رام لال، تم بھی کیا یاد کروگے؟ تمہیں آج محبت کا ایک "امپورٹیڈ" نسخہ بتاتا ہوں۔ اس پر عمل کروگے تو تمہیں لگے گا جیسے تمہاری شادی آج ہی ہوئی ہے۔ بھابی تمہاری طرف ایسے پیار سے دیکھے گی جیسے تم ایک لمحہ پہلے شادی کے منڈپ سے اُٹھ کر آئے ہو۔

رام لال: سچ۔

رام بلاس: ہاں۔

رام لال: بتاؤ یار۔

رام بلاس: انگلینڈ میں جو نسخہ خاوند بیویوں کو خوش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اُسے کہتے ہیں سرپرائز دینا۔

رام لال: نسخے کا نام تو بتادیا، طریقۂ استعمال بھی تو بتاؤ نا۔

رام بلاس: ایسے ہے رام لال کہ ایک دن میاں گھر آتا ہے دفتر سے۔ آکر بیوی کے پاس کھڑا ہوجاتا ہے۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ ہوتا ہے۔ بیوی پوچھتی ہے تمہارے ہاتھ میں کیا ہے۔ میاں کہتا ہے "ڈارلنگ پہلے آنکھیں بند کرو۔" بیوی آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ میاں اس کے ہاتھ میں کچھ دیتا ہے، کہتا ہے "اب آنکھیں کھولو۔" بیوی آنکھیں کھولتی ہے اور دیکھتی ہے کہ اُس کے ہاتھ میں سونے کی بالیاں ہیں۔ وہ اپنے میاں کو پیار سے گلے لگالیتی ہے اور کہتی ہے "ڈارلنگ ہاؤ سویٹ آف یو"۔ رام لال تم نے اس طرح کبھی بیوی کو سرپرائز دی ہے۔

رام لال: نہیں یار بیوی کو گلے تو لگایا ہے لیکن سرپرائز کبھی نہیں دی۔

رام بلاس: تو پھر ایک بار بھابی کو سرپرائز دے کر دیکھو۔

رام لال: لیکن یار کیا سرپرائز صرف بالیوں سے ہی دی جاتی ہے۔

رام بلاس: نہیں بھائی۔ چیز کوئی بھی ہو۔ بیوی چیز کی نہیں جذبے کی قدر کرتی ہے۔ ایک دوپٹہ ہو جائے دو رومال ہو جائیں۔ صرف اتنا خیال رہنا چاہیئے کہ چیز اچانک دی جائے۔

رام لال: ٹھیک ہے۔ اس مہینے تنخواہ ملنے پر پاروتی سے دس روپے مانگ لوں گا یہ کہہ کر کہ اسے سرپرائز دینی ہے۔ اور پھر دس روپیوں کا کچھ لے کر پاروتی کو دے دوں گا، بالکل ویسے جیسے تم نے بتایا ہے۔

رام بلاس: یار تیرے جیسا گدھا مَیں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر دس روپے بیوی سے مانگ کر لیے تو پھر سرپرائز کیا ہوئی۔

رام لال: تو پھر گرو جی پیسے کہاں سے آئیں گے؟ پوری تنخواہ تو اُسے دے دیتا ہوں۔ اُس میں سے ایک روپیہ روز وہ مجھے دیتی ہے بس کے کرائے کیلئے اور چائے کے کپ کے لیے۔ سرپرائز دینے کیلئے تحفہ کیسے خریدوں۔

رام بلاس: دیکھو بھئی اگر تمہیں میرے نسخے پر عمل کرنا ہے

[نہیں قربانی دینی ہوگی۔ تم اس ایک روپے میں سے پیسے بچاؤ۔

رام لال: کیسے بچاؤں؟

رام بلاس: تم دفتر سے واپس پیدل جاؤ۔ اس طرح جو چھ آنے روز بچیں گے اُن کو اکٹھا کرو۔ مہینے میں دس روپے ہو جائیں گے۔ اگلے مہینے دس روپیوں کا کچھ خرید کر پہنچ جانا اپنے گھر اور ہمارے بتاتے ہوئے نسخے کے مطابق بھابی کو دے دینا پھر دیکھنا کیا غضب ہوتا ہے۔

رام لال: اچھا بھائی میں یہ بھی کر دیکھتا ہوں لیکن ایسے پیدل چل چل کر میری ٹانگیں گھس جائیں گی۔

رام بلاس: یہ تمہارا مسئلہ ہے میرا نہیں . . . اچھا جس دن بھابی کو سرپرائز دینی ہو اُس دن مجھے ساتھ لے جانا۔

رام لال: [گھڑی کی طرف دیکھتا ہوا] ارے یار دس بج گئے، میں چلوں۔ ابھی ہیڈ کلرک آجائے گا۔

[رام لال اٹھ کر اپنی میز پر آجاتا ہے اور کام میں لگ جاتا ہے]

[فیڈ آوٹ]

تیسرا سین

[ایک مہینہ بعد]

[دفتر کا وہی کمرہ۔ گھڑی پر ساڑھے چار بج رہے ہیں۔ رام بلاس اور رام لال اپنی اپنی میزوں پر بیٹھے کام کر رہے ہیں۔ روزی اندر آتی ہے]

روزی: [رام لال سے] گڈ ایوننگ۔ میرا نام روزی ہے۔ میں نے آج ہی یہ دفتر جائن کیا ہے۔

رام لال: ویلکم۔ آیئے میرے کولیگ سے ملیئے۔ مسٹر رام بلاس۔ پہلے لندن آفس میں تین سال ڈیپوٹیشن پر رہے ہیں۔

[رام بلاس اٹھ کر نمستے کرتا ہے]

روزی: [رام لال سے] آپ کا دوست، منہ سے کچھ نہیں بولتا۔

رام بلاس: میں ذرا شرماتا ہوں۔

روزی: [مسکراتے ہوئے] کیوں؟

رام بلاس: ایسا ہے کہ میں نے کبھی کسی لڑکی سے آج تک بات نہیں کی۔

روزی: ایک سے بھی نہیں؟

رام بلاس: ایک سے تو کی ہے۔

روزی: کس سے؟

رام بلاس: اپنی ماتا جی سے۔

(قہقہہ)

روزی: اور آج تک آپ نے کسی اور لڑکی سے بات نہیں کی، کیوں؟

رام بلاس: میری ماتا جی کہتی ہیں کہ لڑکی سے بات اُس دن کرنا جب شادی کرنی ہو۔

روزی: اب تو آپ کو روز بات کرنی ہوگی، مجھ سے ماتا جی کو پتہ چل گیا تو پھر؟

رام بلاس: تو پھر شادی کر لوں گا۔

(قہقہہ)

رام لال: مس روزی اب تو پانچ بج رہے ہیں۔ کل آیئے۔ آپ کو آپ کا کام سمجھا دوں گا۔

روزی: اچھا . . . . بائی۔

(باہر چلی جاتی ہے)

رام بلاس: لڑکی بھگا دی نا۔ اچھے بھاگتی ہو۔

رام لال: فکر نہ کرو۔ کل سے یہیں بیٹھے گی۔ آج ذرا مجھے گھر جانے کی جلدی ہے۔

رام بلاس: تو جاؤ مجھے جلدی نہیں ہے۔

رام لال: تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔

رام بلاس: کیوں؟ کیا بات ہے؟

رام لال: [شرما کر] آج تمہارا وہ محبت کا اسپیشلسٹ نسخہ

آئی مانا ہے۔

رام بلاس : اچھا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ تو گویا آج
تمہاری دوسری شادی ہو رہی ہے۔ دیکھ لو
دوست یہ سب ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔

رام لال : اچھا اچھا۔ زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ چلو
چلیں۔

(دونوں کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

(فیڈ آؤٹ)

(چوتھا سین)

[رام لال اور رام بلاس رام لال کے گھر کے
باہر کھڑے ہیں]

رام بلاس : لو میرے شیر۔ کھلواؤ دروازہ اور دکھا دو
بھابی کو ہمارے نسخے کا چمتکار۔

رام لال : بھائی تم باہر ہی کھڑے رہنا۔ تمہارے سامنے
مجھ سے وہ سب کچھ نہیں ہوگا۔

رام بلاس : اچھا، اچھا۔ کھلواؤ دروازہ۔

(رام لال دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

رام لال : دروازہ کھولو۔

پاروتی : کھول رہی ہوں۔ اتنا چلا کیوں رہے ہو؟

(دروازہ کھولتی ہے۔ رام لال اندر آتا ہے)

پاروتی : [رام لال کے ہاتھ میں ایک پیکٹ دیکھ کر] یہ تمہارے
ہاتھ میں کیا ہے؟

رام لال : [رومانٹک انداز میں] پہلے آنکھیں بند کرو۔

پاروتی : بتاؤ کیا ہے؟ یہ چونچلے کیا دکھا رہے ہو؟

رام لال : او ڈیئر پہلے آنکھیں بند کرو۔

پاروتی : لو بابا۔

رام لال : اب کھولو۔ یہ دیکھو تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔
ولایتی پوڈر کا ڈبہ۔

پاروتی : ہائے ہائے کبھی تو عقل کی بات کیا کرو۔ میں
نے کبھی لگایا ہے پوڈر۔ اور . . . یہ کس

روپے کہاں سے آئے؟ تنخواہ میں سے چھپا کر ر
تھے؟

رام لال : نہیں تو۔

پاروتی : تو پھر کہاں سے آئے؟

رام لال : میں نے بچائے ہیں۔

پاروتی : کہاں سے بچائے ہیں۔

رام لال : اپنے خرچ میں سے۔ تم سے جو ایک رو
لیتا ہوں نا اس میں سے بچائے ہیں۔

پاروتی : روز مجھ سے ایک روپیہ اینٹھ کر لے
ہو حالانکہ خرچ تمہارا ساٹھ پیسے سے زیادہ ن
[اونچی آواز میں] ہائے رام، میں لٹ گئی۔ ب
ہو گئی۔ میرا گھر والا ہی مجھے لوٹ رہا ہے

رام لال : پاروتی، پاروتی، آہستہ بولو۔

پاروتی : کیوں آہستہ بولوں؟ میں تو پورے م
بتاؤں گی۔ اپنے ہی گھر میں لوگ چوری کر
لگیں تو کوئی چپ کیسے رہ سکتا ہے۔

[دروازے کے پیچھے چھپا ہوا رام بلاس کھسکنے لگ

رام لال : تو کہاں بھاگ رہا ہے رام بلاس۔ تیرا ستیا
تیرے نسخے کا ستیاناس۔ تجھے چھوڑوں گا
بچو۔

[رام لال گھر سے نکل جاتا ہے۔ پاروتی وہیں کھڑی ر
رہی ہے]۔

[پردہ

سید رحیم الدین توفیق (حیدرآباد)

★

اشتہاری حکیم

ڈاکٹروں اور حکیموں کی تین قسمیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم کے ڈاکٹر اور حکیم وہ ہیں جو کسی یونیورسٹی کے ڈگری یافتہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا وجود بنی نوع انسان کی بقاء کے لیے ناگزیر ہے۔ دوسری قسم کے ڈاکٹر یا حکیم وہ ہوتے ہیں جو فٹ پاتھ پر مجمع لگاتے ہیں۔ یہ بالکل گھٹیا قسم ہے۔ تیسری قسم ان دونوں کے درمیان کی ہوتی ہے یہ نہ تو ڈگری یافتہ ہوتے ہیں اور نہ فٹ پاتھ مجمع لگاتے ہیں بلکہ ایک آدھ چھوٹی موٹی ملگی یا کمرے میں اپنی دکان کھول لیتے ہیں جسے کلینک کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ عطائی حکیم اور ڈاکٹر اپنے آپ کو پوشیدہ امراض کے ماہر بتاتے ہیں جیسے مردانہ کمزوری بدخوابی۔ بواسیر۔ السر۔ کینسر وغیرہ وغیرہ۔ ان میں۔ اکثر جنسی امراض کے ماہر ہوتے ہیں (اشتہار میں تو یہی لکھا ہوتا ہے) دیکھنے میں آیا ہے کہ جنسی امراض حکیم لے من پسند امراض ہیں اور اس طبقہ میں کافی مقبول ہیں)۔ ان بیماریوں کے شکار کو یہ حکیم بہت عزیز رکھتے ہیں اور جی جان سے ان کا علاج کرتے ہیں۔

پچھلے زمانے میں بادشاہوں۔ نوابوں اور رئیسوں کے درباروں میں جو حکیم ہوا کرتے تھے ان کا زیادہ وقت معجونوں کی تیاری میں گزرتا تھا خصوصاً شاہی حکیموں کا۔ ان حکیموں کی وجہ سے بادشاہ اپنی زندگی میں صرف ایک ہی بار مرض میں مبتلا ہوتا اور بالآخر دارِ فانی سے کوچ کر جاتا تھا۔ ان حکیموں کی وجہ سے شہزادے تخت نشینی کی حسرت لیے ہی بوڑھے ہو جاتے یا پھر بغاوت کر دیتے۔ شاہی دور تو ختم ہو گیا لیکن شاہی حکیم اور ان کی حکمت باقی ہے۔ ان حکیموں کی تحقیق کی ہر تان قوتِ باہ پر ٹوٹتی ہے اور کیوں نہ ٹوٹے اسی قوت پر تو نسلِ انسانی کی بقاء کا دار و مدار ہے۔ ہم نے ایک حکیم صاحب کی تصنیف "ترکاریوں سے علاج" پڑھی ہے۔ بخدا جتنی بھی ترکاریاں ہیں ان میں شائد ہی کوئی ترکاری ایسی ہو جس کا اس قوت کے بڑھانے میں کچھ نہ کچھ حصہ نہ ہو۔ ہر ترکاری کے بیان میں آخری دو سطریں اس خوبی کے بیان کے لیے مختص تھیں۔ اس سلسلہ میں پھلوں اور میووں کو بھی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ یہ حکیم اپنے مریضوں کو ایسا لالچ دیتے ہیں کہ وہ ان کے بنائے ہوئے معجون کھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیوں کہ مرد کی شان ان معجونوں کے استعمال کے نتیجہ میں پوشیدہ ہے۔ آج کل دو گولیوں کی زبردست تشہیر ہو رہی ہے جو بقول ان حکیموں کے بادشاہوں کے منہ سے چھین کر لائی گئی ہیں۔ جس چیز کا عوام تصور تک نہیں کر سکتے تھے آج وہ ان حکیموں کی بانی سے اس کا استعمال کر سکتے ہیں یہ گولیاں اصلی موتی۔ زعفران۔ مشک اور پتہ نہیں کون کون سی الا بلا

قوت بخش جڑی بوٹیوں سے تیار ہوتی ہیں۔ آج کے دور میں جب پانی بھی خالص نہیں ملتا وہاں کون یقین کرے گا کہ یہ گولیاں اتنی قیمتی اور وہ بھی اصلی چیزوں سے بنی ہیں نادانوں نے اتنا نہ سوچا کہ بادشاہوں کے منہ کا نوالہ خریدے گا کون اور خرید بھی لے تو اس کے استعمال کے مابعد اثرات سے نمٹنے کی استطاعت کسے ہے۔ بادشاہوں کے پاس تو اصطبل ہوا کرتے تھے؛ جب ہم کسی باتصویر اشتہار میں مغل بادشاہ کو پھول سونگھتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اسے نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ ان گولیوں کا اشتہار ہے لیکن ایک دن یونہی بے خیالی میں ایسا ہی ایک اشتہار پڑھا تو وہ باسمتی چاول کا نکلا اور غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ وہ تصویر انارکلی کی تھی۔ ان عطائی حکیموں اور ڈاکٹروں کی حکمت اور ڈاکٹری کا سارا دار و مدار اشتہارات پر ہی ہوتا ہے۔ یہ اشتہارات صرف مقامی اردو روزناموں میں ہی چھپتے ہیں ان میں بعض اردو ہفتہ وار اور ماہناموں میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کو شاید غلط فہمی ہے کہ ان بیماریوں کا شکار صرف اردو اخبار کے قارئین ہی ہوتے ہیں یا پھر وہ اتنے بھولے بھالے ہوتے ہیں کہ آسانی سے ان کے جھانسے میں آ جاتے ہیں۔

لیجیے ہم آپ کو چند مشہور اور مقبول عام اشتہارات کے کچھ نمونے دکھائیں:

ایک اشتہار ایک خوبصورت اور نوخیز نوجوان کی تصویر کے ساتھ نظر آئے گا جس میں نوجوان خلاؤں میں گھورتا کسی خیال میں کھویا ہوا سا لگتا ہے۔ تصویر پر سرخی لگی ہے صرف خلاؤں میں گھورنے سے جوانی واپس نہیں آ جائے گی لمحوں کی خطا عمر بھر کی سزا بن گئی۔ ہمیں تو وہ نوجوان کافی صحت مند اور ترو تازہ لگ رہا تھا۔ اس معصوم کی خطا صرف اتنی تھی کہ وہ ایک "لمحہ" کے لیے اسی پوز میں کیمرے کے سامنے آ گیا پتہ نہیں یہ تصویر اس کی اجازت سے چھپی تھی یا پھر چالاک حکیم نے تصویر کو حسب مطلب استعمال کر لیا تھا یا اس نوجوان نے مالی مجبوریوں سے تنگ آ کر اس اشتہار کا ماڈل بننا قبول کر لیا تھا وجہ کچھ بھی ہو۔ اس کا لے اس نوجوان کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا سوائے اشتہار کے ایک حکیم صاحب یہ مشورہ دے کر کہ خودکشی نہیں شادی کیجئے سینکڑوں مایوس اور ناکام مریضوں کی اندھیری زندگی میں امید کی کرن بلکہ سورج طلوع کرتے ہیں تو دوسرے حکیم صاحب یہ چیلنج کرتے کہ "نوجوانی میں کیا نہیں ہوتا" ان سینکڑوں نادانوں کو پشیمانی کی دلدل سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں اور ساتھ میں یہ مژدہ جانفزا بھی سناتے ہیں کہ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا علاج کے دروازے کھلے ہوئے ہیں آؤ میری طرف کہ میں تمہاری مردہ نسوں میں بجلیاں بھر دوں۔ بہر حال ہم تفصیل میں اس لیے نہیں جا رہے ہیں کہ پولس کہیں ہمیں قانون انسداد فحاشی کے تحت چالان نہ کر دے کچھ دن پہلے حیدرآباد کے ایک مشہور اور کثیر الاشاعت اردو روزنامہ میں ایک اشتہار کسی پوشیدہ امراض کے ماہر کی طرف سے چھپا تھا اشتہار کیا تھا اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا تھا ظالم نے کوزے میں دریا کو بند کیا تھا۔ اس میں ہمہ اقسام کی پوشیدہ بیماریاں مردانہ کمزوری ان کی وجوہات اور علاج وغیرہ کے بارے میں اتنا کھول کھول کر بتایا گیا تھا کہ جاہل سے جاہل مریض بھی اپنی تشخیص آپ کر لے۔ اگر اس اشتہار میں اس حکیم اور ادارے کا نام نہ ہوتا تو ہم اسے "تعلیم بالغان" سلسلہ کی کوئی کڑی سمجھتے ہم اس اشتہار سے کافی لطف اندوز اور محظوظ ہوئے لیکن جب سامنے نظر پڑی تو ہم شرم سے پانی پانی ہو گئے کیوں کہ ہمارا نوخیز لڑکا ہمارے سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا یہ اشتہار آج سے چالیس سال پہلے چھپا ہوتا تو شریف اور بال بچے والے اصحاب کم از کم اس دن یہ اخبار اپنے گھر نہ لاتے بلکہ کسی ہوٹل یا چائے خانہ

میں اس سے لطف اندوز ہو کر آجاتے کیونکہ اس زمانے میں بچوں کو بھی اردو آتی تھی۔

جو حکیم کسی دوسرے شہر کے مریضوں کا علاج کرتے ہیں وہ خط و کتابت کے ذریعہ اپنا کام چلاتے ہیں۔ خط و کتابت کو راز میں رکھنے کی پوری پوری ضمانت دی جاتی ہے چنانچہ بڑے دواخانہ کے پتہ پر آئے ہوئے خطوط پر پرائیوٹ صرف بڑے حکیم صاحب کے لیے لکھا ہوتا ہے تو اسے سوائے بڑے حکیم صاحب کے کوئی نہیں کھول سکتا بلکہ پوسٹ باکس میں سے بھی بڑے حکیم صاحب ہی خطوط نکالتے ہیں۔ جن خطوط پر صرف پرائیوٹ لکھا ہوتا ہے اسے جونیئر حکماء نیلکرے میں کھول کر پڑھتے ہیں۔ آخر انھیں بھی تو ایک دن "بڑا حکیم صاحب" بننا ہے۔ اس پیشہ کا اولین اور زرین اصول ہے رازداری۔ علاج معالجہ کے دوران معالج اور مریض کے درمیان رازداری کا ایسا تال میل قائم ہو جاتا ہے کہ جب بھی دونوں مل بیٹھتے ہیں تو دیکھنے والوں کو شبہ ہوتا ہے کہ کسی گہری سازش کا جال بنا جا رہا ہے حکیم صاحب کے سینہ میں مریضوں کے شرمناک راز ایسے دفن ہو جاتے ہیں جیسے سوئز بنکوں میں کالا دھن۔

اشتہاری حکیموں اور ڈاکٹروں کی دوسری قسم وہ ہے جو کینسر اور السر جیسے موذی اور جان لیوا بیماریوں کا علاج کرتی ہے یہ حکیم و ڈاکٹر کافی منکسرالمزاج ہوتے ہیں۔ یہ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتے بلکہ نقارہ خدا یعنی زبان خلق کا استعمال کرتے ہیں یہ اپنی مریضاؤں سے سرٹیفکٹ حاصل کر کے اسے اشتہاروں میں چھاپ دیتے ہیں۔ ایک ہی سرٹیفکٹ کئی کئی حکیم و ڈاکٹر استعمال کرتے ہیں۔ صرف مریضہ کا نام پتہ اور تصویر بدلتی رہتی ہے۔ یہ تمام عورتیں چالیس سے پچاس سال کی ہوتی ہیں اور چار سے چھ بچوں کی مائیں ہوتی ہیں اور چھاتی یا رحم کے کینسر میں مبتلا ہوتی ہیں۔ یہ ہندوستان کے ہر بڑے ڈاکٹر کے علاج سے مایوس ہو کر بھٹکتے بھٹکتے آخری وقت میں اس کھجور میں اٹک جاتی ہیں لیکن "چالیس" دن میں بھلی چنگی ہو کر ہنسی خوشی اپنے خاوند اور بچوں کو سنبھالنے چلی جاتی ہیں اور تادم اشتہار سنبھالتی رہتی ہیں۔

بعض چالاک ڈاکٹر سرٹیفکٹ کے بجائے مریض کی دو تصویریں چھاپ دیتے ہیں ایک حالیہ تصویر جس میں بیماری کے آخری اسٹیج کی وجہ مریض کا حلیہ بگڑا ہوا ہوتا ہے دوسری قدیم جو اس کے صحت مندی کے زمانے کی ہوتی ہے اب وہ صرف یہ "علاج" کرتے ہیں" کہ تصویر کی ترتیب بدل دیتے ہیں تازہ تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے علاج سے پہلے اور پرانی تصویر کے نیچے لکھا ہوتا ہے علاج کے بعد۔ ہمیں ان مریضوں کے حال پر رونا آتا ہے ایسے لا علاج اور لب گور مریضوں سے ان کے آخری دنوں میں علاج کے بہانے پیسے بٹورنا بھاگتے بھوت کی لنگوٹی کھینچنے کے مترادف ہے۔

اب آخر میں ایک منفرد اشتہار ہے یہ ایک دماغی امراض کے ماہر کا ہے جس سڑک پر اس کا کلینک ہے اس پر سے اکثر ہمارا گزر ہوا ہے۔ ہم نے اس کلینک میں کبھی کسی متنفس کو نہیں دیکھا حتیٰ کہ ڈاکٹر کو بھی نہیں جن ڈاکٹروں کی پریکٹس نہیں چلتی وہ اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بجائے کلینک کے دروازے پر کھڑے اپنا وقت گزارتے ہیں اور مریضوں کا انتظار کرتے ہیں۔ ایک دن جب ہم نے اس حکیم و ڈاکٹر کے بارے میں دریافت کیا تو پتہ چلا کہ وہ خود پاگل ہو گیا ہے اور پاگل خانہ میں شریک ہے۔ اس کے پاگل ہونے کی وجہ صدمہ، ناکامی اور مایوسی تھی۔ مریضوں کا انتظار کرتے کرتے بے چارہ خود پاگل ہو گیا اور اپنے ہی دعوے کی نفی کر گیا اس میں مریضوں کا کیا قصور۔ اس کا دعویٰ ہی اتنا کھوکھلا تھا کہ پاگل بھی اس پر ایمان لانے تیار نہ تھے۔ وہ کلینک آج بھی موجود ہے۔ شائد اس کے ورثاء نے اسے اس

[illegible]

ہڑک مہلک ہوتا ہے
مگر آپ اسے روک سکتے ہیں
یہ ہوتا کیسے ہے؟
— ہڑک پاگل جانور، زیادہ تر کتے کے کاٹنے سے ہوتا ہے
— ہڑک ہو جائے تو موت ہو جاتی ہے۔
کیونکہ اس سے شفا کا کوئی علاج نہیں ہے۔
احتیاطی تدابیر
— مگر ہڑک سے بچا جا سکتا ہے۔ اپنے تمام پالتو کتوں کو ہڑک کا ٹیکہ لگوائیں۔
— آوارہ کتوں کو پکڑنے اور ختم کرنے میں محکمے کی امداد کریں کیونکہ آوارہ کتوں کو ہڑک (پاگل پن) لاحق ہوتا ہے اور وہ پالتو کتوں کو کاٹ کر انہیں بھی اس مرض میں مبتلا کر دیتے ہیں۔
— اگر آپ کو کتا کاٹ لے تو زخم صابن اور پانی سے اچھی طرح دھو ڈالیں اور فوراً نزدیکی ہسپتال یا شفاخانے تک جائیں۔
ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ
— ڈاکٹر کے مشورے سے ہڑک سے بچاؤ کا ٹیکہ لگوائیے۔
سینٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو
ڈی۔جی۔ایچ۔ایس نئی دہلی

رضا نقوی واہی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
ایک سیماب صفت شخصیت

آج سے ۲۲-۲۴ سال قبل میں اور ڈاکٹر اختر اورنیوی مرحوم بہار شریف کے ایک مشاعرے میں شریک ہوئے
ہ گاہ میں شاعروں، سامعین اور منچلے HOOTERS کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ جب کوئی مقامی یا غیر
ے شاعر مائک کے سامنے آتا تو بعض گوشوں سے "مقطع پڑھئے" کی فرمائش اچھالی جاتی اور وہ غریب صرف مطلع ہی
ہ غروب ہو جاتا۔ میرے پیچھے کی صف میں بیٹھے ہوئے کوئی صاحب تھے جن کے آوازے زیادہ زوردار ہوتے۔
ں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک اندام دبلے پتلے نوجوان اپنے چند ہم عمر دوستوں کے درمیان بیٹھے ہوئے داد اور بیداد
ے پٹاخے داغنے میں مصروف تھے۔ سفید کرتا پائجامہ پہنے ہوئے تھے، چہرہ نہایت ملیح اور جاذب نظر تھا۔ مجھے دیکھے
ا مجوب مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرنے کے بعد سر جھکا کر خاموش ہو گئے لیکن ان کی جملہ بازیوں کا سلسلہ وقفہ وقفہ
ے چلتا رہا۔ مشاعرے کے دوران جب یہ غزل سنانے آئے تو تعارف ہوا اور پتہ چلا کہ صاحب زادے کا نام مناظر عاشق
رگانوی ہے، مقامی برنگہ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم ہیں، لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔

نام کے ساتھ "عاشق" کا لاحقہ جڑا ہونے سے معاً مجھے اپنی طالب علمی کے زمانے کے ایک دوست زبیر احمد تمنائی
آگئے، جب کہ ہم دونوں انٹرمیڈیٹ کے اور ڈاکٹر اختر اورنیوی مرحوم بی اے کے طالب علم تھے اور ہمارا یہ مثلث پٹنہ کالج
مسلم ہوسٹل میں مقیم تھا۔ تمنائی بھی مناظر عاشق کی طرح محجوب صفت اور بظاہر عاشق مزاج تھے۔ ایک بنت عم کے
ان کی عمر سے آٹھ دس سال بڑی تھی، یک طرفہ خاموش محبت کرتے تھے اور ہر شام اس کے گھر کا پھیرا لگانے کے
رجب ہوسٹل واپس آتے تو اختر صاحب اور مجھ سے اپنی داستان عشق بیان کرتے۔ اختر صاحب اس میدان
یں زیادہ تجربہ کار تھے، اس لیے وہ تمنائی کو کامیابی کے نئے نئے گر بتاتے۔ ایک بار بنت عم نے انھیں گلاب
ایک پھول تحفتہً دیا، جو دوسرے ہی روز سوکھ گیا، لیکن تمنائی نے اس سوکھے پھول کو اپنی ایک کتاب میں
شہ کے لیے رکھ چھوڑا۔ اسی زمانے میں انھوں نے ایک آزاد نظم لکھی جس کے چند مصرعے اب تک یاد ہیں:

[illegible]

یہ وہ دور تھا جب نیاز فتحپوری لکھنؤ سے ماہنامہ نگار نکالا کرتے تھے اور ان کے قلم کی دھاک ادبی دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ نگار کا ایک باب "فراست الید" (PALMISTRY) کے زیر عنوان شائع ہوتا تھا۔ اس باب میں نیاز مختلف مضمون نگاروں کا خطِ تحریر دیکھ کر مکتوب نگار کی نفسیات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے تھے تمنائی نے انھیں ایک خط کے ذریعہ اپنی جذباتی پریشانیوں کا حال بتایا تو نیاز نے منجملہ اور باتوں کے ایک جملہ یہ بھی لکھا۔

"عزیزم، ابھی تو آپ طاؤس طناز کی طرح اپنی ہی اداؤں پرست رہنے کے دور سے گزر رہے ہیں"..... وغیرہ وغیرہ لفظ "تمنائی" اور "عاشق" کی معنوی مماثلت کو دیکھ کر بہار شریف کے مشاعرے میں ہی میں نے چاہا کہ مناظر صاحب کے سامنے نیاز کا جملہ دہرا دوں، لیکن خاموش رہا۔ اتفاق سے چند ہی دنوں کے بعد مناظر کا ایک خط آیا۔ جواب میں میں نے نیاز کا جملہ quote کرتے ہوئے لکھا کہ ابھی تو آپ خود عشق کئے جانے کی عمر میں ہیں، یہ "عاشق" تخلص کسی طرح آپ کو زیب نہیں دیتا۔ فوراً جواب آیا کہ ـــــ "آپ کا خط پڑھ کر شرم سے میں پسینہ پسینہ ہو گیا" دل کی بات بھی لکھی کہ گاؤں کی ایک لڑکی سے محبت ہو گئی ہے، جو سن میں دو چار سال بڑی ہے اور اب شادی کے بعد اپنے شوہر کے گھر جا بسی ہے۔ اس کی محبت نے مجھے "عاشق" تخلص اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ یہ تھی ابتداً مناظر عاشق سے میرے اولین تعلقات کی۔ تعلقات میں کئی موڑ آئے جن کا تفصیلی بیان غیر ضروری ہے، البتہ چند باتیں جن سے موصوف کی سیماب صفتی کے نقوش واضح ہوتے ہیں، یہاں لکھنے کا خطرہ مول لے رہا ہوں۔

مناظر عاشق نے جب انٹرمیڈیٹ کے ہی طالب علم تھے، ایک بار مجھے خط لکھا جس کے LETTER HEAD پر "ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی" چھپا ہوا تھا۔ اس وقت تک تیز رفتار کمپیوٹر ٹکنولوجی ابتدائی مراحل میں تھی اور معجزاتی دور بھی ختم ہو چکا تھا، اس لیے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انٹر کا ایک طالب علم کیونکر اتنی لمبی چھلانگ لگا کر پی ایچ ڈی بن بیٹھا۔ موٹی عقل سے غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی ہومیوپیتھک ادارے سے انھوں نے دس روپے میں ایک عدد نقلی ڈگری خرید لی ہو گی جو اس زمانے کا علم چلن تھا۔ اور حقیقت بھی یہی تھی میں نے انھیں مخلصانہ مشورہ دیا کہ آپ جیسے ابھرتے ہوئے ادیب کو یہ زیب نہیں دیتا کہ سستی شہرت کی خاطر اس طرح کے بچکانہ طریقے استعمال کریں۔ انھیں اپنی تعلیم مکمل کرنی چاہیئے۔ اور باضابطہ ایم اے کرنے کے بعد ڈاکٹر بننے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ مجھے خوشی ہے کہ مناظر نے میرے مشورے کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ آئی اے بی اے پاس کر کے پٹنہ یونیورسٹی کے ایم اے کورس میں داخل ہو گئے، اور امتیاز سے کامیاب ہونے کے بعد کڑی محنت کی، تحقیقی مقالہ لکھا اور آخرش ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کر لی اور آج کل ایک کالج میں استادِ ادب ہیں۔ جب وہ پٹنہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں زیرِ تعلیم تھے، اسی زمانے میں انھوں نے نسیم بکڈپو لکھنؤ سے خط و کتابت کر کے پہلا مجموعۂ کلام ـــــ کلامِ نرم و نازک خود مرتب کر کے چھپوایا۔ اس کے بعد چھٹا مجموعہ ـــ متاعِ واہی جب چھپنے والا تھا تو اس کی نظمیں بھی مسودے کے اسٹیج میں ترتیب دیں۔ ساتھ ہی ساتھ شاعری اور مضمون نگاری کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ شاید ہی ملک کا کوئی بدقسمت ماہنامہ ہو گا جس میں ہر ماہ تواتر و تسلسل سے ان کا کوئی نہ کوئی مضمون نہ چھپتا ہو۔ بچوں کا رسالہ ہو، خواتین کا ماہنامہ ہو، عام ادبی جریدہ ہو، طبی یا جاسوسی رسالہ ہو، [illegible] ہو سب میں [illegible] کرتے رہے۔ لکھنے کا دورہ جب جنون کی حد تک بڑھا تو کسی بچی یا کسی خاتون کے [illegible] بھی مضامین، افسانے، نظمیں لکھ کر چھپوانے لگے۔ قدرت ادب کا جوش [illegible] کے درجنوں رسائل کے ایڈیٹوریل بورڈ میں بھی شامل ہو گئے۔

یادش بخیر آٹھویں دہائی کی ابتداء میں مناظر عاشق کے دوش بدوش ادبی دنیا میں ایک اور نام طلوع ہوا جس نے نوجوان قارئین کے دلوں میں ہلچل سی مچادی۔ یہ نام تھا "نینا جوگن"۔ عرصۂ دراز تک میرے لیے یہ نام اجنبی رہا لیکن آخر کار یہ راز بھی کھل گیا کہ ایسے مضامین جو غیر اہم ہونے کی وجہ سے مناظر عاشق کے نام سے عام رسالوں میں جگہ نہیں پاتے، وہ نینا جوگن کے نام سے آسانی سے شائع ہونے لگتے ہیں۔ یہ اُن مدیران رسائل کے ساتھ مناظر کا عملی مذاق تھا جو تخلیق سے زیادہ تخلیق کار کی جنس پر توجہ دیتے ہیں۔

ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ دفعتاً مناظر نے مجھے خط لکھنا بند کر دیا اور شہر گیا میں رہنے لگے۔ سبب دریافت کرنے کی غرض سے میں نے انھیں درج ذیل منظوم خط لکھا ؎

یہ بات سمجھنے سے مرا ذہن ہے قاصر — کیوں ایک زمانے سے ہو خاموش مناظر
'الکتاب' کا آسیب بھی مدت ہوا بھاگا — فرصت کے ہیں دن، وقت کا سرمایہ ہے وافر
پھر بند ہے کیوں سلسلۂ خط و کتابت — اس قطعِ تعلق کا سبب کچھ تو ہے آخر
خط کوئی مقالہ، کوئی ناول نہیں ہوتا — جس کے لیے تم کھولو مضامین کے دفتر
خط لکھنا کوئی فکرِ سخن بھی نہیں ہرگز — جس میں یہ بہانہ ہو، طبیعت نہیں حاضر
"چُپ پیر" کی درگاہ سے وابستہ ہوئے کیا — اور بیٹھ گئے بن کے اُسی در کے مجاور
یا بودھ گیا کے کسی بھکشو نے پھنسایا — اور مسلکِ گوتم سے ہوئے تم متاثر
کیا پھر کسی ناگن کا پڑا قلب پہ دورہ — کیا بن گئے پھر جادۂ وحشت کے مسافر
حیرت ہے کہ دو ماہ پہ اک کارڈ نہ لکھے — وہ شخص جو مکتوب نگاری میں ہو ماہر

کیا راز ہے اس مون برت کے پسِ پردہ
اک روز نہ اک روز وہ ہو جائے گا ظاہر

مون برت کا راز یہ کھلا کہ حضرت ان دنوں گیا میں مٹھائیوں کی دوکان کھول کر بزنس مین بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر روزانہ جتنا مال تیار ہوتا، شام تک ان کے احباب دوکان پر پہنچ کر "مفت کی مے" سمجھتے ہوئے چٹ کر جاتے تھے۔ جو تھوڑی بہت مٹھائیاں بچ جاتی تھیں انھیں خود مناظر صاحب صاف کر جاتے تھے۔ چند مہینوں میں بزنس فیل ہو گیا، اور وہ اپنے گاؤں واپس چلے گئے۔

اس منظوم خط سے جو غلط فہمی پیدا ہوئی اب اس کا بھی کچھ بیان ہو جائے۔ ماہنامہ تحریک (دہلی) کے مدیر گوپال متل نے اپنے ادارے سے میرے منظوم خطوط کا مجموعہ شائع کیا جس کا نام تھا۔ نام بنام۔ اس وقت میں نے جتنے منظوم خطوط احباب کو لکھے تھے سب کی نقل متل صاحب کو بھیج دی تھی۔ انھوں نے سو صفحات کی کتاب شائع کی جس میں آٹھ دس خطوط شامل نہیں کیے۔ میں نے جب گوپال متل صاحب سے استفسار کیا تو انھوں نے لکھا کہ صفحات کی کمی کے باعث چند خطوط حذف کر دیے گئے۔ میری شامتِ اعمال سے مناظر کے نام کا خط بھی چھوٹ گیا تھا۔ مناظر نے جب وہ کتاب دیکھی تو مجھ سے خفا ہو گئے کہ میں نے جان بوجھ کر انھیں نظر انداز کیا۔ میں نے اپنی صفائی میں گوپال متل کے خط کا حوالہ دیا لیکن اسے بھی ناقابلِ قبول سمجھا گیا۔ پھر ان کی ناراضگی دور کرنے کے لیے میں نے اس کتاب میں وہ خط شامل کر لیا۔ اس طرح "نام بنام" ... [illegible]

چھپنے وقتی طور پر ختم ہوا۔ لیکن یہاں یہ بھی بتا تا چلوں کہ "نام بنام" پر یوپی اُردو اکادمی نے جب مجھے بڑا ایوارڈ دیا تو اخبار میں خبر چھپنے کے بعد مناظر ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے میرے گھر آکر مبارکباد دی تھی۔"

اُوپر مدیران رسائل سے مناظر کے عملی مذاق کا ذکر آچکا ہے۔ اسی طرح کا ایک اور دلچسپ واقعہ یاد آرہا ہے۔ ریٹائرڈ ڈسٹرکٹ جج بہاء الدین احمد کلیم، جب بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر تھے، تو میری قیام گاہ کے قریب ہی رہتے تھے۔ بڑے مخلص، دوست نواز اور باغ و بہار قسم کے انسان تھے۔ ادب پر گہری نظر تھی شاعری بھی کرتے تھے۔ اُن سے برابر ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ ایک دن میں ان سے ملنے گیا تو جدید شاعری کا ذکر چھڑ گیا۔ انھوں نے کہا آؤ ایک بے معنی نظم لکھ کر کسی رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دی جائے۔ نظم کا پہلا بے معنی مصرعہ انھوں نے لکھا اور میں نے اسی کے سہارے قلم برداشتہ ایک مہمل سی آزاد نظم لکھ ڈالی جس کا عنوان "پیچش" رکھا گیا۔ اس نظم کا ہر مصرعہ بے تکا، مہمل، بے معنی اور دوسرے مصرعہ سے غیر مربوط تھا۔ اُسے پڑھ کر ہم دونوں بہت محظوظ ہوئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ کئی سال کے بعد جب مناظر ہزاری باغ سے "کوہسار" شائع کر رہے تھے، تو ایک بار میرے یہاں آکر پرانے رسائل اور کتابوں کے کئی بنڈل اپنی نجی لائبریری کے لیے ساتھ لیتے گئے۔ اتفاق سے ایک بنڈل میں مذکورہ بے معنی نظم کا مسودہ پڑا ہوا تھا۔ اُسے پڑھ کر انھوں نے تعریف کا خط لکھا کہ "واہ کیا عمدہ نظم آپ نے لکھی ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسی نظمیں بھی آپ لکھ سکتے ہیں۔" دو ایک مصرعے بھی کوٹ کئے۔ وہ خط پڑھ کر میں خوب ہنسا۔ بعد میں مناظر کو اس نظم کے تولد کی پوری داستان لکھ کر بھیج دی۔ اب مناظر نے نقادوں سے عملی مذاق یہ کیا کہ اس نظم کی نقلیں آٹھ دس حضرات کے پاس اس فرمائش کے ساتھ بھیجیں کہ اس کا تجزیہ کرکے اپنے خیالات لکھیں۔ ایک دو حضرات کو چھوڑ کر بقیہ ناقدوں نے نظم کو خوب خوب سراہا، نئے نئے معنی پہنائے اور اسے ایک آفاقی نظم ہونے کی سرٹیفکٹ دے دی۔ مناظر نے ان تمام لوگوں کے تجزیاتی مطالعے کو "کہسار" کے ایک شمارے میں نظم کے متن اور میرے خط کے ساتھ شائع کر دیا۔ جس سے کئی اہم ناقدوں کی سخن فہمی کا پول کھل گیا۔

"چھیڑ خوباں سے چلی جائے" کی حکمت پر عمل کرتے ہوئے مزید ایک دو واقعات کا بھی تذکرہ کرتا چلوں۔ جب ۱۹۷۶ء میں ہم چند دوستوں نے پٹنہ میں بڑے پیمانے پر کل ہند جشنِ ظرافت تقریبات منعقد کیں تو مناظر کو بھی دعوت نامہ برائے شرکت بھیجا گیا۔ نجی طور پر میں نے موصوف سے یہ بھی درخواست کی کہ تقریبات سے کچھ پہلے تشریف لائیں اور میرے کاموں میں ہاتھ بٹائیں۔ وہ شاید آتو گئے لیکن میرے سامنے نہیں آئے۔ پروگرام کے اختتام کے بعد احمد جمال پاشا (مرحوم) نے مجھے بتایا کہ مناظر آپ سے بے حد خفا ہیں۔ ان کی شکایت یہ ہے کہ آپ نے انھیں "نظر انداز" کیا۔

"نظر انداز" کئے جانے کی شکایت کی یہ دوسری قسط تھی۔ میں نے احمد جمال پاشا سے جواباً کہا کہ دعوت نامہ میں نے خود پوسٹ کروایا تھا پھر نظر انداز کرنے کی بات کہاں سے ٹپک پڑی۔ وہ بولے کہ موصوف اس بات پر برہم ہیں کہ ایک فنکار کی حیثیت سے انھیں پروگرام میں شریک نہیں کیا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ جہاں ملک کے مشہور طنز نگار، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، وجاہت علی سندیلوی، احمد جمال پاشا، نریندر لوتھر اور مستند نقاد، ڈاکٹر قمر رئیس ڈاکٹر وہاب اشرفی وغیرہ موجود تھے، وہاں مناظر صاحب کو جشنِ ظرافت کمیٹی مقالہ نگار یا انشائیہ نگار کی حیثیت کیسے مدعو کرتی، جب کہ ان کا فن ابھی FORMATIVE STAGE میں ہے۔ اس کے علاوہ بسیار نویسی

کے باعث اب تک انھوں نے ادب کے کسی بھی ایک شعبے میں اپنی انفرادیت کے نقوش نہیں بنائے ہیں۔ یہ بات ۱۳ سال پہلے کی ہے۔ اس مدت میں مناظر نے بلاشبہ ادب پر اپنے اثرات مرتب کئے ہیں اور نئی نسل کے فنکاروں کے درمیان خاصی اہمیت حاصل کرلی ہے۔ یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔

آخر میں ایک اور دلچسپ واقعہ بیان کر کے اس گفتگو کو ختم کرتا ہوں۔ جب آزاد غزل کے لشکر کی مرکزی فوجی کمان مناظر عاشق کے ہاتھوں میں آئی تو انھوں نے بڑی ریاضت اور جانفشانی سے اس لشکر کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ ملک کے ہر شاعر سے کم از کم ایک آزاد غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ بہتروں نے یہ فرمائش پوری بھی کی۔ مجھ سے بھی فرمائش کی گئی لیکن میں نے اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے آزاد غزل کے بجائے ایک چھوٹی سی مزاحیہ نظم لکھ کر بھیج دی۔ بس غضب ہوگیا۔ اس کے بعد سے آج تک مناظر نے میرا حقہ پانی بند کر رکھا ہے۔

لیکن اس منہ پھُلوّل کے زمانے میں بھی جب ۱۹۸۳ء میں ماہنامہ "ادب نکھار" مئو ناتھ بھنجن (اعظم گڈھ) نے میرے فکر و فن پر ایک خصوصی شمارہ شائع کیا تو مناظر نے اس میں اپنا ایک تنقیدی مضمون شامل کرایا۔ اس کے علاوہ رانچی یونیورسٹی کے ایک لکچرر عقیل اشرف صاحب کو مجھ پر تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی لکھنے کے لیے راضی کیا اور مقالے کی تیاری میں بھی خاطر خواہ مدد کی۔

اس نظم کے چند اشعار پیش کر رہا ہوں لیکن یہ خیال رہے کہ جس زمانے میں یہ نظم لکھی گئی تھی اس وقت مناظر کی مضمون نویسی اور شاعری الّھڑ دوشیزہ کی طرح شباب پر تھی، اور خود مناظر صاحب ناکتخدا تھے (بہ الفاظ دیگر موصوف تذکیر کے صیغے سے بظاہر تانیث کے صیغے میں ہجرت کر چکے تھے)۔

دو لوگوں کے جو انداز میں ہے خواجہ سرائی	آزاد غزل سے ہوئی نیلما کی سگائی
"عصمت کا لحاف" اوڑھے ہوئے رہتی ہیں دو تو	کہسار میں جھانکو تو ہے بس کھائی ہی کھائی
پیدائشی لنگڑے کو سمجھتی ہیں تنومند	آزاد غزل کی وہ بنیں جب سے فدائی
اللہ رے اس صنفِ مخنّث کا سراپا!	اک ٹانگ ہے دن بھر تو اک ٹانگ سوائی
پانی کے لیے ریت کو وہ چھان رہی ہیں!	شبنم نے بچاری کی نہ جب پیاس بجھائی

اس چھیڑ چھاڑ کے باوجود میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر اعلان کرتا ہوں کہ مناظر مجھے بے حد عزیز ہیں (اور یہ کہ میں نے انھیں کبھی "نظرانداز" نہیں کیا (بلکہ خود وہ مجھے بارہ برس سے نظرانداز کئے ہوئے ہیں)۔ خدا کے حضور یہ دُعا بھی ہے کہ ان کی پوس پالک یعنی آزاد غزل خوب پھولے پھلے، آخر میں مناظر صاحب سے دست بستہ گذارش ہے کہ وہ غالب کے درج ذیل شعر کو خواہ مخواہ اپنے اُوپر چسپاں کرنے کی دانستہ یا نادانستہ کوشش نہ کیا کریں ؎

باغ پاکر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

مالِ مسروقہ

نعامہ بکوش کے قلم سے

فیض کے خطوں کا مجموعہ

نثری شاعری کا عمدہ نمونہ

فیض احمد فیض بلاشبہ اردو کے مقبول ترین شاعروں میں سے ہیں۔ غالب و اقبال کے بعد وہی ایک شاعر ہیں جنھیں برصغیر پاک و ہند سے باہر بھی جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ فیض کی مقبولیت کا اس سے بڑا سبب کیا ہوگا کہ ان سے نظریاتی اختلاف رکھنے والے بھی، ان کے شعروں، مصرعوں اور شعری ترکیبوں کو اس طرح استعمال میں لاتے ہیں، جیسے یہ مالِ غنیمت ہوں۔ فیض کے کلام کو مالِ غنیمت سمجھنے والوں میں ہم بھی شامل ہیں، بلکہ ہم نے تو ہمیشہ خود فیض صاحب کو بھی مالِ غنیمت سمجھا اور ان کے بارے میں بیسیوں "سخن گسترانہ" کالم لکھے۔ فیض صاحب سے ہمیں نیازمندی کا شرف حاصل تھا۔ ہمارے بہت سے کرم فرما ہمارے کالموں کے حوالے سے فیض صاحب کے کان بھرتے تھے، لیکن مرحوم نے ان شکایتوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور ہمیشہ محبت اور شفقت سے پیش آتے رہے۔ البتہ فیض کے شیدائی اور ہمارے خاص الخاص دوست اور کرم فرما مظفر الحسن مرحوم فیض سے متعلق ہماری تحریروں کو دشمن کی نظر سے دیکھتے تھے اور اکثر ٹوکتے رہتے تھے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ بدمزا ہوئے ہوں۔ وہ ہم پر اس حد تک مہربان تھے کہ فیض پر اپنی کتابوں میں نہ صرف ہمارا ذکر کیا بلکہ اپنی ایک کتاب پر ہم سے دیباچہ بھی لکھوایا۔

فیض کے انتقال کے بعد ہم نے ان کے بارے میں کبھی کچھ نہیں لکھا۔ فیض پر لکھنے کا مزا تو ان کی زندگی ہی میں تھا۔ مگر آج ہم اپنی اس روایت کو توڑ رہے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے سامنے ایک ایسی کتاب ہے جسے پڑھنے کے دوران احساس ہوا، جیسے فیض صاحب ہمارے درمیان موجود ہوں اور ہم انھیں چلتے پھرتے دیکھ رہے ہوں۔ فیض پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت جو کتاب ہمارے سامنے ہے، اس کے بارے میں ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ایسی کتاب کبھی نہیں لکھی گئی اور شاید آئندہ بھی نہ لکھی جائے۔

اس کتاب کا نام ہے "دامنِ یوسف" اور یہ تالیفِ لطیف ہے، محترمہ سرفراز اقبال کی۔ محترمہ نے اپنے نام فیض کے خطوں کو ان کے پس منظر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ کتاب ان کی آپ بیتی کی صورت اختیار کر گئی ہے، ایک ایسی آپ بیتی جسے فیض کی سوانح حیات کا ایک باب بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کا آغاز، فیض کے اس معنی خیز شعر سے ہوتا ہے ؎

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو لب پہ آئے تو راز ہو جائے

محترمہ سرفراز اقبال کون ہیں؟ زیر نظر کتاب میں شامل خطوں کے حوالے سے عرض ہے کہ وہ ایک ادب نواز خاتون ہیں، جن کے ہاں شاعروں، فنکاروں اور دوسرے معززین کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ان کا دولت خانہ ادب دنوں کا مرکز ہے۔ محترمہ کے ہاں کی محفلوں کا تذکرہ ابن انشاء نے اپنے ایک خط میں کیا ہے جو اسی کتاب میں شامل ہے۔ (ص ۴۹-۴۸) وہ لکھتے ہیں ــ "آپ کو محفل آرائی اور دوست نوازی اور دیگر آرائیوں اور نوازیوں سے فرصت نہیں تھی تاہم، ہم کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہے۔ . . . آپ کے سول اور ملٹری دوستوں کا کیا احوال ہے۔ افسوس کہ آپ کا گھر چھوٹا ہے، لیکن سامنے کا پلاٹ خالی ہے۔ وہاں شامیانے لگوا کر ہر روز صبح کو آپ کو اپنا دربار بھی منعقد کرنا چاہیئے اور نذریں وصول کرنی چاہیئں اور خلعت و انعام تقسیم کرنے چاہیئں۔ حد ہے اتنے دنوں سے وہ جگہ خالی ہے اور آپ لوگوں نے اس پر قبضہ کر کے اسے کچی آبادی نہیں بنایا جو کبھی نہ کبھی تو مستقل ہوتی۔"

محترمہ نے خود اپنا تعارف ان لفظوں میں کرایا ہے ــ "بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ دوستی، محبت، عشق، چاہت، یہ سب کیا ہے، لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکی۔ ممکن ہے بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں، مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور سننا اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ، کاش کبھی مجسم ہو کر مجھ سے ملنے آئیں، میں انھیں اپنے کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھا دوں اور پھر ان کی باتیں سنتی جاؤں۔ سنتی ہی جاؤں حتیٰ کہ سننے سنانے کے لیے کچھ باقی نہ رہے۔ آوازیں ختم ہو جائیں۔ کمرہ خالی رہ جائے۔" (ص ۱۰)

وہ بقول خود، اسی قسم کی باتیں سوچتے ہوئے فیض کو خط لکھا کرتی تھیں!

محترمہ پہلی مرتبہ احمد فراز کے ذریعے فیض صاحب سے متعارف ہوئیں۔ فون پر بات چیت ہوئی۔ وہ اس پہلی بات چیت میں فیض سے کہنا چاہتی تھیں "تم سے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو" مگر نہ کہہ سکیں۔ اس غائبانہ ملاقات کا محترمہ پر کیا اثر ہوا، اس کا اندازہ ان الفاظ سے کیجیے ـ "فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد، میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں یا پھر اڑتے بادلوں کی نرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پر اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں۔" (ص ۱۲)

کچھ عرصہ بعد کراچی میں پہلی ملاقات ایک ہوٹل میں ہوئی۔ اس کے بعد خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دوسری ملاقات پشاور کے ایک ہوٹل میں ہوئی جہاں احمد فراز محترمہ کو اپنے ساتھ لے گئے تھے! اس ملاقات کا حاصل یہ مصرعہ تھا جو فیض نے ایک کاغذ پر لکھ کر اور اپنے دستخط کر کے محترمہ کو پیش کیا ـ ع

فراز اوج پہ پہنچے تو سرفراز ہوئے

محترمہ کا بیان ہے کہ "فراز آج تک اس مصرع کی تاب نہ لا سکا۔" اس ملاقات کا محترمہ پر جو اثر ہوا، وہ انھیں کے الفاظ میں یہ ہے ــ "اگلے روز میں راولپنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لیے اس روشن ستارے کی مانند تھے، اندھیری رات کے مسافر جس سے رہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ جب بھی مجھے کوئی مشکل ہوگی، میں ان سے ضرور مشورہ کروں گی کیونکہ یہ شخص ہے جو مجھے یوں محسوس کر سکتا ہے جیسے میں خود کو محسوس کرتی ہوں۔" (ص ۱۵)

اس کے بعد خطوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ بیچ میں محترمہ کی باتیں بھی جاری رہتی ہیں کہیں کہیں شعر بھی نظر

پیش کرتی ہیں، کہیں کسی غیر واضح جملے کی تشریح کرتی ہیں، کبھی فیض صاحب سے اپنی کسی ملاقات کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔ محترمہ کا اندازِ بیان اتنا خوبصورت ہے کہ کہیں کہیں تو فیض کے خط ان کی نثر کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں۔ محترمہ کی عقیدت اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ فیض کے بعض سرسری اور بے مزا خطوں کو بھی اپنی توضیح و تشریح سے ادب پارہ بنا دیتی ہیں۔

اس کتاب میں فیض کے کل ۵۶ خطوط ہیں۔ چند خط محترمہ کے بچوں کے نام ہیں لیکن ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ تین چار کے علاوہ باقی سب خط مختصر ہیں لیکن ان کے اختصار میں ایک جہانِ معنی نظر آتا ہے۔ ابتدائی دو چار خط "عزیزی" سے شروع اور "فقط" پر ختم ہوتے ہیں۔ ان کے بعد کے خطوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں سے شروع اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔ پڑھنے والا ان کی ابتدا سے پہلے اور اختتام کے بعد بھی بہت کچھ پڑھ سکتا ہے اور بین السطور میں جو کچھ ہے اس سے استفادہ کرنے کے لیے چشمِ بینا کی نہیں، ذہنِ رسا کی ضرورت ہے۔ ان خطوں میں کیا کچھ ہے، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباسات سے کیجئے:

"جو تم نے لکھا ہے کیفیت اپنی بھی کچھ ویسی ہی ہے۔ یعنی جہاں تک بد عادتوں کا تعلق ہے۔ تمہاری عادت نہیں بھی کچھ اتنی بڑھ چکی ہے کہ آنکھ کھلتے ہی "صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُن کے ہاتھوں کی" کا مضمون ذہن میں آتا ہے۔" [ص۔ ۶۱]

"... تمہارے لیے اچھی بات یہی ہے کہ ہم تمہیں ٹکٹ بھجوا دیتے ہیں، تم میاں سے مہینے بھر کی چھٹی لے کر ہمارے پاس آ جاؤ اور ہم ضمانت دینے کو تیار ہیں کہ تمہیں صحیح و سالم واپس کر دیں گے۔" (ص۔ ۶۶)

"تم نے ہمیں ٹی وی پر دیکھ لیا لیکن ہم کیسے دیکھیں۔ شاعر لوگ کہتے ہیں کہ دل میں تصویر رکھنی چاہیئے اور "جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی"، اس سے زیادہ آرام دہ صورت تو یہی ہے کہ بار بار گردن جھکانے کے بجائے تصویر کہیں سامنے ہی رکھ لی جائے لیکن وہ تو تصویر ہوئی، اُس سے بات کیسے کی جائے یا اس کی آواز کیسے سنی جائے"؟ [ص۔ ۸۸]

"تمہارا کہنا غلط ہے کہ تمہیں ملاقات کا ہم سے زیادہ طلب ہے۔ تمہارے پاس تو پھر بھی وہاں دل لگی کا بہت سا سامان موجود ہے (خواہ اس سے کچھ نہ کچھ گڑبڑ کیوں نہ ہوتی رہے) یہاں تو یادوں کے سوا کچھ نہیں ہے ... اسی وجہ سے ہم دامن چھڑا کر ادھر اُدھر نکل جاتے ہیں لیکن وہاں وہ چیز تو نہیں ملتی جو پہلے ۱۰۴[1] اور اب سنا ہے کسی نئے تاج محل میں ہے۔" [ص۔ ۹۱]

[1 محترمہ کے پُرانے مکان کا نمبر تھا۔ "نئے تاج محل" سے مراد نیا مکان ہے]

"ہم نے تمہاری عادتیں بگاڑ دی ہیں تو یہی شکایت میاں تم سے بھی ہے اور اسی "بگاڑ" کی وجہ سے اپنا کمرہ اور اپنا بستر زیادہ یاد آتا ہے۔" [ص۔ ۹۵]

"کراچی سے روانگی سے پہلے تمہاری آواز سن کر خوشی ہوئی۔ تمہارا بہت ہی اچھا خط بھی ملا تھا۔ ہم کبھی کسی کا خط رکھتے نہیں ہیں، لیکن یہ میں نے رکھ لیا ہے تاکہ سند رہے اور تم بھاگ نہ سکو۔" (ص۔ ۱۱۴)

ان اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے، اصل خطوں میں کیا کچھ ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نثر میں شاعری کر رہے ہوں۔ فیض کی شاعری میں "رشک" کا مضمون ذرا کم ہی نظر آتا ہے اور وہ اتنے فراخ طبع

رقیب سے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ لیکن ان خطوں میں معاملہ برعکس ہے۔ ذرا دیکھیے غالب کی طرح فیض کس کس انداز سے "رشک" کا مضمون باندھتے ہیں۔ رقیبوں پر نظر رکھنے کے لیے جاسوس مقرر کرنے کا سوچتے ہیں۔

"تمہیں نیا گھر مبارک ہو۔ یہ افسوس ضرور ہے کہ ہم نے نہیں دیکھا۔ . . اِس میں ہمارا کوئی کمرہ ہوگا۔ خیر کبھی وہ بھی ہو جائے گا۔ لیکن اگر تمہارا ریٹائر ہونے کا ابھی ارادہ نہیں ہے تو اس دوران میں کیا ہوگا خالد سعید بٹ کو لکھتے ہیں کہ جاسوسی کے فرائض انجام دے۔" [ص۔ ۷۵]

"تم نے ہمارے دوست میر (علی احمد تالپور) صاحب کو بھی دریافت کرلیا۔ بھلا تم سے کوئی کیسے بچ سکتا ہے۔ لیکن کسی خوبصورت عورت کو میر صاحب کی رکھوالی میں دینا تو گوشت اور بلی والا معاملہ ہے۔" (ص۳۲)

"غالباً سکے دوست جتنے میں جو تمہیں مہارت حاصل ہے، اُس کا کچھ علاج ضرور ہونا چاہیے۔ تم مسکرا کر خیر مقدم کرنے تک تو ٹھیک ہے لیکن اگر مسکرانے کا انداز ہی ایسا ہو کہ . . . . کسی کے دل میں لڈو پھوٹنے لگیں تو اس میں کسی کی کیا خطا۔ اس کے جواب میں تم کہو گی کہ ہم کیا کریں، ہماری صورت ہی ایسی ہے، تو وہ بات بھی ٹھیک ہے۔" [ص ۱۰۳]

"رشک" کے معاملے میں محترمہ بھی فیض سے کم نہیں۔ فیض نے ایک خط میں کسی خاتون سے ملاقات کا ذکر کیا اس کی باتیں انھیں پسند آئیں اور ان باتوں پہ ایک گیت لکھ دیا۔ یہ گیت انھوں نے محترمہ کو بھیجا۔ محترمہ نے لکھا۔ "میں بھی تو باتیں کرتی ہوں۔" اس کے جواب میں فیض لکھتے ہیں "تم نے چاہنے والوں کا ذکر کیا ہے وہ تو ہیں اور اللہ انھیں خوش رکھے۔ لیکن ہر کسی سے تو وہ کچھ نہیں مانگ سکتے، جو مل سکتا ہے، جو حُسنِ اتفاق سے وہاں میسر آگیا تھا اور جس کی طلب ہمیشہ کی طرح باقی ہے۔ تم نے لکھا تھا کہ تم بھی تو باتیں کرتی ہو اور شاید اسی وجہ سے اچھی لگتی ہو تم اچھی ضرور لگتی ہو، لیکن اس میں باتیں کرنے کے علاوہ اور چیزوں کو بھی دخل ہے۔" [ص۸۴]

خطوں کی توضیحی عبارتوں میں محترمہ نے بھی جگہ جگہ شاعری کی ہے۔ مثلاً

"میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھے ملیں تو میں اُن کو یہ خط واپس کر دوں . . . لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ حصہ واپس لے لو، جو ندی کے پانی کی بجائے اداس ہوا میں تیرتا جا رہا ہے۔" (ص۴۹)

"فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لیے اس سنگِ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزر رہے تھے۔" [ص ۲۳]

"فیض کو الوداع کر کے . . . . جہاز کو دیکھ کر میں نے بے ساختہ ہاتھ ہلایا، مجھے اپنا وجود جہاز کے پیچھے اُڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس وقت میرا جی چاہا میں بھی ایک پرندہ ہوتی . . . ." [ص ۵۷]

●●

اس کتاب کا نام "دامنِ یوسف" کے بجائے "دامنِ تار تار" ہوتا تو بہتر تھا۔ پچھلے ہفتے ہم نے عرض کیا تھا کہ اس مجموعے میں محترمہ سرفراز اقبال کے بچوں کے نام فیض کے جو دو چار خط ہیں، ان میں بھی روئے سخن محترمہ ہی کی طرف ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔ ایک بچے نے اپنے خط میں محترمہ کے حوالے سے فیض صاحب کو بے وفائی کا طعنہ دیا۔ اس کے جواب میں وہ فرماتے ہیں "امی سے کہہ دینا

ہیں۔ یہ دنائی نہیں، دنیا داری ہے۔" (ص۔ ۳۲) ایک اور خط میں ارشاد ہوتا ہے " امی کے خط مل گئے ہیں، تم
جواب میں ہماری طرف سے پیار کرلینا" (ص۔ ۴۴) اسی طرح یہ جملہ بھی بیک وقت خوشی اور غم کا آئینہ دار ہے۔
"تم نے امی کا جو حال لکھا ہے اسے پڑھ کر کچھ اداس بھی ہوں، لیکن دل کچھ خوش بھی ہوا کہ ہمیں کوئی یاد تو کرتا ہے۔"
(ص ۶۰) فیض بچوں کی نفسیات سے پوری طرح واقف ہیں اور ان سے انھیں کی سطح پر آکر باتیں کرتے ہیں۔ " امی
سے تم نے مقابلہ کب سے شروع کیا ہے۔ تم نے خود ہی لکھا ہے کہ وہ کبھی کبھی یاد کرکے رو بھی دیا کرتی ہیں، لیکن تم
نے کتنے آنسو بہائے ہیں؟" (ص ۶۲)

فیض کے خطوں پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ہمیں اس کالم میں ابنِ انشاء اور سید سبطِ حسن کے خطوں
کا ذکر بھی کرنا ہے اس لیے فیض کے خطوں کی صرف ایک خصوصیت بیان کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے اور وہ ہے ان کا
مزاحیہ انداز۔ ایک مرتبہ محترمہ حج کرکے آئیں تو فیض نے انھیں لکھا " خوشی کی بات یہ ہے کہ تمہارے نو سو تو پورے
ہو گئے۔ اب اگلے نو سو پورے ہونے تک تمہیں کافی لمبی چھٹی ہے۔" (ص ۸۰) اپنی اور محترمہ کی عمروں کے حوالے
سے یوں گل افشانی کی ہے:

" تمہیں ابھی سے اپنی عمر کی فکر کیوں ہونے لگی! ابھی تو ... تمہیں اپنے دامادوں کو رام کرنا ہے
اور تمہاری یہی صورت رہی تو ان کی اولادوں کو بھی۔ البتہ ہمیں اب کبھی کبھی یہ خیال ضرور آنے لگا
ہے کہ اس عمر میں دنیا والوں سے منہ موڑ کر اللہ اللہ کرنا چاہیے، لیکن تم جیسے لوگ یہ کرنے ہی
نہیں دیتے۔ بلکہ اب ہم دلی گئے تو تم جیسے لوگوں میں ایک آدھ کا اور اضافہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ
بات تم سے نہیں کرنی چاہیے۔" (ص ۸۸)

" ..... آپ خدا کے فضل سے نانی اماں بن چکی ہیں۔ مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب تم اپنے
لیے ایک "گرینڈ مدر" کا بیج بنوا لو جو بوقتِ ضرورت سامنے لگا لیا کرو۔ لیکن خیر نانی بن کے
تم میں کیا فرق آئے گا۔ البتہ اب ہم واقعی ریٹائر ہونے کی سوچ رہے ہیں۔ اس سے پہلے
کچھ دن تمہارے ساتھ گزار لیتے تو اچھا تھا۔" (ص ۱۰۳)

مختصر یہ کہ فیض کے خط بہت اہم ہیں۔ اردو کے پسماندہ اور درماندہ محققین کے لیے یہ ایک نیا موضوع
ہے اب وہ برسوں ان خطوں پر تحقیق کرتے رہیں گے۔ خود محترمہ کے نزدیک ان خطوں کی اہمیت کیا ہے، اس کا
اندازہ ان کے ان الفاظ سے کیجیے: " میں جب فیض صاحب کے ان خطوں، ان کی باتوں، ان کے لفظوں اور ان
کے پس منظر میں سانس لیتے جذبوں کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتی ہوں تو یہ سب مل کر مجھے میرے ہونے کا احساس
دلاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے جیسے ابدی ہجرت میں بھی میرا زادِ سفر ہوگا اور کبھی کبھی تو میرا یہ گمان، ایمان کا روپ دھار لیتا
ہے کہ جب میری روح مکاں سے لامکاں کی وسعتوں میں تحلیل ہو رہی ہوگی تو حدِ نظر پہ کسی مقدس سمت سے
اچانک کوئی خوشبو دھنک رنگ لہجے میں سرگوشی کرے گی۔ ارے تمہیں میرے خط کہاں ہیں؟ وہ کیا دنیا میں چھوڑ آئی
ہو؟ کیا ایسا ممکن ہے! کاش ایسا ممکن ہو۔" (ص ۱۱۸)

گویا محترمہ کے ساتھ ان کا نامۂ اعمال نہیں، نامہ ہائے فیض احمد فیض ہوں گے۔ فیض کے خطوں کو بھی نامۂ
اعمال سمجھنا چاہیے، مگر مشترکہ۔ فرشتے ہر فرد کا نامۂ اعمال الگ الگ لکھتے ہیں، مشترکہ نامۂ اعمال کوئی انسان

ہی لکھ سکتا ہے!

فیض کے خطوں کے اس مجموعے میں ابن انشاء اور سید سبط حسن کے بھی چند خطوط شامل ہیں ممکن ہے ان دونوں کے اور خطوط بھی ہوں، جو الگ الگ مجموعوں کی صورت میں شائع ہوں۔ "دامنِ یوسف" میں صرف وہی خطوط ہیں جن کا تعلق فیض صاحب سے ہے۔ پہلے ذرا ابنِ انشاء کی "استادانہ" نثر کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے:

"فیض صاحب کے واپس کھسکنے کا اور وہاں موجود ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اور کوئی باقی نہیں رہا۔ سورج اپنی جگہ، چاندنی اپنی جگہ، چھوٹے موٹے ستارے اپنی جگہ۔ بعض ایسی راتیں بھی ہوتی ہیں کہ سورج ہوتا ہے نہ چاند ہوتا ہے۔ بس ستاروں کو دیکھ کر اور گن کر دل بہلانا پڑتا ہے۔ بلکہ گننے اور دل بہلانے کے لیے ستارے زیادہ اچھے رہتے ہیں۔ سورج صرف ایک ہے چاند بھی ایک ہے، اسے کوئی کہاں تک گنے گا؟" (ص ۲۶)

"اس دورِ الفت میں دیکھنا اپنے ہاتھ وغیرہ نہ کٹا لینا، یہ ہر قسم کی چوری پہ کاٹا جا سکتا ہے۔ سینہ زوری پر دونوں کٹنے چاہئیں۔" (ص ۲۷)

"۔۔۔۔ اب تو میرا تعارف اس حیثیت سے کرایا جاتا ہے کہ ان سے ملئے یہ معمولی آدمی نہیں ہیں یہ بیگم سرفراز اقبال کے جاننے والے ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب اس شخص کا نام فیض، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کی فہرست میں آتا ہے تو یہ بھی کچھ تو ہوگا۔ ایسے ویسے کو تو بیگم اقبال منہ لگانے سے رہیں۔ میں آپ کا FAN ہوں۔" (ص ۳۹)

ابنِ انشاء تو خیر مزاح نگار تھے، ان سے اس قسم کی باتیں غیر متوقع نہیں۔ لیکن خدا جانے سید سبطِ حسن جیسے سنجیدہ آدمی کو کیا ہوا کہ انھوں نے فیض صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ان کی "متروکاتِ سخن" پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے فیض کے انتقال پر تعزیت بھی محترمہ سے کی۔ تعزیتی خط کے یہ الفاظ قابلِ توجہ ہیں "میری اچھی دوست! محبت بہت لطیف محبت [illegible] ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ہیں، قدرت جن کو یہ جذبہ عطا کرتی ہے وہ ساری عمر گزار دیتے ہیں۔ نہ کسی سے محبت کر پاتے ہیں، نہ کوئی ان سے محبت کرتا ہے مگر آپ تو ان خوش قسمت اور خوش خصلت انسانوں میں سے ہیں، جن کو محبت کرنا آتا ہے۔ مجھ کو کبھی کبھی فیض صاحب پر رشک آتا تھا، ان کو کتنا پیارا چاہنے والا ملا ہے مگر وہ تو محبت لوٹ کر پیار کرتے تھے۔ مجھ میں وہ [illegible] کی صلاحیت کہاں لیکن کوشش [illegible] کا کہ آپ کے غزل کے [illegible] پھر دل پا [illegible]" (ص ۱۲۱)

سید صاحب نے غموں کو [illegible] بانٹنے کی بات محض تکلفاً نہیں کہی۔ وہ واقعی غم کی تصویر بن گئے "میری مہربان دوست! خوش رہو! مگر تم تو [illegible] ہوگی کہ نہ خط نہ ٹیلیفون، نہ تصویریں جن کا تم نے وعدہ کیا تھا [illegible] کہ شاید تمہارا کوئی خط ہو مگر ناکامی ہوتی ہے۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

کیا ہے۔ بہرحال جن کی یادوں نے یہ اُلٹے سیدھے شعر کہلوائے ہیں، اسی کی نذر ہیں"۔ (ص ۲۲۴)

سید سبطِ حسن اور شاعری؟ جی ہاں، انھوں نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کی زندگی کی پہلی اور آخری نظم ایک ادبی "شاہکار" ہے۔ یہ نظم ملاحظہ فرمایئے اور اس کی داد دیجئے کہ سید صاحب نے دوسرے بند، تیسرے مصرعے میں محترمہ کا نام کس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔

میرے محبوب کے ہونٹوں کی مٹھاس
میرے محبوب کے ہونٹوں کی حرارت
لبِ گویا! تری شیرینیٔ گفتار کہاں سے لاؤں؟
تیرا اندازِ تکلم، جس سے خوشبوئے وفا آتی ہے
چاہت کی مہک، پیار کے پھول
الفت و مہر کا مژدہ لاتے
عہد و پیماں کا نغمہ جن کو
میرے کانوں نے سنا، میری آہوں نے سنا
اور قلبِ مضطر نے تسلی پائی

میرے غم خانے میں یہ کون آیا
آیا اور درد کا درماں بن کر
مجھ کو سرافراز کیا
خوشبوؤں کا در باز کیا

اور اب یادوں کی سب رنگ دھنک
تجدیدِ ملاقات کا ارماں بن کر
ان کی باہوں کی طرح
میری فرقت کے شب و روز کو
اپنی آغوشِ محبت میں سکوں [illegible] ہے۔

فیض صاحب نے اپنے خطوں میں نثر میں شاعری کی ہے۔ سید صاحب نے شاعری میں نثر لکھی ہے۔ پہلے کام کی طرح یہ کام بھی بہت مشکل ہے۔

سید صاحب نے محترمہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے ایک خط میں بیگم ایلس فیض کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ "ایلس کی بے رخی کا شکوہ فضول ہے۔ وہ فیض صاحب کی کسی چاہنے والی کو پسند نہیں کرتیں بلکہ اپنا رقیب سمجھتی ہیں۔ یہ ان کا احساسِ کمتری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔ آپ اپنا دل میلا نہ کریں"۔ (ص ۱۲۱) محترمہ ایلس فیض کی نظر سے جب یہ الفاظ گزریں گے تو انھیں محسوس ہوگا کہ فیض کا ایک [illegible] ان کے بارے میں [illegible] لکھا تھا۔

ہماری دِلی ہمدردیاں بیگم فیض کے ساتھ ہیں، لیکن ہماری ہمدردیوں سے کیا ہوتا ہے! سُنا ہے بیگم سرفراز آپا کی
کے پاس فیض کے کئی امستریمی دوستوں کے خطوط ہیں۔ جب یہ خطوط شائع ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ فیض کیسے کیسے دوستوں
کے درمیان زندگی بسر کر گئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کتاب کا نام "دامنِ یوسف" کی بجائے "دامنِ تارتار" ہونا چاہیئے کیونکہ اس
کے ہر صفحے پر "دستِ زلیخا" کی کارفرمانیاں نظر آتی ہیں۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں۔ اس کتاب میں پاکئ داماں کی حکایت
بیان کی گئی ہے، اس لیے وہی نام درست ہے جس نام سے یہ کتاب چھپی ہے۔ ویسے بھی نام میں کیا رکھا ہے، اصل چیز
کتاب کے مطالب ہیں اور انھیں پر توجہ کرلی چاہیئے۔

ایک قاری نے یہ شکایت بھی کی ہے کہ کتاب کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ صرف ۱۲۶ صفحات ہیں اور قیمت
۳۰ روپے ہے۔ ناشر نے دھوکا دینے کے لیے کتاب کے آخری چار صفحات میں نمبر شمار میں سو کا اضافہ کردیا ہے
ن کی وجہ سے ۱۲۶ صفحات ۲۲۶ ہوگئے ہیں۔ محترم قاری کی خدمت میں عرض ہے کہ یہ کتاب ہرگز مہنگی نہیں ہے۔
۳۰ روپے دراصل اس تصویر کی قیمت ہے جو کتاب کے آخری سرِ ورق پر چھاپی گئی ہے جس میں فیض صاحب
ب خوابی کا لباس پہنے ہوئے پلنگ پر بیٹھے ہیں اور ان کے شانوں پر ہاتھ رکھے کوئی اور بھی موجود ہے۔ ۳۰
روپے میں یہ تصویر خرید یئے کتاب اس کے ساتھ مفت ملے گی۔

منظور وقار (گلبرگہ)

حیدرآباد چلو حیدرآباد چلو

زندہ دلان حیدرآباد کی جانب سے ۲۴ر نومبر ۸۸ء کو حیدرآباد میں منعقد ہونے والے کل ہند مزاحیہ ادبی اجلاس کا اعلان اخبارات میں پڑھتے ہی ہم تینوں (راقم رؤف خوشتر اور وسیم احمد) نے اس اجلاس میں شرکت کا پروگرام بنایا۔ پھر کیا تھا ہماری ادبی اجلاس میں شرکت کی نیوز اخبارات میں شائع بھی ہوگئی پروگرام کے مطابق ہم صبح چھ بجے کی بس سے بیدر پہنچے جہاں سے رؤف خوشتر کو لے کر ظہیرآباد پہنچنا تھا۔ رؤف خوشتر کے مکان پر پہنچے تو برادرم رؤف خوشتر اور بھابی جان نے ہمارا استقبال اس طرح کیا جس طرح سعودی عرب میں ملازمت کر کے ڈھیر سارے تحفوں کے ساتھ گھر لوٹنے والے فرد کا کیا جاتا ہے۔ (یوں بھی خلوص کا ایک تحفہ ہمارے ساتھ تھا) رؤف خوشتر اور ہم ظہیرآباد پہنچے تو ایک بس وسیم احمد اور مسعود عابد کو لے کر اس تیزی کے ساتھ یہ جادہ جا ہوگئی کہ رؤف خوشتر اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ گئے۔ شاید بس ایک ساتھ تین مزاح نگاروں کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔ پھر تو ہم حیدرآباد کے لیے روانہ ہونے والی اگلی بس میں اسطرح لپک کر گھس پڑے کہ ہم لوگوں کی پھرتی کو دیکھ کر بس کا ڈرائیور حیران تو کنڈکٹر پریشان ہوگیا۔ (اگر ہم دونوں یہ پھرتی نہیں دکھاتے تو ادبی اجلاس میں ہماری شرکت تو نہ ہوتی البتہ ظہیرآباد ہی سے ہم خود طنز و مزاح کا نشانہ بن کر اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ جاتے) بس میں سوار ہوتے ہی رؤف خوشتر کی پُر لطف باتیں شروع ہوگئیں۔

بس کافی تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی مگر جب بس کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تو رؤف خوشتر نے کہا "معلوم ہوتا ہے بس کے ڈرائیور کو بھی مزاحیہ ادبی اجلاس میں شریک ہونا ہے" ہم نے جواب دیا "ہاں! ایسا لگتا ہے ڈرائیور کو نہ صرف ادبی اجلاس میں شریک ہونا ہے بلکہ اس اجلاس کی صدارت بھی کرنی ہے"، رؤف خوشتر نے فوراً چٹکلہ چھوڑا "نہیں! اگر صدارت کرنی ہوتی تو وہ بس کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ کرنے کے بجائے رفتار کو کم کر دیتا دراصل معلوم ہوتا ہے ڈرائیور کو مزاحیہ ادبی اجلاس میں اپنا مضمون سنانا ہے"۔ یوں ہم قہقہہ بردوش حیدرآباد پہنچے۔

ٹھیک ساڑھے پانچ بجے شام جب ہم گاندھی بھون کے احاطہ میں داخل ہوئے تو گاندھی بھون کے سامنے منتظمین اور مہمانوں کا استقبال کرنے والوں میں نمایاں حضرت حمایت اللہ، مصطفٰے علی بیگ، ... حیدرآباد ...

مگر وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ہی رہے۔ (شاید انھیں ہماری آمد کا پتہ چل گیا تھا) غرض ہم نے جن جن مزاح نگاروں سے ملاقات کی یہ جان کر اطمینان ہوا کہ ہم پہلے ہی سے مزاح نگار کے طور پر متعارف ہیں۔ (اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہنے کا یہی تو ایک فائدہ ہے)

گاندھی بھون کے خوبصورت ہال میں ٹھیک چھ بجے مزاحیہ ادبی اجلاس کا آغاز ہوا ڈائس پر صدر اجلاس مجتبیٰ حسین کے علاوہ صرف مضمون نگار حضرات ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ (ڈائس کو ہسٹریا نیا سے محفوظ رکھا گیا تھا) حمایت اللہ سامعین کو کرسیوں پر بٹھا رہے تھے اور اس بات کی پوری کوشش کر رہے تھے کہ کوئی بھی شخص اجلاس کے اختتام تک ہال سے باہر نہ جانے پائے۔ سب سے پہلے یوسف ناظم نے مزاح نگاروں کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا کہ ان قلمکاروں کو آئندہ اپنا تعارف کروانے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ اجلاس کا آغاز ڈاکٹر حبیب ضیاء کے مضمون سے ہوا۔ انھوں نے اوپننگ بیٹسمین کے طور پر قہقہوں کی اسکورنگ کو آگے بڑھایا۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد رشید الدین مائک پر آئے۔ ان کے بعد جب "نائٹ واچ مین" کے طور پر مسیح انجم اپنا بیاٹ (مضمون: شاعروں اور ادیبوں کی کالونی) لے کر میدان میں اترے تو طنز و مزاح کے وہ چوکے اور چھکے لگائے کہ سارا ہال قہقہوں اور تالیوں کی آواز سے گونج اٹھا۔ پھر ان کے بعد خواہ مخواہ، پرویز یداللہ مہدی، نریندر لوتھر اور دلیپ سنگھ نے ایک سے بڑھ کر ایک مزاحیہ مضمون سنا کر سامعین کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا۔ جب صدر اجلاس مجتبیٰ حسین اپنا طنزیہ "جی ہاں' سوئس بنک میں میرا کھاتہ موجود ہے" سنانے لگے تو سامعین کی داد سے ہال گونج اٹھا۔ چونکہ مجتبیٰ حسین ادبی اجلاس کے آخری مزاح نگار تھے اس لیے سامعین کو قابو میں لانا ضروری تھا چنانچہ یوسف ناظم نے اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا اس اعلان کو حقیقی شکل دینے کے لیے لوگس حیدرآبادی نے سامعین اور مہمانوں کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ سامعین ہنستے مسکراتے قلمکاروں کو مبارکباد دیتے ہوئے چلے گئے۔

دوسرے دن یعنی ۲۵ر نومبر کو (دوپہر) ہم دفتر شگوفہ پر پہنچے۔ دفتر شگوفہ معظم جاہی مارکٹ کے قریب بیچلرز کوارٹرز کی سب سے اوپر کی منزل پر واقع ہے۔ (یوں بھی شگوفہ کا دفتر بیچلرز کوارٹرس پر ہی ہونا ضروری تھا کہ مزاح نگار "دل" سے ہمیشہ بیچلر ہی تو ہوتے ہیں) شگوفہ کے دفتر کمرہ نمبر ۱۳ میں داخل ہوتے ہی ہمیں یوں لگا جیسے کسی کلاس روم آفیسر کے چیمبر میں داخل ہوئے ہیں۔ سلیقے سے سجائے ہوئے کمرے میں ڈاکٹر مصطفےٰ کمال بڑے ہی بارعب انداز میں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور "راؤنڈ ٹیبل کانفرنس" جمی ہوتی تھی، یوسف ناظم، محمد منظور احمد (رکن مجلس ادارت) اور محمد سلیمان (خازن زندہ دلان) بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے داخل ہوتے ہی سب خوش ہوئے۔ یوسف ناظم نے ہمیں اپنے قریب بٹھا لیا اور تفصیلی گفتگو کا اعزاز بخشا۔ مصطفےٰ کمال ہمارا تعارف محمد منظور احمد سے کراتے ہوئے بولے "یہ منظور احمد صاحب ہیں۔ یہ آپ کے مضامین شگوفہ میں اشاعت سے پہلے بھی پڑھتے ہیں اور بعد بھی" (ہم نے دل میں کہا اشاعت سے پہلے پڑھنا تو ادارتی ذمہ داری کی تعریف میں آتا ہے۔ اشاعت کے بعد بھی ہمارے مضامین پڑھتے ہیں تو یہ ہمارے لیے ایک اعزاز ہے)۔ یوسف ناظم صاحب گلبرگہ کے حالات دریافت کرتے رہے۔ ڈاکٹر راہی قریشی اور ڈاکٹر طیب انصاری کو یاد کیا اور کہا بہت سال پہلے جشن خطیب کے وقت گلبرگہ آیا تھا پھر گلبرگہ جانے کا اتفاق ہی نہیں ہو سکا۔ ہم نے گلبرگہ کی ادبی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارے شہر میں مختلف ادبی انجمنوں کے علاوہ روزنامہ "بہمنی نیوز" اور ہفت روزہ "اتفاق" شہر کے ادبی ماحول کو پروان چڑھانے میں لگے

ہوئے ہیں۔ جب ہم نے کہا کہ "یوسف ناظم صاحب! گلبرگہ کے باذوق قاری آپ کی تحریروں کو بے حد پسند کرتے ہیں" انھوں نے فوراً جواب دیا" ایک گلبرگہ والے ہی تو میری تحریروں کو پسند کرتے ہیں"۔ پھر کچھ یاد کر کے بولے گلبرگہ کے ایک صاحب خاکہ نگاری نمبر نکالنے والے تھے پتہ نہیں کیا ہوا اس نمبر میں میرا انٹرویو بھی شامل تھا۔ ہم نے بتایا "وہ صاحب انیس صدیقی ہیں جو ہمارے قریبی دوست ہیں خاکہ نگاری نمبر کی کتابت اور طباعت کا کام مکمل ہو چکا ہے صرف سرورق کا کام باقی ہے بہت جلد کتاب منظر عام پر آئے گی"۔ یہ سن کر انھوں نے اچانک ہماری مصروفیت دریافت کی۔ ہم نے کہا "ہم گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں بحیثیت کلرک کام کرتے ہیں" وہ بولے اچھا تو طیب انصاری والے گورنمنٹ کالج میں" پھر پوچھا۔ "سالار کا ادبی ایڈیشن میرے پاس آتا ہے بنگلور سے "سالار" کے علاوہ اور کون کون سے اخبار نکلتے ہیں"؟ ہم نے جواب دیا" بنگلور سے اور بھی بہت سے اردو اخبارات شائع ہوتے ہیں مگر سالار بہت زیادہ مقبول ہے اس کی مقبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ آپ خود بھی سالار کا مطالعہ کرتے ہیں"۔ پھر ہم نے کہا "یوسف ناظم صاحب آج کل آپ بے حد چھپ رہے ہیں"؟ انھوں نے فوراً جواب دیا "اچھا تو کیا اب میں چھپنا چھوڑ کر چھپنا شروع کر دوں"؟ ہم نے جواب دیا: "ایسی غلطی مت کیجئے گا اگر آپ چھپنا چھوڑ کر چھپنا شروع کر دیں گے تو آپ کی تحریروں کے شیدائی آپ کے فراق میں تڑپنا شروع کر دیں گے"۔ اس کے بعد انھوں نے کہا "میں تو مشاعرہ میں شرکت نہ کر سکوں گا کیوں کہ آج ہی مجھے بمبئی جانا ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے"؟ ہم نے جواب دیا ہمارا ارادہ بھی مشاعرہ میں شرکت کا نہیں ہے۔ اس درمیان ہم کھانس رہے تھے وہ بولے "جناب آپ کو کھانسی اور سردی ہے اسی لیے منتظمین مشاعرہ نے مشاعرہ گاہ پر شامیانہ لگائے ہیں پھر بھی آپ مشاعرے میں شرکت نہیں کر رہے ہیں"۔ غرض یوسف ناظم صاحب کہتے رہے اور ہم سنتے رہے ہماری بڑی تمنا تھی کہ ہم یوسف ناظم صاحب سے ملیں۔ ان کی پُرخلوص و پُرلطف باتوں نے ہمیں بے حد متاثر کیا۔ ہم اسی شام ۶ بجے کی ایکسپریس ٹرین سے گلبرگہ کے لیے روانہ ہوئے رات بھر مزاح نگاروں کے چہرے اور سامعین کے قہقہے ہمارا پیچھا کرتے رہے اور پھر ہمیں یوں لگا جیسے ان چہروں اور قہقہوں کے درمیان شہر حیدرآباد جھوم رہا ہو۔!

●●

تصنیف: ایس ڈھوم رَاجَن

تلخیص و ترجمہ: فیاض احمد فیضی

مزاح — محض ہنسی ہنسی کی بات نہیں ہے!

نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ٹریننگ اِن انڈسٹریل انجنیرنگ (NITIE) نے پیداواریت بڑھانے میں مزاح کا کردار، کے موضوع پر تحقیق کا پروگرام تیار کیا ہے۔

بنیادی طور پر نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ٹریننگ اِن انڈسٹریل انجنیرنگ (NITIE) کا مقصد، کام کرنے کے ایسے سسٹم کا خاکہ بنانا ہے جس سے پیداواریت میں اضافہ ہو اور پیشہ ورانہ تکالیف، غیر محفوظ حالات اور بوریت جیسے مضر اثرات کا خاتمہ ہو۔

کام کرنے والوں کی پیداواریت میں اضافے کی خاطر، غیر روایتی طریقۂ کار کی کھوج کے نتیجے میں این آئی ٹی آئی ای (NITIE) نے مزاح جیسے غیر مقبول میدان میں تحقیق کا فیصلہ کیا ہے اس مقصد کی خاطر موسیقی کے استعمال کے بارے میں پہلے ہی تحقیق کی جا چکی ہے۔ انسٹی ٹیوٹ نے یوگا اور پیداواریت' اور غور فکر اور پیداواریت' کا مطالعہ کرنے کا بھی پروگرام بنایا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رمانی کہتے ہیں "ہم ایک فرد کا مطالعہ یہ مان کر کرتے ہیں کہ اگر وہ صحتمند ہے تو ہر چیز بھی صحیح اور صحت مند ہوگی جب کہ انسانی عنصر، پیداوار کی زنجیر کی سب سے کمزور کڑی ہے"۔

یوگا اور غور و فکر آئندہ برسوں کے موضوعات ہیں جب کہ پچھلے برس منعقدہ سیمینار میں ماہرین کی آرا جاننے کے بعد، پیداواریت بڑھانے میں موسیقی کے اثرات کے موضوع کا انتخاب کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں پروجیکٹ تشکیل دیئے جا رہے ہیں جو اس بات کا تعین کریں گے کہ کام کرنے کی جگہوں پر موسیقی کا استعمال کن طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر رمانی کہتے ہیں: "یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ موسیقی کے اثر سے گائے کے دودھ کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا اور کھیتوں میں فصل بہتر ہونے لگی۔ بمبئی اسپتال میں تھیراپی کے لیے بھی موسیقی کا استعمال محدود پیمانے پر کیا جاتا ہے"۔

امسال کا موضوع "مزاح اور پیداواریت" ہے۔ اپنے ساتھی پروفیسر وی ایس آر ڈی ورما سے پیداواریت میں اضافے کے لیے غیر روایتی طریقوں کے استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر رمانی نے سوال کیا "آخر مزاح کیوں نہیں؟" اور پروفیسر ورما نے اتفاق کیا کیونکہ ایک غیر معمولی تجربہ ہوگا۔ ... حالات میں تناؤ کو کم کرنے کی صلاحیت مزاح میں کس قدر ہے، یہ بھی جانتے ہیں۔

ڈاکٹر رمانی سمجھتے ہیں کہ پیداواریت بڑھانے کے لیے مزاح کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنے کی خاطر خواہ گنجائش

وہ کہتے ہیں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ مزاح اور انتظامیہ اور پیداواریت کے موضوعات پر "کیس اسٹڈیز" تیار کی جائیں
عادات و اطوار سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لیے ہمیں مختلف شعبوں کے اصولوں کو یکجا کرنا پڑے گا۔ غیر ضروری اور
مثالی اصولوں کو ترک کر دینے سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ زیادہ سے زیادہ نئے طریقۂ کار اور اصول
بنائے جائیں تاکہ ایک پیچیدہ سماجی اکائی کے طور پر مسائل پر قابو پایا جا سکے۔

مزاح کی صلاحیتیں دو دھاری تلوار کی طرح ہیں۔ ڈاکٹر رمانی کہتے ہیں کہ خاص طور سے مینجروں کے مسائل کے
تعلق سے مزاح کے اسلوب اور ان کے اثرات پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔ انتظامی امور اور انتظامیہ سے متعلق ریسرچ
کے لیے مزاح اور ظرافت میں کافی گنجائشیں ہیں خصوصاً آج کے دور میں کاروباری دنیا میں مزاح کا استعمال لازمی
ہے جہاں تھکن اور تناؤ کا سب سے بڑا علاج مزاح کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

مزاح اور پیداواریت کے میدان میں نسبتاً بہت کم تحقیق ہوئی ہے۔ ڈاکٹر رمانی کا خیال ہے کہ "لوگ
اس موضوع کو سنجیدگی سے برتنے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔"

غیر ممالک میں البتہ کچھ تحقیقی کام ہوا ہے۔ مینجر کا مزاح کو برتنا اور اس کے مثبت نتائج پر ہونے والی ایک
ایسی ہی تحقیق سے انکشاف ہوا کہ مزاح کے پُر اثر استعمال اور اعلیٰ درجے کے پیداواری نتائج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

۱۹۸۲ء کے آس پاس "فورچون" (FORTUNE) نے "بزنس میں مزاح کی قدر و قیمت اور اس کے اثرات"
کے موضوع پر ایک سروے کیا تھا جس میں چونسٹھ اعلیٰ عہدے داروں سے معلومات حاصل کی گئی تھیں۔ اس سروے
سے یہ پتہ چلا کہ جدید انتظامیہ میں مزاح کے رول سے متعلق اختلاف آرا اور الجھنیں موجود ہیں۔ اکیاون عہدیداروں
نے تسلیم کیا کہ مزاح ایک صحت مند شئے ہے اور انتظامی کاموں میں اہمیت رکھتا ہے لیکن چونسٹھ میں سے صرف ستائیس
کا خیال تھا بزنس میں فرد کی کامیابی اور مزاح کا باہمی رشتہ ہے۔

اگرچہ مزاح کی خوبیوں کو سراہتے ہوئے کچھ مضامین لکھے گئے ہیں لیکن تجرباتی ریسرچ کے سلسلے میں بہت کم کام ہوا ہے۔
مزاح کے فوائد اور استعمال سے متعلق غیر ممالک میں پچھلے چالیس برسوں میں کی گئی ریسرچ کا ذکر کرتے ہوئے
ڈاکٹر رمانی کہتے ہیں کہ ۱۹۵۹ء کے میڈلٹن اور مولینڈ گروہی تنازعہ پر ریسرچ سے پتہ چلا کہ مزاح نے گروہوں کے مابین
میل و ابلاغ کی واضح حد بندیاں قائم کر کے کام کرنے کے سماجی طریقوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ ایک اور محقق برما کا نظریہ
ہے کہ مزاح ایک ایسا حربہ ہے جو تنازعات میں استعمال کیا جا سکتا ہے اس لیے کہ غیض و غضب سے بھرپور اور
شعلے بیانات دینے کے مقابلے میں مزاح کی لطافت اور قبولیت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ ایک ریسرچ ایسی بھی ہوئی
ہے جس میں لطیفہ گوئی کو سماجی قبولیت حاصل کرنے کا حربہ اور مختلف گروہوں کے سماجی تعلقات کو مضبوط بنانے کا
کارگر طریقہ تسلیم کیا گیا ہے۔ تحقیق سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ کسی گروپ کے ایک ممبر نے مزاح کا حربہ استعمال کیا جو تناؤ
کم کرنے، حالات پر قابو پانے اور اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں واضح طور پر مددگار ثابت ہوا۔ ایک محقق مارنس اس
نتیجے پر پہنچا کہ وہ گروپ جس کے افراد اعلیٰ ظرافت کے مالک ہوتے ہیں وہ ان گروپوں سے زیادہ مستعد اور فعال ہوتے
ہیں جن میں اس قسم کے افراد نہیں پائے جاتے۔

اسمتھ، امکاف اور اشنگر نے ۱۹۷۱ء میں "غیر معمولی فرائض کی انجام دہی میں منصوبہ بند مزاح کے اثرات" پر تحقیق
کے بعد ثابت کیا کہ بہت زیادہ تناؤ کے شکار افراد نے جب
انہیں

سے بہت بہتر ہے جنھوں نے غیر مزاحیہ حربے استعمال کئے تھے۔

ڈاکٹر ربانی کے مطابق مندرجہ بالا ریسرچ کے نتائج اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ مزاح کو اپنانے سے بے اطمینانی کم ہوسکتی ہے جس کا اثر کارکردگی پر ہوگا۔ اسی وجہ سے پیداواریت بڑھانے کی خاطر کام کرنے کے سسٹم کی تشکیل کرتے وقت مزاح کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہوگا۔ مزاح نہ صرف کسی گروپ کے مسائل حل کرنے کی صلاحیتوں پر اپنا مثبت اثر دکھاتا ہے بلکہ گروپ میں شامل افراد کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔

حالیہ سمینار میں، جو ملک بھر اور دنیا بھر میں اپنی نوعیت کا واحد سمینار تھا، ڈاکٹر ربانی نے افلاطون اور ارسطو کے زمانے سے لے کر والٹیئر اور سوئفٹ سے ہوتے زمانہ جدید تک مزاح کے رول کو پیش کیا اور تجرباتی تحقیق کے دو زاویوں کا ذکر کیا۔ اول روزگار کی جگہ پر مزاح سے متعلق مسائل خصوصاً یکسانیت سے معمور فرائض کی انجام دہی اور دوم آج کی کاروباری دنیا میں پھیلے ہوئے تناؤ کے علاج کے طور پر مزاح کا استعمال ــــ تاکہ حقائق سے متعلق متوازن مطمح نظر پیدا ہو اور دور اندیشی کے ذریعے قوتِ فیصلہ کی تربیت ہوسکے۔

اس سلسلے میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ٹریننگ ان انڈسٹریل انجنیئرنگ (NITIE) "پیداواریت اور مزاح" کے موضوع پر اولین بین الاقوامی سمینار کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ ۵۷

بھیونڈی میں شامِ طنز و مزاح

بھیونڈی میں زندہ دلانِ بمبئی کے اشتراک سے طنز و مزاح کی ایک شام کا اہتمام بزمِ تکمیل رائٹرس گروپ نے
[کیا۔] اس خاص طنزیہ و مزاحیہ نشست کی صدارت بھیونڈی کے مشہور و معروف وکیل ادب نواز جناب یاسین مومن
[نے] کی اور بہ حیثیت مہمانِ خصوصی جناب ظفرالاسلام ظفر مدعو تھے اس مزاحیہ نشست کی اناؤنسنگ کے فرائض جناب
[اقبال] عثمان مومن نے اپنے مخصوص انداز میں انجام دیئے۔ تلاوتِ کلام پاک سے اس ادبی نشست کا آغاز ہوا۔
[اصغر] حسین قریشی (مدیر تکمیل) نے تعارفی تقریر کی ان کے بعد بھیونڈی کے اُبھرتے ہوئے نوجوان مزاح نگار
[جن]اب مختار برنی نے "جانا ہمارا عدالت میں" کے عنوان سے ایک طنزیہ مضمون سنایا۔ اقبال عثمان مومن نے "چلئے بھی
[جانے دیجئے]" کے عنوان سے اک مختصر افسانہ سنایا۔ بھیونڈی کے ہی ایک مشہور و معروف انشائیہ نگار جناب رفیع انصاری
[نے] ایک طنزیہ "قلم سے علم تک" پیش کیا۔ بھیونڈی کے ان ادیبوں کے مضامین کافی پسند کئے گئے۔

[بم]بئی سے آئے ہوئے مہمان اور زندہ دلانِ بمبئی کے عہدہ دار واراکین نے بھی اپنی مزاحیہ تخلیقات نذرِ سامعین
[کیں۔ س]ب سے پہلے مشہور شاعر جناب خواہ مخواہ نے ایک مضمون پیش کیا اور نثر میں بھی اپنے جوہر دکھائے ان کے مضمون کا
[عنو]ان تھا "اُڑنے سے پیشتر ہی میرا رنگ زرد تھا" ان کے اس جملہ پر کہ "اڑانیں ان دنوں وقت پہ نہیں اُڑ رہی ہیں۔
[اس] لیے آپ دو روز پہلے ہوائی اڈے پر پہنچ جائیں" یا یہ جملہ کہ "ہوائی جہاز میں ایک ایمرجنسی دروازہ ہوتا ہے جو کبھی
[کبھ]ی تو خود بخود کھل جاتا ہے یا پھر کبھی وہ کھلتا ہی نہیں ہے"۔ بہت داد ملی۔

نوجوان مزاح نگار اور زندہ دلانِ بمبئی کے سکریٹری جناب فیاض احمد فیضی نے بھی "پھلوں میں رنگ بھرے" کے عنوان
[سے] ایک پُر مزاح تخلیق پیش کی جو اپنے انفرادی اسلوب کی بناء پر کافی پسند کی گئی اور خوب سراہی گئی۔

آخر میں اردو کے نامور مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے "سواریاں" سنایا "شہر میں سواری اس چیز کو
[کہتے] ہیں جو آدمی کو نہ مل سکے"، "وکٹوریہ میں سفر کرنے سے فاصلہ نہیں گھٹتا صرف وقت کٹتا ہے" اسی طرح کے دوسرے
[جم]لوں پر ہنسی کے فوارے چھوٹتے رہے۔ ڈاکٹر ظفرالاسلام ظفر صاحب نے کہا ہے کہ "سنجیدہ تخلیق جتنی مشکل
[ہے] اس سے کہیں زیادہ طنز و مزاح لکھنا مشکل فن ہے" انھوں نے شہر کے مزاح نگاروں کو کچھ مفید مشورے بھی دیئے۔

[جنا]ب یاسین مومن صاحب نے صدارتی خطبہ میں کہا کہ جو مقام اردو ادب میں طنز و مزاح کو ملنا چاہیئے تھا وہ ابھی تک
[نہیں] ملا۔ آج ہمارے ادب میں دوسرا اکبر الہ آبادی پیدا نہیں ہوا۔

شکریہ کی رسم اصغر حسین قریشی (مدیر تکمیل) نے ادا کی۔

(مُرسلہ مظہر سلیم۔ کرلا بمبئی)

دے کے خط (مراسلے)

شگوفہ کا سالنامہ دیکھا۔ سیدہ جعفر بیگ احساس کا مضمون، نرینلہ لوتھر، مجتبیٰ حسین اور فیاض احمد فیضی بہت پسند آئے مطالعے کے دوران آپکی یاد آتی رہی اور نتیجہ میں ایک نظم ہوگئی ۔ گر قبول افتد زہے عزّ و شرف ۔ مجلسِ ادارت میں طالب خوندمیری کی شمولیت فالِ نیک ہے ۔ ——— محبوب مانجھوی (اِلیتو)

○

کیا خوب سالنامہ نکالا ہے آپ نے
اے واہ! کیا کھلایا شگوفہ ہے آپ نے
بچے کی طرح آپ نے کی اس کی پرورش
کس کس جتن سے اس کو سنبھالا ہے آپ نے
طنز و مزاح کا گلشنِ بے خار ہے جیسے
دے کر جگر کا خون نکھارا ہے آپ نے
اس دورِ پُر ملال میں کچھ دیر کو سہی
غمگیں دلوں کو خوب ہنسایا ہے آپ نے
تازہ مزاح کے پھولوں کو اک ساتھ گوندھ کر
گلدستہ حسین بنایا ہے آپ نے
دلی و لکھنؤ سے نہ جو ہو سکا وہ کام
ارضِ دکن سے کر کے دکھایا ہے آپ نے
طنز و مزاح کو ہند میں بخشا ہے اک مقام
طنز و مزاح کا رُتبہ بڑھایا ہے آپ نے
زندہ دلوں کے آپ ہیں سالارِ کارواں
زندہ دلی کا رنگ جمایا ہے آپ نے
پاک و عرب میں بانٹ کے خوشبو مزاح کی
رشتوں کو استوار بنایا ہے آپ نے

اعلیٰ نسب وسیدیِ مُصطفےٰ کمال!
واللہ! کیا کمال دِکھایا ہے آپ نے

اداریہ

○ بزرگ ادیب، ناول نگار، اور ماہنامہ "حریم" کے مُدیر جناب نسیم انہونوی کا ۴ مارچ کو انتقال ہوگیا۔ یوں تو ایک عرصہ سے ان کی صحت اچھی نہیں تھی، لیکن آخر وقت تک ادبی کاموں میں مصروف و منہمک رہے انھوں نے خود بے شمار ناولیں لکھیں اور برصغیر کے کئی ناول نگاروں کو اپنے ادارے کے ذریعہ روشناس کروایا۔ انھوں نے اپنی تحریروں اور "حریم" کے ذریعہ خواتین کی بیداری اور اصلاح کے کام خاص انداز میں انجام دیئے۔

○۔ ممتاز ادیب اور مزاح نگار عبدالقادر حبیب کا ۴ مارچ کو لندن میں انتقال ہوگیا۔ حبیب حیدرآبادی کی کتابیں "انگلستان میں" اور "برطانیہ کی سیاسی جماعتیں" اور انشائیوں کا مجموعہ "رہ و رسمِ آشنائی" شائع ہوچکی ہیں۔ گذشتہ شمارہ میں انکے فن پر ایک تفصیلی مضمون بھی "شگوفہ" میں شائع ہوچکا ہے ۔

○۔ لندن میں قیام کرنیوالے ایک اور حیدرآبادی ادیب شاعر اور دانشور وقار لطیف کا بھی جنوری میں انتقال ہوگیا۔ حبیب حیدرآبادی اور وقار لطیف نے لندن میں اردو کی شمع جلا رکھی تھی۔ اردو کے ان خدمت گزاروں کے انتقال پر ادارہ شگوفہ ملول ہے۔
دُعا ہے کہ خدا انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے
آمین!

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

حیدرآباد

جلد ۲۲
شمارہ ۴

اپریل ۱۹۸۹ء

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

تصویرِ سرِ ورق

ممتاز شاعر طالب خوندمیری "کرناٹک اُردو اکیڈمی کے زیرِ اہتمام گلبرگہ میں منعقدہ "شبِ قہقہہ" میں کلام سنا رہے ہیں۔ دائیں سے بائیں — ڈاکٹر شفیق صدر اکیڈمی، جناب ابراہیم خلیل اللہ، جناب یوسف ناظم اور جناب علی حفیظ (کنوینر)

★

فی پرچہ ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے
لائبریریوں سے ۶۰ روپے
عرب ممالک سے: ۱۲۰ روپے

کتابت: محمد عبدالرؤف

طباعت: ... آفسٹ پرنٹنگ پریس چھتہ بازار حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ: ... معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون رہائش: 521064 فون دفتر: 557716

کشمیری قوام

شگوفہ

نے اپنے ۳۰ سالہ دورِ اشاعت میں
طنز و مزاح کی ایک تاریخ بنائی ہے اور
کئی ضخیم نمبر پیش کئے ہیں۔
اب
ایک اور یادگار خصوصی اشاعت

"۳۰ سالہ انتخاب"

(ترتیب کے مراحل میں)

مہمان مدیر:
سید عبدالقدوس، ایڈوکیٹ

اِس تھیلی کے چٹے بٹے
(فہرست)

حرفِ سخنک

طرفہ تماشے (انشائیے)

شامِ قہقہہ، کولار

اُڑیں گے پرزے (خاکہ)

چمن (منظومات)

اپریل ۱۹۹۹ء
شگوفہ کے عام شمارہ کی قیمت ... ۵ روپے
سالانہ خریداری انفرادی ... ... ۵۰ روپے
وی پی کی صورت میں ... ... ۵۵ روپے
لائبریری کے لیے ... ... ۶۰ روپے

اپریل فول

اسمٰعیل آذر
(کٹک)

خوب صورت ایک مصرع نذر کردوں دوستو؟
ارشاد ہو!
اپریل فول!

ہائیں یہ کیا، شرٹ پر ہے آپ کے سگرٹ کا گُل
اپریل فول!
آج فرسٹ اپریل کا تہوار ہے، گھر گھر ہے غُل
اپریل فول!

بھئی مُبارک، کیوں نہ پھر کھائیں مٹھائی کم سے کم
رہنے دیجے، نقلی ہوگی ایک دم
نقلی، ہاہا! آج تو اُلٹا دِوَس ہے محترم
اپریل فول!

اُف غضب میڈم یہ جُوڑا آپ کے سر سے بڑا!!
جسم کی سوجن وہاں پہنچی ہے کیا؟
او شٹ اَپ ہم نے تو بھروائی ہے جوڑے میں ہوا
اپریل فول!

بے لگامی در گزر
آپ کی چندیا کے مسٹر جھڑ گئے کیا بال و پَر
جی نہیں بالوں کے اندر سے نکل آیا ہے سر
اپریل فول!

آج محبوبہ نے عرصہ بعد بھیجا ایک خط
چلیئے سارا غم غلط
دھت ترے کی اس میں ظالم نے تو لکھا ہے فقط
اپریل فول!

وہ لیے بھائی کا تھا خط، جس میں تھا یہ لکھا ہوا
تیری بہنا کر گئیں پرسوں قضا
اتنا سُن کر چل بسیں فوراً ہماری والدہ
پھٹ سے پھر اک تار آیا، درج تھا
اپریل فول!

کیا سفیدی آگئی بالوں میں بابو دھرگھسیٹ
جی نہیں اوپر سے کر ڈالی ابھی کوّے نے بیٹ
اپریل فول!

آپ کو بتلائیں آذر فول ڈے آخر ہے کیا؟
جی بتائیں، اصل کیا ہے واقعہ
کیا بتائیں جی، ہمیں خود ہی نہیں جب کچھ پتا
اپریل فول!

---

* یکم اپریل کو اپریل فول ڈے منایا جاتا ہے

رضا نقوی واہی

طرحی مشاعرے

آنہ پائی کے حساب کے زمانے میں شاہنامۂ فردوسی کے اشعار بھی گنے گئے اور دیوانِ میر کے نقطے بھی۔
پتہ لگانے والوں نے زبانِ اُردو کے شاعرِ اول کا بھی سراغ پا لیا۔ لیکن یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اب تک یہ
نہ معلوم ہو سکا کہ طرحی مشاعروں کا موجد کون تھا اور اس عجیب و غریب ایجاد کی داغ بیل کس سن، کس تاریخ
اور کس ساعت میں پڑی۔ آج جب کہ کمپیوٹر کی سہولت میسّر ہے، بہت ممکن ہے کوئی محقق اپنے سمندِ جستجو کی باگ
اس اچھوتے میدان کی طرف بھی موڑ دے۔ تحقیقی مقالے لکھنے والوں سے زیادہ لکھوانے والوں کی بے تحاشہ دوڑ
کے زمانے میں یہ امر بعید از قیاس بھی نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو صنفِ تحقیق کسی حد تک اس الزام سے بری ہو جائے
گی جو ماضیِ قریب میں اردو تنقید پر لگایا گیا تھا کہ اس کا وجود معشوق کی موہوم کمر ہے یا اُقلیدس کا فرضی
نقطہ؟ اس تحقیق سے ایک ماہرِ نفسیات کو طرحی مشاعروں کے موجد کی دماغی ساخت پر روشنی ڈالنے میں مدد
ملے گی۔

بہر کیف ان طرحی مشاعروں سے اِتنا فائدہ تو ضرور ہوا کہ لُغت مرتب کرنے والوں کی آمدنی میں اضافے
کی صورت نکل آئی۔ غزل کی قبائے تنگ کے لیے ہر قسم کے قافیے اور کہاں ملتے؟ دوسرے یہ کہ شعراء میں جذبۂ
تقابل و تسابق کی وجہ سے مشاعروں میں گہما گہمی، سامعین کی دل چسپی کا باعث بنی۔ شعراء کے ساتھ سامعین بھی
مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کبھی ایطائے جلی اور ایطائے خفی کی بحثیں ہیں تو کبھی شترگربہ پر گرفت، کبھی کسی
لفظ کے گرنے پر اعتراض تو کبھی تقطیع کی گردان، یہ سب مناظر جنھیں عرفِ عام میں شاعرانہ چشمک کہتے ہیں اور کہاں
دیکھنے کو ملتے۔ یہ اور بات ہے کہ بعض اوقات یہ شاعرانہ چشمک میدانِ کارزار کا نمونہ پیش کرتی۔ کبھی مصرعے لڑ جاتے
کبھی اشعار لڑ جاتے تھے اور کبھی یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ غزلیں بھی لڑ جاتی ہیں۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ آپس میں شعراء الجھ جاتے۔ جب
ایوانِ قانون ساز میں معمولی سی لغزش بھی ہنگامے کا سبب بنتی ہے۔ تو پھر طرحی مشاعروں کو مطعون کرنے کا کیا جواز؟
ایک صحت مند جمہوری نظام میں حزبِ مخالف کا ہونا لازمی قرار دیا گیا ہے۔

شاعروں اور غزلوں کے لڑ جانے کے ذکر میں دو مشاعروں کا حال بھی سُن لیجئے۔ اُن دونوں مشاعروں کا تعلق
ہمارے شہر عظیم آباد سے ہے۔ ایک طرحی مشاعرہ تھا۔ ایک صاحب نے غزل شروع کرنے سے پہلے یہ دعویٰ کیا۔
اگر کوئی صاحب ایسا مطلع کہنے کی جرأت کریں تو انھیں سیر بھر خون تھوکنا پڑے۔

مشورہ دینے والا بھی کوئی موجود نہیں۔ اس لیے میدان صاف پاکر طرحی مشاعروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک مشاعرے میں مجھے بھی دعوت دے کر لے جایا گیا۔ میں نے طرحی غزل تو نہیں کہی لیکن طرح کی زمین میں کچھ اشعار سنائے۔ چند پیش ہیں ؎

دوستو آج اہلِ ادب کا مزا پاؤ گے ؛ شعر کی ریس میں شاعر کو کھڑا پاؤ گے
ہیں گدایانِ سخن داد کے طالب یاد رہو ؛ بزم میں بُت بنے بیٹھو گے تو کیا پاؤ گے
داد و توصیف تو ہے بھیک سخنور کے لیے ؛ اس کرم کے لیے محشر میں جزا پاؤ گے

ہو اجازت تو میں اربابِ سخن سے پوچھوں ؛ گھوٹ کے رٹے کو کہو کیسے بنا پاؤ گے
بحر و اوزان کے گرداب میں پھنس کر یارو ؛ خاک تم رمزِ تغزل کا پتا پاؤ گے
تم نے سوچا ہے کبھی طرحی نشستوں کے لیے ؛ بے تکی قافیہ پیمائی سے کیا پاؤ گے

میرے اشعار بھی صدا بہ صحرا ثابت ہوئے اور اگلے ہفتے ایک دوسرا مشاعرہ شادؔ عظیم آبادی کی زمین میں منعقد ہوا جس میں مدعو کرنے کے لیے خود مہتمم مشاعرہ تشریف لائے اور مجھے بادلِ ناخواستہ جانا پڑا۔ اس مشاعرہ میں جو کلام میں نے پڑھا وہ بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔

جو دل نے حضرتِ کوثر کو اشتعال دیا ؛ اُنھوں نے طرح کا مصرع کوئی اُچھال دیا
خوشی سے کھل گئیں باچھیں غزل نویسوں کی ؛ کسی نے جیسے اُنھیں مژدۂ وصال دیا
سخن نوردی کا موقع جو دستیاب ہوا ؛ تو لا دو ذہن میں جتنا تھا سب نکال دیا
لغت کو چھان پھٹک کر قوافی جمع کیے ؛ کسی نے میرؔ کے دیوان کو کھنگال دیا
یہ مال ہاتھ لگا جس کو جس قدر اُس نے ؛ ہر ایک قافیہ پر ایک شعر ڈھال دیا
بلا کے طرحی نشستوں میں دوستوں نے مجھے ؛ ہر ایک بار بڑی اُلجھنوں میں ڈال دیا
رفوگری کا یہ دھندا مجھے نہ راس آیا ؛ کبھی قبول کی، دعوت کو گاہ ٹال دیا
مگر خلوصِ محبّاں نے اِس نشست میں آج ؛ مرے دماغ میں کانٹا جو تھا نکال دیا
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم ؛ سروشِ فکر نے یہ تحفۂ خیال دیا
"ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو"! ؛ اِسی خیال نے میرا قدم سنبھال دیا
تھا کے محرمِ شہیدوں میں ہو گیا شامل ؛ کنویں میں طرح کے میں نے بھی مغز ڈال دیا
گلہ کرے گی جنابِ ارضِ شادؔ واہی سے ؛ "غریبِ جان کے تونے مجھی کو ٹال دیا"

اِن اشعار نے بھڑ کے چھتّے کو چھیڑ دیا۔ پھر کیا تھا ہمارے شہر کی ہر انجمن طرحی مشاعرے کرنے لگی۔ یہاں تک کہ وہ ادارے جو صرف نعتیہ مشاعرے کرکے شعراء کی عاقبت سنوارا کرتے تھے، اب وہاں بھی خالص طرحی مشاعرے شروع کر دیے گئے۔

ایک ایسے ہی مشاعرے میں جس میں قدیم و جدید شعراء کی مجموعی تعداد تقریباً سو تھی، جو دس بجے دن کے شروع ہوا تو سات بجے شام تک مسلسل چلتا رہا، میں نے جو اشعار سنائے وہ بالکل بے معنی تھے۔ آپ بھی ان اشعار سے لطف اندوز ہوں ؎

غبارِ تجرید میں آشفتہ سری کا لکھا ؛ یوں ہے جیسے بشر کا لجری کا لکھا
وہ ادب ہو کہ سیاست کا بیابانِ وجود ؛ زنگِ آئینہ بنا ہے بصری کا لکھا
جو ہوئی دَور میں ابلاغ سے ترسیل کا بُعد ؛ نقش بر آبِ سخن ہے ہنری کا لکھا
مرکزِ عقل سے تا نقطۂ پرکارِ جنوں ؛ رُخِ مشہود پہ شاہد لفظری کا لکھا
تو ہنرِ نو تُندیِ تہیہ جام سے اُبھرے جس دم ؛ عصرِ نو پر ہو عیاں راہبری کا لکھا
ایک آتش کدۂ فکر ہے سرابِ خیال ؛ اک معمہ ہے زوالِ بشری کا لکھا
خرد آشوبِ تمنا ہے نمودِ ہستی ؛ نقشِ تقدیر بنا ہے اثری کا لکھا
میرے اشعار میں سرچشمۂ تفہیم جدید ؛ آپ سمجھیں نہ اسے بے خبری کا لکھا

ان اشعار پر داد و تحسین کے نعرے بلند ہوتے رہے، اور میرا حال یہ تھا کہ ؎

نالۂ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

بعض لوگ کہتے ہیں کہ طرحی مصرعوں پہ غزلیں کہنا بانس پر چڑھنے اُترنے کی کرتب بازی ہے، یا زیادہ سے زیادہ پیمائشِ طولِ قد و گیسو کا مشغلہ۔ میں پوچھتا ہوں کہ جب کوہ پیمائی اور اولمپک میں مختلف کرتب کی نمائش کے لیے انعامات دیے جاتے ہیں تو وہ شعراء جو طرحی مشاعروں میں قافیہ پیمائی کرتے ہیں، اُنھیں کیوں اس اعزاز سے محروم کیا جائے۔ کم از کم داد تو ملنی ہی چاہیے۔ یہ اور بات ہے کہ خود مجھے یہ دھندا راس نہ آیا۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ اب بھی دھڑلے سے طرحی مشاعرے ہوتے ہیں جن میں مجھے مدعو کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ شہر کی سب سے فعال ادبی انجمن کا سرپرست بھی بالاتفاق مقرر کیا جاچکا ہوں۔ پتہ نہیں یہ اربابِ انجمن کی مخلصانہ ستم ظریفی ہے یا کسی ناکردہ گناہ کی سزا، کہ اس انجمن کے مشاعرے اب خود میری قیام گاہ پر منعقد کرائے جاتے ہیں۔ ▲▼

غزل

ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

دیارِ غیر میں بھی سوزِ چشمِ نم رہا باقی غمِ دوراں کے پہلو میں غمِ بیگم رہا باقی
یہ رونا ہے کہ میں روتا نہیں کیوں ساس کے غم میں مرے گھر میں مسرت کا عجب ماتم رہا باقی
نہ گرمانے بگاڑا کچھ، نہ سرمانے، نہ بارش نے "ہنی مون" اپنا جاری تھا بہر موسم رہا باقی
اِدھر اتّی ہوئیں داخل "اُدھر ابّا ہوئے غائب یہی حالت رہی گھر کی یہی عالم رہا باقی
نواسہ تھا، کہ پوتا تھا، نواسی تھی، کہ پوتی تھی بہر صورت سکوت تک گریۂ پیہم رہا باقی
ضمانت ضبط آخر ہوگئی سب کی الکشن میں نہ یہ پرچم رہا باقی، نہ وہ پرچم رہا باقی
کٹورے میں بلا کرتی ہے گڑ کی چائے روزانہ ہمارے حق میں قدرت سے یہ جامِ جم رہا باقی
علاجِ زخم تو نرسوں کی قربت ہی نے کر ڈالا دواخانے میں جو مرہم تھا، وہ مرہم رہا باقی
خدایا! ناک رکھ محفوظ میری، رشتہ داروں میں کہ اِن سے ناک میں آکر بھی میرا دم رہا باقی
خسر کا وار، خوشدامن کا حملہ کر دیا پسپا ہر اِک دستِ شکستہ میں عجب دم خم رہا باقی
نواسوں کی خوشی سے ہے زیادہ یہ خوشی مجھ کو کہ قرضِ مہرِ دخترِ تجھے بین میں کم رہا باقی
ادائے بنتِ حوّا ہے، خطائے ابنِ آدم ہے زمیں پر بھی گناہِ حضرتِ آدم رہا باقی

بہت نکلے ترے ارمان راہی پھر بھی کم نکلے
کہ تیرے دِل میں رنجِ زوجۂ سوم رہا باقی

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

تیل اپنی جگہ، دھار اپنی جگہ اور تیلی کا کردار اپنی جگہ
ڈاک اپنی جگہ، تار اپنی جگہ آنکھوں آنکھوں میں تکرار اپنی جگہ
شاعری ہم سے بیزار اپنی جگہ شعر کہنے کی بیگار اپنی جگہ
رہنماؤں کا دیدار اپنی جگہ اور الکشن کے آثار اپنی جگہ
خدمتِ خلق مدِ نظر ہے مگر جعلی ووٹوں کے انبار اپنی جگہ
داد ان کو ملے، مال ان کو ملے ان کے دو چار اشعار اپنی جگہ
ڈاکٹر اپنی نرسوں میں حیران ہیں اور پریشان بیمار اپنی جگہ

ہاشمی پاؤں اپنے سلامت رہیں
ان کی آرام دہ کار اپنی جگہ

ڈاکٹر جاوید وششٹ (نئی دہلی)

ہاتھا پائی

ہاتھا پائی کا تعلق براہِ راست ہاتھ اور پاؤں سے ہے۔ دوسرے لفظوں میں بغیر ہاتھ پاؤں کے ہاتھا پائی نہیں ہو سکتی۔ اور پھر ہاتھا پائی کے لیے کم از کم دو شخص درکار ہیں۔ اگر کوئی اکیلا ہی ہاتھا پائی کرتا ہو یعنی ہوا میں مکّے اُچھال رہا ہو، خلاء میں لاتیں مار رہا ہو تو سمجھنا کہ اس کے دماغ کا کوئی پیچ ڈھیلا ہے۔ اُسے فوراً دماغی اسپتال میں بھرتی کرا دینا چاہیے۔

ہاتھا پائی میں بیک وقت دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر آپ دونوں پاؤں سے ایک ساتھ لکد زنی نہیں کر سکتے۔ پھر تو آپ میدان میں کھڑے بھی نہ رہ سکیں گے۔ دولتیاں جھاڑنے کا شرف صرف گدھے کو حاصل ہے۔ مگر گدھے "ہاتھا" سے محروم ہیں صرف "پائی" کرتے ہیں اور وہ بھی خرمستی کے عالم میں۔

ہاتھا پائی جب ارتقاء پذیر ہوتی ہے تو پہلی منزل پر "دھول دھپّا" کا روپ دھار لیتی ہے۔ پھر تو تیزی سے "دھکّا مکّی" اور "لپاڈگی" کی منزلیں طے کرتی ہوئی "سر پھٹول" کے مرحلے تک پہنچ جاتی ہے۔ اس طرح وہ ترقی کرتی ہوئی "آتنک واد" کی منزل تک پہنچنے کی قدرت رکھتی ہے۔

ہاتھا پائی کے لیے تھوڑی سی اشتعال انگیزی ضروری ہے۔ اگر آپ پُرسکون ہیں تو آپ ہاتھا پائی کے اہل نہیں۔ ہاتھا پائی اور کیو (Q) میں چولی دامن کا ساتھ ہے کیوں کہ کیو میں ہی "پہلے میں، پہلے میں" کے ورد سے "آپا دھاپی" کا جنم ہوتا ہے اور آپا دھاپی سے ہاتھا پائی پیدا ہوتی ہے۔ اس کی زد میں آ کر کیو ٹوٹتی رہتی ہے۔ جہاں بھی کیو ہو گی وہاں ہاتھا پائی بھی ہو گی۔ وہ چاہے راشن کی دوکان پر ہو، ٹکٹ گھر کی لائن ہو کہ پانی کے نل کی قطار۔ نل پر پانی کے برتن کیو میں ہوتے رہتے ہیں مگر مٹی کا گھڑا لائن میں ایک بھی نظر نہیں آئے گا۔ کیوں کہ ہاتھا پائی گھڑے کے لیے جان لیوا ثابت ہوتی ہے، اس لیے پیتل تانبے اور اسٹیل کے برتن، بہت ہوا تو پلاسٹک کی بالٹیاں اور کنستر جو خالی ہونے پر اپنی موجودگی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ بڑے کی بات یہ ہے کہ عورتیں گالی گفتار کے بعد صرف "ہاتھا" پر رک جاتی ہیں، "پائی" کبھی نہیں کرپاتیں۔ اس لیے ان میں ہاتھا پائی کے بجائے ہاتھا مالی ہی ہوتی ہے۔

طرفہ تماشا ہے کہ ہاتھ اور پاؤں دونوں مذکر ہیں مگر ان کا عمل (ہاتھا پائی) مونث کیسے ہو گیا؟ یہ تو ایسی بات ہوئی کہ دو مرد مل کر ایک عورت بن سکتے ہیں۔ حالانکہ ماہرین نفسیات نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ نہ کوئی مرد خالص مرد

ہوتا ہے اور نہ عورت خالص عورت۔ مرد صرف ساٹھ فی صد مرد اور چالیس فی صد عورت ہوتا ہے اسی طرح عورت صرف ساٹھ فی صد عورت اور چالیس فی صد مرد ہوتی ہے۔ ہم عورت مرد سے کیا ہاتھا پائی کریں۔ بس یہ طے ہے کہ ہاتھا پائی کو صنفِ نازک ہونے کا شرف حاصل ہے۔

جنسیات میں ہاتھا پائی ذریعۂ تلذذ ہوتی ہے۔ پھولوں کی سیج پر سیج سُنگھنے سے ہاتھا پائی، دست درازی کر کے ہی سیج سنگرام کی تیاری کی جاتی ہے۔ ناخن اور دانت کا استعمال بھی جائز ہے کیوں کہ یہ دونوں حیوانیت کی علامت ہیں اور ظاہر ہے کہ سیج سنگرام حیوانیت کی سطح پر ہی لڑا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واتسایان نے کاما سوتر میں ناخن اور دانت کے صحیح استعمال کی ترکیبیں بتائی ہیں۔ ثقہ لوگ ایسے موضوعات کا مطالعہ مزے لے لے کر کرتے ہیں مگر لاحول بھی پڑھتے جاتے ہیں۔

ایک بار ایک انشائیہ نگار کا اپنے ہی انشائیے سے ہاتھا پائی ہو گئی۔ ہوا یوں کہ وہ دونوں ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلے جا رہے تھے، مگر وہ جیسے ہی چوراہا "دھینگا مستی" پر پہنچے، انشائیے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ انشائیہ نگار پر تابڑ توڑ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں سے حملہ کر دیا۔ انھیں لڑتا دیکھ کر وہاں بھیڑ جمع ہو گئی۔ مزا یہ ہوا کہ بھیڑ میں سے کسی نے انشائیے کو چانٹا مارا تو کسی نے انشائیہ نگار کو لات رسید کی۔ یہ معلوم کیے بغیر کہ آخر وہ کیوں باہم دست و گریباں ہیں۔ ایسے لوگ بھی بڑے دل چسپ ہوتے ہیں۔ نفسیاتی طور پر یہ بڑے دبو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتے رہتے ہیں مگر کمزور ہونے کے سبب اس کا اظہار نہیں کر پاتے۔ یہ ایسے ہی موقع کی تلاش میں ہوتے ہیں اور جہاں کہیں بھیڑ میں کوئی آدمی پٹتا ہوا ملتا ہے تو عزم وہ ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ اس طرح ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ غرض انھوں نے انشائیہ اور انشائیہ نگار دونوں کی خاصی تواضع کر دی۔ بھیڑ کو دیکھ کر ایک صحافی بھی اُدھر آ نکلا۔ اس نے حملہ آوروں کو روکا اور پوچھا کہ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ مگر انھیں کچھ پتا ہو تو بتائیں۔ وہ تو اپنے ہی رس میں تھے۔ آخر اس نے بیچ بچاؤ کیا۔ بیچارے انشائیہ نگار کا تو کچومر ہی نکل گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ بہت مسرور تھا۔ اپنے بدن کو مسکرا کر سہلاتا بھی جا رہا تھا۔ لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ صحافی نے انھیں ایک ریسٹوران میں لے جا کر بٹھایا اور ان کا انٹرویو لینے سے پہلے کافی کا آرڈر دے دیا۔

جب ذرا ان کے حواس ٹھکانے آئے تو صحافی نے ان کا اتا پتا پوچھا۔ انشائیہ تو خاموش رہا۔ چپ چاپ کافی کی چسکی لیتا رہا مگر انشائیہ نگار نے اپنا پیچھے دیا کہ میں فلاں ابن فلاں اردو کا ادیب و انشائیہ نگار ہوں۔ اور یہ میرا تخلیق کردہ انشائیہ مسٹر ہاتھا پائی ہے۔ صحافی رسمًا ان سے مل کر بہت خوش ہوا، ہاتھ ملایا۔ مگر اس نے احتیاطًا اپنی کرسی ہاتھا پائی سے کچھ فاصلے پر سرکالی۔ اس نے سوچا کہ جب اس نے اپنے خالق کو نہیں بخشا تو میں کس کھیت کی مولی ہوں۔ اس نے بھی یہ کہہ کر اپنا تعارف کرایا کہ میں روزنامہ "ہاتھا پائی" کا نامہ نگار ہوں۔

صحافی نے انشائیہ نگار سے پہلا سوال کیا کہ آپ پٹنے کے باوجود مسرور نظر آتے، اس کا سبب؟ انشائیہ نگار نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ مسرت کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میری تخلیق نے اپنی توانائی کا بھرپور مظاہرہ کیا، ثبوت دیا اور خوب دیا۔ میں خوش ہوں کہ وہ مجسم ہاتھا پائی ہے۔ میں اب اپنے انشائیے کی داد و تحسین کے لیے کسی نقاد کا مرہونِ منت نہیں ہو سکتا۔ اب آپ ہی بتلائیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی ہے کسی تخلیق کار کو۔ کیا کسی انشائیہ نگار کو خواہ وہ فرانس کے مونٹین ہوں کہ انگلستان کے بیکن یا اردو انشائیے کے باوا آدم وزیر آغا، اپنی داد کسی انشائیے سے

لی ہے آج تک! اتنا کہہ کر انشائیہ نگار انشائیہ ہاتھاپائی کا ہاتھ پکڑ کر بال روم ڈانس کرنے لگا۔
جب وہ رقص سے فارغ ہوئے تو صحافی نے مسٹر ہاتھاپائی سے کہا کہ آخر آپ کو یہ کیا سوجھی کہ اپنے ہی خالق پر ہاتھ صاف کر دیا! انشائیے نے بڑی [illegible] کے ساتھ کہا کہ یہ سب غیر ارادی اور لاشعوری طور پر ہوا۔ ہم جیسے ہی بڑا دھینگا مشتی پر پہنچے، میرے ہاتھ کھجلانے لگے اور میرے پاؤں میں کرنٹ سا دوڑ گیا۔ اور میں ایک مدہوشی کے عالم میں انشائیہ نگار پر پل پڑا۔ یہ سن کر صحافی تو ہکا بکا ہو کر رہ گیا مگر انشائیہ نگار نے سر انتخار بلند کیا اور سبحان اللہ! واہ وا! کہہ کر انشائیے کو گلے لگا لیا۔ صحافی نے آپ نے اپنے انشائیے کا نام ہاتھاپائی کیوں رکھا؟
انشائیہ نگار ــــ آپ کے اخبار "ہاتھا چھانٹی" میں ایسی خبریں پڑھتے پڑھتے جب زبان پک گئی کہ آج پارلیمنٹ میں سرکار اور وپکش میں ہاتھاپائی ہو گئی۔ آج فلاں جلسے میں سامعین و مقررین دست و گریباں ہو گئے۔ آج فلاں عبادت گاہ میں نمازیوں اور [illegible] میں دست درازی ہو گئی۔ آج فلاں مندر میں بھگتوں اور پجاری میں جوتم پیزار ــــ سیاسی [illegible] پر جوتا چل گیا۔ وغیرہ وغیرہ تو میں نے بھی سوچا کر ہونے دو انشائیے کے ساتھ ہاتھاپائی۔ مگر آپ نے اپنے اخبار کا نام "ہاتھا چھانٹی" کیسے رکھ لیا؟
صحافی :۔ یہ تو آپ ہی کیا بھی جانتے ہیں کہ آج کا دور بدعنوانی، دغابازی، چھین جھپٹی اور بھرشٹاچار کا دور ہے۔ تو اپنے سماج کو آئینہ دکھانے کے لیے ہی ہم نے اخبار کا نام "ہاتھا چھانٹی" رکھا۔ اخبار کے ایک سیٹھ ہاتھی رام ہاتھ کی صفائی میں بڑے ماہر ہیں۔ سرکار کو کئی بار مشورہ دے چکے ہیں کہ کالے دھن کو نمبر ایک کر دیجیے دیش کی ECONOMY نہایت مضبوط ہو جائے گی۔ جب تک کالا دھن دو نمبر پر رہے گا، ملک میں متوازی معاشیات چلتی رہے گی، اسی سے سارے جھنجھٹ ہیں۔
(انشائیہ سے) اچھا! مسٹر ہاتھاپائی! آپ نے جب اپنے خالق کو بھی نہیں بخشا تو کیا اپنے قاری سے بھی ایسا ہی سلوک کریں گے؟
انشائیہ :۔ اگر قاری مجھے کوروکشیتر دھرم کشیتر میں لے جا کر پڑھے گا تو مجھے بھی مہابھارت کے لیے تیار ہی سمجھیے۔ مگر میں ہاتھاپائی سے آگے نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ میری مجبوری ہے۔ البتہ ہاتھاپائی میں قاری کی بھی طبیعت ضرور صاف کر دوں گا۔ اتنا مجھے اپنے اوپر بھروسہ ہے۔
صحافی :۔ (انشائیہ نگار سے) آئندہ آپ اپنے کسی انشائیے کا اتنا خطرناک عنوان نہ رکھیے۔ اور اگر کوئی مجبوری ہو تو اسے اتنا توانا نہ ہونے دیجیے کہ وہ سماج میں ایک نئی سمسیا کھڑی کر دے۔ وہ آپ ہی کے لیے نہیں قارئین کے لیے بھی DANGEROUS ہو گا۔
انشائیہ :۔ میں ہی ایک ترکیب بتائے دیتا ہوں جیسے کوئی قلم "صرف بالغوں کے لیے" مخصوص کر دی جاتی ہے اسی طرح انشائیہ نگار ایسے خطرناک انشائیے کے عنوان کے ساتھ تین بار۔ خطرہ، خطرہ، خطرہ ضرور لکھ دے۔ اس سے یہ فائدہ ہو گا کہ اگر انشائیہ میری ہی طرح توانا ہوا اور کہیں واقعی خطرہ پیدا کر دیا تو انشائیہ نگار قانونی گرفت سے محفوظ رہے گا۔
صحافی دونوں کا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔ دوسرے دن روزنامہ "ہاتھا چھانٹی" میں سرخی تھی۔ بھرا ہا دھینگا مشتی پر ایک انشائیہ اور انشائیہ نگار میں ہاتھاپائی۔

مخلص قادری، بالاپور (اکولہ)

"اچھے نہیں لگتے"

الٹ نیک آپ دو ہو کر تو بڑے اچھے نہیں لگتے — بنا پالش پہ ان کے ٹھیکرے اچھے نہیں لگتے
بڑے حضرت! خدارا اب تو آنکھیں سینکنا چھوڑو — میاں! اس عمر میں یہ چونچلے اچھے نہیں لگتے
میری بیوی کو اچھے لگتے ہیں میکے کے کتے بھی — مرے بھائی، بھتیجے، بھانجے اچھے نہیں لگتے
جُدا ہوتا ہے اندازِ نظر، ہر ایک کا اپنا — تمہیں جو اچھے لگتے ہیں مجھے اچھے نہیں لگتے
جوانی میں تو میٹھی میٹھی باتیں اچھی لگتی ہیں — کسی کے کرشمے، تیکھے شوربے اچھے نہیں لگتے
نمازیں پڑھتے ہیں رمضان سے لیکن جی چراتے ہیں — کریلے تو کھاتے ہیں اور گھلے اچھے نہیں لگتے
اچانک پیار برسانے لگی ہو اِن دنوں ہم پہ — ہمیں بیگم ارادے آپ کے اچھے نہیں لگتے
نہیں تیرے لبوں میں اِن دنوں پہلی سی شیرینی — کہ تیری گالیوں کے ذائقے اچھے نہیں لگتے
سویرے نسبتاً جو لوگ اچھے خاصے لگتے ہیں — نجانے کیوں وہی سب دن ڈھلے اچھے نہیں لگتے
مزاج ہے اپنا اپنا یہ طبیعت اپنی اپنی ہے — مجھے گُل، اُن کو غنچے ادھ کھلے اچھے نہیں لگتے
مزے لے لے کے کھا لیتے ہیں ہم تو روکھی سوکھی بھی — پراٹھے آپ کو گھی میں تلے اچھے نہیں لگتے
پلیڈر ہو کہ لیڈر یا تونگر ہو کہ مفلس ہو — جوانی میں حسین چہرے کسے اچھے نہیں لگتے

وہ چاہے میر و غالب ہوں، مگر اسٹیج پر مخلص
گلے ان کے اگر ہوں بے سُرے اچھے نہیں لگتے

○

مُنہ پھٹ ناگپوری

صاف صاف

بس پٹاخہ کو بُلانا چاہیئے — گھر میں دیوالی منانا چاہیئے
سوچتا رہتا ہوں اوندھے لیٹ کر — قوم کو کیسے جگانا چاہیئے
سالی سالے آ رہے ہیں اپنے گھر — ساگ بیگن کا پکانا چاہیئے
ہم سے دیوانوں کو صحرا بھی چمن — عقل کو موسم سہانا چاہیئے
لکھ پتی بن کر ہنسے تو کیا ہنسے — خالی جیبی مسکرانا چاہیئے
بجلی والوں کا بھروسہ چھوڑ دو — گھر میں قندیلیں جلانا چاہیئے
بوڑھے بہروں کو سناؤ بھیرویں — فلم اندھوں کو دکھانا چاہیئے
بے ضمیری نام و شہرت کے لیے — اپنی غیرت بیچ کھانا چاہیئے

رؤف خیر (حیدرآباد)

وکیل مرحوم کا تعزیتی جلسہ

[اس مضمون کے آئینے میں اگر کسی وکیل کو اپنا چہرہ نظر آئے تو اس میں مضمون کا کوئی قصور نہیں]

خواتین و حضرات!

آج ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ وکیل صاحب مرحوم کی "متوقع" موت پر اُن کا سوگ منائیں۔ ویسے حضرات میں معذرت خواہ ہوں کہ یہ جلسہ قدرے تاخیر سے منعقد ہو رہا ہے مگر جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں مرحوم خود تاخیر کے بڑے قائل تھے اکثر عدالتوں میں مرحوم اس قدر تاخیر سے پہنچتے کہ بیشتر مقدمات میں ان کے خلاف یک طرفہ (EXPARTE) فیصلے صادر ہو جاتے جس کا مرحوم کو کم اور ان کے موکلین کو زیادہ ملال ہوتا۔

مرحوم کے دل پر جب پہلا حملہ ہوا تھا تو انھوں نے اس کے خلاف عارضی حکم التواء (INTERIM STAY) لے لیا۔ اور چونکہ مقدمات میں وکیل صاحب تاخیری رویہ (DRAGGING) اپنانے کے عادی تھے اسی لیے اس میں بھی انھوں نے وہی رویہ برقرار رکھا اور بہت کوشش کی کہ حکم التواء جو حاصل ہوا تھا اسے مستقل ABSOLUTE کروالیں مگر عادلِ حقیقی نے ان کا مقدمہ خارج کر ہی دیا اور اس طرح جو INTERIM STAY ان کے اوپر عطا ہوا تھا وہ (VACATE) ہو گیا اور پھر عادلِ حقیقی کی عدالت میں ایک بار جو فیصلہ ہو جاتا ہے اس پر کہیں بھی اپیل دائر نہیں کی جا سکتی۔ وہ تو بس ایک ہی موقع اپنے اجلاس سے عطا کرتا ہے اسی موقع کو غنیمت جان کر [illegible] قوی کیا جا سکتا ہو کر لینا پڑتا ہے اور اگر اپنا مقدمہ ہی کمزور ہو تو لفاظی، بحث اور چرب زبانی وہاں کچھ مدد نہیں دیں گی۔

تو حاضرین میں تاخیر کا سبب عرض کر رہا تھا جس کی وجہ سے اس جلسے کی [illegible] میں مزید تاخیر ہو رہی ہے۔ محض اک جملۂ معترضہ نے ذرا سی طوالت اختیار کر لی میں ایک بار پھر معذرت خواہ ہوں۔

مرحوم کا مجھ پر بڑا احسان ہے اب آپ سے کیا چھپانا میں ایک چور رہا ہوں۔ [illegible] وکیل صاحب [illegible] کر جوارِ رحمت میں جگہ دے انھوں نے مجھے کبھی جیل جانے نہیں دیا۔ وہ مجھے ہر بار بچاتے رہے۔ بالآخر [illegible] نے خود یہ شریف پیشہ ترک کر دیا۔ [illegible] یہ پیشہ اگر شریف [illegible] کے ارباب مجاز اور ارباب سیاست کیوں اپناتے۔ میرا [illegible] ہے کہ مرحوم وکیل صاحب کا ایک [illegible] کی [illegible] [illegible] مرحوم کو [illegible] مرحوم ان دنوں [illegible] تھے۔

اس طرح انھوں نے مجھے اپنا منشی بنالیا ویسے بھی میں چونکہ چوری کے کئی مقدمات میں پولیس کی جانب سے ملوث کیا گیا تھا حالانکہ میں اُن کا معمول برابر ادا کرتا رہا ہوں لیکن کبھی کبھی پولیس والے اپنا کوٹہ مکمل کرنے کے چکر میں ہم جیسے دیانت دار چوروں کو بھی چکر میں ڈال دیتے ہیں۔ تو ان مقدمات کی وجہ سے تو وکیل صاحب مرحوم سے ہر ہفتہ تین چار دن تو ملنا ہی پڑتا تھا اب باقی کے چار تین دن گزار لینے میں حرج ہی کیا تھا۔ میں نے خود تو چوری چھوڑ دی تھی لیکن اپنے دیگر چور بھائیوں سے اپنا کمیشن لے لیا کرتا تھا۔ اور میں نے ان کو بھی مرحوم وکیل صاحب کے مؤکلین میں شامل کر دیا تھا تاکہ وقت ضرورت کام آوے۔ اللہ مرحوم کو جنت نصیب کرے مرحوم چوروں کے بڑے ہمدرد واقع ہوئے تھے۔ قسم خدا کی انھوں نے ہم سے کبھی اپنی فیس نہیں مانگی مگر ہم لوگوں نے بھی کبھی وکیل صاحب کا احسان نہیں رکھا جب کبھی کوئی چیز ہاتھ لگتی ہم اسے وکیل صاحب کی نذر کر دیا کرتے چنانچہ کلر ٹی وی (TV) واشنگ مشین، پنکھے اور خوبصورت گھڑیاں مرحوم کو ہم نے تحفتہً پیش کی تھیں۔

مرتے دم تک میں مرحوم کا ساتھ نبھاتا رہا اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا کیوں کہ میرے بعض مقدمات ہنوز زیرِ دوران ہیں۔ اب ان جیسا نیک دل وکیل ڈھونڈنا ہی پڑے گا۔ انشاء اللہ یہ کام آج ہی طے پا جائے گا کیوں کہ اس محفل میں کئی وکلاء صاحبان بھی موجود ہیں وہ میری مدد فرما کر ممنون فرمائیں گے۔

خواتین و حضرات! میں آپ کا زیادہ وقت چرائے بغیر اپنے فاضل دوست چھرے باز خان کو زحمت دوں گا کہ وہ وکیل صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کریں۔

حاضرینِ کرام۔ میں اس جلسے کے کرتا دھرتا اور میرے پیش رو مقررِ جناب سارق نواز خان کا ممنون ہوں کہ انھوں نے مجھے وکیل صاحب مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کا موقع عطا کیا۔ میں وکیل صاحب مرحوم کا زندگی بھر ممنونِ احسان رہوں گا کیوں کہ انہی کی مہربانی سے آج میں پھانسی کے پھندے سے بچ کر شریفانہ زندگی گزار رہا ہوں۔ مرحوم وکیل صاحب نے مجھے محض پندرہ ہزار روپے کے عوض قتل کے الزام سے بچا لیا تھا جس میں سے دس ہزار روپے تو میں نے مقتول کو قتل کر کے اس کی جیب سے اڑائے اور باقی پانچ ہزار روپے ایک اور شخص کو قتل کر دینے کی دھمکی دے کر وصول کیے تھے اس طرح جو کچھ کمایا تھا وہ وکیل صاحب کی نذر کر دیا تھا۔ وکیل صاحب مرحوم کو اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر یہ ثابت کیا کہ قتل کی واردات کے وقت میں شہر ہی میں نہیں تھا۔ اس کے لیے انھوں نے دہلی کی ایک لاج میں میرے نام سے کمرہ بک ہونے اور میرے وہاں قیام کے جعلی رسائد پیش کیے جنھیں عدالت نے حقیقی تسلیم کر کے میری (alibi) مان لی اور مجھے قتل کے الزام سے باعزت بری کر دیا۔ بے چارہ مقتول اگر بغیر مزاحمت کے دس ہزار روپے مجھے حوالے دیتا تو جان سے ہاتھ کیوں دھو بیٹھتا۔ کس قدر ناعاقبت اندیش تھا۔ اسے کیا معلوم کہ جب تک وکیل صاحب مرحوم کی طرح کا وکیل شہر میں زندہ ہے کوئی قاتل پھانسی پر بھلا کیسے چڑھایا جا سکتا ہے۔ آج میں وکیل صاحب مرحوم کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آئندہ کبھی کسی کا قتل نہیں کروں گا ظاہر ہے اس طرح آئندہ مجھے کون بچا سکے گا وکیل صاحب مرحوم کی بات ہی کچھ اور تھی۔ جب تک وکیل صاحب زندہ تھے کسی قاتل کا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا تھا۔ ہائے کیسی ہنرمند شخصیت سے دنیا خالی ہو گئی۔

چھرے باز خاں کی اس مؤثر تقریر کے بعد محترمہ ظالم النساء نے اپنے جذبات کا اظہار فرماتے ہوئے کہا:

سامعین کرام! مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ویسے سارا ملک ان کا قائل تھا۔ میں اپنا تجربہ بیان کرتی ہوں۔ مجھ کو پولیس والوں نے اپنی بہو کو جلا کر مار ڈالنے کے الزام میں گرفتار کرلیا تھا۔ بھلا ہو چھرے یا زمان بھائی کا کہ ان ہی کے مشورے سے میں وکیل صاحب مرحوم سے ملی تھی پھر انھوں نے فوری میری ضمانت کروائی۔ وکیل صاحب نے ثابت کیا کہ میری بہو جائے بنا رہی تھی کہ اسٹو بھڑک اُٹھا اور وہ جل کر مرگئی اور مزید یہ کہ میں ساس ہونے کے باوجود اس کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ خواہ مخواہ پڑوسیوں نے سمجھ لیا کہ میں نے ہی اسے جلا کر مار ڈالا کیوں کہ وہ اتنا جہیز نہ لاسکی تھی جتنی میری پڑوسن کی بہو لے کر آئی تھی۔ میری ہمسایہ خواتین کے مسلسل طعنوں ہی کی وجہ سے میں اپنی بہو پر مزید جہیز لانے کے لیے دباؤ ڈالتی رہی تھی اور ایک دن جب بات تو تو میں میں تک پہنچ گئی تو میں نے بہو کا آخر کام تمام کردیا۔ میرے بیٹے کی مدد شاملِ حال نہ ہوتی تو شاید کام اتنا آسان نہ ہوتا لیکن شکر ہے میرا بیٹا اس واردات میں ملوث نہیں کیا گیا۔ سارا الزام میں نے خود اپنے سر لے لیا تھا۔ آخر ماں جو ٹھہری!

بہرحال میں ممنون ہوں کہ مرحوم وکیل صاحب کی بدولت آج میں آزادی سے سانس لے رہی ہوں ورنہ جہیز اموات کے سخت قوانین کا شکار ہوگئی ہوتی۔ آج میں وعدہ کرتی ہوں کہ اپنی موجودہ بہو سے اچھا سلوک کرتی رہوں گی۔ ویسے یہ بہو مرحومہ کی بہ نسبت اچھا خاصہ جہیز ساتھ لے آئی ہے۔

ظالم النساء کی آپ بیتی کے بعد مرحوم وکیل صاحب کی چھوٹی بیوہ نے وکیل صاحب کو خراجِ دجیت ادا کرتے ہوئے اپنی روداد سُنائی۔

خواتین حضرات! میں دراصل ایک بے سہارا لڑکی تھی۔ ماں باپ کے گزر جانے کے بعد دواؤں کی اک کمپنی میں ملازمت کرتے ہوئے زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ مالکِ مکان کی مجھ پر نظر تھی۔ جب میں اس کی باتوں میں آنے سے انکار کرتی رہی تو اس نے گھر سے نکال دینے کی دھمکی دی اور بالآخر تخلیۂ مکان کا دعویٰ دائر کردیا۔ میں مرتی کیا نہ کرتی دوڑی دوڑی مرحوم وکیل صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر ساری رودادِ غم سُنا ڈالی۔ اور ان کے قدموں پر گر پڑی کہ وہ مجھے اس مصیبت سے بچائیں۔ وکیل صاحب نے سینے سے لگا لیا۔ میں ذرا جھجکی مگر اس مضبوط پناہ میں آگئی۔ اس کے بعد جب مرحوم وکیل صاحب کی جانب سے مالکِ مکان کو جوابی نوٹس ملی تو اس کی سٹی گم ہوگئی۔ الحمدللہ میں آج تک بھی اسی مکان میں ہوں۔ بحیثیت کرایہ دار نہیں بلکہ بحیثیت مالکۂ مکان کیوں کہ مرحوم وکیل صاحب کی غیر شرعی بیوی ہونے کے بعد (کیوں کہ شرعی کوٹہ تو وہ پہلے ہی مکمل کرچکے تھے) انھوں نے مذکورہ مکان میرے نام پر خرید کر تحفتاً مجھے دیا تھا۔ سابقہ مالک مکان اب میرا کرایہ دار ہے۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے مجھ پر کافی نوازشیں فرمائی تھیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں مبادا ان کی دیگر بیواؤں تک یہ بات پہنچے اور وہ مرحوم کی شان میں نازیبا کلمات ادا کریں اور خود مجھے بھی نتائج و عواقب بھگتنا پڑیں۔ اب میں نے سوچا ہے کہ اپنے موجودہ کرایہ دار سے عقدِ ثانی کرہی ڈالوں۔ میں بہرحال وکیل صاحب مرحوم کی بڑی احسان مند ہوں کہ میرے لیے انھوں نے اتنی دولت چھوڑی ہے کہ جس سے مجھے دوسرا شوہر آسانی سے مل سکتا ہے۔

آخر میں اس تعزیتی جلسے کے صدر دھن داس دو رُخیہ جو مرحوم وکیل صاحب کے بڑے قریبی دوست اور ان کے ہم پیشہ ہیں اپنے تاثرات بیان کریں گے۔

بھائیو اور بہنو ۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ میں اور مرحوم دو دھاری تلوار کی طرح رہا کرتے تھے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے دشمن مشہور تھے لیکن دو سیاسی لیڈروں کی طرح اندر ہی اندر ہم ایک دوسرے کے لیے جان تک (اپنے اپنے موکلوں کی) قربان کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ اگر میرا موکل (CLIENT) کمزور ہوتا تو میں اپنے حسب مخالف یعنی مرحوم وکیل صاحب کے موکل سے کچھ لے کر وہ مقدمہ ہار جاتا اور اگر مرحوم وکیل صاحب کا موکل کمزور ہوتا تو میں اپنے موکل سے جو ان کے موکل کے خلاف مقدمہ لڑ رہا ہوتا ہے، کچھ رقم دے دلا کر معاملہ ختم کروا دیتا۔ اس طرح مرحوم وکیل صاحب سے میری دوستی بڑی پائیدار تھی۔ اب چونکہ مرحوم وکیل جاتے رہے مجھے ان کی موت سے ذاتی طور پر بڑا گہرا نقصان پہنچا کیوں کہ یہ پیشہ ہم ساجھے داری میں کر رہے تھے۔ وکیل مرحوم بڑے نیک آدمی تھے۔ انھوں نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا ان کے اپنے موکلوں کے ساتھ انھوں نے دھوکا کیا ہو تو یہ ان کا اپنا ذاتی معاملہ ہے مگر زیادہ تر وہ اپنے ہم پیشہ دوستوں اور موکلوں کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا کرتے تھے ۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

جہانگیر انس
(بہار)

تنقیدی تجربے

تنقید نقاد کے ذہنی رقص کا نام ہے۔ ذہنی رقص کوئی جامد شئے نہیں۔ تال اس کو نچاتا اور حالات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ان کے زیر اثر وہ خود بھی ناچتا ہے۔ اس لیے سلولائیڈ سے اس کا گہرا ربط ہوتا ہے۔ تنقید [illegible] کی طرح بدلنے والے اسی رنگ کا نام ہے اس لیے وہ ہمیشہ کتھک یا ٹوئیسٹ ہی ہوتی ہے۔ یہ دیگر بات ہے کہ اگر نقاد سُر اور تال کی نزاکتوں سے پوری طرح واقف ہیں تو اس کا یہ ذہنی رقص محض اچھل کود تک محدود رہ جاتا ہے اور اس طرح تنقید اناڑی کا رقص بن جاتی ہے۔ اس کے برعکس چالاک نقاد سُر اور تال کو دلنشیں بنانے والے چہار عناصر یعنی چشم و ابرو کے اشارے اور دست و پا کی حرکات کو نہایت ہی نزاکت کے ساتھ پیش کرکے اپنے تنقیدی کتھک یا ٹوئیسٹ کو نہایت دلفریب بنا دیتا ہے۔ اور چالاک تر نقاد دو قدم اور آگے بڑھ کر مغربی طرز یعنی کولہوں کی لٹک اور چھاتیوں کی طوفانی جنبش کو بھی اس میں شامل کرکے بین الاقوامی سطح کا کیبرے رقص بنا دیتا ہے۔

نقاد کو تاریخی شعور بھی ہونا چاہیے۔ مثلاً اگر وہ ماضی کے کسی کارنامے پر بحث کر رہا ہے تو اسے کتھا کلی میں پیش کرنا چاہیے۔ اگر حال کے کسی کارنامے پر بحث کر رہا ہے تو ٹوئیسٹ میں۔ تب ہی وہ حقیقی طور پر تنقید کا حق ادا کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کامیاب نقاد وہی ہے جو ہوا کا رُخ اور عوام کی پسند مدِ نظر رکھتا ہے۔ یہ نہیں دیکھتا کہ زیر بحث موضوع میں کتنا نیا پن ہے اور کتنا پُرانا پن۔ ماضی کا احساس اور چیز ہے اور ماضی کا پابند ہونا دوسری چیز۔ اگر نقاد محض لکیر کا فقیر ہے وہ ڈسکوتی ذہن کو کتھا کلی کی طرف لے جانا چاہتا ہے تو وہ اپنے منصب کو پورا نہیں کرتا۔ کتھا کلی سے تسلسل قائم رہنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ڈسکوئی تجربے کرنے سے نہ جھجکنا چاہیے۔ مثلاً کتھا کلی کے بعد کیبرے کا دور آیا اس کے بعد اس کا دائرہ بڑھا اور ٹوئیسٹ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ جس طرح موسیقار مختلف طریقے سے دھن بناتا ہے اس کے اظہار کا کوئی ایک طریقہ نہیں۔ تنقید میں بھی یہی ہو سکتا ہے کہ نقاد اپنے فن کو نئے فارم کے ذریعہ ظاہر کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ نقاد چشم و ابرو اور دست و پا کا پابند ہو۔ وہ کولہوں اور سینوں سے بھی کام لے سکتا۔ تجربہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ افزائش نسل کی طرح ہر نسل کے ہاتھوں ہر دور میں تنقیدی تجربات کا سلسلہ جاری رہتا ہے تجربات کے لیے ضروری نہیں کہ وہ صرف نئے فارم میں "راک اینڈ رول" کرتے چلے جائے

ـــــــ وہ نئے ساز، نئی آواز اور نئی دھن کے تحت "رمبھا" میں بھی ظاہر ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ تاشہ، ڈھول، نقارہ، بھونپو، مردنگ، طبلہ، ہارمونیم، بینجو، ستار، ماؤتھ آرگن، بانسری، پیانو ــــ غرض کہ زمانے میں رائج تمام ساز و آواز پر تنقید نے تجرباتی رقص کیا ہے۔ یہاں تک کہ خالص مغربی دھن پر "ہپیانہ رقص" اور "ڈمرو پہ بندر ناچ" کا بھی تجربہ کیا ہے۔ جس کے سبب اس میں سرسامی کیفیت بھی ملتی ہے اور مرگی کے دورے بھی، ہائی بلڈ پریشر کی جھنجھنی بھی ملتی ہے اور لو بلڈ پریشر کی غنودگی بھی، بلغمی کھانسی کی کھوں کھوں بھی سنائی دیتی ہے اور خشک کھانسی کی ٹھوں ٹھوں بھی، کینسر کی اذیتیں بھی پائی جاتی ہیں اور مالیخولیا کی جھائیں بھی، اور اب تو بعض پر ایڈس کا اثر بھی نظر آنے لگا ہے۔

قدیم مسائل سے استفادہ کرتے ہوئے جدید مسائل کو حل کرنے اور نئے تصورات کو رائج کرنے کے لیے نقاد کے کئے گئے تجربات کے تحت تنقید کہیں لال دوپٹہ اوڑھے مارکسی بینڈ پر کولہوں اور چھاتیوں کو وحشیانہ جنبش دیتی، آنکھوں میں لال ڈورے ڈالے "تارا ٹھمکا بدل گئی چال متوا" کا راگ الاپتی نظر آتی ہے تو کہیں ریشمی شلوار کرتا جالی کا "پہنے ہوئے اپنے جمال جہاں آرا کو "مجرا" کے ذریعے پیش کرتی نظر آتی ہے کہیں اسکرٹ اور بکنی میں بن ٹھن کر چھت پر کھڑی "خارجی حرکات یعنی دست و پا کی اداکاری کے ساتھ چشم و ابرو سے داخلی جذبات کا بھی اظہار کرتی نظر آتی ہے۔ کہیں چرس و گانجہ کے نشہ میں دھت اپنے آپ سے بے خبر "دم مارو دم مٹ جائے غم" کا نعرہ لگاتی نظر آتی ہے، کہیں فطری لباس میں ملبوس "ایچک دانہ بیچک دانہ دانہ اوپر دانہ" کے دھن پر کیبرے ڈانس کرتی نظر آتی ہے۔

تاریخ تنقید پر نظر ڈالیے تو وہ شروع سے آخر تک راج کپور کی "بابی" یا کمال امروہی کی "رضیہ سلطان" کی داستان نظر آئے گی ــ جدید دور میں تو اس کو نقاد ہی نہیں کہنا چاہیئے جو "سارے گاما پا دھانی سا" کے اصول پر بنیاد کی تنقید نہ رکھتا ہو۔ آج تو نقاد ہونا اُسی کو زیب دیتا ہے اور یہ لفظ اُسی پر جچتا ہے جو "لارا لارا لا لا" کے اصول کے زیر اثر تنقید کو جمبو جیٹ رفتار "ڈسکو" سے ہم آہنگ کر کے کتھک اور ٹوئسٹ کے اس تسلسل کو جاری رکھتا ہے۔

نقاد محض میک اپ مین، ٹیبلو ماسٹر، ہیئر ڈریسر یا اسٹیج ڈیکوریٹر نہیں ہوتا۔ وہ تو رنگ ماسٹر ہوتا ہے۔ وہ قدروں کا خالق ہوتا ہے وہ انھیں برتتا اور پھیلاتا ہے۔ وہ خود رقاص نہیں ہوتا لیکن رقص کے تمام اسرار و رموز ــــ سے واقف ہونے کا دعویدار ہوتا ہے۔ وہ خود نغمہ نگار یا گلوکار نہیں ہوتا لیکن نغمہ نگاری اور گلوکاری کے فن کا خود کو ماہر سمجھتا ہے۔ وہ موسیقار نہیں ہوتا لیکن خود کو موسیقی کا بابا آدم سمجھتا ہے۔ وہ اداکار نہیں ہوتا لیکن اداکاری کے "الف" سے "ے" تک میں بزعم خود دقاق ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے پاس ایک تیسری آنکھ ہوتی ہے جو خوردبین سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ عام ذہن کے علاوہ ایک مخصوص ذہن بھی ہوتا ہے جو دور کی کوڑی لانے میں ماہر ہوتا ہے۔ اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ قدروں کو وہ ہمیشہ نشیب و فراز سے دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ غرضکہ کوئی نقاد قدروں کے اس تماشے کو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ کر تیسری آنکھ سے دیکھتا اور مخصوص دماغ سے اس کا تجزیہ کرتا ہے، کوئی قطب مینار پر چڑھ کر، کوئی سطح زمین سے، کوئی سطح زمین سے بھی نیچے اُتر کر، کوئی خط استوا سے، کوئی ارض البلد سے، کوئی طول البلد سے۔ اب مجھ جیسا دیکھتا

ہے جس نظر سے دیکھتا ہے تحسین بھی اسے ویسی ہی حسین، متین یا سنگین نظر آتی ہیں جنھیں وہ مزید حسین، متین یا سنگین بنانے کے لیے اپنے طور سے برتتا اور پیلاتا ہے۔

جدید دور میں اپنی اپنی کینچلی سے نکل کر بہت سے نقادوں نے تنقید میں اہم تجربات کیے ہیں جن کے باعث تنقید کے فن میں تاناتھیا، چھم چھم چھاچھم اور یاہو کی خصوصیات پیدا ہوگئی ہیں۔

مختصر یہ کہ تنقید آج ایک ٹی وی بھی ہے اور ریکارڈ پلیئر بھی، کرکٹ بھی ہے اور شطرنج بھی، ہتیا بھی ہے اور ڈھیچو بھی۔ الکوحل بھی ہے اور ہیروئن بھی، فیشن بھی ہے اور کرکشن بھی، بی بی سی لندن بھی ہے اور آکاش وانی دہلی بھی ـــ ماڈرن ایج میں جتنے بھی اوصاف ہیں ان کے مجموعہ کا نام تنقید ہے۔ ان تمام اوصاف سے اس نے استفادہ کیا ہے، ان کی بنیادوں پہ اپنی تعمیر کی ہے۔ ان ہی بنیادی اصولوں کی روشنی میں ادب کے اصول متعین کئے ہیں۔ اور اپنے آپ کو ادب کے دائرے سے باہر نکال کر "بھانگڑاہ" کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ اور یہی اس دور کا سب سے اہم تجربہ ہے۔

ایک زمانہ تھا جب تنقید محض طبلہ کی تھاپ تھی، گھنگھرو کی جھنکار، عاشق کی دلنوازی اور معشوق کی تنک مزاجی تھی۔ دھول دھپہ میں سراپا ناز کا شیوہ تھا۔ چنک منک اور کھنک کی تلاش اس کی دنیا تھی۔ ایک زمانے تک اس نے اس میں خود کوئی اضافہ نہیں کیا۔ جدید دور کی تنقید صرف - - - - - - - - - - - -

ان علوم کے سہارے ہی آگے نہیں بڑھ رہی ہے بلکہ ہر جگہ ان علوم کے جو تنے ہیں اس نے اپنے اندر ایک "ڈسکوتی" شان پیدا کی ہے۔ اس نے کمپیوٹر، روبوٹ، ٹسٹ ٹیوب بے بی، تبدیلیٔ جنس یہاں تک کہ استقاط حمل جیسے ماڈرن ایج کے اوصاف کو اس طرح اپنایا ہے کہ وہ اس سے علیحدہ معلوم نہیں ہوتے بلکہ آج ان اوصاف اور تنقید کے درمیان ایک مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور اس سے تنقید کی شکلیں بعض مقامات پر جدید آرٹ کا نمونہ بن گئی ہیں۔ لیکن ان کی تجرباتی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور نہ ان نقادوں کی اہمیت سے جو اصولوں کی بنیاد پر تنقید کا مقدس فریضہ انجام دیتے ہیں۔

۸۵

غزلیں

لقب عران
اچلپور

رہنے لگے ہیں جا کے وہ اب نینی تال میں
دیوانہ ہو گیا ہے یہاں جن کے خیال میں

سمجھو کہ اس کی دُنیا سے چھٹی قریب ہے
جو پھنس گیا کسی کی محبت کے جال میں

اللہ کا کرم کہ ترقی ہوئی مری !
دشمن نے لاکھ چاہا میں آؤں زوال میں

بادِ صبا نصیب تجھے ہوگی کیا بھلا
شوخی جو پائی جاتی ہے اس بُت کی چال میں

مخصوص کمرہ چاہیئے آرام کے لیے !
اور تم بضد کے ٹھہروں میں اس عام ہال میں

جی چاہتا ہے اس میں لقب ڈوب جاؤں میں
پڑ تا ہے جو حسین گڑھا اس کے گال میں

○

محبوب مانجھومی
ناسپور

نہ ہو فرقت میں یوں مایوس، تھوڑا صبر کر تکیہ
کرے گا تجھ پہ اک دن وہ مرا رشکِ قمر تکیہ

بنا تھا ایک ہاتھی کے جو شب بھر زیرِ سر تکیہ
سحر تک بھر گیا تھا وہ جوؤں سے سر بسر تکیہ

ضعیفی میں کمر کے درد نے وہ گُل کھلائے ہیں
بجائے زیرِ سر، رکھتے ہیں ہم زیرِ کمر تکیہ

نہ جانے کہہ دیا کیا شب کو ان سے جوشِ مستی میں
وہیں ظالم نے ہم کو تڑ سے مارا کھینچ کر تکیہ

پَروں سے بلبلوں کے ہم نے بھروایا ہے تکیہ کو
اسی باعث سبھی کہتے ہیں اس کو بے ضرر تکیہ

○

ڈاکٹر یوسف گوہر
شاہ جہاں پور

ترقی کے یہی جلوے بہت ہیں
کبھی تانگے تھے اب رکشے بہت ہیں

وہی نا اہل جیتے گا الکشن !
کہ جس کے پاس ہتھکنڈے بہت ہیں

خُدایا خیر ہو اُردو ادب کی
محافظ جس کے خود بھوکے بہت ہیں

کیا تھا عشق مجنوں نے بھی لیکن
ہمارے عشق کے چرچے بہت ہیں

بڑھے کیوں کر نہ آبادی وطن کی
کہ فرصت کے ہیں لمحے بہت ہیں

کروں کیوں کر نہ ڈیلی یوز آلو !
کہ انڈے آج کل مہنگے بہت ہیں

جو اہلِ فن ہیں تاریکی میں گم ہیں
کہ نا اہلوں کے اب چرچے بہت ہیں

غریبوں کی غریبی بھی مٹے گی !
ابھی نیتاؤں کے چمچے بہت ہیں

تیل ملتی نہیں ہے سوکھی روٹی !
منسٹر کے لیے مرغے بہت ہیں

مسرور مسلم (بھوپال)

زہرہ قا۔۔۔۔۔۔

[بھوپال گیس المیہ کے پس منظر میں]

یوں تو گیس المیہ سے ہزار ہا یادیں اور اتنی ہی کاشیں وابستہ ہیں لیکن سر دست یہاں اُن لاشوں پر بیٹھ کر رونا ہمارا مقصود نہیں۔ اور نہ ہی اُن چلتی پھرتی زندہ لاشوں پر قہقہے لگانے کا ہی ارادہ ہے۔ جو اس حادثے میں زندہ بچ رہنے پر اب موت کو ترجیح دینا زیادہ پسند کرتی ہیں کہ سسک سسک کر جینے اور لمحہ لمحہ ہلاک ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ ایک ہی بار میں قصہ تمام ہو جائے۔

لیکن اس طرح اپنی مرضی سے مرنے میں بھی یہ اندیشہ ہے کہ کہیں دوبارہ پھر سے زندہ نہ کر دیئے جائیں۔ کیوں کہ مذکورہ حادثے کے بیشتر سابق مرحومین اس تلخ تجربے سے دو چار ہو چکے ہیں۔ یعنی پہلے ہی ہلے میں اچھے خاصے مر گئے تھے۔ اور ابھی ڈھنگ سے قبر میں پاؤں نہ پھیلائے تھے کہ "قم باذنِ سرکار" دوبارہ اٹھا لیے گئے۔ کیوں اٹھا لیے گئے۔؟ اس کا قطعی جواب تو ہم بھی نہیں دے سکتے۔ ہاں، اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اس حادثے کے بعد پہلی بار جو سرکاری اعداد و شمار منظرِ عام پر آئے۔ ان میں مرنے والوں کی تعداد بے خیالی میں سیاسی مصلحتوں سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس لیے بڑی عجلت میں چار پانچ سو مُردوں کو فوری طور پر زندہ کرنا پڑا اور بقیہ ہزاروں کو دریا بُرد لگ بھگ دو ہزار جسدِ خاکی عوام الناس کی نگرانی میں سپردِ خاک و نذرِ آگ کیے گئے! اس لیے قبرستانوں اور شمشان گھاٹوں میں تھوڑی بہت چہل پہل ہو گئی۔ ورنہ کوشش تو یہی تھی کہ انھیں بھی تجہیز و تکفین کے تکلف سے بے نیاز کر دیا جائے۔ پھر بھی سرکار حادثے کی سنگینی کو معتدل اور مرحومین کی تعداد کو مختصر کرنے میں کامیاب رہی لیکن غیر ارادی طور پر ایک اہم اور بڑا کام یہ ہو گیا کہ تمام گمشدہ مرحومین پسِ مرگ رسوائی سے بچ گئے۔ یہی بہت ہے کہ کم از کم ؎

ہوئے وہ نہ مر کے رسوا، ہوئے سب ہی غرقِ دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار دیکھا

اگرچہ دریا بُرد اور زندہ کئے گئے تمام گمشدہ مرحومین اب داستانِ پارینہ بن چکے ہیں۔ مگر ہمیں آج بھی اُن کی تلاش ہے۔ کم از کم اس دریا کے متعلق ہی ہمیں تھوڑا بہت سراغ مل جاتا جس میں انھیں نیکی سمجھ کر ڈال دیا گیا تھا تو انھیں نہ صرف ہم بھی گلہائے عقیدت پیش کرنے کی ہماری دیرینہ آرزو پوری ہو جاتی۔ بلکہ ہم بھی یہ تجربہ کر کے

دیکھ لیجئے کہ آخر دو منٹ کی خاموشی سے ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جانے والوں کی آتما کو کیسے شانتی مل جاتی ہے۔ اور مرنے والوں کے پسماندگان ان دو منٹوں کے سناٹے سے کیونکر بہل جاتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم اس بے داغ ریاکاری کا تجربہ کرنے سے محروم رہے۔

حالانکہ گیس متاثرین آج بھی بذریعہ علاج نہایت پابندی سے مارے جا رہے ہیں۔ چاہیں تو یہ تجربہ ان پر بھی کر سکتے ہیں۔ مگر دشواری یہ ہے کہ بظاہر اب یہ لوگ یکمشت نہیں مر رہے بالاقساط مر رہے ہیں۔ جبکہ ہماری لیڈرانہ جبلت کی تسکین کے لیے لازم ہے کہ بیک وقت کئی لوگ مریں تاکہ مجمع کا تاثر پیدا ہو سکے۔ اِکا دُکا اموات سے بھی کہیں تسکین ہوئی ہے؟

پھر بھی اِک طویل انتظار کے بعد تھک ہار کے ہم تو اس پر بھی آمادہ ہو گئے تھے کہ چلو، اِکا دُکا لوگوں پر ہی یہ تجربہ کر لیا جائے مگر اب کی بار محکمۂ صحت آڑے آ گیا۔ اس محکمہ نے گیس مظلومین کے علاج و معالجہ کے لیے جو سہولتیں فراہم کی ہیں۔ اس کے نتیجہ میں کتنے ہی بدن جان سے خالی ہو کر سانس کی ڈور میں اٹکے ہوئے ٹی بی اسپتال پہنچا دیئے جاتے ہیں۔ اور جب وہاں مشقِ ثانی کے بعد اُن کے خیمۂ زیست کی آخری طنابیں اور سانسیں پوری طرح ٹوٹ جاتی ہیں تو اُن کی موت کے سرٹیفکٹ میں مرنے کا سبب ٹی بی درج کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ اُن کے لواحقین معاوضہ کا دعویٰ نہ کر سکیں اور حکومت بھی بدنام نہ ہو کہ اتنا عرصہ گزرنے پر بھی یہ دو برس گیس اموات پر قابو نہ پا سکی۔

[illegible] ظاہر ہے "گیس اموات" کے مقابلے میں ٹی بی سے مرنے والوں کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔ یہاں بھی ٹی بی اور غریبی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اور غریب غرباء سے ہمیں مطلق دلچسپی نہیں۔ لہٰذا ہم پھر ہاتھ ملتے رہ گئے اور [illegible] کر سکے۔ ہمارے نزدیک خراجِ عقیدت دو ہی صورتوں میں زیب دیتا ہے۔ یا مرنے والا کوئی مشہور و معروف [illegible] ہو یا موت کا سبب کسی خصوصی اہمیت کا حامل ہو۔ تب کہیں جا کر غمگساری کے چرچے ہوتے ہیں۔ ورنہ معمولی [illegible] والی ہوتی ہی رہتی ہیں۔ سب کو تو خراجِ عقیدت پیش نہیں کیا جا سکتا۔ سیدھی سی بات ہے، اگر گور کن موت پر آنسو بہانے لگے تو رو رو کے اندھا ہو جائے۔

[illegible] کو کیا کہیئے کہ ہمیں بہرحال اندھا ہونا تھا۔ وہ آنکھیں جو مہلک گیس سے پوری طرح نہ [illegible] چشم بینا کے ہاتھوں بے نور ہونا پڑا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ سرکار کو گیس [illegible] دھول جھونکنے کی جھنجھٹ سے ہمیشہ کے لیے نجات مل گئی۔ ورنہ اس پروپیگنڈے کے لیے خواہ مخواہ [illegible] اضافی محنت کرنی پڑتی تھی۔

[illegible] یہ ہوا کہ اب گیس المیئے کی سالگرہ کی تقاریب کسی بدمزگی کا شکار [illegible] پر لوگ اک ہنگامہ کھڑا کر دیتے تھے۔ نتیجتاً سیاسی بازیگروں کی سالانہ تقریب غمگساری پر پانی پھر جاتا تھا۔ جس کی تیاری میں ان کھلاڑیوں کو پورے سال گریہ و زاری کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ تاکہ عین موقع پر کہیں دیدۂ بینا کا پانی خشک نہ ہو جائے۔

[illegible] عقیدت [illegible] ایصالِ ثواب [illegible] روشنی ڈالی جائے گی اور یہ بتایا جاتے گا کہ ہم [illegible]

[illegible]

اطمینان بخش نتائج برابر موصول ہو رہے ہیں۔ مثلاً وہ چند سو خواتین جنھیں ہم نے روزگار فراہم کیا تھا۔ وہ ہماری غفلت سے ڈھائی سو روپے ماہانہ کمانے لگی تھیں۔ اب انھیں ۲۵؍ روپے ماہانہ پر اکتفا کرنا ہوگا۔ کیوں کہ اِس بے تحاشہ کمائی سے خواتین میں فضول خرچی کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا جو مناسب نہ تھا۔ ہمیں یقین ہے، اِس کفایتی اقدام سے اُن کی بھوک اور افلاس میں کوئی اضافہ نہ ہوگا۔ بلکہ صبر و قناعت اور فقر و فاقے کی بھٹی میں تپتے تپتے وہ بالآخر کندن بن جائیں گی، اور اُن کے نیچے راکھ کا ڈھیر کہ ہر بھٹی کے لیے ایندھن ضروری ہوتا ہے۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ ہمارے بے پناہ ہوس و حوصلے کی داد دی جائے۔ تاہم یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا، کہ شروع شروع میں بیرونی ملکوں سے جو امدادی رقم ہمیں موصول ہوئی۔ اُن سے ہم نے اپنی بھی مالی مشکلات پر قابو پا ہی لیا۔ لگے ہاتھوں اپنے عزیز و اقارب کو بھی آلامِ روزگار سے بے نیاز کر دیا۔ اِس باہمی تقسیم کے بعد جو مٹھی بھر رقم بچی، اُس کی تقسیم کا یہ بندوبست کیا کہ تقسیم کار اِس ہاتھ لے، اُس ہاتھ دے۔ اس ہوشربا گرانی میں آخر اُن کا بھی تو کچھ حق بنتا ہے۔

یہی نہیں گیس متاثرین کی باز آباد کاری کے لیے جو کروڑوں روپے کا سات سالا ایکشن پلان ہم نے مرتب کیا ہے۔ اُسے روبہ عمل لانے کے لیے اس کی مدتِ کار میں مزید توسیع کی جائے گی، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ زیادہ سے زیادہ دنوں تک اِس سے محروم رہیں! اسی خیال سے یہ طے کیا گیا ہے کہ اِس جز وقتی پلان کو سات سال کے بجائے ستّر سال پر محیط کر دیا جائے۔ بلکہ ممکن ہوا تو پوری صدی تک! ــــ یاد رکھیے، ہم آپ کی دِگرگوں حالت، گرتی صحت اور بڑھتی ہوئی تربتوں کی طرف سے غافل نہیں ہیں لیکن کچھ رضاکار تنظیمیں اور شر پسند عناصر خواہ مخواہ ہماری دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیتی ہیں جس سے ہمیں شدید تکلیف ہوتی ہے ــــ پھر موضوع اور مذاکرہ بدلتے ہوئے شہدائے گیس کو آہوں اور آنسوؤں کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ جس کے دوران مقرر کا گلا بار بار رندھ جائیگا۔

اِس مقامِ آہ و فغاں کے بعد تقسیمِ اسناد کے طور پر، چند پا بہ رکاب بزرگوں کو [illegible] شال، کچھ مفلوج و معذور بیواؤں کو زنگ آلود سلائی مشینیں، لذتِ کام و دہن سے محروم دس بیل یتیم بچوں کو ٹافیاں اور بیکار لوجوانوں کو تجارتی اسکیموں کے خواب بانٹے جائیں گے۔ مزید برآں، سرکاری [illegible] سپتالوں میں جاں بلب و دم مریضوں کو درازئ عمر کی ڈھیر ساری دعائیں، اتنی ہی مقدار میں باسی پھل اور کچھ دوائیں بھی دی جائیں گی۔ جن کا پیکنگ [illegible] خالص اور اصلی ہوگا ــــ اور سب سے آخر میں زیارتِ قبور کو قبرستانوں میں سفید پوش وفود جائیں گے۔ اور جب وہ دیکھیں گے کہ وہاں کا چپّہ چپّہ آباد ہوگیا تو خوشی سے جھومتے ہوئے فخر سے کہیں گے ؎

"ہمارے دم سے ہی آباد ہیں یہ ویرانے"

عبدالسلیم اختر
(گونڈیا)

اکثر دوکان آتے جاتے میری نظر اس کی طرف اُٹھ جایا کرتی تھی۔ ریلوے پل، بوکنگ آفس کو پار کرتے ہی سامنے ایک چھوٹا سا میدان ہے اور شہر میں داخل ہونے کے لیے میدان کے بائیں جانب شہر کی خاص شاہراہ اور دائیں طرف ڈاکخانہ ہے۔

وہ ڈاکخانہ کے نکڑ پر ہی بیٹھ کر بھیک مانگا کرتا اس کی آواز میں نہ جانے کون سا جادو تھا کہ دھیان بے ساختہ اس کی طرف کھینچ جایا کرتا تھا۔

آج اسے بینک میں دیکھ کر مجھے تعجب ہوا تھا میں اپنے آپ کو اس کے پاس جانے سے روک نہیں پایا اس نے بھی شاید مجھے پہچان لیا تھا اس نے میری طرف ایک چھوٹی سی ڈائری اور کچھ روپے بڑھا دیئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ڈائری نہ ہوکر بینک کی پاس بک ہے میں نے ڈپازٹ فارم بھر کر اسے دے دیا لیکن اپنی چاہت کو نہ روک سکا۔ اور پوچھ ہی لیا "کیا کروگے پیسے بچا کر؟" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "بیٹی کی شادی" اور ری سیپشن کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

کافی وقت گزرنے کے بعد دیکھا کہ وہ جگہ آج کل خالی رہتی ہے لیکن اب بھی حسب عادت نظر اس طرف اُٹھ ہی جاتی ہے ایک دن گھر لوٹتے وقت دیکھا کہ وہ جگہ آج خالی نہیں ہے بلکہ اب اس جگہ ایک نیا ہی چہرہ ہے۔ گھر کی طرف تیزی سے بڑھتے قدم رُک گئے میں نے دیکھا اور اس کی تھالی میں چونّی ڈالتے ہوئے پوچھ ہی لیا۔ "پہلے یہاں جو بیٹھے تھے وہ کہاں گئے"۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا "آج کل وہ بیمار رہتے ہیں میں ان کا داماد ہوں اور انھوں نے یہ جگہ مجھے جہیز میں دی ہے"۔

رات کے گیارہ بج چکے ہیں اور میں اپنے بستر پہ پڑا اپنی آٹھ برس کی بیٹی کو دیکھ رہا ہوں جو پاس ہی اپنی ماں کے پاس گہری نیند میں سو رہی ہے اور میرے کانوں میں بار بار یہی لفظ گونج رہے ہیں "میں ان کا داماد ہوں اور انھوں نے یہ جگہ مجھے جہیز میں دی ہے"۔

فیاض احمد فیضی (بمبئی)

سفرنامۂ چرچ گیٹ

اردو ادب کا آج کل سفرناموں کے مارے بُرا حال ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھار کوئی سنجیدہ ادیب انتہائی غیر سنجیدگی سے ایک آدھ خشک سا سفرنامہ لکھ دیتا تھا جسے لوگ بڑے اہتمام کے ساتھ اپنی لائبریری کی زینت بنالیتے تھے اور اپنے بچوں کو اسے پڑھنے کی تلقین کیا کرتے تھے مگر جب سے مزاح نگاروں کو سفر کرنے کے مواقع ہاتھ آنے لگے ہیں انھوں نے سفرنامہ نویسی کو اپنا حق مان لیا ہے اور بڑے دھڑلے سے چلبلے اور شریر سفرنامے لکھے جارہے ہیں جن میں قباحت صرف اتنی ہے کہ بزرگوں کو انھیں دوسروں سے چھپا کر پڑھنا پڑتا ہے۔ طالب علم جو پہلے سفرناموں سے بدکتے تھے اب شوق سے انھیں کھلے عام پڑھنے لگے ہیں۔ سفرناموں کی اس مقبولیت کو دیکھتے ہوئے بعض ادیبوں نے ہمت کرکے خیالی سفرنامے بھی لکھنے شروع کر دیئے ہیں جو اکثر حقیقی سفرناموں سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوتے ہیں اس لیے کہ ان میں سفر کم ہوتا ہے سفرنامہ زیادہ!

ہم پر یہ افتاد پڑی کہ اچانک ایک دن دلی سے ہمارے دوست کرنل شرما (ریٹائرڈ) اور حیدرآباد سے ڈاکٹر بیری تقریباً ایک ہی وقت پر بمبئی وارد ہوئے اور ہمارے غریب خانے کو رونق بخش کر ہمیں حیرت اور خوشی کے سمندر میں ڈبو دیا۔ حیرت اس لیے کہ آج تک ایک ساتھ دو مصیبتیں ہم پر کبھی نازل نہیں ہوئی تھیں اور خوشی اس لیے کہ عام طور سے جب لوگ بمبئی آتے ہیں تو سیدھے کسی ہوٹل کا رُخ کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بمبئی والوں کے گھروں اور دلوں میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہاں قیام کیا جا سکے۔ ایسے تنگ شہر میں جب ہمارے دو پُرانے اور ذی حیثیت دوستوں نے ہمیں اس قابل سمجھا تو ہمارا فرض تھا کہ نہ صرف خوش ہوں بلکہ اس کا اظہار بھی اپنے معزز مہمانوں کے سامنے کریں، سو ہم نے کیا۔

کرنل شرما (ریٹائرڈ) ہمارے ایک بیڈروم ہال اور کچن پر مشتمل چھوٹے سے فلیٹ کو دیکھ کر فرمانے لگے "اگر آپ امریکہ میں ہوتے تو آپ کی تین نفری فیملی کو اس فلیٹ میں رہنے کی ہرگز اجازت نہ ملتی۔ وہاں آپ کو کم از کم دو بیڈروم ہال کا مکان خریدنا پڑتا۔"

ہمیں کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ کرنل شرما حال ہی میں امریکہ سے لوٹے تھے۔ بیس برس پہلے ان کا اکلوتا بیٹا گھر کے ڈسپلن سے تنگ آکر امریکہ فرار ہو گیا تھا اور وہیں شادی کر کے بس گیا تھا۔ اب وہاں اس کا اپنا کاروبار تھا۔ کرنل نے ریٹائرڈ ہوتے ہی اپنے نالائق بیٹے کو معاف کر دیا تھا اور تین مہینے اس کے پاس امریکہ میں گزار کر لوٹے تھے۔ ہم نے مسکراتے

ہوئے انھیں جواب دیا کرنل صاحب، اگر ہم وہاں ہوتے تو ہمارا گھر شاید ایئر کنڈیشنڈ ہوتا۔ ہمارے ٹوائلیٹ کا فلش خراب نہ ہوتا۔ دیواروں سے اِدھر اُدھر پلستر نہ اکھڑا ہوتا۔ ہمارے قدموں کے نیچے قالین ہوتا اور گیراج میں ایک کونٹیسا کھڑی ہوتی۔ ہمارے گھر میں فون ہوتا اور وہ خراب نہ ہوتا۔ ہماری جیب میں ڈالروں کی ہریالی ہوتی۔"

ہماری جوابی تقریر سُن کر ڈاکٹر بیری مفکرانہ انداز میں کہنے لگے "مگر یہاں آپ کو کم از کم یہ فخر تو حاصل ہے کہ جس شہر میں ایک کمرے میں بیس افراد زندگی گذارتے ہیں آپ کے ڈھائی کمروں کے فلیٹ میں صرف تین افراد بستے ہیں۔"

"جی ہاں! بمبئی میں جو لوگ ایک کمرے کے ایک تہائی حصہ میں رہتے ہیں انھیں بھی یہ مسرت حاصل ہے کہ وہ ان لوگوں سے بہت بہتر ہیں جو فٹ پاتھ پر بستے ہیں۔" ہم نے کہا۔

کرنل نے مداخلت کی۔ "اس طرح تو فٹ پاتھ پر رہنے والوں کو بھی کوئی نہ کوئی فخر ضرور ہوگا۔"

"یقیناً ہوگا۔ مگر وہ ابھی تک دریافت نہیں کیا جا سکا ہے" ڈاکٹر صاحب نے زوردار جماہی لیتے ہوئے فرمایا

صبح ناشتہ کی میز پر کرنل نے مژدہ سنایا کہ انھیں واپسی کا ہوائی ٹکٹ بک کرنے اور دوسرے کچھ غیر ضروری کام نپٹانے کی غرض سے نریمان پوائنٹ جانا ہے۔ ڈاکٹر بیری کو بھی فلورا فاؤنٹین پہنچنا تھا۔ ہمارا آفس فورٹ میں ہے۔ یعنی ہم تینوں کی منزلیں قریب قریب ہی تھیں۔ پچھلی مرتبہ جب کرنل شہر بمبئی تشریف لائے تھے تو مسلسل تین دن تک ٹیکسی میں سفر کرتے رہے تھے اور ہمیں بھی شریکِ سفر کیا تھا۔ ہم اسی خیال سے خوش تھے کہ آج آفس ٹیکسی سے پہنچیں گے۔ دراصل بمبئی شہر میں ٹیکسیاں اتنی مہنگی ہیں کہ ان میں شریف آدمی اس وقت تک سفر نہیں کر سکتا جب تک کہ کوئی دوسرا کرایہ ادا کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔

لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ گھر سے باہر نکلتے ہی کرنل نے رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ کہنے لگے "سنا ہے بمبئی شہر کی لوکل ٹرین کا فرسٹ کلاس کا سفر ٹیکسی کے سفر سے زیادہ آرام دہ اور سستا ہوتا ہے؟"

"اسی طرح لوکل ٹرین کے دوسرے درجہ کا ڈبہ آٹو رکشا سے بہتر ہوتا ہے" ڈاکٹر بیری کہاں چُپ رہنے والے تھے۔

ہمارا جی چاہا کہ انھیں بتا دیں کہ بمبئی کی لوکل ٹرین کا سفر عذاب ہونے کے باوجود محض کم کرائے اور تیز رفتاری کی وجہ سے مقبولِ عام ہے اور اب ادھر کچھ برسوں سے کرائے میں مسلسل اضافے اور رفتار میں مسلسل کمی کی بناء پر لوکل ٹرینیں یہ چارم بھی کھوتی جا رہی ہیں اور اب لوگ مجبوراً اس میں سفر کرتے ہیں۔ لیکن مہمانوں کی رائے پتھر کی لکیر ہوا کرتی ہے اور اس سے اختلاف کرنا یا ان کی تردید کرنا سراسر بداخلاقی ہے۔ سو ہم چُپ رہے۔

چنانچہ ہمارے معزز مہمانوں نے یہ فیصلہ ہمیں سنایا کہ ہمارے گھر سے ملاڈ ریلوے اسٹیشن کا فاصلہ بس کی بجائے آٹو رکشا سے طے کریں گے اور ملاڈ سے چرچ گیٹ کی دوری کو لوکل ٹرین کے خوش گوار سفر سے دُور کریں گے۔ ہم صرف اس خیال سے خوش تھے کہ اس سفر کے یادگار لمحات کو کرنل شرما (ریٹائرڈ) اپنی نامکمل سوانح حیات میں ضرور شامل کریں گے ظاہر ہے اس میں ہمارا نام بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہوگا۔ اور ڈاکٹر بیری ممکن ہے اُلٹا ہے سے پہلے اپنے مریضوں کو روزانہ صبح بمبئی کی لوکل ٹرین کے سفر کا نسخہ تجویز کرنے لگ جائیں۔ ڈاکٹر بیری دراصل وہ پہلے ڈاکٹر ہیں جنھوں نے اسپین کے ایک گمنام شاعر پر ہنستے کھیلتے پی ایچ ڈی کی اور ڈاکٹر کہلائے۔ ایک عرصہ تک مقامی کالج میں ادب کی ڈاکٹری کی جس سے اپنی غربت کا علاج کرتے رہے استعفا خواہ مخواہ ہی حاصل کی۔ اس کے بعد اچانک انھوں نے اپنے گھر پر ہومیوپیتھی کی پریکٹس کا آغاز کر دیا اور اپنی توقع کے خلاف کامیابی سے دوچار ہوئے۔ اب یہ حال

پھر کالج میں اُردو ادب کے طلبہ کو ہومیوپیتھی کے فوائد پر لیکچر دیتے تھے اور شام کو اپنے مریضوں کو دوا کی پڑیاں دینے سے پہلے اپنا اور اساتذہ کا باقاعدہ کلام سناتے تھے۔ چہرے اور گھر کے در و دیوار پر رونق آنے لگی تھی۔

ہم تینوں کالونی کا راستہ طے کرکے جیسے ہی سڑک پر نکلے ایک حیرت انگیز بات ہوئی۔ ایک آٹو رکشہ تیزی سے ہمارے قریب آکر رُکا اور اندر سے ڈرائیور نے نہایت مہذب انداز میں کہا: "آئیے صاحب اسٹیشن جائیے گا" ہم تینوں سیدھے آٹو رکشہ میں بیٹھ گئے۔ رکشہ ایک جھٹکے کے ساتھ روانہ ہوا اور راستہ بھر ہمیں جھٹکے پہنچاتا رہا۔ ایک جگہ سگنل پر رکشہ رکا تو ڈاکٹر جیری نے سرگوشی کی "ویسے تو یہ جھٹکے اور شاک ہر طرف۔ لیکن آپ کے بمبئی کے آٹو رکشہ ڈرائیور بہت مہذب اور شائستہ ہیں۔ ہمارے حیدرآباد میں تو سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے اور جی تو ایسے ہیں کہ سیدھے منہ بات کرنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ صرف غراتے رہتے ہیں" اور ہمیشہ ایسی جگہ جانے کے لیے تیار رہتے ہیں جہاں آپ کو نہیں جانا ہوتا ہے۔"

کرنل شرما بھی آج کچھ ہم خیال تھے "دلی کا تو حال ہی عجب ہے۔ وہاں خالی آٹو رکشہ ٹکسی ہی نہیں دیتے پھر وہاں رکشہ پیڈل سے کم اور بے ایمانی سے زیادہ چلتا ہے۔ غلط سلط راستوں سے منزل پر پہنچانے کے بعد بھی دل نہیں بھرتا تو تیز رفتار میٹر اور غلط حساب کتاب کے سہارے آپ کو بالکل کنگال بنا دیتے ہیں۔"

آٹو رکشہ ڈرائیور اور ہم خاموشی سے یہ سب سنتے رہے اور دل ہی دل میں ہنستے رہے۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ آٹو رکشہ یا ٹیکسی بمبئی میں ہو یا دلی میں ہو یا دنیا کے کسی شہر میں ہو، ہر جگہ ایک سا حال ہے۔ بس بے ایمانی کے الگ الگ روپ ہیں اور الگ الگ طریقے ہیں۔

اسٹیشن پہنچ کر آٹو رکشہ ڈرائیور نے بھی مروتاً بالکل صحیح پیسے لئے اور ہمارے مہمانوں کی سادہ لوحی پر مسکرا کر ہمیں وداع کیا۔ ٹکٹ کی کھڑکی پر پہنچ کر ہم نے سو روپے کا نوٹ کلرک کو دیا اور کہا "دو ٹکٹ چرچ گیٹ فرسٹ کلاس"۔ اس نے پہلے ہمارے نوٹ کو اور پھر ہمیں حیرت سے دیکھا۔ بمبئی میں عام طور سے لوگ لوکل ٹرین میں فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہیں خریدتے بلکہ ہر شخص کے پاس سیزن ٹکٹ رہتا ہے جو بہت سستا ہوتا ہے اور پاس کہلاتا ہے کبھی کبھار جو سفر کرتے ہیں وہ عام طور پر سیکنڈ کلاس کا ہی ٹکٹ خریدتے ہیں۔ خیر، کلرک نے دو ٹکٹ فرسٹ کلاس کے اور بقایا تیس روپے ہمارے حوالے کئے۔ ہم نے ٹکٹ دیکھا تو اس پر کرایہ اُنتیس روپے لکھا تھا یعنی دو ٹکٹ کے اٹھاون روپے ہوتے۔ تیس روپیوں کی واپسی کا مطلب ہوا اٹھاسی روپئے جب کہ ہم نے اُسے پورے سو روپے کا نوٹ دیا تھا۔ ہم نے سوچا ممکن ہے کلرک نے اسے اسّی روپے کا نوٹ سمجھا ہو۔ پھر روپے کی قیمت بھی تو گرتی رہتی ہے۔ ہم نے اس سے آہستگی سے کہا "بھئی یہ تو دس روپے کم ہیں" اس نے خشمگیں نگاہوں سے ہمیں دیکھا اور بارعب آواز میں جواب دیا "تم سے [illegible] دے رہا ہوں، شور کیوں مچاتے ہو؟" پھر دراز سے دس روپے کا نوٹ نکال کر ہماری طرف پھینک دیا۔ ہم نے نوٹ اٹھا کر پلٹ کر دیکھا تو ہمارے معزز مہمان کافی دور کھڑے تھے ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔ بمبئی کے ریلوے کلرکوں کی ایمانداری کا انداز انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔

پلیٹ فارم نمبر ایک پر پہنچ کر کرنل شرما نے وزن کرنے والی مشینیں دیکھیں تو مچل گئے۔ کہنے لگے "آپ کے پاس چونی تو ہوگی۔ برسوں سے ہم نے ریلوے اسٹیشن پر وزن نہیں کیا"۔ ہم نے ایک دو نہیں پانچ چھ چونیاں جیب سے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ انھیں حیرت تو ہوئی لیکن فوراً ہی وزن کرنے کی مشین پر

ہوگئے لال چکر جیسے ہی رکا اُنھوں نے چونّی ڈال دی۔ ہم دل ہی دل میں دُعائیں مانگ رہے تھے۔ یاخدا ہماری محبت کی چونّی کی لاج رکھنا۔ کھٹ سے ایک آواز آئی مگر ٹکٹ نہیں آیا۔ کرنل نے مایوسی میں پوری مشین کو جھنجھوڑ دیا مگر ٹکٹ نہ آنا تھا نہ آیا۔ ہم نے انھیں دلاسا دیا "مشین خراب معلوم ہوتی ہے، آپ دوسری مشین آزمالیں۔" دوسری مشین میں جیسے ہی انھوں نے سکّہ ڈالا، کئی آوازیں آئیں اور ٹکٹ ان کے ہاتھ میں آگیا۔ خوش خوش ہاتھ سے مگر ٹکٹ پر نظر پڑتے ہی ان کا چہرہ اُتر گیا۔ ڈاکٹر بیری نے دریافت کیا "کیوں کرنل صاحب! وزن بہت بڑھ گیا ہے نا؟ اب آپ کو اپنی خوراک پر توجہ دینی چاہیے۔" کرنل جھلائے ہوئے کہنے لگے "بھئی اس ٹکٹ پر صرف قسمت کا حال لکھا ہے، وزن کا ہندسہ پڑھا ہی نہیں جاتا۔" ہم نے عرض کیا "پڑھا نہیں جاتا تو یقیناً کتابت کی غلطی ہوگی۔ کرنل صاحب، ابھی ایک چونّی باقی ہے تیسری مشین پر بھی ٹرائی کر لیجیے۔"

خدا خدا کر کے تیسری مشین نے جو ٹکٹ اُگلا اس پر قسمت اور وزن دونوں ہی کا غلط حال روشن حرفوں میں درج تھا۔ "کرنل صاحب، یہاں وزن کروانے کی مشین اور پبلک ٹیلی فون کا ایک سا حال ہے۔ تین سکّوں میں ایک کام بنتا ہے" ہم نے انھیں بتایا۔

ابھی چند قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ہمارے آگے دنیا کا سب سے عجیب و غریب جوڑا (اور وہ بھی انسانوں کا) جا رہا ہے۔ سفید قمیص، سیاہ پتلون اور جوتے سیاہ جسم پر پہنے ہوئے کوئی صاحب تھے جو اس طرح چل رہے تھے جیسے ابھی ابھی پورا ریلوے اسٹیشن خرید ا ہو۔ ان سے ایک قدم پیچھے خوبصورتی کی حدوں کو چھوتی ہوئی ایک خاتون تھیں جو اپنے نازک ہاتھوں میں جہازی سائز کا بریف کیس اُٹھائے چل رہی تھیں۔ ہم نے شرارتاً کہا "کرنل صاحب! دیکھیے کتنی فرماں بردار اور سعادت مند بیوی ہے جو شوہر کا سارا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے۔" کرنل نے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی جہاندیدہ بزرگ کسی نادان بچّے کو دیکھتا ہے۔ فرمانے لگے "حضرت! فرماں برداری اور سعادت مندی تو شوہروں کی پالیسی ہے۔ یہ خاتون اس شخص کی بیوی ہو ہی نہیں سکتی۔ بلکہ میں تو ان حضرت کی چال دیکھ کر یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کوئی بھی خاتون زیادہ دن تک ان کی بیوی نہیں رہ سکتی۔"

ہم چپ ہو گئے۔ اور کیوں نہ ہوتے اس لیے کہ اب ہم نے ان کی شکلیں دیکھ لی تھیں۔ وہ ایڈوکیٹ حمادی تھے اور ان کا بریف کیس تھامے جو محترمہ تھیں اُن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ان کی سکریٹری بھی ہیں۔

ابھی ہم تینوں پلیٹ فارم نمبر ایک پر ہی تھے اور منزلِ مقصود یعنی چرچ گیٹ جانے والی ٹرین پلیٹ فارم نمبر دو پر آئی تھی۔ وہاں جانے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ پٹریوں سے ہو کر جاتا تھا اور دوسرا برج سے۔ اور دونوں ہی راستوں پر مسافروں کا ہجوم رواں دواں تھا۔ کرنل شرما نے برج کے اوپر پہنچ کر پلیٹ فارم نمبر دو پر کھڑے تقریباً ہزاروں آدمیوں کو دیکھا تو حیرت سے کہنے لگے "یہ رش دیکھ کر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے ٹرین چرچ گیٹ نہیں بنارس جائے گی اور ہر ایک مسافر کو الوداع کہنے کے لیے پندرہ رشتہ دار جمع ہیں؟" ہم نے مسکراتے ہوئے کہا "کرنل صاحب! بنارس تو نہیں، البتہ ان میں سے بہت سے لوگ باندرہ، اندھیری اور دادر جائیں گے۔ اور انھیں الوداع کہنے کون آسکتا ہے؟ بمبئی کے مضافات میں رہنے والے خاندان کا تقریباً ہر فرد صبح کو اپنی یاترا پر نکل جاتا ہے اور شام کو ہی پنچھیوں کی طرح گھر لوٹتا ہے۔"

ابھی ہم برج کی آخری سیڑھیاں اُتر ہی رہے تھے کہ دیکھا پلیٹ فارم نمبر ایک سے ایک خوش پوش نوجوان نے

پٹریوں پر چھلانگ لگائی تاکہ وہ پٹریوں کو پار کرکے پلیٹ فارم نمبر دو پر پہنچ جائے۔ ابھی وہ دوسری لائن پر پہنچا ہی تھا کہ سامنے سے آتی ہوئی ٹرین نے زور سے ہارن بجایا۔ وہ مارے گھبراہٹ کے پلیٹ فارم پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا مگر تنگ پتلون کی وجہ سے ایک بار ناکام ہوگیا۔ ٹرین نے پھر ہارن بجایا، اس نے سراسیمگی کے عالم میں پلیٹ فارم پر کھڑے لوگوں کی طرف مدد کے لیے ہاتھ بڑھایا مگر کسی نے اس خیال سے اس کا ہاتھ نہیں تھاما کہ خود ہی لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ اب ٹرین نے بہت زوردار آخری سیٹی بجائی۔ پلیٹ فارم پر کھڑی بہت سی عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ چشم زدن میں پلیٹ فارم نمبر دو پر کھڑے ہوئے ایک آدمی نے جھک کر اس نوجوان کا ہاتھ پکڑا اور اُسے اُوپر پلیٹ فارم پر کھینچ لیا۔ اگلے ہی سیکنڈ ٹرین ہارن بجاتی ہوئی تیزی کے ساتھ وہاں سے گزر گئی اور اسٹیشن پار کرگئی شاید وہ فاسٹ ٹرین تھی اور اُسے یہاں رُکنا نہیں تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہو رہا تھا۔

"پلیٹ فارم نمبر دو کے کناروں سے دور ہٹ جائیں۔ فاسٹ ٹرین 'پاس' ہونے والی ہے۔"

پلیٹ فارم پر چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں۔ سبھی اس شخص کی تعریف کر رہے تھے جس نے نوجوان کی مدد کی تھی۔ کرنل شرما کیوں چپ رہتے۔ فرمانے لگے "مجھے تو یہ شخص سماجی کارکن معلوم ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر بیری نے حسبِ عادت ان کی بات کاٹی "لیکن سماجی کارکن اتنے بہادر کہاں ہوتے ہیں؟"

کرنل نے فوراً ان کی تصحیح کی "ارے بھائی میں تو یہ کہہ رہا تھا وہ نوجوان جس نے ریلوے لائن کراس کی وہ مجھے سماجی کارکن معلوم ہوتا ہے۔"

"وہ کیسے؟" ہم نے استعجاب سے کہا۔

"وہ ایسے کہ سماجی کارکن عموماً زندگی میں شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ برج کراس نہیں کرتے ریلوے کی پٹریوں کے بیچ سے گزرنا پسند کرتے ہیں اور اسی شارٹ کٹ میں کبھی کبھی خودکشی کر جان جان آفریں کے سپرد کر دیتے ہیں۔" کرنل نے ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر ہمیں سمجھایا۔

ہم پلیٹ فارم پر جس جگہ کھڑے تھے وہاں فرسٹ کلاس کا ڈبہ آکر رُکتا تھا۔ اس کے ساتھ لیڈیز کے ڈبے بھی لگتے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے وہاں بہت سی فرسٹ کلاس خواتین بھی کھڑی مسلسل ایک دوسرے سے باتیں کیے جا رہی تھیں۔ شمال کی سمت یعنی جہاں خواتین تھیں اُس طرف سے ٹرین کو بھی آنا تھا۔ لوگ بے چینی سے اسی سمت میں دیکھ رہے تھے۔ ڈاکٹر بیری سے رہا نہیں گیا۔ فرمانے لگے "سمجھ میں نہیں آتا یہ لوگ اس قدر اضطراب کے ساتھ ٹرین کی راہ تک رہے ہیں یا اس فیشن پریڈ کا لطف اُٹھا رہے ہیں؟"

"بھئی یہ پتہ لگانا تو بہت آسان ہے کہ کون کیا دیکھ رہا ہے" کرنل مسکراتے ہوئے کہنے لگے۔ عورت کی نیت اس کی اداؤں سے اور مرد کی نیت اس کی آنکھوں سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اب ان لوگوں ہی کو دیکھئے۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں ہوس کی چمک ہے تو کچھ نگاہوں میں حسد جھلک رہا ہے۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہوسناک [illegible] عورتوں پر مرکوز ہیں اور مایوس نظریں ٹرین کی متلاشی ہیں؟" ڈاکٹر بیری نے مزید وضاحت طلب کی۔

"بالکل ٹھیک" کرنل [illegible] ہمدردی کے ساتھ مسکرائے۔

"آپ تجزیہ [illegible] بہت جلد [illegible] کرتے ہیں" کرنل نے [illegible] اسے انگریزی میں نتیجے پر چھلانگ لگانا

JUMP TO THE CONCLUSION کہتے ہیں لیکن آپ بھی کیا کر سکتے ہیں' ڈاکٹر جو ٹھہرے۔ میں یہ عرض کر رہا تھا جناب کہ دراصل خواتین کا نظارہ کرنے والوں کی آنکھوں میں حسرت اور مایوسی ہے کہ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے اور جن لوگوں کی آنکھوں میں بے بسی ہے وہ ٹرین کے منتظر ہیں کہ ہر شخص کو پہلی ٹرین میں جگہ چاہیئے کہ یہی ٹرین انھیں ان کے ذریعۂ معاش تک پہنچائے گی؟

اتنے میں اناؤنسر نے لاوڈ اسپیکر پر شستہ ہندی میں کچھ اعلان کرنا شروع کیا ادھر پلیٹ فارم نمبر چار سے ایک تیز رفتار ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی گذری اور اس نے ہیں اس اعلان کی چوٹ سے بچا دیا۔

اس ریلوے اناؤنسر کو تو دور درشن پر ملازم ہونا چاہیئے تھا۔ اس کی زبان سچ مچ بڑی پیاری ہے؟ ڈاکٹر بیری نے آہستگی سے کہا کہ کوئی اور نہ سن لے۔

میرا تو خیال ہے کہ ریڈیو کی ملازمت کہیں بہتر ہے۔ وہاں شکل وصورت کوئی نہیں دیکھتا۔ بلکہ آج کل ریڈیو والے تو بدشکل اور بدصورت امیدواروں کو ہی ترجیح دیتے ہیں کہ کل کو یہ دور درشن جانے کے لیے نہیں مچلے گا۔ کرنل نے نیا نکتہ پیش کیا۔

اچانک پلیٹ فارم پر ایسی ہلچل شروع ہوگئی جیسے کسی بھری بھری سڑک پر کوئی فلمی ستارہ آنکلا ہو۔ غالباً ٹرین آرہی تھی۔ مگر جب سب کی محبوب ومطلوب ٹرین پلیٹ فارم پر آئی تو اس کی حالت قابلِ دید ہرگز نہیں تھی۔ دروازے کھڑکیاں اور چھت سبھی جگہوں پر لوگ اس بری طرح چمٹے ہوئے تھے کہ چلتی ٹرین کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے چیونٹیاں شکر کے دانے کو اٹھائے چلی جارہی ہوں۔ جو لوگ چھت پر بیٹھے تھے وہ تو پھر بھی سالم کے سالم اور خوش وخرم دکھائی دے رہے تھے باقی کسی کا سر کسی کا دھڑ تو کسی کے بازو کی جھلک دکھائی دیتی تھی ہم تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں فیصلہ ہوگیا کہ یہ ٹرین چھوڑ دیں گے۔ ٹرین رکی تو مجمع دیوانوں کی طرح اس پر لپکا اور لوٹ کھسوٹ شروع ہوگئی ایسا لگتا تھا کہ فقیروں کا جم غفیر ہے جو کسی کم ظرف سے پھینکی جانے والی روٹی پر لپک رہا ہو یا گرتی ہوئی کٹی پتنگ کی ڈور پکڑنے کی کوشش بہت سے بچے کر رہے ہوں۔ بمشکل سیکڑوں لوگ مزید اس ٹرین پر سوار ہوگئے اور ٹرین رینگنے لگی۔

پتہ نہیں کیسا مبارک دن تھا وہ۔ ایک کے بعد ایک کئی ٹرینیں آئیں رکیں' کچھ لوگوں کو مقناطیسی کشش نے سلے دروازوں کھڑکیوں پر چپکا یا اور آگے بڑھ گئیں۔ ہماری ہمت ہی نہیں ہوئی کہ اپنے معزز مہمانوں کو اس آزمائش میں ڈالیں۔ غالباً پانچویں ٹرین جو آئی وہ قدرے خالی تھی یعنی وہ صرف اندر سے بھری ہوئی تھی ابھی باہری حصوں پر آدمیوں کی جگہ رنگ وروغن اور اشتہارات نظر آرہے تھے۔ ہم نے پلیٹ فارم پر موجود بھیڑ کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ ریلے میں ہمیں بھی بہا کر ٹرین کے اندر پہنچا دے۔ چنانچہ اس نے ہمیں چاروں طرف سے گھیر کر بڑی عزت اور احترام کے ساتھ دھکیلتے ہوئے کمپارٹمنٹ میں پہنچا دیا۔

جیسے ہی ہماری ٹرین چلی' ڈاکٹر بیری پسینہ پونچھتے ہوئے مجھ سے گویا ہوئے "بمبئی کی بس سروس تو ملک میں سب سے اچھی مانی جاتی ہے' پھر کیا بات ہے لوکل ٹرین کا اتنا برا حال ہے؟"

ہم سے کوئی جواب بن نہ پڑا تو عرض کیا "ہوسکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ لوکل ٹرین میں کنڈکٹر نہیں ہوتے۔ بمبئی کی بس سروس ظالم کنڈکٹروں اور تیز رفتار ڈرائیوروں کی بنا پر اتنی مقبول ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کی لوکل ٹرین میں کوئی کنڈکٹر نہیں ہوتا" کرنل شرما سانس درست کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "ورنہ اور بھی حال بُرا ہوتا۔ نہ جانے کتنی ٹرینیں اسٹیشن پر رُکے بغیر ہی آگے بڑھ جاتیں۔ کنڈکٹر اپنی مرضی سے خالی ٹرین کو بھی اسٹیشن سے ذرا پہلے یا ذرا آگے رُکوا دیتے اور اسٹیشن پر کھڑے مسافر مُنہ بھر ایک دوسرے کا منہ ہی تکتے رہتے۔

"وہ تو اب بھی ہوتا ہے" ہم نے کہا۔ "فاسٹ لوکل ٹرین صرف بڑے اسٹیشن پر رکتی ہے یا پھر وہ چھوٹے اسٹیشنوں کے بیچ میں کہیں رُک کر آرام فرمانے لگتی ہے۔"

ہماری تیز رفتار ٹرین اب دھیمی ہو رہی تھی۔ گورے گاؤں اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ کرنل شرما نے پھلجھڑی چھوڑی "اسٹیشن آ رہا ہے، پھر لوگوں کا ریلا اندر آنے والا ہے۔ آیئے ہم تینوں ایک دوسرے کو آخری بار دیکھ لیں۔ الوداع دوستو الوداع۔"

ہمارے منہ سے ابھی ہنسی نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ نہ جانے کتنے لوگ دھڑدھڑا کر بھرتے ہوتے کمپارٹمنٹ میں گھس آئے۔ کسی کی سسکاری نکلی، کوئی غرّایا تو کسی نے زیرِ لب آنے والوں کی کئی پشتوں کو دعائیں دے ڈالیں۔ ٹرین نے پھر رفتار پکڑ لی۔ ہم نے اِدھر اُدھر دیکھا، کرنل اور ڈاکٹر سچ مچ غائب ہو چکے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ کہاں ہیں؟" ہم نے آواز لگائی۔ جواب فوراً آیا مگر ایسا لگا ٹیلی فون پر کوئی بہت دُور سے کہہ رہا ہے "بھئی میرا ایک پیر بُری طرح کچل گیا ہے۔ بنا ایکسرے کروائے بتا نہیں سکتا فریکچر ہے یا نہیں"۔ یہ یقیناً ڈاکٹر صاحب کی آواز تھی۔ ہم نے انھیں دلاسا دیا۔ "ڈاکٹر صاحب گھبرایئے مت۔ ہمارا بھی ایک ہاتھ بُری طرح پھنسا ہوا ہے، چھوٹتا ہی نہیں"۔ اتنے میں کسی کونے سے کرنل نے گرہ لگائی "ارے بھائی اس بھیڑ میں ہماری تو حسِ مزاح ہی دب کر رہ گئی ہے۔"

کئی لوگ ہنس دیئے اس لیے کہ ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جو حسِ مزاح کے معنی جانتا ہو لیکن ہنسنے کے لیے اس کے معنی جاننا ضروری بھی تو نہیں ہوتے۔

چلتی ٹرین سے بھینسوں کے کئی طبیلے نظر آئے اور اسی کے ساتھ نتھنوں میں ایک جانی پہچانی تیز بو در آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جوگیشوری قریب آ رہا تھا۔ ہماری ٹرین جوگیشوری رُکنے کے بعد ان اسٹاپ تیز رفتار ٹرین ہونے والی تھی جیسے پورے گیارہ اسٹیشنوں پر رُکے بغیر سیدھے سنٹرل اسٹیشن پر رُکنا تھا یعنی اب صرف جوگیشوری پر بھیڑ کے چڑھنے اُترنے کا مزہ چکھنا تھا۔ جنھیں نہیں اُترنا تھا وہ اپنی جگہ ڈٹے ہوئے تھے۔ اُترنے والے اپنے جوتوں، کہنیوں اور کمریوں کی مدد سے دوسروں کو ہٹاتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

بہت کم لوگ جوگیشوری میں سوار ہوئے۔ ٹرین کے اندر موجود مسافروں کی تو دلی خواہش یہی تھی کہ اب اس میں کوئی اندر نہ آئے۔ ایک گجراتی نوجوان بڑی تیزی سے کمپارٹمنٹ میں آیا اور آتے ہی ایک بہت موٹے سے آدمی کی توند سے ٹکرا گیا۔ دونوں کی نگاہیں ملیں تو نوجوان بدحواسی کے عالم میں کہنے لگا "ارے تم ہو بھائی سیٹھ معاف کرنا۔ تم کیا سیٹھ تو بہت دن کے بعد یہ گاڑی میں ملا سیٹھ"۔ بہت سے لوگ تانگوا لگ کے ساتھ ان دونوں کو دیکھنے لگے۔ موٹے آدمی نے چھوٹتے ہی اُس نوجوان کو ایک موٹی سی گالی دی۔ "اے آج اِدھر مل گیا تو سیٹھ سیٹھ بولتا ہے۔ ایک مہینے سے چار ہزار کا بل دبا کر بیٹھا ہے۔ وہ بھی دیتا ہے بول؟"

لوگوں کی ناگواری مسرت میں بدل گئی۔ چہرے دمکنے لگے نوجوان نے بے عزتی کے احساس سے ایک جھرجھری لی پھر ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولا "کانٹے کو بوم مارتا ہے سیٹھ دھکا دے گا۔ یہ سب دے دے گا؟" اتنا کہہ کر وہ بھیڑ کو چیرتا ہوا کمپارٹمنٹ کے دوسرے حصہ کی طرف بڑھ گیا۔

اب ٹرین کو سیدھے بمبئی سنٹرل پہنچنا تھا، اسی لیے اس کو فاسٹ ٹرین کا خطاب ملا تھا اور شاید اسی لیے وہ دھیمی رفتار سے رینگ رہی تھی۔ میرے پڑوس میں کھڑے صاحب نے اپنی چھتری کے ہینڈل سے میری کمر میں ایک ضرب لگاتے ہوئے کہا "ایکسکیوزمی! پلیز جانے دیجئے مجھے اندھیری اترنا ہے" اتنا کہہ کر میرے ہٹنے کا انتظار کئے بغیر اپنی چھتری دوبارہ چبھوتے ہوئے ذرا آگے بڑھ کر اگلے مسافر پر اپنا فارمولا آزماکر بولے "ایکسکیوزمی! ..."

اگلے مسافر نے جھنجھلا کر جواب دیا "پہلی بار یہ لوکل پکڑی ہے کیا؟ معلوم نہیں اس کا اندھیری اسٹاپ نہیں ہے؟" اس شخص پر جیسے بجلی گر پڑی "ارے پلیٹ فارم پر تو انڈی کیٹر میں سلو ٹرین SLOW TRAIN لکھا تھا۔ یہ کون سی گاڑی ہے؟"

"یہ ریل گاڑی نہیں ہے بھائی صاحب! ہوائی جہاز ہے۔ اب یہ سیدھے بمبئی سنٹرل پر لینڈ کرے گا" ایک آواز آئی اور بہت سے لوگ ہنسنے لگے۔

"کبھی نہیں سدھریں گے۔ معلوم نہیں کدھر سے آجاتے ہیں۔ اب مزہ آئے گا" یہ آواز ایک ٹائی والے کی تھی۔

"ارے بھائی گھبراؤ مت۔ بمبئی سنٹرل اتر کر دوسری ٹرین سے واپس آجانا گورٹ کے بدھوا اندھیری آئے؟"

"وہ نہیں تو یہی ٹرین میں بیٹھے رہنا۔ چرچ گیٹ جاکر یہ اندھیری واپس آئے گی" کھڑکی کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے زور سے صدا لگائی۔ لوگ پھر مسکرانے لگے۔

اب ٹرین کسی قدر رفتار سے ہارن بجاتی ہوئی اندھیری اسٹیشن کو پار کر رہی تھی۔ وہ غلط مسافر بے چارگی کے ساتھ اپنے اسٹیشن کو نگاہوں سے اوجھل ہوتا دیکھ رہا تھا۔

"بھیا ذرا مجھے دروازے کے قریب آنے دیجئے۔ شاید ٹرین کسی سگنل پر رک جائے تو میں وہیں اتر جاؤں گا"۔ اس نے دوسروں سے التجا کی۔

"اب یہ ٹرین نہیں رکنے والی"۔ دروازے پر کھڑے ایک جنٹلمین گویا ہوئے "آپ وہیں آرام سے کھڑے رہیئے اور ہمیں بھی یہاں اطمینان سے ٹھنڈی ہوا کھانے دیجئے"۔

وہ بے چارہ خاموش ہوگیا۔ چھتری کی مدد سے آگے بڑھنے کی ترکیب بھی شاید وہ بھول گیا تھا۔ اب باندرہ اسٹیشن سے ٹرین گذر رہی تھی۔ اچانک اس کی رفتار کم ہوگئی اور اس شخص کا چہرہ پرامید ہوگیا۔ شاید اس کی دعا قبول ہوئی اور ٹرین رک گئی اس نے مسافروں کو راستے سے ہٹایا اور دروازے پر پہنچ کر ادھر ادھر دیکھ کر پٹریوں پر چھلانگ لگادی۔ دروازے پر کھڑے جنٹلمین نے اسے انگریزی کی ایک مشہور گالی سے نوازا۔ ادھر سے کوئی جواب نہ آیا، شاید جلدی میں اس نے سنا نہیں۔ ٹرین ایک جھٹکے سے دوبارہ حرکت میں آئی اور فوراً ہی رفتار پکڑلی۔

"بہت لکی تھا سالا" ایک صاحب نے اس کی خوش قسمتی کا گلہ کیا اور "ٹائمز آف انڈیا" کھول کر پڑھنے لگے۔ ایک اور مسافر جو اسٹار اینڈ اسٹائل میں منہ چھپائے کھڑا تھا، کہنے لگا "معلوم نہیں" اس کو سچ مچ اندھیری اترنا تھا یا غلطی سے سیکنڈ کلاس کی بجائے فرسٹ کلاس میں آگیا تھا"

ہم نے اطراف میں نظر دوڑائی تو دیکھا اس اثنا میں میاں کرنل اور ڈاکٹر دونوں ہی ہمارے قریب پہنچ چکے تھے مگر ہماری طرح انھیں بھی کچھ ہوش نہ تھا۔ دونوں کا حلیہ بُری طرح بگڑ چکا تھا، اور شاید ہمارا بھی۔ ڈاکٹر بیری کی نظر ہم پر پڑی تو کہنے لگے "ایسا لگتا ہے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔" ہم نے کرنل صاحب کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "معاف کیجیے گا کہیں آپ کرنل شرما تو نہیں ہیں؟" کرنل صاحب خالی خالی نظروں سے ہم دونوں کو دیکھتے ہوئے بولے "جی نہیں۔ میں لوکل ٹرین کا فرسٹ کلاس مسافر ہوں اور یہ میرا آخری سفر ہے۔" ہماری پیشانی پہلے ہی پسینے سے بھیگی ہوئی تھی۔ عرقِ انفعال کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ ٹرین نے اپنی رفتار بڑھا دی تھی۔

"آپ مجھے یہ بتائیں کہ آخر آپ کی لوکل ٹرین کے فرسٹ کلاس اور سکنڈ کلاس میں فرق کیا ہے کہیں یہ سرمایہ دار اور مزدور والا فرق تو نہیں ہے"؟ ڈاکٹر بیری نے ہم سے دریافت کیا۔ ہم اس سوال کا بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے۔

"جی نہیں اگر ایسا ہوتا تو فرسٹ کلاس کے ڈبے میں الّو بول رہے ہوتے؟" ہم نے وضاحت کی۔ "لوکل ٹرین کے سیکنڈ کلاس میں بہت سے امیر سیٹھ بھی سفر کرتے ہیں اور فرسٹ کلاس میں بینکوں کے چپراسی بھی نظر آتے ہیں۔ اس لیے کم از کم سرمایہ دار اور مزدور والا امتیاز تو یہاں نہیں ہے؟"

"پھر اس ڈبے کا نام فرسٹ کلاس کیوں ہے؟ ہمیں تو اس میں اور دوسرے درجوں میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔" ڈاکٹر صاحب مطمئن نہیں تھے۔

"ایک فرق تو یہی ہے کہ اس ڈبے کی سیٹیں گدے دار ہیں۔ یہ گدّے اور گدیاں ہی ہمارے سماج میں کسی کو بھی درجۂ اول کا شہری بناتی ہیں۔ گدی کھینچ لیجیے۔ آدمی دوسرے تیسرے درجے کا ہو کر رہ جاتا ہے" ہم نے سمجھانے کی کوشش کی۔ "پھر فرسٹ کلاس میں تین آدمیوں کی سیٹ پر صرف تین آدمی بیٹھتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح کہ تیسرا آدمی شرمندہ شرمندہ سکڑ کر بیٹھتا ہے جب کہ سیکنڈ کلاس میں اتنی ہی جگہ میں چار آدمی بڑے مزے سے بیٹھتے ہیں؟"

"کوئی اور فرق بھی رہ گیا ہو تو بتا ڈالیے" ڈاکٹر بیری نے اصرار کیا۔ شاید وہ وقت کاٹنے کی خاطر سوال کر رہے تھے۔

"فرسٹ کلاس میں بہت سے لوگ صاف ستھرے کپڑے پہن کر آتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بریف کیس بھی لٹکا ہوتا ہے جس میں وہ لنچ باکس چھپا کر لے جاتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کے مسافر لنچ باکس کو پرانے اخبار میں لپیٹ کر ہاتھ میں رکھتے ہیں اور کوئی شرم محسوس نہیں کرتے۔"

"ذہنیت کا بھی تو فرق ہوتا ہوگا فرسٹ کلاس اور سیکنڈ کلاس کے مسافروں میں؟" کرنل شرما نے سوال داغا۔

ہم کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ مخالف سمت جانے والی ایک ٹرین کی گڑگڑاہٹ نے ساری آوازوں کو نیچا دکھا دیا۔ جاتی ہوئی ٹرین کے ایک سیکنڈ کلاس کے کمپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑے کچھ منچلوں نے ہمارے ڈبے سے متصل فرسٹ کلاس لیڈیز کمپارٹمنٹ میں کھڑی عورتوں کو دیکھ کر زور زور سے سیٹیاں بجائیں۔ مگر ٹرین کی تیز رفتاری کی وجہ سے یہ سیٹیاں اپنے نشانوں پر نہیں پہنچ سکیں۔

"دیکھا آپ نے ذہنیت کا فرق؟" ڈاکٹر بیری نے کرنل صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو کوئی فرق نہیں ہوا" کرنل کہاں ماننے والے تھے۔ کہنے لگے "بے چارے فرسٹ کلاس کے مردوں کا بھی جی چاہتا ہے کہ سامنے والی کھڑکی کی طرف منہ کر کے سیٹیاں بجائیں مگر فرسٹ کلاس کا لیبل انھیں روک دیتا ہے۔"

انھیں آپ سیکنڈ کلاس کے دروازے پر پہنچا دیجیے۔ رُکی ہوئی سیٹیاں خود ہی باہر نکل آئیں گی۔"

ہماری ٹرین حیرت انگیز طور پر کئی منٹوں سے تیز رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ کمپارٹمنٹ کے آخری سرے پر کچھ لوگ بیٹھے رمی کھیل رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ زور زور سے باتیں کرتے جاتے تھے قہقہے اڑا رہے تھے اور خوب شور مچا رہے تھے۔ بہت سے لوگ انھیں گھیر کر کھڑے تھے اور خاموشی سے ان کا کھیل دیکھ رہے تھے کرنل سے نہیں رہا گیا، پوچھنے لگے "یہ کون سا کھیل ہو رہا ہے"؟

"جی، وہ لوگ تاش کھیل رہے ہیں"۔ ہم نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"اچھا۔ تب تو غالباً تاش دنیا کا واحد کھیل ہے جس میں تماشائی خاموشی سے کھیل دیکھتے ہیں اور کھلاڑی شور مچاتے ہیں"۔ کرنل نے مفکرانہ انداز میں کہا۔ ایک صاحب جو ہمارے قریب کھڑے ہماری باتیں غور سے سُن رہے تھے، فرمانے لگے "نہیں صاحب یہ گجراتی لوگ خالی بیلی چلاتا ہے۔ ان کو گجرات میں شور مچانے نہیں ملتا تو بمبئی میں آکر گلا پھاڑتا ہے"۔

ہم نے سوچا ضرور کسی گجراتی نے ان کا دل دکھایا ہے یا قرض لے کر غائب ہوگیا ہے جو یہ اپنے دل کی بھڑاس یوں نکال رہے ہیں۔

ہمارے قریب ہی کچھ کالج کے طالب علم کھڑے تھے جو مسلسل فلمی باتیں کر رہے تھے چنانچہ لوگ بڑے انہماک سے انھیں سُن رہے تھے۔ ظاہر ہے اگر وہ علمی باتیں کرتے تو انھیں کون سُنتا۔ اتنے میں ایک لمبے بالوں والے مسافر نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹکا تو ایک طالب علم کے چشمے پر تیل کی نئی لکیریں بن گئیں۔ وہ جھنجھلا کر کہنے لگا تمہاری گردن کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہے کیا۔ دکھائی نہیں دیتا، پیچھے لوگ کھڑے ہیں؟"

تیل چپڑا ہوا آدمی شاید پہلے سے جلا بھنا کھڑا تھا کہنے لگا "آرام سے ٹراول کرنے کا ہے تو ٹیکسی میں جاؤ ہم کیا کرے گا۔ اِدھر یہ بھائی نے سر پیچھے کیا تو ہم کو لگا تو ہم نے بھی سر پیچھے کیا تو تم کو لگا۔ اب تم کو لگا تو تم بھی سر پیچھے کر لو حساب برابر"۔ یہ سُن کر کچھ لوگ ہنس دیئے۔ وہ طالب علم ابھی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ مگر چند ہی سیکنڈ میں اس کے ساتھی کو بدلہ لینے کی ترکیب سوجھ گئی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک چپت تیل چپڑے ہوئے آدمی کے سر پر جمادی۔ وہ غصّے میں جیسے ہی پلٹا، اس نے جلدی سے کہا "ہم کیا کرے گا۔ ہمارے پیچھے والے کا ہاتھ ہمارے سر پر لگا تو ہمارا ہاتھ تمہارے سر پر لگ گیا۔ اب تم اپنے آگے والے سے حساب برابر کر لو"۔

معاً پھر ایک تیز بو ہمارے دل و دماغ کو معطر کر گئی۔ کسی نے رومال کا سہارا لیا۔ دیکھا دیکھی کئی رومال جیب سے نکل کر ناک پر چپک گئے۔ ٹرین باندرہ اور ماہم کے بیچ سے گذر رہی تھی۔ کچھ لوگ ریلوے لائن کے کنارے بیٹھے، صبح بیدار ہونے کے بعد اپنی پہلی ضرورت پوری کر رہے تھے۔ کرنل فرمانے لگے "آپ کے شہر میں تو سُنا ہے سڑک پر تھوکنے والوں پر بھی جرمانہ عاید ہونے والا ہے مگر میں دیکھ رہا ہوں تو لوگ اس سے بھی بڑا جُرم کر رہے ہیں"؟

"کرنل صاحب، سڑک پر تھوکنے والوں کو پکڑ کر جرمانہ وصول کرنا آسان ہے اس لیے کہ ان کی تعداد بہت کم ہے مگر ان بڑے مجرموں کی تعداد ہمارے شہر میں بہت زیادہ ہے۔ انھیں پکڑنا مشکل کام ہے اور پریشان کن بھی۔ پھر ان کے پاس جرمانہ ادا کرنے کے لیے پیسہ بھی نہیں ہے"۔ ہم نے پھر اپنے شہر کی وکالت کی۔

ٹرین کی رفتار اچانک کم ہوگئی اور کچھ دُور جاکر بالکل ختم ہوگئی۔ ذرا سی دیر میں پھر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

"آج کل کوئی ٹرین ٹائم پر چلتی ہی نہیں۔"

"ایک ٹرین تو ٹائم پر چلا نہیں سکتے۔ بات اکیسویں صدی میں جانے کی کرتے ہیں۔"

"آج یہ حالت ہے۔ دس برس کے بعد کیا ہوگا؟"

اتنے میں دروازے پر کھڑے ہوئے کسی مسافر نے اطلاع دی۔ "ہوگئی چھٹی۔ کوئی آدمی اپنی ٹرین سے کٹ گیا ہے۔" لوگوں کو ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا۔

"یہ لوگ سالے کو اتنا گردی میں ٹرین پکڑتا ہے۔ یہ ٹرین چھوڑ دیتا تو گرتا تو نہیں۔"

"معلوم نہیں کدھر سے مرنے کو آجاتا ہے سب کا ٹائم کھوٹی کرتا ہے۔ ایک آدمی کے واسطے اتنا پبلک لیٹ ہو جائے گا۔"

"ایک تو ٹرین پہلے ہی لیٹ تھی۔ اوپر سے یہ پرابلم"!

"ارے مرنا ہی تھا تو ایک آدھ PEAK HOUR ہی کیوں؟ دوپہر کا ٹائم چننا تھا میرے یار۔"

اتنی سی دیر میں اسٹریچر پر زخمی کو لے جایا جا چکا تھا۔ لوگ ٹرین سے جھک جھک کر تماشا دیکھ رہے تھے اور ٹرین کے چلنے کی دُعا مانگ رہے تھے۔ گارڈ نے وسل دی اور آہستہ آہستہ ٹرین چلنے لگی۔ لوگوں نے ایک لمبی چین کی سانس لی۔ تاش کے کھلاڑیوں نے پھر شور مچانا شروع کر دیا۔

اب ہماری ٹرین دادر سے نکل چکی تھی۔ بمبئی سنٹرل اسٹیشن پہنچنے میں ابھی چار اسٹیشنوں کا "نان اسٹاپ" سفر باقی تھا۔ ہمیں اپنی پیٹھ پر کچھ زائد بوجھ کا احساس ہوا تو ہم نے پلٹنے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔ ڈاکٹر بری مسکراتے ہوئے گویا ہوئے "کوئی صاحب آپ کی پیٹھ پر شاید سجدہ کر رہے ہیں"۔ کرنل نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اس نیک بندے کو ہلایا تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے سیدھے کھڑے ہوگئے۔ کرنل مجھ سے کہنے لگے،

"تھوڑی دیر پہلے ایک صاحب اپنی نوکیلی تھوڑی سے ہمارا کندھا کھجانے کی کوشش کر رہے تھے" اور دیکھئے ڈاکٹر بری نے ہمیں اپنی قمیص کی آستین دکھائی "ایک اور فرسٹ کلاس پسنجر بہت دیر تک اپنی پیشانی کا پسینہ ہماری آستین میں ٹرانسفر کرتے رہے ہیں"۔

کمپارٹمنٹ کے دوسرے دروازے کے قریب کوئی چیخا "واٹ نان سنس۔ دھکا بھی مارتے ہو اور میرے پیر پر بھی کھڑے ہو گئے ہو۔ دُور ہٹو"۔

"میں کیا کروں بھائی۔ جگہ ہی نہیں ہے"۔ دوسری آواز آئی "میں تو خود بہت دیر سے ایک ہی پیر پر تھا۔ اب دوسرا پیر رکھا تو آپ کو لگ گیا"۔

"جگہ نہیں ہے تو میرے سر پہ بیٹھ جاؤ۔ نہیں تو چپ چاپ ایک پیر پہ ہی کھڑے رہو۔ بمبئی سنٹرل پہ جگہ ہو جائے گی تو دوسرا پیر بھی رکھ لینا۔"

اندر بیٹھے تاش کے کھلاڑیوں میں سے کوئی چلایا۔ "ارے صبح صبح کائے کو ڈسٹرب کرتے ہو۔ لڑنا ہے تو دونوں نیچے اُتر جاؤ"۔

سب کھلاڑیوں نے قہقہہ لگایا، دونوں فریق خاموش ہو گئے۔ بمبئی سنٹرل اسٹیشن قریب آ رہا تھا۔ ہمارے

کمپارٹمنٹ کے دروازے کے قریب ایک پستہ قد شخص کھڑا بہت دیر سے جمائیاں لے رہا تھا۔ شاید وہ رات بہت جاگا تھا اور صبح ٹرین میں آرام کر رہا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اب کی بار جیسے ہی اس نے پورا منہ کھول کر آکسیجن اندر کھینچی، ٹھیک اسی وقت ساتھ لٹکے ہوئے آدمی نے اس کے چہرے کے قریب ایک زوردار چھینک ماری اور اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے۔ وہ چھینک اس کے کھلے ہوئے منہ میں بم کی طرح پھٹی تھی۔ آس پاس کھڑے سبھی لوگ ساکت و جامد ہو گئے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ٹریجڈی ہے یا کامیڈی! اسی وقت ٹرین بمبئی سنٹرل پر رکی اور لوگوں کا جم غفیر چھینک اور جمائی دونوں کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اسٹیشن کی بروقت آمد نے ایک اور جنگ کا خطرہ ٹال دیا تھا۔

بمبئی سنٹرل پر ٹرین کافی دیر رکی رہی۔ شاید موٹر مین تھک گیا تھا۔ پلیٹ فارم پر ٹھیک فرسٹ کلاس کے ڈبے کے سامنے کئی ٹکٹ چیکر کھڑے اپنا فرض خوش اسلوبی سے انجام دے رہے تھے۔ ایک ٹکٹ چیکر نے دو دیہاتیوں کو پکڑ رکھا تھا اور انھیں سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ فرسٹ کلاس کے ڈبے سے اترے ہیں اور ان کے پاس ٹکٹ سیکنڈ کلاس کے ہیں اس لیے انھیں جرمانہ بھرنا پڑے گا۔ ایک بوڑھے سے ٹکٹ چیکر نے بیک وقت تین خواتین کو روک رکھا تھا اور وہ تینوں بڑی جانفشانی سے اپنے اپنے بیگ کے اندر رکھے خزانے میں اپنا "پاس" تلاش کر رہی تھیں۔ کچھ لوگ کینٹین پر کھڑے جلدی جلدی سموسہ نگل رہے تھے۔ بک اسٹال پر تعلیم یافتہ لوگوں کی بھیڑ تھی۔

ٹرین جیسے ہی چلی، ایک نوجوان ٹکٹ چیکر ہمارے کمپارٹمنٹ میں آگیا۔ آتے ہی اس نے تمام مسافروں کا عقابی نظروں سے جائزہ لیا۔ چار پانچ لوگوں کے ٹکٹ چیک کئے تھے کہ ایک صاحب نے آگے بڑھ کر اسے "ہلو" کیا اور پھر دوستانہ لہجے میں کہنے لگے "کمال ہے صاحب، میں آپ کو ہمیشہ دیکھتا ہوں آپ صرف کچھ لوگوں کو چیک کرتے ہیں، باقی کو چھوڑ دیتے ہیں"۔ نوجوان ٹکٹ چیکر ایک دم خوش ہو گیا۔ فخریہ لہجے میں کہنے لگا "ہماری نظر بنا ٹکٹ مسافر یا سیکنڈ کلاس کے پسنجر کو ایک سیکنڈ میں تاڑ لیتی ہے اسی لیے ہر ٹرین میں کوئی نہ کوئی شکار ہاتھ لگ ہی جاتا ہے"۔

کافی دیر تک ان دونوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ گرانٹ روڈ کے بعد چرنی روڈ اسٹیشن آیا تو وہ ٹکٹ چیکر ان صاحب سے گرم جوشی سے مصافحہ کر کے اتر گیا۔ اب جو ٹرین چلی تو وہی صاحب اپنے دوست کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہنے لگے "دیکھا کتنا ہوشیار بنا پھرتا تھا۔ اتنی دیر تک مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ میرے پاس فرسٹ کلاس تو کیا سیکنڈ کلاس کا بھی پاس نہیں ہے"۔

ڈاکٹر بیری سے نہ رہا گیا۔ اسی سفید پوش شریف آدمی سے پوچھنے لگے۔ "غالباً آپ اپنا پاس آج گھر بھول گئے ہیں؟"

اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا "نہیں صاحب پچھلے چار برس سے میں روزانہ بلا ٹکٹ فرسٹ کلاس میں سفر کر رہا ہوں۔ صرف دو بار پکڑا گیا۔ کل خرچہ آیا پچاس روپے۔ ہے نا فائدے کی بات؟"

ہم سب خاموش ہو گئے۔ شاید ہم تینوں ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ آج ہم نے ایک گھنٹے کے سفر کے اٹھاون روپے ادا کئے تھے اور یہ شخص پچاس روپے خرچ کر کے چار برسوں سے سفر کر رہا ہے۔

ہمارے ساتھ سبھی لوگ اس کی قسمت پر رشک کر رہے تھے۔ سبھی کو افسوس تھا کہ یہ ترکیب اور پہلے انہیں کیوں نہ ملی۔

میرین لائن اسٹیشن آیا تو کافی لوگ اُتر گئے۔ پھر بھی ہمیں بیٹھنے کی جگہ نہیں ملی۔ اب ایک ہی اسٹیشن باقی رہ گیا تھا اس لیے تاش کے پتے جلدی جلدی تقسیم کئے جا رہے تھے کہ ایک بازی اور ہو جائے۔ ایک صاحب رونی صورت بنائے کپڑوں پر بے شمار شکنیں لیے کھڑے تھے۔ بال ان کے بکھرے ہوئے تھے۔ کرنل نے سرگوشی کی "دیکھئے اس شخص نے بھی ایک پیر پر کھڑے ہو کر سفر کیا ہے"؟

"وہ کیسے؟" ہم نے حیرت سے پوچھا۔

کہنے لگے "دیکھئے" اس کا ایک جوتا چمک رہا ہے"؟

ہم نے اپنے حلیوں پر نظر ڈالی۔ تینوں ایک سے بڑھ کر ایک فقیر نظر آ رہے تھے جنھوں نے اس سفر میں تجربات کی بے بہا دولت سمیٹی تھی۔ چرچ گیٹ پر ٹرین جیسے ہی رکی سارے قیدی چھوٹ کر بھاگے۔ ابھی لوگوں کو آفس پہنچنے کے لیے شاید کچھ اور مرحلے طے کرنے تھے۔ تاش کے کھلاڑی اب پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے اپنی آخری بازی پوری کر رہے تھے۔ کرنل نے ہم دو درویشوں سے پوچھا۔

"اچھا بتائیے وہ کون سی چیز ہے جو ہندوستان کے تمام ریلوے اسٹیشنوں پر پائی جاتی ہے اور ہر جگہ ایک جیسی ہوتی ہے؟"

"ریل کی پٹری" ڈاکٹر صاحب فوراً بولے۔

"پلیٹ فارم!" ہم نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔

"دونوں غلط" کرنل نے مسکراتے ہوئے ارشاد کیا۔ "وہ چیز جو ہندوستان کے تمام ریلوے اسٹیشنوں پر ایک جیسی ہوتی ہے، اس کا نام ہے چائے" یقین نہ آئے تو چلئے ہم آپ کو چرچ گیٹ کی چائے پلاتے ہیں"

اور ہم تینوں تھکے تھکے قدموں سے کینٹین کی طرف چل دیئے۔

بہادر آیتم اللہ

(حیدرآباد)

انجمن زن مُریداں

[زن مُریدوں سے معذرت کے ساتھ]

پچھلی جمعرات ہم مرزا حماقتی سے ملنے اُن کے حماقت کدہ پہنچے اور مرزا کو آواز دی حسبِ معمول مرزا پہلی ہی آواز پر برق رفتاری سے دریچہ میں نمودار ہوئے اور ملتجیانہ انداز میں سرگوشی کی "بھائی ذرا آہستہ ابھی ہماری بیوی صاحبہ گھر پر موجود ہیں وہ سن لیں گی تو قیامت قبل از وقت نازل ہو جائے گی کچھ دیر انتظار کیجیے" اتنا کہہ مرزا غائب ہو گئے۔ مرزا پر ان کی بیوی صاحبہ کا اتنا کنٹرول ہے کہ وہ سانس بھی بغیر بیوی صاحبہ سے پوچھے نہیں لیتے ماں کی خدمت یا بھائی بہن سے ملنا تو دور کی بات ہے۔ چہل قدمی کے دوران بیوی صاحبہ بھوت کی طرح سوار رہتی ہیں آج تک مرزا کو کسی عزیز و اقارب دوست احباب کے دُکھ درد میں شریک ہونے کی اجازت نہیں ملی۔ ہم مرزا کے گھر کی کھڑکی کے زیرِ سایہ کھڑے اُن کا انتظار کر رہے تھے کہ اندر سے مرزا کی آواز آئی دیکھے سُنا وہ اپنے روتے ہوئے بیٹے سے دریافت کر رہے تھے "بیٹا کیوں رو رہا ہے"؟ بیٹے نے کہا "مجھے ماں نے مارا ہے" ارشاد ہوا "بے وقوف کہیں کے اس میں رونے کی کیا بات ہے، کبھی مجھے روتے ہوئے دیکھا ہے" واقعی مرزا کی قوتِ برداشت کا جواب نہیں۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ کسی نے مرزا سے پوچھا تھا کہ "مرزا صاحب آپ کیا کام کرتے ہیں"؟ تو مرزا نے فخریہ انداز میں جواب دیا "وہی جو میری بیوی صاحبہ کہتی ہیں"۔ زن مریدی اور فرمانبرداری کا مجسمہ مرزا حماقت الدین عرف مرزا شادی کے بعد سے قیدِ بامشقت بھگت رہے ہیں۔ قیدیوں کو خوشی کے موقع پر رہائی نصیب ہوتی ہے لیکن مرزا کو اس جہنم میں رہنا لکھا تھا۔

خیر صاحب! مرزا کو جلدی اپنی بیوی صاحبہ سے چھٹکارا مل گیا اُن کی زوجہ محترمہ بن ٹھن کر گھر سے باہر آئیں اسکوٹر اسٹارٹ کر کے چلتی بنیں۔ مرزا بے چارے ڈرتے ڈرتے گھر سے برآمد ہوئے بعد از سلام و کلام ہم دونوں بلکہ اپنی منزل کو روانہ ہوئے راستہ میں رویندرا بھارتی ہال پر پولیس کا سخت پہرہ تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کوئی جلسہ منعقد ہو رہا ہے جلسہ کے لیے پولیس کا اتنا سخت پہرہ تشویش ہوئی باب الداخلہ کے قریب پہنچے تو ہال کے دروازے پر کھڑے آدمی نے سوال کیا "دنیا کا سب سے خطرناک ہتھیار کونسا ہے" مرزا نے جھٹ سے جواب دیا: "جی بیلن" اور ہمیں فوراً ہال کے اندر داخلہ کی اجازت مل گئی۔ مرزا کے نزدیک بیلن ایٹم بم سے زیادہ خطرناک ہتھیار تھا۔ تجربہ کی بات ہے۔

اسٹیج کے پاس ہی دو خالی نشستیں مل گئیں اور ہم براجمان ہو گئے۔ جلسہ کی کارروائی کے آغاز پر معلوم ہوا کہ چند بہادر، نڈر، جیوٹ اور دلیر قسم کے زن مریدوں نے بیویوں کے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے ایک تنظیم "انجمن زن مریداں" کی بناڈالی ہے عہدہ داران انجمن کے نام (جوکہ بلا مقابلہ منتخب ہوئے) کا اعلان کیا گیا جو حسب ذیل ہیں:-

جناب خونخوار خان صاحب صدر۔ جناب دلیر خان صاحب۔ جناب شمشیر صاحب شریک صاحب۔ جناب خوفناک خازن اور اراکین عاملہ جناب طاقتور خان صاحب، جناب مشہور و معروف خان، جناب بے باک۔ جناب نڈر خان۔ جناب بہادر وغیرہ وغیرہ۔

انجمن کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد حاضرین جلسہ کو پڑھ کر سنائے گئے:-

۱. شوہروں کو بیویوں کے مظالم سے محفوظ رکھنا۔
۲. شوہروں کو اُن کے بچاؤ کے طریقے سکھانا۔
۳. شوہروں کو اُن کے ماں باپ بھائی بہنوں کا حق ادا کرنے کی ترغیب دینا۔
۴. شوہروں میں خود داری اور عزت نفسی پیدا کرنا۔
۵. شوہروں کو عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تاکید کرنا۔
۶. شوہروں کو یہ احساس دلانا کہ شادی ہو جانے کے باوجود وہ ابھی تک مرد ہیں۔
۷. شوہروں کو بیویوں کے پیچھے دُم ہلاتے پھرنے سے روکنا۔
۸. شوہروں کو بیویوں کی ہزاروں ایسی خواہشوں کو پوری کرنے سے باز رکھنا، جن میں سے ہر خواہش پہ دَم نکلے۔
۹. شوہروں کو بیویوں کے غلام نہیں بلکہ دوست یا جیون ساتھی بن کر رہنے کے قابل بنانا۔
۱۰. شوہروں کو اپنی عقل سے سوچنے کی ترغیب دینا۔
۱۱. شوہروں کی مدد اور قدم قدم پر ان کو ہدایت دینے کے لیے ہر محلے میں ایک سنٹر قائم کرنا۔

اس انجمن کا اصل مقصد زن کی اصلاح کرنا ہے (اگر زن مریدوں میں زن کی اصلاح کرنے کی ہمت ہوتی تو وہ زن مرید کیونکر کہلاتے اور یہ انجمن وجود میں کیوں آتی۔؟

صاحب یعنی معتمد انجمن جناب دلیر خان نے جلسہ کی کارروائی کا آغاز کرتے ہوئے ایک مختصر لیکن پُراثر تقریر کی جس کا حاضرین پر بالکل اثر نہیں ہوا وہ زن مرید کے زن مرید ہی رہے۔ تب معتمد صاحب نے مظلوم زن مریدوں سے درخواست کی کہ وہ ڈائس پر آکر اپنی روداد سُنائیں ہر جلسہ میں صرف اراکین کو اپنی آپ بیتی سنانے کی اجازت ہوگی۔

زن مریدوں کو سانپ سونگھ گیا کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی آپ بیتی بیان کرتا۔

ہم نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مرزا کو زبردستی ڈائس پر پہنچا دیا اور ان کی قمیص اتار کر مرزا کی پیٹھ حاضرین کی جانب کر دی۔ مرزا کی پیٹھ پر کسی مشاق مصور کے شاہکار خوبصورت و حسین بیل بوٹے نقش کئے ہوئے تھے۔ صدر انجمن جناب خونخوار نے اپنی خونخوار آنکھوں سے پیٹھ کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا "یہ آرٹ کی کونسی قسم ہے جو پیٹھ پر نقش کی جاتی ہے۔ ہم مصور کا نام جاننا چاہتے ہیں — مرزا نے شرماتے ہوئے جواب دیا" جناب یہ آرٹ کا نادر نمونہ نہیں بلکہ یہ حسین گل بوٹے اور نقش و نگار خادم کی حسین و جمیل اور قابل بیوی کے نازک مرمریں انگلیوں کا ہنر ہے بقول شاعر پیٹھ پہ جیسے زخم ہے ناخن کی خراش کا۔ آپ دیدنی ہوتی ہیں اس کی دستکاریاں

بیوی کے ہاتھوں مار کھانے کے بعد بھی بیوی کی تعریف کرنے پر بعض جیالے زن مریدوں نے صدائے احتجاج
بلند کی۔ سب کو خاموش رہنے کی تاکید کرتے ہوئے عزت مآب صدر صاحب نے مرزا سے اس آرٹ کے نادر نمونہ
کو پیٹھ پر نقش کرنے کی وضاحت طلب کی تو مرزا یوں گویا ہوئے [illegible] اور اس نقش دلنگار کی اصل وجہ یہ ہے کہ حقیر
فقیر پُر تقصیر اپنی والدہ محترمہ کی خیریت دریافت کر بیٹھا" معتمد صاحب نے تعجب خیز انداز میں دریافت کیا، "کیا آپ کو
اپنی والدہ سے ملنے کی اجازت نہیں" مرزا نے جواب دیا "تکرار میری عادت نہیں اس لیے بیوی صاحبہ جو کہتی ہیں
اس پر عمل کرنا میرا اولین فرض ہے وہ اگر کسی سے ملنے سے منع کرتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ میری بھلائی کے لیے ایسا کرتی ہوں
اس لیے میں کبھی کسی سے نہیں ملتا۔ وہ جس سے ملتی ہیں میں بھی اُسی سے ملتا ہوں۔ اِسے کہتے ہیں میوچول انڈر اسٹانڈنگ
(MUTUAL UNDERSTANDING) اس کے بہت سے فائدے ہیں۔ اسی طرح ہر پہلی کو وہ اپنی تنخواہ
اپنے پاس رکھ لیتی ہیں تو میں بھی اپنی تنخواہ لا کر انھیں دے دیتا ہوں۔ انہی کی پسند کی ہر ماہ دو تین فلمیں ہم دیکھتے ہیں"۔
مرزا نے توقف کیا تو عزت مآب صدر صاحب نے طنزیہ پوچھا "اس کے علاوہ بھی کوئی خوبی ہے آپ میں"؟ تو مرزا یوں
گویا ہوئے "دوستو میں صبح سویرے چائے پینے کا عادی ہوں اس لیے خود ہی چائے تیار کر کے پی لیتا ہوں۔ اس کے
علاوہ بندہ ذرا صفائی پسند واقع ہوا ہے اس لیے اِدھر اُدھر پڑی ہوئی چیزوں کو قرینے سے رکھ دیتا ہوں رات کے
برتن صاف کر دیتا ہوں چونکہ ناشتہ جلدی کرنے کا عادی ہوں اس لیے ناشتہ بھی خود تیار کر لیتا ہوں جب بیوی صاحبہ
تیار ہو کر میز پر آجاتی ہیں تو اپنے ہاتھوں کی ورزش کی خاطر پنکھا جھیلتا ہوں"۔ مرزا کے خاموش ہوتے ہی زن مریدوں
کی غیرت جز وقتی جاگی اور انھوں نے "شرم شرم" کے نعرے بلند کیے۔ مرزا ہمیشہ کے چکنے گھڑے قمیص پہنی اور نیچے
اُتر آئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ مرزا کے ڈائس سے نیچے آنے کے بعد معتمد صاحب نے مائیک سنبھالا اور دوسرے بہادر
زن مریدوں سے درخواست کی گئی کہ وہ اسٹیج پر آکر اپنی آپ بیتی سنائیں لیکن ہال میں ایک عجیب سی خاموشی طاری تھی
زن مرید بیویوں کی غیر موجودگی میں بھی احساس زن مریدی ساتھ لیے پھرتے ہیں کسی زن مرید میں اتنی ہمت نہ تھی کہ
اسٹیج پر آکر کچھ کہہ سکے۔ آخر کار دربان نے سکوت کو توڑا اور جیب سے تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر معتمد صاحب کو دیا
کہ کسی صاحب نے آپ تک پہنچانے کے لیے کہا تھا۔ معتمد صاحب نے کاغذ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔

"صدر صاحب اور میرے ہمزاد زن مرید بھائیو زن مرید زن مرید ہی ہوتا ہے۔ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ
اپنی بیوی کی برائی سرِ عام کر سکوں کیوں کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ویسے بھی دیوار عمل کا جز ہوتے ہیں اور میرا تو
کیس ہی دوسرا ہے میرے لیے بیگم بارات لے کر آئی تھیں میں بے چارہ دلہا بنا بیٹھا رہا کیوں کہ میرا باپ زن مرید تھا اس
لیے مجھے اُمورِ خانہ داری بچپن سے سکھائے گئے تاکہ آئندہ زندگی میں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو۔ اپنے ماں باپ کا
احسان ہے کہ وداع ہو کے جس گھر کو گیا اس کو جنت بنا دیا۔ دوسرے ہی دن سے چولہا چوکی سنبھال لیا سسرال میں کسی
قسم کی کوئی تکلیف نہ ہونے دی۔ بیوی کے دوست احباب کے لیے چاہے اُن کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو منٹوں میں کھانا
تیار کر دیتا ہوں بیگم دوست احباب کلب وغیرہ میں وقت گزارتی ہیں اور میں گھر کے کام کاج کرنے کے بعد دفتر بھی جاتا ہوں۔
گھر میں اللہ کے فضل و کرم سے آرام و آسائش کی ہر چیز موجود ہے لیکن ہر ماہ اپنی سہیلیوں پر رُعب جمانے کی خاطر
قیمتی اشیاء خریدنے کی عادت سی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بیگم کو ایک بیش بہا نکلس پسند آگیا اور موصوفہ نے حکم
صادر کر دیا کہ فلاں جوہری کی دوکان میں فلاں فلاں نمونہ کا نکلس تیس ہزار روپیوں کا ہے فوراً خرید کر لے آؤ۔ بیچارہ

بھائیو!
وقت واحد میں تیس ہزار کا بندوبست کرنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن میری اس غیر شائستہ حرکت کا علم جب بیگم کو ہوا تو
غم و غصہ کی کوئی انتہا نہ رہی مجھ پر اس طرح برس پڑیں کہ برسات کا مہینہ بھی مارے شرم کے پانی پانی ہو جائے۔ گرجنے
برسنے کے بعد "موت بہتر ہے ایسے جینے سے" کہتی ہوئیں کیروسین اپنے اوپر چھڑک لیا اور تیلی کی تلاش میں اِدھر اُدھر
دیکھنے لگیں میں حواس باختہ رہ گیا کہ کہیں خدانخواستہ بیگم سچ مچ خودکشی نہ کرلیں کیوں کہ میرا اس دنیا میں سوائے بیگم
کے اور کوئی دوسرا نہیں۔ شادی خاندان کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ میرے حسن سے متاثر ہو کر دلہن والوں نے مجھے
انگوٹھی پہنائی اور منہ میٹھا کیا تھا۔ نکاح کے بعد تو سب کو چھوڑ کر ان کے گھر آیا تو بس ان کا ہی ہو رہا۔

خیر صاحبو! کیروسین چھڑکنے کے بعد بیگم کو ماچس کی تلاش تھی اور اتفاق سے ماچس بیگم کے قدموں میں
پڑی تھی یہ دیکھ کر میں گھبرا گیا کہ کہیں میرا سہاگ اُجڑ نہ جائے لہذا ہمت کرکے ان کے قدموں میں پڑی ماچس اٹھانی
چاہی اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیگم مجھ پر جھپٹ پڑیں اور اپنے پنجوں سے خاکسار کا وہ حشر کیا جو چیل دار
کا کرتی ہے۔ منہ سے پھلجھڑیاں چھوٹنی شروع ہوگئیں مغلظات کا طوفان اُبل پڑا۔ مرحومین کو قبروں سے نکال کر بعد
فاتحہ خوانی کے دوبارہ دفنایا جانے لگا۔ اپنی قسمت کو کوسا جانے لگا کہ ایک ناکارہ آدمی اُن کے پلو سے باندھا گیا
جس میں ایک نکلیس خریدنے کی تک سکت نہیں۔ جب بیگم کو یقین ہو گیا کہ اُن کا شکار ادھ مرا ہو چکا ہے تو محترمہ
نے شکار کو چھوڑ کر گھر پر طائرانہ نظر ڈالی اور پھر گھر میں ایسی تباہی مچائی جسے دیکھ کر نادر شاہ بھی شرمندہ ہو جائے
اس دوران ہمیں کئی بار روند ڈالا گیا اور ٹھوکریں بھی ماریں۔ جب ٹھوکریں برداشت کے باہر ہو گئیں تو خادم
نے وعدہ کیا کہ کچھ نہ کچھ کر کے نکلیس ضرور خرید کر دوں گا۔ یہ سن کر نادر شاہ ثانی نے اپنے ہاتھ روک لیے اور مجبوراً
ناچیز کو قرض لے کر نکلیس خریدنا پڑا۔" اتنا پڑھنے کے بعد معتمد صاحب نے کاغذ تہہ کر کے میز پر رکھ دیا اور مظلوم زن مرید
پر ہونے والے ظلم کے خلاف چند نعرے بلند کئے اور ایک قرار داد منظور کروائی کہ اگر بیویوں کا ظلم ختم نہ ہوا تو مجبوراً
اس کے خلاف مورچے، دھرنے بھوک ہڑتال اور مرن برت کا اہتمام کیا جائے گا اس مسئلے کو پارلیمنٹ کے آئندہ
سیشن میں اٹھوایا جائے گا زن مریدوں کو ترغیب دی گئی کہ ہمت کر کے بیویوں کے ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند
کریں۔ آخر میں یہ طے پایا کہ "انجمن زن مریداں" کا اجلاس اگلی سالی جمعرات کو کسی دوسرے خفیہ مقام پر اتنی ہی
سکیورٹی کے ساتھ ہوگا تاکہ اس اجلاس کی کسی خاتون کو بھنک نہ پڑے۔!

کولار میں
کامیاب شامِ قہقہہ زار کا انعقاد

کولار کرناٹک اُردو اکیڈمی بنگلور کے زیرِ اہتمام ۱۱ر مارچ کی شام ۱۹۸۹ء ، ریشم اور سونے کی سرزمین کولار میں پہلی مرتبہ منعقدہ شامِ قہقہہ دراصل یادگار شامِ قہقہہ زار ثابت ہوئی وہ صرف شہر کولار بلکہ ضلع کولار کے دوسرے شہروں اور بنگلور سے بھی شریکِ محفل اردو کے شیدائیوں سے شانتا رام راؤ گوڑا کلیان بھون شام ساڑھے چھ بجے ہی کھچا کھچ بھر گیا تھا اُردو کے شیدائیوں کی آمد کا سلسلہ پھر بھی جاری رہا۔ بیشتر لوگوں کو ہال کے اندر اور باہر کھڑے ہوئے اس یادگار اجلاس میں پیش کئے گئے نثری فن پاروں اور منظوم تخلیقات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دیکھا گیا، علی الخصوص جب شعراء کرام نے اپنا مزاحیہ کلام اپنے الگ الگ انداز میں سنایا تو سامعین ہنسی سے بے قابو ہوگئے اور بعض مرتبہ سامعین ہنسی سے اتنے بے حال ہوئے کہ دوردرشن کیندر بنگلور کے باذوق کیمرہ مین کو سامعین کی طرف اپنے کیمرہ کو بار بار موڑتے ہوئے دیکھا گیا۔

روزنامہ سالار کے مینجنگ ایڈیٹر جناب ابراہیم خلیل اللہ خان نے دو تین لطیفوں سے اس شامِ قہقہہ زار کا افتتاح کیا۔ اُنھوں نے کرناٹک اردو اکیڈمی کی کارگزاریوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ اکیڈمی کے صدر و اراکین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ وہ اردو زبان کی سرگرمیوں کو ریاست کے مختلف شہروں میں لے جارہے ہیں۔ یہ کام قابلِ رشک ہے۔ اکیڈمی کی صدر ڈاکٹر لئیق خدیجہ نے مزاحیہ خطبۂ صدارت پیش کیا جس کو کافی پسند کیا گیا۔ اس خطبۂ کے چند ایک فقرے پسندیدہ اشعار کی طرح دوبارہ پڑھوائے گئے۔ تقریب کے افتتاحی دور میں اصل سامعین کی ساری توجہ کا مرکز ریاستی محکمۂ پولس کے سنٹرل رینج کے ہر دلعزیز اور مقبولِ خاص و عام ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولس مہمانِ خصوصی شری یم۔ ڈی۔ سنگھ بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے صاف اور شستہ اردو زبان میں مزاحیہ انداز میں تقریر کر کے خوب دادِ تحسین پائی۔ شری یم۔ ڈی سنگھ نے اصل لکھنوی انداز میں جب اردو کے اشعار سنائے تو قدرشناس سامعین نے خوب داد دی اور آپ نے اردو زبان اور اپنے تعلق کا اظہار کرتے ہوئے زبان زدِ خاص و عام مصرع پڑھا۔

"بازار سے گزرا ہوں خریدار نہیں ہوں" تو ہال پُر زور دادِ تحسین سے گونج اٹھا۔ ایک اور مہمانِ خصوصی اُردو زبان کے ممتاز مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے اپنے چند مختصر کلمات سے سامعین کے لبوں پر ہنسی بکھیر دی۔ اس محفلِ قہقہہ زار میں کولار ضلع کے یس پی شری ڈی پی نیگی بھی رونق افروز رہے۔ جناب یوسف ناظم، جناب مسیح انجم، جناب محبوب برنائی اور جناب وسیم احمد طنز و مزاح سے بھرپور اپنی نثری تخلیقات سے سامعین کو لطف اندوز کیا۔ اس دوران سامعین کو بار بار ہنستے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ جناب طالب خوندمیری، جناب مصطفےٰ علی بیگ، جناب پاگل عادل آبادی، جناب بگڑ رائچوری اور جناب اعجاز احسنی نے اپنی مزاحیہ نظمیں اور غزلیں سُنا کر سامعین کو اتنا ہنسایا کہ وہ لوٹ پوٹ ہو گئے کئی ایک اشعار اور کئی ایک بندبار بار سُنے گئے۔ علی الخصوص سامعین کے اصرار پر پاگل عادل آبادی کو دوسری مرتبہ بھی سنا گیا۔ اکیڈمی کی تہذیبی کمیٹی کے کنوینر جناب مظہر محی الدین نے نظامت کے فرائض انجام دیئے۔ شامِ قہقہہ کے کنوینر جناب بی ایل حنیفا نے خیر مقدم کیا اور شکریہ ادا کیا۔ جناب مصطفےٰ نعمان کی تلاوت آیات کلامِ پاک سے اس محفل کا آغاز کیا۔

"شامِ قہقہہ"
کولار (کرناٹک)

صدارتی و تعارفی خطبہ

—— ڈاکٹر لئیق صلاح ——

کرناٹک اُردو اکیڈیمی کے زیراہتمام ۱۱ر مارچ کو "شامِ قہقہہ" کے زیرعنوان محفل طنز و مزاح برپا کی گئی، جس میں ملک کے نامور طنز و مزاح نگار ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر صدر اکیڈیمی ڈاکٹر لئیق صلاح نے صدارتی و تعارفی خطبہ پڑھا جو شگوفہ کے قارئین کی نذر ہے ———— (ادارہ) ————

آج طنز و مزاح کی قد آور شخصیتیں شعری و نثری تخلیقات سے لیس سربرآرائے سلطنتِ کولار ہیں۔ ہاں! جب ہم نے انھیں دعوت نامہ روانہ کیا تو قافلے کے ساتھ یوسف کارواں نے بھی شرکت سے اتفاق کیا۔ ورنہ عموماً لوگ ایسے موقعوں پر اپنی اہمیت جتانے کے لئے دبی آواز میں انکار کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ کوئی اصرار کرے، تب پھر اقرار ہو۔ لیکن آج کے جہان ادیبوں اور شاعروں نے ہماری دعوت پر فوری لبیک کہا۔ حالانکہ ان میں ایسے اصحاب بھی ہیں جو ملک گیر حیثیت کے حامل ہیں بلکہ ملک کی سرحدوں کو پار کر کے آفاقی بن گئے ہیں اور طنز و مزاح کی دنیا میں جہاں گیر اور عالمگیر کہلانے لگے ہیں۔
ان کی سادگی پر کچھ شک سا ہونے لگا ہے۔ کہیں یہ پُرکاری تو نہیں۔ "آمدم برسرِ مطلب" والا معاملہ تو نہیں۔ ہنسی و قہقہوں کے ساز و سامان کے ساتھ ان ادیبوں اور شاعروں نے باہر کی سیر کی۔ یوں لگتا ہے کہ وہاں اپنے تمام خزانے لٹا دیئے اور خالی ہاتھ لوٹے پھر کو کسٹم آفیسر کا خوف، منکر نکیر اور اللہ میاں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ حال ہی میں اخباری اطلاعات سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ کولار میں کچھ نئے سونے کے ذخائر دریافت ہوئے ہیں۔ یقیناً اس اطلاع کو انھوں نے گرہ میں باندھ لیا اور جوں ہی ہمارے کلکٹر علی حفیظ صاحب نے انھیں خوش آئند خبر پہنچائی، تو نیکی اور پوچھ پوچھ کے مصداق انھوں نے حامی بھر لی

اپریل ۱۹۸۹ء

۱۷

اب یہ کام بھی کنوینر کا ہے کہ اپنے نام کی مناسبت سے حفاظت کی ذمہ داری قبول کریں۔

منتظم جلسہ کو مہمانوں کے اس اضطراب کا اندازہ بخوبی تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس اجلاس کو جو ۱۴ر جنوری کو مقرر تھا ملتوی کرکے ۱۱ر مارچ کو مقرر کیا۔ آج کے جہان خصوصی اور اس قافلے کے ناظم نے حالات [illegible] تامل لکھا "شب قہقہہ" کے انعقاد میں عجلت نہیں، تاخیر ہونی چاہیئے۔ اس لئے آپ کا رشتہ بحیثیت مزاح نگار، مزاح کے ابوالاجداد مرزا نوشہ اسداللہ خاں المخاطب بہ غالبؔ سے ملتا ہے۔ جس نے کہا تھا ؎

اگر شراب نہیں انتظارِ ساغر کھینچ

لیکن کنوینر کے مصرعے ہی کے اس خیال نے چونکا دیا کہ اس "حیوانِ ظریف" نے ایک اور جگہ فرمایا تھا ؎

ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

سوچا کہ مزید توقف مناسب نہیں۔ کیونکہ یہ ضیغم سیماب صفت ہیں۔ ممکن ہے اس دوران وہ کسی اور ریاست پر حملے کی تیاری نہ کرلیں۔ حملہ آوروں کو دعوت دینے کا طریقہ تاریخی ہے۔ ہمارے ملک سے اس قسم کے دعوت نامے شہنشاہ بابر اور نپولین اعظم کو روانہ کئے گئے تھے۔ جن میں اول الذکر فرماں روا یہاں آیا تو اپنے وطن کو بھول گیا۔ چنانچہ اس خدشے کے پیش نظر ہمارے ان ضیغموں کی واپسی کا انتظام قبل از آمد کرلیا گیا ہے تاکہ ایسے خدشات کا امکان نہ رہے۔

نقادوں نے مزاح کو کبھی صنفِ ادب ماننے سے انکار کیا اور کبھی اسے نمبر دو کے زمرے میں رکھا۔ لیکن مزاح نگار، ان کے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور نہیں بلکہ داڑھی، چوٹی کا زور لگاتے رہے۔ آج ہمارے درمیان مزاح کے چوٹی کے فنکار موجود ہیں۔ مگر یہاں چوٹی سے زیادہ داڑھی نظر آرہی ہے۔ داڑھی والوں کی اکثریت چوٹی والوں پر غالبؔ آگئی مگر بلا شرکت غیرے، انھیں مردِ میداں ہونے کا فخر حاصل نہیں۔ وہ دن گئے جب اس کے ذکر خیر سے "تصویر کائنات" کو رنگین بنایا جاتا تھا۔ اب وہ ہستی نہ صرف نبرد آزما ہے بلکہ حلیف سے زیادہ 'حریف' بن گئی ہے۔ فتح و شکست اور زلف کے سر ہونے کا معاملہ تو مقدر کی بات ہے لیکن مقابلہ تو ضرور ہو رہا ہے۔

آج کل خطبۂ صدارت مشاعروں یا مزاح کی محفلوں میں اجلاس کے اختتام کے بجائے آغاز ہی میں پڑھا جارہا ہے اور صدر بے چارہ شرکاء اجلاس سے کچھ سُنے بغیر اپنے خیالات کا اظہار، بالکل اس انداز میں کرتا ہے۔ جس طرح ہوائی فائر کیا جاتا یا پھر نماز غائبانہ ادا کی جاتی ہے۔ نماز غائبانہ کی روایت تو بہت پرانی ہے۔ موجودہ ترقی یافتہ ملک میں عقیقہ کی تقریب کے علاوہ منگنی یا شادی بھی متعلقہ افراد کی غیر موجودگی میں منعقد کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اب "اصل" سے "زیادہ" "نقل" کی اہمیت ہے۔ سال گذشتہ ہماری اکادمی کی سرگرمیوں کا آغاز "طنز و مزاح کی محفل سے ہوا تھا اور امسال مزاحیہ اجلاس پر اختتام ہو رہا ہے، تاکہ انجام بخیر ہو۔

آج جو تخلیقات اس اجلاس میں پیش کی جائیں گی، ان پر تبصرہ تو ممکن نہیں اس لئے بجائے فن پاروں کے [illegible] کے تعلق سے کچھ عرض کروں گی۔

یوسف ناظم صاحب، صرف مزاح نگار ہی نہیں بلکہ مزاح کے بہت بڑے نقاد بھی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس حیثیت کو صیغۂ راز میں رکھا تھا، حالانکہ ان کی وابستگی ایسے محکموں سے نہیں رہی جن سے کوئی راز وابستہ ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کا تعلق افشائے راز کے محکموں سے رہا۔

ڈاکٹر مصطفیٰ کمال کو ان کی خوبی یا کمزوری کا علم پتہ نہیں کیسے ہوا؟ چنانچہ انھوں نے نہایت رازدارانہ انداز میں موصوف کو "شگوفہ" کا مہمان مدیر بننے پر آمادہ کرلیا۔ واقعی یہ اُن کا کمال ہے کہ یوسف ناظم کو نہ صرف بے نقاب کیا بلکہ بے حجاب کرکے، اُن سے یہ اعتراف کروایا کہ وہ مزاح نگار ہونے کے ساتھ ساتھ محقق اور نقاد بھی ہیں۔ "ہندستانی مزاح نمبر" میں شائع شدہ ان کا مضمون، طنز و مزاح کا تفصیلی جائزہ ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ مزاح نگاریوں ہی وجود میں نہیں آیا۔ اس کے لئے مطالعہ اور مشاہدہ دونوں ضروری ہیں، صرف "خامہ بگوش" ہونا کافی نہیں۔ گہرائی اور گیرائی کے علاوہ زبان پر عبور ہونا چاہیئے۔ تب ہی حرف مطلب زباں پر آتا ہے اور سننے والا واقعی یہ محسوس کرتا ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کیف و کم، البتہ، فقط، بالکلیات اور فی الحال وغیرہ میں موضوعات کی کمی نہیں اور نہ ہی تکرار ہے۔ ان کے بے حساب مقدمے اور تبصرے بھی ہیں جن میں مزاح کی چنگاریاں، پھلجھڑیاں اور شعلے حسب ضرورت موجود ہیں۔

ہمارے آج کے ایک اور مہمان خصوصی محترم ابراہیم خلیل اللہ خاں صاحب، کولار کے متوطن ہیں۔ یہ شہر تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ نواب حیدر علی کے والد ابوالفتح محمد علی اور اُن کی اہلیہ یہاں مدفون ہیں۔ نواب ٹیپو سلطان شہیدؒ کی تعمیر کردہ عیدگاہ کے علاوہ حسین شاہ مرزا اور نعمت ولی کی درگاہ کا شمار، یہاں کی مشہور عمارتوں میں ہوتا ہے۔

خلیل اللہ خاں صاحب (سابق) چیرمین اقلیتی کمیشن کے علاوہ مختلف قومی و ملی اداروں و انجمنوں کے سرپرست اور ایک اعلیٰ پایہ صحافی ہیں۔ لیکن موصوف کا شمار اُن اخبار نویسوں میں نہیں جن کے تعلق سے رشید احمد صدیقی نے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ "جب رزق کے دروازے بند ہوجاتے ہیں تو ہندوستان میں اخبار نویسی کے دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں۔" اور نہ ہی ان اخبار نویسوں میں شامل ہیں جنھیں بقول مولانا "بعض حواسوں کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً آنکھ ان کے لئے بالکل زائد ہے اس کا کام کان سے لیا جا سکتا ہے۔ بس جو سنا لکھ دیا۔" اس پیشے کی آبرو ہی ان کے خلوت و وقار کی ضامن ہے۔ وہ ادب کی صالح روایات کے فروغ سے صحافت کے معیار کو بلندی عطا کر رہے ہیں۔ محترم جناب یم ڈی سنگھ صاحب، ہندی کے ایک نامور ادیب اور اُردو ادب کے باذوق قاری کے علاوہ اپنے محکمہ کے ایک قابل آفیسر ہیں جو حسن انتظام اور حسن سلوک میں بے حد مقبول ہیں۔

مسیح انجم صورت سے بہت شریف بلکہ تبلیغی نظر آتے ہیں۔ کسی شادی کی محفل میں سوء اتفاق قاضی موجود نہ ہو تو یقیناً لوگ ان سے مزید اصرار کرتے ہوں گے کہ وہ یہ فریضہ ادا کریں۔ اور انھیں اس پارٹ ٹائم سروس سے انکار کی جرأت نہیں ہوتی ہوگی۔ البتہ مسیح انجم اور قیس کے تعلق سے اظہار خیال کرنا، ان کی شرافت کے پیش نظر

ہمیں منظور نہیں۔ رشید احمد صدیقی کے بارے میں شوکت تھانوی نے کہا تھا کہ صورت سے مرثیہ گو معلوم ہوتے ہیں اسی طرح پیچھے رستم مسیح انجم ہیں۔ طنز و مزاح کی دنیا کے مسیح اور آسمان ادب کے انجم، وہ سیارہ ہیں، ثابت نہیں۔ اس لئے گردش کرتے ہوئے یہاں تک پہنچ گئے۔ ان کے ہاں فلسفیانہ انداز نہیں ہے۔ روزمرہ زندگی کے عام مسائل کو پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے، جن پر انھیں کافی دسترس حاصل ہے۔ اکثر اوقات معمولی باتیں بھی زندگی میں اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ چونکہ عوامی زندگی کی جھلک ان میں ملتی ہے اس لئے وہ نظیر اکبر آبادی کی طرح عوام میں مقبول ہیں۔

مرزا مصطفیٰ علی بیگ کے مزاح کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مشرق و مغرب کا امتزاج موجود ہے اور شوخ، چنچل، شریر اور طرار کرداروں کے ذریعہ مزاح کی فضا بناتے ہیں موصوف ایک مانے ہوئے ایکٹر بھی ہیں۔ کئی مزاحیہ ڈرامے کامیابی کے ساتھ اسٹیج کر چکے ہیں۔ مختلف زبانوں اور علاقوں کے لب و لہجے پر انھیں ماہرانہ دسترس حاصل ہے۔

کسی زمانے میں ادب عالیہ اور علوم و فنون باہم دگر تھے۔ اب ان کی شاخیں علحدہ ہو گئیں۔ اور ان دونوں میں قربت کا احساس باقی نہیں رہا۔ لیکن جب طالب خوندمیری اس رشتے کو استوار کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ برسوں کے بچھڑے ایک ہو گئے۔ ان کی شاعری قدیم و جدید، شعری اوصاف کا پیکر ہے۔ تضمین اور پیروڈی میں کلاسیکی اشعار سے اپنے اشعار کا پیوند اس قدر نفاست و مہارت سے جوڑتے ہیں کہ پلاسٹک سرجری کا گماں ہونے لگتا ہے۔ لوگ مزاح نگاروں سے ملتے ہوئے اسی لئے ہچکچاتے ہیں کہ انھیں یہ ڈر رہتا ہے کہ کہیں مرحوم سوداؔ کی طرح ان کا بھی کوئی غنچہ صدا لگاتے ہی قلمدان لے کر حاضر نہ ہو جائے اور دیکھتے ہی دیکھتے تضحیک سر بازار نہ پہنچ جائے۔ طالبؔ کا فن دو آتشہ ہے یعنی ادب عالیہ اور فنون دونوں کے پروردہ اس لئے کبھی نوکِ قلم سے کام لیتے ہیں اور جب روشنائی خشک ہو تو ایسی صورت میں ہوتے قلم کا سہارا تلاش کرتے ہیں۔ مہمان خصوصی کو منہا کرنے کے بعد ہمارے دیگر میزبان و مہمان فنکار "نورتن" کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان میں بعض صاحب تصنیف ہیں۔ مثلاً جناب محبوب بڑائی اور جناب پاگلؔ (!!)۔ جن مزاح نگاروں کا تعلق ہماری ریاست سے ہے، وہ محتاج تعارف ان معنوں میں نہیں کہ وہ نہ صرف ہمارے ہیں بلکہ شہرت کے حامل بھی ہیں۔ بیرون ریاست کے موقر رسائل میں چھپنے کا اعزاز انھیں حاصل ہے۔ اب کرناٹک میں بھی مزاح نگاروں کے اوسط میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ سالار اور پاسبان کے ادبی ایڈیشنوں کے علاوہ ہفتہ وار "ایقان" نے "کشت زعفران" کے عنوان سے ایک گوشہ مزاحیہ تحریروں کے لئے مخصوص کیا ہے جس کے توسط سے نئے لکھنے والے منظر عام پر آ رہے ہیں۔ ترجموں کے توسط سے مختلف زبانوں کے مزاحیہ ادب کے بارے میں جو معلومات ہوئی ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ جنوبی ہند کی علاقائی زبانوں میں سوائے کنڑ کے کسی اور زبان میں معیاری مزاح نہیں ہے۔ میں نے اپنی ریاست سے لگاؤ کے پیش نظر یہ بات نہیں کہی، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ آپ کی خدمت میں طنز و مزاح کے دو نمونے کنڑ شعری تخلیق کے ترجموں کی صورت میں پیش کئے جائیں گے اور قوی اُمید ہے کہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔

حمید الماس صاحب نے کنڑ نظموں کا ترجمہ "شب گرد" کے عنوان سے کیا ہے۔ جس میں عثمانیہ یونیورسٹی کے

فارغ التحصیل ایک آئی۔ اے۔ ایس آفیسر ستایا پر اتک کی ایک نظم طنز سے بھرپور موجود ہے، ملاحظہ کیجئے۔

گھر میں جلتے ہوئے دیپک نے کہا
مجھ سے
رونق ہے اندھیرے گھر میں
مسکراتے ہوئے چولھے نے کہا
فخر کے ساتھ
مجھ سے ملتی ہے زمانے کو حیات
گھر میں عورت نے سنا دونوں کی باتیں تو کہا
مجھ کو دونوں کی ضرورت ہے جلو
تم بھی جلو
تم بھی جلو

دوسرے نامور شاعر اے کے رامانجم ہیں جو شکاگو یونیورسٹی میں دراوڑی زبانوں کے پروفیسر ہیں، جن کے مجموعے انگریزی اور کنڑا دونوں زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک چھوٹی سی نظم پیش خدمت ہے ؎

آج حمام کے بڑے ٹب پر
والد محترم نے جلدی میں
بھول کر رکھ دیئے ہیں اپنے دانت
میں نے اُن کو قریب سے دیکھا
ہنس رہے ہیں بڑی فراغت سے

طنز و مزاح نے معاشرے کی اصلاح اور حقائق کی تلاش میں نہایت اہم رول ادا کیا ہے۔ مزاح نگار جس قدر حساس ہوتا ہے، اُس قدر شائد ہی کوئی اور ہو۔ اُس کا ظرف عالی اور حوصلہ بلند ہوتا ہے۔ سوسائٹی کی ناہمواریوں، زیادتیوں اور ظلم کو وہ صرف ساحل سے تماشائی کی طرح نہیں دیکھتا، وہ اس کا غواص بھی ہوتا ہے۔ ہونٹوں پہ مسکراہٹ بکھیرنے کیلئے کتنے آنسوؤں کو پلکوں پر سجاتا اور کتنی آہوں کو سینے میں چھپا لیتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

مرحوم جاں نثار اختر نے جو بات غزل گو شعراء کے تعلق سے کہی تھی، وہی تھوڑی سی تحریف کے ساتھ مزاح نگاروں کی نذر کرتی ہوں ؎

مزاح کی قدر کرو اے ادب کے متوالو
ملیں گے نہ مزاح گو مزاح داں ایسے

منظور وقار (اکبر)

(خاکہ)

طیب انصاری
بگڑ جائے تو تلوار کی دھار...؟

اُونچی پیشانی (ہر میدان میں کامیابی کی نشانی) بلند قد (اتنا بلند کہ قد آور کہلانے کے لیے کافی ہے) لمبی ناک (جس پر کبھی مکھی نہیں بیٹھی) بھرے بھرے گال اور بدن خون سے مالامال۔ یہ سراپا ہے ڈاکٹر طیب انصاری کا۔ بس یوں سمجھیے کہ طیب صاحب اگر فلم انڈسٹری میں ہیرو بننے کے لیے جاتے تو انھیں سکندرِ اعظم، اکبرِ اعظم اور اشوکِ اعظم جیسے کردار ضرور ملتے۔ طیب صاحب ۲۳ ستمبر ۱۹۴۱ء میں الند شریف (ضلع گلبرگہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"میری پیدائش خود ایک اہم واقعہ ہے اور اس واقعہ کی اہمیت کا صحیح اندازہ آنے والی نسلیں کر سکیں گی۔ دوستو! یہ واقعہ جب آنے والی نسلوں کے لیے ہے تو پھر ہم لوگوں کو یہ جاننے کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کہ اس واقعہ کی اہمیت کے پیچھے کونسا اہم راز پوشیدہ ہے کیونکہ ہم لوگ تو موجودہ نسل کے لوگ ہیں۔"

طیب صاحب نے ایک علمی اور صوفی گھرانے میں آنکھیں کھولیں اُن کے جدِ اعلیٰ حضرت علاء الدین انصاری حضرت پیر نصیر الدین چراغ دہلوی کے مُرید اور خلیفہ تھے۔ اس لحاظ سے طیب صاحب کو بھی خلیفہ یا مُرشد ہونا چاہیے تھا مگر بن گئے نقاد اور اپنی تنقیدی تلوار سے اردو ادب کے چند معروف بتوں پر وار کیا جس کی وجہ سے طیب صاحب اردو ادب میں موضوعِ بحث بننے کے بعد مقبول بھی ہو گئے۔

طیب صاحب لباس کے معاملے میں فیشن پرست تو نہیں البتہ پینٹ شرٹ اور سفاری میں ملبوس رہتے ہیں مگر کالج کے افتتاحی اور اختتامی فنکشنوں کے علاوہ ادبی اجلاسوں میں سوٹ پہن کر بھی شریک ہوتے ہیں۔ نمازِ جمعہ دیگر لاکھوں مسلمانوں کی طرح طیب صاحب بھی پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں اس دن آنکھوں میں سُرمہ لگا کر شیروانی پہن لیتے ہیں اور نمازِ جمعہ کے فوراً بعد شیروانی اتار دیتے ہیں یا شام تک شیروانی کو سینے سے لگائے رکھتے ہیں اس بات کا ہم نے باریک بینی سے مشاہدہ نہیں کیا ورنہ یہ راز بھی ہم آپ کے سامنے ضرور اُگل دیتے۔ جہاں تک طیب صاحب کی سوچ و فکر کا معاملہ ہے ان کی سوچ و فکر میں گہرائی ہوتی ہے (اتنی گہرائی بھی نہیں کہ سقراط نظر آتے ہوں) خیالات میں بلندی ہوتی ہے (اتنی بلندی بھی نہیں کہ اپنے آپ کو ہمالیہ پہاڑ ثابت کرتے ہوں) طیب صاحب کی گفتگو میں ٹھہراؤ ہوتا ہے وہ ایک ایک لفظ کو تول تول کر ادا کرتے ہیں گفتگو کے دوران طنز بھی کریں گے تو معیاری۔ طیب صاحب میں طنز و مزاح کا ذوق تو بہت ہے۔ مزاح تو کبھی نہیں لکھا مگر مزاحیہ مضامین پڑھتے ضرور ہیں (ویسے مزاحیہ مضامین پر ہنسنے والے ہی حقیقی مزاح نگار ہوتے ہیں)

بولنے سے پہلے سوچتے ہیں مگر بول کر سوچتے نہیں۔ جہاں تک طیب صاحب کی چال ڈھال کا معاملہ ہے ان کی چال کچھ اس طرح ہے کہ جھوم جھوم کر چلتے ہیں۔ چلتے وقت ہونٹوں ہی ہونٹوں میں مسکراتے بھی رہتے ہیں مسکراہٹ یوں بھی صحت کے لیے بہت مفید چیز ہے اس راز سے شاید طیب صاحب اچھی طرح واقف ہیں جو لوگ اس راز سے واقف نہیں وہ چلتے وقت ہمیشہ ... اور بڑبڑاتے رہتے ہیں۔ طیب صاحب اسکوٹر رکھتے ہوئے بھی اسے بہت کم استعمال کرتے ہیں اردو زبان و ادب کے لیے انھیں اپنا خونِ جگر جلانا تو منظور ہے مگر فالتو کاموں کے لیے اپنے اسکوٹر کا پٹرول جلانا منظور نہیں۔ (ویسے تو اکثر ادباء اور شعراء کو اردو زبان و ادب کی خدمت کے لیے تو پھوٹی کم اور ادبی سیاست کے لیے اپنے اسکوٹر کا پٹرول زیادہ جلاتے ہوئے دیکھا ہے) اب رہا سوال طیب صاحب کی چلن کا ہم نے تو کبھی انھیں غلط راستے پر چلتے ہوئے نہیں دیکھا ورنہ اردو کے شعراء اور ادباء خصوصاً نقاد کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی غلط راستے پر ضرور چل پڑتے ہیں۔ لگے ہاتھوں ہم آپ کو یہ بھی بتاتے چلیں کہ طیب صاحب کی تعلیم کہاں تک ہوئی ہے؟ طیب صاحب اردو کے ایم اے ہیں آپ لوگ کہیں گے کہ اس میں کونسی خاص بات ہے؟ ہمارے شہر کے دودھ پیتے بچے تک اردو سے ایم اے کر لیتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ طیب صاحب اس زمانے میں عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس ہوئے ہیں جب کہ عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے پاس کرنا واقعی تیر مارنے کے برابر تھا۔ طیب صاحب! آج کل ڈاکٹر طیب انصاری کہلانے لگے ہیں ظاہر ہے ایک عدد پی ایچ ڈی کی ڈگری کا اضافہ ہوا ہے۔ ہم یہ وضاحت اس لیے کر رہے ہیں کہ ہمارے شہر میں آر ایم پی کی ڈگری رکھنے والے ڈاکٹروں کی تعداد ایم بی بی ایس اور پی ایچ ڈی کی ڈگری رکھنے والے ڈاکٹروں سے زیادہ ہے۔

طیب صاحب کس عہدے پر فائز ہیں یہ آپ لوگ تو اچھی طرح جانتے ہیں پھر بھی ہم بتانا اپنا ذاتی فرض سمجھتے ہیں طیب صاحب گورنمنٹ کالج گلبرگہ میں اردو کے لکچرار تھے لکچرار کا اپنی دیگر مصروفیات کے علاوہ طلباء کو پڑھانا بھی ضروری ہوتا ہے لہٰذا طیب صاحب بھی طلباء کو پڑھایا بھی کرتے تھے لیکن اب طیب صاحب لکچرار سے دو ہاتھ آگے بڑھ کر ریڈر بن گئے ہیں یہ بات شاید آپ لوگوں کو معلوم ہے یا نہیں ہم بتا دیتے ہیں کہ لکچرار جب ریڈر بن جاتا ہے تو اس کا "ورک لوڈ" کم ہو جاتا ہے اور اس کی اپنی دیگر مصروفیات زیادہ ہو جاتی ہیں لکچرار کے تنخواہ کے بل آفس کلرک بناتے ہیں مگر ریڈر بنتے ہی اسے اپنا بل خود ہی بنانا پڑتا ہے اور تو اور تنخواہ لانے کے لیے چیک بک کے ساتھ بینک کے چکر بھی لگانے پڑتے ہیں غرض لکچرار ریڈر بنتے ہی (SELF_SERVICE) قسم کا آدمی بن جاتا ہے طیب صاحب اپنی اس (SELF.SERVICE) کے باوجود طلباء کو پڑھایا بھی کرتے ہیں اور اس حیرت انگیز انداز میں کلاس لیتے ہیں کہ طلباء کے ساتھ کلاس میں کم تو کلاس کے باہر زیادہ نظر آتے ہیں۔ طیب صاحب کو کن کن باتوں کی عادت ہے اور کن کن عادتوں سے وہ پرہیز کرتے ہیں یہ بھلا ہم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے دن بھر تو نہیں نصف دن تو ہم ان کے ساتھ ہی رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ان کی ہر حرکت پر ہماری نظر ہوتی ہے (ہمیں اس بات کا خوف ہے کہ اس خاکے کو سننے کے بعد طیب صاحب آئندہ ہماری ہر حرکت پر نظر رکھنا شروع نہ کر دیں)۔

طیب صاحب: کو تقریر کرنے کی بڑی عادت ہے اگر کسی ہفتہ کسی تقریب میں تقریر نہ کر سکیں تو ان پر اس قدر ہیجان طاری ہو جاتا ہے کہ کالج کیمپس میں اپنے طلباء اور ساتھی اساتذہ کے سامنے کھڑے کھڑے ہی تقریر شروع کر دیں گے۔ طیب صاحب کو تقریر کرنے کے لیے موضوع تلاش کرنے کی ضرورت تو ہوتی نہیں کیوں کہ موضوعات خود طیب صاحب کی تلاش میں بھٹکتے رہتے ہیں! ان کی تقریریں اس قدر مقبول ہیں کہ شہر میں اکثر ادبی اجلاس اور سیمینار طیب صاحب کا

تفریحِ طبع کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں۔

طیب صاحب اکثر ادباء اور شعراء کی طرح غیر ضروری گپ شپ، دوسروں کی غیبت اور ہوٹلوں میں رات گئے تک چائے نوشی اور چرب زبانی کے شغل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ سگریٹ کے تو طیب صاحب پیدائشی دشمن ہیں (سگریٹ پینے والوں کو بھی اپنا دشمن سمجھتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرتے)، شرابیوں سے ہمیشہ چالیس قدم دُور ہی رہتے ہیں۔ فلم بینی کا شوق نہیں کے برابر ہے۔ ٹی۔وی دیکھنے کا شوق صرف اس حد تک ہے کہ اس پر کرکٹ میچ چل رہے ہوں یا کوئی دلچسپ سیریل ہو تو دیکھ لیتے ہیں لیکن تبصرہ سے احتراز کرتے ہیں۔

طیب صاحب دعوتوں کے معاملے میں کافی سنجیدہ ہیں دعوت میں نہ جا کر دعوت دینے والے کا دل توڑنا تاج محل توڑنے کے برابر سمجھتے ہیں۔ اس لیے طیب صاحب بلا لحاظ مذہب و ملت ہر شخص کی دعوت میں پابندی سے شرکت کرتے ہیں شرط بس اتنی ہے کہ انھیں ایک عدد دعوت نامہ ضرور ملنا چاہیئے۔ یوں تو طیب صاحب ہر قسم کے کھانوں کو پسند کرتے ہیں مگر دسترخوان پر جب انھیں "ویجیٹرین" کھانوں کی جگہ "بریانی" نظر آتی ہے تو ان کے بارہ طبق روشن ہو جاتے ہیں۔ خود تو شکر سے پرہیز کرتے ہیں مگر دورانِ طعام اپنی گفتگو کی شیرینی سے جہاں ڈبل کے میٹھے کو مزے دار بنا دیتے ہیں وہیں طنز و مزاح سے بھرپور جملوں سے بریانی کی لذت کو دوبالا کر دیتے ہیں۔

طیب صاحب! وقت اور اصول کے پابند ہیں نہ خود اصول کو توڑیں گے اور نہ دوسروں کو اصول توڑتے ہوئے برداشت کریں گے وقت کے اس قدر پابند ہیں کہ اگر کسی ادبی اجلاس کی وہ صدارت کرنے والے ہوں تو اُس ادبی اجلاس میں وقتِ مقررہ پر پہنچنے والے پہلے سامع خود طیب صاحب ہی ہوں گے۔ جہاں تک طیب صاحب کی علمی اور ادبی سرگرمیوں کا تعلق ہے اپنے طلباء کو پڑھانے کے معاملے میں کلاس کے اندر کس طرح کی سرگرمی دکھاتے ہیں یہ تو طلباء ہی جانیں البتہ طلباء میں علمی ادبی اور تنظیمی سرگرمیوں کی وہ روح پھونک دیتے ہیں کہ طلباء کالج کو الوداع کہتے ہی شاعر یا ادیب بن جاتے ہیں یا پھر اپنی ایک عدد ادبی انجمن بنا کر صدارت شروع کر دیتے ہیں۔ طیب صاحب نئے قلمکاروں کی نہ صرف ہمت افزائی کرتے ہیں بلکہ انھیں انعامات سے بھی نوازتے ہیں۔ طلباء کو اساتذہ کی عزت کرنے کی جہاں تلقین کرتے ہیں وہیں خود اپنے اساتذہ کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں۔

طیب صاحب! اب تک ایک درجن کتابوں کے خالق بن چکے ہیں (شاید طیب صاحب ادب میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں) طیب صاحب کو اپنی ہر کتاب سے اتنا ہی پیار ہے جتنا والدین کو اپنی اولاد سے ہوتا ہے ان کی کتابوں پر ملک کی مختلف اردو اکاڈیمیوں نے انعام سے نوازا ہے جب بھی ان کی کتاب پر انعام کا اعلان اخبارات میں شائع ہوتا ہے طیب صاحب اس طرح خوش ہوتے ہیں جس طرح ایک باپ "ورلڈ کپ کرکٹ ٹورنمنٹ" میں اپنے بیٹے کی "سنچری" بنانے پر۔

کالج میں طیب صاحب صدر شعبہ اُردو/ فارسی / عربی ہیں دو چار علمی اور ادبی انجمنوں کے بھی صدر ہیں شہر میں منعقد ہونے والے ادبی اجلاسوں کی صدارت تو کرتے ہی رہتے ہیں گویا کہ صدارت سے کم کا عہدہ طیب صاحب کو جچتا ہی نہیں۔ طیب صاحب کبھی کمزور اور ناتواں قلمکاروں کی تنقید کا جواب نہیں دیتے۔ طیب صاحب اکثر کہا کرتے ہیں اگر کشتی لڑیں بھی تو اپنے سے طاقتور پہلوان سے مچھر نما پہلوان کے ساتھ اکھاڑے میں اتر کر لوگوں کے سامنے تماشا بننا کہاں کی دانشمندی ہے؟؟

طیب صاحب ۱۹۵۴ء سے لکھ رہے ہیں اخبارات اور رسائل میں برابر چھپ رہے ہیں ان کا کہنا ہے قلمکار چاہے کتنا ہی بڑا ہو اگر چھپنا چھوڑ دے گا تو ادب کے میدان میں اس طرح چھپ جائے گا کہ سرچ لائٹ لگا کر ڈھونڈنے پر بھی نہیں ملے گا۔ گذشتہ بیس برس سے طیب صاحب کا جسم گلبرگہ میں ہے تو روح حیدرآباد میں۔ اس کی وجوہات اور بھی بہت سی ہیں مگر ہمیں اس کی ایک اہم وجہ یہ نظر آتی ہے کہ حیدرآباد طیب صاحب کا سسرال ہے۔ جب طیب صاحب اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو کر ہمیشہ کے لیے حیدرآباد میں سکونت پذیر ہو جائیں گے تو ہمیں یقین ہے اُس وقت طیب صاحب کا جسم حیدرآباد میں ہوگا اور روح گلبرگہ میں کیوں کہ اس وقت تک طیب صاحب گلبرگہ کی علمی ادبی اور تہذیبی اقدار کا ایک اٹوٹ حصہ بن جائیں گے۔

آخر میں ہم علامہ پاگل بانکنڈی کا وہ شعر آپ لوگوں کی نذر کر رہے ہیں جن کے بارے میں علامہ کا خیال ہے کہ ہمارے چار صفحات کے اس خاکے کے مقابلے میں ان کا ایک شعر طیب صاحب کی شخصیت کو اُجاگر کرنے کیلئے کافی ہے۔ شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

بگڑ جائے تو تلوار کی دھار ہے طیب
پگھل جائے تو شبنم کی بوچھار ہے طیب

{ یہ خاکہ ڈاکٹر طیب انصاری کی ۲۱ ویں تصنیف "آباد خیال آباد رہے" کے جلسۂ رسم اجراء کے موقع پر ۲۶ فروری ۸۹ء کو پڑھا گیا۔ }

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

چوہران انتخابات

بگاڑنے کی اور بھی کئی ترکیبیں ہو سکتی تھیں۔

یہ سنگرہ شاید سرد مقام ہوگا۔ لیکن یہی اب سردیوں کے دن ہیں۔ وہاں سورج بھی دیر سے صورت دکھاتا ہوگا۔ دس اور گیارہ بجے سے پہلے اگر پروگرام شروع نہ ہو سکا تو پھر دوپہر کے کھانے کا کیا ہوگا۔ معلوم نہیں منتظمین جج نے اس نکتے پر غور کیا بھی یا نہیں۔ سردیوں میں ویسے بھی بھوک ذرا جلدی لگتی ہے اور اگر اس موسم میں دھوپ کھانے میں ہی تو لگتا ہے پیٹ نہیں بھرتا۔

گزشتہ چار پانچ دہائیوں میں طنز و مزاح کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ورنہ پہلے اسے کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ اب تو اس کی مقبولیت کا یہ حال ہے کہ ہماری تنقید بھی مزاحیہ ہو گئی ہے۔ یہ بڑی ہی خوش آئند بات ہے۔ امید کی جا سکتی ہے کہ آئندہ طنز و مزاح کے انعامات نقادوں ہی کو دیئے جائیں گے۔ ہونا بھی چاہیے۔ تنقید نگاروں کے ہاں درآمد شدہ مال بکثرت ہوتا ہے۔ غریب مزاح نگار یہ سامان کہاں سے لائیں گے۔

یوسف ناظم کی صبح ہوئی ہے تو ظاہر ہے شام بھی ہو جائے گی

●●

وجاہت علی سندیلوی

ماڈرن سسر کی مشکلات

ماڈرن سسر کی مشکلات کا اندازہ لگاتے وقت یہ نہیں فراموش کرنا چاہیے کہ یہ آج کے پورس کبھی خود بھی سکندرِ اعظم بنے تھے یعنی حال کے سسر خود بھی ماضی کے داماد رہ چکے ہیں، اور جن میں سے کم سے کم پورس کو دیکھ کر اکثر یہ شعر یاد آجاتا ہے ؎

دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آگئی ہے پاؤں میں

ہمارے پڑوسی بھولا ناتھ نے آج سے قریب پچیس سال پہلے اپنے داماد گوری شنکر کو جہیز میں اس خیال سے ایک ٹٹو بھی دیا تھا کہ وہ لیکھ پال ہے اور اس سواری سے اُسے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے اور کاشتکاروں سے وصول کئے ہوئے مالِ غنیمت کو گھر لانے میں سہولت ہوگی۔ لیکن جیسے ہی ٹٹو کی لگام گوری شنکر کے ہاتھ میں پہونچی، ٹٹو کے بجائے وہ خود دولتیاں چلانے لگے۔ اُن کا اصرار تھا کہ اُسے ٹٹو کے ساتھ ایک سائیکل بھی دی جائے۔ اُس زمانے تک تو نہیں جانے کا فیشن عام طور سے رائج نہیں تھا اور سسرال کے دروازے پر ٹُر ٹُر بجتی ہوئی بین بجا کرنا بلیک میل کے لئے کافی سمجھا جاتا۔ بات کچھ زیادہ بڑھتی دکھائی دی تو ہم جیسے بچولوں نے دخل در معقولات دے کر گوری شنکر اور ان کے باپ کو اس بات پر راضی کرلیا کہ وہ ٹٹو کے ساتھ نہیں بلکہ ٹٹو کے بجائے سائیکل لے لیں اور بھولا ناتھ نے اُس کی قیمت فوراً ادا کردی۔ واضح رہے کہ اس وقت سائیکل کی ٹٹو سے زیادہ قیمت ہوا کرتی تھی اور آج سے یہ فوقیت صرف اتنی ہی کہ وہ ٹٹو سے زیادہ تیز پا ہوتی اور اس کے ساتھ دانے گھاس کا بھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔

آپ حالات کی ستم ظریفی دیکھئے کہ چند ہفتے ہوئے میرے پاس کچہری میں وہی گوری شنکر آیا۔ بہت حیران اور پریشان۔ میں نے پوچھا [illegible] کہنے لگے صرف ایک بات پوچھنے آیا ہوں۔ کیا بتلا سکتے ہیں وکیل صاحب یہ آج کل کے داماد کس طرح جونک کی طرح چمٹ جاتے ہیں۔ میرا لڑکا جہیز میں سائیکل [illegible] اور داماد ہے کہ وہ [illegible]

ڈرا بیٹھا ہے کہ وہ موٹر سیکل سے کم کوئی مونڈھا نہیں لے گا۔ اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟ " شنا بیچ اُس کی شادی
کا فکر یاد آگیا۔ اور شیطان نے ورغلایا کہ کہہ دوں " جا بھوڑا تھوڑا لا شکر دیر سے " لیکن بھوت نے زبان ملا کسل۔ بنا
مزے کر مارتا کون سی بہادری ہے اور میں نے اُس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے صرف یہی کہا۔ " آج کل کا داماد تو شامت
اعمال بن کر رہ گیا ہے۔ یہ کم بخت یہ کیوں نہیں سوچتا کہ اسے خود بھی ایک دن سسر بننا ہے۔ جہیز کی شرمناک روایت کا
جو کھیل آج وہ کھیل رہا ہے اُس میں کل اسے خود بھی تو پھاندنا پڑے گا۔ " گری شنکر بولا " وکیل صاحب آپ نے تو میرے
منھ کی بات چھین لی۔ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ یہاں اپنے سوارتھ کے آگے سماج کے بارے میں کون سوچتا ہے۔ میرا بس
چلے تو میں ایسے سب لالچی دامادوں کا منھ کالا کر کے بستیوں سے باہر نکلوا دوں " گری شنکر چلا گیا لیکن میرے لئے یہ فیصلہ
کرنا دشوار تھا کہ میں نے جو الفاظ سُنے تھے وہ اُس کے تھے یا بھولا شنکر کے نکڑ کے یا اُس شخص کا تکلّم کے جو وہ اپنے داماد کو
دینے والا تھا۔

ہمارے معاشرے میں ماڈرن سسر کا اطلاق اُن بے گناہ گنہگاروں پر ہوتا ہے جو اپنی مرضی کے بغیر زبردستی سسر
بنا دیئے جاتے ہیں یعنی شادی تو ماڈرن دولہا دلہن خود طے کرتے ہیں لیکن طویلے کی بلا بندر کے سر کے مصداق اُن کے والد
صاحبان کو چار و ناچار سسر کا رول ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان مہمان اداکاروں کو اپنی مرضی کے خلاف جبریہ اداکاری کرنا پڑتی ہے
جو عموماً جوکر کی ہوتی ہے اور خدانخواستہ اگر فلم فلاپ ہو جاتی ہے تو سب سے زیادہ لعن طعن یہی بنائے جاتے ہیں۔

ہمارے دوست قدرت اللہ پرانی وضع قطع کے ایک بہت سیدھے سادے اور روایت پسند انسان تھے۔ اُن کی بیوی اور
لڑکیاں بہت شدت سے پردہ کرتیں۔ ٹیلی ویژن کیا اُن کے گھر میں ٹرانسسٹر تک کا گذر نہیں تھا۔ کبھی کبھار اگر کسی محلے
والے کے ریڈیو کا کوئی بھولا بھٹکا نغمہ اُن کے کانوں تک پہونچ جاتا تو اُن کے چہرے پر ایک عجیب سی وحشت برسنے لگتی اور وہ
جلدی جلدی اپنی بیڑی کے کش کھینچ کر قربِ قیامت کا تذکرہ چھیڑ دیتے۔ اُن کے ایک ہی لڑکا تھا اور وہ اُن کی مخالفت
کے باوجود اپنے شوق سے ڈاکٹری پڑھنے لگا۔ ڈاکٹری کی سند لے کر پلٹا تو اُس نے ماں، بہنوں کے ذریعے باپ کو اطلاع دی
کہ وہ اپنی ایک ہم جماعت ڈاکٹرنی سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ قدرت اللہ پہلے تو بہت بھڑکے اور بپھرے لیکن پھر دوستوں اور
عزیزوں کے سمجھانے بجھانے سے راضی تو خیر کیا البتہ خاموش ہو گئے۔ اور ڈاکٹر لڑکے کے لئے ایک ڈاکٹرنی بہو کا خانہ ان میں
اضافہ کر دیا۔ میں نے ظاہر میں تو اس شادی پر اظہارِ مسرت کیا لیکن چونکہ قدرت اللہ کا بچپن کا دوست تھا اس لئے اس خیال
سے کہ وہ خود خوش نہیں ہیں ان کے ساتھ بڑی ہمدردی محسوس کرتا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ

گمان ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

شادی کو ابھی چند مہینے ہی ہوئے تھے کہ میرا قدرت اللہ کے یہاں جانا نہیں ہو سکا۔ ایک دن خیال آیا کہ چلو قدرت اللہ کے حالات
خیال آیا کہ چلوں آج اُس کی خیریت دریافت کروں اور دیکھوں کہ بیچارا کس طرح ماڈرن سسر بنا بیٹھا ہے ... رہا
ہے۔ گھر پہونچا تو دیکھا کہ کنڈی کے اوپر کال بیل لگی ہوئی ہے۔ گھنٹی بجائی تو کچھ دیر بعد قدرت اللہ، سیمائی اور ...
تبسم لئے ہوئے نمودار ہوئے۔ وہ تہمد اور بنیان کے بجائے پتلون ... قمیص پہنے ہوئے تھے ...

اس کی رعایت سے گڈ مارننگ کہا تو کچھ محجوب ہو کر " وعلیکم السلام " کہتے ہوئے مجھے کمرے کے اندر لے گئے جہاں اب تخت اور مونڈھوں کے بجائے صوفہ اور کرسیاں پڑی تھیں۔ درمیان کی نیچی میز پر بیڑی کے بنڈل اور دیا سلائی کے بجائے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر رکھا ہوا تھا۔ نیچے زمین پر تنی دری کا فرش تھا اور اس کے بیچ میں ایک خوشنما قالین بچھا تھا۔ میں نے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے پوچھا " بھئی قدرت اللہ! اب اپنی بیڑی کے ٹکڑے کہاں پھینکتے ہو؟" قدرت اللہ کی یہ پرانی عادت تھی کہ جہاں بیٹھتا اس کے چاروں طرف بیڑیاں پی پی کر ان کے ٹکڑے بکھیر دیتا، یہی یار سا ٹوک چکا تھا۔ لیکن مرد نادان پر کلام نرم و نازک بے اثر والا مضمون تھا۔ ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔ " بیڑی پینا میں نے چھوڑ دیا ہے۔ اب دن میں صرف ایک آدھ سگریٹ پی لیتا ہوں۔ اس کے لئے وہ ایش ٹرے رکھی ہے! " اور واقعی آتش دان پر ایک ایش ٹرے بھی رکھی تھی۔ اندر گھر میں ٹیلی ویژن پر کوئی فلم جاری تھی اور اس کے گانوں کے ساتھ لڑکیوں کے قہقہوں اور چٹکلوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ قدرت اللہ کو دوا کھانے سے چڑھ تھی اور آج تک میں نے کوئی دوا سوائے گل قند کے جسے وہ غذا کہتا کھاتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت اس نے اپنی جیب سے ایک پلاسٹک کی ڈبیا نکالی اور اسے کھول کر دو کیپسول اپنے منہ میں رکھے اور انہیں بغیر پانی کے نگل گیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اس نے شاید یہ حرکت مجھے چڑھانے کے لئے کی ہے اور میں چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا لیکن وہ لپکا اور بڑے خلوص سے اپنے ہاتھ میرے کاندھوں پہ رکھ کر مجھے بٹھا دیا اور یہ کہتے ہوئے " نہیں! تم بغیر چائے اور ناشتے کے جا ہی نہیں سکتے۔" گھر کے اندر چلا گیا۔ ؎

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں\
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

خیر قدرت اللہ کو چھوڑیے وہ تو ماڈرن سسر بننے کے امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو گئے۔ حالانکہ اس کامیابی کے لئے انہیں کیا کیا ذہنی اور جسمانی قلابازیاں کھانا پڑی ہوں گی اُن کے تصور ہی سے دل کانپتا ہے۔ مگر ان کا سا لچکدار ہو جانا ہر سسر کے لئے ممکن نہیں ہو سکتا۔ ع

اللہ اگر توفیق نہ دے ، انسان کے بس کا کام نہیں

عام طور سے آج کل کے سسر کی اپنے داماد اور بہو سے نہیں بنتی۔ دونوں کے سوچنے اور سمجھنے کے انداز میں بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ پچھلے زمانے میں ہر سسر اپنے داماد کے سامنے اپنی حیثیت بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کی کوشش کرتا لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ عام گھر سے میرا دوست اپنے داماد کی آمد کی خبر سن کر رنگین ٹیلی ویژن پڑوسی کے گھر سے منگا لیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ کیا حماقت ہے تو کہنے لگا " ۱۰ بجے دن سے ایک لڑکا ملنے آتا ہے پھر رنگین ٹی وی دیکھ کر رعب بیٹھے گا۔" وہ بیچارہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جو داماد سسر کے گھر میں رہتے ہیں وہ ما تحت ہوتے ہیں۔ داماد اب گھر میں بیٹھے کر نہیں بازاروں میں گھوم گھوم کر اچھے ہوٹلوں کی فہرست بناتے ہیں۔

(برطرح: غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا۔ شاد عظیم آبادی)

رضا نقوی واہی

جو دل نے حضرتِ کوثر[1] کو اشتعال دیا
انھوں نے طرح کا مصرع کوئی اچھال دیا
خوشی سے کھل گئیں باچھیں غزل نویسوں کی
کسی نے جیسے انھیں مژدۂ وصال دیا
سخن نوردی کا موقع جو دستیاب ہوا
تمام ذہن میں جتنا تھا سب نکال دیا
لغت کو چھان پھٹک کر قوافی جمع کیے
کسی نے میر کے دیوان کو کھنگال دیا
یہ مال ہاتھ لگا جس کو جس قدر اس نے
ہر ایک قافیہ پر ایک شعر ڈھال دیا
بلا کے طرحی نشستوں میں دوستوں نے مجھے
ہر ایک بار بڑی الجھنوں میں ڈال دیا
رفوگری کا یہ دھندا مجھے نہ راس آیا
کبھی قبول کی، دعوت کو گاہ ٹال دیا
مگر خلوصِ محبّاں نے اس نشست میں آج
مرے دماغ میں کانٹا جو تھا نکال دیا
"خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم"
سروشِ فکر نے یہ تحفۂ خیال دیا
لگا کے خون شہیدوں میں ہو گیا شامل
کنوئیں میں طرح کے میں نے بھی ڈول ڈال دیا
گلہ کرے گی نہ اب ارضِ شاد واہی سے
غریب جان کے تو نے مجھی کو ٹال دیا

[1] میرے کرخر منتظم ادارہ

ضمیریات

ضمیر جعفری
(آسٹریلیا)

کھیت کھودے ہیں خندقوں کے لیے
شہر خالی ہیں راکٹوں کے لیے
آپ کو دکھ ہو کوئی خدا نہ کرے
ہم جو زندہ ہیں جسم منوں کے لیے
لوگ ننگے رہیں تو رہنے دو
سوٹ سلواؤ نوگزوں کے لیے
اب بھی موجود ہیں بحمد اللہ
ہم مسلمان بت کدوں کے لیے
گرکے اونچی دلوں کی دیواریں
پل بناتے ہیں رابطوں کے لیے
"لیبرل اسپورٹ" کا زمانہ ہے
تو بھی منگواؤ تامتوں کے لیے
آدمی کے سمیت اب بھی ہیں
بار برداریاں گدھوں کے لیے
اپنی جمہوریت میں اترے ہیں
کچھ گھرانے منسٹروں کے لیے
خود مکینوں سے معتبر ہیں کہیں
میز اور کرسیاں گھروں کے لیے
زرگروں کے قل سے کب ڈرتا
چند شیشے ہیں پتھروں کے لیے
نقش گھر کا جدید ہو [illegible]
اب جگہ [illegible] کے لیے
یہ جہاں ہے بڑا اکھڑ [illegible]
جو جلوں اور دل جلوں کے لیے

ویادار میں اس کے قرابت دار ضرور مل جائیں گے۔ آپ نئی نوکرانی کو دیکھ لیجئے کیا مجال کسی قبیلے کا نہیں اگر وہ
چار گھنٹے کام کرتی ہے تو اس میں دو گھنٹے شیخی بگھارنے میں اور ایک گھنٹہ بالوں کو سنوارنے میں صرف کرتی ہے گھر
میں بچا ہوا کھانا دعوت میں کھالیں لیکن اس کے لیے کاڑھے دودھ کی چائے ضرور بنے گی۔ بیگم صاحبہ دوسری وجہ
خاموش ہی رہیں بلا سے پردہ ٹی وی۔ دیکھتی رہے گی اگر اس کی ناز برداریوں میں ذرہ برابر بھی کوتاہی ہو جائے
تو وہ اپنی دھال جانے کے لیے ایسی رنگ کا منتری شروع کرے گی کہ جسے سن کر بی بی کا بلیڈ پریشر مزید بڑھ جائے گا
بی بی مانک کے آگے ہاتھ جوڑ کے التجا کریں گی کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا ہمیں معاف کیجئے کیونکہ سبھی جیالی جانتی ہیں
کہ شوہر نہ ہو تو شوہر کے کام چلایا جا سکتا ہے لیکن نوکرانی کے بغیر گھر کی رانی کا حال برا ہوتا ہے۔

اکبر کو اپنے نو رتنوں پہ ناز تھا تو ہمیں اپنی چار سہیلیوں پر بڑا فخر ہے۔ ایک شگوفہ ہے تو دوسری
نیر تیسری افسانہ نگار کی بہن ہے تو چوتھی منسٹر کی سکریٹری۔ ہم یقین سے کہتے ہیں کہ اگر آپکو ان میں سے کسی
ایک کی محبت بھی نصیب ہو جائے تو بس آپ کے نصیب جاگ جائیں گے۔ ہم ہمیشہ ان کی رنگین داستانوں میں
اس قدر کھوئے رہتے ہیں کہ اپنی بے رنگ زندگی کو بھی بھول جاتے ہیں۔ شبنم شاعرہ ہے۔ اردو ادب میں اس
کا کیا مقام ہے یہ تو ہم نہیں جانتے البتہ وہ ہم سب میں ممتاز مقام کی مالک ہے۔ اسے جب اپنے نام کی شہرت کا
احساس ہوا تو شاعری کا شوق بھی چرایا اس شوق کے چراتے ہی اس نے دو چار مشہور شاعروں کے مجموعوں کو سامنے
رکھا کہیں سے تشبیہات چرائیں تو کہیں سے موضوعات جوڑ لئے ہوئے مرکب سے جب غزلیں تیار ہونے لگیں تو
مشاعروں میں شرکت کا سلسلہ بھی چل نکلا وہ تو کہنا ہی کیا جب مشاعروں میں شرکت کرنے لگی تو طوفان کھڑا ہو گیا
کسی کی نظم غالب کی تراکیب پر کسی کی نوجواں شاعر کے مضامین پر سب اس پر نثار ہونے لگے۔ ایسے بھی ہماری شاعری
میں سرقہ و توارد کی رسم پرانی ہے۔ شبنم کی غزلیں ہولیوں کی عنایت اور اکادمی کی مالی اعانت سے منظر عام پر آگئیں
تو ادارۂ التحریرات المنصفین نے اسے اسٹین لیس اسٹیل تحفے اور شال سے نوازا۔ اب تو وہ بفضل خدا اپنے
آپ کو ہندوستان کی پروین شاکر سمجھنے لگی ہے۔ سو بدقسمتی سے بکھر رہ گئی۔ اسے تو گلوکارہ بننا چاہیے تھا
افسوس کہ اس کی آواز میں وہ سحر نہیں پھر بھی اپنا گلا صاف کرنے کیلئے کالی مرچ کھاتی رہتی ہے۔ کالی مرچ کے استعمال
سے اس کا رنگ ضرور کالا ہو گیا ہے لیکن اس کی آواز پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے یقین ہے کہ غزل گائیکی میں آخر
کے عباس کا نام ہی باقی رہے گا۔ جب بھی ہم اس کے گھر جاتے ہیں تو وہ ریاض کرتی رہتی ہے ہم نے لاکھ سمجھایا کہ
پہلے ریاضی کی مشق کر لو تو خود بخود ریاضت کرنا بھی آجائے گا پر وہ مانتی نہیں۔ بسم اللہ خاں اور احمد علی خاں کے سوا بھلا
اسے کون سمجھا سکتا ہے۔ افسانہ تو بس نام کی افسانہ ہے۔ اس نے گھٹنوں کے بل چلتے وقت ہی بات کو افسانہ بنانا
شروع کیا تو اس کے بڑے بھائی نے باقاعدہ افسانے لکھنے شروع کیے۔ لکھتے لکھتے جب بیس سال کی عمر میں انہیں
شہرت نصیب ہوئی تو بس بہنوں کی قسمت چمک اٹھی۔ افسانہ جب بھی مشہور افسانہ نگاروں کی صحبتوں کا ذکر
کرتی تو شبنم کا دل جل جاتا کیونکہ جھوٹ موٹ کا گاتا ہے۔ افسانہ کی باتیں [illegible]
کاش ہم بھی کسی مشہور فنکار کی بہن ہوتے۔ فنکار پر صرف فن کو سنوارنے کا بھوت سوار رہتا ہے جبکہ اس کے خاندان
والوں پر شہرت کا۔ ہماری قسمت میں نہ شہرت لکھی ہے اور نہ ہی دولت اسی لیے تو بیس سال سے [illegible] رہیں۔

خالد عرفان (پاکستان)

ہوٹلوں میں شاعری

ہوٹلوں میں شاعروں کا قصد کرنا عام ہے
فرصت ہو تو یہاں بھی بور کرنا عام ہے

ہوٹلوں میں خدمت شعر و سخن ہونے لگی
صبح تا ہم ادارہ پر تعمیر فن ہونے لگی

ہوٹلوں میں شب گزاری شاملِ آداب ہے
شاعری کل وقت کا یہ پارٹ ٹائم جاب ہے

میں یہاں آیا ہوا ہوں اک ضروری کام سے
ایک مصرعہ ذہن میں اٹکا ہوا ہے شام سے

ہوگیا کل ایک ہوٹل میں ہمارا بھی گزر
اور ہم آداب محفل سے مکمل بے خبر

ٹھیک بجے میں غزل اپنی سنانے آگیا
اپنا لطیفہ بیت کرتے ڈاکٹر ملنے آگیا

میزباں فن کار مجھ کو ویلکم کہنے لگے
آج کی محفل کا صدر محترم کہنے لگے

کیا خبر تھی بات اتنی مختصر ہو جائے گی
ایک ہی شاعر سے ملنے میں سحر ہو جائے گی

چاہتے سب تھے کہ یہ مرغا ہمارے ہاں آئے
وہ سمجھ بیٹھے تھے گویا مجھ کو قربانی کی گائے

میں بہ مجبوری ادب کے اس گڑھے میں دھنس گیا
چند سامع خوش ہوئے لو ایک سامع پھنس گیا

حاضرینِ بزم میں کچھ برہمی ہونے لگی
شاعروں کے درمیاں شاعر کشی ہونے لگی

ایک صاحب تو بہت ہی خوش مزاجی سے ملے
تاکہ وہ جاری کریں شعر و سخن کے سلسلے

اپنے پہلو میں مجھے تشریف رکھنے کو کہا
پھر مخاطب ہو گیا مجھ سے ادب کا اژدہا

آپ اس محفل میں آئے ہیں تو کچھ کھائیں حضور
پہلے بسکٹ پان کا ہی شوق فرمائیں حضور

آپ بسکٹ لیجیے نمکین لیت فرض ہے
میں نے جب بسکٹ لیا بولے کہ مطلع عرض ہے

وہ مری نازک سماعت پر ستم ڈھاتے رہے
شعر کے جو ڈونگرے لاتے مجھ پہ برساتے رہے

ہم بطور داد ان کے شعر دہراتے رہے
شاعرِ شیریں بیاں کا ہم نمک کھاتے رہے

بوریت سے لگ گئے تھے میری پیشانی پہ بل
اور وہ گنگنا رہے تھے اپنی پندرھویں غزل

بالآخر جب وہ ہوٹل کی فضا پر چھا گئے
داد دینے کے لیے ہوٹل کے بیرے آگئے

سب ذخیرہ کر چکے جب ختم وہ استادِ فن
پیٹ میں میرے بھی پھرنے لگا [illegible]

بولے پھر تم بھی سناؤ شاعرِ دامن تہی
گر تمھیں تازہ غزل کوئی رباعی ہی کہی

وقت کافی ہو چکا ہے آپ جلدی کیجیے
میں نے جب مطلع پڑھا بولے اجازت دیجیے

بیٹھے بیٹھے ہماری جھپکی لگ گئی ایک نیند لینے کے بعد داد و تحسین کے ہاؤ ہو سے نیند جو اچٹی تو ہمیں ایک نہایت بزرگ شاعر، فرشتہ صورت پڑھتے نظر آئے۔ ہماری پوری نظر عنایت انھیں پر تھی۔ مشاعرے کے بعد اکثر کو مودبانہ سلام کیا۔ شعرائے کرام میں زیادہ تر تعداد ان اساتذہ کی تھی جو برسوں سے پڑھ رہے تھے اور جنھیں دیوان کے دیوان ازبر تھے اور جو مشاعرہ پڑھنے کے لیے خود بھی شاعری کرنے لگے تھے کہ اگر ذکر کرتے تو ان کی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جائیں۔ یہ حضرات البتہ خود اکتسابی کا اعلان کر چکے تھے اور ساری زندگی کے لیے اس دائرے میں محصور رہنے کو بخوشی تیار تھے۔ البتہ دیگر حضرات ہرگز ہرگز اپنی شاعری کو اکتسابی سمجھنے پر راضی نہ تھے۔ البتہ آفتابی اور ماہتابی سمجھنے میں کوئی ہرج نہ تھا اور جب سے زرد غزل اور کالی غزل دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا وہ تمام تر شاعری کو آسمانی سمجھنے لگے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ سامعین اور سامعات کے لیے آسمانی ناگہانی ثابت ہو۔

بڑے بڑے جید علما اور شعرائے کرام سے ملاقات ہوئی سب اپنے کو شاعر اعظم سمجھتے اور دوسرے کو داد دینا گویا کسرِ شان خیال کرتے تھے یہ بھی سچ ہے کہ اگر ان کے مزاج میں یہ خلل نہ ہوتی تو خرقہ درویشی نہ اختیار کر لیتے۔ سو اس وقت وہ سب خرقہ شاعری اختیار کیے ہوئے تھے۔ خرقہ درویشی پر یاد آیا کہ اگر شاعروں کے لیے کوئی یونیفارم طے کر دیا جاتا تو سامعین کے لیے کتنی آسانی ہوتی۔ بغیر یونیفارم کے اسٹیج پر ہی نہ آتے۔ دور ہی سے دیکھنے پر پہچان لیے جاتے۔

انھیں بزرگ شاعر مذکور کہ جن کا بیان آچکا ہے، کے سامنے ہمیں دیکھتے ہی بولے ـــــ بی بی ایک کام کرو ہر شاعر سے اس کی پہلی غزل یا پہلا شعر پوچھ لو اور یہ بھی کہ کس عمر میں کہا گیا۔ تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ہمیں بھی یہ ترکیب پسند آئی۔ بزرگ شاعر حضرت الہام اکبرآبادی جن کی شاعری کے الہامی ہونے میں کسی کافر کو ہی شک ہو سکتا تھا۔ شمالی ہند کے کسی دور دراز مقام کے رہنے والے تھے۔ بقول ان کے عربی اور فارسی ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں (اب تو لونڈی غلام آزاد کر دیے گئے ہیں ـــــ) اور ان کی مادری زبان اردو ـــــ پھر لکھا ان کی ماں کو نہ عربی آتی تھی اور نہ فارسی۔ رہ گئی اردو تو وہ ان کی بھی مادری زبان تھی۔ ایسے لکھنے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی موصوف صرف مادری زبان میں شعر کہتے تھے۔ ہم نے کہا۔

"استاد، آپ ہی اس تجویز کے موجد ہیں اس لیے اس بے نقط زبان کے مسئلہ کو آپ ہی حل کیجیے۔ کہنے لگے۔ بی بی میں کہوں گا تو مانے گا کون۔ بجنوری نے اس شعر کو نسخہ حمیدیہ میں غالب سے منسوب کر دیا۔" ہمارے کان کھڑے ہوئے۔ کھڑے کانوں نے ہمارے حسن میں خاصہ اضافہ کر دیا ہوگا۔ لیکن ہم نے اس جانب توجہ نہ دی اور یوں گویا ہوئے۔

"فرمائیے تو سہی، ہم یقین کر لیں گے ـــــ بھلا آپ پر شک کریں گے تو کس پر کریں گے؟"

فرمایا۔

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

بیان جاری رہا ـــــ غالب کا پورا کلام ایسے الحاقی عناصر سے بھرا پڑا ہے۔ اس وقت ہماری عمر رہی ہوگی یہی کوئی آٹھ سال میں نے اور انھوں نے بچپن میں تقریباً اکبرآباد سے [illegible] تھا۔ پھر [illegible] چھوڑ گئے دہلی

سے گردن ہلائی، مجبوراً مونچھ کی شکنوں کو درست کیا، زبردستی گلا صاف کیا اور ہماری طرف داد خواہ نظروں سے دیکھا۔ ہم نے دھیرے سے کہا۔ اچھا محترم، مقطع تو مشکل نہیں ہے۔

کہنے لگے "تم کیا سمجھتی ہو" ہم نے کہا" آپ سے تو ڈر لگنے لگا ہے۔ آپ اپنے آپ کو بے نیام کہہ رہے ہیں" زور سے ٹھٹھا لگا کر ہنسے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے نتیجہ میں ہماری ساڑی پر غش کا پانی کا نمونہ بن گئی۔

کہنے لگے "وہی سلیقہ"، بھلا ذرا تو گہرائی میں اترتیں"۔ ہم نے آس پاس جھانکا، کہیں کوئی گہرائی نہ تھی سپاٹ فرش تھا۔ دری بچھی زمین۔ ہم ڈر رہے کہ کہیں یہیں کہیں کوئی تہہ خانہ نہ ہو۔ مشاعرہ ایک قدیم عمارت میں جشن یادگاری کے طور پر منایا جا رہا تھا جی ہاں حضرت یادگاری خفیف مرشدی کا جشن تھا۔

مگر ابھی الہام صاحب کی بات پوری نہیں ہوئی تھی اب ہم کھو گئے تھے، ارشاد ہوا۔ محترمہ (طنز یہ کم تادیبی زیادہ) ہم نے صرف اپنے کو نہیں، اپنے الہام کو بے نیام کہا ہے"۔

الہام صاحب سے فیضیاب ہونے کے بعد، ہماری ہمت نہیں رہی تھی کہ کسی اور شاعر سے رجوع ہوتے مگر خود انہیں نے دو چار حضرات کو آواز دے کر بلایا اور ہم سے زیادہ ہمارے مقصد سے تعارف کرایا۔

حضرت شمشیر صاحب کی تو باچھیں ہی کھل گئیں۔ باچھوں کے کھلنے میں خلوص نیت کو دخل ہوتا ہے اور یہ کہ کھل کھلنے سے بھی کم وقت لیتی ہیں اور بناوٹی ہی کھلنے کے لیے جاتی ہیں۔ ان میں بناوٹی پن بالکل نہیں ہوتا۔

ہماری تو و توش کے شمشیر صاحب جو اگر مشاعرہ میں نہ ہوتے کسی اکھاڑے میں ہوتے یعنی یوں سمجھئے کہ وہ صرف فن شاعری میں نہیں فن کشتی گری میں بھی ناسخ کے ہم پلہ تھے اور موجودہ عہد کے پہلوان سخن کہلائے جا سکتے تھے۔

بادشاہ اور نواب کم سے کم خطاب تو دے دیتے تھے۔ ویسے شمشیر صاحب کو بھی خطاب دیا گیا تھا۔ عوام الناس کی طرف سے کیونکہ مشاعروں کے علاوہ ان سے ملاقات کا مقام صرف اور صرف اکھاڑہ ہے اور جب وہ پہلوانی کے یونیفارم میں ہوتے ہیں تو گویا بالکل اپنے پورے فارم میں ہوتے ہیں۔ اس لئے شمشیر برہنہ کہلاتے ہیں حالانکہ وہ اس وقت صرف شمشیر بلکہ شمشیر بانیام بنے ہوئے تھے۔ انھوں نے اپنے پہلے شعر سے ہمیں نوازا کہ جب دس سال کی عمر میں وہ اکھاڑہ میں اترے تھے تو سہراب ہند کو پچھاڑ دیا تھا اور یہ شعر پڑھا تھا ؎

کوئی کوئی میدان میں یوں دھم سے نہ ہوگا
رستم سے ہوا کام تو کیا ہم سے نہ ہوگا

ہم جان بچا کر کھسکنا ہی چاہتے تھے کہ پکڑے گئے اور الہام صاحب نے ان کی غزل بھی نوٹ کرا دی جو ہم نے اسی وقت نوک زبان کر لی۔ اور اب حرز جان بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ سادگی ملاحظہ ہو ؎

زندگی امتحان ہے پیارے — تم بھی کہہ لو زبان ہے پیارے
دوستی مہر و انسیت چھوڑی — اپنا دشمن جہان ہے پیارے

پھر خود ہی ہنسے اور الہام صاحب کے زانوئے مبارک پر اپنا دست مبارک مار کر ارشاد فرمایا۔
"آپ کے تو علم میں ہی ہے، جب پہلوانی اختیار کی خاندانی زندگی سے ناطہ ہی توڑ لیا۔

ہے جیل کی سزا نہ دو ہم کو — یہ فقط اللہ میاں ہے پیارے

ان سے شمشیر آزمانا ہے — یہ کوئی پہلوان ہے پہلے سے

ہمارے صبر کا پیمانہ چھلکنے کے بجائے چٹخنے لگا۔ ڈٹ بھی گئی مگر آج ایسے پھنسے تھے کہ راہ فرار نہ ملتی تھی مگر ابھی الہام صاحب کے قریبی دوست برہان جونپوری اور رہ گئے تھے۔ ان تینوں حضرات کو ساتھ ہی جانا تھا۔ گاڑی تھی شمشیر صاحب کی۔ انھیں کی طرح دراز قامت، دوسرے پہیوں والی، حالانکہ الہام صاحب صوفی صفت آدمی تھے۔ ہر چند کہ ابھی خرقہ درویشی سے آراستہ نہیں تھے لیکن شمشیر صاحب کے تعارف پر ہی گاڑی چلنے والی نہ تھی۔

گاڑی اٹکی ہوتی تھی کہ میزبان مشاعرہ کو بھی چلنا تھا۔ آج کی محفل کے میزبان (فقط شعراء کی محفل) جناب برہان جونپوری ہی تھے۔ عالم فاضل، نقاد، شاعر، شاعر دوست اور شاعر نواز سبھی کچھ تھے اور کہ انھیں کے گھر ہونے والا تھا، مگر ہم پر تو دوہری بلکہ تہری مار تھی۔ خدا کی مار ہی تو تھی جو ہم یہاں تشریف لائے۔ شاعروں کے منہ آئے اور اس پر طرہ یہ کہ مشاعرہ گاہ جیسا کہ قاعدہ عام ہے شہر سے پانچ سات میل دور تھی۔ کسی نے سچ ہی لکھ دیا ہے کہ جوں جوں محبت میں رات بھیگتی جاتی ہے شعر کے معنی نہ جانے کون سے محاسن پیدا ہوتے جاتے ہیں جو دن کے اجالے میں کبھی نظر نہیں آتے۔ اور کہ دن کو اگر مشاعرہ برپا کیا جائے تو مسافر راستہ اور شاعر پڑھنا بھول جاتے ہیں۔

سو ہوا یوں کہ ہم ہمت کر کے ذرا سا اس عمارت سے باہر آئے یہ سمجھ میں ہی نہ آتا تھا کہ شمال کو جائیں کہ جنوب کو ہر ایک سے پوچھتی تھی کہ جاؤں کدھر کو میں گھبرا کے ہم واپس آ ہی گئے۔ ہمیں اس وقت تک برہان صاحب کا نام بھی معلوم نہ تھا، ہم نے میر سے نام پوچھا۔ آج کے مشاعرہ میں میزبان ہونے کی وجہ سے انھوں نے پڑھا ہی نہ تھا اس لئے ہم انجان تھے۔ فرمایا۔

نام میں کیا دھرا ہے؟ میر کو دیکھو نا۔ نام بھی میر اور تخلص بھی میر۔ لوگ کہتے ہیں کوئی اور لفظ ہی نہ ملا۔

ہم نے کہا "وہ تو میر کی یادداشت ہی خراب تھی۔ اگر دماغ پر زور دیتے تھے تو دورہ پڑ جاتا تھا۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی — دھوم ہے پھر بہار آنے کی

اکثر تو وہ اپنا نام تک بھول جاتے تھے۔

زور سے ہنسے "ارے بھئی یہی تو" (خضاب کے ساتھ یہی تو مشکل ہے اور لوگ ہیں خضاب اور عمر چھپانے کا سرٹیفکٹ ہر وقت اپنے ساتھ رکھیں —!!) ہم دل ہی دل میں اپنے سے خفا ہو رہے تھے کہ آواز کا تسلسل ہمیں اپنی طرف راغب کرنے لگا۔

"یہ بھی ایک شاعرانہ ادا ہے۔ اس سے شخصیت میں ذرا بھاری بھرکم پن آجاتا ہے۔ اب میرا نام ہی دیکھ برہان الہدیٰ برہان۔

"بجا فرمایا" ہم پھر واپسی کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ برہان صاحب کی غزل ہماری سماعت سے ٹکرائی۔

برہان ہیں ہم صاحب برہان کوئی اور نہ ہوگا
ہم سا ترا پرسان کوئی اور نہ ہوگا
کہتے ہیں زمانے کی شکایت وہ سبھی سے
شاید انھیں پہچان کوئی اور نہ ہوگا

وہ دست طلب دیکھ کے دیتے ہیں دعائیں
تو جیسا ہے انساں کوئی اور نہ ہوگا

مقطع اور مطلع سے حسین سنگم برہان صاحب کی اس غزل میں نظر آیا۔ آخری شعر ہمارے شعور اور لاشعور پر دستک دیتے رہا تھا اور ہم اپنے دست طلب کو دیکھ رہے تھے۔
یا خدا نادین بخشوا سند کی ایسی سزا۔

**

مختار یونس
(مالیگاؤں)

آتنک وادی کے نام....

دہشت مآب بارر ایبل (Hornorable) آتنک وادی صاحب

شیم علیکم (Shame upon you)

تمہارا دھمکی نامہ ملا۔ پڑھ کر میں تھر تھر کانپنے لگا۔ رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بدن میں کرفیو سا لگ گیا۔ آپ کے خط کے یہ دو جملے خونریزی کے ستر حملوں کے برابر تھے۔ اب میرے دل و دماغ کے سوفٹ ویئر اپنے آپ کو "انا تھ" محسوس کر رہے ہیں۔ آپ نے لکھا تھا۔

"عظیم الشان خریکار ۷ مہینوں کے بعد پہلی بار تمہارے شہر میں۔ بیٹا اب تمہاری خیر نہیں۔"

آخر آپ میری جان کے گاہک کیوں ہو گئے ہیں۔ میں نے آخر آپ کا کیا بگاڑا ہے ؟ کیا میں نے آپ کی دکان کا ادھار نہیں چکایا ؟ کیا میں نے آپ کے مکان کی کوئی اینٹ چرائی ہے ؟ کیا میں نے اپنی بکریاں آپ کے کھیت میں منہ مارنے کے لئے چھوڑی ہیں۔ قسم لے لو آج تک کسی کو کبھی چھیڑا ہو۔ حلف اٹھوا لو جو کبھی آپ کے بدمعاش جونیئر صاحبزادوں کو ڈانٹا ہو۔ انھوں نے میرا پانی کا مٹکا پھوڑ ڈالا۔ میں نے شکایت نہیں کی بلکہ کامیاب نشانہ بازی کی داد دی۔ اور انھیں مستقبل کا "ہیرو" کہہ دیا۔ بس یہی خطا ہو گئی۔ آپ کے منی بدمعاش مجھ سے چڑ گئے اور آئے دن میری کھڑکیوں کے ذریعہ اینٹ پتھر گھر میں برسنے لگے اور میرے خلاف آپ کو ایسا بھڑکایا کہ اب تک آپ کی آنکھیں شعلے برسا رہی ہیں۔ آپ کی تحریری دھمکی میں گو آپ کا نام درج تھا نہ آپ کے دستخط تھے مگر آپ کی لکھاوٹ کا انداز سب سے جدا ہے اور میں نے اُسے پہچان لیا۔ آپ میں قتل و خون کے اثرات سرایت کر گئے ہیں۔ آپ مجھے ہلاک کر دیں گے تب بھی دنیا آپ کو بڑا نہیں کہے گی۔ دیکھئے آپ غصہ بلغم بیت متحرک دیجئے۔ آپ کو بھگوان کی اور کسی آرمی کی بندوقوں کا واسطہ آپ کو اپنے خونخوار بچوں کی قسم، آپ اپنی دھمکی واپس لے لیجئے۔

آپ [illegible] کو فروغ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ آپ [illegible] کا شگوفہ [illegible] کے ماہر ہیں۔ مجھے اپنے خفیہ ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ پنجاب کے دہشت گردوں سے آپ کی گہری [illegible] ہے۔ وہ آپ کو تحفے میں [illegible] اور [illegible] آپ انھیں [illegible] اور [illegible] جہاں [illegible] کے پاس [illegible] ہے [illegible]

ان لینڈ لیٹر بم، پارسل بم اور پتہ نہیں کون کون سے بم آپ کی جیبوں میں بھرے رہتے ہیں۔

ایک آتنک وادی کے بچے کی سالگرہ پر آپ نے ایک خوبصورت کھلونا تحفتاً بھیجا تھا مگر وہ آپ کو سود سمیت لوٹا دیا گیا یعنی اس میں بارود کی تباہی بھی فٹ کر کے آپ کو لوٹا دیا گیا۔ ایک ہدایت بھی کھلونے کے ساتھ بھیجی تھی۔ "خبردار! اس کھلونے سے پرہیز کیجئے اور اسے فوراً کسی پبلک مقام پر استعمال کیجئے۔ کتنی تباہ کاریاں ہوتی ہیں، کتنے لوگ مرتے ہیں کتنے زخمی ہوتے ہیں، کتنوں کی سکرات لگی ہے۔ کتنا علاقہ کھنڈر بنتا ہے، سب کی تفصیلی رپورٹ دیجئے تاکہ ہم اسے اپنے علاقے میں عمدگی سے استعمال کر سکیں۔

آپ نے وہ کھلونا بم ایک ایسے سینما گھر میں رکھا جہاں فلم کھلونا لگی تھی۔ محمد رفیع گا رہے تھے — کھلونا جان کر تم تو... میں دیکھ رہا تھا آپ نے وہ کھلونا سینما کینٹین کے بازو میں ایک گوشے میں رکھ دیا تھا اور پھر کمپاؤنڈ سے باہر میں نے آپ کو دیکھا، آپ نے کھلونے کو دیکھا کہ دو بچے اس کھلونے سے کھلواڑ کرنے لگے۔ اچانک کھلونا چیخ اٹھا۔ سینما گھر لرزا، اس کی دیواریں ڈر کے مارے سجدہ ریز ہو گئیں۔ دروازے چکرا کر گرے اور سینما بین لوگوں نے اجتماعی طور پر آخری ہچکی لی۔ ایسی تباہی مچی کہ نہ ہیرو زندہ رہا نہ ولین، نہ ہیروئین زندہ بچی نہ کامیڈین۔ شوٹنگ میں حصہ لینے والے تمام ایکسٹرا اور آرکسٹرا مع اسٹوڈیو جل کر راکھ ہو گئے۔

میاں فیئر (Fear) دہشت گرد! آپ اپنی دہشت گردی پر فخر کرتے ہو کہ آپ دنیا کے پہلے دہشت گرد ہیں، آپ سے پہلے کسی ماں کے لال میں یہ جراثیم پیدا ہی نہیں ہوئے۔ ایسے خیالات کو جھٹک دیجئے۔ آپ سے پہلے بھی دہشت گرد ہر دور میں گزرے ہیں۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے دہشت گردی کا تاریخی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ کو انسانی سلاٹر ہاؤز میں تبدیل کر دیا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی بھی فسطائی دہشت گرد تھے۔ انھوں نے اپنی انا کے لئے دنیا کو فنا کرنے کے لئے جنگِ عظیم دوم کی داغ بیل ڈالی۔ نکسلائیٹ اور آنند مارگی بھی دہشت گرد تھے۔ یہ تو آپ کی تاریخ رہی ہے۔ آج آپ کے نقشِ قدم پر تمام فرقہ پرست سینائیں، پریشدیں، سنگھٹنائیں دھرم کے نام پر دہشت کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں۔ پولیس کے محکمے میں بھی آپ کے ہم خیال دہشت وادی آ گئے ہیں، جب ہی تو پی اے سی، ایس آر پی جہاں جاتے ہیں جنرل ڈائر کی طرح لوگوں کو بھوننا شروع کر دیتے ہیں۔ میرٹھ، ملیانہ اور مراد آباد اس کی خوفناک مثالیں ہیں۔ آپ لوگ اپنے کئے پر پچھتاتے نہیں بلکہ علی الاعلان کہتے ہو۔ "فخر سے کہو ہم دہشت وادی ہیں" ہمارا نعرہ۔ وہ مارا۔ چن چن کر مارا۔ "آنکھ بند کر کے شوٹ کرو۔ دھرم سے قتل کرو۔"

دہشت گردی کا فارمولا ایک پولیس انسپکٹر نے ہمیں ارسال کیا ہے۔ اُن کا نسخہ دہشت گردی حسب ذیل ہے

دہشت گردی = نفرت + اذیت + قوت + بدلہ = وحشت مارڈر / خون خرابہ / قتلِ عام

آپ سے قہر و عذاب کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ آج کا دور جمہوریت کا دور ہے۔ جمہور کو آزادی اور حقوق رکھنے کا حق حاصل ہے مگر آپ لوگ جمہوریت کو ڈائنامائیٹ کرنے پر تلے ہیں۔ تمام قسم کی آزادیاں آپ نے خود لے لی ہیں۔ آپ کے خوف سے بولنے والے، لکھنے والے کب آپ کا شکار ہو جائیں کہا نہیں جا سکتا۔ آپ کی کیفیت کا رنگ دیکھ کر مدر ٹریسا بھی پانی مانگے

(موڈیل) بدل دیتا ہے۔

"اگر فلاں امیدوار کو ووٹ نہیں دیا گیا تو اس حلقۂ انتخاب کی خیر نہیں " یہ ایک دہشت پسندانہ جملہ وورٹروں کے مانند انقلاب برپا کر دیتا ہے۔ اور اس طرح غنڈہ گرد، غلط کار لوگ جیت کر لائے جاسکتے ہیں۔ سہ

جس کو ہو جان و دل عزیز ان کے خلاف جائے کیوں
روپیے نثار زار کیوں کیجئے ہاتھ ہائے کیوں

آپ لوگوں کے خلاف آج عالمی رائے عامہ ہے۔ مگر اسرائیل اگر لبنان کے فلسطینی کیمپوں پر بمباری کرکے دہشت پھیلائے تو وہ جرم نہیں مانا جاتا۔ روس اگر افغانستان میں مجاہدین پر کیمیائی بم برسائے تو وہ مجرم ہرگز نہیں مانا جاتا۔ امریکہ ایرانی جہازوں اور بندرگاہوں پر حملہ آور ہو تو وہ بھی مجرم نہیں مانا جاتا۔ وہ لوگ ہول سیل میں دہشت پھیلائیں تو قصوروار نہیں مگر آپ لوگ اِکّا دُکّا مقامات پر کچھ لوگوں کو نشانہ بنائیں تو ہر ملک آپ کے خلاف ہو جاتا ہے۔ دیکھئے آپ ہم معصوموں پر اپنی دہشت کا سکہ بٹھاتے ہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اس کا رخ اُن قوموں کی طرف موڑ دیجئے جو دہشت گردی میں A-1 (اے ون) ہیں۔

اُمید ہے جناب والا اپنی دھمکی واپس لے لیں گے اور میرے خلاف کارروائی کرنے سے گریز کریں گے۔ فقط

امن پسند پبلک میں سے ایک

مفلس فاروقی (پارسی ٹاکی)

پھولوں کو ہوا دیتے ہیں یوسف ناظم

اندھوں کو دکھا دیتے ہیں یوسف ناظم
لنگڑوں کو بھگا دیتے ہیں یوسف ناظم

بہروں کو سنا دیتے ہیں یوسف ناظم
گونگوں کو گوا (؟) دیتے ہیں یوسف ناظم

روتوں کو ہنسا دیتے ہیں یوسف ناظم
بات ایسی بنا دیتے ہیں یوسف ناظم

ہلچل سی مچا دیتے ہیں یوسف ناظم
سوتوں کو جگا دیتے ہیں یوسف ناظم

کرتے ہیں مسیحائی قلم سے اپنی
مردوں کو جلا دیتے ہیں یوسف ناظم

دیوانوں کو ہشیار تو ہشیاروں کو
دیوانہ بنا دیتے ہیں یوسف ناظم

سنتے ہیں کہ شعلوں کو ہوا دیتے ہیں لوگ
پھولوں کو ہوا دیتے ہیں یوسف ناظم

اک پل میں جلتے ہوئے صحراؤں کو
گلزار بنا دیتے ہیں یوسف ناظم

وہ بھوت جو لاتوں سے بھی بھاگیں نہ کبھی
باتوں سے بھگا دیتے ہیں یوسف ناظم

بس ٹھیک کلیجے میں اتر جاتا ہے
جو تیر چلا دیتے ہیں یوسف ناظم

اک جنبشِ لب، نوکِ قلم سے اپنی
ہنگامے جگا دیتے ہیں یوسف ناظم

بے لطف سی، سادہ سی کسی بات کو بھی
پر لطف بنا دیتے ہیں یوسف ناظم

دراصل وہ مرہم کا اثر رکھتا ہے
نشتر جو چلا دیتے ہیں یوسف ناظم

مجھ جیسوں پہ معیارِ نظر کی اپنے
اک دھاک بٹھا دیتے ہیں یوسف ناظم

ہوتے ہیں جہاں، اپنی ہمہ دانی کا
اک رنگ جما دیتے ہیں یوسف ناظم

ہر سمت بکھر جاتے ہیں گلہائے نشاط
شاخوں کو ہلا دیتے ہیں یوسف ناظم

اک آن میں سمتوں کو بدل دیتے ہیں
دیواریں گرا دیتے ہیں یوسف ناظم

ہے ملکِ ظرافت پہ حکومت کس کی
ہم نام بتا دیتے ہیں یوسف ناظم

پرواز بلندی کی طرف کرتی ہے
طائر (؟) کو پر جو اڑا دیتے ہیں یوسف ناظم

پھر رنگ اترنے نہیں پاتا اس کا
جو نقش بٹھا دیتے ہیں یوسف ناظم

اک سیلِ خیالات کہ تھمتا ہی نہیں
دریا سے بہا دیتے ہیں یوسف ناظم

ہم بات کو بس سوچ کے رہ جاتے ہیں
لفظوں کی قبا دیتے ہیں یوسف ناظم

اظہارِ حقیقت ہے یہ مفلس ورنہ
کیا لیتے ہیں کیا دیتے ہیں یوسف ناظم

محمد رفیع انصاری
(بھیونڈی)

فلم سے علم تک

فرصت کے اوقات میں اپنے تھکے ہوئے ذہن کو آرام دینے کی خاطر کسی شغل کا اختیار کرنا تفریح کے زمرے میں آتا ہے
تفریح کے رسیا لوگوں کی پہلی قسم وہ ہے جنھیں تفریح کے علاوہ کسی اور کام سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ یہ تفریح کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں، تفریح کے لیے ہی جیتے ہیں اور وقت آنے پر تفریح کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اس نوع کے لوگ وقت بے وقت، موقع بے موقع، دیر سویر بس تفریح کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ دوسروں کو "ڈس ہرٹ" کر کے اپنے تفریحی موڈ کو برقرار رکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنھیں تفریح کے علاوہ ہر کام اکتا دینے والا لگتا ہے۔ آفسوں میں، درس گاہوں میں، رزم میں، بزم میں وہ ہمیشہ اپنی مصروفیات کو کوستے اور دوسروں کی خوش بختی پر دل مسوستے رہتے ہیں۔

تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے لیے تفریح ہمیشہ دسترس سے باہر کی چیز ہوا کرتی ہے وہ بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو تفریح کے لائق بناتے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ "فلم" ہمارے یہاں تفریح کا سب سے سستا اور آسان ذریعہ ہے۔ اتنا آسان کہ تفریح کی تیسری قسم کے شائقین کو بھی اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے کسی خاص وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ ہمیں پہلی بار اس سے واسطہ پڑا یعنی فلم دیکھنے کا شوق ہوا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دیں کہ اس وقت ہمارے شہر میں ایک اکیلا سنیما گھر تھا اور ادنیٰ صفوں کے لیے پانچ آنے کا ٹکٹ ہوا کرتا تھا جس کے لیے عموماً سب سے زیادہ رش ہوتا تھا۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے ایک چھوٹے تاریک کمرے میں بند ہو کر ٹکٹ کھڑکی کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس جیل نما کمرے میں بند رہنے کی مدت فلم کی مقبولیت پر منحصر ہوتی تھی۔ فلم اگر بہت اچھی ہوتی تو بکنگ کے لیے بہت پہلے ہی سے لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ اسی لیے پانچ آنے والے ٹکٹ کے لیے مقررہ تعداد میں شائقین کے آتے ہی سنیما گھر کے ملازمین انہیں بے دردی سے کوٹھری میں دھکیل کر مقفل کر دیتے۔ جب فلم شروع ہونے کا وقت آتا تو فرداً فرداً ٹکٹ دے کر سنیما گھر میں داخل کر دیا جاتا۔ لوگ اس ناروا سلوک کو بطور تفریح برداشت کرتے بلکہ شکریہ ادا کرتے تھکتے نہیں تھے جس میں

ڈال کر اوپر ہی سے بچا لیا گیا ہے۔ قطار والوں کو قابو میں رکھنے کے لیے نگران کو کوئی دقت نہ ہوتی البتہ شائقین ہی ان کے ناز اٹھاتے اور چائے پان سے تواضع کرتے۔ یہ سب ہمیں اس کوٹھری میں جانے کے بعد معلوم ہوا۔

دوسرے درجہ کا ٹکٹ بارہ آنے کا ہوا کرتا تھا جسے حاصل کرنا چنداں مشکل نہ تھا۔ اسے آزادانہ ہنستے گاتے حاصل کیا جاسکتا تھا۔ حالانکہ اس کے لیے قطار ضروری لگتی تھی لیکن قطار میں شور شرابے اور غل غپاڑے کا ماحول پابندی سے بپا نہ ہوتا تھا۔ اس کا کاؤنٹر اکثر شو شروع ہونے کے بعد بھی دعوتِ نظارہ دیا کرتا۔ سینما گھر کے راستے سے گزرنے والے یوں ہی اس پر ایک نگاہ ڈال لیا کرتے۔ بعض دفعہ اس کا وا ہونا راہ گیروں کی آتشِ شوق کو بھڑکانے کا موجب بھی بنتا۔ بارہ آنے والے ٹکٹ خریدنے کی ہمت ہمیں تہواروں کے علاوہ کبھی نہیں ہوئی۔ ان موقعوں پر شہر کے تمام راستے بالعموم اس نادر سینما گھر کی طرف ہی جاتے تھے۔ دوست اور دشمن، ادنیٰ و اعلیٰ، پیر و جوان بلا تکلف ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر نگاہ لطف کے امیدوار ہوا کرتے تھے۔

آخری درجہ کا ٹکٹ سوا روپے کا تھا۔ ہمیں اس درجہ میں بیٹھنے کا موقع شاذ و نادر ہی ملا۔ اس درجہ میں گھوم پھر کر وہی صورتیں دکھائی دیتیں جن کا تعلق تفریح کرنے والوں کی پہلی قسم سے ہوتا ہے۔ پہلے اور دوسرے درجہ کے ناظرین تو شو سے بہت پہلے ہی ہال میں آجاتے اور خوب چھان پھٹک کر پوری طرح اطمینان کرنے کے بعد اپنی اپنی نشستوں پر جم جاتے۔ ہال کا جائزہ لیتے ہوئے جب یہ پیچھے مڑ کر تیسرے درجہ کی جانب دیکھتے تو انھیں کرسیاں خالی ہی نظر آتیں۔ آخری درجہ میں بیٹھنے والے اکثر شو شروع ہونے کے بعد تشریف لاتے اور بیشتر باقاعدہ شو ختم ہونے سے قبل ہی برآمد ہونا شروع ہو جاتے۔ ہم نے بعض کو اندھیرے میں آتے اور اندھیرے میں رخصت ہوتے دیکھا۔

جوش و خروش کا فقدان تیسرے درجہ کے لوگوں میں کم پایا جاتا۔ جب کہ پہلے درجہ کے شائقین یعنی پانچ آنے کا ٹکٹ خریدنے والے فلم سے قبل دکھائے جانے والے اشتہارات سے پوری طرح لطف اندوز ہونا اپنا حق سمجھتے تھے۔

لفظ بلیک (BLACK) سے ہماری آشنائی اسی گھر کی بدولت ہوئی۔ پہلی بار اس لفظ کو ہم نے نہیں سنا لیکن جب ہمارے علم میں اضافہ ہوا تو یہ لفظ محض سینما گھر کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہر دشوار مرحلہ پر بلیک کی سہولت سے استفادہ کر کے اپنی بگڑی کو بنایا جاسکتا ہے۔

شوقِ سینما بینی نے ہمیں ایک اور لفظ 'ہیرو' سے متعارف کرایا۔ ہیرو کا لفظ سنتے ہی تصور میں ایک ایسی خوب رو، وجیہ طاقتور، دیدہ ور اور دانش ور شخصیت ابھرتی تھی جس کا وار کبھی خالی نہ جایا کرتا تھا۔ شاطر اور مکار 'ولن' کی جانب سے چلائے گئے تیر ہیرو کے قریب پہنچ کر اپنا راستہ بھول جاتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ فلمیں دیکھ دیکھ کر فلمی ہیرو کے ستے پاکٹ ایڈیشن جگہ جگہ اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے دکھائی دیتے۔ یہ ڈپلی کیٹ ہیرو بھی اپنے اپنے حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ اس وقت بعض فلمی ہیرو کو جو شہرت اور مقبولیت حاصل تھی وہ آج بھی بڑے بڑے نیتاؤں کی دسترس سے باہر ہے۔

کیا پڑھا لکھا کیا ان پڑھ، کیا سنجیدہ اور کیا رنجیدہ ہر کوئی سینما کا قائل اور اداکاروں کا گھائل تھا۔ فلمی تصویروں کے کٹ آؤٹ بچے شیرینی کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ طلبا نصابی کتابوں کے اوراق میں فلمی تصویروں کو چھپا کر رکھتے اور فرصت کے اوقات میں

انھیں ازبر کر کے بیت بازی کی تیاری کیا کرتے۔ اس سلسلہ میں کچھ یادگار واقعات آج بھی ہماری یادداشت میں محفوظ ہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ گرمی کی چھٹیوں میں ہم ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے اکثر دور تک بلکہ بہت دور تک نکل جاتے دوپہر میں باغ کی سیر کرتے ہوئے سڑکوں پر گشت کرتے وقت اور تاریخی عمارات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک ہی گیت گن گنایا کرتے تھے "مجھ کو اس رات کی تنہائی میں آواز نہ دو" ہم لوگ چونکہ ان کی اس عادت سے بخوبی واقف تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ کوئی انھیں بھری دوپہر میں بھی آواز نہ دے گا۔ اسی لیے انھیں اور ان کے الاپے ہوئے نغمے کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ کسی مداخلت کے نتیجے میں وہ کوئی دوسرا اور اس سے بھی بھیانک گیت شروع کر دیں گے۔ کیونکہ ماضی میں ایک مرتبہ ایسا ہو چکا تھا کہ ہم نے انھیں مذکورہ گیت گنگنانے کی پاداش میں چلتے سورج کا واسطہ دیا تھا تو انھوں نے "سویرے والی گاڑی سے چلے جائیں گے" کا ورد کر کے اپنی نامرادی اور الٹی میٹم کا اعلان کر دیا تھا۔ اس لیے جب وہ گنگناتے تو ہم ان کا حوصلہ بھی بڑھاتے اور سامعین کو اشاروں کنایوں سے معاملہ کی نزاکت سے آگاہ بھی کر جاتے۔ ہماری حوصلہ افزائی کے نتیجے میں وہ فرط مسرت میں ایک دوسرا نغمہ "سہانی رات ڈھل چکی نہ جانے تم کب آؤ گے" شروع کر دیتے۔

ہمارے شناساؤں میں ایک "سدو بھائی" بھی ہیں۔ نوعمری کے زمانے میں رت جگے کے موقعوں پر وہ جھوم جھوم کر گاتے — "میں لکھی تمھیں محبت تم نے لکھ دیا فسانہ" پہلی مرتبہ تو ہماری بھی سمجھ میں آیا لیکن جب کوشش پر غور کیا۔ اور سر پر توجہ کی تو وہ بے ساختہ وہ فلمی غزل یاد آگئی کہ ع "ملی خاک میں محبت جلا دل کا آشیانہ" ہم نے موقع محل دیکھ کر ایک دن ان سے پوچھ ہی لیا کہ سدو بھائی اس کا کیا مطلب ہے "میں لکھا تمھیں محبت ۔۔۔" کہنے لگے مطلب صاف ہے۔ میں نے اپنے دوست کو محبت بھرا خط لکھا اور ادھر سے جواب آیا کہ تمھاری محبت میں کوئی حقیقت نہیں ہے یہ تو بس فسانہ ہے۔ پھر ہم نے پوچھا کہ اس کا کیا مطلب ہے "ملی خاک میں محبت جلا دل کا آشیانہ"۔ بولے یہ اس کے بعد کا STEP ہے یعنی جب محبوب نے محبت کو فسانہ کہہ کر ٹھکرا دیا تو عاشق نامراد نے یہ لے چھیڑی "ملی خاک میں محبت ۔۔۔" ان کے جواب با صواب پر ہم اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

ہمیں یاد ہے بڑے امتحان کی جوابی کاپی پر ایک غبی طالب علم نے پرچے کے خاتمے پر اور ختم شد سے پہلے یہ شعر لکھ کر ہمیں فکر مند کر دیا تھا کہ ؎

آ ے ہیں وہ مزار پہ گھونگھٹ اتار کے
مجھ سے نصیب اچھے ہیں میرے مزار کے

اب جب کہ ہمیں فلم دیکھنے کا شوق نہیں رہا ہم اس سیکٹر میں رونما ہونے والے فلمی انقلابات سے قطعی بے خبر ہو گئے ہیں لیکن آج بھی جب ہماری راہ میں کوئی سینما گھر آ جاتا ہے تو ٹکٹ بلیک کرنے والے راستہ روک کر ہمارا عندیہ دریافت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں ۔۔۔ ہم کچھ سوچ کر اور پھر اس کی بات ٹالتے ہوئے مسکرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔

●●

سرپٹ حیدرآبادی

عشق کرکے جوتے کھانے کی ہے دھن
اپنی درگت خود بنانے کی ہے دھن

نقشِ پا پر سر جھکانے کی ہے دھن
بختِ خفتہ کو جگانے کی ہے دھن

آشیاں اپنا جلانے کی ہے دھن
برق کو نیچا دکھانے کی ہے دھن

میہماں اپنا بنانے کی ہے دھن
اپنے گھر ان کو بلانے کی ہے دھن

التفاتِ حسن کا خواہاں ہے عشق
حالِ دل ان کو سنانے کی ہے دھن

بادہ نوشی کھیل بچوں کا نہیں
پینے کی پی کر پچانے کی ہے دھن

رقص میں ہر شے ہے پروائی ہوا
فصلِ گل ہے سنسنانے کی ہے دھن

ساقی کی نظروں میں جچنے کے لیے
بے پیے بھی ڈگمگانے کی ہے دھن

ہم کو کچھ مطلب نہیں اغیار سے
اپنے ہی خود کام آنے کی ہے دھن

ہوتے ہیں نغمے تمہارے دل نشیں
سازِ دل اپنا بجانے کی ہے دھن

بے سُرے پیدائشی سرپٹ ہیں ہم
گائیں گے کیا منمنانے کی ہے دھن

رشید عبدالسمیع جلیل

ہر روز گرل فرینڈ سے ملاقات چاہیے
یا ٹیلیفون ہی پہ سہی بات چاہیے

کمرے میں بند چھت کو سدا گھورتی ہوئی
کب تک اکیلے پن میں گھری ذات چاہیے

ماحول سازگار ہے موسم بھی خوش گوار
کچھ عشق وشق جیسی خرافات چاہیے

ہوتی ہے عید چاند کی رویت پہ منحصر
تھوڑی سی چاندنی کا بھی اثبات چاہیے

کہنے لگا ہے دل یہ تجھے دیکھنے کے بعد
کچھ ماورائے دید شروعات چاہیے

ہے آرزو کا وقت نہ یہ انتظار کا
منزل سہل ہے کچھ ایسی کہ بارات چاہیے

گردہ، کلیجی، پھیپھڑا، بھیجا نکالا ہوا
بھونے کہ اور کیا کوئی سوغات چاہیے

اُٹھ بیٹھ سامنے کریں مرغا بنے بغیر
اس کے علاوہ کیا تجھے دن رات چاہیے

بکواس کر رہے ہو بہت دیر سے جلیل
بیٹھے ہو ٹھیک سے بھی کہ اک لات چاہیے

خامہ بگوش کے قلم سے
(پاکستان)

جگن ناتھ آزاد کا نیا مجموعۂ کلام

"بوئے رسیدہ" یا "بوئے عمر رسیدہ"

یہ سال اس اعتبار سے بہت مبارک ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے درمیان ادبی تعلقات خاصے خوشگوار ہو رہے ہیں۔ پاکستان سے اکٹھے چالیس ادیب دہلی کی اُردو کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے ۔ یہ کانفرنس علی صدیقی نامی اُردو کے ایک بہی خواہ کی کوششوں سے منعقد ہوئی تھی۔ گویا علی بابا ہندوستان کا تھا اور چالیس ادیب پاکستان کے۔ خوشی کی بات ہے کہ ان چالیس ادیبوں میں سے بیشتر انواع و اقسام کے ایوارڈ لے کر واپس ہوئے ۔ مزید خوشی اس کی ہے کہ جن کو پاکستان میں نہیں پوچھا جاتا، اُن کے پوچھنے والے بلکہ آنسو پونچھنے والے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں۔

اس سال ہندوستانی ادیب بھی خاصی بڑی تعداد میں یہاں آئے۔ ان میں زیادہ تر مشاعروں کے شاعر تھے، جن کے نام پہلی اور آخری بار ایک ہی مرتبہ سننے میں آئے۔ کچھ شاعرات بھی تھیں، جن کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کا ترنم تھا، یعنی اگر ان کی شاعری سے ان کا ترنم الگ کر دیا جائے تو باقی کچھ نہیں بچتا، لیکن ہندوستان سے بعض ایسے اہل قلم بھی آئے جن کے لئے اہل پاکستان نے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ مثلاً مجروح سلطان پوری، ڈاکٹر شمیم حنفی، جیلانی بانو، ڈاکٹر احمد سجاد، شمس الرحمٰن فاروقی اور جگن ناتھ آزاد۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان بلند مرتبہ اہل قلم سے ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہو سکا۔ یہ تمام ادیب اپنے اپنے میزبانوں کی خواہشوں کے اسیر تھے، ہم جیسے عام لوگوں کی ان تک رسائی ہوتی تو کیسے۔ بہ مشکل جگن ناتھ آزاد سے ملنے کی خوشی حاصل ہو سکی اور ظاہر ہے کہ اُن سے ملنا پورے ہندوستان سے ملنے کے مترادف ہے۔

جگن ناتھ آزاد ہندوستان کے اُن ڈیڑھ دو شاعروں میں سے ہیں جو پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ وہ ہر سال نہیں، تو ہر دوسرے سال پاکستان ضرور تشریف لاتے ہیں۔ کبھی کسی مشاعرے میں شرکت کے لئے اور کبھی علامہ اقبالؒ کے حوالے سے کسی علمی مجلس میں مقالہ پڑھنے کے لئے۔ یہاں آتے ہی وہ اپنے چاہنے والوں میں تبرک کی طرح تقسیم ہو جاتے ہیں۔ ایک دن میں اُن کی دس دس دعوتیں ہوتی ہیں۔ خوش اخلاق اتنے ہیں کہ ہر دعوت قبول کر لیتے ہیں اور ہر دعوت کے بعد کلام بھی سناتے ہیں۔ لیکن وہ صرف شاعر نہیں، پڑھے لکھے آدمی بھی ہیں، اس لئے ہر محفل میں گفتگو بھی خوب

کرتے ہیں اور یہ گفتگو بڑی فکر انگیز ہوتی ہے۔ انہوں نے حافظہ بلا کا پایا ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں شعر یاد ہیں۔ اپنے ہی نہیں، دوسروں کے بھی۔ اپنا کلام تو ہر شاعر کو یاد ہوتا ہے، لیکن آزاد صاحب کو دوسرے شاعروں کے شعر بھی بڑی تعداد میں یاد ہیں۔ علامہ اقبال کا تو انہیں پورا کلام حفظ ہے۔ محتاط اتنے ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اپنے شعر علامہ اقبال کے نام سے یا علامہ کے شعر اپنے نام سے سنا دیئے ہوں حالانکہ علامہ سے اُن کی عقیدت ایسی ہے کہ من و تو کا فرق مٹ جائے تو کوئی تعجب نہیں۔

اب کے آزاد صاحب کی گفتگو کا مرکزی خیال جموں کا سیلاب تھا، جس میں ان کا ذاتی کتب خانہ برباد ہو گیا۔ وہ اس سیلاب کا ذکر خصوصاً اپنی کتابوں کی "غرقابی" کا تذکرہ بڑے درد انگیز انداز میں کرتے رہے۔ انھوں نے بتایا کہ نہ صرف مطبوعہ کتابیں ضائع ہوئیں، ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے بھی برباد ہو گئے۔ ایک محفل میں جب ہم نے آٹھویں مرتبہ سیلاب کی داستانِ دلخراش سنی تو عرض کیا، اگر آپ اجازت دیں تو ایک دردانگیز واقعہ بلاتشبیہہ ہم بھی سنائیں۔ آزاد صاحب نے نہایت خوش دلی سے اجازت دے دی، حالانکہ محفل میں وہ کسی دوسرے کو بولنے کی اجازت مشکل سے دیتے ہیں۔ ہم نے جو واقعہ سنایا، یہ تھا کہ چند برس قبل ایک مشہور ادیب کے گھر میں اتفاق سے آگ لگ گئی۔ ان کے کتب خانے کی بہت سی نادر کتابیں جل گئیں۔ غیر مطبوعہ تصانیف کے کئی مسودے بھی جل کر راکھ ہو گئے۔ خانہ سوختہ ادیب کے دوست اظہار ہمدردی کے لئے ان کے ہاں پہنچے۔ ہر دوست نے اپنی بساط کے مطابق آتش زدگی کے واقعہ پر اظہار افسوس کیا۔ البتہ ایک دوست نے نئے انداز سے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا "اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے کتب خانے کا جل جانا ایک دردناک سانحہ ہے، لیکن یاد رکھئے ہر شر میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا ہے۔ جہاں مطبوعہ کتابوں کا جل جانا افسوسناک ہے، وہیں آپ کی غیر مطبوعہ تصانیف کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر مطبوعہ رہ جانا اطمینان کا باعث ہے۔ یقیناً یہ آپ کا نقصان ہے، لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ آپ کے قارئین بے شمار متوقع نقصانات سے محفوظ ہو گئے۔"

اس واقعہ سے آزاد صاحب بھی محظوظ ہوئے۔ فرمایا، "چونکہ یہ واقعہ آپ نے بلاتشبیہہ سنایا ہے، اس لئے آپ کی نیک نیتی پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔"

آزاد صاحب کی کراچی تشریف آوری سے کچھ دن پہلے اُن کا نیا مجموعۂ کلام "بوئے رسیدہ" کے نام سے نفیس اکیڈیمی کراچی نے شائع کیا تھا۔ یہ موصوف کا ساتواں مجموعۂ کلام ہے، جو پہلی مرتبہ پاکستان سے شائع ہوا ہے۔ آزاد صاحب کی کراچی میں موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کتاب کے ناشر طارق اقبال اور بزرگ ادیب خواجہ حمید الدین شاہد نے "بوئے رسیدہ" کی تقریب رونمائی کا اہتمام کیا، جس میں کراچی کے کئی مشہور نقادوں نے مقالے پڑھے۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر باقی تمام نقادوں نے جو مقالے پڑھے، وہ "بوئے رسیدہ" کی بجائے تقریب کے دعوت نامے کے مطالعے کا نتیجہ تھے۔ ایک مقالہ نگار سے ہم نے کہا "حضرت! آپ نے کتاب کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا، آزاد صاحب کے بارے میں سامنے کی باتیں کہہ دی ہیں۔" انھوں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے

فرمایا۔ "بات یہ ہے کہ تقریب سے صرف چند گھنٹے پہلے مجھ سے مقالہ لکھنے کے لئے کہا گیا تھا۔ کتاب مجھے اس وقت ملی جب میں مقالہ لکھ چکا تھا۔"

آزاد صاحب کو بھی اس کا احساس تھا کہ مقالہ نگاروں نے ان کی کتاب کا مطالعہ کئے بغیر اپنے سخن فہم ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ہم نے ان کی دلجوئی کی خاطر عرض کیا "پاکستان میں یہی رواج ہے کہ کتابوں کی رونمائیوں میں جو مقالات پڑھے جاتے ہیں، وہ متعلقہ کتابوں کو پڑھے بغیر لکھے جاتے ہیں۔" آزاد صاحب نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے اس کا سبب پوچھا، تو ہم نے بتایا "کتاب پڑھنے کے بعد اس کی خوبیاں تلاش کرنے کا کام مشکل ہو جاتا ہے۔"

آزاد صاحب کو اس کا بھی غم تھا کہ انہوں نے اپنے مجموعۂ کلام کا نام "بوئے رمیدہ" رکھا تھا، لیکن ناشر نے اسے "بوئے رسیدہ" بنا دیا۔ آزاد صاحب چاہتے تھے کہ کتاب کا نام تبدیل کر دیا جائے کیونکہ "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب ہے، لیکن ناشر اس پر آمادہ نہیں کیونکہ اس نے کتاب کا خوبصورت سرورق کئی رنگوں میں بڑی محنت سے تیار کیا تھا اور خاصی رقم صرف کر کے اسے چھپوایا تھا۔ آزاد صاحب نے "بوئے رسیدہ" کی بے معنویت کا ذکر کئی مرتبہ کیا۔ ایک محفل میں استاد دلاور فگار بدایونی بھی موجود تھے۔ انہوں نے فرمایا "بوئے رسیدہ" بے معنی ترکیب نہیں ہے۔ چونکہ اس مجموعے میں آپ کی ادھیڑ عمری کے زمانے کا کلام شامل ہے، اس لئے پڑھنے والے کے ذہن میں فوراً یہ بات آتی ہے کہ "بوئے رسیدہ" سے مراد "بوئے عمر رسیدہ" ہے۔

آزاد صاحب جن دنوں کراچی میں تشریف رکھتے تھے، حسن اتفاق سے انہیں دنوں ایک کتب فروش نے ہندوستانی کتابوں کی نمائش کا اہتمام کیا۔ اس نمائش سے ہم نے محمد ایوب اولیا کی مرتبہ کتاب "جگن ناتھ آزاد - ایک مطالعہ" کا نیا ایڈیشن خریدا تاکہ اس پر آزاد صاحب سے بطور یادگار دستخط کرا لئے جائیں۔ ہم نے جب کتاب ان کے سامنے رکھی اور دستخط کرنے کی درخواست کی، تو انہوں نے فرمایا "یہ میری تصنیف تو ہے نہیں، میں اس پر دستخط کیسے کروں۔" ہم نے عرض کیا "یہ درست ہے، لیکن اس کتاب کے وجود میں آنے کا سبب آپ ہی ہیں۔ ہم نے یہ کتاب خریدی ہی اس لئے ہے کہ اس پر آپ سے دستخط کرائیں گے۔" فرمایا۔ "دستخط میں اس شرط پر کروں گا کہ آپ اسے پڑھیں بھی۔" ہم خاموش رہے کہ معزز مہمان کے سامنے لب کشائی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ورنہ جی چاہتا تھا کہ ہم یہ کہیں "ایک معمولی سی عنایت کا آپ اتنا بڑا معاوضہ کیوں طلب کر رہے ہیں۔"

یہ تو خیر مذاق کی بات تھی ورنہ محمد ایوب اولیا کی مرتبہ کتاب ایک قابل قدر ادبی کام ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر آزاد صاحب کی خوبصورت شخصیت اور بے مثال شاعرانہ کمالات کے بارے میں ہماری معلومات میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ اس کتاب میں جن اہل قلم کے مضامین شامل ہیں ان میں سے صرف چند کے نام ملاحظہ فرمائیے۔ سید احتشام حسین، مولانا صباح الدین عبدالرحمن، پروفیسر نجیب اشرف ندوی،

ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر ن۔ انصاری، ڈاکٹر قمر رئیس۔ ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، دل سے لکھا ہے اور سوچ سمجھ کر لکھا ہے۔ غالب کی طرفداری نہیں کی، سخن فہمی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب اتنی اچھی ہے کہ جی چاہتا ہے ہندوستان کا ہر کے غیر قانونی پبلشروں سے کوئی اس کتاب کو بھی چھاپ دے۔ پاکستان میں آزاد صاحب سے محبت کرنے والے بہت بڑی تعداد میں ہیں۔ یہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گی۔
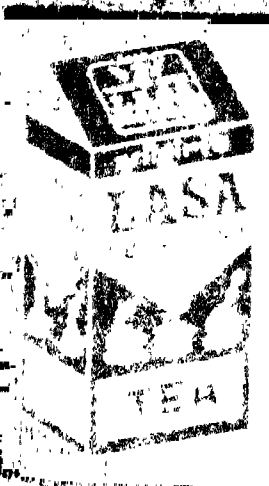
• رؤف خوشتر
(بیدر)

شور

سُنتے ہیں کہ جب کائنات میں خاموشی دیکھی نہ گئی تو کھنکتی ہوئی مٹی سے آدم اور پھر آدم کی بائیں پسلی سے (جی ہاں! اُس وقت بھی (Keep left) کا چلن رائج تھا) حوا کو پیدا کیا گیا، گویا خود بخود شور کا سامان پیدا ہوگیا۔ اس پر فرشتے "ہم کو اب تک خاموشی کا وہ زمانہ یاد ہے" کہتے رہے۔ مسٹر اور مسز آدم کا وہ پہلا دن (جو خاموشی کا آخری دن بھی تھا) اور آج کا دن، انسان برابر شور مچائے ہوئے ہے۔ اقوام متحدہ کو چاہیئے کہ وہ بے ہنگم شور کو اپنا عالمی ترانہ قرار دے کہ اس میں نسل، زبان، علاقائیت اور دیگر بشری اختلافات نہیں ہیں۔

حرف "ش" سے شور اور شر بنتے ہیں تو "خ" سے خاموشی اور خیر۔ ہم آج تک افسوس کر رہے ہیں کہ انسان نے حرف "خ" کے بجائے "ش" کا انتخاب کیوں کیا۔ اگر وہ خ کا انتخاب کرتا تو اس دنیا کا منظر ہی کچھ اور ہوتا، سب کچھ ہوتا مگر شور و زور نہ ہوتا۔

باوثوق ذرائع سے (جو ضروری نہیں کہ کوئی نیوز ایجنسی ہو) معلوم ہوا کہ آدم کو ورغلانے اور حرف "ش" کو ترجیح دلانے میں اُس کا ہاتھ (بلکہ دماغ) ہے جس کا نام بھی "ش" سے شروع ہوتا ہے اور جس سے ہم سال کے بارہ مہینوں میں صرف ایک مہینہ جزوی رہائی پاتے ہیں۔

ہم نے بوم الدولہ سے کہا "جس طرح حُسن کے دو مساوی حصّہ دار حضرت یوسفؑ اور بقیہ سارے انسان ہیں۔ شور کے دو مساوی دعویدار مشرقی سیاستداں اور مغربی موسیقار ہیں"۔

بوم الدولہ کب خاموش رہتے۔ جیسا کہ اُن کا ہمیشہ یہ وطیرہ اور طریقہ رہا ہے کہ وہ ہر ایک سے ہر کسی معاملے میں قرض کے علاوہ، وہ لے جانا چاہتے ہیں جس کو بہت پہلے 'گرودت' نے اپنی ایک فلم کے ٹائیٹل کے طور پر استعمال کیا تھا، جی ہاں ——— بازی۔

جب ہم کنوارے تھے تو بوم الدولہ نے شادی کرلی۔ جب ہم نے بھی یہی غلطی کی تو بوم الدولہ نے تجدید خطا کرلی۔ میٹرک کے امتحان کے وقت ہم سے درخواست کی کہ ہم ایک بار فیل ہوجائیں کیونکہ وہ دو چار بار فیل ہونے کی زبردست صلاحیت رکھتے تھے۔ جب ہم نے میٹرک کا معرکہ پہلی بار ہی سر کرلیا تو اُن کو بڑی مشکل سے ایک بار

ہی فیصل ہونے پر اکتفا کرنا پڑا ' اور یہ ان کے لئے بڑا امتحان تھا۔

کسی نے جب انکشاف کیا کہ مرزا نوشہ دو دو تخلص رکھتے تھے تو بوم الدولہ نے اپنے لئے تین[۳] تین تخلص منتخب کرلئے اور پپنا Popular Urdu Poets Pen Name Association میں تینوں تخلص رجسٹر کروا لئے۔ پپنا کا ہر رکن اپنے آپ کو شاعری کا باوا (Puppa of Poetry) سمجھتا ہے۔ بوم الدولہ تینوں تخلص کو موقع ومحل کے اعتبار سے استعمال کرتے ہیں۔ مزاحیہ مشاعروں میں بور ' سیاسی اور اکیڈمیوں کے مشاعروں میں شور ، خواتین اور ٹی ۔ وی کے مشاعروں میں مور تخلص فرماتے اور چرائی ہوئی غزلوں کے ساتھ جاتے ہیں۔ غزلیں ہی کیا وہ افسانوں کے اجلاس میں دوسروں کے افسانوں کے ساتھ شرکت فرماتے اور دھونس جماتے ہیں۔ چھینے اور اہمیت جتانے کے ہتھکنڈوں سے ہاری اور قرض سے بھاری افسانہ نگاروں سے دامے درمے اور کبھی کبھی سخنے ان کے افسانے دبوچ لیتے ہیں اور حقیقی افسانہ نگار اس ڈاکو افسانہ نگار کو اپنا افسانہ دیتے ہوئے گنگناتا ہے۔ ع

افسانہ میرا بن گیا افسانہ کسی کا

آمدم برسر مطلب ۔ تو جب ہم نے شور کو دو حصوں میں تقسیم کیا تو بوم الدولہ نے حسب روایت و عادت اختلاف کیا اور کہنے لگے ۔ " میں قربانی کے گوشت کی طرح شور کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ سیاستدانوں اور موسیقاروں کے علاوہ شور کے تیسرے حصّہ پر سیمناروں اور مشاعروں کا قبضہ ہے۔ "

ہم :۔ جی ہاں ! مشاعروں اور سیمناروں کا شور سن کر آبشار اپنا شور بھول گئے ہیں ۔ اس لئے حکومت نے آبشاروں کے نزدیک سیمنار اور مشاعرے منعقد کرنے پر پابندی عائد کردی ہے کہ سیّاح فطری شور سن سکیں ' بشری شور نہیں ۔

بوم الدولہ :۔ جب سے ہمارے بچے چڑیا گھر دیکھ آئے ہیں وہ شور مچانا بھول گئے ہیں۔ چڑیا گھر کے تربیت یافتہ اور مہذب جانوروں کو دیکھ کر بچے خاموش رہنا سیکھ گئے ہیں ۔

ہم :۔ تو پھر قائدین کو بھی چڑیا گھر کی سیر کرانی چاہیئے ۔

بوم الدولہ :۔ اگلے وقتوں میں لکھنؤ میں شرفاء اپنے بچوں کو آداب زندگی کا درس لینے کے لئے طوائفوں کے پاس بھیجتے تھے۔ اب شائد ہمیں اپنے بچوں کو چڑیا گھر بھیجنا ہوگا ۔ لکھنؤ پر یاد آیا کہ شام اودھ کے ساتھ ساتھ صبح بنارس بھی مشہور تھی ، اور وہ واقعی ایک بنارس ہی کیا اُس وقت ہر شہر اور گاؤں کی صبح سہانی ہوتی تھی ۔ اب جو میں نماز اور دودھ کے لئے صبح باہر نکلتا ہوں تو دیکھتا کم ہوں اور سنتا زیادہ ہوں ۔ پرندوں کی چہچہاہٹ کی جگہ مشینوں کی گڑگڑاہٹ سنتا ہوں۔ صبح کی لالی دھوئیں میں کالی ہوگئی ہے ۔ اب تو صبح سویرے ہی شور مچا رہتا ہے ۔

ہم :۔ آپ اگر فلمی ہدایت کار ہوتے اور اس موضوع پر فلم بناتے تو فلم کا ٹائٹل ہوتا " پھر مچا ہے شور "۔

بوم العلماء۔ جی نہیں! اگر میں فلساز ہوتا تو خاموش فلمیں بناتا ۔ اجی صاحب، جب ہم مسحور کن موسیقی، دلنواز نغمے اور معیاری مکالمے نہیں دے سکتے تو اس سے بہتر ہے کہ خاموش فلمیں بنائیں۔

ہم :۔ کیوں نہ اکیسویں صدی کو بین الاقوامی صدی برائے خاموشی قرار دیں، کیونکہ اب تک ہم نے بیس صدیاں برائے شور و زور منا ڈالیں ۔ آئیے اب ہم عہد کرلیں کہ ہتھیاروں کی دوڑ کے ساتھ لفظوں کی ترویج پر بھی پابندی عائد کر دیں گے۔

بوم الادب:۔ کیوں نہ ابھی سے اس آنے والی صدی اعلان خاموشی کا بین الاقوامی صد سالہ جشن منانے کی تیاریاں شروع کر دیں ۔

ہم :۔ جی ہاں! آپ تو تیاریاں شروع کر دیں گے حسبِ عادت زور و شور سے ۔

مِزاح ـــــ راحت کا ایک اہم ذریعہ

شکاگو۔ امریکن میڈیکل اسوسی ایشن کے جریدے میں شائع ایک وسیع طبی مضمون میں ایک ڈاکٹر نے دعویٰ کیا ہے کہ طنز و مزاح کے ذریعہ مریض کے درد کے احساس میں کمی ممکن ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے کہا ہے کہ انہوں نے اعصاب اور ہڈیوں کے درد سے بے چین چھ مریضوں پر اپنی اس جدید "طنز و مزاح تھراپی" کا کامیاب تجربہ کیا ہے۔ ڈاکٹر نے سویڈن میں اپنے پرائمری ہیلت کیئر سنٹر کا تجربہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس مقصد کے لئے انہوں نے تین نرسوں پر مشتمل ایک گروپ قائم کیا۔ مریضوں کو تفریحی کتب، ریکارڈ، ویڈیو فلم سے لطف اندوز ہونے اور روزمرہ کی زندگی میں طنز و مزاح کو اہمیت دے کر مریضوں پر اس کے اثرات کا مطالعہ کیا گیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اس پروگرام میں مزاح سے متعلق تحقیقی لیکچر بھی کرائے گئے اور مریضوں کو مشورہ دیا گیا کہ وہ غیر ضروری [illegible] کو خیرباد کہہ کر اپنی زندگی کو لطائف سے روشناس کرائیں۔

ڈاکٹر کا بیان ہے کہ اس کے نتیجہ میں مریضوں کو خاطر خواہ افاقہ ہوا۔ ان کے درد و تکلیف میں کمی [illegible] اور علاج معالجہ کا بہتر اثر ان پر مرتب ہوا۔ جن مریضوں نے مزاح کو جس قدر زیادہ اپنایا انہوں نے اتنا ہی زیادہ فائدہ پایا۔

اس علاج سے قبل اور اس کے بعد مریضوں کی نفسیات کے ٹسٹ لئے گئے تھے ان سے بھی یہ ظاہر ہوا کہ علاج کے بعد مریضوں کی نفسیاتی کیفیت پہلے کی بہ نسبت بہت زیادہ بہتر ہوگی۔ --

قطعات

— عید مبارک —

اسماعیل ظریف

●

نمازروزوں سے غافل رہے مہینہ بھر
سمجھ رہے ہیں کہ یہ تو کوئی خطا نہ ہوئی
ظریفؔ عید مبارک کہو گے کس منہ سے
نمازِ عید بھی تم سے صحیح ادا نہ ہوئی

●

ماہِ صیام آتے ہی صحت بگڑ گئی
کانوں پہ ہاتھ دھرتے تھے روزوں کے نام سے
تو نے نمازِ عید میں تک بھول کر ظریفؔ
پہلے سلام پھیر لیا پیش امام سے

●

لو عید بھی ہماری آکر گزر گئی ہے
ہم عظمتِ رمضاں کا اقرار تو کرتے تھے
اب روزوں کے بارے میں مت پوچھیے کچھ ہم سے
سحری نہ سہی لیکن افطار تو کرتے تھے

گرگٹ گورکھپوری

●

مبارک باد لینا عید کی خوشیاں منالینا
سکوں گر ہو تو جم کر چین کی بنسی بجا لینا
یہی ہم کرتے آئے ہیں مگر احساں لازم ہے
ہمیں شیطان رشدی کے لیے خنجر اٹھالینا

●

بہ چشمِ غور حالاتِ فلسطیں تو ذرا دیکھیں
جہاں کے طفل ماں کی گود میں بھی چونک جاتے ہیں
مبارک آپ کو ہوں عید کی خوشیاں مرے بھائی
میں اتنا کہہ نہیں سکتا مرے لب تھرتھراتے ہیں

●

میں گورکھپور کا گرگٹ پہن کر سوٹ و تہ ٹائی
کرا کر زلف سیٹیں پر ہیر سیلون سے ڈائی
بھلا بیٹھا ہوں نا وصوم کے سارے فرائض کو
مبارک باد لیکن عید کی احساں ہے بھائی

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

التواء کو
"وائی۔وا" کہتے ہیں ہم

ملتوی ہونے اور ملتوی ہوتے رہنے میں فرق ہے۔ ہمارا مضمون ریڈیو سے نشر ہونے والا تھا لیکن شہنشاہ جاپان کی "بے وقت موت" کے سوگ کے سبب ملتوی ہو گیا۔ موت کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں جو بروقت انجام پاتی ہو لیکن حیرت ہے کہ موت ہی کو بے وقت کہا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ کسی کی موت کو بے وقت کہہ کر گویا اپنی دانست میں عزرائیل کو قدرے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں، لیکن انھیں کار ہائے مفوضہ کے روز و شب کی انجام دہی سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہو گی کہ نادانوں کی بے وقت کی راگنی پر غور بھی فرما سکیں۔ الغرض دوسرے دن نشر ہو گیا، گو ہمارے دوست احباب جو کئی ہفتوں سے ہمارے اصرار پر مشتاق تھے، محروم رہے لیکن ہم نے اپنا مضمون نہ صرف سنا بلکہ ٹیپ بھی کر لیا تاکہ سند رہے، وقت ضرورت کام آئے۔ ایک موقع پر ہمارا عقد ثانی بھی عقد اولیٰ کی طرح ملتوی ہو گیا تھا کیونکہ ہمارے عقد و نکاح میں تشریف لے آنے والی خاتون کے پہلے شوہر کی دوسری والدہ کے سسر کا نوے سال کی عمر میں انتقال ہو گیا تھا۔ ہم نے خود بعض کاموں کو بعض باتوں کے پیش نظر ملتوی کیا لیکن ملتوی کرتے رہنا یہ تو بہت زیادتی ہے جمعہ کے روز نئی فلم لگتی ہے لیکن اگر کسی سبب پروگرام ملتوی ہو جائے تو آئندہ جمعہ بہرحال لگتی ہے ورنہ شائقین تھیٹر والے کے پیچھے لگ جائیں۔ ولیمہ ملتوی ہوتا ہے، لیکن ملتوی ہوتا نہیں رہتا۔ اکثر اخبار میں اس طرح کی خبر شائع ہوتی ہے کہ کسی ناگزیر وجہ کی بناء پر فلاں کا ولیمہ ملتوی ہو گیا ہے۔ آئندہ انعقاد کا عنقریب اعلان کیا جائے گا اور ولیمہ کے مدعوئین روزانہ اخبار چاٹ رہے ہیں کہ کہیں کوئی دن اخبار نہ دیکھ پائیں اور ولیمہ "مس" ہو جائے چنانچہ کچھ ہی سالوں بعد ملتوی شدہ ولیمہ منعقد ہوتا ہے، یہ اور بات ہے کہ وہ ان کی دوسری شادی کا ولیمہ ہوتا ہے۔ پہلی شادی کا ولیمہ کہاں گیا، یہ پوچھنے کا شائد کسی کو شرعاً حق نہیں۔ اسی طرح امتحان ملتوی ہوتا ضرور ہے لیکن ہوتا نہیں رہتا۔ تقریبات ملتوی ہوتے ہیں لیکن ہوتے نہیں رہتے۔ ہراج ملتوی ہوتا ہے لیکن ہوتا نہیں رہتا ۔ ۔ ۔ لیکن وائی۔وا کے بارے میں ہمارا ایقان ہے کہ یہ بہرحال و بہرصورت، بلا سبب و بے سبب نہ صرف ایک آدھ بار ملتوی ہوتا ہے بلکہ تسلسل کے ساتھ ملتوی ہوتا رہتا ہے۔ وائی۔وا کے التواء کی شان

ہی اور ہوتی ہے۔ تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ ایک صاحب کا وائی۔ وا اتنی بار ملتوی ہوا کہ وہ عہد شباب سے دور ضعیفی کے اواخر میں داخل ہو گئے۔ اسی انتظار میں کئی صدور انتقال کر گئے۔ یہ انتقال، انتقالِ مکانی کے علاوہ انتقالِ لامکانی بھی تھا۔ الغرض آخری علالت کے دوران انھیں ایمبولینس میں لایا گیا۔ اسٹریچر پہ وائی۔ وا ہوا۔ ایک ہفتہ بعد ان کی زیارت کا اعلان اور ان کے وائی۔ وا کا رزلٹ ساتھ ساتھ شائع ہوئے۔ کچھ ریسرچ اسکالرس نے تاریخ نکالی۔ مصرعہ تاریخ شاید کچھ یوں تھا۔ ؎

وائی۔ وا نے اس کو غارت کر دیا

ہمارے وائی۔ وا کے التوا کی شان ہی کچھ نرالی تھی۔ ہمارا پہلا وائی۔ وا ہماری وجہ سے ملتوی ہوا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہندوستان میں انگلستان کی گھڑیاں چل رہی ہیں۔ اقبال کی طرح قدرے تاخیر سے پہنچے استاد چست شاگرد سست کا معاملہ تھا۔ ہمارے گائیڈ نے اپنی موٹی عینک کے دبیز شیشوں میں سے گھورا۔ ہم کوئی کنواری دوشیزہ تو تھے نہیں کہ اس طرح کی تیز نگاہوں کی تاب نہ لا کر پانی پانی ہو جاتے۔ کہہ دیا معافی چاہتا ہوں۔ دیر ہو گئی۔ موصوف نے ناک کے حلقوں کو عینک کے کناروں سے ملاتے ہوئے فرمایا۔ دیر نہیں بہت دیر ہو گئی ہے۔ صدر شعبہ کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ سچ پوچھئے اس جملہ پر ہم کھِل اُٹھے۔ انگ انگ میں برقی شرارے دوڑنے لگے۔ بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ اپنی قسمت نارسا پر ناز کرنے لگے۔ وجد کی کیفیت طاری ہو گئی۔ سارا کالج مدہوشی میں رقصاں نظر آنے لگا۔ ہمارے وجود کا جز جز ایک سطری نظم پڑھ رہا تھا گویا صدر شعبہ۔ یعنی کہ واقعی صدر شعبہ۔ حقیقت میں یعنی کہ ہمارا۔ ہم جو کہ ناچیز کچھ بھی نہیں۔ تمناؤں کے مارے، دنیا کے ستائے ہوئے۔ قریب قطعی نامراد واجبی واجبی آدمی کے لئے۔ انتظار کر رہے ہیں۔ صدر شعبہ۔ اُف

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

صدر شعبہ کو ہم نے ملتجی نگاہوں سے دیکھا جس میں معذرت کم حیرانی زیادہ تھی۔ نگاہ ناز، پر از تمکنت بار ڈالی، لمحہ بھر بعد فوراً ہٹا لی۔ گویا کہہ رہے ہوں، آپ کے بھی کیا نصیب ہیں۔ صدر شعبہ آپ کا منتظر ہے۔ ؎

ہاں ناز کرو جتنا قسمت پہ آج کم ہے

اور ایک غیر معروف اخبار کے صفحات میں گم ہو گئے۔ وائی وا تھا یا ہماری شادی۔ خود کو نوشہ سمجھ رہے تھے۔ جو یاد کرنا تھا وہ تو یاد کر ہی لیا تھا بلکہ جو یاد نہیں کرنا تھا اسے بھی یاد کر لیا تھا۔ کیا معلوم کون سی بات پوچھی جائے۔ ہمارا مقالہ۔ اعمال نامے کی طرح بغل میں تھا۔ اپنے گائیڈ کی بغل میں دم سادھ کر بیٹھ گئے جیسے مرغی کے پنکھ میں چوزہ چیل سے ڈر کر بیٹھتا ہے۔ اور انھیں ایسے دیکھ رہے تھے گویا اپنی ساری ناکامیاں، نادانیاں اور نا اہلیاں ساری کی ساری ان کے ذمہ ہیں۔ اب کیا تھا ان پروفیسر صاحب کو فون پر فون کئے جانے لگے جو کبھی پھول اور کبھی کے خیار ہے۔ سارا شعبہ اور سارے اسکالرس بھگت چکے ہیں۔ ان کے گھر کے فون کی گھنٹی زور و شور سے بج اٹھتی لیکن وہ نقار خانے میں شاید طوطی کی آواز تھی۔ کوئی اٹھا ہی نہیں رہا تھا یا پروفیسر صاحب اٹھانا

بھول رہے تھے۔ بات کرنی ضروری تھی اور یہ عالم تھا کہ بات بنتی نظر نہ آتی تھی لیکن کوشش بھی بہرحال ضروری ہے۔ ہمارے استاد اپنی بھاری بھرکم انگلیوں کا تسلسل کے ساتھ بے دردی سے استعمال کر رہے تھے لیکن فون تھا کہ ہاتھ غیبی۔ آشنائے رمز کوئی نہیں اور ہمارا یہ عالم کہ آنے والے کٹھن دور کو تصور میں لاتے ہوئے لرزنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ ہمارا پہلا وائی وا تھا۔ تجربہ کار ضعفا سے ہم نے وائی۔ وا کے بارے میں استفسار کیا۔ کہنے لگے ایک طرح کا انٹرویو ہوتا ہے۔ ہم نے مزید استفسار کیا کہ کچھ تو فرق ہوگا۔ کہنے لگے۔ انٹرویو میں کامیابی غیر یقینی ہوتی ہے، برخلاف اس کے وائی۔ وا میں کامیابی یقینی ہوتی ہے۔ کچھ ڈھارس بندھی۔ ایک حضرتؒ نے کہا۔ آپ ذرا "ایکٹیو" ہوجائیے۔ ہم شاعر ہوئے، شوہر ہوئے۔ ایم اے ہوئے، مضمون نگار ہوئے بلکہ تقدیر سے مزاح نگار بھی ہوئے لیکن کم بخت ایکٹیو نہیں ہو سکے۔ ہم سب کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ایکٹیو ہونا ہمارے بس کی بات نہیں، لیکن فرمانبرداری ہماری فطرت میں فیاضی کی طرح ودیعت ہے اٹھ کر باہر نکلے اور پروفیسر صاحب کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کی گھڑیاں یوں بھی بہت کٹھن ہوتی ہیں اور پھر پروفیسر کا انتظار۔ تمام روز قیامت کا انتظار کیا والی بات تھی۔ لیکن منتظر تھے۔ انتظار میں بگڑتا ہی کیا ہے یہی نا کہ بوریت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے آزاد ہونے کے بعد جب آدھا ہندوستان اس میں مبتلا ہے تو ہم کس کھیت کا گاجر ہیں، مولی اس لئے نہیں کہ ہم مونث نہیں۔ آخرش بور کر صدر شعبہ اپنی کار میں بے کار بیٹھے ہوئے چلے گئے۔ وائی۔ وا پوری شان و شوکت سے ملتوی ہوگیا۔ ہم نے بڑی بے صبری سے اپنے گائیڈ سے پوچھا۔ پھر کب وائی۔ وا ملتوی ہوگا۔ انہوں نے کہا آئندہ جمعرات کے بعد کی جمعرات کو آئیے۔ ہمیں آنے والی جمعرات کو آجائیں گے۔ موصوف نے یہ جملہ کچھ اس برجستگی سے فرمایا کہ ہمیں خود پر "صحت مند فقیر" کا شبہ ہونے لگا۔

جب اللہ اللہ کرکے دوسری جمعرات آئی تو ہم نے وائی۔ وا کی تیاری اس نیت سے شروع کی کہ ابھی تو دوسری دفعہ ہے، وائی۔ وا یقیناً ملتوی ہوگا۔ وہ وائی۔ وا ہی کیا جو ملتوی نہ ہو۔ بے دلی کے ساتھ ایک لکچرر صاحب کے گھر گئے تاکہ وائی۔ وا کا صحیح وقت معلوم کرسکیں۔ وہ باہر نکلے۔ کہنے لگے۔ آپ کو نہیں معلوم آپ کا وائی وا ملتوی ہوگیا ہے۔ ہم نے کہا ہم نے تو اس دفعہ کوئی تاخیر نہیں کی پھر وائی۔ وا کیوں ملتوی ہوگیا۔ فرمایا صدر شعبہ دورہ پر جارہے ہیں دور۔ موصوف نے اس دور کو تجریدی معروف طویل لہجہ میں فرمایا کہ ہمیں اندیشہ ہائے دور دراز نہیں دراز بھی گذرنے لگے۔ کہا بمبئی جارہے ہیں۔ ہم نے خیال کیا کہ بمبئی جب اتنی دور ہے تو لندن کتنی دور ہوگا۔ اس طرح ہمارا وائی۔ وا دوسری مرتبہ ملتوی ہوگیا۔

وائی۔ وا اور التوا، اب ہمارے لئے مترادفات ہوگئے تھے۔ جو وائی۔ وا ہوتا ہے وہ ملتوی ہوتا ہے اور جو ملتوی ہوتا ہے وہ وائی۔ وا ہوتا ہے۔ دوسری بات ہمارے ذہن سے ہمارے پہلے عشق کی طرح پھسل کر رہ گئی۔ پہلا عشق بھی غضب کی چیز ہوتی ہے۔ ہمارا پہلا عشق ایک جہاں دیدہ خاتون کے مرہون منت تھا۔ یہ اس

وہ تعلقات ہے جب ہم پنسل سے لکھا کرتے تھے۔ ایک صاحب نے ہم سے کہا کہ ہاتھ تنگ ہے۔ تقریب کرنا ہے جہیز کچھ وائی۔ وا کر دو۔ انھوں نے پوچھا تمہارے حقِ ثانی کا کیا ہوا۔ ہم نے کہا۔ ہوتا کیا۔ وائی۔ وا ہوگیا۔ ہم نے ایک لالچی سسر کو اپنے ہونے والے سمدھی سے یہ کہتے سنا کہ جوڑے کی رقم ۲۵ ہزار، ورنہ شادی وائی۔ وا۔ بیگم نے جب شاپنگ کا پروگرام بارہا دیگر ملتوی کیا تو ہم نے کہا، بیگم آپ کی شاپنگ بھی وائی۔ وا سے کم نہیں۔ وائی وا کو وہ واہ۔ وا سمجھ بیٹھیں۔ نان میٹرک ہونے سے یہی تو ہوتا ہے۔ ان کے اس طرح سمجھنے سے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوگئے کہ جو امر غیر موزوں پہ طنزیہ واہ۔ واہ کرتے ہیں، شاید وائی۔ وا کی بگڑی ہوئی شکل ہے ممکن ہے کثرتِ استعمال سے وائی۔ وا "واہ۔ وا" ہوگیا ہو۔ اب تو ہم لفظِ التواء کو قریب قریب بھول چکے ہیں اب ہمارے لبوں پر وائی۔ وا ہی وائی وا رہتا ہے۔

"وائی۔ وا" سے کوئی اور نقصان ہو یا نہ ہو یہ نقصان ضرور ہوتا ہے کہ وائی۔ وا کی تیاری کا ذوق مدھم پڑجاتا ہے۔ اور وائی۔ وا کے وائی۔ وا ہونے کے سبب ہم تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ ہم نے ایم۔ فل آخر کس پر کیا تھا؟

آج جب گھر آئے تو ایک لفافہ ہمارے ہاتھ لگا۔ اس پر لکھا ہے کہ آپ کا ملتوی شدہ وائی۔ وا جو ملتوی ہوا تھا۔ اب پھر جمعرات کو نہیں بلکہ منگل کو رکھا گیا ہے تاکہ آپ اپنے اساتذہ کے ساتھ علم کے جنگل یعنی "کالج میں منگل" منا سکیں۔ اور ہم پھر اس بات سے خوف زدہ ہیں کہ کہیں دو مرتبہ ملتوی شدہ وائی۔ وا تیسری مرتبہ "وائی۔ وا" نہ ہوجائے۔

--

نسیم سحر (جدہ)

غزل

سیوا جو اس نے کی ہے پٹائی کی شکل میں
میں نے وصول کی ہے مٹھائی کی شکل میں

ہے آرزو ہمیشہ ہی لیٹا پڑا رہوں
بستر پہ جانِ جاں لئے رضائی کی شکل میں

جی پھولتا ہے عہدِ ملاوٹ میں جانے کیا
کھاتی رہے ہیں دودھ ملائی کی شکل میں

دے کر زکوٰۃ ڈھال ہی لے گا ضرور شیخ
رشوت کو بھی حلال کمائی کی شکل میں

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا"
وہ "ایکس" کو بھی لکھتی ہے "دائی" کی شکل میں

جو کوٹ اور پینٹ پہننے پہ خوش تو ہوں
پھندا مگر گلے میں ہے ٹائی کی شکل میں

عادت ہے ان کی دیتے ہیں دھوکا مجھے ضرور
بسکٹ کھلا رہے ہیں خطائی کی شکل میں

سرکاری ہسپتال میں سب مر گئے مریض
رنگین پانی پی کے "دوائی" کی شکل میں

صدیقی و نسیم ہیں شاعر مزاج لوگ
دیکھا مگر انہیں بھی قصائی کی شکل میں

نیاز سواتی پاکستان

غزل

•

نہ سردی نہ ٹھنڈی ہواؤں نے مارا
اُسے ڈاکٹر کی دواؤں نے مارا

بھروسہ بہت جن پہ وہ کر رہا تھا
اسے ہاں انہی آشناؤں نے مارا

نہیں آتا بیگم کو کھانا پکانا
اُسے ہوٹلوں کی غذاؤں نے مارا

ہمیں راس شہرِ کراچی نہ آیا
ٹریفک کی ہم کو صداؤں نے مارا

سکول ہم نے بھیجا تھا پڑھنے کو بچہ
وہاں ٹیچروں کی سزاؤں نے مارا

بہت ناز تھا اس کو طاقت پہ لیکن
بڑے باز کو فاختاؤں نے مارا

انہیں فائدہ تو نہ اُن سے ہوا کچھ
نیازؔ! اُن کو چکنی غذاؤں نے مارا

•

اسلامی ترقیاتی بنک کی طرف سے میلادمنیٰ پر قربانی کے گوشت کی تقسیم کی طرف اشارہ ہے، اس پروجیکٹ میں برادرم اعجاز صدیقی (جدہ کی ادبی دنیا سے تعلق رکھنے والے معروف شاعر) اور راقم الحروف کی ڈیوٹی [illegible] ہوا کرتی ہے۔ (ن س)

خان عزمی (دہلوی)

سوال:

امتحاں میں سوال آیا ہے
"غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے"

یقین:

کچھ نہیں! کچھ نہیں بلا سے ہے یہ حیا
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اُلٹی گنتی:

ایامِ زندگانی کا اُلٹا ہے کیا حساب
جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

احتیاط:

کانے کو دیکھ کر نہ سفر کی ہو ابتدا
"میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہو"

افسوس:

آبلوں کو کاٹ کر چھڑکا نہ چٹکی بھر نمک
"اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے"

پرسہ:

پرسہ میں جاتے والے ہیں فارسٹ منتری
"مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے"

حیلہ:

دیکھ کر خواب میں بھوتوں کی بھیانک شکلیں
"آن پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے"

فرق:

مکھیاں مارتے ہو بیٹھے ہوئے
"چل نکلتے جو مے پیئے ہوتے"

مشورہ:

مے پرستوں سے کہو نیند کی گولی لے لیں
"ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی"

غزل

ہمارا بینک بیلنس گھٹ گیا ہے — کنکشن دوستوں سے کٹ گیا ہے
یہ اسکوٹر، فریزر، ٹیلی ویژن — بہت سستے میں لڑکا پٹ گیا ہے
لکھی تھیں جن میں یک جہتی کی باتیں — کتابوں سے وہ چیپٹر پھٹ گیا ہے
سبق فرقہ پرستی کا عزیزو — یہاں کا بچہ بچہ رٹ گیا ہے
اُدھر ماں باپ اِدھر احکامِ بیگم — کہ دو حصوں میں مرزا بٹ گیا ہے

کمرز الکوئج بیتیا

انوار انصاری
(رانچی۔ بہار)

لیکن......

"لیکن" ایک چار حرفی لفظ ہے مگر اس میں بڑی طاقت پوشیدہ ہے۔ اس کی شان وشوکت نرالی ہے۔ آن بان سج دھج انوکھی ہے۔ تیور میں جولانی ہے۔ نگاہ میں سرشاری ہے۔ ادا میں بانکپن ہے۔ اس کے کرشمے نرالے ہیں یعنی جہاں بھی "لیکن" کا استعمال ہوا سمجھئے معنی ومفہوم کی دنیا بدل گئی۔ بنتا ہوا کام بگڑ گیا، بگڑا ہوا کام سنور گیا لیکن "لیکن" پر آنچ نہ آئی۔ آئیے "لیکن" کی اداؤں کے نت نئے جلوے ملاحظہ فرمائیں

دنیا میں جینے کے لئے دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ "ہوا" اور پانی۔ ہوا کا استعمال تو انسان ہر لمحہ کرتا ہے کیونکہ انسان ایک لمحے کے لئے بھی ہوا کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ "لیکن" صاف ستھری ہوا کسے نصیب ہے۔ صنعتی شہروں کی حالت تو بے حد سنگین ہے۔ یہاں ہوا پر پابندی ہے۔ جی بھر کر سانس لینا بھی دشوار ہے۔ یہی حال پانی کا ہے۔ پانی کی تلاش میں انسان پانی پانی ہو رہا ہے۔ دیہاتوں میں تو گندے تالابوں، ندی نالوں، بوسیدہ کنوؤں کا کسی طرح پانی دستیاب ہو جاتا ہے "لیکن" شہروں میں تو کہیں کہیں پانی پر بھی پابندی ہے۔ اب تو سائنس دانوں کو کوشش کرنی چاہیئے کہ کس طرح انسان ہوا اور پانی کے بغیر زندہ رہ سکتا ہے "لیکن" کیا یہ ممکن ہے؟

تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے۔ گلی کوچوں میں، اسکول، مدرسے، پاٹھ شالے قائم کئے جارہے ہیں "لیکن" دنیا تنزل کے راستے پر گامزن ہے۔ موجودہ عہد میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بیٹے باپ کو پہچاننے میں ہچکچاتے ہیں "لیکن" باپ پھر بھی بیٹے کو شفقت اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پہلے والدین اپنے نورِ نظر کی شادی خانہ آبادی اپنی پسند سے کرتے تھے "لیکن" اب بیٹے اپنے والدین کی پسند کو ٹھکراتے ہیں۔

کبھی کبھی حسنِ اتفاق سے دلچسپ لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ دورانِ سفر ایک بار میری ملاقات بہار راج ٹرانسپورٹ بس میں ایک لیڈر نما شخص یعنی ایک گیدڑ سے ہوگئی۔ وہ لیڈر نما گیدڑ سچ کو جھوٹ میں بدلنے کا ہنر، قاتل کو مقتول ثابت کرنے کے گر، رات کو دن کہنے کا راز بتا بتا کر بس کے مسافروں کا دل بہلا رہا تھا اور نان اسٹاپ بے تحاشا بولے جارہا تھا۔ اس کی گفتگو پر پابندی لگانے کی جب تمام کوششیں بے کار ہوگئیں تو مجھے "لیکن" کا خیال آیا۔ میں نے اس کے ہر جملے کے بعد "لیکن" کا استعمال اس زوردار طریقے

سے کہا کہ اس کی وطن پرستی مشتبہ ہو گئی۔ اس نے کہا سیاست میں مذہب کو دخل نہیں۔ میں نے کہا "لیکن حضرت یہاں تو بیشتر سیاسی جماعتیں مذہب کی آڑ لے کر زندہ ہیں۔" اس نے کہا لیڈر کو عوام کی پریشانیوں اور مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے کہا "لیکن" عوام سے انتقام لینے کا پیدائشی حق بھی لیڈر ہی کو حاصل ہے۔ اس نے کہا لیڈر عوام سے غلط وعدے کبھی کبھار ہی کرتا ہے۔ میں نے کہا "لیکن" عوام کو سبز باغ کی سیر کرانا بھی تو لیڈر کا فرض منصبی ہے۔ گویا اسی طرح "لیکن" کی تکرار سے وہ لیڈر نما شخص خاموش ہو گیا۔

انسان کا پیدائشی حق رونا ہے "لیکن" حالات کے تحت کبھی کبھی وہ مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یوسف ناظم کے لفظوں میں "فوٹوگرافر نہ تو مزاح نگار ہوتا ہے نہ طنز نگار" لیکن "وہ سب کو مسکرانے پر مجبور کر سکتا ہے۔

موٹاپا صحت کی نشانی ہے "لیکن" عقل جتنی زیادہ موٹی ہو گی آدمی اتنا ہی صحت مند اور باافتدار ہوگا۔

آدمی خاک کا پتلا تو ہوتا ہی ہے "لیکن" جو آدمی مصلحتوں کا پتلا نہیں ہوتا خاک میں مل جاتا ہے۔

اب ایسی مشینیں بن گئی ہیں جو یہ بتا سکتی ہیں کہ آدمی سچ بول رہا ہے یا جھوٹ "لیکن" یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر یہ تجربہ کس امید پر کیا جا رہا ہے۔ کیا اب بھی ایسا کوئی بدنصیب ہے جو سچ بولے۔

ملازمین کو بھی "لیکن" سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اگر بوس نے کیریکٹر رول لکھتے ہوئے "لیکن" کا استعمال کیا تو سمجھئے آپ کا بیڑہ غرق ہو گیا۔ مثلاً باس نے یہ ریمارک دیا کہ مسٹر اے بہت ہی اچھے ورکر ہیں، ذہین ہیں، محنتی ہیں "لیکن" آفس دیر سے آتے ہیں۔ تو سمجھئے آپ کی مٹی پلید ہوئی۔ یا یہ کہ باس نے لکھا کہ قانون کی جانکاری مسٹر بی (B) کو بہت ہے "لیکن" وہ نوٹ لکھ کر آفیسر کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہی "لیکن" مسٹر بی کی ترقی پر ضرب کاری ثابت ہوگا۔

سستی تحریر اور تقریر میں "لیکن" کا استعمال کر کے کچھ دور تک گاڑی کھینچی جا سکتی ہے۔ ادھر کچھ ناقد "لیکن" سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

"لیکن" کے استعمال سے آپ اپنے بگڑے کاموں کو سنوار سکتے ہیں، مصیبت سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔ اپنی بیگم کو سبز باغ دکھا سکتے ہیں۔ پڑوسیوں کا دل جیت سکتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو "لیکن" کا کثرت سے استعمال کر کے دیکھئے۔ "لیکن" کی جادوگری پر آپ کو ایمان لانا ہی پڑے گا۔

--

رفیع احمد
(مالیگاؤں)

سہرا

دلہن کے لیے جہیز اور دولہا کے لیے سہرا ضروری ہے۔ دولہا اور سہرا لازم و ملزوم ہیں۔ کسی زمانے میں دولہے ہاتھیوں یا گھوڑوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے۔ زمانہ بدلا، زمانے کے ساتھ رسم و رواج بھی بدلے۔ اب ہاتھیوں اور گھوڑوں کی جگہ کار نے لے لی ہے۔ نوشاہ کی سواری بدل گئی لیکن سہرا بدستور قائم رہا۔ نوشاہ بلی پیدل ہو یا سوار اس کے لیے سہرا باندھنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ دکانداروں کے لیے ملاوٹ کرنا۔ اگر بارات کے ہمراہ کئی کاریں ہوں تو اس کار پر بھی سہرا باندھا جاتا ہے جس میں نوشاہ میاں تشریف رکھتے ہیں۔ عرس کے مواقع پر مزاروں کے دن پھرتے ہیں اور شادی کے سیزن میں کاروں کی خوش نصیبی جاگ اٹھتی ہے۔

سہرا کیا ہے؟ سینکڑوں پھولوں کی قد آدم لڑیوں کو نوشاہ کے سر پر لپیٹ دیتے ہیں اسے سہرا کہتے ہیں۔ سہرے کو پھولوں کا برقعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ شادی کے موقعہ پر دولہا بہت شرماتا ہے یا شرمانے کی ایکٹنگ کرتا ہے اس لیے وہ برقعہ پوش ہو جاتا ہے۔ ورنہ آج کے نوجوان تو شرم کو ایک زنانہ چیز سمجھتے ہیں۔ اگر سہرے کو پھولوں کا برقعہ کہنا آپ کو گراں گزرتا ہے تو اسے آپ پھولوں کی چلمن کہہ لیجئے، اور خوش ہو جائیے۔ آخر چلمن بھی تو پردہ پوشی ہی کے کام آتی ہے۔ موجودہ زمانے کی گرانی اور بیکاری کو مدِ نظر رکھیئے تو آج سر پر سہرا باندھنا سر سے کفن باندھنے کے مترادف ہے۔

سہرے کی وجہ سے ہی دولہے اور باراتیوں میں فرق محسوس ہوتا ہے ورنہ اس موقعہ پر تو بوڑھے بھی بناؤ سنگھار کے سارے ریکارڈ توڑ نے پر اتر آتے ہیں۔ نوشاہ میاں پہلے ہی دوڑ کی ریس میں اول نمبر آئے ہوں گے لیکن سر پر سہرا بندھتے ہی ان کی رفتار بسنجر ٹرین جیسی ہو جاتی ہے۔ گویا سہرا انہیں سبق دے رہا ہے کہ آئندہ زندگی میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانا ہوگا۔ سہرے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دولہے میاں کی شکل و صورت اور رنگت کا پتہ ہی نہیں چلتا اور کبھی تو عمر کا اندازہ بھی نہیں ہوتا۔

دورِ جدید میں نیکی اور شرافت کے ساتھ ہی شرم و حیا بھی دنیا سے رخصت ہو رہی ہے۔ آج کل شادی پر سہرا باندھنا فیشن کے خلاف تصور کیا جاتا ہے۔ اب گلے میں صرف پھولوں کا ہار ڈالنا کافی ہے۔ خاکسار کے ذہنِ نارسا میں اس کی تین وجوہات ہو سکتی

ہیں پہلی یہ کہ نئی نسلیں شاید اتنی نازک ہیں کہ سر پر سہرے کا بوجھ بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔ دوسری یہ کہ نوجوانوں کے سر پر بیکاری اور گرانی کا ہی بار گراں اتنا زیادہ ہے کہ وہ اس میں مزید اضافہ نہیں چاہتے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ گرانی نے بھی کا عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ اسی لیے سہرے نے بھی تنگ آکر ہار کی شکل اختیار کرلی۔ ویسے یہ "منی" چیزوں کا زمانہ ہے۔ اب رسالوں میں منی افسانے، منی کہانیاں پسند کی جاتی ہیں۔ ہار کو آپ منی سہرا سمجھ لیجیے۔

سہرا صرف سر پر باندھا ہی نہیں جاتا بلکہ شادی کی محفل میں پڑھا بھی جاتا ہے۔ نوشاہ میاں جب کیل کانٹے سے لیس ہو جاتے ہیں تو ہیں تو کوئی شاعر صاحب کھڑے ہو کر سہرا پڑھتے ہیں۔ پہلے سہروں میں شعریت ہوا کرتی تھی اب بوریت پائی جاتی ہے۔ اب سہرے میں دولہا، دلہن، والد، والدہ، دادا، دادی، نانا، نانی، ماموں، مامی، بھائی، بھابی، بہن، بہنوئی، بھتیجے، بھتیجی غرض تمام رشتے داروں کے نام پائے جاتے ہیں۔ گویا سہرا نہ ہوا شجرۂ نسب ہو گیا۔ بعض نام ایسے ہوتے ہیں جو کم بخت کسی طرح وزن میں نہیں بیٹھتے۔ ایسے ناموں کے کان مروڑ کر انھیں باوزن بنایا جاتا ہے۔ اس کارنامے کو انجام دینے میں بعض اوقات شاعر کو چھٹی کا دودھ یاد آجاتا ہے۔ سہرا گو شعرا داد کم اور نوٹ زیادہ بٹورتے ہیں۔ اگر کوئی صاحب تجاہل عارفانہ سے بھی کام لیں تو شاعر مکرر شعر پڑھ کر اپنا ٹیکس وصول کر ہی لیتا ہے۔ بخیل سے بخیل آدمی کو بھی اس موقع پر اپنا نام آتے ہی جیب ہلکی کرنی پڑتی ہے۔ شاعر اگر تان سین کا شاگرد ہے تو پھر پوچھنا ہی کیا؟ سینکڑوں روپیوں کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔ سہرا گوئی کو آپ شعرا کا سائیڈ بزنس سمجھیے۔ دس پندرہ اشعار لکھ کر سینکڑوں روپے کمانا خسارے کی بات نہیں ان ہی شعرا کے دیوان کو آپ دس روپے میں خریدنے کو تیار نہیں ہوتے۔ ایسے شعرا کو خاکسار کا مشورہ ہے کہ وہ غزلوں کا دیوان مرتب کرنے کی بجائے سہروں کا دیوان مرتب کریں تو گھر میں خسارے کا بجٹ نہیں پاس ہوگا۔ ویسے بھی سہرا لکھنے سے شان میں بٹہ نہیں لگ جاتا۔ جب غالب اور ذوق جیسے شعرا سہرا لکھنے پر مجبور ہو گئے تو ہماری اور آپ کی کیا اوقات ہے؟ شعرا کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو آپ کو دانت نکالنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انھیں آپ مزاح کہتے ہیں۔ یہ سہرا لکھنے میں ٹھول لگی کرنے سے باز نہیں آتے۔ بعض اوقات تو گستاخی پر اتر آتے ہیں۔ زندگی میں شاید یہ پہلا موقع ہوتا ہے جب لوگ اپنا مذاق اڑانے والے کو گالیوں کی بجائے روپیوں سے نوازتے ہیں۔

سہرا اسے بھی کہا جاتا ہے جسے بارات کے آگے آگے کچھ لوگ مترنم آواز میں پڑھتے ہوئے کم اور چیختے ہوئے زیادہ چلتے ہیں۔ یہ بے چارے اپنا گلا بھی پھاڑتے ہیں اور سامعین کے کان کے پردے بھی۔ آخر بارات اور جنازے میں کچھ فرق تو ہونا ہی چاہیے۔ بعض افراد اس فرق کو زیادہ واضح کرنے کے لیے بارات کے آگے بینڈ باجے بجاتے ہیں اور ناچتے کودتے ہیں۔ فلمی گیتوں نے پہلے تو قوالوں کی مٹی پلید کی۔ یوسف آزاد سے جانی بابو اور عزیز نازاں تک سبھی پر فلمی بھوت سوار ہو گیا۔ فلمی گانوں کی طرز پر قوالیوں کی دھن بننے لگی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا۔ سہرا گانے والوں نے قوالوں سے درس عبرت نہیں لیا۔ اب تو زیادہ تر سہرے فلمی گیتوں کی دھنوں پر ہی گائے جاتے ہیں۔ میں اس وقت حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگتا ہوں جب سہرا کسی غمگین گانے کی دھن پر پڑھا جاتا ہے۔ کوئی ان کمبختوں سے یہ نہیں پوچھتا کہ بھائی شادی مقام مسرت ہے یا مقام رنج و الم؟

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

●●

محمد اسد اللہ (امراوتی)

مہمان اور بِن بُلایا مہمان

مرزا غالب یہ فرما گئے ہیں "موت کا ایک دن معین ہے۔" کاش یہ بات انھوں نے مہمان کے متعلق کہی ہوتی تو یقیناً بن بلایا مہمان اور ملک الموت دونوں بُرا مان جاتے۔ دونوں کی اپنی اپنی وضع داریاں جو ہیں۔ ہم سوچتے ہیں کہ کاش مہمانوں کی آمد کا ایک دن مقرر ہوتا تاکہ ہم بھی اسی دن اپنا مکان مقفل کر کے کسی عزیز کے گھر کا رخ کرتے اور ہمیں یقین ہے کہ وہ بھی یہی کرتا کیوں کہ آج اکثر لوگ موت اور بن بلایا مہمان دونوں میں کسی قسم کی تفریق کے قطعی قائل نہیں ہیں۔
اس صورت میں ایک فائدہ ضرور ہوتا، ہم بن بلائے مہمانوں سے ٹکرانے اور گھبرانے سے بچ جاتے اور بن بلائے مہمانوں کو چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتا۔ اور تو اور، میزبان اپنے آپ کو تسلی دینے کے لیے دسترخوان پر یہ شعر بھی نہ دہراتے:

شکر کر اللہ کا بددل نہ ہو مہمان سے
رزق اپنا کھا رہا ہے تیرے دسترخوان سے

بن بلائے مہمانوں کی آمد کا نہ دن مقرر ہے، نہ تعداد اور نہ ان کے آنے کا دن متعین نہ ہی اس کے جانے کا دن کون مقرر کر سکتا ہے۔ اسی لیے اکثر میزبان اپنے مہمانوں کا استقبال ان دو سوالوں سے کرتے ہیں۔ دونوں سوالات کے درمیان سانس لینے کے لیے انٹرول تو قطعی نہیں ہوتا۔

سوال نمبر ۱: "آئیے آئیے! کب تشریف لائے آپ؟"

حالاں کہ میزبان اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے کہ وہ غریب ابھی ٹیکسی سے اتر کر اپنے حواس درست کر رہا ہے، مگر یہ سوال شاید اس لیے کیا جاتا ہے کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ اتنی بڑی مصیبت اس کے گھر آ چکی ہے۔

سوال نمبر ۲: "کب تک قیام کریں گے؟"

پہلے سوال کا جواب تو میزبان کے رو برو کھڑا ہے مگر سوال کرنے والے کی روح دوسرے سوال کے جواب میں اٹکی ہوئی ہوتی ہے، جس طرح طلسمی کہانیوں والے جادوگر کی جان طوطے کے قالب میں ہوتی ہے۔ دوسرے سوال کا جواب دینا لازمی ہوتا ہے، لہٰذا مہمان بڑی ڈھٹائی سے یہ جواب دیتا ہے۔

"جناب عالی! جب تک ہمارا دانہ پانی اس گھر میں لکھا ہے ضرور رہیں گے، بلکہ آپ ہمیں بھگانا چاہیں تو بھی نہیں نکلیں گے؟"

یہ جواب سنتے ہی میزبان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہے۔ اس سے کفِ افسوس ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہی بات دانے اور پانی کی۔ اب ہمارے زمانے میں دانے اور پانی میں ملاوٹ وغیرہ کا بھی خاصا عمل دخل ہوتا ہے۔ عام آدمی مہنگائی کی دم کو جتنا سیدھا کرنا چاہتا ہے یہ دم اسی قدر ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے۔ بن بلایا مہمان اس سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ کب یہاں وہاں سے دسترخوان پر آ پہنچا اور کب اپنے

دانے پانی کی سرحد پھلانگ کر صاحبِ خانہ کے دانے پانی کی مملکت میں بلا پاسپورٹ داخل ہو گیا۔

سائنس کی بدولت جہاں مختلف DETECTIVE مشینیں ایجاد ہو چکی ہیں، خدا کرے کوئی ایسا آلہ بھی ایجاد ہو جائے جو دانے پر لکھے نام بہ آسانی پڑھ سکے۔ یوں تو ایجاد ہونے والی بہت سی چیزوں نے یہ باور کروانا شروع کر دیا ہے کہ اس دنیا میں اب انسان بذاتِ خود ایک بن بلایا مہمان ہے، مگر انسان اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک دنیا میں اس کا دانہ پانی موجود ہے، خواہ اسے دھکے مار کر کیوں نہ نکالا جائے، وہ یہاں سے ٹلنے والا نہیں۔ چناں چہ اب آدمی تلاشِ روزگار میں لوکل ٹرین اور سٹی بس کے دھکے کھاتا ہے اور جیتا ہے۔ آج کل تو دانے دانے پر ہی نہیں، لوکل ٹرین اور بس کے دھکوں پر بھی آدمی کا نام لکھا ہوتا ہے۔

مہمان نوازی کی روایت بہت پرانی ہے، مہمان نے صدیوں کا سفر کیا اور بننے بگڑنے کے کئی مراحل طے کیے۔ چناں چہ اس دوران اس نے میزبان سے نمٹنے کا گر بھی سیکھ لیا ہے۔ اب وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ کب اور کس گھڑی بارش کے پہلے قطرہ کی طرح کس کے گھر جا دھمکنا چاہیے تاکہ میزبان کو نہ بھاگنے کی مہلت ملے نہ رستہ۔ گھر میں قدم رکھتے ہی مہمان سب سے پہلے یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ گھر کا نظام کس کی مٹھی میں ہے۔ شوہر کے یہاں دل پر بیگم کی حکومت ہو تو چائے اور کھانے کی مسلسل تعریف کر کے میزبان کے گھر اور دل دونوں میں جگہ بنانے کی کوشش کرتا ہے اور اگر گھر میں میاں کا سکہ چلتا ہو تو اس کے ٹوٹے پھوٹے ہارمونیم کی شان میں قصیدہ پڑھ کر اس کی بے سری تانوں کا سلسلہ تان سین سے ملاتا ہے۔

مہمان کا یہ جدید روپ بارش کے قطرے کی طرح تنہا نہیں آتا بلکہ MOBILE HOME کے روپ میں آپ کے گھر منتقل ہو جاتا ہے اور آپ غالب کی زبان میں کاتبِ تقدیر سے چھوٹا سا سوال پوچھتے رہ جاتے ہیں۔

"کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد"

دنیا کے عجائب خانے میں حیرانیاں اور پریشانیاں تو قدم قدم پر آدمی کی منتظر رہی ہیں۔ بیسویں صدی نے اور بھی کمال کیا، ہر نیا دن سائنس کی کسی نئی ایجاد یا نئے انکشاف کے ساتھ اس جادوگر کی طرح طلوع ہوتا ہے جو خالی ٹوپی سے کبوتر برآمد کر کے ہمیں دریائے حیرت میں غوطہ زن کر دیتا ہے۔ یہ مثال بن بلائے مہمان پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بن بلایا مہمان اپنے درجن یا نصف درجن سمجھ دار اور ناسمجھ بچوں کی فوج سمیت آپ کے گھر پر یلغار کر دیتا ہے تو آپ مارے حیرت کے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی اسے اور کبھی اپنے گھر کو دیکھنے لگتے ہیں۔ آپ کی یہ حیرت اگلے دن اور بھی قابلِ دید ہوتی ہے۔ جب اس کا لائق بچہ دو ہی سے آپ کے کسی دوست کے بھجوائے ہوئے ٹی سیٹ کو لے کر "JACK AND JILL, WENT ON THE HILL" گنگناتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ جاتا ہے اور آپ کے کمرے کے فرش کو ہیروشیما یا ناگاساکی سمجھ کر پوری قوت سے فرش پر دے مارتا ہے "اس معصوم کو کیا پتہ کہ وہ ٹی سیٹ ہے۔ آپ کا پیمانہ صبر لبریز ہو جاتا ہے۔ مگر آپ اپنے چہرے پر کھسیانی ہنسی کے آثار پیدا کر کے کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں، آخر بچہ ہی تو ہے" کہہ کر رہ جاتے ہیں۔ اور بچے کے والدین آپ کی زبان سے نکلی اس ابدی سچائی کو صدقِ دل سے قبول بھی کر لیتے ہیں۔

پریشانیوں کی یوں بھی تو کوئی حد نہیں آپ کی حیرانی کی اس وقت کوئی انتہا نہیں رہ جاتی، جب ہر حد سے

ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یہ مخلوقِ عالمی پھیلنے پر بن بلائے مہمانوں کی ناشائستگی کے سبب ہے، لہٰذا اکثر لوگ ان ہی بن بلائے مہمانوں سے خائف رہنے لگے ہیں۔

بعض مہمان رومانی ناول کی طرح دلچسپ ہوتے ہیں۔ انھیں چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ اسی طرح میزبان بھی بن بلائے مہمان اسی قسم کے دلچسپ ناول کی طرح ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بعض بن بلائے مہمان تھرڈ کلاس قسم کے شاعر کی بے تکی غزل کی طرح ہوتے ہیں۔ اس غزل کی طرح جس کا ہر شعر شعریت سے خالی اور بوریت سے بھرپور، اکتا دینے والے ۲۴ گھنٹے کے ایک دن کی طرح ہوتا ہے۔ شاعر اپنی بے سری آواز میں ایک ایک شعر کا اضافہ کرتا چلا جاتا ہے، جس طرح مہمان اپنی رسائی کے ایک ایک دن کو ٹالتا رہتا ہے۔ اس قسم کا شاعر بھی اسٹیج پر ایک ناخواندہ مہمان ہی ثابت ہوتا ہے۔

یوں تو بن بلایا مہمان کے دو پاؤں ہوتے ہیں۔ جن کی مدد سے وہ آتا ہے اور جانے کا نام نہیں لیتا۔ مگر بعض ناخواندہ مہمان بنا پیروں کے بھی آتے ہیں جیسے غنڈہ گردی، بے حیائی، چور بازاری وغیرہ

مہمان کو پھر بھی آپ کسی نہ کسی عذر یا حیلے کے ذریعے گھر سے بھگا سکتے ہیں لیکن ان سماجی برائیوں کو بھگانا آپ کے بس کا روگ نہیں؟

رشید الدین
(حیدرآباد)

اِسحٰق ایوبی مرحوم

پچھلے دنوں حیدرآباد میں اُردو کے مزاح نگار ادیب محمد اسحٰق ایوبی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ وہ حیدرآباد کے نہیں تھے لیکن انھوں نے اسی کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور پچھلے تیس سال سے یہیں مقیم تھے۔ مہدی پٹنم میں انھوں نے مکان بھی بنا لیا تھا۔ اس طرح وہ پیدائشی نہیں بلکہ اپنے انتخاب کے ذریعہ حیدرآبادی تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شہر انھیں کتنا پسند تھا۔

اسحٰق ایوبی مہاراشٹر کے ضلع ناسک کے ایک تعلقہ مالیگاؤں کے متوطن تھے۔ ان کا تعلق بُنکر برادری سے تھا۔ ان کے آباء و اجداد بہت عرصہ قبل اتر پردیش سے یہاں آکر بس گئے تھے۔ ایوبی صاحب نے اپنی برادری کے روایتی طریقہ کی بجائے اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور سرکاری نوکری اختیار کی۔ وہ پونہ یونیورسٹی کے ایم اے (اردو فارسی) تھے۔ اُس زمانے میں اردو اور فارسی کے مضامین علیحدہ علیحدہ نہیں ہوتے تھے بلکہ ایم اے میں چار پرچے اردو کے اور چار فارسی کے ہوتے تھے۔ اردو کے علاوہ وہ فارسی، عربی اور انگریزی پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ ۱۶؍ مئی ۱۹۱۶ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اس طرح انتقال کے وقت ان کی عمر تقریباً ۷۳ سال تھی۔

ایوبی صاحب پریس انفارمیشن بیورو حکومت ہند سے وابستہ تھے۔ سبکدوشی کے وقت تک وہ انفارمیشن آفیسر کے عہدہ تک پہنچ گئے تھے اور حیدرآباد آفس کے انچارج تھے۔ ایوبی صاحب اپنے ملنے میں صحافتی برادری سے کافی مقبول تھے اور ہر طرح ان کی اعانت کرتے تھے۔ میں نے ہمیشہ ان کے دفتر میں اردو کے کسی نہ کسی صحافی کو بیٹھے پایا۔ پہلے وہ شعبہ اردو کے انچارج تھے بعد میں سارے دفتر کے انچارج ہو گئے تھے۔

ایوبی صاحب بے حد معقول الطبع، شریف النفس، خلیق، ملنسار اور ہمدرد آدمی تھے۔ وہ تنہائی پسند اور کم گو تھے لیکن اپنے مخصوص دوستوں کے ساتھ خوب کھلتے تھے اور قہقہے بھی لگاتے تھے۔ وہ دوران گفتگو دل چسپ فقرے کستے رہتے تھے اور ان کی داد کے طور پر [illegible] قہقہہ بھی لگاتے تھے۔ مزاح ان کی طبیعت کا ایک لازمی جزو تھا لیکن عام لوگوں کے لیے وہ ایک سنجیدہ، متین اور سیدھے سادے آدمی ہی تھے۔ حیدرآباد میں ان کے [illegible] تھے [illegible] شامل تھا [illegible] خوش ہوتے تھے اور [illegible] شکایت کرتے تھے۔

وہ ۱۹۶۰ء میں دہلی سے تبادلہ ہو کر حیدرآباد آئے اور میں بھی اسی سال اورنگ آباد سے حیدرآباد منتقل ہوا۔ ایک بار ایوان اردو گیا تو وقار خلیل صاحب نے ایوبی صاحب کا تعارف کرایا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ میں بھی بھول بھال گیا۔ لیکن ایک مقامی اخبار میں ان کا ایک مزاحیہ مضمون نظر سے گزرا جس میں ان کی کوٹ پہنے اور بو ٹائی لگائے ہوئے ایک تصویر بھی چھپی تھی۔

مضمون اور تصویر دیکھ کر میں نے ان سے ملنے کا ارادہ کر لیا۔ ان کے کمرہ کے سامنے نہ کوئی چپراسی تھا اور دروازہ پر پردہ البتہ ان کے نام اور عہدہ کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں اندر پہنچا تو دیکھا کہ ایک بے حد مختصر شخص اور غیر متاثر کن صاحب مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہیں میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے غور کیا کہ ان کے ہاتھ بھی معمول سے کچھ چھوٹے تھے۔ مجھے مشکل سے یقین آیا کہ یہ وہی صاحب ہیں جن کی تصویر میں نے اخبار میں دیکھی تھی۔

لیکن جب ان سے باتیں شروع ہوئیں تو میں سب کچھ بھول چکا تھا۔ اس دن کی ملاقات دائمی دوستی میں بدل گئی اور یہ تعلقات اتنے بڑھے کہ گھریلو تعلقات کی نوعیت ہو گئی۔ افسوس کہ چند سال قبل ان کی اہلیہ بھی انتقال کر گئی تھیں۔ البتہ ان کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں موجود ہیں ان سب کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا۔ تینوں لڑکوں اور ایک لڑکی کی شادی ہو چکی ہے ان بیاہی لڑکی فی الحال ایم اے کر رہی ہے۔

ایوبی صاحب بے حد قابل آدمی تھے۔ اردو کے علاوہ وہ عربی، فارسی اور انگریزی پر بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ انھیں مرہٹی اور ہندی بھی اچھی آتی تھی۔ ایک بار میرے دفتر محکمہ ترجمہ میں عزیز جنگ ولا کی ایک کتاب "دستور العمل پٹیل و پٹواریاں" کے کچھ حصے انگریزی میں ترجمہ کے لیے آئے۔ مجھے جو حصہ ملا اس میں کچھ پیراگراف فارسی کے بھی تھے۔ میں نے اس سلسلے میں ایوبی صاحب کی مدد لی اور انھوں نے دفتر ہی میں بیٹھے بیٹھے مجھے اس کا انگریزی ترجمہ لکھوا دیا۔

لیکن افسوس کہ انھوں نے اپنی قابلیت سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت لئے دیئے رہتے تھے۔ ان کی طبیعت میں کاہلی بھی تھی۔ اس وجہ سے عبدالحمید لوہیرے مرحوم ایڈیٹر ماہنامہ "صبح امید بمبئی" انھیں مذاق سے بحر الکاہل کہا کرتے تھے۔ لوہیرے صاحب ان کے دوست اور خیر خواہ تھے اور ان کی قابلیت سے بخوبی واقف تھے لیکن ان کی محنت نہ کرنے کی عادت سے نالاں رہتے تھے وہ شہرت پسند بھی نہیں تھے پچھلے دس پندرہ سال سے وہ ایک بے حد باعمل اور صحیح العقیدہ مسلمان بن گئے تھے اور نماز روزہ اور وظائف کے سختی سے پابند ہو گئے تھے۔ وہ نہ صرف خود اسلام کے اصولوں پر عمل پیرا ہو گئے تھے بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ مجھے بھی اکثر نماز کی پابندی کی تلقین کرتے تھے داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ خیر خیرات بہت کرتے تھے۔ میں نے ان کے گھر سے کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ جاتے نہیں دیکھا۔

ایوبی صاحب مزاح نگار تھے۔ ان کا طرز تحریر منفرد تھا۔ زبان و بیان پر انھیں بے پناہ قدرت حاصل تھی۔ وہ چٹکیوں ہی میں کام کی باتیں لکھ جاتے تھے۔ عام طور پر وہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرتے تھے جن پر کوئی مزاحیہ مضمون مشکل ہی سے لکھا جا سکتا ہے۔ [illegible] اپنے [illegible] کا مجموعہ [illegible] مرتب کر لیا تھا لیکن اس کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی آخر آخر میں شاعری کا بھی شوق [illegible]

کا ذہنی منفرد رنگ تھا۔ کچھ نظمیں بچوں کے لیے بھی لکھی تھیں جو بچوں کے رسالہ "کھلونا" میں شائع ہوئیں۔ ان کے بہت سے انشائیے ماہنامہ "شگوفہ" میں بھی شائع ہوتے۔

سنٹرل یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبہ اردو نے ڈاکٹر سیدہ جعفر کی نگرانی میں ایک طالبہ انیسہ سلطانہ سے ایم فل کے لیے ریسرچ ورک کرایا تھا عنوان تھا "حیدرآباد میں طنز و مزاح کی نشوونما" ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۰ء تک" اس کتاب میں پورے ۵ صفحات ایوبی صاحب کی شخصیت اور فن کے لیے مختص ہیں۔ اس کتاب میں بہت سخت تنقیدی لب و لہجہ اختیار کیا گیا ہے لیکن ایوبی صاحب کے انشائیوں کے بارے میں ایک بھی سخت یا نخوا نا خوشگوار جملہ اس کتاب میں نہیں ملتا۔ ایک جگہ وہ (انیسہ سلطانہ) لکھتی ہیں:

" اسحٰق ایوبی اچھے مزاح نگار رہیں۔ ان کے مضامین کئی لحاظ سے اپنی قدر و قیمت رکھتے ہیں۔ فن اور زبان کے لحاظ سے ان کی اہمیت نظرانداز نہیں کی جاسکتی اسحٰق ایوبی کا المیہ یہ ہے کہ وہ حیدرآباد کے اچھے اور پرانے مزاح نگار ہونے کے باوجود انھیں شہرت نہیں ملی"۔

آخر میں ان کا طرز تحریر بھی دیکھ لیجئے۔ شاعروں کے تعلق سے ایک انشائیہ میں لکھتے ہیں "مشاعرہ اور قوالی میں زمین و آسمان کا فرق ہوا کرتا تھا۔ اب یہ فرق سمٹ کر سوا نیزہ کا رہ گیا ہے"۔ "حادثوں" کے بارے میں یہ ایک جملہ دیکھئے "حادثوں کی نوعیت لاٹری کی سی ہوتی ہے جو کسی کے نام بھی نکل سکتی ہے"۔ ایک اور مضمون میں لکھتے ہیں: "سورج اور شمع کا مقابلہ کیا مگر پروانہ مرتا ہے تو شمع پر"۔

ایوبی صاحب ذیابطیس کے پرانے مریض تھے۔ ہومیو پیتھک طریقہ علاج جانتے تھے اور اسی سے اس کا علاج کرتے تھے۔ آخری چند سالوں میں اسی مرض کی وجہ سے بینائی بھی زائل ہوگئی تھی۔ گھر ہی میں رہتے تھے۔ پہلے سے نحیف تھے۔ آخر آخر میں بالکل ہی نحیف و ناتواں ہوگئے تھے کیوں کر پرہیزی کھانا کھاتے تھے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ذیابطیس کی وجہ سے ہی ان کی موت واقع ہوئی۔

۸۷

ڈاکٹر جاوید وششٹ [تبصرہ]

نئے شگوفے

مصنف :۔ کنھیا لال کپور
سال اشاعت :۔ ۱۹۸۸ء
صفحات :۔ ۱۹۲
قیمت :۔ پینتیس ۳۵ روپے (مجلد۔ رنگین گرد پوش)
پبلشر :۔ سلوچنا پبلیکیشنز ڈی ۱۴، گرین پارک، نئی دہلی ۴۹۔۔ ۱۱

کنھیا لال کپور (۲۷ جون ۱۹۱۰ء ۔ ۵ مئی ۱۹۸۰ء) اردو طنز و مزاح کے قد آور ادیب ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فکر تونسوی انھیں عمر بھر اپنا گرو مانتے رہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے نو مجموعے شائع ہوئے :۔ سنگ و خشت، شیشہ و تیشہ، چنگ و رباب، نوک و نشتر، بال و پر، نرم گرم، گرد کارواں، گستاخیاں اور نازک خیالیاں۔ پہلا مجموعہ ۱۹۴۲ء میں اور آخری ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آیا۔

"نئے شگوفے" کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا انتخاب کپور صاحب نے کیا اور اس کا نام سنسکار بھی یہ ان کی آخری کتاب ہے اس مجموعے کا مقدمہ اردو اور انگریزی کے معروف ادیب اندرجیت لال نے بعنوان "کچھ طنز نگار کے بارے میں" سپرد قلم کیا ہے۔ ہمارے نقاد اس بات پر متفق ہیں کہ کپور صاحب بنیادی طور پر طنز نگار ہیں، مزاح ان کے ہاں ذیلی و ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی شگفتہ مزاجی اور زندہ دلی مزاح کے نئے نئے شگوفے چھوڑتی رہتی ہے۔ طنز و مزاح کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں :۔

"طنز : تنقید ہے۔ صدائے احتجاج ہے۔ دشنام یار ہے۔ تبصرہ ہے۔ تازیانہ ہے۔ اس کا مقصد اصلاح ہے۔ دوسرے کی پگڑی اچھالنا ہے۔ اپنے احساس برتری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ بے ہودہ اشیاء اور اشخاص کا مضحکہ اڑانا ہے۔ مزاح :۔ مبالغہ ہے مشغلہ ہے۔ ہنسائی ہے۔ انار ہے۔ پھلجھڑی ہے۔ اپنے آپ پہ ہنسنے کا نام ہے۔ چٹکی لینا ہے۔ ہمدردانہ نقطۂ نظر سے انسانی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے کا فن ہے۔"

(طنز و مزاح میری نظر میں)

کنھیا لال کپور کا طرز نگارش اور انداز طنز و مزاح ملاحظہ کیجئے مشتے نمونہ از خروارے :۔

آدمی :۔ وہ جانور جسے چڑیا گھر میں اس لیے نہیں بھجوایا گیا مبادا باقی جانور اس کی صحبت میں رہ کر بگڑ نہ جائیں۔

بیوی :۔ دلہن، باورچن، نرس اور باندی کا قابل رحم مرکب۔

بھابی :۔ سالی کے علاوہ واحد ہندوستانی عورت ہے جس کے ساتھ تھوڑی سی بے تکلفی کے ساتھ پیش آیا جا سکتا ہے۔

تقریر :۔ کچھ کہے بغیر متواتر بولتے چلے جانے کا فن۔

زبان :۔ گوشت کا لوتھڑا جس کی لمبائی کم ہو سکتی ہے

اگر وہ بغیر ... ہی رہ جاتے

ناخستہ: ایک پرندہ جسے کبھی قفس سے اڑا دیا گیا تھا لیکن جو اس کی وفات کے بعد خود اڑ رہا ہے۔

(لغات جدید)

آنکھیں: وہ جو ... ملیں تو زحمت، مل جائیں تو مصیبت، لڑ جائیں تو آفت اور اٹھ جائیں تو قیامت ہوتی ہے۔

ایسا: ایک قسم کا ... پایا جاتا ہے...

فلسفہ: کوئی ایک بات جو نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے جو سمجھا رہا ہے اور نہ اس کی سمجھ میں آتی ہے جو سمجھ رہا ہے مگر اس کو پھر بھی پتے کی بات کہا جاتا ہے۔

(لغات جدید تر)

اندرجیت لال نے ٹھیک لکھا ہے کہ اس (کپور صاحب) کا ہر دوسرا فقرہ چٹپٹا اور ہر تیسری ترکیب چاق و چوبند ہوتی ہے۔ ان کا ہر لفظ ایک طمانچہ اور ہر شوشہ ایک چٹکی ہے۔ کپور صاحب مرحوم کی یہ تازہ ترین کتاب بلکہ آخری کتاب ان کی نمائندہ تحریر کہی جا سکتی ہے۔ طنزیہ ادب کی ایک قابل قدر کتاب بھی جو ہر اعتبار سے دلکش ہے۔ کپور صاحب کے مداحوں کے لیے یہ ایک یادگار تحفہ کا درجہ رکھتی ہے۔

اداریہ

حیدرآباد کے ممتاز ترقی پسند شاعر جناب خیرات ندیم کا اس مہینے انتقال ہوگیا۔ وہ پچھلے چند ہفتوں سے علیل تھے۔

خیرات ندیم 'مخدوم' اور سلیمان اریب کے ساتھیوں میں سے تھے۔ بڑے خوش مزاج، خوددار اور مخلص آدمی تھے۔ حلقۂ احباب کافی وسیع تھا۔ زندہ دلان حیدرآباد اور شگوفہ سے بھی انھیں تعلق خاطر تھا۔ زندہ دلی کی حقیقی تصویر تھے۔ مالی اور جسمانی تکلیف کے باوجود چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اور طبیعت کی لطیفہ سنجی میں کبھی فرق نہ آیا۔

ادارۂ شگوفہ خیرات ندیم کے انتقال پر گہرے رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے۔ دعا ہے کہ خدا انھیں اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین۔

مدیر

دے کے خط (مراسلے)

○ محبّی و مخدومی ڈاکٹر سیّد مصطفیٰ کمال صاحب
سلام مسنون! سڈنی کے مشاعرے میں شگوفہ کا تازہ شمارہ ملنے پر سارا ماحول اور زیادہ دل کش ہو گیا۔ انجمن ترقی اردو آسٹریلیا کے نام آپ نے اپنے پیام میں فقیر کا جن دل پذیر الفاظ میں ذکر کیا اس کے لیے بندہ آپ کا بے حد شکر گزار ہے۔ یہاں آکر مجھے محسوس ہوا کہ آسٹریلیا میں بھی طنز و مزاح کی شمع خصوصی طور پر زندہ دلانِ حیدرآباد ہی نے روشن کر رکھی ہے۔ شگوفہ ملا تو سارا شاعر سامنے آگیا۔ یعنی نریندر لوتھر، یوسف ناظم، طالب خوندمیری، مسیح انجم اور بلند و بالا حمایت اللہ صاحب۔ ابھی تک مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ کے مضامین پڑھنے کی مہلت مل رہی ہے۔ مجتبیٰ کے قلم کے ہاتھ تو دل میں اتر جانے والی نثر لکھنے کی طلسمی انگوٹھی لگ گئی ہے۔ دلیپ سنگھ جی کا جو مضمون بھی اب تک میری نگاہ سے گزرا۔ خوب سے خوب تر۔

میں مئی کے اواخر تک یہیں ہوں۔ والسلام
ضمیر جعفری

وولن گانگ، آسٹریلیا

○ پہلی اپریل کو یہاں مزاحیہ مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ محترم ضمیر جعفری صاحب نے صدارت فرمائی۔ شگوفہ کے چند شمارے احباب میں تقسیم کیے گئے۔ اتنا اچھا رسالہ پاکر لوگ بہت خوش ہوئے۔ ہم سب آپ کے مستقل خریدار بن رہے ہیں۔ زندہ دلانِ حیدرآباد اکیڈمی اور شگوفے سے لطف اندوز ہونے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہوں۔ وہ اپنی نشست ابھی تک نہیں بھول سکا جس میں نئی نسل میں جو ہونے اپنا دلچسپ مضمون پڑھا تھا اور ہوائی کی لطیفہ گوئی اور تبسم کے لطیفے ۔۔۔ خدا سے دعا ہے کہ شگوفہ اور زندہ دلان پھولیں اور پھلیں۔

سیّد مسعود حسینی۔ سڈنی (آسٹریلیا)

○ ۲ رمارچ کو کراچی میں پاک بھارت مزاحیہ مشاعرہ منعقد ہوا۔ میرا خیال تھا آپ بھی تشریف لائیں گے لیکن آپ سے ملاقات شاید قسمت میں نہیں تھی۔ آپ آئے نہیں اسی طرح جناب طالب خوندمیری کی ملاقات سے بھی محروم رہا۔ انڈیا سے صرف پاپلر میرٹھی تشریف لائے تھے۔ موصوف کا کلام بہت پسند کیا گیا۔
کراچی میں محترم خواجہ حمید الدین شاہد ایڈیٹر سب رس سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ اس سال بھی وہ گزشتہ سال کی طرح پاک بھارت طنز و مزاح کانفرنس منعقد کریں گے۔ شاید اس موقع پر آپ کے نیاز، نیاز کو حاصل ہوں۔

نیاز سواتی۔ ایبٹ آباد

○ سال نامے کو پہلے دیکھ کر پھر پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ اس ہوش ربا گرانی میں شگوفہ کے چکنے چکنے پات نے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیے۔ ابھی سال نامے کا نشہ اترا نہ تھا کہ دوسرا شمارہ بھی ہاتھ لگا۔ یہ تو حقیقت سب پر عیاں ہے کہ شگوفہ کا ہر شمارہ ایک الگ مزاج رکھتا ہے۔ سال نامہ حیدرآبادی بریانی تھا تو دوسرا شمارہ بگھارے بیگن سے کم نہیں۔

حلیمہ فردوس
بنگلور

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۲
شمارہ ۶
جون ۱۹۸۹ء

سرورق: طالب خوندمیری

فی پرچہ: ۵ روپے
زرِ سالانہ: ۵۰ روپے
لائبریریوں سے: ۶۰ روپے
عرب ممالک سے: ۱۶۰ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چار کمان۔ حیدرآباد
کتابت: محمد غالب

خط و کتابت کا پتہ: ۳۱-۱-۵ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون رہائش: 521064 * فون آفس: 557716

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

مسیح انجم

بیت الخیال

عنوان پڑھ کر شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ 'بیت الخیال' کسی شاعر کے مجموعۂ کلام یا اس کے غزلیات کا نام ہوگا۔ جی نہیں! یہ صرف آپ کا خیال ہی خیال ہے۔ یہاں "بیت الخیال" سے ہماری مراد اپنے گھر کی وہ مختصر سی چو دیواری ہے جسے ہم نے بزعم خود ادیب ہونے کے ناتے یہ نام دے رکھا ہے۔ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ہمارے بیت الخیال کی کل کائنات صرف دو قدمچے ہیں ــــ ویسے، ہر بیت الخیال کی کل کائنات صرف دو قدمچے ہی ہوا کرتی ہے۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ بعض لوگ اسے ریڈنگ روم، ڈرائنگ روم، باتھ روم، ویٹنگ روم ــــ اور نہ جانے کیا کیا 'روم' کا درجہ دے دیتے ہیں اور کن کن اغراض و مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ زمانہ ملٹی پرپز پراجکٹ کا ہے اور آج کا انسان ایک چیز سے کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ فلموں میں اسی ایکٹرس کو زیادہ چانس دیا جاتا ہے جو کئی طرح کے رول کرسکتی ہو اور کئی طرح سے کام آتی ہو۔

آپ ہماری اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ 'بیت الخیال' ہی مکان کا سب سے اہم حصّہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ہر شخص کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب وہ وہاں سے فراغت پاکر نکلتا ہے تو بالکل چاق و چوبند دکھائی دیتا ہے۔ پھر اس کے بعد دیکھئے کہ شام تک اس کے چہرے پر کس غضب کی "بحالی" رقص کرتی رہتی ہے۔ سارے کاروبار بڑی خوش اسلوبی سے انجام پاتے ہیں۔ نہ کوئی اڑچن اور نہ کوئی رکاوٹ۔ بلڈ پریشر بھی بالکل نارمل رہتا ہے۔ مسکرا مسکرا کر بات کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر کوئی آئی۔اے۔ایس آفیسر یا گزیٹیڈ آفیسر کسی دن اپنے ماتحتوں سے مسکرا مسکرا کر بات کرے تو سمجھ لیجئے کہ وہ اس دن اپنے "بیت الخیال" سے نہایت ہی کامیابی و کامرانی کے ساتھ برآمد ہوا ہے۔

لیکن شاعروں، ادیبوں اور مفکّروں کی بات بالکل جداگانہ نوعیت کی ہے۔ کیوں کہ مختلف موضوعات پر گھنٹوں سوچنا اور غور و فکر کرنا ان کی طبعیت کا خاصہ ہے اور غور و فکر کے لیے 'بیت الخیال' سے زیادہ موزوں جگہ شاید ہی کہیں ہو۔ کیوں کہ آج کل کے مکانوں میں "خلوت" نام کی کوئی چیز باقی نہ رہی جہاں آپ تنہا کسی موضوع پر غور و فکر کرسکیں اور آپ کو ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہ ہو۔ شہر کے پارک، چمن اور تفریح گاہ بھی اس قابل نہ رہے جہاں آپ کو گوشۂ تنہائی نصیب ہوسکے۔ گوشۂ تنہائی کی تلاش میں جب آپ گھر سے بیزار ہوکر کسی پارک یا چمن کا رُخ کرتے ہیں تو وہاں آپ کو پالش والا، مالش والا، تیل والا کے علاوہ مال والا قسم کے بیسیوں دلالوں اور بروکروں سے سابقہ پڑتا ہے۔ یُوں بھی آج کل کے چمن، پارک اور تفریح گاہ OPEN-AIR-LAVATORY اور OPEN-AIR-URINAL میں تبدیل ہو گئے ہیں جہاں جگہ کی قلّت کا شکار ہونے والے لوگ مختلف پوزیں مختلف ضروریات سے فارغ ہوتے نظر آتے ہیں۔ اب لے دے کر "بیت الخیال" ہی غور و فکر کے لیے موزوں و مناسب جگہ قرار پاتی ہے۔

چنانچہ جب ادیب، شاعر اور مفکّر اپنے "بیت الخیال" میں بند ہوجاتے ہیں تو اُن کے ذہن کی کھڑکیاں روشن دان اور دروازے یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ کھلنے لگتے ہیں۔ چہرے پر ایک رنگ آتا ہے۔ ایک رنگ جاتا ہے۔ غیب سے مضامین آنے لگتے ہیں۔ اسرار و رموز کھلنے لگتے ہیں۔ خرد کی گتھیاں سُلجھنے لگتی ہیں۔ ایک خیال آتا ہے، ایک خیال جاتا ہے۔ دھُندلا خیال واضح اختیار کرتا ہے۔ روشن خیال ایک اچھوتے خیال میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر یا مفکّر "بیت الخیال" میں طویل قیام فرمائے تو یقین کر لیجئے وہ کچھ اسی قسم کے خیالات میں غلطاں و پیچاں ہے۔ چچا غالب نے انسان کے محشرِ خیال ہونے کی جو بات کہی ہے شاید وہ فیضانِ بیت الخیال ہی کا نتیجہ ہو۔ ازار بند میں گرہیں لگانے کی بات بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ شاید مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" مرتب کرتے وقت از راہ اُستاد نوازی رعایت و مروّت سے کام لیا ہو۔ اس سلسلے میں محققین کو چاہیئے کہ وہ "بیت الخیال" میں بیٹھ کر غور کریں۔ کیوں کہ غور و فکر اور یکسوئی کے لیے "بیت الخیال" سے زیادہ موزوں جگہ شاید ہی ہو!

ہمارا لٹریچر "بیت الخیال" کے ذکر سے خالی پڑا ہے۔ کسی نے بھی اس کے CONTRIBUTION کی جانب توجہ نہیں دی۔ ہوسکتا ہے ادب کو نازک اور اچھوتے خیالات سے مالا مال کرنے میں "بیت الخیال" کا بہت بڑا CONTRIBUTION رہا ہو۔ کتنے ہی ایسے اچھوتے اور نازک خیالات ہوں گے جنھیں شعرا نے "بیت الخیال" سے نکلنے کے بعد اشعار میں ڈھالا ہو اور پھر بعد میں انھیں ایوانوں اور فریموں میں سجایا گیا ہو۔ کتنی ہی ایسی تھیوریاں ہوں گی جو "بیت الخیال" میں جنم لی ہوں اور پھر اس کے بعد انقلاب کا ذریعہ بنی ہوں۔ دور کیوں جائیں۔ مشہور سائنس داں نیوٹن نے کششِ ثقل کا جو نظریہ پیش کیا تھا وہ "بیت الخیال" کے فیضان ہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ نیوٹن کے زمانے میں "بیت الخیال" باغ کی نوعیت کا رہا ہو۔ ہماری اس بات پر ہوسکتا ہے محققین اور مؤرخین چراغ پا ہوجائیں۔ اور از سرِ نو تحقیق کرکے باغ کو بیت الخلا ثابت کر دیں۔ کیوں کہ محققین اور مورخین کے لیے باغ میں بیٹھے ہوئے شخص کو بیت الخلا میں بٹھلانا اور بیت الخلا میں

بیٹھے ہوئے شخص کو باغ میں بٹھانا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اور آج کل یہ کام ہمارے مورخین اور محققین بڑے دھڑلے سے انجام دے رہے ہیں۔

یہ بڑا عجیب وغریب نفسیاتی معاملہ ہے کہ غسل خانے میں فلمی گانے سوجھتے ہیں اور گنگنانے کو جی چاہتا ہے ـــــ لیکن "بیت الخیال" میں یہ ساری سرگرمیاں بالکل معیوب سمجھی جاتی ہیں اور اس کا مرتکب پاگل قرار دیا جاتا ہے۔ یوں بھی "بیت الخیال" میں داخل ہونے کے بعد انسان کو ایک چپ سی لگ جاتی ہے۔ اور اس پر ایک گمبھیرتا طاری ہوجاتی ہے آپ تو یوں معلوم ہوگا جیسے سارا علاقہ ایک SENSITIVE AREA قرار دیا گیا ہو۔ مفکرین نے اس علاقہ کو ـــــ SILENCE ZONE قرار دیا ہے۔ اور مجبوری کی صورت میں صرف ایک گمبھیر "ہوں" کے ذریعہ اپنا آپا بتانے کی اجازت دی ہے۔ بعض شرمیلے قسم کے لوگ تو اس حد تک آداب ملحوظ رکھتے ہیں کہ "ہوں" کہنا تک گوارہ نہیں کرتے بلا مصنوعی کھانسی کے ذریعہ اپنی موجودگی سے مطلع فرماتے ہیں۔

جب ہم کسی اہم مسئلہ سے دوچار ہوجاتے ہیں تو اس کو "بیت الخیال" سے رجوع کرتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمیں "بیت الخیال" سے کوئی خاص اُنس ہے۔ دراصل ہم جگہ کی قلت کا شکار ہیں ہمارے گھر میں کوئی ایسا گوشہ نہیں ہے جہاں صرف ہم ہی ہم ہوں اور ہمارے خیالات ہوں۔ ہمارے کمرے میں اتنی گنجائش ہی نہیں ہے کہ ہمارے ساتھ خیالات بھی سما سکیں۔ ہمارے شہر کے پارک اور چمن اس قابل نہیں رہے کہ وہاں گوشۂ تنہائی نصیب ہو سکے۔ جیسا کہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ وہاں پالش والوں، مالش والوں، بھیک مانگنے والوں، آنکھ چرانے والوں، آنکھ ملانے والوں اور آنکھ مارنے والوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اب لے دے کر "بیت الخیال" ہی وہ واحد جگہ رہ جاتی ہے جہاں کوئی کسی کو ڈسٹرب نہیں کرتا۔ چنانچہ جب ہم کسی اہم موضوع کو لے کر 'بیت الخیال' کا رُخ کرتے ہیں تو گھر والوں کو یہ وارننگ دے دیتے ہیں کہ دیکھو بھئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرنا، ورنہ ہم سے بُرا کوئی اور نہ ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیتے ہیں کہ اگر کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو صاف کہہ دینا کہ ہم گھر میں نہیں ہیں۔

اشارے اور کنائے برطرف! ہم لکھنا چاہتے تھے "بیت الخلا" لیکن لکھ گئے "بیت الخیال"۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ سوچ اگر اچھی ہو، خیالات اگر اچھے ہوں تو کیا بیت الخلا اور کیا بیت الخیال۔ یوں اگر غور کریں تو "بیت الخیال" اِنسانی ذہن کا دوسرا نام بھی ہے، بشرطیکہ اس میں اچھے خیالات پرورش پاتے ہوں اور وہ صالح ادب کی نکاسی کرتا ہو۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہو تو "بیت الخیال" ہی "بیت الخلا" بن کر رہ جاتا ہے۔ اس طرح کی کئی زندہ مثالیں آج دُنیا میں موجود ہیں۔ فی الحال ایک مثال پر اکتفا کرتے ہیں۔ بدنام زمانہ مصنف سلمان رشدی نے " THE SATANIC VERSES " (شیطانی کلمات) لکھی اور دولت کے ساتھ ساتھ رسوائی بھی خوب کمائی۔ اب آپ ہی سوچیے کہ صاحبِ معتوب کی یہ تصنیف "بیت الخلا" کی پیداوار ہے یا "بیت الخیال" کی !؟

▲▲

رضا نقوی واہی
پٹنہ

دانشور

تھا حسنِ اتفاق کہ "ٹی کورنر" میں کل
بیٹھے ہوئے تھے ناو ئیز قائمہ بنے ہوئے
رکھا تھا پوسٹ فرسٹ بیگ ایک میز پر
یوں عالمِ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے آپ
اُلجھے ہوئے تھے بال ، حجامت بھی تھی بڑھی
میں نے بصد خلوص و ادب چائے پیش کی
رسم کے تذکرے سے چلی بات ادب کی سمت
ہر بات میں کہیں کا حوالہ ضرور تھا
اردو کے ارتقا کی طرف بات جب مڑی
میں نے کہا کہ ذہن ابھی تک غلام ہے
افکار مستعار ہیں تحسین مستعار
تنقید چھیڑ چھاڑ ہے تحقیق کھود کھاد
افسانے کے مرحلے میں افسانہ پن نہیں
پیڑوں کے بدلے اس میں مشینوں کا ناچ ہے
پہلے تھا فارسی کے تتبع پہ افتخار
بولے فضول آپ نہ بکواس کیجیے
میں نے کہا کہ چند ادیبوں کا نام لیں
بولے کہا کہ موسیو ژاں پال سارتر
اور ... رہے ہیں جوائس ادیبِ عصر

قسمت سے میری مل گئے اک انٹلکچوئل
جیسے محاذ پر ہو کوئی فیلڈ مارشل
اور اس سے متصل تھیں کتابیں ڈبل ڈبل
جیسے دماغ میں ہو کسی مسئلے کا حل
چہرے پہ ادعائے متانت جبیں پہ بل
اور اس کے بعد آیا رُخِ گفتگو نکل
اپنی جگہ پہ آپ کا ہر قول تھا اٹل
اس سے غرض نہ تھی کہ حوالہ ہو برمحل
کہنے لگے کہ تیز ہے رفتار آج کل
جاتا نہیں دماغ سے تقلید کا خلل
ہر نکتہ بے مقام ہے ہر لفظ بے محل
چلتے ہیں یوں قلم کہ چلے جس طرح سے ہل
اس شتر بے مہار کی سیدھی ہے کون کل
اک جھوٹ پل بنا ہے 'پری خانہ' غزل
اب مغربی ادب کی غلامی ہے بے خلل
اب کاروانِ فکر کی راہیں گئیں بدل
اپنی ڈگر بنا کے جو چلتے ہیں آج کل
جس نے بنا دیا ہے ہمیں انٹلیکچوئل
پہنے دل و دماغ کے دیتا ہے جو بدل

میں نے کہا۔ حضور یہ اردو کا تھا سوال
بولے، کہ آپ بحث کریں مجھ سے یہ مجال!

ڈاکٹر جاوید وششٹ
فرید آباد

چیتھڑ قناتیا

۱۹۶۷ء کی بات ہے ہمارے ایم۔ اے (اردو) کے نصاب میں علامہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کی "کیفیہ" تھی۔ ہمیں اس میں کوئی کیفیت نہیں نظر آئی، بڑی خشک! مگر قہر درویش بر جان درویش کے مصداق کیفیہ کی خشکی کو چار و ناچار برداشت کرنا پڑا۔ آخر ہم نے اس ریگستان میں ایک نخلستان تلاش کر ہی لیا۔ اردو الفاظ کی تحقیق میں کیفی صاحب نے کچھ ایسے ناخلف و نابنجار الفاظ دریافت فرمائے کہ جن کے ماں باپ یعنی مادّہ و ماخذ کا علم اُن عقلمندوں کو نہ ہو سکا۔ انہوں نے ان الفاظ کو "یتیم الفاظ" گردانا، مثلاً جیرغٹو، اللّلّو، اول جلول، الم غلّم، الّلے تلّلے، نٹ کھٹ، چھیچھا لیدار و چیتھڑ قناتیا۔ چیتھڑ قناتیا پر نظر پڑتے ہی دل باغ باغ ہو گیا۔ یتیموں کی صف میں چیتھڑ قناتیا ہی قدِ یتیم نکلا۔ کیونکہ اسے عاشق بے زر ہونے کا شرف حاصل ہے۔

اردو زبان و ادب نے ان یتیموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا، مشرّف بہ اردو کیا۔ ان کے آنسو پونچھے، یتیمی کی گرد ملال کو جھاڑا۔ لغت نگاروں نے انھیں معانی و مطالب کی دولت سے مالا مال کیا اور اس طرح وہ اردو الفاظ کے سماج میں اپنا درجہ و مرتبہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مگر یہ بات بھی کسی لطیفے سے کم نہیں کہ ایسے الفاظ کو بھی جن کی اصلیت کا پتا نہیں، یار لوگوں نے معنی کا لباس فاخرہ زیب تن کرا کر انھیں مزیّن کرا دیا۔ ظاہر ہے اہل زبان نے محلّ استعمال سے ان کو یعنی قیاسی معنی عطا کر دیے۔ یہ ثبوت ہے اردو کی رواداری اور اس کے بڑے دل گردے کا کہ چلو ایک چیتھڑ قناتیا بھی سہی۔

کیفی صاحب نے الفاظ کی خاصیت اور خصوصیت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ بعض الفاظ کو شعوری طور پر اہل زبان مترادفات کے لیے غیر زبان سے انتخاب کر کے اپنا لیتے ہیں۔ اس پر خراد کر کے اردو بنا لیتے ہیں۔ مگر بعض شرارتی الفاظ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بھیس بدل کر از خود BACK DOOR سے داخل ہو کر ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ چیتھڑ قناتیا ایسا ہی لفظ ہے۔ اسے ہم "گھس بیٹھیا" بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس نے ایک اور کمال یہ کیا کہ اپنے چہرے پر نقلی چہرہ فٹ کر لیا تاکہ پہچانا نہ جا سکے۔ "چیتھڑ" کا مکھوٹا لگا کر "قناتیا" چپکے سے اردو الفاظ کی صف میں براجمان ہو گیا۔ ——— اب پہچان لو اسے کوئی۔ آخر لغات نگار حضرات نے بھی اسے گھٹیا معنی ہی پہنائے یعنی کمینہ، خوشامدی، عاشق بے زر وغیرہ۔

اب اگر چیتھڑ قناتیا کے چہرے سے "چیتھڑ" کا چیتھڑا نوچ لیا جائے تو شاید اس کی اصل کا پتا چل جائے۔ چہرے پر جہاں اس نے چیتھڑ کا مکھوٹا چڑھا رکھا ہے وہاں بدن کے گرد قناتیں بھی تان رکھی ہیں۔ ایسی صورت سے کیفی صاحب

بھی عاجز آ گئے۔ وہ نہ تو اس کے چہرے کا مکھوٹا ہٹا سکے اور نہ قناتیں ہی گرا سکے۔ آخر اس چیڑ قناتیا نے ہمارے محققین کا خوب منہ چڑایا۔

ہم نے یونیورسٹی میں چیڑ قناتیا کا چکر چلایا۔ نوجوان محققوں سے دریافت کیا۔ سب لغت کے معنی بتا کر رہ گئے۔ ہم نے ان کی غیرت کو جھنجھوڑا یہ کہہ کر کہ جب تمھیں ایک لفظ کے بارے میں علم نہیں تو تحقیق کیا خاک کرو گے۔ ان کے سمند ناز پر جب ہماری بات کا تازیانہ پڑا تو چند من چلے محققوں نے بیڑا اٹھایا کہ ہم ضرور چیڑ قناتیا کے حسب نسب، حدود اربعہ، محل وقوع وغیرہ وغیرہ کا پتہ لگائیں گے۔ ہم محققین کے اس گروہ کو "چیڑ قناتیے محققین" کے نام سے پکارنے لگے۔ جب ہم نے انھیں یہ بتایا کہ علامہ کیفی نے چیڑ قناتیا سے ہار مان لی تو ان کے حوصلے پست ہو گئے اور آخر قلم دان تحقیق اٹھا کر الگ رکھ دیا۔ اور سب نے توبہ کی کہ اب ہم چیڑ قناتیے کے پھیر میں نہیں پڑیں گے۔ مگر ہم نے ہمت نہیں ہاری بلکہ ان کے اعتراف شکست سے ہمارے حوصلے بلند ہو گئے۔ اب ہم نے لائبریری کو خیر باد کہا اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کا رخ کیا۔ کیونکہ ان سیڑھیوں پر دلی کے بڑے بڑے لال بجھکڑ مل جاتے ہیں۔ بہرحال ہم نے انہیں میں چیڑ قناتیے کی تلاش جاری رکھی۔ تلاش دلچسپ تھی۔ ایک روز ہم حسب معمول چیڑ قناتیا کی جستجو میں سرگرم تھے۔ ایک کوچے میں گھسے تو ایک "چیڑ خندی" سے ملاقات ہو گئی۔ ہم نے سوچا کہ یہ ضرور کسی چیڑ قناتیے کی جورو ہو گی۔ کیونکہ ہم نے نہ صرف قیافہ شناسی سے کام لیا بلکہ چیڑ قناتیا اور چیڑ خندی کے سابقہ "چیڑ" پر بھی غور کیا۔ چیڑ کے اشتراک سے مزید تقویت ملی اور ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ چیڑ خندی کا کوئی نہ کوئی رشتہ چیڑ قناتیا سے ضرور ہو گا۔ اس لیے ہم نے اس کا پیچھا کیا۔ ہم تو تحقیق کی دھن میں تھے مگر وہ سمجھی کہ شکار پھنس گیا۔ اس نے اس اندھی گلی کے آخری مکان میں لے جا کر ہمیں بٹھایا مرغ سے تیا گ سے ہماری مزاج پرسی کی اور پھر مطلب براری کے لیے ہاؤ بھاؤ اور اشارے کنایے کرنے۔ ہم بڑے پریشان ہوئے اور سوچنے لگے کہ مارے گئے گلفام! آخر ہم نے آمدم برسر مطلب کہہ کر چیڑ قناتیا کا ذکر چھیڑ دیا تو اس نے ہمیں بھی خواجہ چیڑ قناتیا یعنی عاشق بے زر سمجھا۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ ہم اس کے مصرف کے نہیں۔ پھر بھی اس نے ہماری رہنمائی کی اور کہا کہ گلی کے نکڑ پر ایک ٹینٹ ہاؤس ہے۔ وہاں آپ کو کئی چیڑ قناتیے مل جائیں گے۔

ہم ٹینٹ ہاؤس پہنچے تو واقعی وہاں ہمیں ایک نہیں، دو نہیں، پورے تین چیڑ قناتیے ملے۔ ٹینٹ ہاؤس کا مالک بڑا صاحب ذوق تھا۔ اس نے غفورا، شکورا اور شیرا کو آواز دی مگر ان کے نام سے نہیں، پیش، زیر اور زبر کے نام سے۔ ہم ذرا چونکے تو وہ تینوں ایک ہی صف میں کھڑے تھے۔ تمبو گھر کے مالک نے ان سے تعارف کرایا۔ یہ غفورا "چیڑ قناتیا" ہے اس لیے پیش کے نام سے جانا جاتا ہے۔ چکنی چپڑی باتیں کرتا ہے یعنی مسکا لگانے میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ قنات لگانے کے فن میں تو یہ تینوں ہی ماہر ہیں۔ یہ شکورا "چیڑ قناتیا" ہے یعنی بڑا باتونی چیڑ چیڑ کرکے چرب زبانی میں اس کا جواب نہیں۔ اس لیے میں اسے حرف "زیر" کے نام سے پکارتا ہوں۔ یہ ان کی EXTRA QUALIFICATIONS ہیں پیش کمال کا مسکتی ہے تو زیر بلبل ہزار داستان۔ اور یہ شیرا خالص چیڑ قناتیا ہے۔ اس لیے میں اسے "زبر" کہتا ہوں۔ یہ اصل میں تمبو گھر کا محافظ ہے۔ اس کا ہٹا کٹا بدن اور جلادی مونچھیں ہی اس کی QUALIFICATION ہے۔ یہ پر لطف معلومات حاصل کرکے ہم لوٹے تو ایک نہ شد دو شد بلکہ سہ شد اور پیش، زیر اور زبر نے سہ رخی چیڑ قناتیا ہمارے

سامنے کھڑا کر دیا۔ چیڑ قناتیا اور چمچے میں ایک قدر مشترک ہے خوشامد اور چاپلوسی۔ چمچہ ظرف ہوتے ہوئے بھی بڑا کم ظرف ہے۔ مگر چیڑ قناتیا کمینہ ہو کر بھی چمچے سے بہتر ہے۔ کیونکہ چمچہ کمینہ ہی نہیں رذیل بھی ہے۔ چمچا اپنے ہی طور طریق سے اپنا الو تو سیدھا کر ہی لیتا ہے، مگر چیڑ قناتیا کبھی کبھی اپنے عاشقانہ مزاج کے باعث اپنا بنا بنایا کام بھی بگاڑ لیتا ہے۔ بہرحال چمچہ نرا مسخرہ ہے اور چیڑ قناتیا سنجیدہ اور باوقار۔

زندگی کے ہر شعبے میں چیڑ قناتیے تھوک میں مل جاتے ہیں۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ مگر ان کی بھی تین بڑی قسمیں ہیں۔ پہلی قسم ہے "بازاری" چیڑ قناتیوں کی۔ ان کی چال ڈھال، بول چال، نشست و برخاست پر بازار کی مہر لگی ہوتی ہے۔ ان کی عامیانہ بازاری بھاشا کمینہ پن، شہدپن اور گالی گفتار سے بھری ہوتی ہے۔ مگر خوشامد اور چاپلوسی کے باعث زبان میں بڑی روانی اور مٹھاس ہوتی ہے۔ وہ چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے سارے گُر جانتے ہیں۔ کالے دھندے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ اس لیے دلالی میں ایکسپرٹ ہوتے ہیں۔ "خرفشاد میں ہی آمد ہے" ان کا موٹو ہے۔ محکمہ انکم ٹیکس کے افسران بالا سے ربط ضبط رکھتے ہیں۔ ان کا نعرہ ہے "کھاؤ اور کھانے دو"۔

دوسری قسم کے چیڑ قناتیوں کو ہم "درباری چیڑ قناتیا" کہہ سکتے ہیں۔ یہ بڑے چکنے چپڑے POLISHED مہذب CULTURED اور رکھ رکھاؤ کے ہوتے ہیں۔ کیونکہ برسر اقتدار پارٹی کے مانے نیہ بردار ہوتے ہیں۔ ان میں جو ذرا تیز ہوتے ہیں۔ وہ مجلس شورا کے معزز ممبر بن جاتے ہیں اور مشیران خاص کی صف میں اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی اپنے غلط مشوروں سے الیکشن بھی ہروا دیتے ہیں۔ یہ چوبیس گھنٹے کالے [illegible]ن کی نکشی کی پیچایکں لگے رہتے ہیں۔ سرکار اور سرمایہ داروں کے درمیان کی ایک اہم کڑی ہوتے ہیں۔ الیکشن کے لیے یہ کالا دھن جمع کرتے ہیں۔ کالی سیاست کے یہ سنگ موسیٰ کے اہم ستون ہیں۔ ایوان سیاست میں ان کا طوطی بولتا ہے۔ ان میں سے کچھ KING MAKER بھی بن جاتے ہیں۔

اور تیسری قسم ہے "خانقاہی" چیڑ قناتیوں کی۔ ظاہر ہے آج وہ خانقاہیں تو نہیں ہیں جن کی تقدیس و طہارت ضرب المثل ہوتی تھی۔ اور جہاں شاہ وقت بھی ادب سے آکر بیٹھتا تھا۔ مگر آج کی خانقاہیں ارباب اقتدار سے وابستہ رہتی ہیں اور ان کی ہر گھٹیا سیاست میں ممد و معاون۔ انہیں سے ان کا حلوا مانڈا چلتا ہے۔ ریاکاری کو یہاں فروغ ملتا ہے۔ یہاں اسمگلنگ کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ خانقاہوں میں بہترین اسمگلر ملتے ہیں۔ لباس فقر زیب تن کر کے تسبیح و کلاہ سے مزین ہو کر بظاہر صوفی صافی بہ باطن فاسق و فاسخ، ظاہر و باطن ہیں۔ یہاں پہلے یکرنگی ہوتی تھی اب بعد المشرقین۔ بہرحال خانقاہ کے چیڑ قناتیے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ آدمی کو نہ دین کا چھوڑتے نہ دنیا کا۔ مذہب و اخلاق پر بڑے بڑے وعظ ہوتے ہیں مگر الفاظ بالکل کھوکھلے اور بے اثر۔ کیونکہ ارباب سیاست کی طرح اصحاب ریاضت بھی ننگے ہو گئے ہیں۔ یہاں رام رام جپنا پرایا مال اپنا کا ورد چلتا رہتا ہے!

قلمی معاونین سے التماس:

تخلیقات صاف، خوش خط، صفحے کے ایک جانب ارسال فرمائیے۔

سرپٹ حیدرآبادی

۵

بگڑے نہ شعرگوئی کا معیار کم سے کم
ٹھنڈی پڑے نہ گرمیٔ بازار کم سے کم
خاموش رہیے کیجیے نہ انکار کم سے کم
بن جائے بات ہماری بھی اک بار کم سے کم

احسان ہوگا ہم پہ سمجھداروں کا بہت
سمجھے نہ کوئی ہم کو سمجھدار کم سے کم
چھینو نہ ہم سے تم شرفا اپنے پیڑوں کا
رہنے دو زیرِ سایۂ دیوار کم سے کم
دوبارہ پھر نہ دوں گا میں تکلیفِ التفات
پورا ہو مدعا میرا اک بار کم سے کم
غیروں سے کیا غرض ہیں جو غیر ہمارے کون
سمجھیں وہ ہم کو اپنا پرستار کم سے کم
قربان جاؤں تمھارے میں حسن ملیح پر
مجھ کو بنا لو اپنا نمک خوار کم سے کم
کوئی تو یادگار رہے بزمِ نشاط کی
کانوں میں گھنگروؤں کی ہو جھنکار کم سے کم
ہٹ دھرمیوں میں اپنی رہے کامیاب وہ
ان کے بہت ہیں میرے طرفدار کم سے کم
ہو اختصار پیشِ نظر بزمِ شعر میں
اشعار کی غزل میں ہو بھرمار کم سے کم
چھوڑا نہ اپنے ہاتھ سے دامانِ یار کو
سرپٹ ہے ہوش کھو کے بھی ہشیار کم سے کم

ہر فن لکھنوی

(کراچی)

۵

کار، ٹی وی خالصتاً یہ سائنس کی ایجاد ہے
اور ٹیلی فون موصوفہ کا خالہ زاد ہے
بے چارے عاشق کے سر کا تاج ٹیلی فون ہے
آلۂ اظہارِ الفت آج ٹیلی فون ہے
فون پر اپنے چچا سے کیجیے دن بھر کلام
پوچھیے انڈوں کی قیمت، مرغ اور مچھلی کے دام
فون پر لکھوائیے استاد سے تازہ غزل
اور باہر آ کے کہیے میں ہوں شاعر بے بدل
فون پر جھگڑے سے کوئی خطرۂ جاں بھی نہیں
بات بڑھ جائے تو پٹ جانے کا امکاں بھی نہیں
فون پر خامی ذرا سی بھائی خالد سے ہوئی
گفتگو ان کے بجائے ان کے والد سے ہوئی
میرے سر پر کچھ بلائیں بن کے انساں آ گئیں
فون لیلیٰ کو کیا لیلیٰ کی اماں آ گئیں
شادیاں دولہا دلہن کی فون پر ہونے لگیں
منگنی اور مانجھے کی رسمیں لیے اٹھ رونے لگیں
فون سے معیار کتنا گر گیا انسان کا
عقد کی محفل میں سناٹا ہے قبرستان کا
اک منٹ میں طے سفر سو میل کا ہونے لگا
جو نہ ہوتا تھا رسیور پر ادا ہونے لگا
فون صاحب شکریہ تم کو ہزاروں کا سلام
ہر فنِ مفلس کا اور شادی کے ماروں کا سلام

ابراہیم یوسف (بھوپال)

بہروپیے

کچھ دن سے ہم عزیزِ محترم کے رویے میں عجیب سی تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ پہلے وہ سلام کرنے میں ہمیشہ پہل کرتے تھے لیکن اب یہ حالت ہوگئی تھی کہ سلام میں پہل کرنا تو کجا ہم انھیں سلام کرتے تو گردن میں اکڑ پیدا کرکے صرف اکڑی ہوئی گردن کو ہلا کر رہ جاتے۔ پہلے جب بھی ہمیں مخاطب کرتے تو ہمارے نام کے ساتھ صاحب ضرور لگاتے مگر اب کھرے نام سے مخاطب کرتے۔ پہلے بے تکان بولنے کا مرض تھا اب بہت کم بولتے اور جواب ہوں ہاں سے دیتے۔ چہرہ جو پہلے شگفتگی سے گلنار رہا کرتا تھا اب مصنوعی رعونت کا آماجگاہ بن گیا تھا اور چال میں رعونت کے تمام جراثیم پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بچوں کو سخت تاکید کر دی گئی تھی کہ اب انھیں ابا جان نہ کہا جائے بلکہ پاپا کہا جائے اور ماں کو اماں کہنے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور اماں کی جگہ ممی کا استعمال لازمی قرار دیا گیا تھا۔ بیوی کو سخت ہدایت کر دی گئی تھی کہ انھیں اے جی، او جی جیسے فرسودہ اور نچلے طبقے کے لوگوں کی طرح مخاطب نہ کیا جائے بلکہ نام لیا جائے کمرے میں دو چار الماریوں کا بھی اضافہ ہو گیا تھا جن میں انگریزی کی موٹی موٹی کتابیں بھی ہوئی تھیں حالاں کہ عزیزِ محترم انگریزی زبان سے ناواقف تھے۔ پہلے جب ہم ان سے ملاقات کرنے ان کے گھر پر حاضری دیتے تو فوراً تشریف لے آتے خلوص سے مصافحہ بلکہ معانقہ بھی کرتے اور ہمارے لاکھ انکار کرنے پر بھی خاطر و مدارات کرتے لیکن اب جب کبھی ہم ان سے ملاقات کرنے جاتے تو آدھ آدھ گھنٹے باہر تشریف نہ لاتے اور ہم کسی نوکری کے خواستگار کی طرح دیواروں پر آویزاں ان تصاویر کو جنھوں نے خاندان کے بزرگوں کی تصاویر کی جگہ لے لی تھی اور جو کسی شریر بچے کی شرارت کا نادر نمونہ معلوم ہوتی تھیں تکا کرتے۔ جب گھر سے برآمد ہوتے تو چہرے پر ایسے تاثرات ہوتے جیسے ہم ان کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مجرم ہوں اور اگر ہم ان کے استقبال کے لیے کھڑے نہ ہوتے تو ہمیں ایسی خشمگیں نظروں سے گھورتے جیسے ہم ان کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہوں اور پھر صوفے پر یوں آکر بیٹھ جاتے جیسے ہماری فریاد سننے کے منتظر ہوں۔

اس تبدیلی کی کیا وجہ تھی ہم سمجھنے سے قاصر تھے یہ تو ہمارے علم میں تھا کہ عزیزِ محترم کے دماغ میں نئے نئے کیڑے پیدا ہو کر کلبلاتے رہتے ہیں مگر یہ کون سا کیڑا ہے جو آج کل کلبلا رہا تھا اس سے بالکل لاعلم تھے۔ جب ہم نے ان کی بیگم صاحبہ سے معلومات حاصل کیں تو انھوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا اور شکایت آمیز لہجے میں کہنے لگیں کہ سارے گھر کا ناک میں دم کر رکھا ہے ہر روز ایک نیا حکم صادر ہوتا ہے کہ اب یوں نہیں یوں کیا جائے۔ مجھے حکم صادر ہوا ہے کہ میں ان کا نام لیا کروں۔ بھلا میں ان کا نام لے سکتی ہوں بس دن رات بگڑتے رہتے ہیں کہ میں ان کا نام کیوں

لیتی - پھر ہمیں اپنی نانی کا ایک دل چسپ واقعہ سنایا فرمانے لگیں کہ میری نانی بے حد متقی اور پرہیزگار تھیں، روزہ نماز کی پابند اور اپنے شوہر کی جن کا نام رحمت اللہ تھا بڑی فرماں بردار تھیں۔ انھیں مجازی خدا سمجھتی اور ان کی اس قدر عزت واحترام کرتی تھیں کہ ان کا نام لینا گناہِ کبیرہ سمجھتی تھیں یہاں تک کہ جب نماز میں سلام پھیرتی تھیں تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کے بجائے السلام علیکم شلین کے ابا کہا کرتی تھیں۔ جس کی نانی ایسی ہو بھلا اس کی نواسی شوہر کا نام کیسے لے سکتی ہے۔ بہرحال محترمہ سے بھی اس تبدیلی کا سراغ نہیں ملا اور عزیز محترم میں یہ تبدیلی معمہ ہی بنی رہی۔

ہم نے خیال کیا کہ شاید عزیز محترم پر ماڈرن بننے کا بھوت سوار ہو گیا ہے لیکن ہمارے اس خیال کی تردید ان کے بعض ایسے افعال سے ہوئی جنھیں پہلے وہ فرسودہ اور قدامت پسندانہ کہا کرتے تھے اور جیسے سے بھی ان کے پاس نہ پھٹکتے تھے اب اکثر خود کو انھیں مشاغل میں مصروف ظاہر کرتے مثلاً ایک مرتبہ انھوں نے ہم سے کہا تھا کہ بچپن میں وہ پابندی سے نماز پڑھتے تھے مگر سنِ شعور پر پہنچنے کے بعد انھوں نے کبھی نماز نہیں پڑھی مگر اب نماز کی وجہ سے اپنی عدیم الفرصتی کا رونا روتے۔ یہ دوسری بات تھی کہ انھوں نے اکثر ایسے وقت میں بھی خود کو نماز میں مشغول بتلایا جو وقت نماز کے لیے مکروہ ہے جب کبھی ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو خود کو مطالعہ میں مصروف ظاہر فرماتے حالاں کہ ہمیں معلوم تھا کہ مطالعہ کے نام پر انھوں نے کبھی جاسوسی ناول بھی نہیں پڑھا تھا۔ اخباروں سے انھیں اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ہر ملک میں بین الاقوامی سطح پر تباہی اور بربادی پھیلانے کی ساری ذمہ داری اخباروں کی ہے اخباروں میں کام کرنے والے اول نمبر کے ضمیر فروش اور روسیاہ لوگ ہوتے ہیں۔ واقعات کو یوں توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں جس سے مختلف طبقات اور ممالک کے درمیان منافرت کا جذبہ پیدا ہو ان کے دماغ عقل و خرد سے خالی ہوتے ہیں بس اخبار کا مالک پیسے کے زور سے انھیں جس طرف ہانکتا ہے وہ اسی طرف چلتے رہتے ہیں قوم اور ملک کی ترقی خوش حالی اور امن و امان کی انھیں ذرہ بھر پرواہ نہیں ہوتی اور اخبار کا مالک کوئی جاہل شخص ہوتا ہے جو جلبِ منفعت کے لیے ان لوگوں اور طبقوں کی حمایت کرتا ہے جن سے اسے زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ ہونے کی امید ہو ایمان داری اور انصاف سے اس کو اللہ واسطے کا بیر ہوتا ہے وہ کہا کرتے تھے کہ کسی بھی نارمل آدمی کو ہمارے قومی اخبار پڑھنے کو دے دو چند دن میں وہ اخبار بند ہو جائے گا۔ ان خیالات کے باوجود اب گھر میں متعدد اخبار آنے لگے تھے وہ انھیں پڑھتے تھے یا نہیں اس کا تو ہمیں علم نہیں مگر اخباروں کو ردی میں بیچ کر بچوں کو چاکلیٹ کھاتے ہم نے ضرور دیکھا تھا۔

ایک بات اور ہم نے محسوس کی کہ وہ اگر کسی مسئلہ پر آج کوئی رائے دیتے تو کل کچھ اور بات کہتے اور تیسرے دن بالکل ہی نئی بات کہتے حالاں کہ اس سے قبل اگر وہ کسی مسئلہ پر کوئی رائے قائم کر لیتے تو اس پر سختی سے اڑے رہتے تھے۔ آپ اس کے خلاف لاکھ دلائل پیش کریں مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ گھر میں ایک بچے سے کوئی ایک بات کہتے تو دوسرے سے دوسری اور ایسے حالات پیدا کر دیتے کہ دونوں میں نہ صرف جھگڑا ہو جائے بلکہ مار پیٹ کی نوبت آجائے اور جب معاملہ ان کی عدالت میں پیش ہوتا تو وہ فیصلہ کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتے اور اگر فیصلہ کرتے تو اس میں کوئی ایسا پہلو رکھتے کہ تھوڑی دیر کے سکون کے بعد مسئلہ اور شدت سے کسی دوسرے پہلو سے ابھر کر گھر

کے امن وسکون کو برباد کر دیتا انھیں گھر کے امن وسکون سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ ہاں پاس پڑوس۔ کے ہر مسئلہ میں ٹانگ اڑا کر ثالث کا کردار ادا کرنے کے لیے ہر وقت تیار اور اپنے پڑوسیوں کے درمیان مسائل پیدا کرنے کے ذمہ دار بھی اکثر عزیز محترم ہی ہوتے تھے۔ صبح صبح گھر سے نکل پڑتے کبھی اس پڑوسی کے یہاں بیٹھے ہیں تو کبھی اس کے یہاں وہاں سے اٹھ کر تیسرے کے یہاں جا بیٹھتے وہ اسے خیر سگالی مشن کہتے تھے اور گھر میں بچوں میں برابر مار کٹائی ... جب معاملہ کچھ زیادہ ہی نازک صورت اختیار کر لیتا تو اسے اپنی چہیتی بیٹی کے سپرد کر دیتے اور وہ جی کو ... کے مقابلہ میں کمزور کی دھنائی کر دیتی اور جب ان سے شکایت کی جاتی تو فرما دیتے یہ انتظامی معاملہ ہے ہم میں دخل دینا نہیں چاہتے بہرحال گھر کی حالت تباہ کر رکھی تھی اُن کی ساری توجہ گھر کے باہر مرکوز ہو گئی تھی۔

اور آخر کار ایک روز اس کیڑے کا پتہ چل گیا جو ان کے دماغ میں کلبلا رہا تھا اور اس کا انکشاف بھی خود عزیز محترم ہی نے کیا ایک روز جب ہم صبح صبح ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ اپنے پارک میں چہل قدمی فرما رہے تھے یہ پارک بھی چند دن میں عالم وجود میں آیا تھا اور اپنی نوعیت کا واحد پارک تھا گملے سے دس پندرہ گملے وہ یہاں رکھے ہوئے تھے اور ان کے درمیان "مشکل سے ڈیڑھ فٹ چوڑی جگہ تھی جو بقول عزیز محترم اس پارک کی روش تھی۔ عزیز محترم نے بعد میں ہمیں تبلایا کہ اس پارک کے لیے انھوں نے پنج سالہ منصوبہ بنایا ہے پانچ سال کے بعد نہ صرف وہ بلکہ پاس پڑوس والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ خیر اس وقت اکڑی ہوئی گردن ہلا کر ہمارے سلام کا تو جواب دیا لیکن اپنے اس عالیشان پارک میں کچھ اس طرح چہل قدمی میں مشغول رہے جیسے ہماری موجودگی قطعی غیر اہم ہو۔ اور ہم یوں کھڑے رہے جیسے اپنے قتل کا حکم نامہ وصول کرنا ہو کچھ دیر بعد ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "میرا منصوبہ کامیابی سے آگے بڑھ رہا ہے"

ہم نے حیرت سے ان کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا "کون سا منصوبہ؟ آپ نے پہلے تو ہمیں اپنے منصوبہ کے بارے میں نہیں تبلایا"

"تم انتہائی نا معقول بلکہ واہیات انسان ہو اگر تمہیں پہلے سے علم ہو جاتا تو نہ صرف ہمارا مذاق اڑاتے بلکہ ہمارے منصوبہ پر پانی پھیر کر ہماری زندگی اجیرن کر دیتے۔ صرف مصلحت کی خاطر تمہیں لاعلم رکھا گیا"

مصلحت پسندی کا نام سن کر ہمارے کان کھڑے ہوئے کہ ضرور عزیز محترم کے دماغ میں ایڈمنسٹریٹر بننے کا کیڑا کلبلا رہا ہے۔ بہرحال ہم نے عرض کیا "اگر ایسا ویسا کوئی منصوبہ ہے تو ہم ضرور اپنے واہیات ہونے کا ثبوت دینگے"

"خیر خیر۔ آؤ اندر بیٹھ کر گفتگو کریں گے آفتاب کی تمازت بڑھتی جا رہی ہے"

"کیا اتنی قدر نازک مزاجی بھی منصوبہ کا کوئی پہلو ہے" ہم نے سوال کیا کیونکہ آفتاب کی تمازت کا اس وقت نام ونشان تک نہ تھا۔ عزیز محترم ہمارے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے تنے تلے رعونت سے بھرپور قدم اٹھاتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف روانہ ہو گئے ہم بھی ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ عزیز محترم اپنے مخصوص صوفے پر ایک خاص زاویہ سے گردن اکڑا کر بیٹھ گئے ہم نے سامنے والے صوفے پر بیٹھ کر ان کے انداز نشست کو بغور دیکھا تو ایک مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "شاید تمہیں ہمارا اس طرح بیٹھنا پسند نہیں آیا"

"بالکل پسند نہیں آیا" ہم نے کہا "یہ انداز فرعونیت ہیں بالکل پسند نہیں۔"
"اور ہم نے کئی راتیں آئینہ سامنے رکھ کر اس طرح بیٹھنے کی پریکٹس کرنے میں گزاری ہیں۔"
"لاحول ولاقوۃ" ہم نے بے ساختگی سے کہا "یہ راتیں کسی مفید اور نیک کام میں نہیں گزاری جاسکتی تھیں"
"کیا تم سمجھتے ہو کہ ہم نے غیر مفید کام کیا ہے۔"
"ہمیں تو اس میں کوئی افادیت نظر نہیں آتی۔"
"ہے عزیز من ہے۔" پھر ہمیں غور سے دیکھتے ہوئے فرمایا "کیا تم نہیں چاہتے کہ ہم ۲۱ ویں صدی کے آدمی بن جائیں۔"
"یا مظہر العجائب۔" ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ عزیز محترم ہماری بوکھلاہٹ پر مسکرانے لگے۔" تو یہ فرعونی نشست، رعونت بھری چال، ایان جان سے پاپا ہوجانا، امی کو ممی بنا دینا، ایک نیک بخت کو اس کی تہذیب کے خلاف اپنا نام لینے پر مجبور کرنا، مکروہ اوقات میں نماز پڑھنا ۲۱ ویں صدی کا آدمی بننے کا منصوبہ ہے۔"
"بالکل ہے۔" عزیزم نے وثوق کے ساتھ کہا پھر کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا "تم یوں نہیں سمجھو گے۔ اچھا ہم سمجھاتے ہیں۔ تم رام دین کو جانتے ہو؟"
"کون رام دین؟"
"۔ اپنے پڑوس میں رہتا تھا۔ عدالت ضلعی میں چپراسیوں کا جمعدار تھا۔"
"ہوگا کوئی۔ ہم نہیں جانتے۔"
"بیچارا سیدھا سادھا آدمی تھا اس کا ایک لڑکا پہلے ڈرائیور تھا پھر ایک سیاسی پارٹی کا معمولی رکن ہو گیا جلسے جلوسوں میں فرش وغیرہ بچھایا کرتا تھا کچھ عرصہ شہر سے غائب رہا پھر ایک دن معلوم ہوا کہ وزیر ہو گیا ہے۔"
ہم نے جل بھن کر کہا "بس تو آپ بھی فرش بچھاتے پھرئیے ایک دن ضرور وزیر بن جائیں گے۔"
"لاحول ولاقوۃ۔ پہلے پوری بات سنو۔ خیر۔ ہم نے سوچا محلہ کا لونڈا ہے چل کر مبارکباد دینا چاہیے۔ بخدا وہاں پہنچ کر ہمیں سخت توہین کا احساس ہوا۔ پہلے تو ہم سے سیکڑوں سوالات کیے گئے کہ ہم کہاں ہیں کیوں آئے ہیں منسٹر صاحب سے کیا کام ہے ہم منسٹر صاحب کو جانتے ہیں تو کیوں کر جانتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال بہزار خرابی بسیار ہمارے کپڑوں اور جسم کا اس طرح جائزہ لیا گیا جیسے ہم کوئی مجرم ہوں پھر ہمیں ایک کمرہ میں بٹھلا دیا گیا اور کہا گیا کہ منسٹر صاحب بے حد معروف آدمی ہیں آپ زیادہ لمبی چوڑی مبارکباد نہ دیجیے گا۔ ہم جل بھن کر کباب ہو گئے۔ مگر اب کیا کرتے آن پھنسے تھے۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد ہمیں باز یابی کا موقع ملا اس لونڈے نے ایسا ظاہر کیا جیسے ہمیں پہچانتا ہی نہ ہو ہماری مبارکباد کو اکڑی ہوئی گردن سے قبول کیا بخدا انسانیت کی اس بے حرمتی پر ہم خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے بس اسی وقت عہد کر لیا کہ ہم ۲۱ ویں صدی کا آدمی بن کر اس بڑے آدمی سے ملاقات کیا کریں گے۔" عزیز محترم کی یہ داستان سن کر ہمارے دل میں ان کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے کہ ایک مخلص انسان کو اپنے خلوص کا جنازہ اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانا پڑا۔ پھر فرمانے لگے "تم ہمارے انداز نشست اور چال کو فرعونیت قرار دیتے ہو۔ فرعون کو تو ہم نے نہیں دیکھا لیکن آج کل

کے ذہنوں کو ضرور دیکھتے رہتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ آج کل زندہ رہنے کے لیے اسی راستہ پر چلنا چاہیے " ہم
سوچنے لگے کہ عزیز محترم ہمیشہ "صلح کل" مرنجاں مرنج نیک دل اور مخلص انسان تھے اب ان کی شخصیت میں کیسا زہر
بھر گیا ہے قبل اس کے کہ ہم کچھ بولتے انھوں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا " بس ہمارا اقدام دیکھئے لڑکے کا ایک مرکب
تیار کریں انشاء اللہ ۲۱ ویں صدی کا انسان ایسا ہی زہریلا اور انسانیت دشمن ہوگا" اس کے بعد انھوں نے کیا کہا ہم نہ
سن سکے کیونکہ ہم سوچنے لگے تھے کہ کیا واقعی عزیز محترم کا یہ تجزیہ صحیح ہے اور کیا ۲۱ ویں صدی کا انسان اس قدر
انسانیت سے دور بد اخلاق بہروپیا ہوگا ۔

غلام مسکین ادیب سندیلوی

کوئی کسان کھیت میں بوتے جوار کیوں
دن بھر مچائے بیٹھ کے کوّا گہار کیوں

ہارے ہوئے کو ہار پہناتا نہیں کوئی
جیتے ہوئے کو لوگ پہناتے ہیں ہار کیوں

جب مٹ چکا ہے ادنیٰ و اعلیٰ کا امتیاز
احساس کمتری کا ہو کوئی شکار کیوں

پیسا ہے میل ہاتھ کا کہتے ہیں سب مگر
پیسے سے لوگ کرتے ہیں پھر اتنا پیار کیوں

بدھو میاں سے حضرت عاقل ہیں پوچھتے
پھیلا رہے ہیں لوگ یہاں انتشار کیوں

پینا منع ہے مے کا نہ ہے بیچنا منع
تائب ہو میکشی سے کوئی بادہ خوار کیوں

ناصح کو اس سوال کا دے کیا کوئی جواب
بس پر میاں کے آج ہے بیوی سوار کیوں

تیر و کماں پکڑنے کا جن کو نہیں شعور
پیشہ سپہ گری کا کریں اختیار کیوں

تم کو سمجھ کے مفلس و نادار اے ادیب
کوئی دوکان دار دے سودا ادھار کیوں

لڑکے

صابر بہاری

اپنی غیرت پھٹک گئے لڑکے
آج کتنے بھٹک گئے لڑکے

ان کو بننا تھا پھول گلشن کا
خار بن کے کھٹک گئے لڑکے

لڑکیاں پاس کر گئیں ام۔اے
میٹرک میں اٹک گئے لڑکے

امتحاں گاہ کا یہ نقشہ تھا
لے کے پرچے سٹک گئے لڑکے

ملک میں خاک انقلاب آئے
سر پہ فیشن اٹک گئے لڑکے

[illegible] جانے کو
گھر سے نکلے لٹک گئے لڑکے

[illegible] صورت
لے کے جیبوں میں ٹھمک گئے لڑکے

نکلا اسکول اور کالج سے
بس کے پیچھے لٹک گئے لڑکے

[illegible] ادھار لائے تھے
اس نے ڈانٹا سٹک گئے لڑکے

[illegible] ابتری ہے فرقت کے اور
ہائے کتنے بھٹک گئے لڑکے

سوئے کالج چلے تھے بن ٹھن کے
راہ میں ہی اٹک گئے لڑکے

جادو فیشن کا چل گیا ایسا
بن کے ہپّی مٹک گئے لڑکے

جب سے ٹکڑے جگر کے کہلائے
اچھے اچھے بھٹک گئے لڑکے

ضیا حسنی

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

شہر شہر قریہ قریہ یہ جو تین پہیوں کی موٹریں اچھلتی کودتی، بل کھاتی، لہراتی اور شوخیاں دکھاتی ہیں انھیں کے دم سے سڑکیں آباد نظر آتی ہیں۔ سست رفتاری ہو یا تیز خرامی یہ دونوں صورتوں میں پرکشش دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی یہ دھیرے دھیرے، بھولے بھولے چل کر گرفتارانِ محبت کی آتشِ شوق کو بھڑکاتی ہیں لوگ دیوانہ وار ان کا پیچھا کرتے ہیں اور دوڑتے دوڑتے ان کے دامن کو پکڑ لیتے ہیں اور پھر ان سے ہم آغوش ہو جاتے ہیں۔ کبھی یہ برق وشعاع بن کر بسوں، منی بسوں اور موٹر کاروں کو زیر کر کے اس طرح آگے بڑھ جاتی ہیں کہ وہ ان کی گرد کو بھی نہیں پاتیں۔ انھیں مقامی زبان میں "ٹمپو" کہا جاتا ہے۔ ہم اس کی وجہِ تسمیہ ضرور بتاتے لیکن اس خیال سے کہ موضوع کا سرا ہاتھ سے چھوٹ نہ جائے سر دست آگے بڑھے جاتے ہیں۔

ٹمپو کے سلسلے میں آپ جو بھی رائے رکھتے ہوں لیکن حقیر رائے تو یہ ہے کہ کم خرچ بالانشین تو صرف ٹمپو میں ہی مل سکتی ہے۔ خرچ کی بات چلی ہے تو سن لیجیے یہ آپ کے جیب پر ایسا بوجھ ڈالے گی کہ جس سے آپ کی جیبِ نازک پر ذرا سی گرانی محسوس نہ ہوگی بالکل اس طرح جیسے کوئی مریض انجکشن لگوانے کے بعد سبکسار ہو جاتا ہے۔ آپ ٹھاٹ سے موٹر نشین بنے ہوئے گرد و پیش کے خوش گوار مناظر پر نظر ڈالتے ہوئے ہوا کے دوش پر اڑ کر منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔

بات سے بات نکلتی ہے اس سلسلے میں ہم دوسری تیز رفتار گاڑیوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہتے۔ شہروں میں بسیں، منی بسیں، ٹیکسیاں اور کہیں کہیں آٹو رکشے بھی رواں دواں دکھائی دیتے ہیں۔ سائیکل رکشے بھی معذرت کرتے ہیں۔ [illegible] یہ اپنی جگہ صرف اس لیے رکھا [illegible] دیتے ہیں کہ لوگ [illegible] کے اس پُر آسائش لیکن بے خطر ذریعۂ آمد و رفت کو یکسر فراموش نہ کر دیں۔ سائیکل رکشہ والے جگہ جگہ بڑی تعداد میں [illegible] زیادہ مستعد دکھائی دیتے ہیں کبھی وہ آواز لگا کر متوجہ کرتے ہیں اور کبھی اشاروں کنایوں سے رجھاتے ہیں۔ یہ رکشے والے پاس پڑوس میں مصلحتاً جانا پسند نہیں کرتے۔ انھیں کئی کیلو میٹر دور جانے ہی میں معاشی بہتری دکھائی دیتی ہے۔ رکشے والے ہی پر منحصر نہیں آج ہر شخص دن کے دن موٹی رقم سمیٹنے کے چکر میں رہتا ہے۔ اب تو یہ رکشے والے شروع کی گنتی بھول گئے ہیں اور چار پانچ روپے سے پہل کرتے ہیں اور آپ کی مجبوری یہ ہے کہ دو روپے سے زیادہ آپ کی جیب سے نکل نہیں پاتے اس لیے رکشے والوں سے نہیں بنتی ویسے یہ رکشے والے [illegible] گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہیں اور ہر شخص [illegible] کے میل ملاپ سے ایسی بات آ ہی جاتی ہے یہ نت نئی ترکیب سے مسافر سے روپے اینٹھ لینا خوب جانتے ہیں اگر آپ خدانخواستہ کسی ٹھگ رکشا والے کے ہتھے چڑھ گئے تو دو کی جائے

بن جاتی ہے تو اسے تو آپ محسوس کرتے ہوں گے۔ ٹیمپو جو تین پہیوں کے سہارے دوڑنے لگی تو انسان کو یہ خوش گوار تبدیلی کافی پسند آئی اور اس نے اس کا جگہ جگہ خیر مقدم کیا۔

ٹیمپو کے ذریعے انسانی فلاح و بہبود کے کام ہو رہے ہیں۔ اس نے ہمارے ملک کے لکھے پڑھے بیکاروں کو کھپانے میں کافی تعاون دیا ہے۔ کتنے مالک، ڈرائیور اور کنڈکٹر ٹیمپو کے دھندے میں لگ کر اپنی زندگی کو سنوار چکے ہیں۔ چھوٹے کم فہم زیادہ سے زیادہ روپے حاصل کرنے کے فن کو جانتے ہی نہیں لہٰذا وہ مجبوراً روکھی پھیکی زندگی گزار رہے اور بعضے تیز و طرار لوگ نہ صرف اپنا بھلا کر رہے ہیں بلکہ انھوں نے کتنے سرکاری عمال کے وہاں بھی گھی کے چراغ جلا دیے ہیں کیا کیا جائے بعضے چمک دمک والی زندگی ہی کو پسند کرتے ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ ٹیمپو باراتوں کو نبٹانے، میلوں ٹھیلوں، نوٹنکیوں اور دنگلوں کی رونق بڑھانے، دولہا کو جٹانے، مُردوں اور بیماروں کو مرگھٹ، قبرستان اور ہسپتال پہنچانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتی۔ اگر کوئی ستم رسیدہ ویرانے میں پھنسا ہو یا سرِ راہ کوئی حادثہ کا شکار ہو گیا ہو تو ٹیمپو ہی ان کے آڑے وقتوں میں کام آتی ہے اور سہارا انھیں ڈھارس دیتی ہے اور بڑھ کر آنسو پونچھتی ہے۔

جہاں تک ہمارا معاملہ ہے برسوں سے ہماری اس سے گاڑھی چھن رہی ہے نہ جانے کب سے ہم شہر سے دور ایک کالونی میں آباد ہیں۔ نئی زندگی اور بڑھتی ہوئی آبادی نے کالونیوں سے ہمارا تعارف کرایا ہے۔ شہروں میں دور دراز بسی ہوئی ان کالونیوں کا وجود غنیمت ہے غرض ٹیمپو ہی کی وجہ سے شہر سے ہمارے خوش گوار تعلقات چل رہے ہیں ہم روزانہ اسی سے دفتر آتے اور گھر واپس جاتے ہیں ملک میں جب کوئی تبدیلی رونما ہوئی تو اس کی بازگشت ہم نے اسی ٹیمپو میں سنی۔ شہر کی دل چسپیاں اور گہما گہمی کی باتیں یہیں گوش گزار ہوتی رہی ہیں۔ مشاعرے، سیمینار اور کرکٹ کے تذکرے، کسی پارٹی کے پھر سے اقتدار میں آنے کا معاملہ، کسی محبوب سربراہ کا المناک واقعۂ قتل، سر ابھارتی ہوئی فرقہ پرستی، عبادت گاہوں میں شر پسندوں کا جمگھٹ سبھی باتیں ہم نے ٹیمپو پر سنیں۔ مظلوم لڑکیوں کی سسکیاں اور ان کے غم زدہ باپوں کی آہوں کی گرمی یہیں محسوس ہوئی۔ ٹی۔ وی کے سیریل بھی یہیں گفتگو کا موضوع بنتے رہے ہیں۔ "ہم لوگ" "رامائن" "بہادر شاہ ظفر" اور "امیر خسرو" پر تبصرے ہوتے رہے ہیں لیکن "رجنی" نے تو خواتین کے اندر زندگی کی لہر دوڑا دی اسی ٹیمپو میں کتنی تیز و طرار عورتوں کو رجنی کا روپ دھارے اور ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں کا قافیہ تنگ کرتے دیکھا اور بعض عورتوں نے شوخ گفتاری سے مردوں کو ایسا لاجواب کیا کہ وہ منہ چھپا کر بھاگ گئے غرض جو کام اخباروں اور ریڈیو سے نہیں ہوا تھا اسے ٹی۔ وی نے کر دکھایا۔

ہم آخر میں یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ ٹیمپو والے بھی انسان ہیں ان کے ساتھ بھی بھول چوک لگی ہوئی ہے ان میں سے بعض سواری رقم سمیٹنے کے چکر میں سرگرداں رہتے ہیں اور کبھی مسافروں کا سیلاب بھی امنڈ آتا ہے اور تب ان کی پانچوں انگلیاں گھی میں ڈوب جاتی ہیں۔ ایسا منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔ ہر مسافر منٹوں میں منزلِ مقصود پہنچنا چاہتا ہے۔ مقدمہ باز عدالت پہنچے، عاشق محبوب سے ملنے، طالب علم اسکول یا کالج پہنچے، بابو اور چپراسی دفتر جانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں اور بے چارہ ٹیمپو والا ہر مسافر کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتا ہے۔ چنانچہ مسافروں کی

عجلت پسندی اور شیو والے کی ہمدردی اور خلوص ایسا رنگ لاتا ہے کہ منہ کھلے کے کھلے رہ جاتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پوری فضا غم و اندوہ میں ڈوب جاتی ہے۔

کبھی ہمیں شیو میں ایک دو آدمی بیٹھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ان کی تعداد بیس تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی تنگ دامانی اور وسعت دامانی کو دیکھ کر ہمیں نوکِ زبان پر یہ مصرع آجاتا ہے۔

سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

●●

غزلیں

کرشن پرویز
(مہرٹھ)

کیسے اُن کا کہا کرے کوئی
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
غم تو لاکھوں دیئے ہیں لوگوں نے
اب دوا بھی عطا کرے کوئی
غمگساری تو اُٹھ گئی صاحب!
کہئے کس سے گلہ کرے کوئی
کام آئیں نہ وقت پڑنے پر
اپنے یاروں کو کیا کرے کوئی
ہم وفا کی روش نہ بدلیں گے
لاکھ ہم پر جفا کرے کوئی
ایک دل ہے اُسے بھی سوچو تو
درد میں مبتلا کرے کوئی
اب نہ لکھیں گے کوئی خط تم کو
ڈاک مہنگی ہے کیا کرے کوئی

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

پارساؤں کی آرزو کیا ہے
حور و غلمان کی جستجو کیا ہے
آپ کو پان کی یہ خو کیا ہے
چار لفظوں کے بعد تھو کیا ہے
پائیں دنیا میں جنت جائز
شیخ جی کی یہ ہاؤ ہو کیا ہے
"ڈینجر" ہو گیا ہے مالِ حرام
ان کی ہر رگ رگ میں یہ لہو کیا ہے
کھو گئی پھر کسی کی ہے مرغی
آتی ہمسائے سے یہ کو کیا ہے
خوب جانے ہے میرا سمدھی
میرے بیٹے کی آرزو کیا ہے
عورتیں آ رہی ہیں بے پردہ
وائے ملا تری بھی "چھو" کیا ہے
ایک حسن و جمال کا پیکر
متقی، اپنی آرزو کیا ہے

خلیل احمد بے تنگ شیرکوٹی
(امروہہ)

قطعات

ہڑکا

زمیں کو دیئے پھول تو نے خدایا
اُدھر آسمانوں کو بخشے ستارے
دیا حسن ان کو "ہمیں رنجِ الفت"
جو سر کو کھجاتے پھریں مارے مارے

○

مرنے کی خوشی

غمِ جاناں میں پائزن کھا کے
کیوں مریں اور ایک ہنسی ہوگی
اُن کے ہاتھوں ہی مرنا اچھا ہے
خود مریں گے تو خودکشی ہوگی

○

رشتۂ الفت

عشق کیا سفید داڑھی پہ
گول حسرت کا ہو گیا ڈبا
جب بھی جاتا ہوں اُن سے ملنے کو
کہتے ہیں آؤ ٹھیک ہو ابا؟

○

وسیم احمد ظہیر آبادی

سیاست کا کیڑا

خواجہ بھائی ٹوپی والا ہمارے محلے میں ایک کرانہ دوکان چلاتے تھے۔ مگر وہ دوکان سے زیادہ زبان چلاتے تھے۔ تولتے کم بولتے زیادہ تھے۔ ان کا خیال خود ان کے اپنے بارے میں یہ تھا کہ وہ سیاست کے ہر پیچ و خم سے واقف ہیں چاہے وہ سیاست قومی ہو کہ بین الاقوامی۔ وہ بڑے فخریہ انداز میں خود کو سیاست کا کیڑا کہتے تھے۔ ظاہر ہے جس قسم کی سیاست آج کل چل رہی ہے اس میں تو کوئی کیڑا ہی پنپ سکتا ہے۔ دوکان کھلتے ہی خبریں ہوتیں۔ جس میں امریکہ کے جارج بش سے لے کر مسجد کے موذن صاحب سب پر تنقیدیں ہوتیں۔ مسئلہ افغانستان صرف پاؤ کلو شکر تولتے تولتے حل کر دیتے۔ ایران و عراق کی جنگ کے دوران کرکٹ ٹسٹ کا اسکور ان کے نوک زبان پر ہوا کرتا تھا۔ ایک خاص بات یہ تھی کہ ان کے سیاسی تبصروں پر محلہ کی اکثریت ان کی ہاں میں ہاں ملایا کرتی تھی۔ اس کی بھی ایک خاص وجہ تھی محلے میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جن کے رزق کا دروازہ ہر ماہ صرف پہلی تاریخ کو کھلتا تھا۔ باقی دنوں کے لیے وہ خواجہ بھائی کے کھاتے دار رہے۔ جن کے بارے میں خواجہ بھائی کا خیال تھا کہ وہ ان کے در کا کھاتے ہیں۔ ایک دن میں نے ان کی سیاسی تقریر سے اختلاف کرتے ہوئے بی بی سی کی نیوز کے حوالے سے کہا۔ خواجہ بھائی بی بی سی کی نیوز سنتے ہی خواجہ بھائی فوراً مجھ سے کہنے لگے۔ بی بی سی سے اور بیوی سے مت سنا کرو۔ یہ دونوں صرف اپنے مطلب کی سناتے ہیں۔ ایک دن خواجہ بھائی صبح صبح اخبار لیے میرے مکان پر آدھمکے۔ کہنے لگے۔ ادیب بھائی امریکہ کا صدر تو مجھے پکا دوکان دار لگتا ہے۔ میں نے جواب دیتے ہوئے پوچھا امریکہ کے صدر کا دوکان داری سے کیا تعلق۔ کہنے لگے دیکھو تو اخبار میں کیا لکھا ہے۔ اخبار میں لکھا تھا کہ امریکہ نے ایران کو بھی ہتھیار بیچ کر منافع کمایا ہے۔ کہنے لگے میاں دشمن سے بھی جو آدمی منافع کماتا ہو وہی تو پکا دوکان دار ہوتا ہے۔ محلے کی دو شخصیتیں خواجہ بھائی کو سخت ناپسند تھیں ایک شرفو رکشا والا اور دوسرے مسجد کے پیش امام صاحب۔ شرفو رکشا والا ان کی دوکان داری کے لیے خطرہ تھا۔ وہ خواجہ بھائی کا کھاتے دار نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کا معاملہ یومیہ رزق جیسا تھا۔ وہ [illegible] کی جانکاری رکھتا تھا۔ اور یہی اس جانکاری کو خواجہ بھائی کے کھاتے داروں تک چپ چاپ پہنچایا کرتا تھا۔ یہ بات خواجہ بھائی کے لیے خطرناک ثابت ہوتی تھی۔ کھاتے دار جب خواجہ بھائی کی خود ساختہ بڑھی چڑھی قیمتوں پر اعتراض کرتے تو وہ کہتے۔ کھاتے دار ہو تو نہیں پوچھا کرتے۔

وہ شرفو رکشا والے کو ہمیشہ کمیونسٹ کہا کرتے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھ ہی لیا کہ آپ بے چارے رکشا والے کو کمیونسٹ کیوں کہتے ہیں۔ جواباً خواجہ بھائی نے کہا کم بخت بد معاش جو ہے۔!

پیش امام کی محلے بھر میں ہر دل عزیزی خواجہ بھائی کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ بہت کوشش کرتے کہ لوگ پیش امام صاحب سے بدظن ہو جائیں اور مسجد سے ان کا پتہ کٹ جائے اس کے لیے وہ کبھی متولی کے کان بھرتے اور کبھی محلے والوں کو ان کے خلاف اکساتے رہتے۔ آخر تنگ آ کر پیش امام صاحب نے بھرے بازار میں ایک دن کھری کھری سنا ڈالی۔ لوگ بہت خوش ہوئے کہ چلو ایک آدمی تو ایسا دم دار نکلا جو ان کے منہ پر ان کے خلاف کچھ تو بول سکتا ہے۔ میں نے خواجہ بھائی کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ خواجہ بھائی پیش امام صاحب کی وجہ سے آپ کی بڑی سبکی ہوئی ہے۔ کہنے لگے میں سیاست کا کیڑا ہوں دیکھنا ایسی سیاسی چال چلوں گا کہ خود محلے والے ہی پیش امام کو مسجد سے نہیں محلے سے بھی نکال باہر کر دیں گے اور واقعتاً ہوا بھی ایسا ہی —— آہستہ آہستہ لوگ پیش امام صاحب کے خلاف ہوتے گئے۔ مسئلہ عقائد کا تھا۔ محلے میں دو گروپ ہو گئے۔ پہلے چھوٹے علما آنے لگے اور چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگے۔ لوگ بازار میں کھڑے کھڑے ایک دوسرے کو کافر قرار دینے لگے یہ سارا کھیل خواجہ بھائی کا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کیوں میاں کیسی رہی دیکھ لیا نا ہمارا بدلہ کیا ہوتا ہے۔ آخر میں ایک سیاسی آدمی ہوں ذہن بھی تو سیاسی پایا ہے اور سیاسی ذہن یہ خوب جانتا ہے کہ قوم عقائد کی بنیاد پر کس طرح آسانی کے ساتھ آپس میں سر پھٹول کرتی ہے۔

ان کی عام بول چال بھی سیاسی اصطلاحوں میں ہوا کرتی تھی۔ بیوی کو حزب مخالف اور ساس کو ہائی کمان کہتے اور دوکان داری کو خواجہ اقتدار کہتے۔ سارا جھگڑا اسی اقتدار کا تھا۔ بڑے صاحب زادے کی یہ شدید خواہش تھی کہ وہ بھی دوکان یعنی اقتدار پر کچھ دیر کے لیے سہی روز بیٹھا کریں۔ مگر خواجہ بھائی کا خیال تھا کہ اقتدار میں ساجھے داری نہیں ہوتی۔

ایک دن مجھ سے کہنے لگے میاں خدا خیر کرے کل ہمارے گھر ہماری ہائی کمان یعنی ساس آ رہی ہیں۔ اور جب بھی ہائی کمانڈ کا دورہ ہوتا ہے سمجھو کہ میرے گھر کے اندر جھگڑا ضرور چھڑ جائے گا۔ کوئی لاکھ کوشش کرے میں دوکان یعنی اقتدار سے ایک منٹ کے لیے بھی ہٹنے کو تیار نہیں ہوں۔ میں نے انھیں کہا کہ آخر آپ اپنی ساس صاحبہ کی شکایت اپنے خسر صاحب سے کیوں نہیں کرتے تو کہنے لگے میاں وہ بے چارہ تو کسی جمہوری ملک کا صدر لگتا ہے۔ جانتا سب کچھ ہے کرتا کچھ نہیں —— چند دنوں بعد دیکھا خواجہ بھائی کی جگہ دوکان پر ان کے صاحب زادے موجود تھے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا —— میں نے ان سے خواجہ بھائی کے بارے میں پوچھا۔ وہ جھڑک کر بولا —— مجھے معلوم نہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ خواجہ بھائی دواخانے میں بیمار ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے میں پہلی فرصت میں دواخانے پہنچا عجیب حالت تھی۔ خواجہ بھائی درد سے تڑپ رہے تھے اور گھر کا کوئی فرد قریب نہیں تھا۔ ایک طرف شہر قورکشا والا اور دوسری طرف پیش امام صاحب انھیں سنبھالے بیٹھے تھے اور خواجہ بھائی کو تسلی دے رہے تھے۔ معلوم ہوا یہ دو افراد ہی خواجہ بھائی کو دواخانہ لے گئے تھے۔ خواجہ بھائی ان دو کرداروں سے معافی مانگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ ادیب بھائی دیکھ رہے ہو میری حالت —— ؟ دو روز سے تڑپ رہا ہوں گھر کا کوئی فرد پوچھنے نہیں آیا۔ دوکان ہاتھ سے گئی تو سمجھو کہ اقتدار بھی گیا۔ بچے ہاتھ سے نکل گئے۔ میں نے ان سے پوچھا خواجہ بھائی اس مسئلہ کا بھی کوئی سیاسی حل ہے؟
کہنے لگے رونا تو اسی بات کا ہے۔ زندگی بھر ہر مسئلہ کا سیاسی حل ڈھونڈتا رہا۔ خود کو سیاست کا کیڑا سمجھتا رہا۔

اسی سیلیکر ہی کی موت مر رہا ہوں۔ مجبور، لاچار، بے بس۔ میں نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا کہ خواجہ بھائی اس معاملے میں تم اکیلے ہی نہیں پوری قوم تمھارے ساتھ ہے۔ پوری قوم کا حال یہی ہے ہر مسئلہ کا سیاسی حل ڈھونڈا جاتا ہے۔ مسئلہ چاہے سیاسی ہو کہ مذہبی۔ معاشی ہو کہ سماجی تعلیمی ہو کہ اخلاقی۔ ہر مسئلہ کو قوم صرف سیاسی نقطۂ نگاہ سے دیکھتی ہے۔ اس لیے پوری قوم تمھاری طرح لاچار، مجبور اور بے بس دواخانے میں پڑی دم توڑ رہی ہے۔

●●

مہ دسرطن کی جائے کو رسیا نہ ہونا چاہیے
دوستوں کو اس قدر رنگین نہ ہونا چاہیے

پاس ہی غیرت کچھ بھی ہے تو نئی نسل کو
گالڈ سٹ کے دور میں پیدا نہ ہونا چاہیے

سیٹھ صاحب آپ لے لیں لاکھ منہ مانگا مگر
کو ٹھی میں مالی کی دھکا نہ ہونا چاہیے

دل جو ہیکلٹ بھی تو ہے حسینوں سے جڑے
آگ اور گھر کو کبھی یک جا نہ ہونا چاہیے

قوم کی اصلاح کی تم شوق سے سوچو مگر
مشورے کے درمیاں فیتا نہ ہونا چاہیے

لاکھ اونچا ہی پہنچا ہے تخیّل کی اُڑان
پھر بھی شاعر کا دماغ اونچا نہ ہونا چاہیے

جب کوئی سامان لینے جاؤ بیگم کہتی ہیں
ایسا ہونا چاہیے' ویسا نہ ہونا چاہیے

آپ دیسی ہیں تو پھر کیسی بدیسی حرکتیں
رخصتی کے وقت یہ "ٹاٹا" نہ ہونا چاہیے

صاحب تقویٰ ہو کوئی یا کہ رند بادہ نوش
جنوری کی رات میں تنہا نہ ہونا چاہیے

شاطر اب جدت پسندی کا تقاضا ہے یہی
بوڑھے سے سانپ کا افسانہ ہونا چاہیے

غزلیں ——— شاطر گورکھپوری

(روح فراق سے معذرت کے ساتھ)

ادائے خاص سے جس دم وہ منہ میں پان لیتے ہیں
تنبولی کی دکاں پر گاہکوں کی جان لیتے ہیں

ادا و ناز دکھلا کر وہ میری جان لیتے ہیں
نظر ملتے ہی سینے پر دوپٹہ تان لیتے ہیں

کسی عاشق کی ان کے گھر ہو گی خاطر تواضع
جبھی تو وہ اگر کی بتیاں لوبان لیتے ہیں

اثر پھٹکار کا اس دور کے لڑکے نہیں لیتے
وہی کرتے ہیں وہ جو اپنے دل میں ٹھان لیتے ہیں

مزہ تو جب ہے تا شی کا کہ منہ چھوٹے نہ ملنے سے
وہ گاؤدی ہیں جو ملنے سے پہلے پہچان لیتے ہیں

نہیں ہے جن کی قسمت میں کرایہ دینے کی عادت
کرائے کا مکاں وہ لوگ عالی شان لیتے ہیں

انھیں لا اینڈ آرڈر کی کوئی پروا نہیں شاطر
میرا یہ ہے وہ اپنے عاشقوں کی جان لیتے ہیں

تمام رات ——— محمد علی تنکلی (مقیم لندن)

کل آپ نے ہے راہ تکائی تمام رات
لیتے ہوئے گزری ہے جمائی تمام رات

اب آؤ گے' تب آؤ گے ہم انتظار میں
بیٹھے رہے بچھائے چٹائی تمام رات

ہنڈیا ادھر خیالی اُبلتی ہی رہ گئی
مرغی کی ٹانگ تو نے چبائی تمام رات

نکلو جدھر تو تم دہاں گڑیا دھری ہوئی
کھڑکی پہ میں نے آنکھ جمائی تمام رات

خامہ بگوش کے قلم سے

اس آپ بیتی میں جاسوسی ناولوں جیسے سنسنی خیز واقعات بھی ہیں

"وردِ مسعود" ایک بھرپور زندگی کی روداد ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے اپنے تجربات و مشاہدات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک فرد ہی کی نہیں، ایک پورے عہد کی زندگی کے نشیب و فراز بھی ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ "نشیب" زیادہ تر دوسروں کے ہیں اور "فراز" خود لکھنے والے کے۔ یہ کوئی اعتراض کی بات بھی نہیں ہے۔ آپ بیتی لکھنے والا جو کچھ لکھتا ہے، اپنے نقطۂ نظر سے لکھتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے، اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا ہے اپنے کانوں سے سنتا ہے۔ ڈاکٹر مسعود حسین کوئی تحقیقی کتاب تو لکھ نہیں رہے تھے کہ وہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھتے۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور سنا "وردِ مسعود" اسی کی بازیافت ہے۔ اگر کسی کو ڈاکٹر صاحب کے دیکھنے اور سننے پر اعتراض ہو تو اسے فرد کی آزادیٔ دید و شنید میں دخل اندازی کے مترادف سمجھنا چاہیے۔

اس آپ بیتی کا مطالعہ بہت سے زاویوں سے کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً اس میں سفرنامے کا خوب صورت انداز ملتا ہے، شخصی خاکہ نگاری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، عملی زندگی کے ساتھ ساتھ ذہنی زندگی کے سفر کی روداد ملتی ہے، پرانی تہذیب کی مرقع نگاری ہے، تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کی داستان ہے۔ ظاہر ہے کہ ان سب پہلوؤں پر لکھنے کی اس مختصر کالم میں گنجائش نہیں، اس لیے ہم اپنی گفتگو خاص خاص امور تک محدود رکھیں گے۔

ڈاکٹر صاحب کا تعلق درس و تدریس کے شعبے سے ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری سے لے کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلری تک تعلیمات کے میدان میں انھوں نے بہت کچھ دیکھا ہے لیکن سب سے زیادہ عبرتناک منظر انھیں جامعہ ملیہ میں نظر آیا۔ فرماتے ہیں "جامعہ کے اساتذہ میں بعض سیاہ رو سیاہ کار بھی تھے، نہایت ذلیل و کمینی حرکتیں کرنے والے، رسوائے زمانہ، دوسروں کی بہو بیٹی کو پھسلانے والے، ہر قسم کا فراڈ کرنے والے ... کسی نے تال میل سے اپنی ... سرٹیفکیٹ غائب کر کے اپنی تاریخ پیدائش بدل ڈالی تھی۔ وہ استاد ایسے بھی تھے جو دس سال سے پی ایچ ڈی میں نام کا اندراج کرائے بیٹھے تھے اور ان کے قلم سے تا حال چند صفحات تک برآمد نہیں ہوئے تھے۔ ایک صاحب اے لیول تا ایم اے تھرڈ ڈویژن سے سرفراز تھے لیکن پروفیسر بنے بیٹھے تھے ..."

یہ ساری باتیں قابلِ مذمت ہیں لیکن پی ایچ ڈی میں نام کا اندراج کرا کے ۱۹-۱۹ سال تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے والوں کو برا سمجھنا صریحاً ناانصافی ہے۔ آج کل پی ایچ ڈی کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے، یہ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں، جو پی ایچ ڈی کے لیے مقالے نہیں لکھتے۔ ہمارے خیال میں تو اب انھیں اساتذہ کو ترقی ملنی چاہیے، جو پی ایچ ڈی کی تہمت سے محفوظ ہوں۔

"وردِ مسعود" میں بعض اہم شخصیتوں کا ذکر نہایت دل چسپ پیرائے میں ملتا ہے۔ مثلاً

پروفیسر رشید احمد صدیقی اور پروفیسر آل احمد سرور کے بارے میں مسعود صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہم جیسے عقیدت مندوں کے سامنے ان دونوں بزرگوں کی شخصیات کے بعض بالکل نئے پہلو سامنے آتے ہیں۔ مسعود صاحب ان دونوں بزرگوں کے شاگرد اور بقول خود نیاز مند اور محرم راز بھی ہیں۔ اس لیے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے درست ہونے میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ مسعود صاحب نے "موازنۂ انیس و دبیر" کی طرح "موازنۂ رشید و سرور" مرتب کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"رشید صاحب کی شخصیت زیادہ کڑھی ہوئی تھی۔ صدیقی دونوں تھے، لیکن رشید صاحب میں شیوخ کی آن بان تھی۔ ان کی پسند اور ناپسند بھی شدید تھی۔ ان کے کردار کی سب سے نمایاں خصوصیت، ان کی فیض رسانی اور کریم النفسی تھی۔ سرور صاحب نسبتاً دل تنگ رکھتے ہیں۔ وہ ابتدا میں جس کو بڑھاتے ہیں، آخر میں اسی سے رشک کرنے لگتے ہیں۔ . . . .

سرور صاحب کے ہاں تواضع کرنے سے تواضع کروانے پر زور رہتا ہے۔ رشید صاحب کا اس اعتبار سے دسترخوان بہت کشادہ تھا۔ ان کے یہاں، نامعقول ہر قسم کے مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ خود سدا کے حاجت مند ہوتے ہوئے دوسروں کی حاجت روائی کرتے رہے۔"

سرور صاحب کے غیر متواضع ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ایم اے کے امتحان میں مولوی عبدالحق نے تو ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو ۱۰۰ میں سے ۸۴ نمبر دیئے، لیکن سرور صاحب نے صرف ۵۰ نمبر دیئے۔

مسعود صاحب نے رشید صاحب سے اپنی تمام تر عقیدت کے باوجود یہ بھی لکھا ہے ــــ "ان کی عدم کارکردگی کا اندازہ ان کے دوست اور مرشد ڈاکٹر ذاکر حسین تک کو تھا جنھوں نے مجھ سے ایک بار کہا تھا کہ جب تک رشید صاحب شعبۂ اردو کے سربراہ ہیں، اس کی ترقی و ترویج ناممکن ہے۔"

کم و بیش اسی قسم کی بات ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے سرور صاحب کے لیے بھی لکھی ہے ــــ "پتّا مار کام سرور صاحب کے بس کا کبھی نہیں رہا۔ ایک ذہین انسان ہونے کے ناتے وہ طلاقت لسانی اور تنقیدی اشارات و تعریفات کے مرد میدان ہیں۔"

رشید صاحب اور سرور صاحب جتنے ایک دوسرے سے قریب تھے، آخر آخر میں اتنے ہی دور ہو گئے۔ سبب یہ تھا کہ رشید صاحب اپنی ملازمت میں توسیع چاہتے تھے، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان کا خیال تھا کہ سرور صاحب کی مخالفت کی وجہ سے انھیں توسیع نہیں ملی۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں کا خیال ہے کہ توسیع نہ ملنے کا سبب یہ تھا کہ ۱۹۵۸ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت ان کی عمر ۶۵ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ وائس چانسلر اس عمر کے استاد کو توسیع نہیں دے سکتا تھا۔ سرور صاحب نے مخالفت نہیں کی، صرف یہ کیا کہ خاموش رہے، حالاں کہ ان کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ رشید صاحب کی حمایت میں لب کشا ہوتے۔

ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے یہ حقائق بیان کر کے بہت اچھا کیا، لیکن اور زیادہ اچھا ہوتا اگر ان حقائق کا علم رشید صاحب کو ان کی زندگی میں ہو جاتا۔ کاش مسعود صاحب کی آپ بیتی رشید صاحب کی زندگی میں چھپ جاتی، تب سرور صاحب سے ان کی ناراضگی ختم ہو جاتی اور مسعود صاحب سے شروع ہو جاتی کیوں کہ انھوں نے رشید صاحب پر عدم کارکردگی کا الزام لگایا ہے۔

اس کتاب کا سب سے سنسنی خیز حصہ وہ ہے جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی ایک "غلطی" کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ اس غلطی کی وجہ سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زبردست ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس ہنگامے کی زد میں وائس چانسلر یعنی خود ڈاکٹر مسعود

بھی آنے اور وہ جامعہ سے اس حد تک بد دل ہوئے کہ واپس علیگڑھ جانے کی ٹھان لی۔ مسعود صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کو ایک نہایت ذہین انسان طباعت لسانی کا ماہر اور فعال شخصیت کا مالک کہا ہے۔ ان کے کاموں کی تعریف بھی کی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے ـــــ "انھیں ایک خاص نقطہ نظر کے تحت بعض اچھے اساتذہ اردو پر ترجیح دے کر جامعہ لے لایا گیا تھا۔ ہم لوگوں کو بھی علم تھا کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت رہے ہیں۔ وہ ایک حوصلہ مند، گرجا طلب انسان ہیں۔ طبیعت میں خود پسندی اور شدت ہے۔ یہ مثبت ہوتی ہے تو کارہائے نمایاں کر بیٹھتے ہیں۔ جب منفی ہو جاتی ہے تو جارحانہ انداز اختیار کر لیتی ہے اور وہ اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہیں تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے اس سے انھیں غرض نہیں ہوتی۔ اپنے مقصد کے لیے وہ ہر قسم کے ذریعے کا استعمال کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ طلبہ تک کو۔"

ہمارے خیال میں مسعود صاحب نے ڈاکٹر نارنگ کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ جامعہ میں جو لوگ ڈاکٹر نارنگ کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ نااہلوں کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے نہ کسی دوسرے کو کرنے دیتے تھے۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ہدف پر نظر رکھنا کافی ہے، یہ دیکھنا ضروری نہیں کہ تیر کیسا ہے اور کہاں سے چلتا ہے۔ رہی جاہ طلبی اور خود پسندی تو یہ ایسی "خوبیاں" ہیں جو تھوڑی بہت ہر شخص میں ہوتی ہیں۔ ہمیں تو آج تک کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا جو صوفیا کی طرح ہر چیز سے بے نیاز ہو کر اپنی ذات کی نفی کرتا رہے۔

ڈاکٹر محمد حسن کے بارے میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے بتایا کہ جامعہ ملیہ میں پروفیسری کے امیدوار تھے لیکن ان کے بائیں بازو سے انتہائی شغف . . . . . کو جامعہ کے ماحول کے لیے مناسب نہیں پایا . . . . . ڈاکٹر محمد حسن . . . . بعض شاکی ہوئے اور اس کے بعد مجھے پہچاننا چھوڑ دیا۔ میں اس قسم کی آنا والے دوستوں کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں دیتا۔ میرے ان سے پرانے مراسم تھے۔ دہلی یونیورسٹی میں ریڈر کی اسامی پر ان کا تقرر خواجہ احمد فاروقی صاحب نے بہت سے تحفظات ذہنی کے ساتھ میری ہی سفارش اور ذمہ داری پر کیا تھا۔ اب جو ان کی پیشانی پہ بے نیازی دیکھی تو میں بھی خدا بن بیٹھا اور میں نے ان کے وجود ہی کو اپنی زندگی سے خارج کر دیا۔ یہ میرے ردِ عمل ہی کا شاید اثر تھا کہ عرصے بعد ان کا ایک خط آیا جس میں کچھ شکایت اور کچھ اپنے رویئے پر شرمندگی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ راہ و رسم کا دروازہ پھر کھل جائے، لیکن اس سے زیادہ نہ کھل سکا کہ ہم سر اور ہاتھ کی ہلکی سی جنبش کے ساتھ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے۔"

ڈاکٹر محمد حسن اپنے بارے میں جب یہ تحریر پڑھیں گے تو امید ہے راہ و رسم کا دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔

"ورودِ مسعود" میں دو تین جگہ ڈاکٹر گیان چند کا ذکر آیا ہے اور ہر جگہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں موصوف کو پسند نہیں کرتے۔ ڈاکٹر گیان چند کے علمی و تحقیقی کام ایسے اعلیٰ معیار کے ہیں کہ انہیں نظر انداز کر کے کسی شخص کی کمزوری کی بنا پر ان کا ذکر مضحکہ خیز انداز میں کرنا ڈاکٹر مسعود حسین خاں جیسے صاحب علم و فضل کے شایانِ شان نہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں پروفیسری کے امیدوار ڈاکٹر گیان چند بھی تھے اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں بھی۔ انتخاب کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی، ڈاکٹر اعجاز حسین اس کے ایک رکن تھے۔ ڈاکٹر مسعود حسین کو منتخب کر لیا گیا اور ڈاکٹر گیان چند ناکام ہوئے۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں اس سلسلے میں لکھتے ہیں: "شام تک اردو کے نئے پروفیسر کے انتخاب کی خبر عام ہو گئی۔ میں سروری صاحب کے یہاں جا کر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب

سے علاقائی نے بڑے مزے لے لے کر گیان چند صاحب کی امیدواری کا قصہ سنایا۔ کہنے لگے کہ آپ کو شاید معلوم ہوگا یہ اعظم گڑھ کے طالب علم رہے ہیں لیکن وہاں سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد انہوں نے پلٹ کر کبھی نہیں پوچھا۔ اب جو انہیں اس انتخاب کمیٹی کے رکن ہونے کی خبر ملی تو ایک میرے پاس خط آیا اور مجھے کسی زبانی امتحان کے لیے بھوپال آنے کی دعوت دی جہاں وہ اس وقت حمیدیہ کالج میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ میں نے بھی یہ خیال کیا کہ حیدرآباد تو جانا ہی ہے ایسی تاریخ دیدی کہ میں بھوپال ہوتا ہوا حیدرآباد پہنچوں۔ چنانچہ بھوپال میں امتحان لیا اور جب حیدرآباد کے لیے روانہ ہوا تو وہ بھی امیدوار کی حیثیت سے میرے ہم سفر تھے۔"

اس واقعے سے شاید یہ بتانا مقصود ہے کہ ڈاکٹر گیان چند نے جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر اعجاز حسین کو زحمت دی۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ یہ بات ہے کہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے پہلے تو یہ بتایا ہے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے مذکورہ واقعہ پروفیسر سروری کے گھر پر سنایا تھا لیکن چار سطروں کے بعد لکھتے ہیں۔ "دو روز کے بعد علی گڑھ کے لیے واپسی کا سفر اختیار کیا تو اتفاق سے اپنا ہم سفر ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب کو پایا۔ اسی سفر میں انہوں نے مجھے گیان چند صاحب کے ہم سفر ہونے کا قصہ سنایا۔"

جب تک یہ طے نہ ہو جائے کہ ڈاکٹر اعجاز حسین نے مذکورہ واقعہ پروفیسر سروری کے گھر پر سنایا تھا یا علی گڑھ جاتے ہوئے ہم سفری کے دوران، اس وقت تک ہم ڈاکٹر گیان چند کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھیں گے۔ ●●

خورشید ملک، تارین محلہ شاہجہاں پور

سودیشی ریل

اس عنوان کو دیکھ کر ہی بہت لوگ بدک جائیں گے کیونکہ شوکت تھانوی نے آزادی کے کچھ عرصہ بعد ہی اسی عنوان سے ایک افسانہ لکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ لوگ ان کے اس افسانہ کو اپنی کند ذہنی کی بنا پر بھول گئے ہوں گے لہٰذا اس کے عنوان پر قبضہ کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔ مگر توبہ کیجیے آج بھی اپنے یہاں کی ریلوں کا عبرت ناک حال دیکھ کر لوگ شوکت تھانوی کو یاد کر بیٹھتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں مگر اپنا سر پیٹنے کا ارادہ ملتوی کر دیتے ہیں کیونکہ اس میں سراسر ان کے سر کو ہی نقصان پہنچنے کا اندیشہ کرتا ہے۔ بعد میں میں نے سوچا کہ شوکت تھانوی نے اس عنوان کو اپنے نام سے رجسٹرڈ تو کرایا نہیں تھا اور اگر کرایا بھی تھا تو دس سال بعد رجسٹریشن خود بخود منسوخ ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل پرانی فلموں کے نام پہ نئی فلمیں دھڑلے سے بن رہی ہیں۔ اس صورت میں شوکت تھانوی کا عنوان چرانے کا الزام مجھ پر کسی طرح سے بھی عائد نہیں کیا جا سکتا ہے۔

شوکت تھانوی نے آزاد ہندوستان کی ریلوں کا جو نقشہ اپنے افسانہ میں کھینچا تھا اس میں کوئی [illegible] تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ابھی تک اسٹیم انجن کا استعمال بڑی بے حیائی سے کیا جا رہا ہے جب کہ [illegible] ممالک نے اس کو اس کے خالق جیمس واٹ کی یادگار کے طور پر میوزیم کی زینت بنا دیا ہے۔ ہمارے یہاں میٹر گیج کا بھی استعمال بغیر کسی تکلف کے کیا جا رہا ہے جب کہ کرۂ ارض کے بیشتر علاقوں میں اس کا استعمال عرصہ ہوا ترک کیا جا چکا ہے۔ ایک جرمن انجینئر نیا نیا یہاں وارد ہوا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یہاں اسٹیم انجن کا خوب استعمال ہوتا ہے تو اس نے بھاڑ کی طرح منہ پھیلا کر ایسی نظروں سے مجھے گھورا گویا اسے میری [illegible] [illegible] جب میں نے اسے مزید بتایا کہ یہاں میٹر گیج کا بھی استعمال ہوتا ہے تو اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی۔ اسے میری باتوں پر یقین نہیں آیا اور مجھ سے دونوں چیزیں دکھانے کی فرمائش کی۔ چنانچہ میں نے اسے دونوں نادرات کے دیدار کرائے۔ ایک اسٹیم انجن پلیٹ فارم پر کھڑا دھونک رہا تھا۔ جرمن انجینئر بے ساختہ اس کے اندر گھس گیا اور اس کے پرزوں کو چھو چھو کر دیکھتا رہا۔ بعد میں اس نے تبصرہ فرمایا کہ یا تو انجن کے پرزوں نے آب حیات سے غسل کر رکھا ہے یا پھر یہاں کے مستری ڈبل پرائز کے حق دار ہیں جو ان انجنوں میں ابھی تک جان ڈالے ہوئے ہیں ورنہ عام حالات میں اب تک ان پرزوں کو گھس گھس کر فنا ہو جانا چاہیے تھا۔ میٹر گیج کو بھی اس نے غور سے دیکھا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا یہ دونوں چیزیں اس ملک کی قدیم تہذیب سے وابستہ ہیں جو ان کا ابھی تک خاتمہ نہیں کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ چپ رہنے ہی میں میری عافیت تھی۔

خاندانی منصوبہ بندی کے پروپگنڈے پر بے دریغ روپیہ صرف ہونے کے باوجود آبادی کی شرح برق رفتاری سے بڑھ رہی ہے مگر اتنی ہی سست رفتاری سے گاڑیوں کی تعداد میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ گاڑیوں میں بھیڑ ہے کہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ اس بھیڑ کو دیکھ کر شریف، معقول اور سیدھے آدمی کا سفر کے خیال ہی سے دل لرزنے لگتا ہے۔ گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ ملنا تو بہت دور کی بات ہے، ڈبے کے اندر خود کو داخل کرا جوئے شیر لانے سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اندر گھسنے کی جدوجہد میں کپڑے پھٹ جائیں یا کسی کے ٹرنک سے ٹھوکر لگ کر جسم لہولہان ہو جائے، جیب کٹ جائے، گالیاں ملیں، دھکا ملے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ کیا کیا ہو جائے۔ اگر خدا نخواستہ اندر گھس جانے کا اعزاز حاصل ہو گیا تو ضروری نہیں کہ دونوں پیروں کو فرش نصیب ہو جائے۔ اگر صرف ایک ہی پاؤں کو فرش پر ٹکانے میں کامیابی ہو گئی تو آپ کو کرۂ ارض کا خوش نصیب ترین آدمی سمجھنا چاہیئے۔ صرف ایک پاؤں یا اس کے پنجوں کے بل کھڑے ہونے سے گرنے کا قطعی احتمال نہیں رہتا کیونکہ آپ کے جسم کا ہر عضو دوسرے مسافروں کے مختلف اعضا سے کسی نہ کسی طرح ضرور جڑا ہوگا۔ لہٰذا آپ بڑے اطمینان سے نیم معلق رہ سکتے ہیں اور موقعے سے تغافل استراحت کے مزے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ منزل آجانے پر گاڑی سے اترنا بھی بڑے دل گردے کا کام ہے۔ کئی اسٹیشن پہلے ہی سے دروازہ تک پہنچنے کی جدوجہد شروع کر دینی پڑتی ہے۔ تب کسی کے پاؤں پر پاؤں رکھ کر، کسی کے ہولڈال کو روند کر، کسی کی اٹیچی بچا کر، کسی کے کندھوں کا سہارا لے کر، کسی کے سر پر ہاتھ رکھ کر اور کسی کی لاتوں سے رگڑ کھا کر باہر نکل سکتے ہیں۔ باہر نکل کر اپنی سانسیں درست کرنے کے بعد ایسی فرحت محسوس ہوگی کہ جیسے ابھی ابھی نیا جنم لیا ہے۔

گاڑیوں کے لیٹ چلنے کا تو تذکرہ کرنا ہی فضول ہے۔ یہی گاڑیاں تھیں اور یہی ریلوے کے ملازمین تھے پھر بھی ایمرجنسی کے دوران ہر گاڑی اتنے صحیح وقت سے چلتی تھی کہ آپ ان سے اپنی گھڑی ملا سکتے تھے۔ مرکزی حکومت کو چاہیئے کم از کم ریلوے کے محکمہ پر ہمیشہ کے لیے ایمرجنسی نافذ کر دے۔ میں تو گاڑیوں کے لیٹ چلنے سے اتنا محتاط ہو گیا ہوں کہ جب بھی کسی کو ریسیو کرنے اسٹیشن جاتا ہوں تو اپنے ساتھ ناشتہ کا سامان، اخبار، چند رسائل اور دو ایک ناول ضرور لے جاتا ہوں۔ معلوم نہیں کتنی دیر انتظار کرنا پڑے۔ جس طرح موت کا کوئی بھروسا نہیں کب آجائے، بالکل اسی طرح گاڑی کا بھی کوئی وقت نہیں کہ کب آجائے۔

جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں اپنا ستیاناس کروانے کے بعد لگ بھگ ہمارے ساتھ ہی اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا تھا مگر اس نے برسوں پہلے دنیا کی سب سے تیز رفتار گاڑی بنا ڈالی۔ ہمارے یہاں کی گاڑیوں کی سست رفتاری کا یہ عالم ہے کہ کبھی کبھی مسافر کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ اس میں باقاعدہ قیام کیے ہوئے ہیں بعض گاڑیوں کی رفتار اتنی سست ہوتی ہے کہ آپ چلتی گاڑی سے اتر کر زمین [illegible] کر سکتے ہیں اور پھر بڑے اطمینان سے لپک کر گاڑی میں بیٹھ سکتے ہیں۔ گاڑیوں کی سست رفتاری کی اہم وجہ یہ ہے کہ ان کے اسٹاپیج (stoppage) بہت ہوتے ہیں۔ ہر سال نہ جانے کتنے نئے اسٹیشن اُگ آتے ہیں۔ جب کوئی نئی گاڑی چلتی ہے تو شروع میں اس کی معقول رفتار ہوتی ہے مگر بعد میں جن علاقوں سے وہ گزرتی ہے وہاں کے لیڈر اپنے اپنے علاقوں میں اس کو رکوانا شروع کر دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اچھی بھلی گاڑی ستیاناس ہو جاتی ہے۔ ایک بار میں اپنے ایک دوست کو رخصت کرنے اسٹیشن گیا۔ خوش قسمتی سے اس دن گاڑی

ہو گیا ہے کہ لوگ سفر کرنے کے لیے باقاعدہ بطور رقم بس انداز کرتے ہیں۔ فرسٹ کلاس اور ایر کنڈیشنڈ میں اپنی جیب سے ٹکٹ خرید کر سفر کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مفت خورے ہوتے ہیں جن کو اپنی ملازمت کے ناطے کرایہ ملتا ہے یا جن کو مفت پاس ملتا ہے یا پھر بنکوں میں حالو کھاتہ رکھنے والے چالو لوگ ہوتے ہیں۔

نہ جانے مجھ سے کون سا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس کی سزا مجھے سفر کر کے بھگتنا پڑی۔ سستے طریقے یعنی بھائی کبرات کا سفر کرنا پڑا۔ رزرویشن ہو نہیں سکا یا یوں سمجھیے کہ میں نے رزرویشن کرایا ہی نہیں۔ بھلا کوئی تک ہے کہ صرف چند گھنٹے پتلی سی برتھ پر بیٹھ کر جانے کے اتنے روپیے لیتے ہیں جتنے کہ ایک ادنیٰ ہوٹل کے کمرہ کا چوبیس گھنٹوں کا کرایہ! گاڑیوں میں بھی بیشتر ڈبے (RESERVED) ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ہو مجھے سفر تو کرنا ہی تھا۔

گاڑی حسبِ دستور سابقہ لیٹ آئی یعنی آٹھ بجے کی بجائے ساڑھے گیارہ بجے آئی اور بڑے ٹھسّے کے ساتھ آئی۔ بھیڑ بہت تھی مگر لوگ چھتوں پر اس طرح آرام سے لیٹے تھے گویا سسرال میں استراحت فرما رہے ہوں۔ جنرل کمپارٹمنٹ کا حشر دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ دروازے سے ہو کر اندر گھسنے کی گنجائش نہ تھی میں نے دو ایک بار لوہے کی سلاخ پکڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا۔ مجھے نیوٹن کا وہ اصول یاد آ گیا کہ ہر طاقت کے برابر مگر مخالف سمت میں ایک اور طاقت کام کرتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ نیوٹن کو اس اصول کا اس وقت احساس ہوا تھا جب بچپن میں ایک بار ماں کے اپنے کسی شرارت پر غصہ میں آ کر ان کا سر دیوار سے ٹکرا دیا تھا۔ ان کو محسوس ہوا کہ جتنی طاقت سے ان کا سر کو دیوار کی طرف دبا رہے ہیں، دیوار اتنی ہی طاقت سے سر کو پیچھے کی طرف دھکیل رہی ہے۔ بہر حال میں جتنی طاقت سے اندر گھسنے کی کوشش کرتا تھا، اندر سے اتنی بلکہ کچھ زیادہ ہی طاقت سے مجھے باہر دھکیل دیا جاتا۔ مجبور ہو کر ایک قلی کو پانچ کا نوٹ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ جیسے ہی کسی کھڑکی سے میرے جسم کا تھوڑا سا بھی حصہ اندر گھسنے میں کامیاب ہو، وہ پشت سے پے در پے کئی دھکے مار کر مجھے پوری طرح اندر دھکیل دے۔ چنانچہ میں نے کنکھیوں سے کھڑکیوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ آخر کار ایک کھڑکی میں اتنی گنجائش نظر آئی کہ میرے سر کا نصف حصہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ چشم زدن میں قلی نے مجھے اندر ٹھونس دیا۔ اندر گھس جانے کی مجھے اتنی مسرت ہوئی کہ بھلا سکندر کو پورس پر فتح حاصل کر کے کیا ہوئی ہوگی۔ اپنی کامیابی کی سرشاری سے مکمل طور پر لطف اندوز بھی نہ ہو پایا تھا کہ مجھے ان لوگوں کی صلواتیں سنائی دینے لگیں جن کے سروں پر سے ہوتا ہوا گردن کو رگڑتا ہوا، کہنیوں کو دباتا ہوا اور رانوں کو گھستا ہوا میں اندر داخل ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ صلواتیں ہی سنا سکتے تھے کیونکہ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھانے کی بھی گنجائش نہیں تھی۔

اب میں نے پیروں کو فرش پر ٹکانے کی جد و جہد شروع کی کیونکہ ابھی تک میں نیم معلق ہی تھا۔ اس کوشش میں کئی گھٹنوں کو دبوا، جوتوں و چپلوں کو کچلا، پنڈلیوں کو گھسا تب جا کر ایک پاؤں کے صرف پنجوں کو ہی فرش پر ٹکا سکا۔ دوسرا پاؤں نہ جانے کس کے زانوں پر پڑا ہوا تھا، وہ زانوں بار بار ہل کر میرے پاؤں سے نجات حاصل کرنے کی جد و جہد کر رہا تھا مگر میرا پاؤں بے بس و لاچار تھا اس کے لیے ادھر ادھر رتی برابر کھسکنے کی گنجائش نہ تھی۔ غنیمت تھا کہ میرے پاس صرف ایک بریف کیس ہی تھا جس کو میں نے اپنی بغل میں ٹکا رکھا تھا۔ اس کا اگلا سرا کسی کے سر پر ٹکا ہوا تھا مگر وہ اس کا بوجھ اٹھانے کے سبب میں قبول کرنے کو تیار نہیں تھا لہٰذا وہ بار بار اسے پیچھے ڈھکیل دیتا تھا جس کے نتیجہ میں اس کا پلا

سر اُس کی دوسرے کی پیشانی سے ٹکرا جاتا تھا اور وہ تلملا کر اسے پھر آگے کی طرف دھکا دے دیتا تھا۔ غرضیکہ بریف کیس پیچھے اور آگے کی طرف سفر کرتا رہا مگر اس سفر بسلسل میں وہ میری بغل سے جدا نہیں ہوا۔ میرا دوسرا ہاتھ دو تین بغلوں سے ہوتا ہوا کسی کے کاندھے کو چھو رہا تھا۔ اس ریل پیل میں مجھ کو محسوس ہوا کہ وہ کاندھا کسی صنف نازک کے ہیں میں نے گردن توڑ مروڑ کر اس صنف نازک کو دیکھنے کی کوشش کی۔ بہ مشکل تمام ایک خفیف سی جھری سے مجھ کو کامیابی کی سعادت نصیب ہوئی مگر اس کامیابی سے بہتر تھا کہ میں ناکام ہی رہتا تاکہ اس صنف نازک کا بھرم تو قائم رہتا۔ دراصل وہ صنف نازک اپنی نازکی کا دور عرصہ ہوا ختم کر چکی تھی۔ اب تو اس کو صنفِ مضبوط یا صنف پیزدگی (بڑی) آسانی سے کہا جا سکتا تھا۔ دراصل میں یہ نکتہ بھول گیا تھا کہ اپنے یہاں کی صنف نازک اینڈ سے بینڈ سے وقت سفر کرنے سے اجتناب کرتی ہیں۔ ویسے بھی ان میں سفر کرنے کا رواج کم ہی ہے۔ پوری گاڑی چھان ماریئے شاید یہ ایک آدھ نظر آجائے۔

ابھی تک سنا تھا کہ سولی پر بھی نیند آجاتی ہے مگر اس رات یقین ہو گیا۔ حالانکہ میں سولی پر نہیں بلکہ مسافروں کے اوپر بڑے آرام اور سکون سے لٹکا ہوا تھا۔ چونکہ نیند کا وقت بھی ہو گیا تھا اس لیے مجھ کو جھپکیاں آنے لگیں گر جانے کا کوئی خطرہ بھی نہیں تھا کیونکہ میں انواع و اقسام کے جسموں سے گھرا ہوا تھا۔ لہٰذا میں اطمینان سے جھپکیاں لینے لگا۔ ان جھپکیوں کے دوران میں نے سنا کہ لوگ سیاست جیسی گندی تجارت پر گفتگو کر رہے تھے۔ کرپشن کیا، پریویو اینڈزا اور بوفورس وغیرہ کے بارے میں ذکر کر رہے تھے۔ میرے اونگھتے ذہن نے سوچا کہ آج کل کتنے بے تکے اور بے ہودہ الفاظ استعمال ہونے لگے ہیں۔ کرپشن تو سنا تھا مگر کرپشن کیا چیز ہے؟ کلرہ سنا تھا مگر کیلر کیا بلا ہے؟ پریویو تو عام لفظ ہے مگر پریویو ہو کون سی ترکیب ہے؟ BI:FORE اور FIFTER ہمیشہ واحد کے روپ میں استعمال ہوتے ہیں مگر BOFOR کیا چیز ہے جس کی جمع بھی بنائی گئی؟ فارن اینڈ سے تو ہماری گورنمنٹ ہوتی ہے مگر اینڈز کیا بلا ہے؟ میری کم علمی اور غنودگی میں جنگ ہونے لگی مگر میں بدستور اونگھتا رہا اور سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور اونگھتا رہا۔ اچانک میں چونک پڑا۔ اپنے بائیں ہاتھ کو بہ مشکل تمام باہر نکالا اور کلائی کو کسی طرح موڑ کر چہرے کے سامنے کیا۔ گھڑی دو بجا رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کے پاس والی کرسی پر بیٹھے ہوئے چھ آدمیوں میں سے ایک سے درخواست کی کہ وہ پتہ لگائے کہ کس اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہے۔ میں نے شاید اندر آتے وقت اس کو کچھ زیادہ ہی تکلیف پہنچائی تھی کیونکہ اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھور کر کہا "گاڑی ابھی اسی اسٹیشن پر کھڑی ہے جس پر آپ اپنا منحوس وجود لے کر اندر ایک بلا کی طرح گھسے تھے"۔

میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ وہ پڑھا لکھا تو ہرگز نہیں لگتا ہے مگر افسانہ نگار ضرور ہو سکتا ہے!

○ واحد انصاری (برہان پور)

یونہی بڑھتی رہی غم کی ادبانی تو کیا ہوگا
غم جو بہت تمہارے عشق میں مان لو کیا ہوگا

بہلتا ہے تیرے الطاف بیمار کو میرے
ترے الطاف و کرم کی چھت پیر کی [illegible]

ترشتو عمر بھر [illegible] غم کی بھول میں
فصاحت کا کریں کو نہ اس [illegible]

○ [illegible] (برہان پور)

چاند جھلملاتا ہے سر پہ مرے زلفِ یار کا
میں بھی شکار ہو گیا کالے بخار کا

یہ کہہ کے اس نے بزم میں پانسا جما دیا
تحفہ قبول کیجیے گا پہلے پیار کا

جس پہ کیا ہے تم نے کرم پس گیا غریب
تیرا کرم ہے جیسے ہتھوڑا لہار کا

دھلا رہا ہے رعب تھا بھائی اس طرح
جیسے جنوائی ہو وہ کسی تھانیدار کا

[illegible] نے مشاعروں کو چلا ہے چند ستو
دو شعر ہے تخلیق کے مطلع نثار کا

ہٹ دھرمی کا امیری بیوی کی واحد عجیب ہے
سایہ بھی کیا پاس نہ اسے رشتے دار کا

○ سراج نرملی

[illegible] ہو گلہ تو کلی دو
لیکن ہے شرط خود کل کل دو تو ٹل دو

پہلے ہی شعلے تو خطرے کی نشانی
کوئی بھی ذرا سر کو اٹھائے تو کچل دو

حالت تو جتا کی ہے کہ قلاش ہیں ہم بھی
پاکٹ میں تمہارے ہو تو چالیس بدل دو

ڈھوکا مرے دل پہ لگا دگی کب تک؟
مرغی جنیں مجھی نہیں، انڈا ابھی تل دو

[illegible] ہے بہت عیش طلب ہے یہ نکمّہ
گلشن کو بچانا ہو تو مالی کو بدل دو

آیا ہوں سراج اب تو بڑی آس لیے میں
محفل میں سنانی ہے مجھے تازہ غزل دو

○ مجیب الرحمٰن بزمی (رانچی)

مطلبی، خود غرض، بے حیا ہو گیا
دورِ حاضر کے انساں کو کیا ہو گیا

وہ بھی مفلس تھا کل تک تو میری طرح
قوم کا بن کے لیڈر بڑا ہو گیا

معجزہ یہ سیاست کی آندھی کا ہے
باپ ماں سے جو بیٹا جدا ہو گیا

ناچتی ہے جوانی ہر اک موڑ پر
کتنا دلکش سماں شام کا ہو گیا

تذکرہ اب جوانی کا مت کیجیے
دوستو وہ زمانہ ہوا ہو گیا

میری آنکھیں تھیں پھر بھی نہ اسے دیکھ کر
بس اسی بات پر وہ خفا ہو گیا

مرد عورت ہے عورت بنی مرد ہے
یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہو گیا

محمد طارق (مصلح پور امروہہ)

کرشمے غیر ملکی ہاتھ کے

انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے اور ہندوستان میں غیر ملکی ہاتھ آگیا۔ کیسے آیا یہ ہم نہیں جانتے —
ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ غیر ملکی ہاتھ وقتاً فوقتاً ہمارے دیس میں بغیر پاسپورٹ کے آتا رہتا ہے کیوں کہ پاسپورٹ سالم انسان کے لیے ہوتا ہے انسان کے کسی ایک عضو کے لیے نہیں اس لیے غیر ملکی ہاتھ بلا خوف و خطر ہمارے دیس کے کسی بھی علاقہ میں آزادی سے آجاتا ہے۔

ہمیں غیر معتبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ غیر ملکی ہاتھ کی انگلیاں اور انگوٹھا ایک ہی سائز کے ہوتے ہیں اس لیے وہ ہر کام ایک ہی انداز میں انجام دیتا رہتا ہے۔ دیش پر مصیبت بھی لاتا ہے اور سیاست دانوں کے سروں پر آفت کے بادل بھی برساتا ہے — الیکشن میں بھی رہتا ہے اور کرپشن میں بھی۔

غیر ملکی ہاتھ کی آمد و رفت کے بارے میں ایک بات خاص ہے کہ اس کا آنا نظر آتا ہے اور نہ اس کا جانا دکھائی دیتا ہے پتہ چلتا ہے اس وقت جب غیر ملکی ہاتھ سنسنی خیز کرشمے دکھا چکا ہوتا ہے اور ہمارے دیس کے حساس سیاست داں ان کرشموں کو دیکھ کر فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ کرشمے بدیشی ہاتھ کے ہیں جھوٹ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ دیس کے لوگوں کو ہاتھ ملنے سے فرصت نہیں ملتی تو ان کے ہاتھ کرشمے کیسے دکھائیں گے؟

دیش کے لوگ بے چارے مہنگائی پر ہاتھ ملتے ہیں.... فسادات پر ہاتھ ملتے ہیں.... ظلم و زیادتی، کرپشن پر ہاتھ مل مل کر رہ جاتے ہیں اور غیر ملکی ہاتھ اپنے کرشمے دکھاتا چلا جاتا بلکہ لوگوں کو تنگ دیتا ہے جس کا پتہ تحقیقاتی کمیشن لگاتا ہے۔

کسی مندر میں گوشت پھینکنے کا کام غیر ملکی ہاتھ کرتا ہے کسی مسجد کے صحن یا سیڑھیوں پر سور کاٹ کر رکھ دیتا ہے —
کسی کی ذات پر حملہ کرتا ہے تو کبھی دھرم پر کیچڑ اچھالتا ہے — فسادات کرواتا ہے۔ عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرواتا ہے۔ یہی نہیں دیش کی بھولی بھالی جنتا کو اتنا وحشی اور درندہ بنا دیتا ہے کہ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹنے لگتے ہیں — یہ جملہ معترضہ ہے — ہمیں اپنے دیش کے لوگوں کے بارے میں ایسے تشبیہ نہیں استعمال کرنے چاہئیں بلکہ لکھا مدینہ شٹ کی بھاشا میں، جو ہمارے دیش کے لوگ اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ دیش کے لوگ اپنے ہم وطنوں کو گاجر مولی کی طرح نہیں کاٹتے بلکہ کار ثواب سمجھ کر جام شہادت پیتے اور پلاتے ہیں — جام شہادت

بابو آر کے (اپل پور)

انجن اُڑن طشتری کا

ایک دن ہمارے گھر کا وہ مخصوص کمرہ جو برسوں پہلے مقفل پڑا تھا" اسے صاف کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس کمرے سے جو کہ ہمارے بزرگوں کے عہد سے بند پڑا تھا' وہ نادر اور یکتائے زمانہ چیزیں برآمد ہوئیں کہ اللہ کی پناہ! یوں سمجھیے وہ کمرہ نہیں بلکہ نادر اور نایاب چیزوں کا ایک بھنڈار تھا' جو بے روزگار تھا۔ اس دن ایک ہنگامہ سارے گھر میں مچا۔ بچوں نے اس کمرے کے پرانے سامان کی جیسے لوٹ مچادی۔ چھوٹے میاں' بے ڈھل ٹوٹے پھوٹے قدیم چراغ کو ہاتھ میں لے کر اُسے رگڑتے جارہے تھے اور جن کے نمودار ہونے کے منتظر تھے۔ ادھر ننھے میاں زنگ آلود تلوار ہاتھ میں تھام کر شمشیر زنی کے جوہر دکھانے میں مصروف تھے۔ الغرض سارے بچے ایک ایک چیز کو لے کر دیکھتے اور خوش ہو ہو کر ناچتے چلے جاتے۔ اسی کاٹ کباڑ میں ہمیں ایک عجیب تماشے کا دستیاب ہوا۔ اس پہیلی کا تین چوتھائی حصہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا۔ ہم نے منوں مٹی کھود کر اس دفینے کو باہر نکالا۔ پہلی نظر میں دیکھنے پر یہ لوہے کا ایک بے ڈھب سا ٹکڑا لگا۔ غور سے دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں کہیں کہیں کھونٹیاں بھی ہیں' اسکرو بھی ہے اور ایک آدھ جگہ پہیہ بھی۔ ہم پورا ایک گھنٹہ صرف کرنے کے باوجود بھی اسے نہ سمجھ پائے کہ آخر یہ کون سا عجوبہ ہے؟ ہم نے اس معمہ کو حل کرنے کے لیے اپنے پڑوسی کلّو بھائی کباڑی کو بلوایا وہ پرانے لوہے کے سامان کے بڑے پرانے بیوپاری تھے۔ ان کے تعلق سے مشہور تھا کہ لوہا انہیں دیکھتے ہی باتیں کرنے لگتا ہے تو صاحب' کلّو بھائی آئے انھوں نے تعجب سے اس شئے کو دائیں بائیں اوپر نیچے بغور دیکھا اور پھر سوچ کی لکیریں ماتھے پر لاکر ہونٹوں میں سرگوشی کی......ہوں........کم دنوں کا.........اُوں.........اُوں.........ریلوے انجن انجن.........پھر پریشان ہوکر بولے.........نہیں.........نہیں.........پھر ایک مرتبہ وہ اس شئے کے چاروں طرف گھومے اس مرتبہ انھوں نے کہیں کہیں کسی مقام پر ہاتھ لگاکر کچھ محسوس بھی کیا۔ پھر انھوں نے اسے ہاتھوں میں اٹھاکر پوری طاقت سے تولا اور جب وہ پسینے پسینے ہوگئے تب پھولی سانسوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے اور بولے۔ میں اپنے تجربے کی قسم کھاکر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ یہ مشنری ہماری اس دنیا کی ٹیکنالوجی سے بالکل الگ ہے۔ اس وقت مارے حیرت کے سب کے منہ کھل گئے۔ پھر وہ کہنے لگے۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ مشنری ننانوے فیصد سوائے اڑن طشتری کے انجن کے کچھ نہیں۔ اڑن طشتری کا نام سنتے ہی بچے بر سبب خوف نعرہ بلند کرکے اچھل پڑے اور اس شئے سے یک لخت یوں دور بھاگے مانوں یہ اب اڑی کہ تب۔ کلّو بھائی کے اس سنسنی خیز انکشاف پر ہم نے اپنا سینہ فخر سے یہ سوچ کر تان لیا کہ شاید ہمارے بزرگ اڑن طشتری کے موجد ہوا کرتے ہوں گے یا پھر ان کی رسائی اڑن طشتری تک ضرور تھی۔ خیر اڑن طشتری کا قدیم راز ہمارے گھر میں طشت از بام ہونا یہ بات ہمارے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ اس دوران ہماری بچی نے کلّو بھائی سے دریافت کیا "کیوں چچا! آپ کے تجربے

نے اسے نانوے فیصد اڑن طشتری کا انجن قرار دیا لیکن ایک پرسنٹ جو بچ رہتا ہے اس کا کیا ماجرا ہے؟ تب گلّو بھائی بولے، بیٹے، میرا جی تو یہ کہنے کو نہیں چاہتا لیکن اپنے تجربے کو داؤ پر لگا کر، دل پر سو جبر کر کے کہہ لیتا ہوں کہ اس کے سلائی مشین ہونے کے ایک پرسنٹ امکانات روشن ہیں۔ ان کے اس جملے پر گھر کے سارے افراد ہنس پڑے جیسے گلّو بھائی نے لطیفہ سنا دیا ہو۔ چونکہ سلائی مشین کی ضرورت ہمارے گھر میں ایک عرصے سے محسوس کی جا رہی تھی اس لیے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور انھیں رخصت کر کے گھر لوٹے۔ اس وقت ہم خدا کی قدرت کے قائل ہو گئے کہ واقعی وہ جب دینے پر تُلتا ہے تو چھپر ہی نہیں زمین بھی پھاڑ کے دیتا ہے۔ پھر ہم خوش خوشی لوہے کی اس چیز کے قریب ہوئے بہ نظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد ہم نے بھی بلا جھجک اعلان کیا کہ اب کوئی بھی فرد اس شئے سے متعلق مشکوک نہ رہے کیوں کہ اس کے نقش و نگار، سلائی مشین کے خد و خال سے کہیں کہیں مشابہت رکھتے ہیں۔ پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ اڑن طشتری کا انجن نہیں بلکہ سلائی مشین ہی ہے۔ ہمارے اس اعلان کے بعد تالیوں سے پورا گھر تھرّا اٹھا۔ اس اعلان پر بیوی بچے سب مسرت سے بے قابو ہو گئے اور تھوڑی سی ہمیں بھی راحت محسوس ہوئی کیوں کہ سلائی مشین کے لیے ایک عرصے سے بیگم اور بچیوں نے ہمارا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ واقعی آج کل گھروں میں سلائی مشین بہت زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ خواتین تو اس کے بغیر گھر کو گھر تصور ہی نہیں کرتیں۔ چناں چہ بیگم اور بچیاں ہر فرض نماز کے بعد دعاؤں میں مشغول رہا کرتیں اور دامن پسارے کہتیں، خدایا تو ہمیں بھی سلائی مشین دلا کر ہمارے گھر کو گھر جیسا بنا دے تاکہ ہمارا گھر بھی اوروں کے گھروں کی طرح مشین کی سریلی کھٹ کھٹ سے گونجتا رہے۔

خیر صاحب اس عجوبہ کے سلائی مشین ڈکلیر ہوتے ہی بیگم اور بچیوں نے مارے خوشی کے سارے گھر میں دھما چوکڑی مچا دی۔ اس وقت ہماری چھوٹی بچی تالیاں بجا بجا کر اچھل اچھل کر کہنے لگی، ممی، میری ڈسکو شلوار اسی ریل کے انجن پر سئیں گی نا آپ؟ منے میاں نے اسے ٹوکا، اری ہٹ، سب سے پہلے تو میرا سفاری سوٹ اڑن طشتری کے اس انجن پر سلے گا۔ تھوڑے توقف کے بعد ہم بچوں کو اس خدائی فوجداری سے دور ہٹایا اور پھر ہم اس عجوبہ کو استعمال میں لانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ سب سے پہلے ہم نے اس کا پہیہ گھمایا، اس نے چلنے سے صاف انکار کیا۔ پھر اس میں لگی لبلبی کو اٹھانا چاہا تو اس نے ہمارا ناک میں دم کر دیا۔ الغرض اس کا ہر پرزہ اپنی جگہ سنگِ گراں ثابت ہوا۔ آخرکار ہم نے خوب اچھی طرح اسے صاف کیا۔ اس کے سوراخوں اور کل پرزوں سے مٹی الگ کی تب کہیں تھوڑی جنبش کہیں کہیں نمودار ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے کیروسین تیل سے خوب اچھی طرح غسل دیا اور پھر اس کے پہیے کو گھمایا تو کسی کسی جگہ سے بے ہنگم آواز کا جانفزا مژدہ سنائی دیا۔ اس نوبت پر ہم نے بیگم کو خوشخبری دی کہ اب ہم اس عجوبۂ روزگار کو آدھے سے زیادہ اپنے قابو میں کر چکے ہیں یہ سن کر بیگم خوشی سے اچھل پڑیں اور بچے کودنے لگے۔ اس سبو گھڑی بیگم نے دو روپیہ کا نوٹ بچے کو تھما دیا اور فوراً بازار سے مٹھائی منگوا کر محلے کے تمام معصوموں کا منہ میٹھا کروایا۔ پھر وضو کر کے مصلّٰی بچھایا اور دو رکعت نمازِ شکرانہ ادا کیا اس اثنا میں ہم نے ہانک لگائی، ارے بھئی ذرا تیل تو لاؤ۔ گھر کے سب بچے ایک دم الرٹ ہو کر تیل کے لیے دوڑ پڑے۔ کسی کے ہاتھ میں ناریل کے تیل کا اور کوئی چنبیلی کے تیل کا ڈبہ اٹھائے ہوئے تھا، کوئی اسلحے سے سعادت مندی سے کھڑا تھا۔ ہم نے ٹیکنیکل باریکیوں سے کام لے کر ہمہ اقسام کے تیل اس مشین کے ظاہر و باطن کے حوالے کر دیے۔ اس دوران بیگم نماز سے فارغ ہو چکی تھیں وہ بھی الٹے پاؤں دونوں ہاتھوں میں

وہ شیشیاں لیے نمودار ہوئیں بیچ یہ سرسوں کا تیل بھی حاضر ہے اور یہ کسٹرڈ آئیل بھی آپ کے حوالے اور ہاں کل ہی کلو بھائی اپنی بیگم کے ہاتھ ملنے کے لیے مچھلی کا تیل لانے تھے اگر آپ کہیں تو وہ بھی پیش کردوں ؟ الغرض پورے دن بھر کی کڑی محنت اور مہارت کے بعد اس مشینو نے سلائی مشین جیسے ہی ہاتھ پاؤں نکال لیے۔

دوسرے دن ہم نے گھر کی پوری ٹیم کو کمرے کے کونے میں مشین کے بقیہ دھڑ کی تلاش کا مشن سونپ دیا .... اور پھر گھر کے کاٹ کباڑ میں وقفہ وقفہ سے مشین کے دھڑ کا سب سامان ایک ایک کرکے مل گیا اس کے بعد مستری، میکینک اور خود ہم نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر مشین کے سر کا بی کے دھڑ سے جوڑ کر اسے پیروں پہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس وقت مارے نقاہت کے اس کے پیروں میں توانائی کم تھی اسی لیے مشین پہ ہاتھ رکھتے ہی یہ کپکپا اٹھتی لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کے سارے عیب اور کمزوریاں ہم پر عیاں ہوتی گئیں اور آہستہ آہستہ ہم ان پہ قابو پاتے گئے۔ پھر جوں جوں دن گزرنے لگے اس کے رنگ روپ میں نکھار آنے لگا یہاں تک کہ اب تو اس کا مونوگرام بھی پڑھنے لائق ہو گیا تھا۔ تو صاحب ہماری اس سلائی مشین کا نام تھا "سنگر" اسے چلانے سے قبل اس کے نام کی وجہ تسمیہ یہ سمجھ میں آئی کہ اس کی آواز یقیناً سریلی اور دلکش ہوگی لیکن جب بیلٹ وغیرہ چڑھا کر مشین پاپ فٹ کرکے پائیدان کے ذریعے سے چلایا گیا تو کھٹ کھٹ دھڑ دھڑ کا ایک شورِ قیامت بلند ہوا۔ اس کی جھک جھک دھڑا دھڑ کھٹ کھٹ نے ملک کے سارے ریلوے جنکشن ہمارے گھر میں گھسیٹ لائے تھے۔ بیگم اس ہنگامے سے بے نیاز کپڑا سینے میں مشغول رہیں۔ دو تین منٹ بعد ہوا یہ کہ اس کی آواز کی دھڑ دھڑاہٹ سے فرش پہ رکھے سامان کپکپانے لگے، الماریوں میں رکھے برتن اچھلنے لگے اور تختوں پہ رکھی چیزیں فرش پہ رینگنے لگیں اور کانوں میں سنسناہٹ اور سیٹیاں سمٹ آئیں۔ ابھی بیگم نے دس منٹ ہی مشین چلائی ہوگی کہ دروازے پہ ایک زور کی دستک ہوئی۔ ہمارا منا باہر گیا اور اندر آکے بولا۔ ممی ممی، پڑوس کی آنٹی التجا کئے گڑگڑا رہی ہیں اور خدا کا واسطہ دے کر آپ سے مشین نہ چلانے کی التجا کر رہی ہیں وہ کہتی ہیں کہ مشین چلانے سے ان کی دیواروں کی مٹی بھربھر کر گرنے لگی ہے اور انھیں ڈر ہے کہیں ان کا گھر ہی نہ ڈھہ جائے اس لیے وہ بنتی کر رہی ہیں کہ آپ ان کے چھوٹے چھوٹے بچوں اور کچے مکان پر ترس کھائیں اور مشین نہ چلائیں۔ پڑوسن کی اس جائز شکایت کو بیگم یہ کہہ کر ٹال گئیں کہ اس کلموہی کو ہمارے ہر اچھے کام سے بیر ہے اور اب تو یہ بدذات ہماری مشین سے بھی جلنے لگی ہے اس طرح اس طرح وہ مشین چلاتی رہیں۔ نصف گھنٹہ بعد ہوا یہ کہ ہمارے دروازے پہ سارا محلہ جلوس کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ سب کانوں پہ ہاتھ رکھے چلا رہے تھے مشین بند کرو۔ مشین بند کرو۔ رحم کرو۔ رحم کرو.... ہم دروازے پر لپکے۔ ہمیں مطلق دیکھ کر جلوس تشدد پہ اتر آیا۔ پہلے تو لوگوں نے ہمیں خوب ٹھونسے دیئے اور پھر تھپڑ، گھونسوں سے مدارات کی۔ ہم پھٹے کپڑوں کے ساتھ بدحواس بیگم کے پاس پہنچے اور ہماری حالت کا معائنہ کروایا اور تمام ماجرا سنایا تب کہیں وہ مشین سے الگ ہوئیں۔

اس طرح جب جب ہمارے گھر میں اس مشین کے ذریعے سلائی ہوتی ہے تب تب ہمارے کپڑے پھٹتے ہیں، پڑوسیوں کے ساتھ ہاتھا پائی ہوتی ہے اور گالی گلوچ بھی۔

ہماری اس خفت اور جھگڑے فساد سے تنگ آکر ایک دن ہم مشین لیے کلو بھائی کی دوکان پر گئے اور انھیں مشین تھماتے ہوئے کہا، کلو بھائی محلے میں ہمارے سوشل بائیکاٹ کی تیاریاں اپنے شباب پر ہیں اس لیے اب اس دشمنِ جاں غیرتِ ناہید کو دوبارہ اس کی نانی کے پاس بھجوا دیں یا اپنی بیٹیاں میں شامل کر لیجیے اور نہیں سکھنے سے بچنے دیجیے۔

●●

افتخار وصی (بیتیا)

سراسر بحث لاطائل یہ ناہنجار کرتے ہیں
مگر دعویٰ ہے مشقِ شوخیٔ گفتار کرتے ہیں

نہ جب تک لکشمی دیوی کا وہ دیدار کرتے ہیں
بڑے بابو کہاں فائل سے آنکھیں چار کرتے ہیں

ٹپک پڑتی ہیں بیگم سے دھڑک ہر ایک مصرعے پر
غزل کے واسطے ہم جب زمیں ہموار کرتے ہیں

ہمارے دم سے جن کی آبرو بزمِ سخن میں ہے
وہ لونڈے چار دن کے ہم سے آنکھیں چار کرتے ہیں

فقط وعدوں کے جھولے پر جھلائیں آپ جنتا کو
یہ سوئے شیر ہیں ناحق انھیں بیدار کرتے ہیں

جنھیں مرغوں کی ککڑوں کوں سے بھی پرہیز رہتا تھا
سنا ہے ان دنوں انڈوں کا کاروبار کرتے ہیں

ہمیں فرصت کہاں گھر والی سے اب پیار کرنے کی
فقط شعروں میں ہم ذکرِ لب و رخسار کرتے ہیں

ولیمہ ہو کسی کا یا کسی کی فاتحہ خوانی
جنابِ شیخ دسترخوان پر یلغار کرتے ہیں

یہ کتّے جو سرِ راہ بھونکتے ہیں اے وصی تم پر
اگر ہے کاٹنا تو شور کیوں بے کار کرتے ہیں

منظور علی عاقب (بھوپال)

قد گھٹائے گرانی کی اونچائی نے
مار ڈالا غریبوں کو مہنگائی نے

خود ہی آکر کہا ایک بلوائی نے
آپ کا گھر بتایا تھا سی آئی نے

چائے خود وہ پلانے ہمیں لے گیا
بل ادا ہم سے کروا دیا بھائی نے

فاتحہ پڑھنے ہم دادا جی کی گئے
پر دکاں ہی بڑھا دی اس حلوائی نے

خوب جم کر حجامت بھی کی دوستو
اور روپے بھی دس لے لیے نائی نے

جھوٹ کا تب سے ہی بول بالا ہوا
جب سے چپ سادھ لی یار سچائی نے

بعد مدت کے میں خود سے عاقب ملا
اچھا موقع دیا آج تنہائی نے

لاغر نرملی

چوٹ جب لگتی ہے دل پر تو غزل ہوتی ہے
جھڑکیاں دیتا ہے افسر تو غزل ہوتی ہے

شاعری فن ہی نہیں بلکہ ہے کرتب بھی میاں
جاگتے رہیے گا سو کر تو غزل ہوتی ہے

سر ہو ننگا تو یہ جو بیوی کا تو ہوتی ہے ہزل
اور محبوبہ کا ہو سر تو غزل ہوتی ہے

ڈالو اوروں کو جو ٹوپی تو بنو گے شاعر
جیسے مفت کی پی کر تو غزل ہوتی ہے

استعمال اس لیے کرتے نہیں ہم مچھر دان
کہ ستاتے رہیں مچھر تو غزل ہوتی ہے

چین سے سونا ہے شاعر کا تضیعِ اوقات
اونگھتے رہیے گا شب بھر تو غزل ہوتی ہے

شاعری کیجیے عاشق شرط اے لاغر
برسیں دیوانے پہ پتھر تو غزل ہوتی ہے

جہانگیر انس میمن (بہار)

سفر وسیلہ...

حسنِ اتفاق سے ایک دن کسی کتاب میں ہم نے یہ فقرہ دیکھ لیا کہ "سفر وسیلۂ ظفر ہے"۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اس دن سے سفر کا سودا پیر تسمہ پا بن کر ہمارے دماغ سے چمٹ گیا۔ سونا، جاگنا، کھانا، پینا، ہنسنا، بولنا سب کچھ حرام ہو کر رہ گیا۔ بس ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی کہ کسی دور دراز مقام کے سفر پر روانہ ہو کر ظفر و فتح مندی سے ہمکنار ہوں۔ جلتی پر تیل ہمارے اس شوق کی آگ میں آئے دن شائع ہونے والے سفرناموں اور سیاحت ناموں نے بھی کام کیا۔ سفر میں ہمیں دوہرے فائدے نظر آئے۔ ظفر و فتح مندی سے ہمکنار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ آدمی صاحبِ تصنیف بھی بن جاتا ہے اسی کو کہتے ہیں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام۔

گھر والوں سے جب ہم نے اپنے سفر پر جانے کا ذکر کیا تو کسی نے یقین نہیں کیا۔ "قومی ایکتا قائم کرو" کے نعرہ کی طرح ہمارے سفر پر جانے کے اعلان کو بھی ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا۔ گھر والوں کی اس عدم دلچسپی پر ہم جامہ سے باہر ہو گئے۔ نتیجتاً ہمارے شوقِ سفر میں ضد کی بھی آمیزش ہو گئی اور ہم سفر کے انتظام میں دل و جان سے مصروف ہو گئے۔ اب گھر والوں کے کان کھڑے ہوئے۔ طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ ہماری دماغی صحت پر شک کیا جانے لگا لیکن ہم دل میں پختہ ارادہ کر چکے تھے کہ خواہ کچھ بھی ہو جائے اپنا پروگرام ملتوی نہیں کریں گے۔ جب پانی سر سے اونچا ہو گیا یعنی ہم "مجسم سفر" نظر آنے لگے تو والد صاحب نے دریافت کیا "کیا سفر پر جانے کا ارادہ پکا ہے؟"

ہم نے جواب دیا "مرد کی زبان ایک ہوتی ہے"

ہمارا یہ بیباکانہ جواب سن کر بیوی نے زیرِ لب کہا گویا کہ "اب آپ خود کو مرد سمجھنے لگے ہیں" یہ جملہ میرے علاوہ کسی اور نے نہیں سنا۔

ہمارا جواب سن کر والد صاحب نے کہا "سفر پر جانے کا سودا کیوں سوار ہو گیا ہے؟ کیا تمھیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟"

ہم نے جواب دیا "اپنی زندگی پر چھائے ہوئے جمود کو توڑنے اور بیکاری کے دائرہ سے باہر نکلنے کے لیے ہمارا سفر پر جانا ناگزیر ہے"

والد صاحب نے طنز سے پوچھا "یہ سفر اندرونِ ملک تک ہی محدود رہے گا یا اس کا تعلق بیرونِ ملک سے

سے بھی ہوگا؟"

والد صاحب غالباً یہ سوچ رہے تھے کہ ہمارا ارادہ مشرق وسطیٰ جاکر روپے کمانا ہے۔ لیکن ہم نے یہ کہہ کر ان کے خیال کی تردید کردی کہ "فی الحال تو کلکتہ جانے کا ارادہ ہے ہوسکتا ہے بعد میں بیرون ملک کے سفر کا بھی پروگرام بن جائے۔"

والد صاحب نے نصیحت کرتے ہوئے کہا "خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔" آداب گفتگو کے پیش نظر ہم نے زبان سے والد صاحب کو کوئی جواب نہیں دیا لیکن دل ہی دل میں یہ ضرور سوچا کہ "گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں۔"

آخر وہ دن بھی آ پہنچا جس دن کو ہم نے سفر کے لیے فال نکال کر اور مولوی بقراط سے مشورہ کرکے منتخب کیا تھا اور یہی نہیں بلکہ پنڈت ملوطا پانڈے کو ہاتھ کی ریکھا دکھلا کر ہم نے یہ تشفی کر لی تھی کہ یہ دن سفر کے لیے مبارک اور فائدہ بخش ہے۔ چونکہ زندگی میں پہلی دفعہ ہم نے سفر کا پروگرام بنایا تھا اور کسی قسم کا RISK نہیں لینا چاہتے تھے اور اب یہ سفر ہماری عزت اور وقار کا بھی مسئلہ بن گیا تھا اس لیے ہر طرح کی احتیاط برتنے پر مجبور تھے۔

گھر میں صبح سے ہی صف ماتم بچھی ہوئی تھی جیسے ہم سفر پر نہیں بلکہ مقتل میں جارہے ہیں۔ والدین کا رنجیدہ ہونا تو فطری بات تھا لیکن بیوی کی آنکھوں میں آنسو کے قطرے دیکھ کر ہمیں تعجب ہو رہا تھا۔ کہاں گھر نہ چھوڑنے پر طعنے دینا اور اب گھر چھوڑنے کا ارادہ کیا تو آنسو بہنے لگے۔ بیوی کے رویہ میں یہ تبدیلی دیکھ کر چند لمحوں کے لیے ہمارا ارادہ متزلزل ہوگیا لیکن فوراً ہم نے اپنے دل کو سخت کرلیا کیونکہ اب یہ ہماری مردانگی کا مسئلہ تھا۔ ہمیں ثابت قدم دیکھ کر بیوی نے پوچھا "مجھے کس پر چھوڑ کر جارہے ہیں؟"

ہم نے کہا "تمہیں خدا کے حوالے کر رہا ہوں۔"

بیوی نے غالب کی طرح فلسفیانہ انداز میں کہا "خدا نے تو مجھے آپ کے حوالے کیا ہے۔"

جی میں آیا کہوں کہ خدا نے نہیں ہماری شامت اعمال نے تمہیں ہمارے حوالے کیا ہے لیکن ایسی باتوں کا یہ موقع نہیں تھا اس لیے ہم نے دل پر جبر کرکے خاموشی اختیار کرلی اور اپنا سفری بیگ اٹھایا جو اس وقت "زنبیل عمرو" سے مشابہ تھا۔ ماں نے بے شمار دعائیں دیں۔ والد صاحب نے سفر میں پیش آنے والی مشکلات سے آگاہ کیا اور ثابت قدم رہنے کی تلقین کی۔ بیوی نے پیار کا تحفہ پیش کیا خاندان کے دیگر افراد نے بھی اپنے اپنے طور سے سلامتی سفر کی دعائیں دیں۔

غرضکہ محبت اور دعاؤں کے سایہ میں گھر سے رخصت ہوکر ہم اسٹیشن پہنچے اور ٹکٹ کاؤنٹر کے سامنے لگی لمبی لائن میں جسے بطور جدت کیو کہا جاتا ہے، کھڑے ہوگئے اور کافی دیر تک کھڑے رہے یہاں تک کہ پیر شل ہوگئے لیکن کاؤنٹر تک رسائی "ہنوز دلی دور است" والا معاملہ تھا۔ تنگ آکر ادھر ادھر جھانکنا شروع کیا تو پتہ چلا کہ کیو میں صرف ہم جیسے شریف اور سادہ لوح انسان صبر ایوب کا نمونہ بنے کھڑے ہیں اور چالاک لوگ بغلی گھونسا بنے ہوئے ہیں۔ بکنگ کلرک کو ان سے فرصت ہی نہیں ہے کہ کیو میں لگے لوگوں کی طرف دھیان دے۔ ہم نے

کیوں میں کھڑے ہونے پر لعنت بھیجی اور بغلی گھونسہ مار کر ٹکٹ حاصل کر لیا اس کے لیے ہمیں ٹکٹ کی قیمت کے علاوہ دو روپے بطور خراج ادا کرنا پڑے۔

ٹکٹ لے کر ہم خراماں خراماں پلیٹ فارم پر پہنچے اور دل تھام کر گورکھپور ہوڑہ ایکسپریس کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد انکوائری آفس سے اعلان ہوا "گورکھپور ہوڑہ ایکسپریس سے یاترا کرنے والے یاتری کان دھیان دیں۔ لائن میں کچھ گڑبڑ ہونے کے کارن گورکھپور ہوڑہ ایکسپریس اپنے ٹائم سے آٹھ گھنٹے ولمب سے چلنے کا سوچنا ملی ہے۔"

یہ اعلان ہمارے شوقِ سفر پر بم بن کر گرا۔ انتظار خواہ ٹرین کا ہو یا محبوب کا، بڑا ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ انتظار کے یہ آٹھ گھنٹے کیسے گزرے اس کا اندازہ شبِ فرقت کا مارا کوئی عاشق ہی لگا سکتا ہے۔

اپنے ٹائم سے یعنی وقت مقررہ سے آٹھ گھنٹے کی تاخیر سے ٹرین اپنے ساتھ حشر کا منظر لیے ہوئے پلیٹ فارم پر وارد ہوئی۔ قلیوں کی دھکم دھکا، خوانچہ والوں کے شور و غل نے کان کے پردے کو مفلوج کر دیا۔ مسافروں کی افراتفری "بعنوان اکھاڑے" کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ہم نے انجن سے لے کر گارڈ کے کمپارٹمنٹ تک مارچ کیا لیکن کہیں سوئی سمانے کی گنجائش نظر نہیں آئی فرسٹ کلاس میں رش کچھ کم تھا لیکن ہمارے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ تھا فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لینا ہمارے بس کی بات نہیں تھی اور نہ ہی ہمارے اندر اتنی ہمت تھی کہ سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ لے کر فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کا رسک لیتے۔ ایک کمپارٹمنٹ کو بہت حد تک خالی پا کر سوار ہونا چاہا کہ اندر گرجتی ہوئی آواز آئی "اندھے ہو نظر نہیں آتا کہ ملٹری کمپارٹمنٹ ہے۔" گرجتی ہوئی آواز سن کر ہمت پست ہو گئی۔ وطن کے پاسبانوں کے کمپارٹمنٹ میں ایک عام مسافر کا سوار ہونا بدتمیزی اور وطن کے پاسبانوں کی توہین نہیں تو اور کیا ہے اور ہم سب کچھ کر سکتے ہیں لیکن کسی کی توہین نہیں کر سکتے۔

مسافروں کی کثرت ریلوے کی آمدنی میں خسارے کی رپورٹ کی نفی کر رہی تھی لیکن اس وقت ریلوے کے بجٹ پر اظہار خیال کرنے کے بجائے کہیں جگہ حاصل کرنا ضروری تھا۔ ٹرین چلنے کا وقت جیسے جیسے قریب آ رہا تھا مسافروں کی بیتابی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہر شخص اپنے اپنے طور سے جگہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں تھا۔ ادنیٰ و اعلیٰ کی تمیز مٹ گئی تھی۔ کوئی قلی کی خوشامد کر رہا تھا۔ کوئی گارڈ سے مدد کا خواہاں تھا۔ کوئی ٹی سی کو مکھن لگا رہا تھا کوئی چارا نہ دیکھ کر ہم نے بھی ایک آر پی ایف کے جوان کا دامن تھاما جس نے پندرہ روپے کے عوض لیڈیز کمپارٹمنٹ میں ہمیں سوار کرا دیا۔ ہم جیسے کچھ اور سفر کے مارے آر پی ایف کے جوانوں کے طفیل ہی لیڈیز کمپارٹمنٹ میں پہلے ہی سوار تھے جنھیں دیکھ کر ہمیں قدرے تشفی ہوئی کہ اس غیر اصولی فعل کی سزا سبھی مل کر بھگت لیں گے۔

تین اسٹیشن بخیر و خوبی گزر گئے چوتھے اسٹیشن پر جب ٹرین رکی تو ایک ٹی سی دو پولس والوں کے ساتھ لیڈیز کمپارٹمنٹ میں داخل ہوا۔ ہم مردوں کو لیڈیز کمپارٹمنٹ میں دیکھ کر اس نے پولیس والوں کو حکم دیا "انھیں عزت کے ساتھ اتار دیا جائے" اس وقت ہماری حالت قابل دید تھی۔ ہمیں شرم سے پانی پانی ہو جانا تھا مگر پسینہ ہی شرابور کر گیا۔ اور آپ تو یہ جانتے ہیں کہ آج کے دور میں کوئی کسی پر رحم بھی بلاوجہ نہیں کرتا۔

المختصر یہ کہ کرائے سے دوگنا کرایہ دے کر اور ہزاروں پریشانیاں اٹھا کر ہم ہوڑہ پہنچے۔ ٹرین جب ہوڑہ اسٹیشن پر رکی تو ہماری خوشیوں کا ٹھکانہ نہ تھا۔ جلدی سے کمپارٹمنٹ سے اترے۔ تیز قدموں سے پلیٹ فارم کی مسافت طے کی اور مین گیٹ پر پہنچے اور جب ٹکٹ نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جیب کٹی ہوئی تھی اور ٹکٹ کے ساتھ منی پرس بھی غائب تھی۔ ہم نے ٹکٹ چیکر سے لاکھ منت سماجت کی اپنی بپتا کا یقین دلایا لیکن اس نے ہماری باتوں پر یقین نہیں کیا — اور اس وقت ہم سرکاری مہمان خانے میں ہیں اور اپنی قسمت کے ساتھ اس کتاب پر بھی ماتم کر رہے ہیں جس میں یہ فقرہ دیکھ کر کہ "سفر وسیلۂ ظفر ہے" ہمارے اندر سفر کا شوق پیدا ہوا تھا۔ ہمارے لیے تو سفر وسیلۂ جیل ثابت ہوا۔

ماجد شمیم (ایڈوکیٹ ۔ بیدر)

ٹی وی نے ہم کو نکمّا کر دیا......

آج ہمیں اس بات کا شدّت سے احساس ہو رہا ہے کہ ہم دن بدن نکمّے ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ دن ہوا ہوئے جب ہم کام کے آدمی کہلاتے تھے اور ہر ادبی محفل میں مدعو کیے جاتے تاکہ سامعین کو اپنے مضامین سے محظوظ کریں۔ مضامین اسی وقت لکھے جاتے ہیں جبکہ آدمی پڑھا لکھا ہو اور لکھا اُس وقت جاتا ہے جب کچھ فرصت کے لمحات ہاتھ آئیں۔ مگر آج لمحات ہیں کہ ہمارے ہاتھ سے پھسلے جا رہے ہیں اور ان پر ٹی وی کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔ اگر آج چچا غالب ہوتے تو شاید وہ بھی عشق کی بجائے ٹی وی کا شکار ہو جاتے۔ اب جبکہ مجلس ادب کی جانب سے یہ حکم ملا ہے کہ ہم شریک محفل ہو کر کچھ سنائیں تو ہمارا حال یہ ہے کہ عدالت اور کالج کی مصروفیات کے بعد جو کچھ وقت بچتا ہے وہ ٹی وی کی نذر ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ٹی وی کے پروگرام نے ہماری ساری مصروفیات کو اتھل پتھل کر رکھا ہے۔ خیال تھا کہ ہفتہ اور اتوار کی چھٹیوں میں کچھ نہ کچھ لکھ ہی لینگے۔ مگر ناشتہ کے بعد پتہ چلا کہ آج ایک روزہ کرکٹ میاچ، انڈیا اور ویسٹ انڈیز کے درمیان ہے تو ہمارے لکھنے لکھانے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی اور ہم ٹی وی کے طلسم میں کھو گئے۔

لکھنے کی شدید خواہش اور ٹی وی کا شدید اثر ہماری نیند پر بھی اثر انداز ہونے لگا ہے۔ دوستوں سے کیے ہوئے وعدے یاد نہیں رہنے لگے ہیں۔ چنانچہ ہمارے دوست ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں جو ہمارے نکمے پن کا ثبوت ہے۔ ہمارے قریبی عزیز کے گھر شادی تھی۔ اُنھوں نے ساری تیاریاں کر لی تھیں۔ اور ہمیں یہ ذمہ داری سونپی تھی کہ ہم آتے ہوئے قاضی صاحب کو ساتھ لائیں۔ شادی اتوار کے دن بعد عصر مقرر تھی۔ اور ظاہر ہے فرصت ہی فرصت تھی۔ اور ہمیں جاتے ہوئے قاضی صاحب کو ساتھ لیجانا تھا۔ چنانچہ ہم نے قاضی صاحب کو مطلع کر دیا۔ دوپہر کھانے کے بعد ہم ذرا لیٹ گئے شاید تین بج رہے تھے۔ ہماری چھوٹی صاحبزادی نے ٹی وی آن کیا۔ دلیپ کمار کی ہندی فلم "نیا دور" چل رہی تھی معلوم ہوا کہ شام میں اولمپک گیمس کو ڈائرکٹ ٹیلی کاسٹ کیا جائے گا اس لیے فلم دوپہر میں ہی دکھلائی جا رہی تھی۔ بادلِ نخواستہ ہم بھی فلم دیکھنے پر مجبور ہو گئے چونکہ فلم دلیپ صاحب کی تھی۔ فلم کی کہانی نے اتار چڑھاؤ میں ہم کچھ اس طرح کھو گئے کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا...... اذان کے ساتھ چونکے اور چھ بجنے کے ساتھ ہی یاد آ گیا کہ ہمیں بعد عصر قاضی صاحب کو ساتھ لیجانا تھا۔ پھر کیا تھا جوں توں کر کے ہم اپنے عزیز کے گھر پہنچے۔ پہنچنے سے قبل قاضی صاحب کے پاس جانا نہیں بھولے۔ مگر وہ موجود نہیں تھے۔ محفلِ عقد آراستہ تھی اور قاضی صاحب خانۂ نکاح دستے رہنے تھے۔ ہماری جان میں جان آئی ۔۔۔ دل کو اطمینان ہوا کہ چلو بعد عصر نہ سہی بعد مغرب تو عقد

ہوتا ہے۔ مگر ہماری ذراسی تاخیر نے شادی کے سارے انتظامات کو درہم برہم کر دیا تھا۔ جب ہم اپنے عزیز کو مبارکباد دینے کے لیے اُٹھے تو وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑے اور ہماری شان میں ہماری اس غیر ذمہ دارانہ حرکت پر اُردو اور دکھنی زبان کے سارے مروجہ الفاظ جو کاہلی اور سستی کے بارے میں ہیں استعمال کر ڈالے اور ہم خاموش سنا کیے۔ وہ دن اور آج کا دن پھر اُن محترم نے ہم سے کوئی کام نہیں لیا۔

پھر ایک واقعہ ظہور میں آیا۔ ہمارے ایک بے تکلّف بزرگ کرم فرما سے بہت دنوں بعد سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ بڑے تپاک سے ملنے کے بعد شکایتاً فرمایا کہ میاں۔۔۔۔۔ آج کل کہاں رہتے ہو۔ نظر ہی نہیں آتے۔ پھر کچھ سوچ کر فرمایا کہ شاید گھر میں ٹی وی آ گیا ہے۔ پھر آپ نے ایک لکچر دے ڈالا کہ ٹی وی کے پروگرام نے انسان کو ہاؤز اریسٹ کر کے رکھ دیا ہے۔ اگر یہی لچھن رہے تو وہ دن دور نہیں جب آدمی کاہل نکمّا اور انسان بیزار بن کر رہ جائیگا۔ ہمیں ان کی باتوں سے انکار نہیں تھا چونکہ ہمارا روز کا یہ مشاہدہ ہے کہ ٹی وی کے پروگرام کے وقت گھر پر دستک ہوتی ہے تو پہلے تو سنی ان سنی کرنے کی کوشش کرتے ہیں جب دستک یا بل (BELL) مسلسل ڈسٹرب کرتی ہے تو بڑوں کے چہروں پر ناگواری اور بچے بیزار نظر آتے ہیں۔ مگر کوئی اپنا پسندیدہ پروگرام چھوڑ کر اٹھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ تب گھر کے سب سے چھوٹے بچے پر ڈانٹ پڑتی ہے تو وہ منہ لٹکائے دروازے پر جاتا ہے۔ یا تو وہ ادھوری بات سُن کر بھاگ آتا ہے یا اُن صاحب کو ٹکا سا جواب دیتا ہے کہ گھر پر کوئی نہیں ہے۔ (اس کا انحصار زیادہ تر پروگرام کی دلچسپی پر ہے) ہاں تو ہمارے ان محترم دوست کا اصرار تھا کہ کبھی تو گھر آئیں تاکہ لطیفہ گوئی کی محفل جمے۔ چنانچہ ایک دن کسی منسٹر کی موت پر عدالت کے بند ہو جانے کی وجہ سے ہم اُن کے گھر پہنچ گئے۔ مکان کے کمپاؤنڈ میں چار چھ بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ کھیل کیا رہے تھے۔ اظہر کپل اور ارشد بننے کی کوشش میں لگے تھے ہم نے ایک بچے کو بہ مشکل اپنے پاس بلایا اور پوچھا بیٹے آپ کے دادا حضرت کہاں ہیں؟ بچے نے پہلے تو ہماری شخصیت کو جانچا پرکھا اور تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ہم نے کہا کہ ہمیں آپ کے دادا حضرت نے بلایا ہے۔ بچے نے حیرت سے پوچھا دادا حضرت نے آپ کو بلایا ہے۔ لیکن ہم سے تو کہا ہے کہ کوئی بھی آئیں تو کہدینا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ ہم نے کہا کہ شاید وہ کسی اور کے لیے کہا ہوگا۔ ہمیں تو بہت ضروری کام سے بلوایا ہے چنانچہ ہم سیدھے عدالت سے ادھر چلے آرہے ہیں۔ بچے نے معصومیت سے کہا کہ وہ ضروری کام یقینی وی سی آر ہی ہوگا۔ ہم نے کہا وی سی آر کیا مطلب بچے نے کہا جی دادا جان وہی دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں یقین نہیں آیا کہ ٹی وی کی شکایت کرنے والی شخصیت وی سی آر دیکھ رہی ہے۔ ہم نے سوچا چلو اچھے رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں۔ بچہ ہمیں دیوان خانے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد محترم جھینپے جھینپے تشریف لائے۔ شاید بچے نے انھیں ساری بات بتلا دی تھی۔ ہم انھیں اس حالت میں دیکھ کر کہا تھے سہ

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ ؎ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

محترم نے اپنی صفائی میں فرمایا۔ ۔۔۔۔ صاحب! بچہ باہر سے وی سی آر لیجا ہے ذرا اسی کو چیک کر رہا تھا ہم نے کہا سہ

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

اس واقعہ کے بعد سے ہمارے محترم دوست ہم سے کترا رہے ہیں۔ ایک دن ہم اپنے آفس میں بیٹھے ایک کیس کی تیاری میں منہمک تھے کہ ایک بزرگ۔۔۔۔ تشریف لائے اور ہم سے دو ور۔۔۔۔ کے نام درخواست لکھنے کی فرمائش کی ہم نے سمجھا کہ شاید

کو شکایت لکھوانا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سن کر بہت تعجب ہوا کہ موصوف ٹی وی پروگرام کی لسٹ منگانا چاہتے ہیں۔ ہمیں حیرانی دیکھ کر فرمایا کہ وہ اپنی بچی کی شادی کی تاریخ مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا قبلہ آپ کی دختر نیک اختر کی شادی کا ٹی۔وی پروگرام سے کیا تعلق . . . . ؟ کیا آپ شادی کی ویڈیو ریکارڈنگ کروانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ٹی۔وی پر لاحول پڑھ کر فرمایا اجی جناب ٹی وی نے ہم لوگوں کو دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ شادی کا وقت نکلا جارہا ہے۔ لیکن مہمان ہیں کہ ٹی۔وی کی دلچسپیوں میں گم! ۔ کیا آپ نے اخباروں میں نہیں پڑھا۔ رامائن کے پروگرام کے اوقات میں ڈائرکٹروں تک نے آپریشن تھیٹروں میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ آپ نے خود نہیں دیکھا کہ سارے کام بالائے طاق رکھ کر لوگ کتنی پابندی کے ساتھ اس پروگرام کو دیکھا کرتے ہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ شادی کی تاریخ ایسی مقرر کروں جبکہ ٹی۔وی پر کوئی خاص پروگرام نہ ہو۔ یہ سن کر ہم ان کی دانائی اور دور اندیشی کے قائل ہو گئے۔

ہم بعض دفعہ سوچتے ہیں کہ ٹی وی نے ہمیں بالکل گوشۂ گمنامی میں پہنچا دیا ہے۔ اب ہم ادبی و شعری محفلوں سے غیر حاضر، مذہبی و سیاسی جلسوں سے کنارہ کش، شادی بیاہ کی تقاریب کا بائیکاٹ کرنے کے علاوہ دوستوں کی محفلوں سے بھی دور رہنے لگے ہیں۔

ہم پر یہ شعر پوری طرح صادق آتا ہے:

ٹی وی نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

جمہوریت پسند منگیتر

نظام احمد قریشی (بھوپال)

عجب اک حادثہ گزرا ہے مجھ پر — کہ جس کی یاد تڑپاتی ہے اکثر
یہ میری جوانی کا ہے قصہ — کہ راتیں حسیں تھیں دن تھے خوشتر
گزرتی تھی مزے میں زندگانی — غمِ جاناں نہ دوراں کا تھا کچھ ڈر
ہوئی خواہش یکایک والدہ کی — کہ میں دیکھوں گی سہرا اس کے سر پر
تکمیل خوشی پھر ان کی خاطر — ہوئے راضی بزرگ و خرد اس پر
قریب و دور تھا چرچا اسی کا — کہ مل جائے مناسب کوئی دختر
ہوئی اک جا بالآخر بات پکی — پسند آئی مجھے اپنی منگیتر
شریف و نیک و نستعلیق و خوش خو — پھر ان سے بڑھ کے تھی تعلیم زیور
پری رو، سرو قد، آنکھیں غزالی — دلوں کو باندھتی تھی زلفِ عنبر
تکلم پہ فدا عقدِ ثریا — تبسم جاں فزا اور روح پرور
نہ جانے اس کے کیا دل میں سمائی — کہ وہ بولی میں لوں گی ووٹ اس پر
جمع کرکے سہیلیوں کو اس نے — مجھے پھر ان کو دکھلایا بلا کر
نہ کچھ انجام کی مجھ کو خبر تھی — گیا میں سر کے بل یوں کوئے دلبر
کہا اس نے یہ بیٹھے ہیں جو حضرت — یہی ہیں میرے ہونے والے شوہر
مگر میں جب قبول ان کو کروں گی — کہ اکثریت کی ہوگی رائے اس پر
طلعت بولیں کہ قد چھوٹا ہے ان کا — کہا سلمیٰ نے صورت سے ہیں جوکر
کہا عذرا نے ہے کچھ رنگ پھیکا — سحر بولیں نہیں ہیں بال سر پر
قدیمی طور ہیں نسرین بولیں — کہا نجمہ نے مرگھلے ہیں مسٹر
رہا کچھ دیر تک ہنگامہ یونہی — ہوا پھر فیصلہ دس میں سے چھ پر
موافق دو ووٹ آئے چار میرے — مخالف چھ رہے قسمت کا چکر
کہا اس نے کہ اب مجبور ہوں میں — جمہوریت میں ہوتا ہے یہ اکثر
اگرچہ مجھ کو ہے انکار اس سے — طبیعت ہے مگر میری مکدر
کچھ عرصے تک جو نسبت رہ چکی ہے — اسی باعث ہے دل غمگین و مضطر
دعا ہے یہ کہ ربّ العالمیں اب — تحمل کا مجھے بھی کر دے خوگر
یہ کہہ کر وہ گئی سکھیوں کو لے کر — چلا آیا ادھر میں دل پکڑ کر
بہت پھر اس کو سمجھایا سبھی نے — نہ مانی وہ مگر تھی ایک خودسر
نظامِ خستہ دل کیا اور کرتے — بچارے رہ گئے بس ہاتھ مل کر

محمد جمیل انصر (ناگپور)

چلو مسکہ لگائیں!

اس پوری کائنات میں صرف حضرتِ انسان ہی اللہ رب العزت کی ایک ایسی عجیب و غریب مخلوق ہے جس کے دل و دماغ میں ہر پل ہر لمحہ کوئی نہ کوئی وسوسہ پرورش پاتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی خیال آتا جاتا رہتا ہے اور جہاں تک ایک رائٹر کے دماغ کا تعلق ہے یوں سمجھیے کہ وسوسوں اور بے جا خیالوں کا مسکن رہتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اس دن اچانک اپنے ذہن میں بھی ــ " چلو ــ مسکہ لگائیں" جیسے خیال کا اسوقت جنم ہوا جب کہ ایک ادارے کی جانب سے کچھ نااہلوں کو " گلی رتن"، " کوچہ رتن "، " محلہ رتن " اور " شہر رتن " جیسے خطابات سے نوازتے دیکھا تو موہن ہی سے پوچھ بیٹھا کہ انھیں یہ اعزازات کیسے ملے ؟ تب فوراً ہی جواب ملا ــ " کیا تم ان کی حرکتوں سے واقف نہیں . . . . ارے یہ مسکہ لگانے میں بہت ماہر ہیں " اور پھر موہن نے ہم سے بھی کہا کہ ــ " ذرا تم بھی مسکہ لگا کے دیکھو . . . . . انہیں تو چلو اعزازات مل رہے ہیں۔ تم تو ٹھوک کے بھاؤ میں بڑے بڑے بنا دیے جاؤ گے " بس اسی وقت یہ خیال ذہن نشین ہوا کہ ــ چلو مسکہ لگائیں !

ویسے مسکہ لگانا کوئی آسان کام نہیں یہ ایک مشکل فن ہے جو دیگر فنون کی طرح کسی اچھے انعام یافتہ مسکہ باز استاد کی سرپرستی میں ہی اچھی طرح سیکھا جا سکتا ہے ۔ آج کتنے ہی لوگ اپنے اطراف میں لوگوں کو مسکہ لگاتے اور اس سے حاصل ہونے والے فائدوں کو دیکھتے ہیں ۔ تب وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ــ چلو اب ہم بھی مسکہ لگائیں اور کچھ فائدے اٹھائیں ــ لیکن صاحب نقل کے لیے عقل ضروری ہے اور ہوتا بھی یہی ہے کہ بے چارے دوسروں کی دیکھا دیکھی مسکہ لگانے نکل تو پڑتے ہیں لیکن جب لوٹتے ہیں تو گھر کے لوگوں کو ان کی " مرہم پٹی " کرنی پڑتی ہے بالکل اسی طرح جس طرح ہمارے شہر کے ایک اردو ہفت روزہ کے ایڈیٹر صاحب کی دوسروں کو مسکہ لگانے کی علت میں درگت بنی تھی ایڈیٹری کے زعم میں انھوں نے گوشت خوری پر پابندی عائد کرنے کا مطالبہ کیا تھا ۔ محض اس لیے کہ ویجیٹیرین قسم کے لوگ ان کی تعریف کریں گے ۔ لیکن ہوا یہ کہ ویجیٹیرین طبقے نے ان کا وہ آرٹیکل ہی نہ پڑھا ۔ البتہ شہر کے سارے قصاب اس ایڈیٹر کی تلاش میں ہاتھوں میں چھرے لیے نکل پڑے ۔ دیکھا آپ نے ! دوسروں کو مسکہ لگانے کی قیمت کتنی مہنگی پڑی ؟

جیسا کہ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ مسکہ بازی کا فن آسان نہیں ۔ اس کو سیکھنے کے لیے استاد کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اس خیال کے آتے ہی ہم ایک استاد کی تلاش میں لگ گئے لیکن استاد تلاش کرنے میں ہم کو زیادہ وقت نہیں لگا ــ ہماری نظر ایک ریٹائرڈ لیکچرر پر پڑی جن کے متعلق ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ آپ نے کس موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی لیکن ان کی حرکات و سکنات سے یوں لگتا تھا کہ مسکہ لگانے میں ماہر ہیں ۔ یا عین ممکن ہے کہ انھوں نے مسکہ لگا کر ہی ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی ہو ۔ بہرکیف وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں مجھے ان کی سند اور ادبی خدمات سے کہیں زیادہ ۔ ان کی مسکہ بازی

عزت ہے۔ بس اسی خیال سے ہم نے مسکہ بازی کے فن کی خوبیاں و باریکیاں سیکھنے کے لیے انھیں استاد تسلیم کرتے ہوئے بیعت اختیار کی۔ ہمیں ان کے ساتھ رہتے ہوئے اس بات کا یقین ہو گیا کہ کچھ ہی دنوں میں ہم ضرور "فن مسکہ بازی" پر ایک ضخیم کتاب لکھ سکیں گے۔

لیکن جناب! جب شامت آتی ہے تو وقت کا انتظار نہیں کرتی۔ ایک روز ہمارے والد صاحب کو ہمارے اس بونگ مسکہ باز شاعر صاحب کے تعلقات کا علم ہوا تو وہ ہم پر بری طرح برس پڑے ــــ "تمھیں شرم نہیں آتی اس نیچ حرام خور کے ساتھ رہتے ہوئے۔" ہم نے شاعر صاحب کو صحبت کی دیر بتائی۔ اس پر والد صاحب نے فرمایا:

"دیکھو بیٹا ــــ ہم بھی شاعروں میں تھوڑے سے بہت سوشیل فیلڈ بھی اختیار کیے ہیں۔ یہ ہیں لیکن پانچ انگلیاں ایک سمان نہیں ہوتیں، جس قوم میں مسکہ بازی کی خصلت ہے، غیرت و حمیت کا جذبہ ہے، رگوں میں خاندانی خون گشت کر رہا ہے وہ کبھی بھی مسکہ بازی پسند نہیں کرتا کام اللہ کی قدرت پہ بھروسہ کرتا ہے اور آگے طرف بڑھتا ہی رہتا ہے...... یعنی انسان کے دل و دماغ میں دوسروں کے آگے جھکنے کی بات تو وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی لیکن اپنی سوچ و فکر ایسی رکھو جو خود کو نہ سہی مگر قوم و ملت کے لیے فائدہ مند ثابت ہو۔"

آپ یقین جانیے کہ ان کی مندرجہ بالا ہدایت کے بعد دل میں پھر کبھی یہ خیال جنم نہ لے سکا کہ ــــ چلو...... مسکہ لگائیں۔

●●

ہاشم عظیم آبادی

اکیسویں صدی کے مشاعروں کی ایک جھلک

وقت کے ساتھ ہر چیز بدلتی ہے۔ رسم و رواج بدلتے ہیں۔ طرزِ رہائش بدلتی ہے فیشن بدلتے ہیں۔ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ چناں چہ ہمارے مشاعرے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں رہے۔ ان میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی گئیں۔ ایک وہ بھی دور تھا جب مشاعروں میں خاص قسم کے آداب ملحوظ رکھے جاتے تھے۔ شعرا جس عزت و احترام سے آتے تھے اسی عزت و احترام کے ساتھ واپس جاتے۔ نہ ہا و ہو نہ فقرے بازیاں اور نہ ہوٹنگ۔ پھر اس مشاعرے کی بگڑی ہوئی یہ صورت سامنے آئی کہ نہ شعرا کی عزت سلامت رہی اور نہ سامعین کے سر محفوظ۔ ہر لمحہ یہ خطرہ کہ کب کس کی پگڑی اچھالی جائے گی اور کب کس شاعر کا قافیہ تنگ کر دیا جائے گا۔

مشاعروں کی اس سے بھی بدتر صورت اکیسویں صدی میں سامنے آنے کی توقع ہے۔ اس کی ایک جھلک پیش ہے:

اکیسویں صدی کے مشاعروں میں ڈائس پر طبلہ، سارنگی اور ہارمونیم کا خاص طور سے اہتمام رہے گا۔ شعرا حضرات شلوار، لہنگا اور پشواز پہن کر ڈائس پر تشریف فرما ہوا کریں گے اور اوڑھنیاں اوڑھ کر کلام سنایا کریں گے۔ نقیبِ مشاعرہ ایک ایسی نائکہ ہوا کرے گی جو شعرا کی راگ راگنیوں اور ان کی گلوکاری پر سیر حاصل تبصرہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ شعرا کو ان کے سازندوں اور طبلچیوں کے نام کے ساتھ پکارا جائے گا۔ ڈائس پر اگر شعرا دیر تک سر و تال ملانے کے بعد غزل سرا ہوا کریں گے۔ اور سامعین کی جانب سے صرف گانے کی فرمائش ہوا کرے گی۔

ڈائس پر شعرا کے آگے اور پیچھے اتنی جگہ رہا کرے گی کہ وہ اپنے اشعار تھرک تھرک کر اور بھاؤ بتا بتا کر سنا سکیں۔ ساتھ ہی رقص بھی کرتے جائیں۔ تحت لفظ پڑھنے والے شعرا بھی کبھی کمر پر اور کبھی کان پر ہاتھ رکھ کر غزلیں سنائیں گے۔ اس دور میں غزل گا شعرا کی قدر و منزلت اس قدر ہوگی کہ غزل گو شعرا منہ چھپائے پھریں گے۔ زیادہ تر شعرا خود ہی گا دینے کو پسند کریں گے۔ طبلہ اور سارنگی بجانے والے ان کا ساتھ دیں گے۔ اگر کسی سرپھرے شاعر نے غالب کی زمین میں غزل سرا ہونے کی حماقت سرزد ہوگی تو اس پر گندے انڈے اور سڑے ہوئے ٹماٹروں کی بارش ہونے لگے گی ـــــ شعرائے کرام کو معقول معاوضہ کے علاوہ انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ انعام و اکرام کے مستحق وہی شعرا ہوں گے جو گانے، تھرکنے، بھاؤ بتانے اور رقص کرنے میں سب سے بازی لے جائیں گے۔ اکیسویں صدی کے مشاعروں میں واہ واہ اور مکرر ارشاد سنائی نہ دیں گے۔ سامعین ڈائس پر پیسے پھینک پھینک کر داد دیا کریں گے جیسے شعرا اشعار سنانے اور گانے کے دوران بٹور بٹور کر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل میں باندھتے جائیں گے ـــــ نظامت کرنے والی نائکہ آخر میں اعلان کیا کرے گی کہ کس شاعر کو کتنی چھوٹ سے نوازا گیا ـــــ

مشاعرہ کے اختتام پر ڈائس پر بیٹھے ہوئے سبھی شعرا اپنی اپنی اوڑھنیاں اوڑھ کر کورس کے انداز میں آداب بجا لائیں گے۔ ■

دے کے خط

(مراسلے)

محترم مصطفیٰ کمال صاحب۔ شگفتہ رہیں۔

شگوفہ برابر مل رہا ہے۔ خوشی ہے کہ آپ اسے مسلسل تر و تازہ اور شگوفہ زار بنا کر پیش کرنے میں کامیاب ہیں۔ جس کے لیے آپ اور آپ کے معاونین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہندوستان میں شگوفہ تنہا ماہنامہ ہے جو طنز و مزاح سے بھرپور مزاج رکھتا ہے اور ایک معیار کا مالک ہے۔

یہ سوچ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ آپ حضرات اس طرح اردو کی بھی خدمت کر رہے ہیں اور اردو والوں کو مسکراہٹوں اور قہقہوں کی دولت سے مالا مال بھی کر رہے ہیں۔ آج کے دور میں دوسروں کو خوش رکھنا بھی بڑی ہمت کا کام ہے ورنہ لوگ دوسروں کو خوش دیکھ کر رنجیدہ رہتے ہیں اور اپنی قسمت کو کوستے ہیں۔ دعا ہے کہ آپ کا شگوفہ سارے ہندوستان کو شگوفہ زار بنانے میں قدم قدم پر کامیاب ہو۔

عبدالقوی دسنوی بھوپال

جنوری ۸۸ء میں میں حیدرآباد میں تھا ملک پیٹ سے ذرا آگے کتابوں کے اسٹال سے شگوفہ کے دو شمارے خریدے تھے ان میں سے ایک مجتبیٰ حسین نمبر تھا۔ اسے میں دل چسپی سے پڑھا۔ ماشاءاللہ۔ دو جامد کی ناکامی کے زمانے میں آپ برابر شگوفہ کو بڑی آب و تاب سے منظر عام پر لا رہے ہیں اور خاص نمبر نکالنے سے بھی نہیں کتراتے۔ اللہ تعالیٰ شگوفہ کو طویل عمر دے آمین۔

ضیا حسنی فتح پور

مئی کے شمارے میں یوسف ناظم پر میری نظم شائع ہوئی ہے۔ یہ نظم مملکت طنز و مزاح کے تاج دار جناب یوسف ناظم کی شخصیت اور کارناموں پر ادھر ادھر سے کچھ ہلکی سی روشنی ڈالتی ہے (مکمل احاطہ نہیں کرتی کہ موصوف کی ادبی فتوحات کا دائرہ خطرناک حد تک وسیع ہے)۔ اس تعلق سے بالخصوص عرض یہ کرنا ہے کہ اس نظم کے لکھنے یا چھپنے سے یوسف ناظم صاحب کے قد و قامت (جو کہ پہلے ہی سے آسمانوں کو چھو رہا ہے) میں کوئی اضافہ ہونے والا نہیں۔ برسوں سے کچھ تاثرات قلب و ذہن پر چپکے ہوئے تھے انھیں کرید کر کاغذ پر سجا دیا ہے۔ مزید یہ کہ اظہار عقیدت مقصود تھا سو کر دیا۔ اس بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی بھی نہیں۔ غلط فہمیوں کو راہ نہ ملے اس لیے وضاحت کر دی ہے۔

محبوب راہی - بارسی ٹکلی

اپریل ۸۹ء کا شگوفہ نظر نواز ہوا۔ اس شمارے میں موجود تمام تر شعری اور نثری تخلیقات دل چسپ اور معیاری ہیں۔ خاص کر محترمہ لئیق صلاح صاحبہ کا صدارتی خطبہ اور فیاض احمد فیضی کا سفرنامہ پسند آئے۔

منظور وقار گلبرگہ

شگوفہ کے بیس سالہ انتخاب کے لیے نیک تمنائیں ——— شگوفہ نے کئی نمبر نکالے اور ہر خصوصی اشاعت مزاحیہ ادب کے سرمایہ میں بہترین اضافہ ثابت ہوئی۔ اس بار آپ نے کسی مسلمہ نقاد کی بجائے ایک قاری کا انتخاب کر کے چونکا دیا۔ بیس سالہ انتخاب صحیح معنی میں اچھے قاری کا ہی کام ہونا چاہیے اس کے لیے قدوس صاحب بہت موزوں رہیں گے۔

رؤف خوشتر

بیدر

جلد : ۲۲

شمارہ : ۷

جولائی ۱۹۸۹ء

ایڈیٹر :
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

مجلس ادارت :
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

مجلس مشاورت :
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

سرورق :

منیجر اعزازی (بمبئی)
[illegible] احمد فیضی

کتابت : محمد غالب

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

فی پرچہ : ۵ روپے
زرِ سالانہ : ۵۰ روپے
[illegible] : ۶۰ روپے
[illegible] : ۱۴۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ :
۲۱ [illegible] کمپاؤنڈ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

[illegible] 521064 ★ فون آفس 557716

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

مالِ مُفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

ایسی کی تیسی (تنقید)

چوری (منظومات)

قارئینِ 'شگوفہ' کی خدمت میں

عید الاضحیٰ

مُبارک

شگوفہ حیدرآباد
جولائی ۱۹۸۹ء
شگوفہ نے اپنے ۲۰ سالہ دورِ اشاعت میں
طنز و مزاح کی ایک تاریخ بنائی ہے
اور کئی ضخیم نمبر پیش کئے ہیں
اب
ایک اور یادگار خصوصی اشاعت
"۲۰ سالہ انتخاب"
(ترتیب کے مراحل میں)
مہمان مدیر: سید عبدالقدوس، ایڈوکیٹ
میوزک ۶۸۹
بلا عنوان
بشکریہ "مسکراہٹ" کراچی
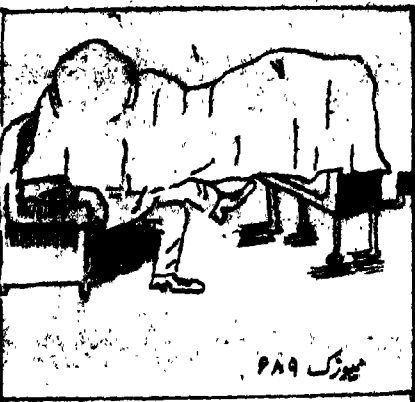
وجاہت علی سندیلوی

پروفیسر صاحب

جب ہم یونیورسٹی میں پڑھتے تو جو پروفیسر صاحب ہمیں ایم۔ اے میں انگریزی ڈراما پڑھاتے، وہ اکثر پڑھاتے پڑھاتے ایسے الفاظ بھی بول جاتے جو کم از کم اس وقت یعنی آج سے پچاس سال پہلے خلافِ تہذیب سمجھے جاتے جیسے پاجی، سالا، اُلو کا پٹھا وغیرہ، اور کبھی وہ جوش میں اگر اس سے بھی آگے تجاوز کر جاتے اور ایسے الفاظ بھی کہہ گزرتے جو آج کے منہ پھٹ زمانے میں بھی گالیاں سمجھی جاتی ہیں۔ لطف یہ تھا کہ وہ یہ گالیاں غصّے اور خفگی سے زیادہ پیار اور محبت کے اظہار میں استعمال کرتے۔ مثلاً چونکہ انہیں شیکسپیر اور غالب سے بڑی عقیدت تھی لہٰذا اکثر ان کے خیالات یا اندازِ بیان کی مماثلت یا اختلاف ظاہر کرتے وقت وہ ان دونوں بزرگ شاعروں کو خوب سناتے۔ ایک روز ان کے نام لے کر کہنے لگے۔ یہ دونوں سالے میری زندگی عذاب کیے ہوئے۔ سیکڑوں بار ان کمبختوں کو پڑھ چکا ہوں اور ہر بار یہ کوئی نیا رنگ بدل کر سامنے آتے ہیں۔ میں ان کے اس پاجی پن سے عاجز آ چکا ہوں۔ (درحقیقت انھوں نے سالے کمبختوں اور پاجی پن سے کہیں زیادہ کثیف الفاظ استعمال کیے تھے لیکن اُن کو اس بھری محفل میں دہرایا نہیں جا سکتا)

ہم طالب علم اُن کی اُن گالیوں سے بے مزہ نہیں ہوتے بلکہ اُلٹے خوش ہوتے اور اُن کو ان کے بکنے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرتے۔ ہم لوگ بھی اکثر ان سے بڑی شوخی اور گستاخی سے باتیں کرتے جو اُس زمانے میں جب کہ شاگرد اور اُستاد کے درمیان آج کل والی بے تکلفی رائج نہیں ہوئی تھی، ایک بڑی انوکھی بات سمجھی جاتی لیکن ہمارے یہ آزاد منش پروفیسر صاحب اس کا بُرا ماننا تو دور رہا بالکل نوٹس ہی نہیں لیتے اور کھلا برجستہ جواب دیتے۔ ایک مرتبہ پروفیسر صاحب شیکسپیر کے میکبتھ کے ان مصرعوں (Lay on Macduff And damn'd him that cries "Hold Enough") کا غالب کے اس شعر سے موازنہ کر رہے تھے کہ

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اُڑ جائے
جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ ہاں اور

اور اپنے اظہارِ پسندیدگی میں دونوں شاعروں کو اپنی پسندیدہ گالیوں سے جن میں حرام زادہ بھی تھا نواز رہے تھے۔ ایک دم سے ہمارے ایک ساتھی قاضی جنہیں ہم بہ حیثیت ٹرک قاضی کہتے پوچھ بیٹھے "آپ ان دونوں میں بڑا حرام زادہ کس کو سمجھتے ہیں" پروفیسر صاحب نے اپنے لیکچر کی روانی میں کوئی فرق نہ آنے دیتے ہوئے برجستہ فرمایا "اس وقت تو اس دخل در معقولات کی وجہ سے سہرا آپ کے سر ہے اور میں ان دونوں ہی سے بڑا آپ کو سمجھتا ہوں۔"

جس وقت کا ذکر ہے اس وقت تو پروفیسر صاحب کے ریٹائر ہونے میں چند مہینے ہی باقی رہ گئے تھے

اور سبھی جانتے کہ وہ یہ گالیاں کسی بدنیتی سے نہیں بلکہ عادتاً غیر اختیاری طور سے بکتے ہیں لہٰذا انہیں اُن کا ایک انداز جنوں سمجھ کر لائق اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن سنا ہے کہ اُن کی ملازمت کی ابتدا میں کئی مرتبہ شعبے کے صدر اور فیکلٹی کے ڈین نے ان سے اُس کے متعلق کچھ رسمی باز پرس کی تھی اور پروفیسر صاحب نے انہیں بڑے دلچسپ اور فکر انگیز جواب دیے تھے۔ "حاشا وکلا میں کبھی گالی نہیں بکتا! گالی کسی کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے دی جاتی ہے اور میں کبھی اپنے حاشیہ خیال میں بھی کسی سالے کو تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا" پروفیسر صاحب نے سالے کے بجائے بہن کی گالی استعمال کی تھی۔

"ابھی آپ اس کو گالی کہتے ہیں! یہ تو کارتوس ہے اس کا گالی پن تو مدت ہوئی ختم ہو چکا۔ اب تو یہ عام بول چال کا گھسا پٹا سا لفظ ہے جسے زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ ہی استعمال کرتے ہیں"!

"حضرت گالی سے زور بیان پیدا ہوتا ہے۔ گالی صرف تکلیف نہیں پہنچاتی اپنے مخاطب کو چونکا بھی دیتی ہے۔ اور چونکنے کے بعد وہ جو کچھ سنتا ہے اُس کا نقش اُس کے ذہن پر زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ اب میرے ہی کلاس کو دیکھیے۔ میرے مضمون میں اس کا نتیجہ سو فی صدی رہتا ہے"!

"کبھی آپ کو غور کرنے کی توفیق ہوئی ہے کہ غالب کے اس شعر میں 'تماشا' کے بجائے اگر 'ایسی تیسی' کر دیا جائے تو اُس کی تاثیر میں کس قدر اضافہ ہو جائے گا ؎

"ایسی تیسی کہ اے محو آئینہ داری ؛ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں"

لیکن وائے تنگ نظری! آپ جیسے حضرات اسے کب برداشت کر پائیں گے، سو تہذیب کی تہمیوں کی تو کئی اشعار میں گنجائش ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ اگر غالب آج زندہ ہوتے تو اُن کا حیلیات شکن میری رائے سے ضرور اتفاق کرتا۔ اب دیکھیے ایسی تیسی اے غارت گر جنس وفا سن میں جو جلیلا ہٹ ہے وہ کبھی ہوتی سہی گالی میں بھی مشکل ہی سے ملے گی"!

"گالی بکنا یقیناً ایک گندی بات ہے لیکن اس کی گندگی کا بہت کچھ دارو مدار اس نے یا ۔ سے میں خیال اور احساس پر ہے اور میرا تجربہ ہے کہ اکثر اس سے متعلق گندگی اتنی بکنے والے کی زبان پر نہیں جتنی کہ سننے والے کے دماغ میں ہوتی ہے شیکسپیئر کا اس نہیں کہا گیا تھا جب اُس نے کہا تھا کہ کوئی بات نہ اچھی ہوتی ہے نہ بری اس میں یہ صفتیں تو اس کے متعلق سوچنے سے پیدا ہوتی ہیں۔ کسی اُردو شاعر نے اس مقولے کا ترجمہ لیا ہے اور برا نہیں کیا ہے ؎

دل پہ لگنے کی بات ہوتی ہے ؛ بات کوئی بری نہیں ہوتی ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

غرض کہ ہمارے پروفیسر صاحب نے ایسے باتوں کے خربوزے بنائے اور اتنا الجھاؤ پیدا کر دیا کہ مجبوراً معترضین خاموش ہو جانا پڑا خصوصاً اس پس منظر میں کہ طلبا کو پروفیسر صاحب سے کوئی شکایت نہیں تھی اور اُن کے پڑھانے کی صلاحیتوں کے سب ہی معترف تھے۔ طلبا کی حاضری اور پڑھنے سے دلچسپی سب سے زیادہ انہیں کے کلاس میں دکھائی پڑتی۔ البتہ شعبے کے صدر نے کچھ ایسا اہتمام کیا تھا کہ حتی الوسع لڑکیاں اُن کے سکشن میں نہیں رکھی جاتیں۔

دلا را ملی ہما شناسد کے مصداق پیٹے لڑک قاضی جلد ہی پروفیسر صاحب کے بہت قریب اور ایک طرح سے اُن کے جونیئر دوستوں میں ہو گئے اور چونکہ ہم تا بہ زبان مسلوان اور ہم قاضی سے دوستی کے اٹوٹ رشتے میں بندھے ہوئے تھے اور سائے کی طرح اُن کے ساتھ رہتے لہٰذا مان نہ مان میں ترا مہمان کی حیثیت سے ہم لوگ بھی اس زمرے

شامل ہوگئے۔ ایک روز ہم تینوں پروفیسر صاحب کے پاس اُن کے ڈرائنگ روم میں اُن سے ہیملٹ پڑھ رہے تھے کہ اچانک جملۂ معترضہ کے طور پر قاضی پوچھ بیٹھے "سر آپ کے ممدوح غالب کو بھی تو گالیوں سے بڑی دلچسپی تھی؟" پروفیسر نے ہیملٹ کی کتاب بند کر کے میز پر رکھنے کے بجائے نیچے قالین پر پھینکدی اور بولے "کیسی کچھ؟ اجی اُنھوں (گالی دے کر) کو تو ہر دلچسپ بات سے دلچسپی تھی۔ گالیاں کو بھی اُس نے ایک انداز محبی بنا دیا تھا ؎

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب ٭ گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

اور پھر ؎ "دل گیا بھی ہو تو اُس کی گالیوں کا کیا جواب ٭ یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں"

سچ پوچھو تو اُس نے گالیوں پر باقاعدہ تحقیق کی تھی۔ تبھی تو اُس نے اپنے شاگرد مولانا حالی کو جس طرح مختلف جسامت اور طاقت کے جانوروں کو مارنے کے لیے کارتوسوں کے نمبر بتائے جاتے ہیں مختلف عمر کے انسانوں کو دینے کے لیے گالیوں کے اقسام نوٹ کروائے تھے۔ بڈھے کو بیٹی کی، جوان کو بہن کی اور کم عمروں کو ماں کی گالی دینی چاہیے۔" اور پھر بڑے تاسف کے لہجے میں کہا "لیکن شاگرد کو یہ نسخہ استعمال کرنے کی کبھی توفیق نہیں ہوئی!"

"لیکن خود غالب نے تو کبھی گالی نہیں بکی!" قاضی نے پوچھا

"میاں آپ کے فرشتوں کو کیا خبر! غالب کے خطوط پڑھیے قاطع برہان اور برہان قاطع وغیرہ کے سلسلے میں اُنہوں نے اپنے مخالفین کو ایسی بے نقط سنائی ہیں کہ اُن کی بعض گالیوں کو آپ کے سامنے بھی دہراتے میں شرما جاؤں اور پھر جب تحریر میں یہ عالم تھا تو تقریر کی گل افشانی گفتار کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں! ہاں یہ اور بات ہے کہ جس طرح محفل میں شراب نہیں پیتے اسی طرح وہ اپنی عام گفتگو اور بول چال میں کوئی ناشائستہ حرف زبان پر نہ آنے دیتے۔ لیکن آخر تھے نہ سپاہی زادے! جب غصہ آجاتا اور خونریزی کی طاقت نہیں رہی تھی تو پھر پورا آپہ دریدگی پر اُتر آتے اور جس طرح ہندستانی پر انگریزی شراب کو ترجیح دیتے اسی طرح عام گالیوں کے بجائے اپنی اختراع کی ہوئی مخصوص گالیاں بکتے۔ ظالم نے (پروفیسر صاحب نے گالی بکی تھی) یہاں بھی اپنی انفرادیت نہیں چھوڑی!"

ایک روز پروفیسر صاحب کہنے لگے۔ "جس زبان میں پھبتی، ٹھٹھولی، اور مختلف اقسام کی بہت سی گالیاں نہیں ہوتیں میں اُسے ناقص اور نامکمل سمجھتا ہوں۔"

"تو آپ کا یہ مطلب ہے کہ کسی جامع اور مکمل زبان کے لیے آپ اس میں بیہودہ اور بدتمیزی کے الفاظ کی بہتات ہونا ضروری سمجھتے ہیں؟" قاضی نے پوچھا۔

پروفیسر صاحب خفا ہو گئے اور گالی بک کر کہا "تم سمجھتے کیوں نہیں؟ ایک موٹر کار کے اچھے ہونے کا یہ معیار ہوتا ہے کہ وہ اپنے استعمال کرنے والوں کو جلدی اور آرام سے اُن کی منزلِ مقصود پر پہنچا دے یہ نہیں کہ اس میں صرف نکو کار بیٹھ سکتے ہوں اور بدکار نہیں۔ اسی طرح ایک زبان کے جامع اور مکمل ہونے کا یہی معیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنے استعمال کرنے والے کے خیالات، جذبات اور احساسات کی خواہ وہ قابلِ تحسین ہوں خواہ قابلِ نفرین، کی صحیح اور پوری ترجمانی کر دے۔ اب اگر انتہائی غصے کے ہیجانی عالم میں کوئی شخص اپنے مخاطب کو زیادہ سے زیادہ ذہنی تکلیف پہنچانے کے درپے ہو لیکن اس کی زبان میں ایسی گالیاں نہ ہوں جو اس کا یہ مقصد پوری مطلوبہ شدت اور حدت سے پورا کر سکیں، تو کیا آپ ایسی (گالی بک کر) زبان کو جامع اور مکمل کہہ سکیں گے؟ ہرگز نہیں!"

ایک دن قاضی اصغر ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ پروفیسر صاحب کچھ مضمحل سے اکیلے بیٹھے ہیں۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے خود ہی چھیڑا "سنا ہے وہ نفسیات کی اولاد (گالی دے کر) ہمنا گر کہتا ہے کہ میں کسی نفسیاتی الجھن یا ناآسودگی کی وجہ سے گالیاں بکتا ہوں۔

"تو اس سے آپ کے گالی بکنے پر کیا اثر پڑتا ہے؟" قاضی نے جواب دیا

"بھئی جانتا ہوں کہ گالی بکنا ایک غیر شریفانہ فعل ہے' یہ ظاہر کرتا ہے کہ بکنے والا ایک بدتہذیب ماحول کی پیداوار ہے۔ . . . . پروفیسر صاحب اپنی بات ختم نہیں کر پائے تھے کہ قاضی بول اٹھے:

لائے اس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

پروفیسر صاحب نے جھنجھلا کر گالی بکتے ہوئے کہا "تم بات تو سنو! میں گالی بکتا ہوں تو کچھ ایسی طمانیت محسوس کرتا ہوں جیسے کوئی گندگی میرے ذہن سے خارج ہو گئی ہو۔ گالی نہ بکوں تو یہ یقیناً یہ گندگی میرے اندر زہر میں تبدیل ہو جائے۔"

"لیکن یہ گندگی آئی کہاں سے؟" قاضی سوال کیے بغیر کب رہ سکتے تھے۔

پروفیسر صاحب کچھ دیر خاموش رہے پھر قہقہہ لگا کر بولے "تم (گالی بک کر) اس وقت کہاں مر گئے تھے جب ساہوکار کا گماشتہ میرے غریب باپ کو اس کی بیوی بچوں اور گاؤں بھر کے سامنے مغلظات گالیاں دیتا اور میرا باپ چپ رہنے پر مجبور تھا۔"

●●

ڈاکٹر راہی قریشی
(گلبرگہ)

تلاشِ گمشدہ

"تلاشِ گمشدہ" کے زیرِ عنوان عام طور پر کسی کھوئے ہوئے معصوم کی تصویر اخبار میں شائع کرکے اُس کے لیے مناسب معاوضے کے ساتھ اخراجاتِ آمد و رفت کی ادائیگی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہاں معاملہ برعکس ہے کیونکہ تلاشِ گمشدہ کا یہ اشتہار کسی معصوم سے متعلق نہیں۔

قصّہ دراصل یہ ہے کہ احسان صاحب اچھے خاصے شریف آدمی تھے، جو پیشے کے اعتبار سے ایک مدرسۂ تحتانیہ کے معلّمِ اردو تھے۔ اساتذۂ اردو کی بدنصیبی اُن کے بھی دامن گیر تھی یعنی انہیں بھی اپنے ذوقِ ادب کے تحت مشاعروں میں شرکت کا جنون تھا۔ ہر جنون اپنے انجام کو پہنچتا ہے چنانچہ احسان صاحب کی شامت آئی تو بعض بدخواہوں نے انہیں آغازِ شاعری کا مشورہ دیدیا، جس کے تحت موصوف کو حسبِ روایت ایک تخلص کی تلاش میں مسلسل مصروف رہنا پڑا۔

بزرگوں کا قول ہے کہ ولادتِ طفل میں ماں کو اتنی تکلیف نہیں ہوتی، جتنی زحمت باپ کو نام کے انتخاب میں ہوتی ہے۔ موصوف کا نام چونکہ احسان تھا، اس لیے زمانہ شناس بزرگوں نے یہ قیمتی مشورہ دیا کہ "احسان فراموش" کے قلمی نام سے جلد شہرت حاصل کی جائے لیکن اُنہوں نے مصلحتاً "رائگاں" تخلص اختیار کر لیا اور اس طرح "احسانِ رائگاں" کا قلمی نام اُن کی ادبی مقبولیت کا سبب بنا۔

انتخابِ تخلص کے مرحلے سے گزرنے کے بعد احسان رائگاں نے اصلاحِ سخن کے لیے ایک کہنہ مشق شاعر سے ربط پیدا کیا اور وہ اس کارِ خیر کے لیے رضامند ہو گئے تو رائگاں نے اپنی نصف تنخواہ اُستادِ محترم کو بطورِ معاوضۂ اصلاحِ کلام منظور پیش کر دی۔

غزلوں کے نام پر انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اُس کی اصلاح یوں ہوئی کہ مقطعوں میں اُن کا تخلص رائگاں نہ ہوا یعنی بدستور باقی رہا۔ کچھ غزلیں اصلاح یافتہ ہو گئیں تو رائگاں کو اپنے ایک شاگرد کی قائم کردہ "بزمِ دروغ ادب" سے ربط پیدا کرنا ضروری ہو گیا تاکہ آئندہ مشاعرے میں یہ بزم احسان کو "رائگاں" ثابت کرے۔ خدا خدا کرکے ایک مشاعرے میں پہلی بار انہوں نے اصلاح شدہ غزل کا یہ مطلع پڑھنے کی کوشش کی ؎

عذابِ عرضِ حالاتِ وفا کب تک رہے باقی
خدا جانے مرے حق میں سزا کب تک رہے باقی

اس مطلعِ غزل کے مصرعِ اولیٰ پر احسان نے احسان کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے "رائگاں" کر دیا یعنی "عذاب" "عرض"

اور حالات "سب کو محروم" اضافت کر کے پوری غزل سنانے کے موقعے سے محروم ہو گئے تاہم معاوضہ استاد کا خیال آتے ہی انہوں نے کمر ہمت کسی اور دوبارہ آغاز کلام کرنا چاہتے تھے کہ مشاعرہ اختتام کو پہونچ گیا۔

رفتہ رفتہ احسان رائگاں کی آمدنی گھٹنے لگی اور معاوضہ استاد بڑھنے لگا۔ جب کافی مقدار میں کلام اصلاح شدہ جمع ہو گیا تو ان کے بدخواہ پھر آن موجود ہوئے اور اس دفعہ یہ مشورہ دیا کہ کسی نہ کسی طرح ایک مجموعۂ کلام شائع کر دیا جائے کیونکہ جس طرح عشق کے لیے محبوبہ ضروری ہے اُسی طرح شاعر کے لیے "مجموعہ" لازمی ہے۔

اس مشورے کے تحت احسان رائگاں اپنی بیگم سے (حسب عادت) رجوع ہوئے اور اپنے آپ کو اُس کا حقیقی زیور ثابت کر کے اُس کا آخری طلائی زیور فروخت کر دیا۔ ایک با ذوق کاتب مامور کیا گیا جس کے تحت کلام تازہ اصلاح یافتہ ہو کر کاتب کی اُجرت اور مجموعے کی ضخامت میں اضافے کا سبب بنا۔ تکمیل کتابت کے بعد ایک مطبع نے بادل ناخواستہ ذمہ داری طباعت بایں شرط قبول کی کہ جملہ اخراجات طباعت احتیاطاً پیشگی ادا کر دیئے جائیں۔

غرض ان ہمت شکن حالات میں احسان رائگاں کے پہلے مجموعۂ کلام "متاع رائگاں" کی اشاعت عمل میں آئی۔ مصور بھی چونکہ ذوق لطیف سے عاری نہ تھا اس لیے سرورق کے ڈیزائن میں اُس نے مجموعے کے نام کے لحاظ سے اُڑتے ہوئے اوراق غزل کے ساتھ ساتھ کرنسی نوٹ بھی پرواز دکھائے تھے۔

زوجہ کے آخری زیور سے محرومی کے بعد جب رائگاں کا پہلا مجموعۂ کلام زیور طبع سے آراستہ ہو گیا تو اُسی گروہ بدخواہاں نے یہ مشورہ دیا کہ "جلسۂ رسم اجراء" کا انعقاد اخلاقاً ضروری ہے کیونکہ مجموعہ بلا رسم اجراء عقد بلا ولیمہ کے مترادف ہوتا ہے۔ رائگاں کا سارا حادثہ رائگاں ہو چکا تھا لیکن اس مشورے کی افادیت سے وہ انکار نہ کر سکے۔ چنانچہ انہوں نے L.I.C سے قرض لیا اور مقامی M.L.A کو صدارت جلسہ کے لیے رضامند کر لیا۔ رسم اجراء کے لیے اُردو سے نابلد شخص کا انتخاب چونکہ ضروری تھا اس لیے ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن کو اس کارِ نیک کے لیے آمادہ کر کے اپنی شخصیت و شاعری پر مضامین لکھوانے کے لیے اُن نثر نگاروں سے رجوع ہو گئے جن کی اپنی کوئی شخصیت نہ تھی اور وہ مخالف شاعری بھی تھے۔

جلسے کے دوران فوٹو گرافر نے رسم اجراء کی تصویر لی تو عین وقت پر رائگاں کو اندازہ ہوا کہ فوٹو گرافر نے اُن کے پچھواڑے کو زیادہ نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا زاویہ بدلے بغیر فوٹو گرافر کا زاویہ بدلا۔ لال فیتے میں لپٹی ہوئی "متاع رائگاں" ڈپٹی ڈائرکٹر کو واپس کر کے دوبارہ سپرد دست خود کرنے کی التجا کی اور ایک آنکھ دبا کر فوٹو گرافر کو اشارہ کر رہے تھے کہ اُس ظالم نے اُسی حالت میں تصویر لے لی۔ بعد ازاں انہوں نے مجموعے سے وہ غزل صحیح پڑھ لی جس کی مشق وہ تاریخ طباعت مجموعہ سے مسلسل کر رہے تھے۔ اور جس کا ترنم انہوں نے اپنے پڑوسی قوال سے بلا معاوضہ سیکھا تھا۔

جلسے کے فوری بعد انتظام طعام بھی تھا جس کے لیے انہوں نے ایک ہوٹل کو آرڈر دیا تھا اور ہوٹل کے مالک سے معاہدہ ادائیگی رقم "فی کس" کے حساب سے طے ہوا تھا۔ ہوٹل کا بل ملا تو یہ انکشاف ہوا کہ اصحاب شریک جلسہ اور اصحاب شریک طعام میں وہی فرق تھا جو شرکائے جلوس جنازہ اور شرکائے نماز جنازہ میں ہوتا ہے۔ یعنی دانش مندوں نے فرش جلسہ گاہ سے زیادہ ترجیح دستر خوان ضیافت گاہ کو دی تھی۔

ظہورِ عجائب کے لیے شاید یہی دن موزوں تھا، چنانچہ اختتامِ طعام کے ساتھ بزم فروغِ ادب کے خازن نے انہیں "متاعِ رائگاں" کے وہ نسخے واپس کیے جو جلسہ گاہ سے متصل "سیل کاؤنٹر" پر رکھوائے گئے تھے۔ احسانِ رائگاں نے نسخے گنے تو مبہوت رہ گئے کیونکہ سیل کاؤنٹر پر (۵۰) نسخے رکھوائے گئے تھے لیکن واپس کردہ نسخوں کی تعداد (۷۵) تھی! معلوم ہوا کہ اس اضافۂ تعداد کا سبب وہ (۲۵) نسخے ہیں جو انہوں نے بعض مخلصین کو تحفتاً عنایت کیے تھے۔

مرحلۂ ضیافت تمام ہوا اور رائگاں کے سوا ہر شخص مسرور ہو کر رخصت ہوا تو اچانک ہوٹل کا مالک نمودار ہو گیا۔ رائگاں ہکلانے لگے اور وہ مسکرانے لگا۔ آخرکار یہ طے ہوا کہ ہوٹل کا بل صبح ادا کر دیا جائیگا۔
دوسرے دن علی الصبح جب ہوٹل کا مالک رائگاں کے گھر پہنچا تو زوجۂ رائگاں نے اپنی اکلوتی آنکھ ملتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا جلسۂ رسمِ اجراء رات بھر جاری رہا؟ ہوٹل کا مالک کچھ نہ سمجھ سکا تو زوجۂ رائگاں نے یہ انکشاف کیا کہ رائگاں بعدِ جلسہ لوٹے ہی نہیں!

کئی دنوں تک اعزا، اقربا اور احباب سے دریافتِ حال جاری رہی۔ فون کیے گئے، خطوط لکھے گئے اور تار بھیجے گئے لیکن ساری تلاشِ رائگاں آخر رائگاں ثابت ہوئی۔ آخرکار ہوٹل کے مالک نے زوجۂ رائگاں کی وصیت اور اولادِ رائگاں کی محبت کے تحت اخبار میں "تلاشِ گمشدہ" کے زیرِ عنوان رائگاں کی وہ تصویر شائع کروائی جس میں "متاعِ رائگاں" ہاتھ میں تھامے ہوئے وہ ایک آنکھ دبا کر مسکرانے کی کوشش کر رہے تھے!!

اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

اس طرف رُخ مرا نہیں ہوتا
جس طرف فائدہ نہیں ہوتا

جوتے چپل اگر نہیں پہ چلتے
راستہ راستہ نہیں ہوتا

جب بھی دستر پہ آپ ہوتے ہیں
ناشتہ ناشتہ نہیں ہوتا

نت نئے ظلم اس پہ ڈھاتا ہوں
پھر بھی معدہ خفا نہیں ہوتا

گونگا، بہرہ بھلا ہے لیکن منہ بھی
گالیاں کھا کے وا نہیں ہوتا

ہاشمی بھول جاؤ ماضی کو
نوجوانی میں کیا نہیں ہوتا

نیاز سواتی (پاکستان)

وہ شوہر آج کل اک اچھا انساں ہو نہیں سکتا
برائے اہلیہ جو خانساماں ہو نہیں سکتا

وہ افسر جو کہ دفتر میں کوئی گھپلا نہیں کرتا
خبر آڈٹ کی سن کر وہ پریشاں ہو نہیں سکتا

کرے گا توبہ جس پیپچے کی تیاری مرے بیٹے!
بزرگوں کی دعا سے بھی وہ آساں ہو نہیں سکتا

اسے معلوم ہے کہ تنخواہ ہماری بڑھنے والی ہے
ہمارا دوست اب ہم سے گریزاں ہو نہیں سکتا

اثر کرتا نہیں کچھ وعظ جب تک پیٹ خالی ہو
کسی کی بھوک کا لیکچر سے درماں ہو نہیں سکتا

رہا جو رات دن ماڈرن اور الٹرا حسینوں میں
اسے یورپ میں جاکر رنجِ ہجراں ہو نہیں سکتا

بظاہر رو رہا ہے تو، بباطن ہنس رہا ہوگا
مرا دشمن مری حالت پہ گریاں ہو نہیں سکتا

سنیل کمار تنگ عنایت پوری

لوگوں نے پورے شہر کا دادا کہا مجھے
تب جاکے انتخاب کا ٹیکٹ ملا مجھے

تم سے ہی جب فریب کا جھٹکا لگا مجھے
کہتے ہو بات بات پہ کیوں بے وفا مجھے

گٹھر تمام وعدوں کا کیوں لادتے ہیں آپ
دھوبی کا کوئی آپ نے سمجھا گدھا مجھے

ہندی ہوں ہم وطن ہوں برہمن نہ شیخ ہوں
اپنے سے کیوں سمجھتے ہیں حضرت جدا مجھے

دردِ جگر کے ساتھ تڑپ اور سوزِ دل
میں کیا بتاؤں آپ نے کیا کیا دیا مجھے

فریاد کی جوانوں سے ہندوستان نے
ڈر ہے نہ بیچ ڈالے نیا رہنما مجھے

اظہر حسن صدیقی
(کراچی)

بیگانی شادی میں

ہر قوم و ملک کے مختلف رسم و رواج اور عادات ہوتی ہیں جو ان کے قومی مزاج کی نشاندھی کرتی ہیں۔ ویسے یہ قطعی ضروری نہیں کہ اس ملک اور قوم کے ہر آدمی میں وہ عادات ہوں یا اس کا مزاج بھی ویسا ہی ہو۔ یہ قومی تشخص برسہا برس کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد جنم لیتا ہے۔ لیکن جب ایک دفعہ کسی قوم پر ایک ٹھپہ لگ جائے تو اس کو اتارنے کے لیے قومی سطح پر بڑی محنت اور منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر برسوں سے سنتے آئے ہیں کہ اسکاٹ لینڈ کے باشندے بہت کنجوس ہوتے ہیں۔ اب وہ ہوں یا نہ ہوں لیکن یہ شہرت ایسی ہو گئی ہے کہ جس سے مفر نہیں۔ حالانکہ اسکاٹ لینڈ والوں کا یہ کہنا ہے کہ اس میں زیادہ دخل انگریزوں کا ہے جنھوں نے انہیں بدنام کرنے کے لیے یہ پروپگنڈا اتنے منظم اور موثر انداز میں کیا [illegible] اسکاٹ لینڈ کے باسیوں کو سچ مچ کنجوس سمجھنے لگی ہے۔ اس کے برعکس چین کو دیکھئے جنھیں کافی عرصہ تک لوگ افیمی کہتے تھے مگر انھوں نے آزاد ہوتے ہی اپنی قوم کی کایا پلٹ دی اور اس قدر محنت اور ترقی کی کہ کل تک ان کو افیمی کہنے والے آج خود افیمی لگتے ہیں ویسے اس میں شک نہیں کہ ع

> "کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
> اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں"

کچھ کچھ حقیقت ضرور ہوتی ہے جس سے بدخواہ پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں اور قوم کے خلاف پروپگنڈا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک بات جو ہمیں بحیثیت قوم سب قوموں سے زیادہ نمایاں کرتی ہے وہ ہے وقت کی فراوانی دوسرے ملکوں میں لوگوں کو [illegible] اگر وقت ہوتا تو [illegible] کرتے اور فلاں فلاں منصوبہ کی تکمیل کرتے۔ ہمارے ہاں اس کا بالکل الٹ ہے۔ [illegible] لوگوں سے وقت کاٹے نہیں کٹتا اور وہ وقت گذاری کے لیے طرح طرح کے حیلے بہانے [illegible] اس بات کا مظاہرہ کبھی دیکھنا ہو تو کسی بھی سڑک کے کنارے تھوڑی دیر تک چہل قدمی کریں تو آپ کو طرح طرح کے تماشے [illegible] دیں گے۔ ذرا چھوٹا موٹا کوئی حادثہ ہو جائے تو دیکھئے ذرا دیر میں کتنا بڑا اژدھام ہو جاتا ہے اور پھر اسی پر بس نہیں بلکہ حادثہ کے زخمیوں اور گاڑیوں کے ہٹنے کے بعد بھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ اس واقعہ [illegible] سے زیادہ بڑا حادثہ تماش بینوں کی بھیڑ اور ان کی گاڑیوں کے رکنے کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔ ذرا کسی کی سائیکل کی ہوا بھی نکل جائے تو یار لوگوں کو اکٹھا ہونے اور باتیں بنانے کا موقع ہاتھ آ جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ کئی معقول لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر ہم نے جب ایک دو آدمیوں سے پوچھا کہ کیا بات

ہے لوگ کیوں اکٹھے ہیں تو بڑا معصومانہ جواب ملا "پتہ نہیں سب لوگ اکٹھے تھے ہم بھی کھڑے ہو گئے" ہے کوئی جواب اس معصومیت کا! - ہر حادثہ اور واقعہ کے بعد طرح طرح کی افواہوں کا جنم لینا بھی ضروری ہے اور فوراً رائی کا پہاڑ بنا دیا جائے گا۔ اگر کبھی آپ نے خود کوئی ایسا حادثہ دیکھا ہو اور پھر اس حادثہ کی خبر دوسروں سے سنی ہو تو ہماری بات کی صداقت آپ پر بخوبی ظاہر ہو جائے گی۔ اور یہ تو آپ نے بھی دیکھا اور سنا ہوگا کہ جس زمانے میں دم دار ستارے لوگوں کو آسمان پر دکھائی دے رہے تھے تو ہم نے خود کئی بار دیکھا بھی ہے اور کیا بھی ہے کہ فٹ پاتھ پر آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کھڑے ہو گئے اور جب بھیڑ لگ گئی تو وہاں سے کھسک گئے۔ ذرا سی دیر میں مجمع اکٹھا ہونا شروع ہو جاتا تھا اور جب تھوڑی دیر بعد وہاں آکر لوگوں سے پوچھا کہ کیوں کھڑے ہو تو کوئی معقول جواب نہیں دیتا تھا۔

یہ بات تو سڑک چلتے اور پارکوں اور تفریح گاہوں میں آنے جانے والے مرد و زن کی تھی۔ ان جگہوں کے علاوہ بھی ہوٹلوں دفتروں اور دیگر جگہوں میں بیٹھنے والے اور کام کرنے والے بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ اور ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ ہمارا پورا معاشرہ اس موذی مرض کا شکار ہے۔ دنیا میں کہیں بھی کچھ ہوا ہو ہم اس کے غم میں اپنی جان ہلکان کرتے ہیں اور اپنا بہت سا قیمتی وقت اوروں کے مسائل سلجھانے اور ان کو انواع و اقسام کے مشورے دینے میں ضائع کرتے ہیں۔

ابھی سمندر پار کی خبروں سے ہی ہم لطف اندوز ہو رہے تھے کہ پڑوس سے خبر آئی کہ وہاں کے اور ہماری وی سی آر پر دیکھی جانے والی فلموں کے مقبول ہیرو امیتابھ بچن کسی حادثہ کا شکار ہو گئے۔ اور موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ ہمارے لیے تو خبر اتنا کافی تھا۔ اللہ بھلا کرے وی۔ سی۔ آر کا پاکستانی گھرانوں میں قیامت صغریٰ کا منظر تھا۔ بچے، بڑے، عورت، مرد جسے دیکھو پریشانی کا شکار ہے۔ ایک دوسرے سے موصوف کی پل پل کی خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ اخباروں کے دفاتر اور خبر رساں ایجنسیوں میں فون اور آنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ ہر کوئی فکر مند تھا اور موصوف کی صحت یابی کے لیے دست بدعا تھا۔ بس ایک ہی کسر رہ گئی تھی کہ اجتماعی دعائیں نہیں کی گئیں یا وظائف کی محفل نہیں منعقد کی گئی ورنہ ایسا لگتا تھا کہ ساری قوم پر افسردگی طاری ہے اور کہیں دشمنوں کے منہ میں خاک اور حاسدوں کے کان بہرے ہوں اگر موصوف کو کچھ ہو گیا تو پرستار زندہ در گور ہو جائیں گے۔ جہاں جاؤ اور جس محفل میں بیٹھو انہی کی بیماری اور صحت یابی کے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز سے واسطہ پڑتا تھا۔ ہم نے لوگوں کو اپنے سگے عزیز رشتہ داروں کے بارے میں اس قدر فکر مند نہیں پایا جتنا اس ہیرو کے بارے میں پایا۔ جسے دیکھئے چہرہ اترا ہوا ہے۔ دل ہی دل میں صحت یابی کے لیے دعا کر رہا ہے اور دوسروں سے بھی اس کے لیے اپیل کر رہا ہے۔ ہمارے شوقین حضرات اتنے دن تک اپنے سارے دکھ درد بالکل فراموش کیے رہے اور اپنی تمام توجہ ادھر ہی مرکوز کیے رہے۔ اپنے عزیز رشتہ داروں کی خبر نہیں کہ کس حال میں ہیں۔ زندہ ہیں یا مر گئے موصوف کے لیے دعائیں ہو رہی ہیں اور منتیں مانگی جا رہی ہیں۔ والدین سے بال بچوں کی خیریت معلوم کرو تو وہ بچوں کی بجائے موصوف کا حال بتاتے ہیں کہ بہتر ہیں۔ اور حد تو جب ہو گئی جب ہم نے اپنی ساس صاحبہ سے مزاحاً کہا کہ یہ سب کو کیا ہو گیا ہے کہ باؤلے بنے ہوئے ہیں تو وہ گویا ہوئیں "اے بھیا اس کے لیے تو میں نے بھی نماز پڑھ کر دعا مانگی تھی" تمہیں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے۔ کس کس کو روئیے اور کس کی شکایت کیجیے۔ جب یہ معلوم ہوا کہ موصوف صحت یاب ہو رہے ہیں تو جا کر جان میں

جان آئی اور چہروں پر بشاشت دکھائی دی لیکن پھر بھی پیچھا چھوڑنے والے کہاں تھے۔ جب تک ہم اسپتال سے رخصت نہیں ہوگئے یہ حضرات نہ صرف پل پل کی خبریں معلوم کرتے رہے بلکہ دوسروں کو بھی اس سے مطلع کرتے رہے۔ بیماری سے زیادہ اس بات کی فکر تھی کہ تیمارداری اور خبرگیری کرنے کے لیے کون کون آتا ہے خصوصاً فلمی دنیا کی خواتین۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ اس زمانے میں نہ صرف اخبارات اور رسائل کی بکری بڑھی ہوگی بلکہ لوگوں کے ٹیلیفون کے بلوں میں کافی اضافہ ہوا ہوگا۔ یہ بات صرف ایک ہی ایکٹر تک محدود نہیں ہے اور بھی کئی ہیں جن کے تمام رشتہ داروں محبوباؤں اور معاشقوں کی تمام تفصیلات الف سے لے کر یے تک ہمیں ازبر یاد ہیں۔ اگر آپ کو ہماری بات کا یقین نہ ہو تو آجکل وی سی آر دیکھنے والے کسی بھی بچے سے اس کے دادا یا دادی کا نام پوچھ کر دیکھ لیں کیا جواب دیتا ہے۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ آپ کو مایوسی ہوگی۔ اس کے برعکس کسی بھی ایکٹر یا ایکٹریس یا ایسے کھلاڑی کے متعلق تمام معلومات فوراً بتا دے گا جس کا کسی بھی مشہور فلم اسٹار سے کوئی تعلق رہا ہو۔

اس بارے میں ہماری دلچسپیاں صرف ہندوستان یا پاکستان تک محدود نہیں ہیں۔ بلکہ قید زمان و مکاں سے آزاد ہیں کسی قسم کا کوئی بھی اسکینڈل ہو خواہ وہ امریکہ سے تعلق رکھتا ہو یا روس سے ہماری دلچسپی کا فوراً مرکز ہو جائے گا۔ اس معاملے میں روسی امریکن یا انگریز کی کوئی قید نہیں۔ الزبتھ ٹیلر کی شادیوں طلاقوں اور اس کے ماضی اور مستقبل کے شوہروں سے ہمیں اتنی ہی دلچسپی ہے جتنی شہزادہ انڈریو اور کوسا ٹارک کے معاشقے یا اس کی کسی نئی دریافت سے ایک دفعہ کوئی موقعہ ہاتھ آجائے پھر دیکھیے اخباروں کے صفحات کس طرح ان تفصیلات سے بھرتے ہیں اور کتنا نمک مرچ لگاکر معمولی معمولی تفصیلات کے ساتھ اس قسم کی خبریں چھاپی جاتی ہیں۔ اگر آپ نے پچھلے چند مہینوں کے اخبار پڑھے ہوں گے تو ہماری یہ بات آپ پر بخوبی عیاں ہوگی۔ ابھی ملکہ برطانیہ اور جناب فیگاں کا معاملہ ہی زیر گفتگو تھا اور اخبار والے رائی کا پہاڑ بنا رہے تھے اور ساتھ ہی فیگاں کی اگلی پچھلی نسلوں کو کھنگال رہے تھے تاکہ اپنے قارئین کو مکمل معلومات معہ جزئیات کے فراہم کریں کہ شہزادی ڈیانا کے ہاں سے پھر کچھ ہونے کی خبر آگئی یعنی بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ابھی تک پچھلے ہی بچے سے لوگوں کو فرصت نہیں ملی تھی کہ یک نہ شد دو شد اب ان کی بھی خبرگیری کیجیے۔ لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ قوم اس غم میں اپنے کو سوچ سوچ کر ہلکان کرنے لگی۔

ہمارے معاشرے میں ساس بہو کے روایتی جھگڑے کا تو ہمیشہ ہی چرچا رہتا ہے اور ہر خاندان کی عورتیں اس معاملے میں خاص دلچسپی لیتی ہیں اور ان کے لڑائی جھگڑے کے قصے خوب نمک مرچ لگاکر ایک دوسرے کو سناتی ہیں۔ مگر اب ان کی یہ دلچسپی ملکی حدود پار کرکے انگلستان تک بھی پہنچ گئی ہے اور ان کی اس دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے اخبار والوں نے ملکہ الزبتھ اور شہزادی ڈیانا میں ساس بہو والی روایتی چپقلش دریافت کرلی ہے اور اس کی تفصیلات بھی منظر عام پر آنے لگی ہیں۔ حال ہی میں ہم نے ایک خاتون کو کہتے سنا کہ ساس آخر ساس ہی ہوتی ہے خواہ وہ برطانیہ کی ملکہ ہی کیوں نہ ہو جائے اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتی۔ اور اسی پر بس نہیں ہمیں نند بھاوجوں کے جھگڑوں سے بھی اس قدر دلچسپی ہے جتنی ساس بہو کی لڑائی سے چنانچہ اخبار والوں نے ہماری دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے شہزادی این اور اس کی بھاوج ڈیانا میں ہونے والی مبینہ لڑائی کی تفصیلات بھی شائع کردیں۔

انگریز کو ملک سے گئے ہوئے تو مدتیں ہوئیں مگر ابھی تک ہم ذہنی طور پر انگریز کے کافی غلام ہیں۔ اپنے پرانے آقاؤں سے ہماری دلچسپی کافی حد تک برقرار ہے۔ ان کا لباس، ان کی زبان، ان کے طور طریقے جس طرح ہم نے اپنائے ہیں

اس حد تک تو شاید انھوں نے خود بھی ان پر اتنا عمل نہ کیا ہو کم از کم اب تو بہر حال نہیں کرتے۔ حد یہ ہے کہ ان کے اسکینڈل ان کے ہاں کی رومانی داستانیں ہم بڑے شوق سے نہ صرف پڑھتے ہیں بلکہ گھنٹوں ان پر گفتگو بھی کرتے ہیں شہزادی مارگریٹ کا آج بھی اگر کوئی اسکینڈل کہیں اخبار میں نظر آجائے تو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ شہزادہ چارلس اور شہزادی ڈیانا کی شادی کی فلموں نے گھروں اور کلبوں میں جس قدر رش لیا ہے اتنا تو کسی پاکستانی فلم کو بھی یہاں کے تماش بینوں نے اتنے شوق سے نہیں دیکھا۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ اگر کہیں اس فلم کی سینما ہال میں نمائش کی اجازت مل جاتی تو وہ کھڑکی توڑ ہفتے ہوتے کہ پلاٹینم جوبلی بھی منانی پڑتی۔ ویسے مایوس نہ ہوں کہ اس سلسلہ میں زیادہ کا انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ آپ کے لیے اور ہمارے اخباروں اور رسالوں کے لیے ایک تازہ اور نیا اسکینڈل یا میلا کی شکل میں حاضر ہے کسی دن کا بھی اخبار یا رسالہ اٹھا کر دیکھ لیجیے کوئی نہ کوئی خبر اس بارے میں تفصیل سے مل جائے گی۔

یوں تو ہر معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد کافی ہوتی ہے جن کو اپنے معاملات اور مسائل سے زیادہ دوسروں کے معاملات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اگر کہیں ان معاملات میں تھوڑا بہت اسکینڈل یا دوسرے الفاظ میں رومان کا پہلو نکل آئے تو پھر سونے پہ سہاگہ۔ یار لوگوں کے ایک دلچسپ مشغلہ ہاتھ آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو خصوصاً ایسے مسائل اور معاملات میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لی جاتی ہے۔ ویسے بھی ہمارے پاس وقت کی فراوانی ہے اور کرنے دھرنے کو کچھ ہے نہیں اور پھر فطرتی میلان بھی ان باتوں کی طرف زیادہ ہی ہے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اخبارات بھی قتل، اغوا، طلاق وغیرہ کے واقعات کو اپنے کالمو میں کچھ زیادہ ہی جگہ دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ واقعات بھی کافی حاشیہ آرائی کے ساتھ شائع کیے جاتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کو چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہیں اور پھر ان واقعات پر جگہ جگہ رائے زنی بھی ہوتی ہے۔ ان میں اضافہ بھی "سینہ گزٹ" کے ذریعہ ہوتا ہے اور اگر یہ نہ ہو تو نہ سننے والے کو سننے میں مزہ آتا ہے اور نہ بیان کرنے والے کا ہی دل خوش ہوتا ہے ممکن ہے اس بات میں انسانی فطرت کا بھی دخل ہو اور دوسرے ممالک میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو مگر ہمیں یقین کامل ہے کہ جس طرح ہم لوگ دوسرے ممالک کی شخصیات کے نجی معاملات میں دلچسپی لیتے ہیں اتنے وہ لوگ دوسروں کے معاملات سے باخبر ہونا ضروری نہیں خیال کرتے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ کیونکہ ہمارے معاملات اتنے دلچسپ اور رومان انگیز نہیں ہوتے کہ کوئی دوسرا ان میں کیا دلچسپی لے یا ان کی فکر کرے۔ سیاست حاضرہ اور عالمی خبروں کا تو ذکر ہی کیا ہم تو غیر ملکی ایکٹروں، ایکٹرسوں، شہزادے شہزادیوں کی شادی بیاہ، منگنی، طلاق وغیرہ کے معاملات میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں جتنی کہ اپنے رشتہ داروں، عزیزوں اور دوستوں کے معاملات میں بھی نہیں لیتے۔

ہمیں یقین کامل ہے کہ شہزادہ فلپ اور ڈیانا کی منگنی سے لے کر شادی اور پھر بچوں کی پیدائش تک کے واقعات بعد حالات میں جس طرح ہم لوگوں نے دلچسپی لی ہے اتنی شاید ان کے اپنے ملک کے لوگوں نے بھی نہ لی ہو۔ اس تمام عرصہ میں کسی دن کے اخبار بھی ان کے حالات اور روزمرہ کے ہونے والے چھوٹے چھوٹے واقعات سے خالی نہیں ہوتے تھے۔ نہ صرف یہ کہ ہر واقعہ کی جزئیات تک مفصل طور پر بیان کی جاتی تھیں بلکہ ان کو جگہ بھی صفحہ اول پر دی جاتی تھی۔ یہ تو روزنامے کے اخبارات کا حال تھا ہفتہ وار اور ماہوار رسالے اور میگزین بھی انہی باتوں سے پر ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ عروسی جوڑے کی مکمل تفصیل لاگت اور اس کی سلائی تک کا ذکر نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ یہ تو تحریروں کا حال تھا۔ تقریبات کی تصاویر اور ان کے

عللہ تھیں جو مختلف اخبارات کی زینت بنتی تھیں ۔ اور جب خدا خدا کرکے شادی کا ہنگامہ ختم ہوا تو فوراً یار لوگوں نے شادی کی فلم وی سی ۔ آر دکھنی شروع کردی ۔ ہمارے اس شہر میں جگہ جگہ گھروں پر اس فلم کی نمائش کے دعوت نامے جن میں کھانا بھی شامل تھا اس طرح جاری ہوتے تھے گویا صاحب خانہ کی اپنی بیٹی یا بہن کی شادی کی فلم دکھائی جا رہی ہے ۔ اب آپ سے کیا چھپائیں ہمیں خود کھانے کی خاطر دو دفعہ یہ فلم دیکھنی پڑی ۔ بہت سے لوگوں نے تو صرف اس ڈر سے یہ فلم دیکھی کہ کہیں ہائی سوسائٹی میں کوئی پوچھ بیٹھا کہ آپ نے وہ فلم نہیں دیکھی تو خواہ مخواہ خفت اٹھانی پڑے گی اور ہم جیسیوں اور فیشن ایبل لوگوں میں دقیانوسی کہلائیں گے ۔ ابھی شادی کا ہنگامہ ختم نہیں ہوا تھا کہ بچے کی خبر آگئی اور اس طرح مبارک سلامت کا غلغلہ مچا کہ گویا اپنے ہی خاندان میں خوشی ہونے والی ہے اور اس وقت تک ہم لوگ چین سے نہیں بیٹھے جب تک صاحبزادے بلند اقبال تولد نہیں ہو گئے ۔ ابھی موصوف نے آنکھ بھی نہیں کھولی تھی کہ ساس بہو کے جھگڑوں کی خبریں آنے لگیں اور پھر ہم لوگ کام سے لگ گئے ۔ ابھی اس طرف سے کچھ اطمینان ہوا تھا کہ خبر آئی کہ جناب فیگان شاہی محل میں جا کودے اور یار لوگوں کو پھر مشغلہ ہاتھ آگیا ۔ اخباروں کی بکری ایک دم سے بڑھ گئی ۔ ہر قسم کی قیاس آرائیاں اور گل افشانیاں شروع ہو گئیں ۔ ہر متعلقہ اور غیر متعلقہ شخص کا مفصل انٹرویو لیا جانے لگا اور اس میں خوب نمک مرچ لگا کر اس کو اخبارات کی زینت بنایا گیا ۔ وہاں سے یہ خبریں کچھ ادھر حاشیہ آرائی کے ساتھ ہمارے اخباروں اور رسالوں تک بھی پہنچیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جو اخبار یا رسالہ بھی اٹھا لو اس میں یہی ذکر تھا ۔

●●

اسماعیل ظریف (حیدرآباد)

....پی ایچ ڈی ہے

ایسے ویسوں کی یہاں دال کہاں گلتی ہے
اچھے اچھوں ہی نے جلسوں کی صدارت کی ہے

دستو بار میں دیسی بھی بہت مہنگی ہے
تاڑ بن چلیے کہ ہر چیز وہاں سستی ہے

اک مرا دوست جو خودساختہ پی ایچ ڈی ہے
قطب مینار سے بھی اس کی اُنا اونچی ہے

بات مہمل سہی بکواس سہی کچھ بھی سہی
بات جو سب کو پسند آئے وہی اچھی ہے

آخری ہفتے میں تھا گھر میں خزاں کا منظر
پہلی تاریخ سے پھر گھر میں بہار آئی ہے

اُن کی انگڑائی میں وہ بات کہاں ہے یارو
اعصاشکنی کا سبب ہے یہ جو انگڑائی ہے

نوکرانی کی میں تعریف بہت کرتا ہوں
جانے کیوں بات یہ بیگم کو بُری لگتی ہے

میاں بیوی کو لڑا دیتی ہے وہ آپس میں
گھر کے بازو ہی محلّے میں جو اک جھجی ہے

کون کہتا ہے اسے کثرتِ اولاد حضور
صرف نو بیٹے ہیں بھائی کو تو اک بیٹی ہے

شادی معیاری کریں گے وہ یقیناً کیوں کہ
لڑکی کالی ہے ذرا ناک بھی نیپالی ہے

آپ کو اپنے پڑوسی سے شکایت ہے جناب
میری بستی میں بھی بخشی ہوئی اک ہستی ہے

شیخ صاحب کے یہ چہرے پہ جو چکناہٹ ہے
آج بھی ان کی رگوں میں وہی اصلی گھی ہے

ویسے ہر بستی میں یک جہتی بھی ہوگی لیکن
بار میں دیکھیے چل کر وہاں یک جہتی ہے

ناس لینے کے بھی انداز جدا ہیں سب کے
ناک والوں نے بھی کیا خوب ادا پائی ہے

آپ کی ناک کا کیا پوچھتے ہیں حال حضور
ناک کی ناک ہے شہنائی کی شہنائی ہے

ہیں ظرافت میں بھی پوشیدہ حقائق یارو
طنز کے پردے میں حق بات کہی جاتی ہے

زندہ دل لوگ سمجھتے ہیں ظرافت کو ظریف
مردہ دل لوگوں کو یہ بات کہاں جچتی ہے

گذارش

ایک شاعر پہ بھری محفل میں ہوٹنگ ہوگئی
اس کی بیگم بھی زنانے میں اسی محفل میں تھی۔

گھر پہنچ کر یوں کہا بیگم نے شاعر سے حضور
پاؤں پڑتی ہوں تمھارے یہ گزارش ہے مری

معاف کردوں گی مہر میں چھوڑ دیجے شاعری

رشید الدین (حیدرآباد)

ہم نے اپنے بچوں کو پڑھایا!

خدائے بزرگ و برتر نے اور چیزوں کے ساتھ ساتھ ہمیں اولاد کی دولت سے بھی نوازا ہے۔ ماشاءاللہ گھر میں بہت سے بچے ہیں۔ ہر عمر اور ہر سائز کے۔ جن کی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہم صبح سے شام تک کمانے کی دھن میں سرگرداں رہتے ہیں۔ لیکن صرف کمانے ہی سے بچوں کے تئیں ہم اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو سکتے ان کے کھانے پینے اور کپڑے لتے کے علاوہ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی تو اہتمام کرنا پڑتا ہے بلکہ زیادہ اہم بات تو یہی ہے ورنہ کوئی منہ پھٹ زمانہ بچوں کی بدتمیزی پر کہہ دے گا :

"کیا تمھارے ماں باپ نے تمھیں یہی سکھایا ہے؟"

اسی لیے اس طعنے سے بچنے کے لیے ہم نے ہمیشہ ہی اپنے بچوں کی طرف توجہ کی ہے۔ انھیں محلے کے آوارہ لڑکوں سے دور رکھا اچھے اسکول میں ان کی تعلیم کا انتظام کیا۔ ان کے یونیفارم، کتابوں، کاپیوں اور جیب خرچ کا ہمیشہ خیال رکھا۔ کیوں کہ آپ کو تو معلوم ہی ہے ان دنوں کوئی بچہ جیب خرچ کے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں نکالتا۔ پہلے زمانے میں سنا ہے بچوں کے ہاتھ پیسہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ماں باپ خود ضروریات کی چیزیں خرید کر لا دیا کرتے تھے لیکن آج کل کے بچوں کو ماں باپ کی لائی ہوئی چیزیں پسند نہیں آتیں۔ اس لیے ان کے ہاتھ میں پیسہ دینا ضروری ہے۔

ہم بہت مطمئن اور خوش تھے کہ چلو ہم نے بچوں کے تئیں اپنی ذمہ داری نبھا دی ہے اور انھیں راہ پر لگا دیا ہے یعنی اسکول کا راستہ بتا دیا ہے لیکن ایک دن اچانک یہ عقدہ کھلا کہ صرف یہی کافی نہیں ہے کچھ اور بھی کرنا ہوگا۔ ہمارے دوست خواجہ صاحب نے یہ کہہ کر ہماری آنکھیں کھول دیں کہ وہ روزانہ تین گھنٹے اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ہم نے پوچھا کہ اس کی کیا ضرورت ہے۔ جب بچے اسکول جا رہے ہیں تو کیا یہ کافی نہیں ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ بالکل کافی نہیں ہے۔"

ہم نے انھیں سمجھانے کی کوشش کی کہ بچوں کو شریک کراتے وقت ڈھیر سا ڈونیشن دیا گیا اور ہر ماہ اتنی بڑی فیس دے رہے ہیں اور اس اسکول کا شہر میں جو اتنا شہرہ ہے تو پھر مزید توجہ کی کیا ضرورت ہے وہ بولے "یہ سب چیزیں اپنی جگہ درست لیکن آپ کو بھی گھر میں بچوں کی طرف توجہ دینا ضروری ہے"۔ ہم نے کہا "ہمارے ماں باپ نے گھر میں کون سی ہماری طرف توجہ دی تھی۔ پھر بھی یونیورسٹی کی سب سے بڑی ڈگری ہمارے پاس ہے اور اسی ڈگری کی بدولت ہم ہر ماہ ڈھیر سی تنخواہ پا رہے ہیں۔ پھر نہ ہمارے ماں باپ نے ہمیں شریک کراتے وقت کوئی ڈونیشن دیا تھا اور نہ ہر ماہ ڈھیر سی فیس دی تھی" اس پر خواجہ صاحب بولے "اجی جناب! آپ کا دور ہمارا زمانہ اور تھا۔ اب وہ زما...

ہو گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے اور امیر خاں بٹیر لڑایا کرتے تھے۔ اب تو مسابقت کا زمانہ ہے۔ بچّے اگر زیادہ نمبر نہیں لائیں گے تو انھیں بڑی جماعتوں میں داخلہ ہی نہیں مل سکے گا۔"

بات کچھ کچھ ہماری بھی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ اس لیے ہم نے بھی طے کیا کہ روزانہ گھنٹہ دو گھنٹے بچّوں کے ساتھ بیٹھ جایا کریں گے۔ جب ہم نے اپنی نصف بہتر سے یہ خیال ظاہر کیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ بھلا اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ کوئی باپ دن بھر آفس میں سر کھپا کر رات میں دیر گئے تک اپنے بچّوں کے ساتھ اسٹڈی میں شریک رہے۔

رات جب بچّے پڑھنے بیٹھے تو ہم بھی ایک کرسی لے کر ان کے قریب بیٹھ گئے اور ایک ناول کا مطالعہ شروع کر دیا۔ خیال تھا کہ بچّے ہمیں قریب پا کر اسٹڈی کی طرف زیادہ دھیان دیں گے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ کوئی پنسل چھیلتا رہا تو کوئی کاپی پر اسکیچ بناتا رہا۔ کوئی کتابوں، کاپیوں پر کور چڑھاتا رہا تو کوئی میز پر ہی سر رکھ کر سوتا رہا۔ تب ہمیں بتایا گیا کہ یہ طریقہ بچّوں کے ساتھ بیٹھنے کا نہیں ہوتا بلکہ بچّوں کے ساتھ بیٹھنے کا مطلب انھیں پڑھانا ہوتا ہے۔

اب یہ تو ہم سے ہو نہیں سکتا تھا۔ زندگی میں کبھی کسی کو پڑھایا نہیں۔ اب کیا خاک پڑھائیں گے اور وہ بھی اپنے بچّوں کو۔ لیکن کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ بچّوں کے مستقبل کا معاملہ تھا۔ اس کا حل ہم نے یہ نکالا کہ کوئی ٹیوٹر رکھ لیا جائے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اتنے بندھے ٹکے بجٹ میں ٹیوٹر کی تنخواہ کہاں سے نکلے گی۔ شریمتی جی سے رجوع ہوئے تو انھوں نے حسب معمول گنجائش نکالنے سے صاف انکار کر دیا۔ لاچار ہم ہی کو کوئی ترکیب نکالنی پڑی۔ بہت سوچا تو خیال آیا کہ کیوں نہ سگریٹ چھوڑ دیا جائے اس سے جو بچت ہوگی اس میں اور کچھ شریک کر کے ٹیوٹر کی تنخواہ دے دی جائے گی۔

چنانچہ اب شد و مد کے ساتھ ایک ٹیوٹر کی تلاش شروع ہوئی۔ ایک صاحب نے ایک بڑے میاں کا پتہ دیا۔ ان کے پاس گئے تو وہ اتنے ضعیف نکلے کہ ان کی جان ان پہ بھاری معلوم ہوئی۔ وہ بچّوں کو کیا پڑھاتے۔ ایک صاحب نے ایک نوجوان کا پتہ دیا۔ انھیں دیکھا تو ایک ٹیوٹر سے زیادہ ہیرو لگے۔ اب ایسے شخص کی گھر میں آمد و رفت اور نشست و برخاست کچھ مناسب نہیں معلوم ہوئی۔ ایک عورت کا بھی کسی نے پتہ دیا لیکن ہماری اہلیہ کسی طرح ایک عورت سے اپنے بچّوں کو پڑھوانے تیار نہیں ہوئیں۔ پڑھوانے کیا اصل میں گھر میں آنے جانے پر معترض ہوئیں۔ بڑی مشکل سے ایک ادھیڑ عمر کے صاحب ملے۔ انھوں نے شرط رکھی کہ پڑھانا شروع کرنے سے پہلے انھیں چائے دینی ہوگی۔ چائے کے ساتھ اگر بسکٹ یا پیسٹری اگر ہو تو مناسب رہے گا۔ تازہ اخبار پڑھنے کے لیے دینا ہوگا اور ہفتہ میں ایک چھٹی دینی ہوگی۔ فیس بھی انھوں نے معقول ہی مانگی۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ غرض مند کے عقل نہیں ہوتی تو ہم نے بھی ان کی تمام شرطیں بلا چوں و چرا قبول کر لیں۔ اب وہ جو پہلے دن آئے تو انھوں نے آتے ہی ٹھنڈا پانی مانگا پھر اخبار پڑھنے میں لگ گئے۔ اخبار ختم کیا تو چائے آگئی۔ کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں۔ بچّوں کے نام پوچھے اور یوں ایک گھنٹہ ختم ہو گیا۔ روز کا معمول کچھ ایسا ہی رہا۔ ایک دن چشمہ بھول آئے۔ ظاہر ہے کہ بغیر چشمے کے کیا خاک پڑھائی ہوتی اور پھر غیر حاضریاں بھی بہت ہونے لگیں۔ اس لیے ہم نے ایک دن بیوی سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ "یہ معاملہ تو کچھ ٹھیک نہیں ہے"۔ وہ تو پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں بولیں "اجی کہیں اونٹ پر بیٹھ کر بھی بکریاں چرائی جاتی ہیں۔ اپنے بچّے ہیں۔ آپ ہی کو پڑھانا چاہیے۔"

خود پڑھانے کے نام سے تو یکبارگی ہمیں جھرجھری آگئی ۔ بھلا ہم کیا خاک پڑھائیں گے بچّوں کو۔ خواجہ صاحب سے رجوع کیا تو وہ بھی یہی بولے کہ "آخر اپنا درد اپنا درد ہوتا ہے دوسرے کو کیا ضرورت پڑی کہ وہ آپ کے بچّوں کے ساتھ اپنا سر کھپائے۔" ہمیں بھی پھر سگریٹ پینے کا موقع مل رہا تھا کیوں کہ ٹیوٹر کو برخاست جو کر دیا تھا۔ دو تین دن اپنے آپ کو تیار کرنے میں لگ گئے۔ پھر جو نصاب دیکھا تو پسینے چھوٹنے لگے۔ چھوٹی جماعتوں میں ایسی ثقیل کتابیں ۔ آخر بچے ہیں یا بلا۔

بالآخر ایک دن ہمت کرکے رات کا کھانا جلد کھا کے ہم بچّوں کو پڑھانے بیٹھے ۔ حساب تو کسی طرح اپنے بس کی بات نہیں تھی کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ یہ علم کسی دل آزار شخص نے شریف لوگوں کو پریشان کرنے کے لیے ایجاد کیا تھا۔ جب تک اسکول میں رہے کبھی ریاضی میں ڈھنگ کے نمبر نہیں آئے۔ اب ہم اپنے بچّوں کو کیا خاک پڑھائیں گے ۔ اس لیے ہم نے بچّوں سے کہا کہ یہ سبجکٹ تم خود پڑھ لینا ۔ بڑے فرزند نے کہا کہ "پپا اسی میں تو ہم کمزور ہیں اور ٹیوشن کی ضرورت ہے۔" ہم نے "پھر دیکھیں گے" کہہ کر ٹال دیا ۔ اب آیا سائنس کا نمبر۔ ایسی موٹی موٹی کتابیں کہ دیکھ کر ہی پسینہ آجائے ۔ اب جو کتاب کھول کر دیکھتے ہیں تو ہر جملہ ہمارے اوپر سے گزر گیا" ہم نے اردو میڈیم میں سائنس پڑھی تھی اور یہ تو انگریزی میڈیم کی کتابیں تھیں ۔

سائنس کی کتاب ایک طرف رکھ کر انگریزی کتاب اٹھائی۔ ہم نے برٹش انگلش پڑھ رکھی تھی اور یہ تو امریکن انگلش تھی۔ باربار ڈکشنری دیکھتے اور قبل از قبل اسٹڈی کیے بغیر ہم یہ بھی پڑھانے سے قاصر تھے ۔ اب رہا سوال تاریخ و جغرافیہ کا بچّوں نے کہا وہ اس سبجکٹ کے گھر پر پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتے ۔ یہ ہمیں کلاس ہی میں سمجھ میں آجاتا ہے ۔ بڑے بچّوں سے فارغ ہو کر ہم چھوٹے بچّوں کی طرف رجوع ہوئے۔

اب جو انھیں دیکھتے ہیں تو الف کا نام بھالا نہیں آتا ۔ بڑی کوفت ہوئی کہ آخر اسکول میں ٹیچر کیا پڑھاتے ہیں بچّوں اور خصوصاً چھوٹے بچّوں کو پڑھانا کتنا کاردارد ہے ۔ یہ ہمیں اب معلوم ہوا ۔ ایک لڑکے نے سوال کیا "پپا جب بی یو ٹی بٹ ہوتا ہے تو پی یو ٹی پٹ کیوں نہیں ہوتا پُٹ کیوں ہوتا ہے" بھلا اب ہم اس بات کا کیا جواب دیتے صرف اس کا کان مروڑ کر رہ گئے کہ یہ کیا غیر ضروری بکواس ہے ۔ ایک بچّے نے پنسل چھیلتے چھیلتے انگلی کاٹ لی ۔ اسے پٹی باندھنی پڑی ۔ گوشمالی بھی کرنا چاہتے تھے لیکن ڈر تھا کہ وہ کہیں رونا شروع کردے ۔ اس لیے خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے ۔ ایک صاحب زادے میز پر سر رکھے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے ۔ انھیں پنسل مار کر جگایا ۔ جس سے پنسل کے دو ٹکڑے ہوکر دو طرف گر گئے ۔ نقصان ہمارا ہی ہوا ۔ اب صبح دوسری پنسل لے کر دینی ہوگی ۔ عجیب مصیبت ہے ۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہونے لگی کہ خواہ مخواہ یہ دردِ سر مول لیا ۔ جب بچے پیدا کیے تو یہ کیا ضروری ہے کہ انھیں پڑھایا بھی جائے ۔

ایک اور بچے کی طرف رجوع ہوئے تو معلوم ہوا کہ صاحب زادے کی آدھی کتابیں غائب ہیں ۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ کچھ پھٹ گئیں اور کچھ بعض لڑکوں نے مانگ رکھی ہیں ۔ اب تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا ۔ ایک تو اتنی قیمتی

کتابیں انھیں خرید کر دی جائیں اور صاحب زادے ان کے ساتھ یہ سلوک کریں۔ تڑاخ سے گال پر ایک طمانچہ رسید کر دیا کہ کیا تھیں کتابیں دوسروں کو بانٹنے کے لیے خرید کر دی تھیں۔ اس نے اس زور سے رونا شروع کر دیا کہ سارا گھر گونج اٹھا۔ اسے روتا دیکھ کر دوسرے چھوٹے بچے بھی رونے لگے اور اچھا خاصہ کہرام مچ گیا۔ یہ شور و غل سن کر باورچی خانہ کی طرف سے ہماری اہلیہ محترمہ دوڑی دوڑی آئیں کہ کیا ہوا۔ بڑے بچوں نے سارا ماجرا کہہ سنایا بلکہ کچھ اپنی طرف سے نمک مرچ بھی لگادی۔

اب غصے میں آنے کی باری ہماری اہلیہ کی تھی۔ کہنے لگیں "ہائے ہائے کیا زور کا چانٹا مارا۔ پانچوں انگلیاں ابھر گئیں۔ بھلا ایسا بھی کوئی مارتا ہے اتنے چھوٹے بچے کو۔ ایسا کیا کر دیا تھا اس نے۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ خود کو پڑھانا نہیں آتا اور غصہ بچوں کی پٹائی کرنے۔ کیا ایک آپ ہی کو بچے ہیں اور لوگوں کو بچے نہیں۔

غرض حضرات! یہ پروگرام بہت دیر تک چلتا رہا۔ ہم اس کی مزید روداد سنا کر آپ کو بے مزہ کرنا نہیں چاہتے کیوں کہ آپ بھی اس نوعیت کے کسی اور مسئلے سے دو چار ہوں گے۔ قصہ مختصر یہ کہ وہ دن اور آج کا دن۔

پھر ہم نے اپنے بچوں کو پڑھانے کی جسارت نہیں کی۔ ہاں ان اساتذہ کے حق میں دعائے خیر ضرور کرتے ہیں جو بچوں کو اور خصوصاً چھوٹے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان کو جنت ملنے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

●●

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے مجموعے

قصہ مختصر
۱۲ روپے

آدمی نامہ
۱۲ روپے

قطع کلام
۱۲ روپے

تکلف برطرف
۱۲ روپے

بالآخر
۱۲ روپے

الغرض
۵ روپے

سو ہے وہ بھی آدمی
(خاکے) ۱۲ روپے

جاپان چلو
(سفرنامہ) ۱۲ روپے

بتوسط شگوفہ

غزلیں

پاگل عادل آبادی

ہر اک جنکشن پہ فیل ہے پیارے
پر بڑھاپے کی ریل ہے پیارے
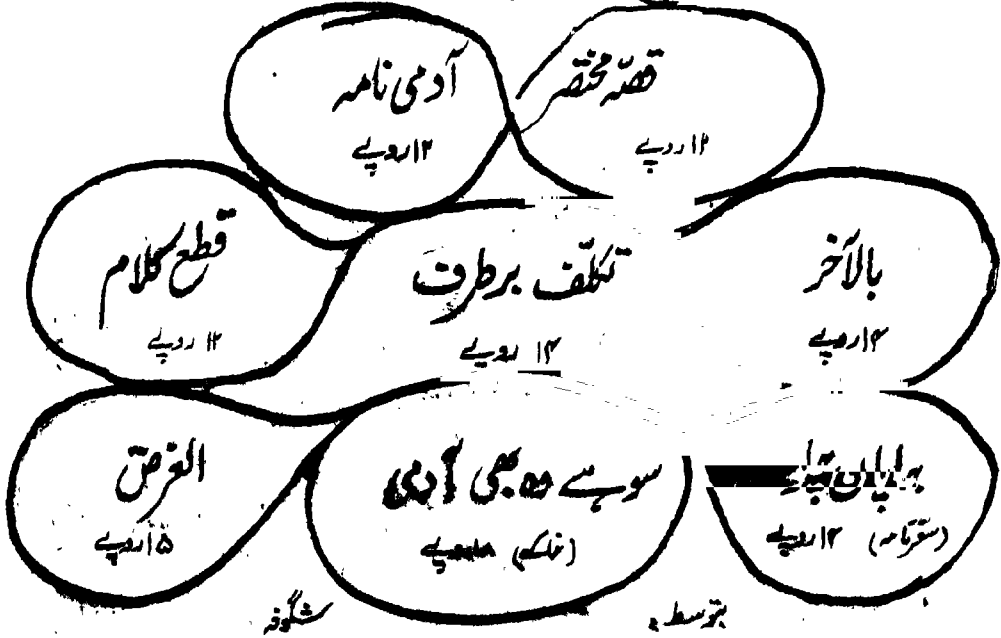
مرمٹا تھا میں جس کی صورت پر
وہ حسیں اب چڑیل ہے پیارے

زلفِ کشمیر جس کو میں سمجھا
وہ بھلا وین کا تیل ہے پیارے

وہ کبھی توپ تھا ایٹم بم تھا
آج تو اک غلیل ہے پیارے

چال کچھوے کی تھی لڑکپن میں
اب وہ طوفان میل ہے پیارے

جس کو کہتے ہیں آج لو میریج
گڈا گڈی کا کھیل ہے پیارے

گھر جنوائی بن کے تو ہوا قیدی
تیری سسرال جیل ہے پیارے

شیخ پیچھا کرے حسینوں کا
نامناسب یہ فعل ہے پیارے

جیت جس کی ہوئی الیکشن میں
وہ تو چنو پٹیل ہے پیارے

پگلی بی-اے بی ایڈ اور پاگل
نرسری میں بھی فیل ہے پیارے

●

مجھ پہ غصہ نکالتے کیوں ہو
مار کر کِک اچھالتے کیوں ہو

اپنے سسگوں کو پالتے کیوں ہو
میرا مردہ نکالتے کیوں ہو

کوئی کتا نہیں ہوں عاشق ہوں
لے کے ڈنڈا ہکالتے کیوں ہو

تم سے دستی سنبھل نہیں سکتی
تھالی پورا سنبھالتے کیوں ہو

چھوڑ دو چپ رہو خدا کے لیے
رنگ میں بھنگ ڈالتے کیوں ہو

دم پہ رکھی ہوئی ہے بریانی
سیٹ اپنی سنبھالتے کیوں ہو

چھالیہ جب تمھیں چبانا ہے
جو کرا پھر نکالتے کیوں ہو

بھُگا ہو جائے گا ابھی خالی
جو ہوا ہے نکالتے کیوں ہو

یہ تو پہلی غزل ہے پاگل کی
ابھی جوتے سنبھالتے کیوں ہو

(نئے سال پر کہی گئی)

تیور اس سال کے کہتے ہیں نرالے ہوں گے
دوش پہ لیڈر کے نئے شال دوشالے ہوں گے

حاجی باٹ اب کے سنبھالیں گے سنا سادھو لوگ
جپو اک ہاتھ میں اک ہاتھ میں مالے ہوں گے

چاہئے ایک مہینے میں اجابت تیکی گے اس سال
ایک پیالی میں ربع پیالی کے پیالے ہوں گے

بھاگ جائیں گے سپیرے سبھی فٹ پاتھوں پر
اب دفاتر میں سبھی کالے ہی کالے ہوں گے

رہتا بنگلے میں فٹ پاتھ پہ سارے ووٹر
کس طرح ڈھونڈ کے یہ راہ نکالے ہوں گے

رنگ دولہے کا کوئی پوچھنے والا ہی نہیں
ہو دلھن گوری، وہ ہر چند کہ کالے ہوں گے

ایسے اشخاص کا ہوگا نہیں مردوں میں شملہ
نیکیاں کر کے جو دریا میں نہ ڈالے ہوں گے

خوب اکڑتے ہوئے پھرتے ہو مگر یاد رکھو
گردنیں دے کے کبھی دیس نکالے ہوں گے

چھپ سے انسانوں کے دے دیتے ہیں اندر کا پتہ
جیسی کچھ شکل ہو کچھ ویسے ہی چالے ہوں گے

ہوئے تعلیم سے آراستہ صاحب زادے
آپ بتلائیے اب کس کے حوالے ہوں گے

مات کھا جائے گا وہ گاؤدی کہلائے گا
جس کی باتوں میں نہ کچھ مرچ مسالے ہوں گے

خوش نویسوں کی تو پہچان یہی ہے غالب
گرد آنکھوں کے کئی حلقے و ہالے ہوں گے

شیخ جو صاحبِ سیم و زر ہو گیا
دفعتاً شہر کا دیدہ ور ہو گیا

ہر قدم پر اسے کامیابی ملی
جو بھی بیوی کے زیرِ اثر ہو گیا

اب غزل کا ہے معیار بدلا ہوا
بس دنارے دنارے دنر ہو گیا

چال کوا بھی چلنے لگا ہنس کی
اب زمانہ ادھر سے ادھر ہو گیا

آج مدقوق ذوقِ نظر دیکھ کر
فکر و فن کو بھی اب کینسر ہو گیا

شیخ سعدی کا سایہ جو بازغ پہ ہے
اس لیے شاعرِ دبنجر ہو گیا

بازغ بہاری کلکتوی

دلاور فگار

ہم سے سنیے شباب کی باتیں

میری شاعری کے بچپن نے بدایوں میں آنکھ کھولی۔ ۱۳، زمانے میں میرا تخلص شباب تھا۔ اس زمانے کے کچھ دل چسپ واقعات جو کتاب زندگی کے اوراق الٹتے ہوئے یاد آتے ہیں، نذرِ قارئین ہیں۔

علی حاتم مرحوم میری دادی کے سگے بھائی تھے۔ طبیعت میں بلا کی ذہانت اور ظرافت تھی۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ قطعات کا مجموعہ "طوفانِ ترقی" کے نام سے نظامی پریس بدایوں سے شائع ہو چکا ہے۔ ہر دل چسپ شخصیت کی ہجو کہہ دی ہے لیکن جذبے کی صداقت اور نیک نیتی کا یہ عالم تھا کہ جس کی ہجو کہتے تھے سب سے پہلے اسی کو سنا دیتے تھے اور وہ شخص بھی اس قدر بلند کردار ہوتا کہ ہجو کو مذاق سمجھ کر اڑا دیتا تھا۔ بدایوں میں ایک ایڈیٹر تھے۔ وہ علی حاتم صاحب کی طنزیات کا مستقل موضوع ہوتے تھے۔ آدمی کچھ حکام پرست تھے۔ حکومت سے خطابات بھی پا چکے تھے ایک روز ان کو بخار آ گیا تو جوائنٹ مجسٹریٹ (جنٹ صاحب) ان کی عیادت کے لیے آئے۔ ایڈیٹر صاحب نے عیادت کی خبر اپنے اخبار میں نمایاں طور پر شائع کی۔ علی حاتم صاحب نے یہ خبر پڑھی، ان کو یہ قطعہ پیش کیا:

خوشی ہوتی، ترقی ہوتی عزت و توقیر میں ہوتی
بدایوں سے بریلی تک تمہارا نام ہو جاتا
بخار آیا تو تم کو جنٹ صاحب دیکھنے آئے
کمشنر دیکھنے آتا اگر سرسام ہو جاتا

ایک صاحب نے نظر کی کمزوری کی وجہ سے عینک استعمال کی تو علی حاتم مرحوم نے فرمایا:

جیسا کھیاں لگائی ہیں پائے نگاہ میں
یوں تو نظر جناب کو عینک کا شغل ہے

بدایوں میں ایک دن میونسپل بورڈ کی طرف سے قوالی کا پروگرام ہوا جس میں اس وقت کا مشہور قوال بجتا بلوایا گیا تھا۔ میونسپل بورڈ کے چیرمین ۔۔۔ بخش صاحب تھے جن کی اولاد کے ناموں کے آخر میں بھی بخش آتا تھا مثلاً جلیل بخش، کفیل بخش، جمیل بخش وغیرہ۔ علی حاتم صاحب نے بجتا قوال کی آمد پر یہ قطعہ کہا:

جذبۂ حبِ وطن کہیے یہ ان پر اعتراض
مولوی صاحب سے دیکھیں کیا لئے ہیں کارِ خیر
آپ نے بجتا کو میرٹھ سے عبث تکلیف دی
گھر کے "بخشوں" میں سے کر لیتے کسی کا انتخاب

بدایوں میں ایک صاحب کی اولاد کا نام ماجد الاسلام، خالد الاسلام، واحد الاسلام، حامد الاسلام وغیرہ تھا صاحب موصوف نے علی حاتم صاحب سے مشورہ کیا کہ اب جو نومولود بیٹا ہوا ہے اس کا کیا نام رکھا جائے۔ علی حاتم مرحوم نے جواب دیا کہ اب تو اس ردیف میں ایک ہی نام رہ گیا ہے یعنی "خارج الاسلام"۔

بدایوں میں جو طرحی مشاعرے ہوتے تھے، ان میں اساتذہ کی موجودگی میں لڑکوں کا ترنم سے غزل خوانی ہونا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ چناں چہ ایک ممتاز شخصیت نے اپنے بیٹے کو مشاعرے میں اس شرط پہ شریک ہونے کی اجازت دی تھی کہ غزل تحت اللفظ پڑھیں گے ترنم سے نہیں۔ ایک مرتبہ اس نوجوان شاعر نے یہ دیکھ کر کہ والد قبلہ مشاعرے میں موجود نہیں ہیں، ترنم سے غزل شروع کر دی۔ اب یہ شاعر کی شامتِ اعمال کہ ادھر غزل کے مطلع کا پہلا مصرع ترنم سے پڑھا کہ ادھر والد قبلہ مشاعرہ گاہ میں داخل ہوئے۔ شاعرِ موصوف نے جیسے ہی والد موصوف کو مشاعرہ گاہ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تو فرمایا "خواتین و حضرات اب چونکہ والد صاحب تشریف لے آئے ہیں شعر کا مصرع ثانی تحت اللفظ سن لیجیے"۔

ممتاز غزل گو اور بالخصوص نعت کے شاعر جناب منور بدایونی مرحوم مشاعرے میں تازہ غزل پڑھ رہے تھے۔ ابھی مطلع کا پہلا مصرع ہی پڑھا تھا کہ ؏

دو کروٹوں میں رات بسر ہو کے رہ گئی

منور صاحب کہہ رہے تھے کہ دو کروٹوں کو مدِ نظر رکھ کر دوسرا مصرع سنیئے۔ ابھی وہ دوسرا مصرع پڑھ نہ پائے تھے کہ ذوالفقار بدایونی مرحوم نے گرہ لگا دی کہ ؏

کروٹ جو تیسری کی سحر ہو کے رہ گئی

اور اب تذکرہ ایک ایسے خود رو مزاح نگار کا جو حرف شناس نہیں تھا مگر صورت شناس اور مردم شناس بلا کا تھا اور استادِ محترم جام نوائی بدایونی کے پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد ہم اس کی خدمت کر رہے تھے۔ ایک مرتبہ بمبئی میں ایک آل انڈیا طرحی مشاعرہ ہوا تھا۔ طرح یہ تھی ؏

بلا عینک کے سویا تھا تو دیکھا میں نے خواب آدھا

مشاعرے میں نرگس، سنیل دت، دلیپ کمار . . . .

راج کپور، جانی واکر، نوشاد، مجروح سلطانپوری وغیرہ ساری فلمی شخصیات سامعین کی حیثیت سے شریک تھیں۔ یہ واقعہ تقریباً ۱۹۵۶ء کا ہوگا۔ ہمارے مزاح نگار شاعر نے جب اپنی مزاحیہ غزل کے یہ شعر پڑھے تو سماں بندھ گیا۔

بہ ایں امید ہم ایامِ حج میں بمبئی آئے
کہ مل جائے قیامت میں ہمیں حج کا ثواب آدھا

جو مطلب کی عبارت تھی اسے بیچوں بیچ گھس ڈالا
کبوتر لے کے آیا ہے مرے خط کا جواب آدھا

سنا ہے نصف بہتر بھی کہا جاتا ہے بیگم کو
تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شوہر ہے خراب آدھا

شاعر موصوف انگریزی تو انگریزی اُردو سے بھی نابلد تھے مگر ہر سوٹڈ بوٹڈ شخص کو خفیہ پولیس کا آدمی اور اس کی انگریزی آمیز گفتگو کو دھمکی سمجھتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے ایک سیاسی مصرع پر اُن کو اس قسم کے حالات سے گزرنا پڑا تھا یعنی کا یہ آل انڈیا طرحی مشاعرہ ختم ہوا تو کسی فلم پروڈیوسر یا ڈائرکٹر نے انگلش لہجے میں اُن سے کہا "ہم اس غزل کے سلسلے میں تم سے (correspondence) کریں گے، اپنا پتہ بتاؤ"۔ شاعرِ موصوف کارس پانڈنس کا مطلب تو نہ سمجھ سکے لیکن اس مدّاح کو پولیس افسر سمجھے اور جوابًا بگڑ کر فرمایا "آپ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، غزل میں کوئی شعر سیاسی نہیں تھا"۔

شاعرِ موصوف ایک مرتبہ بدایوں میں ایک مقامی نشست میں حافظے سے اپنی غزل پڑھ رہے تھے لیکن سامعین کو دھوکا دینے کے لیے بیاض سامنے رکھ لی لیکن اتفاق سے دھوکا دینے والا شاعر خود بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ یعنی صورتِ حال یہ تھی کہ گھبراہٹ میں بیاض اُلٹی رکھ لی تھی۔ صدرِ مشاعرہ نے جب شاعرِ موصوف سے کہا کہ بیاض تو سیدھی رکھ کر غزل پڑھو تو جواب دیا کہ میں دونوں طرح پڑھ سکتا ہوں۔ اُلٹی بیاض سے بھی اور سیدھی بیاض سے بھی۔ اب آپ ہی کہیے کہ ایسے عالم کا کیا کرے کوئی۔

اب سُنیے بدایوں کے مضافات میں ہونے والا ایک اور دلچسپ واقعہ یہ واقعہ بدایوں سے ۴۰، ۵۰ میل کے فاصلے پر مضافات میں ہوا تھا۔ یہ واقعہ بھی تقریبًا ۱۹۵۵ء کا ہی ہے۔ ہم لوگ مع اپنے اساتذہ کے شام کو ۶ بجے مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ ظاہر ہے کہ کھانے کا انتظام تو مشاعرہ کمیٹی کی طرف سے تھا مگر رات کے ۷ بجے، ۸ بجے، ۹ بجے، ۱۰ بجے، ۱۱ بجے، ہم مہمان شعرا گاؤں کے ایک پنڈال کے نیچے بیٹھے بیٹھے تھک گئے مگر کھانا نہیں آیا۔ نہ کوئی میزبان نظر آیا کہ جو کہے کہ ماحضر تناول فرما لیجیے۔ آخر رات کے ۱۲ بجے ایک منتظم نے یہ راز کھولا کہ دعوت میں تاخیر اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ مشاعرہ کمیٹی نے آپ حضرات کی دعوت کا انتظام کرنے کے لیے ایک بڑی تندرست پٹھیا پیڑ سے باندھ دی تھی جس کو ذبح کر کے اس کا گوشت آپ کو کھلایا جاتا مگر بدقسمتی سے وہ رسّی توڑ کر بھاگ گئی ہے۔ تمام اراکینِ انجمن ادب نے اس پٹھیا کو بہت تلاش کیا مگر نہیں ملی۔ اب دال چڑھا دی ہے۔

ایک اور مشاعرہ بدایوں ہی کے مضافات میں کہیں ہو رہا تھا۔ مشاعرے میں تقریبًا (۲۰) مقامی (مضافاتی شعرا) اور (۲۰) بدایوں کے یعنی بیرونی شعرا شریک تھے۔ مشاعرے کے شروع میں صرف مقامی شعرا ہی کو پڑھوایا جا رہا تھا لیکن جب ایک گھنٹے تک مسلسل مقامی شعرا پڑھتے رہے تو ایک مضافاتی سامع نے کہا کہ یہ کیا غلط ترتیب ہے۔ ایک اِتے کا چھوڑو تو ایک اُتے کا۔

کسی اور شہر کے ایک گاؤں میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ جس میں شاہ میاں حضرت احسن مارہروی بھی شریک تھے جو اپنے آپ کو ہمیشہ فقیر کہا کرتے تھے چنانچہ جب میزبان نے شاہ میاں سے پوچھا کہ جناب کے ساتھ کتنے شاعر آئے ہیں؟ کتنے بستروں کا انتظام کیا جائے؟ تو شاہ میاں نے حسبِ دستور جواب دیا کہ پانچ شاعر ہیں اور یہ فقیر۔ یہ جواب سن کر منتظمِ مشاعرہ نے آواز لگائی "اے کلّو شاعروں کے لیے چوپال میں پانچ بستر لگا دے۔ فقیر کا کیا ہے وہ کہیں پڑ رہے گا"۔

کراچی میں ہمیں ایک مشہور پاکستانی شاعر مل گئے۔ ہوٹل میں لے گئے اور چائے سے تواضع کرنے لگے۔ ہم نے ان کے بڑے بھائی کے شعر اُن کو سنانے شروع کر دیے جو ایک مشہور بھارتی شاعر ہیں۔ ایک گھنٹے تک یہ پاکستانی شاعر اپنے سگے بھائی کی تعریف سنتا رہا پھر بگڑ کر بولا "اب ضبط نہیں ہوتا ورنہ ڈگار! یہ چائے تم کو میں نے پلائی ہے یا میرے بھائی نے"۔

قمرالزماں
(رانچی)

مشاعرہ کے لئے ٹینڈر

کل نظر میری پڑی اک معتبر اخبار پر
چھوٹے میں ایک ٹینڈر کی تھی نوٹس جلوہ گر

تھا جلی حرفوں میں "معمارِ ادب" کا اشتہار
فائدہ اس سے اٹھائیں سب ادب کے ٹھیکہ دار

انجمن 'بزمِ سخن' کا کر رہی ہے اہتمام
معتمد جس انجمن کے ہیں جناب "نام جھام"

دوسری اپریل سے درخواست اک دن قبل دیں
منسلک تجنیس کا اک نوٹ بھی اس سے کریں

ساتھ ٹینڈر کے ضمانت کی رقم بھیجیں ضرور
ورنہ دفتر اس کو رد کر دے گا فوراً ہی حضور

اپلیکیشن فارم کی ہو ٹھیک سے خانہ پری
شرط نامے کی شرائط میں نہ رہ جائے کمی

ذیل میں تفصیل ان شرطوں کی اب تحریر ہے
جو کہ "معمارِ ادب" کے خواب کی تعبیر ہے

سب سے پہلے صدر ایسا اک عدد سپلائی ہو
مطلقاً تعلیم اردو کی نہ جس نے پائی ہو

ہاں مگر ایسا سیاست دان ہو وہ کائیاں
فائدے کے واسطے جو سب کو دے دے جھائیاں

اک عدد درکار ہے "ناظم" نظامت کے لیے
شاعروں کی منچ پر اچھی حجامت کے لیے

جانتا ہو ایک اک شاعر کا جو جغرافیہ
اور لطیفہ گوئی میں بھی ہو جو ماہر مسخرا

کر سکے تنقید بے جا شاعروں کی ذات پر
بے تکے چٹکلے ہی جو کہتا رہے بس رات بھر

ایک درجن خوش گلو شاعر غزل گو چاہئیں
ساتھ ان کے دو عدد شاعر ہزل گو چاہئیں

خوش گلو شاعر پڑھے استاد کا اپنے کلام
ہو ہزل گو شاعروں کا بھانڈ کے زمرے میں نام

چار شاعر پڑھنے والے تحت میں ہوں بے لگام
جن کے اندازِ خطابت سے سہم جائیں عوام

چار ہوں آزاد بحروں کے شناور بے گماں
جن کے ہوں اشعار میں فقدانِ آہنگ و زباں

جو عروض و قافیہ کے فن سے ہوں ناآشنا
اپنی نا اہلی پہ جن کو ناز ہو بے انتہا

ختم ہو جائے کبھی بے وقت جب بزمِ سخن
معتمد کے گھر سجائی جائے شعری انجمن

کم سے کم ہوں سو عدد با ذوق ایسے سامعین
پاس انگلش میڈیم سے ہوں یہ ہوں کوٹھی کے مکین

ایسے بدذوقے بھی سپلائی ہوں کوئی دو ہزار
فلمی گانوں کی کریں فرمائشیں جو بار بار

ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں میں رہی اردو اگر
تو خدا حافظ "برج بانو" کا بھارت میں قمر

صغیر احمد سحر سندیلوی

ہم چمن آئینہ ہوں

نبن میاں! کیا چائے نہیں پلاؤ گے؟ مرزا جی نے اپنے ملازم کو آواز دی۔

"حضور! ضرور!! چائے ہی نہیں مٹھائی بھی کھلاؤں گا۔" نبن میاں چہک اٹھے۔

"مگر یہ مٹھائی کس خوشی میں کھلا رہے ہو؟" مرزا جی نے پوچھا۔

"خوشی کا موقع تو ہے ہی لیکن مٹھائی ایک شرط پر کھلاؤں گا۔" نبن میاں نے مسکرا کر کہا۔

"وہ کیا؟ مرزا جی نے تعجب سے پوچھا۔

"آپ کو میرے مجموعۂ کلام تلچھٹ پر سیر حاصل تبصرہ لکھنا پڑے گا" نبن میاں بولے۔

"تمھارے مجموعۂ کلام تلچھٹ پر تبصرہ! کیا معنی"؟ مرزا جی نے اور بھی تعجب سے پوچھا۔

"حضور گستاخی معاف . . . " مرزا جی نے ان کی بات کاٹ دی۔

"کیا تم شاعری بھی کرتے ہو! کیا تخلص ہے تمھارا! مجھے تو آج تک یہ پتا نہ چلا کہتے ہیں کہ شاعر کا ہاضمہ کمزور ہوتا ہے۔ لیکن تمھارا ہاضمہ اس مقولے کے خلاف بہت درست ہے بلکہ ایک طرح سے سخت قبض کی شکایت ہے۔ مجھ پر آج تک تم نے یہ نہ ظاہر ہونے دیا کہ تم شاعر ہو اور نہ کبھی کوئی شعر ہی سنایا۔" مرزا جی نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"حضور! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ آپ کے دادا مرحوم کے مطبوعہ دیوان میں صرف چودہ غزلیں ہیں اور ان کے بیشتر سے بیشتر شاگردوں کے دواوین میں دو دو سو غزلیں تک ہیں تو کیا آپ سمجھتے ہیں یہ سب غزلیں انھیں شاگردوں کی کہی ہوئی ہیں ظاہر ہے کہ یہ سب غزلیں آپ کے دادا مرحوم کی ہیں جنھیں انھوں نے اپنے تلامذہ کو بلا تفریق مذہب و ملت عطیہ کے طور پر تقسیم کر دیا تھا یہی آپ کے والد مرحوم کا طریقہ رہا۔ وہ جب کوئی غزل کہتے تھے وقت پر حاضر شاگردوں کو دے دیا کرتے تھے اور خود اپنے لیے ایسی ہی کوئی غزل لکھ لیا کرتے تھے اسی کمرے میں میں نے دیکھا ہے کہ صبح سے شام تک اور بعض اوقات رات گئے تک شاعروں کا مجمع رہتا تھا اور شعر گوئی کی محفلیں جمی رہتی تھیں سیکڑوں اشعار قلم زد کر کے ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیے جاتے تھے جن سے صبح کے وقت ان کی ضروریات کے لیے پانی گرم کیا جاتا تھا۔" نبن میاں کہے چلے جا رہے تھے۔

"میں یہ سب کچھ نہیں پوچھ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم شاعر کب اور کیسے ہوئے۔ وہ کون سا سانحہ تھا جس نے تم کو شاعر بننے پر مجبور کیا۔ اور تمھارا تخلص کیا ہے تم نے اپنا مجموعۂ کلام اب تک مجھے

کیوں نہیں دکھایا" مرزا جی ننھن میاں سے سوال پر سوال کرتے چلے جا رہے تھے۔

"یہی تو عرض کر رہا تھا حضور! نہ میں کبھی شاعر تھا اور نہ اب ہوں آپ تو اچھی طرح سے واقف ہیں کہ میں زیادہ پڑھا لکھا بھی نہیں ہوں ہاں اس گھرانے کے ادبی ماحول نے طریق گفتگو ضرور سکھا دیئے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں رہ کر کسی قدر اردو بولنا تو آ گیا ہے مگر تھوڑا بہت پڑھ تو ضرور لیتا ہوں لکھ اب بھی نہیں پاتا ہاں ہندی میں خط وط لکھ لیتا ہوں شعر کہنے کی صلاحیت نہ اب مجھ میں ہے اور نہ کبھی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ مجموعۂ کلام دراصل آپ اور آپ کے شاگردوں کے قلم زد اشعار پر مشتمل ہے جنھیں میں نے نذر آتش کرنے کے بجائے محفوظ کر لیا تھا جہاں پر پڑھنے میں نہیں آتا تھا کسی سے پوچھ کر ہندی میں لکھ لیتا تھا چوں کہ یہ اشعار نہ تو آپ کے کام کے تھے نہ آپ کے شاگردوں کے چوں کہ آپ کے سبھی شاگردوں کے تخلص چو حرفی ہیں تاکہ مقطعے کہتے وقت آسانی سے تخلص بدلا جا سکے اس لیے میں نے بھی اپنا تخلص نجمی رکھ لیا۔ تاکہ مقطع میں آسانی سے فٹ ہو جائے۔ اس راز سے مجھے عزمی صاحب نے آگاہ کیا بہر حال جو اشعار نہ آپ کے مطلب کے تھے اور نہ آپ کے شاگردوں کے معیار پر پورے اترتے تھے اور جنھیں کوڑا سمجھ کر پھینک دیا گیا تھا وہ میں نے اپنے دامن میں رکھ لیے تھے۔ مجھے اس بات کا پورا پورا حق بھی پہنچتا ہے۔ جب میں آپ کے دستر خوان کا بچا ہوا کھانا کھا سکتا ہوں تو آپ کی ادبی محفلوں کی جھوٹن بھی چاٹنے کا میرا حق ہے۔ آپ کے تلامذہ کے حصے کے جو اشعار تھے وہ انھیں ملے اور جو میرے حصے کے تھے میں نے لے لیے یہ کہہ کر ننھن میاں خاموش ہو گئے۔

ارے ننھن میاں میں یہ سب کچھ نہیں پوچھتا یہ تو تم نے بہت اچھا کیا تم کو اس کا حق پہنچتا تھا۔ مگر یہ بتاؤ کہ آخر تم کو ابھی سے تبصرہ کی کیا پڑ گئی" مرزا جی نے پوچھا۔

"حضور یہ بات تو میں آپ کو مٹھائی کھلانے کے بعد ہی بتا سکوں گا۔ پہلے میں چائے بنا لاؤں آپ کی باتوں میں یہ بات بھول ہی گیا تھا۔ دیکھیے اچھے میاں بسمل صاحب اور ناظم صاحب جانے کب سے منہ باندھے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کم بخت دیر بھی تو ہو گئی ہے باتوں میں پھنس کر۔

تھوڑی ہی دیر میں ننھن میاں چائے مٹھائی اور سموسہ لے کر حاضر ہو گئے۔

حضور تبصرے میں مجھے اپنے والد محترم کا شاگرد لکھنا کیوں کہ بڑی ادبی شخصیت کی حیثیت سے وہ سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے یہی سوچ کر میں نے بھی یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں آپ کے والد مرحوم کا شاگرد ہوں۔

"بھائی ابھی سے تبصرے کی کیا ضرورت پہلے تم اس کی طباعت کے لیے روپیہ تو جمع کرو۔ مرزا جی نے انھیں ٹالنے کی غرض سے کہا۔

"وہ تو ہو گیا حضور" ننھن میاں نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ کیسے مرزا جی مٹھائی اور سموسہ کھا کر چائے کی چسکی لیتے ہوئے بولے۔

"حضور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ فروغ ادب سوسائٹی آج کل اردو کی کتنی بڑی خدمت کر رہی ہے ہزاروں دیوان اس کے مالی تعاون سے منظر عام پر آ چکے ہیں لاکھوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں اس لیے میں نے بھی اپنے دیوان کا

مسودہ وہیں جمع کیا تھا۔ آپ کو یہ سن کر یقیناً خوشی ہوگی کہ آج دوپہر کو صدر محترم کا خط ملا کہ میرے مسودہ کو ادب کے ماہرین کی اشاعتی کمیٹی نے طباعت کے لائق سمجھا اور اس کے لیے مبلغ چھ ہزار چار سو بیس روپیہ دینا منظور کرلیا ہے۔ یہ دیکھیے صدر کا گرامی نامہ نبن میاں نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر مرزا صاحب کو دیتے ہوئے کہا۔

"مبارک ہو نبن میاں یہ تو بڑی خوش نصیبی کی بات ہے اگر تم برا نہ مانو تو میں تمھارا تعارف لکھ دوں اور تبصرہ انھیں ماہرین ادب سے لکھوا لیجیے چوں کہ انھوں نے آپ کا دیوان بڑی دیدہ ریزی سے دیکھا ہوگا وہ اس کے محاسن سے اچھی طرح واقف ہوں گے وہ مجھ سے اچھا تبصرہ لکھ سکتے ہیں ان کا تبصرہ بہت مناسب رہے گا۔" مرزا جی نے مشورہ دیا۔

"جی نہیں حضور تبصرہ تو آپ سے لکھواؤں گا اور زبردستی لکھواؤں گا آپ سے اچھا تبصرہ کوئی نہیں لکھ سکتا میرے دیوان کا۔" نبن میاں مچلتے ہوئے بولے۔

"مجھے تمھارے دیوان کا تبصرہ لکھتے ہوئے خوشی بے شک ہوتی لیکن تم ہی بتاؤ نبن میاں جب میں ان اشعار کو قلم زد کر کے پھینک چکا ہوں آخر اس کی بھی کوئی وجہ رہی ہوگی۔ جب وہ اشعار میرے شاگردوں کو بھی پسند نہیں آئے تو میں ان پر تبصرہ کیا کروں گا۔ چوں کہ سوسائٹی کے ماہرین ادب کی اشاعتی کمیٹی میں ایک سے ایک ذی علم حضرات ہیں۔ ان کا وسیع مطالعہ ہے اور اعلیٰ تنقیدی شعور رکھتے ہیں وہ بہترین تبصرہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کے تبصرے کے روبرو میرے تبصرہ کی کیا وقعت" مرزا جی نے تبصرہ نہ لکھنے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا جس سے کہیں نبن میاں ناراض نہ ہو جائیں وہ ان کے قدیمی ملازم ہیں۔

"کچھ بھی ہو جائے صاحب تبصرہ تو آپ کو لکھنا پڑے گا" نبن میاں نے ضد پکڑلی۔

"مجھے کوئی انکار نہیں ہے نبن میاں میں تو تمھارے فائدے کے لیے کہہ رہا تھا اچھا پہلے تم یہ بتاؤ کہ تمھیں یہ خیال کہاں سے آیا" مرزا جی نے پوچھا۔

"وہ جو ہمارے عزمی صاحب ہیں ایک دن باورچی خانے میں پہنچ گئے وہاں میرا مسودہ رکھا ہوا تھا انھوں نے اسے دیکھ کر یہ رائے دی اور سچ پوچھو تو یہ سب انھیں کا کیا دھرا ہے" نبن میاں یہ بتاتے ہوئے چائے کی ٹرے لے کر چلے گئے۔

اتنے میں عزمی صاحب تشریف لے آئے مرزا جی نے انھیں دیکھتے ہی کہا آئیے آئیے! ابھی ابھی آپ کا ہی تذکرہ ہو رہا تھا نبن میاں کے ساتھ جناب نے مذاق کیا تھا وہ رنگ لے آیا۔"

"یعنی کیسا مذاق؟" انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وہی ان کا مجموعۂ کلام چھپنے کو سوسائٹی نے اشاعت کے لیے منظور کرلیا ہے وہ مجھ سے تبصرہ لکھوانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ تعارف میں لکھ دوں گا تبصرہ عزمی صاحب سے لکھوا لینا۔"

"یہ غضب ہوا۔ واقعی نبن میاں بڑے خوش قسمت ہیں کچھ ہو صاحب بڑے برتن کی دھوون بھی بہت مزیدار ہوتی ہے تھوڑا تبصرہ لگاتے ہیں تو کچھ پھل پڑتے۔

"مجموعۂ کلام کا نام بھی اسم بامسمّیٰ ہے آپ نے نام چھانٹ کر خوب رکھا ہے "تلچھٹ" - مرزا جی عزمی صاحب کو داد دیتے ہوئے بولے۔

"میرا خیال ہے کہ اشاعتی کمیٹی ننّن میاں کے نام سے یا ان کے دیوان کے نام سے مرعوب ہوگئی" عزمی صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"ارے ننّن میاں دیکھو عزمی صاحب تشریف لائے ہیں کیا انھیں چائے نہیں پلایئے گا" مرزا جی نے آواز دی۔

ضرور ضرور!! ان کے غلاموں کو بھی چائے پلاؤں گا۔" ننّن میاں برتن صاف کرتے ہوئے خوشی سے بولے

"ارے بھائی آپ انھیں ننّن میاں کہہ کر نہ بلایا کریں بلکہ نجمی میاں کہا کریں اب تو یہ صاحبِ دیوان شاعر ہیں" عزمی صاحب نے مرزا جی کو ٹوک کر کہا۔

اتنے میں ننّن میاں مسکراتے ہوئے چائے لے کر آ گئے۔

نجمی میاں تم جلد سے جلد "تلچھٹ" کی طباعت کا انتظام کرو تاکہ تمھارا مجموعۂ کلام زوال پذیر ادب اکاڈمی میں انعام کے لیے داخل کیا جاسکے مجھے یقین ہے کہ تمھیں انعام سے ضرور نوازا جائے گا۔ عزمی صاحب نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے پرخلوص مشورہ دیا۔

حضور یہ تو بعد کی بات ہے سر دست دو ہزار روپے کہاں سے آئیں گے انجمن سے تو رقم بعد میں ملے گی وہ بھی پچھتر فی صد ہوگی اس پچیس فیصد کا کیا ہوگا" ننّن میاں نے فکر انگیز لہجے میں کہا۔

سو تم اس کی فکر نہ کرو کتابت کی اجرت ہم دے دیں کاغذ کی قیمت اور طباعت کے مصارف بعد میں دے دیے جائیں گے جب تمھیں سوسائٹی سے روپیہ ملے تو سب کا قرضہ چکا دینا" عزمی صاحب نے انھیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"مگر حضور یہ رقم تو جب دیوان فروخت ہوگا تبھی مل سکتی ہے کیوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ؟

مجھے معلوم ہے اس کی ترکیب یہ ہے کہ ایک ہزار کتابوں کی اشاعت کے لیے رقم ملے گی تم صرف ایک سو پچاس کتابیں چھپوانا اور ۹۰۰ کتابوں کا کاغذ جلد بندی وغیرہ کی رقم بچ جائے گی۔ پچیس فی صد تخمینا زیادہ لگوایا گیا ہے کچھ اس صورت سے بچ جائے گا اس طرح تمھاری دیگر ضروریات کے لیے ہزار ہزار رقم ہوتے ہوئے بچ جائے گی اور انعام علاحدہ سے ملے گا آج کل اردو کتابیں بکتی ہی کہاں ہیں خصوصیت سے شعری مجموعوں کو کوئی پوچھتا ہی نہیں جو کتابیں چھپیں گی یار دوستوں میں بانٹ دینا اور کچھ کتابیں کتب خانوں میں بھیج دینا تاکہ تمھارا کلام محفوظ ہو جائے"

"اچھا یہ بات ہے تو اس بچی ہوئی رقم سے میں عقیقہ بڑی دھوم سے کروں گا میرے پوتے کا اب تک پیسے کی مجبوری کی وجہ سے عقیقہ نہیں ہوسکا۔" ننّن میاں چائے کی ٹرے لے کر کچھ سوچتے ہوئے چلے گئے۔

"مرزا جی آپ کے دیوان کا کیا ہوا؟" عزمی صاحب نے پوچھا۔

"بھائی میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت سے انجمن نے معذرت ظاہر کردی۔" مرزا جی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ تو غضب ہوا مجھ سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے" عزمی صاحب نے انجمن کی اس کارگزاری کا مرثیہ

.شتے ہوئے کہا۔

"نہیں مرزا صاحب یہ بات نہیں ہے۔ اس میں غلطی نہ صدر انجمن کی ہے نہ ماہرین کمیٹی کی سچی بات تو یہ ہے کہ ایسی انجمنیں اور اکادمیاں سرکاری امداد پر چلتی ہیں پھر وہ سرکار کی وفاداری کو کیسے نظر انداز کر سکتی ہیں۔

اچھا ادب وقت کا آئینہ ہوتا ہے اس میں پورے معاشرے کی سیاسی سماجی اخلاقی اور اقتصادی بلکہ زندگی کے تمام شعبوں کے حسن و قبح کا عکس نظر آتا ہے حقیقت بہت تلخ ہوتی ہے اور کوئی سرکار کیا کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا اس لیے اگر ایسے ادب کی اشاعت میں یہ سرکاری ادارے تعاون کریں جس سے معاشرے کی حقیقی صورت دکھائی دے تو سرکار ناخوش ہو جائے گی۔ سرکار کی امداد پر چلنے والے ان اداروں کے مالی تعاون سے منظر عام پر آنے والا ادب سرکار کے ذہن و دماغ کا آئینہ دار ہوگا"

مرزا جی نے انھیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قلم کاروں کو مالی تعاون دے کر سرکار زبان و ادب کے فروغ میں حصہ نہیں لیتی بلکہ مصنفین کو خریدتی ہے۔" عرفی صاحب تیکھے انداز میں یہ کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ○○

مرزا کھونچ (بیتیا)

اے نگوڑی تری منحوس نظر میں تنکا
ڈھونڈتی کیوں ہے مرے لختِ جگر میں تنکا

یہ ستم ہے یا کرم کچھ تو بتا مجھ کو
کیا کھلاتے ہو مجھے ٹوسٹ بٹر میں تنکا

ایک ہی پھونک میں وہ مجھ سے اڑا دیتے ہیں
ہوگیا میرا وجود اُن کی نظر میں تنکا

چمپین بانو کی روداد سناؤں کیا کیا
اُڑتی چڑیوں کے لگا دیتی ہیں پر میں تنکا

تنکا داڑھی میں بہت لوگوں نے دیکھا ہوگا
میں نے دیکھا ہے میاں شیخ کے سر میں تنکا

کس نے یہ آگ تعصب کی لگائی ہر سُو
ایک باقی نہ رہا پریم نگر میں تنکا

بس اسے چندے کی الطاف و عنایت کہیے
اپنی کوشش کا نہیں ایک بھی گھر میں تنکا

لاکھ کوشش ہو دکاں بند نہیں کر سکتے
کھونچ صاحب نے پھنسایا ہے شٹر میں تنکا

غافل عادل آبادی

قرضہ ہے بال بال مقدر کی بات ہے
بیگم کا ہے کمال مقدر کی بات ہے

بی اے بھی کر کے دوستو بے کار ہی رہا
رشوت کا تھا سوال مقدر کی بات ہے

منے کو میرے آگیا شادی سے قبل ہی
نس بندی کا خیال مقدر کی بات ہے

چکر میں اُن کے گھس گئے جوتے نئے، مگر
پھر بھی گلی نہ دال مقدر کی بات ہے

پولس میں اس کا باپ جمعدار ہے میاں
آیا ہے اب خیال مقدر کی بات ہے

جد و جھگڑ کے دوستو میکے چلی گئی
پوڈر کا تھا سوال مقدر کی بات ہے

سالوں کی مہربانی سے اپنا ہوا یہ حال
تن پر بچی نہ کھال مقدر کی بات ہے

ڈولی کی جگہ دوستو ارتھی نکل گئی
ہنڈی کا تھا سوال مقدر کی بات ہے

نانی کا دم نکلتے ہی نانا کو دوستو
شادی کا پھر خیال مقدر کی بات ہے

غافل تمہارے عشق میں کنگال ہوگیا
ٹوپی بچی نہ شال مقدر کی بات ہے

یوسف یکتا حیدرآباد

روکھی پھیکی یہ دال نکو رے
باسی گردے طحال نکو رے

سوکھی روٹی مزے کی ہے باشا
روغنی شیر مال نکو رے

مات ہوتی ہے مات ہونے دے
ٹیڑھی بنگی یہ چال نکو رے

میٹھے دو بول بس محبت کے
الٹے سیدھے سوال نکو رے

دکنی کمبل بھلی ہے اے یکتا
ہم کو کشمیری شال نکو رے

خامہ بگوش (کراچی)

انھوں نے ایک ایسے کام پر محنت کی ہے جو اُن کی بساط سے باہر ہے

ہمارے نام جو خط آتے ہیں' ان میں زیادہ تعداد ایسے خطوں کی ہوتی ہے جن میں ہماری "غلط بیانیوں" کی تردید کی جاتی ہے یا ہمیں راہِ راست پر آجانے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ بعض مکتوب نگار تو اس قدر خفگی کا اظہار کرتے ہیں کہ ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کی دھمکی بھی دے دیتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ حیثیت عرفی کے ازالے کا سوال وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کوئی حیثیت عُرفی ہو۔

ایک مرتبہ ہم نے ایک شاعر صاحب کے مجموعۂ کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ مجموعہ سو گرام کے دبیز کاغذ پر چھپا ہے' لیکن شاعری دس گرام وزن کی بھی نہیں۔ اگر شاعری کاغذ کے وزن کے برابر نہیں ہو سکتی تھی تو پھر کاغذ ایسا استعمال کرنا چاہیے تھا کہ جو شاعری کا ہم وزن ہوتا کیونکہ شاعری حسنِ توازن کا دوسرا نام ہے۔ یہ پڑھ کر جناب شاعر بہت ناراض ہوئے اور انھوں نے ایک ناقابلِ اشاعت قسم کا عتاب نامہ ارسال فرمایا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب دینا ہمارے لیے ناممکن تھا۔ اتفاقاً ایک مرتبہ اُن سے ملاقات ہو گئی تو فرمایا "آپ کا شعر فہمی کا خانہ خالی ہے۔ غلطی میری ہے کہ آپ کو اپنا مجموعۂ کلام تبصرے کے لیے بھیجا۔" ہم نے عرض کیا یہ آپ کی پہلی نہیں' دوسری غلطی تھی۔ پہلی غلطی اس وقت کی تھی جب آپ نے شاعری کے میدان میں قدم رکھا تھا۔

ہمارے نام جو خط آتے ہیں' ان میں سے بعض اس لائق ہوتے ہیں کہ شائع کیے جائیں مگر افسوس کہ کالم کی محدود گنجائش کے پیشِ نظر ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ اس مرتبہ ہم بطورِ خاص کچھ ضروری خطوں کے لیے گنجائش نکال رہے ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک ہندوستانی صحافی سرور تونسوی کی آپ بیتی پر ایک کالم لکھا تھا۔ اس کتاب میں بہت سے ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی سیاحت کرنے والے پاکستانی شاعروں سے ہے۔ سرور تونسوی نے شراب نوشی کے سلسلے میں بعض پاکستانی شاعروں کو سفلہ پن' بے غیرتی اور گداگری کا طعنہ دیا تھا۔ سرور تونسوی کے الفاظ یہ ہیں "پاکستان کے شاعر کئی ماہ' ہندوستان میں رہے اور انھوں نے تمام ممکن حربے استعمال کر کے مشاعرے پڑھنے کے لیے دعوت نامے حاصل کیے اور ہر مشاعرے میں بڑے طمطراق سے یہ کہتے رہے کہ پاکستان میں ان کی ٹکر کا کوئی دوسرا شاعر نہیں ہے' مگر شراب نوشی کے لیے جو سفلہ پن' بے غیرتی اور گداگری انھوں نے روا رکھی اُسے دیکھتے ہوئے بے شک اس کا یقین ہو گیا کہ ان اوصاف میں واقعی پاکستان کا کوئی شاعر ان کی ٹکر کا نہیں ہے۔"

ہم نے اپنے کالم میں حکومتِ پاکستان کو تجویز پیش کی تھی کہ ہمارے جو شعرائے کرام ہندوستان جا کر ساغر و مینا شغل فرمانا چاہیں' ان کے لیے شراب کی مفت فراہمی پاکستانی سفارت خانے کی طرف سے ہونی چاہیے تاکہ وہ ہندوستانیوں کے ممنون

گیر نہیں ہوا۔ اس مقصد کے لیے دہلی کے سفارت خانے میں پریس سکریٹری اور کمرشیل سکریٹری کی طرح ایک عہدہ "بوتل سکریٹری" کا بھی ہونا چاہیے"۔ یہ کالم پڑھ کر ایک "ہندوستان پلٹ" شاعر نے جو گمنام عتاب نامہ لکھا ہے اس کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا: "آپ کا کالم تنگ نظری اور متعصبانہ ذہنیت کا آئینہ دار ہے۔۔۔ ہندوستان کی کوئی ایسی شخصیت نہیں کہ آپ اس کے بیان کو بہانہ کر پاکستانی شاعروں کی تذلیل کریں۔ اگر ایک آدھ شاعر کسی وقت تھوڑی سی پی لیتا ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ آخر علامہ اقبال اور حافظ شیرازی نے اپنے کلام میں جابجا شراب کا ذکر بے وجہ نہیں کیا ہے۔ وہ شعرا جو ہندوستان جا کر اردو کا پرچم بلند کرتے ہیں اور اپنے وطن کا نام روشن کرتے ہیں ان کے بارے میں توہین آمیز کالم لکھنا اردو اور پاکستان دونوں کی توہین ہے۔ اس خط کے ساتھ "ظرافت" کراچی کے ایک مضمون کا عکس بھیج رہا ہوں۔ اس میں آپ کا حساب کتاب برابر کر دیا گیا ہے۔ اس آئینے میں اپنی صورت ملاحظہ فرمائیے"۔ (تلخیص)

کچھ عرصہ ہوا ہم نے محترمہ سرفراز اقبال کی کتاب "دامنِ یوسف" پر ایک کالم لکھا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جن لوگوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ اس کے مطالب سے آگاہ ہو جائیں۔ اس کے بارے میں ہمیں بہت سے خطوط موصول ہوئے ہیں۔ ایک محترم قاری سید مظفر الاسلام تعارف والا سے لکھا ہے کہ "آپ نے فیض، سبطِ حسن اور ابنِ انشا کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے"۔ عرض ہے کہ مرحومین اپنی بدنامی کا سامان اپنی زندگی ہی میں کر گئے تھے۔ ہم نے تو صرف اتنا کیا کہ ان کے کچھ خطوں کے اقتباسات اپنے کالم میں نقل کر دیے۔ معلوم ہوتا ہے کہ محترم مکتوب نگار کچھ ضرورت سے زیادہ محتاط واقع ہوئے ہیں۔ ورنہ ملک کے معاملات میں نیک نامی یا بدنامی کا کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ طالب نے مطلوب تک پہنچنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی۔ اس سیاق و سباق میں اگر فیض، سبطِ حسن اور ابنِ انشا کے خطوں کا مطالعہ کیا جائے تو وہ ادبی شاہکار نظر آتے ہیں۔ ادبی شاہکار کسی مصنف کی بدنامی کا سبب نہیں ہوتے بلکہ عزت میں اضافے کا وسیلہ بنتے ہیں۔

اسی سلسلے میں جناب محمد مظہر صدیقی صاحب نے کراچی سے دلچسپ خط لکھا ہے۔ فرماتے ہیں: "رجعت پسندوں کی ہمیشہ سے یہ عادت رہی ہے کہ وہ ترقی پسندوں کے خلاف لکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ آپ نے سرفراز اقبال کے حوالے سے ترقی پسندوں کے خلاف جو کچھ لکھا ہے وہ آپ کی متعصبانہ ذہنیت اور رجعت پسندی کا کھلا ثبوت ہے۔ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ ذاتی خطوں کے حوالے سے کسی کی کردار کشی کرنا ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے"۔

ہمیں اپنے رجعت پسند اور مکتوب نگار کے ترقی پسند ہونے سے انکار نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم مکتوب نگار ضرورت سے کچھ زیادہ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اگر ہم مذکورہ ادیبوں کے خطوط اپنے ذاتی وسائل سے حاصل کر کے شائع کرتے تو شاید ہم "اخلاقی مجرم" ہونے کا الزام بھی تسلیم کر لیتے، لیکن یہ خطوط تو ایک کتاب میں شامل ہیں [illegible] کتاب [illegible] کے نام یہ خط ہیں۔ رہا کردار کشی والا الزام تو ہم صرف یہ عرض کریں گے کہ صاحبان کردار کی کردار کشی کوئی نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ وہ خود بھی چاہیں تو یہ کام نہیں کر سکتے۔ بیگم سرفراز اقبال نے فیض، سبطِ حسن اور ابنِ انشا کے جو خطوط شائع کیے ہیں ان سے ان تینوں ادیبوں کے کردار کی اعلیٰ خصوصیات سامنے آتی ہیں، مثلاً فیض صاحب کے انتقال کے بعد سبطِ حسن نے بیگم سرفراز اقبال کو جو خط لکھا اس میں انہوں نے جس انداز سے موصوفہ کے غم کو ہلکا کرنے کا عزم کیا ہے اس سے ان کی انسان دوستی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ سبطِ حسن مرحوم کے یہ جملے ایک مرتبہ پھر ذہن میں تازہ کیجیے: "مجھ کو بھی تو فیض پر رشک آتا تھا ان کو کتنا پیار چاہنے والا ملا ہے [illegible] بہت

تو شکر یہ ادا کرتے تھے مجھ میں وہ دلداری کی صلاحیت کہاں لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے غموں کو جہاں تک ممکن ہو ہلکا کردوں یا بانٹ لوں "۔ کیا یہ سطریں کوئی ایسا شخص لکھ سکتا ہے جو انسانی ہمدردی کے اعلیٰ جذبے سے محروم ہو!

اسی سلسلے میں بریگیڈیر (ریٹائرڈ) نثار احمد قریشی ۔ (سیالکوٹ) نے مدیر "تکبیر" کے نام جو خط لکھا ہے اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

"جناب خامہ بگوش نے "کتابیات" داستانِ یوسف" کے متعلق بہت تفصیلی تبصرہ رقم فرمایا ہے ۔ . . . . ایک عدد تصویر بھی شاملِ اشاعت کردی گئی ہے ۔ یہ سب دیکھ کر بہت تعجب ہوا اور اضطراب بھی ۔ آپ کے یہ خادم تکبیر سے یہ توقع نہیں رکھتے ۔ از راہِ کرم توجہ فرمائیں ۔ یہ نثر میں شاعری "سہی تو بھی قلم سے عریانی و فحاشی" ضرور ہے "۔

ہم اس سلسلے میں کوئی صفائی پیش نہیں کریں گے ۔ موضوع ہی ایسا تھا کہ ہم دل اور قلم پر قابو نہ رکھ سکے ۔ اس لیے ہم بریگیڈیر نثار احمد قریشی سے اور ان تمام قارئین سے معذرت چاہتے ہیں ۔ جنھیں ہمارے کالم میں "عریانی و فحاشی" نظر آئی ۔ ۔

قمر گکاروی (دلیا)

میری ہر ایک بات انھیں ناپسند ہے
پاکٹ کی کائنات انھیں ناپسند ہے

لائیں کہاں سے ان کے لیے مرغ اور پلاؤ
اب گھر کا ساگ پات انھیں ناپسند ہے

کرتی ہیں روز روز ہی پکچر کلب کی بات
قیدی کی سی یہ حیات انھیں ناپسند ہے

ہر روز نوک جھونک ہے جھگڑا ہے اور فساد
القصہ میری ذات انھیں ناپسند ہے

ان پڑھ ہیں وہ لکھائیں پڑھائیں بھی کس طرح
کاغذ قلم دوات انھیں ناپسند ہے

واعظ نے کیا پڑھا دیا حجرہ میں دوستو
اب میرے گھر کی رات انھیں ناپسند ہے

شادی کے رت جگے کو وہ دیتے ہیں اہمیت
لیکن شب برات انھیں ناپسند ہے

دیکھی ہے جب سے شہر کی سڑکوں پہ دھوم دھام
ویرانیِ دیہات انھیں ناپسند ہے

منٹو کے ناولوں میں ہوئی ہیں وہ جب سے گم
درس "رہِ نجات" انھیں ناپسند ہے

پیروڈی

روشن لال روشن (بنارسی)

(روحِ غالب سے معذرت کے ساتھ)

بہت ممکن ہے یارو گمشدہ دل کی رقم نکلے
"اگر اس طرۂ پُرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے"

ہمیں سے بھیک مانگے پھر رہے ہیں ووٹ کی یعنی!
"وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے"

منڈایا سر، لگی کالک، ہزاروں جوتیاں کھائیں
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

میں بندر سے بنا انساں، ہوا لیڈر، منسٹر ہوں!
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

کبھی دُھن مولویت کی کبھی حسرت وزارت کی
ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے

ملمع جان کا تھا کہاں؟ لیڈر کہاں روشن
ہم اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

تمنا مظفر پوری

مشورہ لینے والے

عموماً لوگ مشورہ دینے والوں سے بیزار ہوتے ہیں لیکن میں مشورے طلب کرنے والوں سے پریشان ہوں۔ جب سے سیٹھ دھنا مل کو میرے مشورے سے فائدہ پہنچا ہے اور وہ ایک سینما ہال سے کئی سینما ہال اور فیکٹری کے مالک ہوئے ہیں وہ بغیر میرے مشورے کے کوئی کام نہیں کرتے۔ ذرا سے اتفاق کہیے کہ میرے مشورے پر عمل کر کے سیٹھ دھنا مل دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کوئی منہ اٹھائے چلا آتا ہے اور مجھ سے مشورہ طلب کرتا ہے۔

یوں تو محلے کے لوگ میرے تجربے اور مشورے سے بارہا فائدہ اٹھا چکے تھے مگر سیٹھ دھنا مل کی پے بہ پے شاندار کامیابی نے مجھے اتنی شہرت بخشی دی کہ اب خواہ مخواہ بھی لوگ مشورہ طلب کرنے آموجود ہوتے ہیں۔ محلے میں کسی کے ہاں ختنہ ہے تو مشورہ طلب کیا جاتا ہے کہ ابھی کراؤں یا نہیں۔ ابھی کرانے میں کوئی نقصان تو نہیں۔ اگر ابھی نہ کراؤں تو کب کراؤں۔ صرف اتنی سی بات ہوتی تو برداشت کرلی جاتی لیکن یہاں تو اس ختنہ کے لیے پورا پروگرام مرتب کرنا لازمی ہوتا ہے۔ دعوت نامہ لکھ دیجیے۔ مہمانوں کی فہرست مرتب کیجیے۔ دعوت نامے چھپوائیے وغیرہ۔ محلہ باسی ہونے کے ناتے مجبوراً کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔ ورنہ بد اخلاق، غیر سوشیل، مغرور وغیرہ جیسے الزام لگنے کا خدشہ رہتا ہے۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سیٹھ دھنا مل کی دن دونی رات چوگنی ترقی اور میرے مشورے کی شہرت اس طرح ہوئی کہ لوگ مجھ سے مشورہ طلب کرنے کے لیے ہر وقت حاضر ہونے لگے۔ مجھے بھی ان کے ہر قسم کے مسئلہ کے لیے ذہن کو تیار رکھنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود یہ کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ میرا ہر مشورہ صحیح ہو اور ہر جگہ ہر وقت اور ہر شخص کے لیے مناسب ہو۔ کیوں کہ مسئلہ کی نوعیت ہر آدمی کے لیے الگ الگ ہو سکتی ہے۔ حالات بھی الگ ہو سکتے ہیں۔ ایک مشورہ ایک شخص کے لیے مناسب ہے تو وہی دوسرے کے لیے غیر مناسب ہو سکتا ہے۔ اب یہی غور کیجیے کہ وہ مشورہ جو میں نے سیٹھ دھنا مل کو دیا تھا اور انھوں نے سینما ہال کھولا تھا اگر فلدر رام کو دیتا تو کیا وہ کامیاب ہو سکتا تھا! ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ مشورہ کا انحصار موڈ پر بھی ہوتا ہے۔ پھر بے وقوفوں کو مشورہ دینا بھی بے وقوفی ہے۔ اگر آپ کو اپنے مشورے کی اہمیت جتانی ہو اور اپنی سوجھ بوجھ کی دھاک بٹھانی ہو تو ہر دم ذہین اور عقل مند

لوگوں کو مشورہ دیجیے۔ جو اپنی دولت اور عقل سے آپ کے مشورے کو چار چاند لگا دیں گے ورنہ آپ کا مشورہ یونہی دھرا رہ جائے گا۔ لہٰذا بیوقوفوں کو ہرگز مشورہ نہ دیجیے۔ یہ بات میں اتنے وثوق کے ساتھ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس کی مثال بھی میرے پاس موجود ہے ۔۔۔ ہوا یوں کہ ایک ڈاکٹر صاحب اپنے مریض کو دیکھنے کے بعد کچھ دوائیں لکھ دیں اور ایک مکسچر بنا کر مریض کے تیماردار کو دیا اور ہدایت کی کہ یہ دوا خوب جھنجھوڑ کر اور ہلا کر مریض کو کھلائیں۔ بے وقوف تیماردار ڈاکٹر کی بات سمجھ نہ پایا اور بجائے یہ کہ شیشی کو ہلا کر مریض کو دوا کھلاتا۔ دوا کھلانے سے پہلے مریض کو ہی اچھی طرح ہلا کر اور جھنجھوڑ کر دوا کھلا دیا۔ اب بھلا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مریض کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔

اس تمہید کے بعد اصل بات کی طرف آپ کی توجہ چاہوں گا کیوں کہ کبھی کبھی مشورے کے لیے ایسے لوگ بھی میرے پاس آجاتے ہیں جو ذہنی طور پر بیمار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نسیم صاحب بھی ہیں۔ جب ملیں گے تو اپنے کو ایک بڑے اور اہل ثروت ہونے کا اظہار کریں گے۔ ان کے گھر میں سبزی بھی نہیں بنی ہوگی مگر وہ مرغ کی بات کریں گے۔ ایک ماہ میں چھ انڈے خریدیں گے اور جس دن خریدنے بازار جائیں گے وہ کوشش کریں گے کہ ان کے انڈے کو محلے والے دیکھ لیں اور اسے اتفاق کہیے کہ محلے کے لوگ دیکھ بھی لیتے ہیں کہ نسیم صاحب انڈے لے جا رہے ہیں۔ پھر وہ فرمائیں گے۔ چھ انڈے کا روزانہ خرچ ہے۔ بڑی پریشانی ہے صاحب۔ اگر کہیں اتفاق سے نسیم صاحب آپ کو بازار کی طرف مل گئے اور آپ مچھلی کی خریداری کر رہے ہوں تو فرمائیں گے۔ "اونہہ! میرے لیے دو کیلو مچھلی سے کام نہیں چلنے کا دو کیلو سے کم کا خرچ نہیں ہے۔ اچھا میں کل خریدوں گا۔" اور کل کبھی نہیں آتا۔ ایسے کنجوس اور بے وقوف آدمی کو مشورہ کی کیا ضرورت مگر ایک روز نسیم صاحب تشریف لائے اور پوچھنے لگے۔

"فکسڈ ڈپوزٹ کا کیا طریقہ ہے؟"

میں نے جواب دیا "میں کیا کوئی بینک منیجر ہوں جو بتاؤں۔!"

"پھر بھی"۔ نسیم صاحب نے کہا "کچھ تو علم ہوگا۔"

علم کی بات تھی لہٰذا بتانا ضروری تھا۔

کہا "ہاں بینک یا پوسٹ آفس میں جمع کیا جا سکتے ہیں۔"

"دراصل مجھے ستر ہزار روپیے جمع کرانا ہے۔" نسیم صاحب نے جمع کرانے سے زیادہ یہ جتانا چاہا کہ ان کے پاس ستر ہزار روپے ہیں۔

میں نے پوچھا "کہاں ہاتھ مارا ہے؟"

"گاؤں کی زمین بیچ دی ہے" نسیم صاحب نے بتایا۔

"زمین بیچ دی۔ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہاں شہر میں زمین خریدوں گا۔" نسیم صاحب نے کہا۔ "میں نے بھی اب شہر میں مکان بنانے کا ارادہ کر لیا ہے۔"

میں نے کہا "بہت خوب! اگر مکان بنانا ہے تو زمین خریدیے، روپیے فکسڈ ڈپوزٹ میں رکھنے سے کیا فائدہ!"

"بینک میں رکھنے سے دوگنے ہو جائیں گے۔" انھوں نے چالاکی دکھلائی۔

"اس میں چھ سال کا عرصہ لگے گا۔" میں نے بتایا "اور ہو سکتا ہے کہ کچھ انکم ٹیکس کا جھمیلا بھی ہو کہ اتنے روپے کہاں سے لائے۔"

چوں کہ اس وقت محلّے کے صرف معزّز حضرات ہی بیٹھے تھے اور نسیم صاحب کی بات پورے محلّے والے نہیں جان پائے اس لیے انھوں نے کہا۔

"ایک ضروری کام یاد آ گیا۔ اچھا پھر شام کو حاضر ہوں گا تو تفصیل سے باتیں ہوں گی اور وہ چلے گئے۔

نسیم صاحب شام میں پھر حاضر ہوئے۔ اس وقت محلّے کے بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی گفت گو ہوتی رہی پھر نسیم صاحب نے کہا۔

"اس ٹیکس کا کیا قاعدہ ہے؟"

میں نے پوچھا۔ "کون سا ٹیکس؟"

وہی انکم ٹیکس جس کے متعلق آپ نے بتایا تھا۔ انھوں نے پھر بکواس شروع کردی۔

میں نے کہا۔ "ارے بھائی میرے، میں نے صبح ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ آپ کسی بینک یا اس کے ایجنٹس سے رجوع کریں۔ وہ آپ کو سب کچھ بتا دیں گے۔"

"تمنّا صاحب" انھوں نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "دراصل میری پریشانی یہ ہے کہ میں اپنے محلّے میں ایک زمین (پلاٹ) دیکھ چکا ہوں۔"

میں نے کہا "بس فوراً خرید لیجیے۔ فکسڈ ڈپوزٹ کے جھمیلے سے بچ جائیں گے۔

کہنے لگے۔ زمین کی قیمت بہت زیادہ ہے اتنے روپے کہاں ہیں۔ فکسڈ ڈپوزٹ میں جب یہ روپے دوگنے ہو جائیں گے تو خریدوں گا۔

ان کی بے وقوفی پر دل ہی دل میں ہنستے ہنستے میں نے کہا "اس وقت تک اس زمین کی قیمت پانچ گنا زیادہ ہو جائے گی جسے آپ خریدنا چاہتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ آپ کے روپے دوگنے ہونے تک وہاں پر کچھ منزلہ عمارت کھڑی ہو جائے۔

"آپ چھوڑیے" نسیم صاحب نے کہا "آپ صرف فکسڈ ڈپوزٹ کا قاعدہ بتائیں۔ میں نے کہا نہیں میں نے کہا نا کہ آپ کسی بینک منیجر سے رجوع کریں۔" پھر ان کی دماغی حالت کا خیال کر کے کہا۔ "بلکہ آپ کو زمین فروخت کرنے سے پہلے کسی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔"

فرمانے لگے۔ ہاں۔ ڈاکٹر زیادہ قیمت دے سکتا تھا مگر وہ دیہات میں زمین کیوں کر خریدتا۔" ایسے کودمغز سے کیا بات کرنا تھا۔ پھر بھی میں نے کہا۔

"تو آپ ایسا کیجیے۔ کسی ماہرِ نفسیات سے مل لیجیے۔"

"ماہرِ نفسیات!" نسیم صاحب نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کیا کریں گے۔

"وہ ..... وہ ....." میں نے کہہ دیا "آپ کے دماغ کا علاج کریں گے۔"

میں نے نسیم صاحب کو مشورہ دیا بلکہ صحیح مشورہ دیا تو وہ سر ہلاتے ہوئے چلے گئے۔ لیکن ان کے جانے کے فوراً بعد ایک دوسرے صاحب تشریف لائے۔ ان کو بھی مشورہ درکار تھا مگر میرا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

میں نے پوچھا۔ کہیے صاحب سب خیریت سے ہیں نا۔ کیسے آنا ہوا؟"

بولے۔ خیریت کہاں ہے۔ اسی لیے تو آپ کے پاس آیا ہوں کہ کچھ مشورہ کروں۔"

میں نے کہا۔" ہاں فرمائیے۔"

کہنے لگے۔ دراصل بات یہ ہے کہ میری اہلیہ کئی سال سے بیمار ہیں۔ بہت علاج کرایا لیکن صحت کوسوں دور ہے؟

میں نے پوچھا۔ اور موت ؟"

خدا کا شکر ہے کہ آدمی ذہین تھے فوراً سمجھ گئے۔ بولے۔" وہ بھی۔ مگر اب میں بہت پریشان ہوں کیا کروں کچھ مشورہ دیجیے۔

میں نے پوچھا۔ آپ نے علاج بہت کرایا؟"

فرمایا۔ جی ہاں۔

میں نے کہا۔" لیکن محترمہ صحت یاب ہونے سے انکار کرتی رہیں۔ یہی نا، کیوں ؟"

بولے۔ جی۔

میں نے پھر کہا اور موت بھی ان کو گلے لگانے سے انکار کرتی رہی۔

بولے۔" ہی ہی ہی ہی۔"

میں نے کہا۔ بس ایک ہی صورت ہے آپ کی پریشانی دور ہونے کی۔ تجسس سے انھوں نے پوچھا۔" کیا! بتلائیے!

میں نے بتایا۔ آپ ہی موت کو گلے لگا لیجیے۔ یعنی خودکشی سے آپ کی پریشانی یقیناً دور ہو جائے گی۔

ظاہر ہے ایسے مشورے کے بعد یہاں کون ٹھہرتا۔ وہ صاحب فوراً چلے گئے۔

اور اس دن سے مشورے طلب کرنے والوں کی بھیڑ میں بھی کمی آگئی۔

●●

یوسف جمیل جامعی (کرنول)

پتی جی کی سیوا

کروٹوں لاڈاں نہ یہ خالی گھولن
کہیں دے نہ ماروں میں غصے میں بیلن

اٹھو جلد ہونے لگا ہے سویرا
تمھیں مانجھنے ہیں ابھی گھر کے برتن

جو کل رات رکھے تھے کپڑے بھگو کے
انھیں بھی تو دھونا ہے او میرے ساجن

کچن خالی خالی ہے اب سبزیوں سے
نہ آلو، ٹماٹر، نہ بھاجی، نہ بیگن

نمک ہے نہ مرچی نہ ہلدی نہ دھنیا
سبھی ڈبے خالی ہیں غائب ہے لہسن

ذرا پہلے اٹھ کر تو مالش ہی کیجے
کمر میں ہیں ٹیسیں تو پاؤں پہ سوجن

مجھے کنگھی چوٹی کی عادت نہیں ہے
سنوارو مری زلف کو رکھ کے درپن

نہانا بھی ہے مجھ کو جلدی سے اٹھو
غسل خانہ میں رکھو پانی کا برتن

ابھی ناشتہ بھی تو کرنا ہے مجھ کو
فقط بیس انڈے پراٹھے مرغن

میں چائے نہیں آج VIVA ہی لوں گی
یہی مشورہ مجھ کو دیتا ہے سرجن

ابھی للو ببلو کی تیاریاں ہیں
ابھی توشہ بچی ہے دودھ اور بھوجن

اٹا گرد سے فرش و قالین و صوفہ
غلاظت سے بھرپور ہے گھر کا آنگن!!!

جو شوکیس میں میرے کپڑے پڑے ہیں
بنا دو سلیقے سے جلد ان کا آئرن

اگر ہو سکے دوپہر میں تو جانم!
بنا دینا تندوری مرغ اور چکن

سرِ شام تم بس ڈیلی ہوتے؟ تا
سنا ہے کہ انکل کی آئیں گی سمدن

نہ جانے یہ سب کام کب ہوں گے کیسے؟
ٹلے ہو بچانے پہ تم آج دامن

کہیں میرا غصہ جواں ہو نہ جائے
بنا دوں نہ میں تم کو فاروقی منجن

ابھی اور اک بات کہتی ہے تم سے
[illegible]

سنو دیر سے کچھ گھر آؤں گی میں
"پتی جی کی سیوا ہے میرا بھاشن

پتی جی کی سیوا ہے پوجا" عبادت
جو سیوک نہیں ناری وہ ہے ابھاگن

پتی جی کو جو پیار سے ناری دیکھے
تو دیں گے سو تم اس کو بھگوان درشن

پتی کے بنا زندگی زندگی کیا!
پتی کے ہی کارن ہے ناری کا جیون

اسی میں سترکشا ہے حق ناریوں کی
اسی میں وہ ہوتی ہے پاپوں سے پاون

میں ان ناریوں میں نہیں ہوں قسم سے
جو ہوتی ہیں اپنے شوہر کو ڈائن

مرے سر کی کھا کے قسم اتنا بولو — دیا ہے کبھی ظلم کا میں نے تکاشن
نہیں علم شاید نہیں ہے کہ میرا — بڑے ناز نخروں میں گزرا ہے بچپن
مرے ہاتھ پیلے ہوئے کم عمر میں — اسی کے ہی کارن ہے کاموں [illegible]
مری الجھنیں الجھنیں ہیں تمہاری — تمہیں کشٹ ہی کشٹ ہیں میرے کارن
مگر کیا کروں میری مجبوریاں ہیں — سبھی کچھ ہے تم پہ عیاں اور [illegible]

یہ سب سن کے شوہر نے بیوی سے پوچھا
سکھا دو مجھے بھی تکلم کا یہ فن

اسی کا اگر نام سیوا رکھا ہے — بہت جلد ٹوٹے گا سانسوں کا بندھن
پلا دو زہر یا کہ آزاد کر دو — نہیں میری تم بیوی ہو ساس و سوتن
خدا ایسی بیوی سے سب کو بچائے — کہ ہاتھوں سے جس کے ہو شوہر کا مدفن

جمیل ہم نے دیکھا ہے اکثر گھروں میں
پڑا باتوں باتوں میں گھمسان کا رن
مسلط کہیں بیویاں شوہروں پر
کہیں بیویوں پر ہے شوہر کی قدغن
تطابق بہر حال ہو مرد و زن میں
نہ برسے گا ورنہ مسرت کا ساون

محمد حنیف انصاری
(بھیونڈی)

O

شمع ہر روز سیاست کی جلائے نہ بنے — روزِ روشن میں اندھیرے کو بڑھائے نہ بنے
کسی تدبیر سے بھی جیب اڑائے نہ بنے — کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے
آتشِ بغض و حسد بڑھ گئی اتنی اپنی — کہ لگائے تو لگی، اب یہ بجھائے نہ بنے
تلخیِ تشنگی کا نچایا ہے غریبی نے مگر — اب اسے لاکھ ہٹاتے ہیں ہٹائے نہ بنے
عمر میں سوچا ہے حنیف عیش و طرب کا لیکن — دو گھڑی عیش منائے تو منائے نہ بنے

کلیم اللہ (حیدرآباد)

مرزا احماقتی

ڈپٹی نذیر احمد کا ناول توبۃ النصوح اُن کے تخلیق کردہ کرداروں "کلیم" اور "مرزا ظاہر دار بیگ" کی وجہ سے زندہ جاوید رہے گا۔ ظاہر دار بیگ ہر دور میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ آج کل مرزا ظاہر دار بیگ کی اولاد ہر گلی کوچہ میں نظر آتی ہے۔ راہ چلتے پتھر اٹھائیے، دو تین جانشین تو دکھائی دیں گے۔ ظاہر دار بیگ کے ایسے ہی جانشین ہمارے دوست مرزا حماقت اللہ ہیں جن کو پیار سے دوست احباب مرزا حماقتی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ مرزا کی شخصیت سلف میڈ (SELF MADE) ہے اس لیے وہ درزی، دھوبی، ڈاکٹر، حجام کو اصلاح کا کوئی موقع ہی نہیں دیتے۔ ہر کام خود کر لیتے ہیں۔ جب کبھی ان کا دل گھبراتا ہے تو سارے جہاں کو آگ لگانے کے سے انداز میں جاسے پان پیتے آتے ہیں اور چائے پینے کے بعد نتھنوں کی چمنی سے اپنی ہی سائز کے امپورٹیڈ سگریٹ کا دھواں خارج کرنے کے بعد کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتے ہیں۔

یادش بخیر پچھلے سال مرزا حماقتی یکایک چند دنوں کے لیے روپوش ہو گئے اور جب دوبارہ نمودار ہوئے تو ان کی ظاہر داری میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ جو رقت ٹائی اور ڈنر جیکٹ زیب تن کیے گردن کو ایک طرف ذرا ٹیڑھی کرکے چلنے لگے۔ دوست احباب کے دریافت کرنے پر ایک شان بے نیازی سے کہا کہ وہ تین ماہ کے لیے امریکہ ہو آئے ہیں حالاں کہ روپوشی سے قبل ہم سے مرزا نے خود بے خیالی میں کہہ دیا تھا کہ فصل کی کٹائی کے سلسلے میں وہ گاؤں جا رہے ہیں۔ خیر صاحب حماقتی کی اس خیالی واپسی کے بعد ان کی چال ڈھال میں کافی فرق آگیا تھا۔ وہ ذرا اکڑ کر چلنے لگے تھے کیوں کہ امریکہ ریٹرن جو ہو گئے تھے۔

مرزا حماقتی سے پچھلی ملاقات زندہ دلان کے سالانہ مشاعرے میں ہوئی تھی اس کے فوری بعد ایک دوست کی شادی میں ان سے ٹکرانے کا اتفاق ہوا تھا۔ سب دوست احباب خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ میزبان نے دریافت کیا:

بھائی صاحب مختلف قسم کے مشروبات حاضر خدمت ہیں۔
آپ کون سا مشروب نوش فرمائیں گے؟"

نواب علی: جی مجھے گولڈ سپاٹ چاہیے۔
کلیم: "جی کوک" ([illegible])

عنوان: (جملے) "می تھری" (Me three)

"می تھری" کی پارٹی کے بعد مرزا سے ملاقاتیں ہوتی رہیں اور یہ سلسلہ چل نکلا حالاں کہ دونوں کے خیالات، عادت و اطوار، بات چیت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مرزا کے ساتھ سینما بینی کا تلخ تجربہ بھی ہم کو کئی بار ہو چکا ہے ٹکٹ خریدیں گے تو عام درجہ کا لیکن ہال کے اندر داخل ہونے کے بعد مرزا کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ سب سے پہلے پنکھا تلاش کرتے ہیں۔ نشست پسند فرمانے کے بعد اتنا چھچھورا پن کرتے ہیں کہ پاس والا بیزار آجائے۔ حماقتوں پر حماقتیں سرزد ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ فٹ پاتھ کے کنارے رکھی ایک تصویر پر ہماری نظر پڑی۔ تصویر کسی انگریز جنرل کی تھی جو ہندوستانی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا۔ یہ کسی مشہور و معروف مصور کا شاہکار تھی۔ رنگوں کی آمیزش، چہرے کے نقوش بہت ہی متاثر کن تھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ تصویر بولنے لگے گی۔ شاید کسی بگڑے نواب نے پیسوں کی خاطر وہ شاہکار کوڑی کے مول فٹ پاتھ کے بیوپاری کو فروخت کر دیا تھا۔ ہم نے دکان والے سے اس تصویر کی قیمت دریافت کی تو دکان دار نے کہا کہ وہ تصویر دو سو روپیوں میں فروخت کرے گا۔ ہمارے پاس اس وقت صرف ڈیڑھ سو روپے تھے۔ ہمیں بڑا افسوس ہوا کہ ایک مصور کا شاہکار ہاتھوں سے نکل جائے گا اور ہوا بھی ایسا ہی دوسرے دن وہ تصویر اس دکان میں نہیں تھی خیر صاحب کئی دنوں بعد مرزا کے ساتھ ان کے "حماقت کدہ" جانے کا اتفاق ہوا دیوان خانہ میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ وہی تصویر ان کے دیوان خانہ میں لٹکی ہوئی تھی۔ ہم نے مرزا سے دریافت کیا:

"مرزا: یہ تصویر کتنے روپیوں میں خریدی؟"

مرزا: (تعجب سے) خریدی۔ بھئی خریدی تو خوب کہی۔ میاں تم کو معلوم یہ ہمارے دادا صاحب کی تصویر ہے۔ وہ بالکل انگریز کی مانند تھے۔

کلیم: مرزا۔ صرف پچاس روپے کم تھے ورنہ آپ کے دادا ہمارے گھر میں لٹکے نظر آتے تھے۔

دوست احباب مرزا حماقتی کے روز روز کے بدلتے ہوئے خاندانی سلسلوں سے تنگ آکر دور بھاگنے لگے تھے۔ بالآخر وہ بالکل تنہا رہ گئے!

●●

ڈاکٹر شمیم افزا قمر
(بھاگلپور)

رضا نقوی واہی کی نظمیں

مختلف زبان کے ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مزاحیہ ادب کی ہر زبان میں کمی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مزاحیہ ادب پیش کرنا کہیں زیادہ دشوار ہے بہ نسبت سنجیدہ ادب کے۔ اردو ادب میں مزاحیہ ادب کی دو قسمیں ہیں:

(۱) معیاری مزاحیہ ادب (۲) دوسرے درجہ کا مزاحیہ ادب۔ دوسرے درجے کا مزاحیہ ادب دراصل معاشرہ کی تنزلی کے ساتھ ساتھ ادب میں گراوٹ کی وجہ سے پیدا ہوا۔ لکھنؤ میں سودا، مصحفی اور انشا کی معرکہ آرائیوں تک تو بات غنیمت تھی لیکن کہیں کہیں انھوں نے نہایت پھکڑپن کا ثبوت دیا۔ لکھنؤ اسکول میں ایسے شعرا کی تعداد کافی ہے، جنھوں نے اس قسم کی شاعری کو فن کی حیثیت سے برتا ہے لیکن انھیں اعلیٰ درجہ کا ادب نہیں کہا جاسکتا۔ اعلیٰ درجہ کا مزاحیہ ادب پیش کرنے کے لیے لطیف طنزیہ اشارے، شوخ اور ظریفانہ اور متین اور سنجیدہ ذہن کی ضرورت ہے۔ ایک اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والا شخص اعلیٰ درجے کا مزاحیہ ادب پیش نہیں کرسکتا۔ مزاحیہ ادب اپنے جلو میں طنز کا وہ نازک احساس رکھتا ہے جو غالب کا "تیرِ نیم کش" بن جاتا ہے۔

اردو کے مزاحیہ ادب میں سنجیدہ اور متین ذہن رکھنے والوں میں اکبر الہ آبادی کے بعد رضا نقوی واہی ایک خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے مزاحیہ کلام میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے۔ جنھیں ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں کرسکتے۔ ظرافت، طنزیہ، ہجو کی منزلیں جدا ہوتی ہیں۔ خالص ظرافت محض ہنسنے ہنسانے کا فن ہے مگر ہجو یا طنزیہ میں ایک ایک قدم اور آگے بڑھ کر کسی بدہیئتی، ناموزونیت یا نقص کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ طنز نگار جراحی کے ذریعے علاج چاہتا ہے۔ رضا نقوی واہی بھی طنز نگار ہیں اور ظرافت نگار بھی۔ وہ کہیں صرف مزاح پیش کرتے ہیں لیکن طنز سے بھرپور مزاح۔ "نیا ہاتھی" ان کے طنز اور مزاح دونوں کی بہترین مثال ہے:

شادیاں ہوتی تھیں پہلے جب کسی دیہات میں — چند ہاتھی بھی ہنکائے جاتے تھے بارات میں
اب ان کے عوض ہر گاؤں ہر دیہات میں — نامورانِ سیاست چلتے ہیں بارات میں
آج کل شوبھا بڑھانے کے لیے بارات کی — ہر لگن میں مانگ ہوتی ہے انھیں حضرات کی
ایک ہاتھی پر جو پہلے ختم ہوتی تھی رقم — ایک نیتا پر وہی ہوتی ہے صرف اب بیش و کم

فرق صرف یہ ہے کہ وہ کھاتا تھا خلّہ یہ بلاؤ — اس کا حصّہ ایک من تھا ان کا حصّہ ایک پاؤ
اس کے آگے ٹوکرا تھا ان کے آگے خاصدان — وہ چبایا جاتا تھا پتّہ یہ چبا جاتے ہیں پان

خواہ نیتا ہو کہ ہاتھی نام باراتی کا ہے
الغرض دیوالہ ہر حالت میں باراتی کا ہے

واہی نے طنز اور مزاح کے رشتہ کو بہت ہی ہنرمندی سے برتا ہے۔ طنز کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ بلا واسطہ طنز شدید ہوتا ہے۔ اس میں سنجیدگی زیادہ اور لطافت کم ہوتی ہے۔ مثلاً پطرس بخاری اور فکر تونسوی کا نام ضرب لگانے والوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

لیکن واہی کی نظمیں طنز کا شاعرانہ مزاج رکھتی ہیں۔ وہ اپنی طنزیہ نظموں میں قند کی ملمع سازی کرتے ہیں تاکہ اس کی شدت کا احساس جان لیوا نہ ہوجائے۔ اس کی کڑواہٹ منہ کا مزا نہ بگاڑ دے بلکہ ایک دائمی کھٹک ہو جو برابر بے چین رکھے۔ ایسے طنز اور مزاح کو پیش کرنے کے لیے صناعی درکار ہے۔ شاعرانہ نزاکت اور شعریت کے امتزاج کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واہی کی نظمیں اپنے موضوع اسلوب اور اظہار میں طنز و مزاح کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں۔

رضا نقوی واہی کی نظموں میں ان کا فن سب سے زیادہ نکھرا ہوا ہے۔ ان کی زیادہ تر نظمیں سیاسی ہیں۔ غالباً شاعر کے تجربہ کو اس میں زیادہ دخل ہے۔ یہ نظمیں سیاسی پہلو پر لکھی گئی ہیں۔ "قیام امن" "چرچل کی منتجات" "اے بھائی مصدق" وغیرہ نظمیں بین الاقوامی موضوع کی حامل ہیں لیکن "آبادکاری" "ویلفیئر اسٹیٹ" "الکشن" "اپیل" "الیکشن اور برقعہ" "جال دشمن جگت" "ہم کو لا ہیں ہم کیا ہیں" "آبادی کا مسئلہ" "راشن کی دوکان" "ملازمت" "رشوت" "لیلائے کرسی" "نیا ہاتھی" وغیرہ نظمیں ملکی مسائل پر روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کی بہتر نظموں میں طنز گہرا ہوگیا ہے۔ "قیام امن" اس وقت لکھی گئی جب سامراجی طاقتیں ویت نام میں امن قائم کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ویت نام جنگ کی آگ میں بھی ان ہی کی خشم گیں نگاہوں سے جھلستا رہا۔ ویت نام کے نام سے ہی کتنے لوگوں کے لہو کی گردش تیز ہوجاتی ہے اور وہ اپنے غم و غصّہ کو دبا نہیں سکتے۔ شاید واہی کا دل بھی خون کے آنسو رو چکا تھا۔ جب ہی ان کی اس نظم میں غم و غصّہ کی لہر پوشیدہ ہے:

مرحبا اے امن عالم کے نگہبانِ مرحبا — امن کا تونے نیا معیار قائم کردیا
تیرے فیضانِ کرم سے آج کل ویتنام میں — ہو رہا ہے شانتی کا تجربہ پیمانہ پر
زندگی اور امن میں رہتا ہے بعد المشرقین — زندگی میں اور کیا رکھا ہے نقشِ برآب سوا
زندگی معدوم ہے آبادیاں مسمار ہیں — شہر ہیں ہے قندہ زاں لاشوں سے خیاباں کی فضا
موت سے بڑھ کر نہیں ہے امن کا کوئی نظیر — اس صداقت کا پتہ ویتنام میں تونے دیا

اس نظم کی ابتدا ہی طنز سے ہوتی ہے۔ شاعر امن عالم کے نگہبانوں پر مرحبا کہتا ہے۔ موت کو امن کا سفیر اور زندگی اور امن کو بعد المشرقین کہتا ہے اس نظم کا ہر شعر طنز میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر کا ہر وار شدید ہے۔ واہی کی نظموں میں ان کے شدید جذبات کی ترجمانی ملتی ہے اور ان کے ضبط کے باوجود اس کا اظہار مختلف انداز سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم "اے بھائی مصدق" ملاحظہ فرمائیے۔

انگریز کو کس شان سے انگلی پہ نچایا اے بھائی مصدق　　والسٹٹا الطاف ہمیں دیکھ کے آیا اے بھائی مصدق
بحروں کے جو تھے بادشاہ ان کا اقتدار اب ختم ہے یکسر　　دولت کا مزا تو نے بڑی محنت سے اٹھایا اے بھائی مصدق
عاشق کے جنازے کو تکلف سے نکالا تھا عدو نے ازلا　　خود غسل دیا خود ہی کفن اس کو پہنایا اے بھائی مصدق

واہی کی بیشتر نظموں کے مسائل سے ان کے جذباتی لگاؤ کا اظہار رہتا ہے جس کی وجہ سے نظم میں جانب داری پیدا ہو گئی اس لیے جہاں طنز ہے وہاں گہرا ہے۔ جہاں مزاح ہے وہ بھی شدید لیکن ان کا انداز بیان غیر جانبدار ہوتا ہے خاص کر سیاسی نظموں کو پیش کر کے وہ محض ایک تماشائی بن جاتے ہیں۔ ان کا تمسخر بے ساختہ اور ظرافت سے پُر ہوتا ہے طنز کا وار گہرا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے عنوان یا کردار کو ہنسنے ہنسانے کا موضوع بنا کر خود الگ ہٹ جاتے ہیں اور اس کے تماشے کا نظارہ کرتے ہیں۔ واہی کا اصل رنگ یہی ہے۔ بے حد سنگین بات وہ جو کہنا چاہتے ہیں کہہ جاتے ہیں۔ اس میں طنز بھی ہے اور مزاح بھی شدید۔ اسٹیٹ میں واہی کہتے ہیں ۔

گرم بازاری جہاں ہو جیت کی تقریر کی　　ہانڈیاں پکتی رہیں جس جا خیالی کھیر کی
دفتروں میں فائیلوں کی کھیتیاں شاداب ہوں　　اور غلے منڈیوں میں سر بسر نایاب ہوں
تیل بجلی کا جہاں کھا کے روغن کے عوض　　شاعروں کو مستقل رہتا ہو پیچش کا مرض

واہی کی نظموں کی کامیابی کا راز دراصل ان کے اعلیٰ اخلاقی کردار اور ان کے تجربات میں مضمر ہے۔ موضوعاتی اعتبار سے ان کی زیادہ تر نظمیں سیاسی بھی ہیں جو ان کے مختلف اوقات کے تجربات کی نچوڑ ہیں لیکن ان کی نظموں میں صرف تجربہ ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا نرم مزاج شائستہ ذہن اور بے باک انداز بھی شامل ہے۔ ان کی نظموں میں ضبط کی کیفیت ہے اور اسی لیے ان کا فن بہت معیاری اور اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے۔ مزاحیہ ادب میں تخلیق ادب کرنا ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جو ذرا سی بے راہ روی اور قدرے بے احتیاطی برتنے سے پھکڑ پن اور ہزل گوئی کی مثال بن جاتا ہے۔ واہی نے اپنا معیار قائم رکھا ہے اور اپنی پہچان الگ سے بنائی ہے ▲

امجد علی فیض
گلبرگہ

مچھر کی حمایت میں.....!

جہاں سڑتی ہوئی نالیاں اور گٹر ہم ہندستانیوں کا قیمتی اثاثہ ہیں وہیں مچھر عالم انسانیت کے لیے قدرت کا انمول عطیہ ہیں۔ جب ان کو ختم کرنے کی سازش شروع ہوتی ہے اور نالیوں پر مچھر کش دواؤں کا چھڑکاؤ ہوتا ہے تو ہم کف افسوس ملنے لگتے ہیں کہ ہم جب اپنی آزادی اور جمہوریت سے پورا پورا استفادہ کر رہے ہیں تو ان بے چارے بے زبان مچھروں کو کیوں اس سے محروم رکھا جا رہا ہے؟ کیوں ان کے چلنے پھرنے اور اڑنے پر پابندیاں لگائی جا رہی ہیں؟؟ حالاں کہ وہ اکثریت میں رہ کر بھی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کبھی اپنے مطالبات منوانے کے لیے جلوس نہیں نکالتے، کبھی حکومت کے خلاف نعرے نہیں لگاتے۔ مرن برت اور بھوک ہڑتال کا اہتمام نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ انھوں نے کبھی ریزرویشن کے لیے اپنی تحفظیت کی مانگ نہیں کی۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے جائز مطالبات منوانے کے لیے صف آرا ہو جاتے اور حکومت سے مانگ کرتے کہ ہم کب تک غریبوں کا خون چوسیں۔ ہمیں بھی امیر آدمی فراہم کیے جائیں۔ اور وہ امیر بھی ایسے ہوں جو چربی دار جسم کے نہ ہوں کیوں کہ ان کے جسم میں خون کم اور چربی زیادہ ہوتی ہے جو ہماری صحت کی کوتاہی کا سبب بن سکتی ہے۔

ہماری اس طرف داری پر شاید آپ یہ کہیں کہ انھیں بھی ہمارے ساتھ آزاد رہنے کا پورا پورا حق حاصل ہے اگر انھیں رہنا ہی ہے تو ہماری طرح خوب صورت، صاف ستھری کالونیز میں رہیں گندی نالیوں میں رہ کر کیوں گھر اور ملک کو بدنام کر رہے ہیں تو ہم کہیں گے۔

جہاں ملک کی بیشتر آبادی گٹروں کے قریب کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزار رہی ہے وہیں یہ مچھر نالیوں میں اپنی زندگی گزاریں تو کون سا ملک کی اقتصادی پالیسیوں پر اثر پڑے گا۔ جہاں امیر لوگ غریبوں کا خون چوس چوس کر انھیں گنے کے پھوس کی طرح پھینک رہے ہیں وہیں بے چارے مچھر اپنی چار روزہ زندگی کے لیے ہمارا تھوڑا سا خون چوس لیں تو کون سا ملک کی دفاعی قوت کمزور ہو جائے گی۔

حالاں کہ ان کا دل بھی صاف ستھرے ماحول میں رہنے کو، بڑے کالجوں میں پڑھنے کو اور صاف ستھرے پلے گراؤنڈ پر کھیلنے کو چاہتا ہے مگر انھوں نے جب یہ دیکھا کہ حکومت خود عوام کو ایسی سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر ہے تو اپنی زندگی نالیوں کے سپرد کر دی اور ملک کی ترقی میں برابر ہاتھ بٹاتے رہے۔

ہائے وہ بھی کیا سنہری دور تھا جب محلوں میں ان کی خاص پذیرائی ہوا کرتی تھی اور کال کوٹھری میں خاص اہ

کے لیے سینڈ فراہم کیے جاتے تھے۔

مگر افسوس.......!

آج کل ہر جگہ صفائی کے چرچے ہو رہے ہیں اور ہر چند صاف نظر آ رہی ہے۔ (یہ قیامت کے آثار نہیں تو پھر کیا ہیں) حتیٰ کہ جیل میں بھی اسی صفائی کو مدِنظر رکھتے ہوئے جیل کے باسیوں کو صاف ستھرے کپڑے خوشبودار صابن اور اچھے کھانے فراہم کیے جا رہے ہیں۔ شاید اسی لیے ہندوستان کی ۱۵ فی صد آبادی جیلوں میں ہنسی خوشی زندگی گزار رہی ہے تو ۹۰٪ فی صد آبادی جیل میں رہنے کی خواہش کو لیے دربدر بھٹک رہی ہے اور بہت سے حضرات تو اسی خواہش کو اپنے دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے (خدا سے ہماری دعا ہے کہ مرحومین کی ادھوری خواہشیں آسمان پر پوری ہو جائیں اور انھیں وہیں کہیں ایک عدد صاف ستھرا جیل مل جائے)

مگر اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود کتنے فراخدل ہیں وہ مچھر جو آج بھی ہماری تنہائیوں کو اپنی موجودگی سے رونق افروز کر دیتے ہیں۔

ہمارے جسم پر جا بجا بیٹھ کر اپنے فنگر پرنٹس چھوڑ جاتے ہیں اس لیے کہ ہم فرصت کے اوقات میں انھیں کھجا کھجا کر اپنا غم غلط کرتے رہیں۔ وہ ہم ایک دوسرے کے جسموں میں خون کا تبادلہ بھی محض اس غرض سے کرتے ہیں کہ ہم میں ذات پات رنگ و نسل کا فرق ختم ہو جائے اور کم و بیش ہر آدمی ملیریا سے مستفیض ہو سکے۔ اس کے باوجود بھی ہم ان پر ماحول، صحت اور خون خراب کرنے کی تہمت لگائیں تو وہ بھی ہم سے شکایت کے متمنی ہیں کہ جناب عالی خیری کھمل جی بھی تو ہماری ذات برادری کے ہیں۔ انھیں آپ کی میز اور کرسی استعمال کرنے الماری میں رہ کر آپ کی کتابوں کی ورق گردانی کرنے، مہری پر پڑے پڑے آپ کی رازدارانہ گفتگو سننے کی انھیں بھی پوری آزادی ہے اور پھر ان کی آمد پر بھی تو کہیں مچھر دان نہیں لگتے۔ آخر ہم سے یہ گفتگو سننے کی انھیں پوری پوری آزادی ہے اور پھر ان کی آمد پر بھی تو کہیں مچھر دان نہیں لگتے۔ آخر ہم سے یہ پردہ کیوں......؟؟؟

کیا ہماری خدمات بجا نہیں، کیا ہمارے کارنامے قابلِ ستائش نہیں......؟؟؟

ہم کہیں گے ان کی شکایات بجا، ان کی خدمات قابلِ تحسین کیوں کہ جلسے، جلوس میں ان کی شرکت باعثِ افتخار مشاعروں میں ان کی موجودگی کامیابی کی ضمانت کیوں کہ کچھ ایسے ہی قابلِ دید مشاعرے کے چشم دید گواہ ہم بھی ہیں مشاعرے کی حالت یہ تھی کہ شعراء و سامعین سے مچھروں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس پر افسوس یہ کہ شعرا مچھر دانی لے گئے۔ [illegible] کو بالترتیب ۱۰، ۱۵ مچھر بار بار پہلو بدل بدل کر کبھی ترنم سے تو کبھی تحت اللفظ غزلیں سنانے لگے۔ سارے سامعین پر ایک وجدانی سی کیفیت طاری تھی ہر کوئی اپنے رنگ میں رنگا ہوا اپنے اپنے انداز سے کوئی ہاتھ پیر کھجا کھجا کر، تو کوئی گال پر تھپڑ رسید کر کے (اپنے ہی) اکوئی تالی بجا کر تو کوئی سینہ زنی کر کے داد دے رہا تھا (معلوم ہو کہ یہ داد دینے کے سائنٹیفک طریقے ہیں) وہ داد تو دیتے رہے مگر ایسا محسوس ہو رہا تھا اپنی سخن فہمی پر ماتم کر رہے ہوں۔

اس روز مچھروں نے مشاعرے کو ہی نہیں بلکہ سامعین کو بھی باری باری لوٹا اور انہی کی بدولت اس مشاعرے کا ذکر دوستوں کی زبان سے نکل کر دشمنوں کے دانتوں تک جا پہنچ گیا اور بہت سے بزرگ حضرات دانت نہ

ہونے کی وجہ سے اپنے حلق میں اٹکانے میں کامیاب ہو گئے ۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اگر خطلین کی مداخلت نہ ہوتی تو اس مشاعرے کو عالمی شہرت ضرور نصیب ہوتی ۔

صاحبو! اب آپ سے کیا چھپانا جب سے مچھر سخن فہم ہو گئے ہیں ہمارے گھروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس پر ہماری سالی نے اپنے دس بچوں سمیت ہمارے گھر پر حملہ کر دیا اور اس طرح ٹڈی ہوئی ہیں کہ ہمارے قدم محاذ پر ڈگمگانے لگے ہیں ہم نے سوچا کیوں نہ مچھروں سے استفادہ کیا جائے کیوں کہ تو وہ ہمارے گھر سے جاتے اور نہ ہی ہمارے ہاں تشریف لاتے اسی غرض سے دولت کدۂ مچھر پر حاضری دی اور غیر حاضر رہنے کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا" صاحبو آج کل ہم نے انسانوں کا خون چوسنا چھوڑ دیا ہے کیوں غریب لوگ تو اس سے خالی ہیں اور بچے کچھے امیر ان ... ان میں بھی خالص نہیں ملتا. جہاں خالص خون نہیں ملتا وہاں مرکھپ کے کیا حاصل ۔

مچھر بھوکا مر جائے گا پر نقلی خون نہیں چوسے گا"

اور ہاں آئے دن کے نسلی و فرقہ وارانہ فسادات سے ہمیں اتنا ریڈی میڈ خون مل جاتا ہے کہ ہم برسوں کا اسٹاک محفوظ میں کر لیتے ہیں ۔ فی الوقت خون کا کافی ذخیرہ ہمارے پاس موجود ہے ۔ برائے مہربانی تشریف لے جائیے پھر ملیں گے" پھر ہم نے اپنی پگڑی ان کے پاؤں پر رکھ دست بستہ عرض کیا "بھائی اصل بات یہ ہے کہ ہمارے گھر بن بلائے مہمان گھس آئے ہیں اور ان کے جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی لہذا اب میری عزت آپ کے پاؤں میں ہے چاہے تو آپ اسے ٹھوکر ماریں یا پھر بحال کریں" اتنا سننا ہی تھا کہ سردار مچھر آب دیدہ ہو کر کہنے لگے " بس بس صاحب اور ہمیں شرمندہ مت کیجیے کیا آپ نے بھی ہمیں انسان سمجھ رکھا ہے ۔ آخر ہم نے بھی تو آپ کا خون پیا ہے اگر اس وقت وہی خون آپ کے کام نہ آئے تو ہمارا جینا ہی کس کام کا ...... ؟

اتنا کہہ کر اس نے مچھروں کی ایک ٹکڑی ہمارے ساتھ روانہ کر دی ......

محمد عبدالقدیر (حیدرآباد)

نقل مارنے کے ماڈرن طریقے

[بین کلیاتی مزاحیہ مضمون نگاری کے مقابلے میں
اس مضمون کو انعام دوم کا مستحق قرار دیا گیا ———]

طلبا اور نقل دونوں کا ہمیشہ سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امتحانات کے زمانے میں طلبا کے جیب نقل کی چٹھیوں سے لبریز رہتے ہیں۔ یہی نہیں۔ ان کا پیراہن تمام کاغذی چٹھیوں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

یہ تیاریاں امتحان سے ایک ماہ قبل یا اس سے پیشتر ہی سے شروع کردی جاتی ہیں۔ کمبائنڈ اسٹڈی کے چرچے شروع ہوجاتے ہیں۔ رات رات بھر کمبائنڈ اسٹڈی چلتی ہے۔ اس میں بڑا مزہ آتا ہے چار پانچ دوست مل کر جنگ کے نقشے کی طرح امتحان گاہ کا نقشہ مرتب کرتے ہیں۔ تفصیل کے ساتھ مباحثے چلتے ہیں۔ ان مباحثوں کے دوران تفریح کا نظم دیکھی جاتی ہے پھر ری فریشمنٹ کے طور پر کسی ہوٹل میں چائے نوشی اور سگریٹ نوشی وغیرہ ہوتی ہے۔ ان سب لوازمات سے فارغ ہونے کے بعد اہم اہم سوالات پر نشانات لگائے جاتے ہیں۔ پھر ان کی باضابطہ ایک فہرست مکمل کرلی جاتی ہے جس میں مضافاتی بسوں کی فہرست کی طرح ردوبدل ہوتا رہتا ہے۔ ایک ٹائم ٹیبل بھی مرتب کیا جاتا ہے جس پر تمام ساتھی پابندی کے ساتھ عمل کرنے کا حلف اٹھاتے ہیں۔

جب امتحان پوری طرح سامنے آکر کھڑا ہو جاتا ہے اور صرف تین چار دن باقی بچ جاتے ہیں تو طلبا عید کی شاپنگ کی طرح امتحان کی شاپنگ کو نکلتے ہیں۔ اس شاپنگ کے لیے مخصوص دکانوں پر گائیڈوں کا اسٹاک رہتا ہے۔ بڑے پیمانے پر اشتہار بازی نہیں ہوتی بلکہ سینہ بہ سینہ خفیہ طور پر طلبا میں اس کی تشہیر ہوتی ہے۔ امتحانی موسم میں ملبوسات (garments) کی دکانات پر طلبا کا ہجوم رہتا ہے جہاں پر ایسے ایسے خاص قمیص اور پتلونیں اور تیار کردہ کپڑے ملتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ان دکانات سے طلبا پتلونیں، شرٹس، انڈرویئر اور بنیان جس میں بے شمار چور جیب ہوتے ہیں "امتحان اسپیشل اسٹاک" (exam special stock) میں سے چن کر لیتے ہیں۔ اسی طرح خاص قسم کے جوتے جن میں کم از کم آدھا امتحان حل کرنے کا مواد سما سکے فٹ ویئر سے خریدتے ہیں۔ اور جو طلبا خاص قسم کے ہوتے ہیں اور جو جوتے اور چپل خریدنے کا مقدور نہیں رکھتے وہ اپنی ہوائی چپل کی دو پٹیوں ہی پر بھروسہ کرلیتے ہیں اور اس کے ساتھ ریڈیمیڈ کا ایک پاکٹ جال کی پاکٹ پیپر گلاس نیز بوتل اپنے قریبی جنرل اسٹور سے حاصل کرلیتے ہیں۔

یہ تو ہوئی طلبا کے کپڑوں اور جوتوں کی بات ۔ جہاں تک طالبات کا سوال ہے ، وہ طلبا سے کسی طرح پیچھے نہیں رہتیں ۔ ان کی اپنی exam shopping کچھ مختلف طرز کی ہوتی ہے ۔ متذکرہ بالا گارمنٹس کے علاوہ وہ لیڈیز شاپنگ سنٹر سے خاص قسم کے some hair جس میں چٹھیاں رکھنے کی سہولت ہوتی ہے اور خاص قسم کے جوڑے جن میں زیادہ گنجائش ہوتی ہے خریدتی ہیں ۔ طالبات زمانۂ امتحانات میں اپنا hair style بھی تبدیل کر دیتی ہیں اور فیشن کی آڑ میں exam special hair style کروالیتی ہیں جس سے بہت فائدہ ہوتا ہے کہ جو نوٹس حفظ کرنا مشکل ہو انھیں بالوں میں محفوظ کیا جا سکتا ہے ۔ نقل میں طلبا کی اس غیر معمولی دلچسپی کو دیکھ کر ان کی سہولت کی خاطر چند کمپنیاں خاص قسم کے exam pads اور (compass Boxes) تیار کرنے لگتی ہیں ۔ یہ کاروبار بالکل ہتھیاروں کی اسمگلنگ کی طرح خفیہ ہوتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں اس خاص مہارت کے ساتھ تیار کیے جاتے ہیں کہ دیکھنے والوں کو صرف compass یا exam pads ہی نظر آتے ہیں ۔ لیکن ان میں الہ دین یا گورڈ یک کی الماریوں کی طرح ایسے چور لاکرس ہوتے ہیں کہ بڑے سے بڑا انسپکٹر بھی چٹھیوں کا پتہ نہیں لگا سکتا ۔

بہر حال جب امتحان سر پر آجاتا ہے تو سوالات کے جوابات کو فلیتوں کی شکل میں ان کمپاس بکسوں میں اور exam pads کے چور لاکرس میں محفوظ کر لیا جاتا ہے ۔

ان مراحل سے گزرنے کے بعد جب طلبا امتحان ہال میں اپنا اپنا مورچہ سنبھال لیتے ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت طاری رہتی ہے ۔

جیسے ہی امتحان شروع ہونے کی گھنٹی بجتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صور اسرافیل پھونک دیا گیا ہے ۔ امتحان ہال میدان حشر معلوم ہونے لگتا ہے ۔ کیوں کہ ابتدا میں فضا طلبا کے حق میں "ٹائیٹ" ہوتی ہے اور کسی کو ہلنے کی بھی گنجائش نہیں ہوتی اور جب فضا اس طرح کی ہو جاتی ہے تو پھر امتحان ہال میدانِ حشر کا منظر پیش کرنے لگتا ہے ۔ ہر کوئی نفسا نفسی کے عالم میں ہوتا ہے یہاں سال تمام کے اعمال کا محاسبہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے ۔ ایسے میں کہیں سے اگر یہ خبر مل جائے کہ فلائنگ اسکواڈ آرہا ہے تو ایک کھلبلی مچ جاتی ہے ۔ کالج کے چپراسیوں کا عملہ فوری حرکت میں آجاتا ہے ۔ پھر ایک وارننگ دی جاتی ہے کہ جو کچھ طلبا کے پاس ہے وہ فلائنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیں ۔ اس وارننگ کے ساتھ ہی پائنچے چڑھنے لگتے ہیں ۔ پاجاموں کے الاسٹک کی آوازیں ، exam pad اور compass Boxes اور پیانڈس کے نیچے اوپر ہونے کی کھٹا کھٹ کی آوازیں شروع ہو جاتی ہیں ۔ سینکڑوں امیدواروں کا ایک ایک سال کی محنت ایک ساعت میں نکل کر ردی کی ٹوکری کی نذر ہو جاتی ہے ۔ اس کے باوجود کسی کے پاس سے کوئی چٹھی بچ نکلتی ہے تو اسے دھر لیا جاتا ہے ۔ اور وہ بے چارہ یہ شعر گنگناتا ہوا امتحان ہال سے باہر نکل جاتا ہے :

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

موجودہ دور نقل کے لیے ایک منحوس دور ثابت ہو رہا ہے ۔ کیوں کہ پچھلے تین چار سالوں میں ایسا مکمل اتنی

ثابت ہوگئی ہے کہ اگر کوئی بلے باز (نقل نویس) جارحانہ اسٹروکس کی سوچتا ہے تو اسے پویلین ہی کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں نقل نویسی طلبا کے لئے ایک چیلنج بن کر ابھر آئی ہے۔

جب سے امتحان ہال میں نہتے داخل ہونے کا دور آگیا ہے، طلبا گائیڈ بکس، نوٹس اور چیٹس وغیرہ سے بیزار ہوگئے ہیں۔ اب جبکہ نقل نویسی کا سنہرہ دور ختم ہورہا ہے تو طلبا کا رجحان زیادہ تر پڑھائی کی طرف ہورہا ہے۔ لیکن ماضی کے اثرات اب بھی ذہنوں میں بسے ہوئے ہیں جو نقل کی نئی نئی تکنیکوں کو جنم دیا کرتے تھے۔ ●●

سراج نرملی

○

میکے میں بارہ ماہ مری اہلیہ رہے
چوبیس گھنٹے ساتھ مرے دلربا رہے
یار و! رہے نہ یانس نہ ہی بانسری بجے
بیگم رہے نہ گھر میں، نہ ہی رتّیا رہے
کنگ کانگ، گاما، دارا، کلے کو ہرا دیا
ہمت ہے کس میں؟ جو مرے آگے ٹِکا رہے
لوگوں کے سامنے یوں مجھے ڈانٹ مت ڈیر!
شوہر ہوں تیرا کچھ تو مرا مرتبہ رہے
تم نے کہا تھا، نام ہے منحوس اس لیے
کچھ روز اپنے نام سے ہم بھی خفا رہے
ناممکنات میں سے ہے یہ بات اے سراج!
مجھ سے ہمیشہ [illegible] اہلیہ رہے

○

وہ ہے کٹھن رسائی اب میری جانِ جاناں تک
ٹوٹے دل سے بھاگ آیا شہر سے بیاباں تک
کم سے کم کلومیٹر ٹھیک تھا، مناسب تھا
فاصلہ بہت کم ہے ہاتھ سے گریباں تک
شیر خوار بچوں کو، بھی نہ بخشی پی۔ اے سی
دیکھ کر یہ شرمندہ ہوگیا ہے شیطاں تک
قتل، لوٹ، دھوکا، جھوٹ، رکھ دل یہ کہتا ہے
فاصلہ ہے میلوں کا آدمی سے انساں تک
جیب خرچ کم کرکے کھو رہا ہے تو وقعت
تجھ سے اب نہیں ڈرتا تیرا خانساماں تک
اے سراج قسمت میں سب کی زن مریدی ہے
ڈر رہا ہے خانم سے دیکھو خانِ خاناں تک
●

دسے کے خط

(مراسلے)

مصطفیٰ کمال صاحب!

"شگوفہ" کا جون کا شمارہ ملا۔ شکریہ۔ اس میں (خامہ بگوش) کا پروفیسر مسعود حسین خاں کی خود نوشت سوانح حیات "ورود مسعود" پر تبصرہ خاصہ کی چیز ہے۔ میں نے اسے بہت دلچسپی اور لطف کے ساتھ پڑھا۔ تبصرہ نگار کا اسٹائل بہت اچھا ہے اور شگوفہ میں دراصل اسی اسٹائل کے حامل تبصرے چھپنے چاہئیں۔ ویسے ان میں صاحب کتاب کی ذات یا تصنیف کے تعلق سے کوئی گستاخانہ بات بھی نہیں ہے۔ انھوں نے بہت عمدہ پیرائے میں مسعود صاحب کے بیان کردہ واقعات ہی کو نقل کرتے ہوئے اس پر دو یا تین اور بعض وقت ایک ہی جملہ میں اپنا تبصرہ پیش کیا ہے۔ حیدرآباد میں یہ تبصرہ خاص طور پر اس لیے بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا کہ ہم سب انھیں شخصی طور پر جانتے ہیں اور وہ ہماری یونیورسٹی میں اور ہمارے شہر میں کئی برس رہ چکے ہیں۔ آپ سے تو خیر بہت ہی قریبی مراسم رہ چکے ہیں اور آپ ان کے عزیز شاگرد بلکہ شاگرد "رشید" ہیں۔

اس شمارہ میں اپنے دوست مسیح انجم کا مضمون "بیت الخیال" بھی حسب معمول پسند آیا۔ مجتبیٰ صاحب کی دلی اور پرویز مہدی صاحب کے بمبئی چلے جانے کے بعد وہ حیدرآبادی مزاح نگاروں کی آبرو بنے ہوئے ہیں۔

رشید الدین
حیدرآباد

عید مبارک!

پچھلے دو شماروں میں حصۂ نظم نثر پر بھاری ہے۔ اگر شعرا حضرات کچھ اور توجہ دیں تو حصۂ نظم کا وقار واپس آسکتا ہے۔

مظفر خورشتر (بہار)

دھواں دھار تقریر

جلد : ۲۲ ــــ اگست ۱۹۸۹ء ــــ شمارہ : ۸

جشنِ آزادی مبارک

ماہنامہ

حیدرآباد

فی پرچہ : ۵ روپے ۰ سالانہ ۵۰ روپے ۰ لائبریریوں سے : ۶۰ روپے ۰ عرب ممالک سے ۱۶۰ روپے

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس مچھلی کمان حیدرآباد

خط و کتابت کا پتہ : ۳۱ بچلرز کوارٹرز ، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۱

فون رہائش : 521064 فون آفس : 557716

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذّت کی انتہا ہے یہ
کشمیری قوام
تیار کنندگان:
پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس
گلزار حوض، حیدرآباد
کشمیری قوام

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

۵

ایپکو فیبرکس

APSHWCSL

فیاض احمد فیضی
(بمبئی)

برسات کے مزے

یوں تو برسات کا لطف اٹھانے کے لیے سب سے اچھا موسم بارش کا موسم ہوتا ہے مگر برسات کا موسم شروع ہونے سے ٹھیک ایک مہینہ پہلے ہی اس موسم کے مزے آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ بچّوں کے اسکول سے پیغام آتا ہے "آپ کے بچّے کی شرارتوں سے تنگ آکر اسے اگلی جماعت میں ترقی دے دی گئی ہے تاکہ اونچی جماعت میں پہنچ کر شاید اس میں کچھ سمجھداری آجائے۔ اسکول بند کر دیا گیا ہے۔ جون کے مہینے میں بارش کا پہلا چھینٹا پڑتے ہی اسکول دوبارہ کھل جائے گا۔ اس روز اپنے بچّے کو نیا یونی فارم، نئی برساتی اور نئے جوتے پہنا کر اس کی بیسٹ پچیس کتابیں اور پچیس کاپیاں لاد کر اسکول بھیجیے۔ صرف پہلے دن حاضری لازمی ہے۔"

اس پروانے کو دیکھتے ہی بیگم کی صدائے دل خراش آتی ہے "سنیے! میری آٹومیٹک چھتری بگڑ گئی ہے ابھی سے بنوا لیجیے۔ پتہ نہیں کب بارش شروع ہو جائے، اور ہاں صندوق سے اپنے بارش کے جوتے بھی نکلوا کر صاف کر لیجیے"۔ اسی کے ساتھ صاحبِ کار، صاحب موٹر سائیکل اور صاحب محض سائیکل کو فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ برسات آنے سے پہلے پہلے اپنی گاڑیوں کو بھی آنے والے موسم کے لیے چست و چالاک بنا لیا جائے۔ آپ دوڑ دوڑ کر ہر دوسرے دن بینک سے پیسہ نکال کر لانے میں مصروف اور بیوی بچّے خریداری میں مگن ہو گئے۔ یعنی مئی کی گرمیوں میں ہی برسات کے مزے آنے شروع ہو گئے۔

بارش شروع ہونے سے تقریباً پندرہ روز پہلے ہی محکمۂ موسمیات والے بری طرح مصروف ہو جاتے ہیں۔ روز نئی نئی پیشین گوئیاں دل کو دہلانے لگتی ہیں۔

"امسال بارش جلد شروع ہوگی۔"

"مانسون کرنٹ کی فوج ریاست کی سرحد سے آ لگی۔ اگلے دو روز میں شہر تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔"

"کل کہیں کہیں چھینٹے برسیں گے۔"

"مانسون کرنٹ کچھ کمزور پڑ گیا ہے اب بارش اگلے ہفتے شروع ہوگی۔"

پھر خبر آتی ہے کہ مضافات میں کہیں کہیں بوندا باندی ہوئی تھی اور اگلے روز زوردار بارش ہوگی

اور سچ مچ اگلے روز اتنی گرمی پڑتی ہے کہ دن میں کئی بار غسل خانے میں شاور کے نیچے کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اس طرح موسمیات والے لوگوں کو پیشگی ریہرسل کروا دیتے ہیں کہ لوگ برسات کے موسم میں محنت سے تیار کی گئی غلط پیشین گوئیوں سے دھوکے میں نہ آئیں۔ اور ان پیشین گوئیوں کو الٹ پھیر کر اپنا کام چلالیں۔ پھر بھی کبھی برسات میں ایسی گول مول پیشین گوئیاں جاری ہو جاتی ہیں جو کھوٹے سکے کی طرح دونوں طرف سے غلط نکل آتی ہیں۔ ایسے میں کسی کو الزام دینا سراسر غلط ہے۔ ہمارے یہاں یوں بھی عورت، لیڈر اور موسم کی ذات کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ان کے متعلق کوئی بھی یقینی قیاس آرائی نہیں کی جا سکتی۔

ادھر بادل گرجے، بجلی چمکی اور بارش کی پہلی پھوار پڑی، برسات کے لاتعداد مزے ایک کے بعد ایک آسمان سے اترنے لگے۔ سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ شہر میں غزل، قوالی، مشاعرہ اور کلاسیکی موسیقی کے پروگرام جو موسم گرما میں شباب پر ہوتے ہیں، بارش شروع ہوتے ہی ایک دم سے تھم جاتے ہیں۔ گائیکوں، شاعروں اور قوالوں کو قرار آجاتا ہے اور وہ بھری برسات میں گھر میں بند ہو کر نئی تخلیقات میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فن کاروں کے بچوں کی تاریخ پیدائش اکثر مارچ اپریل اور مئی کے مہینوں کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ جو بچے مارچ اپریل اور مئی کے مہینوں میں پیدا ہوتے ہیں ان کے والدین محض فن کار ہی ہوتے ہیں۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ موسم برسات میں غزل، قوالی اور پکے راگ بالکل سنائی نہیں دیتے۔ جی نہیں۔ ریڈیو والے (اور کبھی کبھی ٹی وی والے بھی) بدستور آپ کے لیے سامانِ دل بستگی مہیا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اونچے گھرانوں کی بیگمات جو سردیوں اور گرمیوں میں ذوق و شوق سے بطور فیشن غزل اور موسیقی کے پروگرام اٹینڈ کرتی ہیں، برسات کے موسم میں ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر بجا کر اپنے ذوق کی تسکین نہیں کرتیں۔ ان دنوں وہ مجبوراً کلب جا کر رمی اور جن سے دل بہلاتی ہیں۔ لیکن قدرت کا انتظام بھی نرالا ہے۔ برسات کی راتوں میں جھینگر چھوٹی بحر کی غزلیں گانا شروع کر دیتے ہیں۔ ندی تالابوں میں مینڈک قوالی سے ملتی جلتی کوئی چیز الاپنا جاری کر دیتے ہیں اور وفادار کتے جو سردی گرمیوں میں ایک دوسرے کے مالکوں کو کاٹ کھانے دوڑتے تھے، اب ایک دم سے رومانٹک ہو جاتے ہیں۔ اور بارش کی رنگین راتوں میں شعری نشستیں منعقد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

حیرت انگیز طور پر برسات کے موسم میں سیاسی ریشہ دوانیاں، ریشہ ریشہ ہو کر بکھرنے لگتی ہیں اور ملک کے دردمند فلاح و بہبود کی طرف سے بے نیاز ہونے لگتے ہیں۔ فسادات، لوٹ مار اور ڈکیتی کے واقعات میں بھی بریک لگ جاتا ہے اور جان و مال کے محافظ اور گہری نیند سونے لگ جاتے ہیں۔ البتہ چھوٹی موٹی چوریوں کے واقعات قدرے بڑھ جاتے ہیں۔ خیر اب بڑے فائدوں کے سامنے ان چھوٹی موٹی قربانیوں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ اگر سال میں صرف ایک موسم ہوتا، برسات کا موسم تو زندگی کتنی بھلی آرام دہ اور پرسکون ہوتی۔ شاید اسی لیے چیراپونجی کا نام اخباروں میں پڑھنے کو نہیں ملتا کہ وہاں سال کے بیشتر حصے میں بارش ہوتی رہتی ہے۔

برسات کے موسم میں غصہ جلدی نہیں آتا۔ گرمیوں کی دوپہر میں اگر کوئی مکھی ناک پر بار بار بیٹھنے لگے تو جی چاہتا ہے کوئی بڑا سا پتھر اٹھا کر مکھی کا خاتمہ کر دیں لیکن بارش میں اگر کہیں سے سانپ بھی نکل آئے تو اسے پیالی میں دودھ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور دودھ بھی کون سا؟ بوتل کا مہر بند والا دودھ جو گوالے کے دودھ کی طرح مزید پتلا نہیں ہو جاتا۔ گرمیوں میں اگر غلطی سے آپ کی موٹر سے دوسری گاڑی کو خراش بھی آجائے تو سامنے والا مارنے مرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ برسات میں آپ پڑوسی کی کار کو جان بوجھ کر ٹکر بھی ماردیں تو وہ خفا کر کہے گا۔ کوئی بات نہیں۔ بارش میں گیلے بریک پر سے پیر پھسل ہی جاتا ہے۔ آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟

یہی وجہ ہے کہ برسات میں گھروں میں برتن نہیں توڑے جاتے۔ تنگ مزاج اور غصیلی بیویاں بالکل آئس کریم بن جاتی ہیں۔ پتہ نہیں یہ ان کے مزاج کی تبدیلی کا اثر ہوتا ہے یا بھیگے موسم میں رچے ہلکے ہلکے رومان کا کہ برسات میں بدصورت بیویاں قبول صورت نظر آنے لگتی ہیں۔ معمولی شکل و صورت کی بیویاں خوب صورت دکھائی دینے لگتی ہیں اور حسین عورتیں تو بالکل پریوں کے سمان سیدھے دل میں اترنے لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ نوجوان لڑکیاں بارش میں اچانک حسن و جمال کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتی ہیں۔ جو بھیگنے سے پہلے قاتل دکھائی دیتی ہیں اور بھیگنے کے بعد مجسم آلہ قتل بن جاتی ہیں۔ پرانے زمانے میں جب حسن قدرتی ہوا کرتا تھا بھیگی ہوئی عورت جہاں قلوپطرہ نظر آنے لگتی تھی وہیں بھیگا ہوا مرد راقفنن کا مشہور پرندہ معلوم ہوتا تھا۔ آج کل میک اپ کے بوجھ تلے دبی خواتین کے چہروں کا اچھا خاصہ حصہ بھیگنے کے بعد دھل کر بہہ جاتا ہے اور وہ حسین پیارا اور کبھی صرف پیارا دکھائی دیتی ہیں۔ مرد البتہ آج بھی بھیگنے کے بعد اسی مشہور پرندے کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا سبب تادم تحریر دریافت نہیں کیا جاسکا۔ عینک لگانے والے مرد اگر بھیگ جائیں تو وہ دوسروں کے لیے مزید تفنن طبع کا سامان ہو جاتے ہیں۔ انھیں عینک اتار کر جیب میں رکھ لینی پڑتی ہے اور وہ ذرا بھیگنے سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بہر حال نئی عینک کا خرچ برداشت کرنے سے تو بہتر یہی ہے کہ آدمی کچھ دیر بھیگا ہی دکھائی دے۔

عام طور پر برسات شروع ہونے کے تقریباً ایک ہفتہ بعد موسلا دھار بارش کا نزول ہوتا ہے۔ یہی زور دار بارش میں آدمی گھر میں آرام کرتا ہے اور سال بھر کی بچائی ہوئی چھٹیاں تمام کرتا ہے کچھ ہمت والے آفس جانے کے لیے نکلتے ہیں تو سڑکوں پر بنے ندی نالوں میں گھنٹوں ڈبکیاں لگاتے رہتے ہیں۔ کیا مرد کیا عورت ملازمت پیشہ بارش میں سبھی اپنے لباس کو موڑ کر تیراکی کا لباس بنا لیتے ہیں کچھ خود تیرتے ہیں کچھ تیرتی بسوں اور ٹرینوں میں بیٹھ کر تیراکی کا مزہ لوٹتے ہیں۔ ان میں آدھے سے زیادہ لوگ آدھے راستے ہی سے سوئمنگ پول کا لطف اٹھانے کے بعد، اتنا سا منہ نکال کر، چہرے پر بے چارگی اور مظلومیت سجائے، گھر واپس ہو لیتے ہیں اور گھر والوں کی ہمدردیاں اور محبت لوٹتے ہیں۔ تھوڑے بہت جو کسی طرح آفس پہنچ جاتے ہیں چند گھنٹوں میں کپڑے سکھا لینے کے بعد واپسی کی تیاریاں شروع کر دیتے ہیں تاکہ ایک گھنٹہ پہلے ہی آفس چھوڑ کر

بھیگتے ہوئے رات بارہ بجے سے پہلے گھر پہنچ جائیں اور دوسرے دن اتفاقیہ رخصت لے کر دن بھر کمبل اور رضائی اوڑھ کر برسات کے مزے لوٹیں۔

برسات میں آپ محنت کریں یا نہ کریں، اس موسم میں بھوک بہت لگتی ہے اور کھانے کی جو بھی چیز سامنے آجائے فوراً اس کا کام تمام کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ اسی لیے گھروں اور ہوٹلوں میں کھانا بچتا نہیں بلکہ اکثر کم پڑ جاتا ہے۔ حالاں کہ برسات میں ہوٹل والوں کو سڑے گلے پھل اور سبزیاں بڑی تعداد میں سستے داموں مل جاتی ہیں۔ برسات میں فقیر بھی باسی کھانے کی فرمائش نہیں کرتے اور نقد خیرات پر ہی اصرار کرتے ہیں تاکہ اسٹاک ختم ہونے سے پہلے ہی ہوٹل سے گرما گرم کھانا خرید کر کھالیں اور قیلولہ فرمالیں۔ برسات میں یوں بھی گرما گرم چیزوں کی قدر بڑھ جاتی ہے چناں چہ اس موسم میں بڑے بچوں کی پسندیدہ فلموں کی ٹکٹیں بآسانی دستیاب نہیں ہوتیں۔

برسات کا ایک چھوٹا موٹا فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس موسم میں بجلی اکثر غائب ہوجاتی ہے تاکہ آپ کو آسمانی بجلی صاف صاف دکھائی دے اور آپ اس کے نظارے سے پوری طرح محظوظ ہوسکیں۔ پھر قدرتی پنکھے کی ہوا مسلسل چلتی رہتی ہے۔ چناں چہ اس موسم کا بل آدھا رہ جاتا ہے اس کی کسر یوں نکلتی ہے کہ اس موسم میں ڈاکٹروں کا بل بھی گنا بڑھ جاتا ہے اور ان ڈاکٹروں کے مطب میں نزلے زکام، ملیریا کے بخار اور چھینکے صحت یاب کی کہانیاں ایک دوسرے کو سناتی ہوئی ماؤں کا جھرمٹ لگ جاتا ہے۔ ہم نے تو گرمی میں بدلتے ہیں اور ان ڈاکٹروں کو بارش کے موسم کے خاتمے پر اپنی کاروں میں سوار گھر جاتے دیکھا ہے۔ جس طرح جنگ کے خاتمے پر کئی چھوٹے چھوٹے دلال بڑے دھنا سیٹھوں کے روپ میں تجارت کے افق پر چمکنے لگتے ہیں اسی طرح بارش کے موسم کا مزہ بارش کے بعد بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔

مسلسل موسلا دھار برسات کو انگریزی میں "Raining Cats and Dogs" یعنی بلیوں اور کتوں کی برسات کہا جاتا ہے۔ یہ بلیوں اور کتوں سے انگریزوں کی محبت کا کھلا ثبوت ہے۔ ایسی زوردار برسات کا نظارہ جنت اور جہنم دونوں کے مزے سے سرشار کرسکتا ہے۔ اپنے اپنے مقدر کی بات ہے اپنے اپنے کرموں کا پھل ہے۔ کچھ لوگ ایسی موسلا دھار بارش کا نظارہ فرماتے یا تو کھلے آسمان کے نیچے بھیگتے ہوئے کرتے ہیں۔ ان سے نسبتاً امیر لوگ ٹوٹی ہوئی چھتوں والے مکان کے اندر کمر کمر تک بھرے ہوئے پانی میں کھڑے ہوکر خدا کو یاد کرتے ہوئے ایسی برسات سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خوش قسمت جو ہیں وہ ٹپکتی ہوئی چھت والے بلڈنگ کے فلیٹ کی بالکنی سے تیز بارش کی بوچھار کا مزہ لوٹتے ہیں تو کچھ لوگ سڑکوں پر چھوٹی چھوٹی امپورٹیڈ چھتریوں کو گردن میں لٹکائے ہوئے بھیگنے کا آنند لیتے ہیں۔ کچھ لوگ کھلے عام سڑکوں پر بھیگنے میں شرم محسوس کرتے ہیں وہ فیشن ایبل پھولوں بھری سڑک کے کنارے بنگلے کے اندر سے جہاں پھولوں کی ایک مہکتی ہوئی ڈالی بھی ہم نشین ہو، تیز بارش کے نظارے دیکھتے ہیں اور خود بھی نظارہ دل

نئی شروعات
نئی طاقت
سبز انقلاب کے پھیلاؤ سے اناج کی پیداوار میں تین گنا سے زیادہ اضافہ۔
ہر پہلو — دیہی ترقی۔
جواہر روزگار یوجنا: خط افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے ہر دیہی کنبے کے ایک رکن کیلئے روزگار۔
وسیع صنعت: نو فیصد سالانہ کی شرح سے پیداوار — برآمدات میں اضافہ۔
سب کے لیے صحت سے متعلق بہتر سہولتیں: زچہ و بچہ کی صحت کی حفاظت پر زیادہ زور۔
قومی تناظری منصوبے کے تحت خواتین کے لیے نئی شروعات۔
دیہی طالب علموں کے لیے بہتر تعلیمی مواقع۔
تکنیکی مشنوں کا آغاز —
سائنس سے غریبوں کو کارگر امداد۔
پنجاب میں حالات کو معمول پر لانے کے لیے بہت سے اقدامات۔
نچلی سطح پر جمہوریت میں نئی جان — پنچایتی راج کا کایا پلٹ۔
آزادی — مضبوطی — ترقی

مضطر مجاز (حیدرآباد)

چنا جور گرم

ناگ پھنیوں کی بھی دھوم! چنا جور گرم
گل ہوئے باغ سے معدوم! چنا جور گرم!

کھنچ گئی دار پہ لے، بھنچ گئے نالوں کے گلے
تیغ ہے زینتِ حلقوم! چنا جور گرم!

بیٹھتی جاتی ہیں آوازیں کہ سناٹوں کی
مچ گئی چار طرف دھوم! چنا جور گرم!

تہمتِ صوت و صدا، حرف و نوا سے اٹھی
قید لازم ہے نہ ملزوم! چنا جور گرم!

غیر خواہانِ زباں قند لب و شہد دہاں
اور تقدیرِ زباں شوم! چنا جور گرم!

غالب و میر و یگانہ و انیس و اقبال
جیتے جی ہو گئے مرحوم! چنا جور گرم!

کیوں نہ دیں دادِ بسیار طلبی زید و بکر
وارثِ حاتمی و مخدوم! چنا جور گرم!

کور و کر راہ نمائی پہ بہ صد ادعا آنکھیں
موردِ طعنۂ مذموم! چنا جور گرم!

گل زمینیں کہ اگاتی ہیں فقط شاخِ ببول
اور ہر شاخ پہ اک بوم! چنا جور گرم!

صفحۂ ریگِ رواں پر قلمِ صرصر سے
قسمتِ گل ہوئی مرقوم! چنا جور گرم!

زندہ باد! آ کے مرے عہدِ درخشاں میں کھلا
ظلمتِ جہل کا مقسوم! چنا جور گرم!

گنگ گویائی کے رکھتے ہیں صداقت نامے
ننگِ ناموس سے موسوم! چنا جور گرم!

الحمد کہ ٹھہرا ہے ہر اک لوک و لنگ
فاتحِ سلطنتِ روم! چنا جور گرم!

شاعری چھوڑ چکے [illegible] مضطر صاحب
تا بہ کے نالۂ مظلوم! چنا جور گرم

ظفر کچھ نیوی

وہ ہمیں دیکھ کر مسکرانے لگے
ہم بھی اب ان کے دل میں سمانے لگے

ان کو ہم حال دل کا سنانے لگے
جونک پتھر میں گویا لگانے لگے

میں تو شاعر ہوں اور کہہ رہا ہوں غزل
تم مرے ساتھ کیوں گنگنانے لگے

ہم یہاں آئے تھے آپ کے واسطے
آپ کیوں بزم سے اٹھ کے جانے لگے

ان کو سوجھا نہیں جب بہانہ کوئی
اپنی آنکھوں سے آنسو بہانے لگے

پردہ اٹھا تو عریانیت آگئی
ہر چھپی چیز اب وہ دکھانے لگے

نیند مانگی تھی ہم نے سکوں کے لیے
آ کے خوابوں میں بھی وہ ستانے لگے

اب گویّے لگے مکھیاں مارنے
شعرا خود ہی محفل میں گانے لگے

کاٹ کر پیٹ روپے بچائے تھے کچھ
کی جو بیٹی کی شادی ٹھکانے لگے

اک بلا سے بچے، دوسری مول لی
بیڑی چھوڑی مگر پان کھانے لگے

کوئی ڈاکو، کوئی جیب کترا بنا
آپ کے سارے بیٹے کمانے لگے

غیر کی عیب جوئی میں ہم تھے مگن
خود پہ انگلی اٹھی تلملانے لگے

جو سراپا چغد لگ رہے ہیں ظفر
وہ بھی اب ہم کو الو بنانے لگے

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

پاؤں جب گلاب ہو گئے
راستے خراب ہو گئے

نقلی کشتہ جات آج کل
ضامن شباب ہو گئے

رشوتوں کی برکتوں سے ہم
صاحب نصاب ہو گئے

آئیں بائیں شائیں لکھ کے ہم
صاحب کتاب ہو گئے

تیرے ساتھ جتنے پل کٹے
باعث عذاب ہو گئے

بے سبب بڑائی ہانک کر
ہم بھی بے نقاب ہو گئے

ہاشمی کے شعر سن کے وہ
سیخ کے کباب ہو گئے

اقبال ہاشمی

مسرور مسلم (بھوپال)

چائے کی خاطر

(مولانا آزاد کی ویران صدی کے نام)

اوّل اوّل مولانا آزاد کی آخری تصنیف "غبارِ خاطر" کی سرسری طور پر ورق گردانی کی تو محسوس ہوا کتاب کیا ہے عربی و فارسی اشعار کا اردو ترجمہ ہے جسے مع آسان تشریح کے خطوط کی شکل میں شائع کر دیا گیا مگر جوں جوں ہماری نظریں کتاب کے صفحات پر ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھیں۔ ہم پر مولانا کے اسلوبِ نگارش اور انشاپردازی کے جوہر کھلتے گئے۔ تاہم پوری کتاب پڑھ کر ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ مولانا اس معرکتہ الآرا تصنیف کو محض چائے کی خاطر لکھ گئے۔ ورنہ اردو دنیا اس بیش بہا تصنیف سے محروم رہ جاتی۔ ہمیں سیاہ یعنی سفید عرف "گوری چنبیلی" کا ممنون ہونا چاہیے کہ جس کی طلب تمام عمر مولانا کو منہ اندھیرے اٹھاتی رہی اور وہ مضامینِ نو کے انبار لگاتے رہے۔ ورنہ چار بجے کا وقت اب اتنا بھی جانفزا نہیں ہے کہ آدمی بلاضرورت بستر چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہو۔ اس لیے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ:

"کچھ تو پوشیدہ تھا اس صبح کی بیداری میں"

ہمیں یہ نتیجہ اخذ کرنے میں اس خط سے کافی مدد ملی جو مولانا نے "چنبیلی زادی" کی تعریف و توصیف میں تحریر کیا ہے۔ اس خط میں مولانا نے چائے کا شجرۂ نسب معتبر تاریخی حوالوں کے اس قدر تفصیل سے بیان کیا ہے کہ چائے کے صحیح النسل اور خاندانی ہونے میں اب کوئی شبہہ نہیں رہ جاتا۔ ورنہ ہم تو اب تک یہی سمجھتے تھے کہ چائے انگریزوں کی دین ہے۔ سچ پوچھیے تو اسی غلط فہمی کے باعث ہم ایک عرصہ مولانا سے بدگمان رہے کہ جن کی غلامی منظور نہ تھی اس کی لگائی ہوئی ملّت کو مولانا نے کیسے گوارا کر لیا۔

یوں تو اس کتاب کے سارے خطوط قلعہ احمد نگر کی اسیری کے دوران لکھے گئے تھے۔ لیکن ہمارا خیال ہے ان کے اسباب مولانا کی گرفتاری کے وقت ہی پیدا ہو گئے تھے۔ کیوں کہ انگریز مولانا کو سوتے سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ گرفتاری سے قبل جو تھوڑی بہت مہلت ملی وہ غالباً رختِ سفر باندھنے میں ضائع ہو گئی اس لیے وہ ڈھنگ سے اپنی من پسند چائے کے فنجان بھی نہ لنڈھا سکے۔ ستم بالائے ستم یہ واقعہ بھی صبح کے اس جانفزا وقت میں پیش آیا جب مولانا نسیمِ صبحگاہی کے شفا بخش جھونکوں کے درمیان فنجان سے ابھرنے والی لطیف خوشبو سے مشامِ جاں کو معطر کرتے اور "چنبیلی زادی" کے حرارت بخش گھونٹ لیا کرتے۔

شاید ہی کسی بندۂ بلا نوش نے مے نوشی کے لیے اس قدر اہتمام نہ کیا ہو گا جتنا مولانا چائے نوشی کے لیے کرتے تھے۔ مختصر بدوسی فنجان ہوتے جس میں چائے کی مقدار بھی مختصر ہی ہوتی کہ اگر بے ذوقی سے پیجیے تو دو ہی گھونٹ میں ختم ہو جائے مگر مولانا خدانخواستہ بے ذوقی کے مرتکب کیوں ہوتے۔ وہ تو جرعہ کشان کہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیتے اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لیتے۔ چائے کے ساتھ ہی مولانا سگریٹ بھی پیتے اور اس تناسب سے کہ ادھر چائے کا ایک گھونٹ لیا اور متصلاً سگریٹ کا ایک کش بھی لگا لیا۔ مقصد کے حسن تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر فنجان سے آخری جرعہ رخصت ہوا، ادھر تپاک ہوئے آتش زدہ نے سگریٹ کی درازی کو آخری خط کشیدہ تک جلا کے راکھ کیا۔ ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور کا جو معتدل مزاج ترکیب پیدا ہوتا ہے۔ اس میں مولانا تادیر غرق رہتے۔ پھر تھوڑے تھوڑے وقفے سے یکے بعد دیگر فنجان بر سر یہ ہوتے، سگریٹ جلتی اور حسن تناسب کا یہی عمل دوبارہ شروع ہو جاتا۔

اس پوری کارروائی کے لیے جتنی مہلت درکار تھی۔ انگریزوں نے اتنی مہلت مولانا کو دی نہیں اور اسی بے کیفی کے عالم میں احمد نگر پہنچا دیے گئے۔ قلم کے دھنی تو تھے ہی۔ لہٰذا وہاں پہنچتے ہی مو خر الذکر کو اٹھا لیا اور دل کا سارا غبار نکال دیا اور ساتھ اس چائے کو بھی آڑے ہاتھوں لیا۔ جس کی سفیدی کو انگریز کاشت کاروں نے اپنی سیاہ قلبی سے نہ صرف کالا کر دیا بلکہ اسے کالی چائے کا نام دے کر اور شروع شروع میں ہم ہندوستانیوں کو مفت پلا پلا کر اس کا عادی بھی بنا دیا ——— مولانا کالی چائے سے اتنا ہی الرجک تھے، جتنا انگریز، مولانا سے۔ مولانا بغیر دودھ کی چائے پیتے اور چائے کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کرنے کی بدعت کا ذمہ دار بھی انگریزوں کو ہی ٹھہراتے۔ وہ ہمیشہ اس بات پر برہم رہے کہ لوگ چائے کے جوہر لطیف کو دودھ کی کثافت سے آلودہ کیوں کرتے ہیں۔ سیدھا سا جواب تھا۔ انگریزوں کی تقلید میں کہ یہی ہم ہندوستانیوں کا شیوہ ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہم ابھی تک ذہنی طور پر یورپ میں بسے ہوئے ہیں۔

مولانا چائے کے ساتھ سگریٹ کی علت کے اضافے کو زندگی کی غلطیوں میں شمار کرتے مگر جب معاملے کے ہر پہلو پر غور کرتے تو طبیعت کو اس پر مطمئن نہ پاتے کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ فرماتے، زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہیے۔ وہ زندگی ہی کیا جس کے دامن خشک کو کوئی غلطی تر نہ کر سکے۔ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے ہمیشہ اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے۔ بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیے۔ لیکن آپ کے دست و بازو میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کر رکھ دیا کہ ایک بوند بھی باقی نہ رہی۔"

یقین جانیے، اسی رعایت سے فائدہ اٹھا کر ہم نے بعض ایسی عادتیں اختیار کر لیں اور ان میں اس حد تک ڈوبے گئے کہ دامن تو دامن سارا وجود ہی تر بہ تر کر لیا۔ ہر چند کہ دست و بازو میں اب بھی اتنی طاقت ہے کہ پل بھر میں اپنے آپ کو نچوڑ کر رکھ دیں۔ لیکن غرقابی کی مدت اتنی طویل ہو چکی ہے اور دامن بھیگ کر اس قدر گل چکا ہے کہ اگر

نچوڑتے جھجکیں تو خدشہ ہے کہیں پھڑ سے پھٹ نہ جائے۔ اس لیے احتیاطاً نہیں نچوڑتے خواہ فرشتے بے وضو ہی کیوں نہ رہیں۔

مولانا چائے کے لیے دودھیا رنگ کی نہایت شفاف اور چوکیدہ شکر (cube sugar) پسند کرتے اور برائے نام چائے میں ڈالتے جو چائے میں گھل گھلا کر بقدرِ اشکِ بلبل رہ جاتی۔ یہاں پھر مولانا ہمارے ذوقِ چائے نوشی پر معترض ہوتے ہیں، کہتے ہیں :

"عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ جو شکر ہر چیز میں ڈالی جا سکتی ہے وہی چائے میں بھی ڈالنی چاہیے۔ اس کے لیے کسی خاص شکر کا اہتمام ضروری نہیں"۔ پھر قند مکرر کے طور پر مزید فرماتے ہیں :

"اس کے لیے ایسی شکر چاہیے جو بلور کی طرح بے میل ہو اور برف کی طرح شفاف ہو۔"

اوّل تو وطنِ عزیز میں شکر کا حصول ہی دشوار تر ہے۔ اس لیے شفاف یا میلی شکر کی تخصیص ہی فضول ہے۔ جو مل گئی اسی کو مقدر سمجھ لیا۔ اب اگر چائے مکدر ہوتی ہے تو ہوا کرے۔ اور اگر سرے سے شکر ہی نہ ملے تو ہم مولانا کی پیش گوئی کے عین مطابق معاملہ صاف صاف گڑ تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔ خواہ ہماری چائے پر گرم شربت، سیال حلوے اور جوشاندے کا الزام ہی کیوں نہ آئے۔

چائے کی حد تک تو مولانا کم تنک بینے میں حق بجانب تھے۔ لیکن مٹھاس سے مولانا کی شکر رنجی کا سبب ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ ہم اور آپ مٹھاس کی لذت مٹھاس سے ہی پاتے ہیں۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا نمک میں مٹھاس کی لذت پیدا کر لیتے تھے۔ کھانے میں مناسب مقدار میں نمک پڑا ہو مگر وہ اوپر سے مزید نمک چھڑک لیا کرتے۔ فرماتے "لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے، مجھے نمک میں ملتی ہے"۔ نمک کی اسی زیادتی سے مولانا کی رگوں کا خون اچھلتا رہا اور ان کی تقریریں پُر جوش ہوتی گئیں تاآنکہ فرنگی اقتدار کی نبضیں ڈوب گئیں اور ملک آزاد ہو گیا۔ درحقیقت مولانا صباحت کے نہیں ملاحت کے قتیل تھے اور انگریز مولانا کا۔

کیوں کہ ہم تو اس کارگہہِ سود و بہار میں آزادی کے بعد وارد ہوئے تھے۔ اس لیے مولانا کی معتوب کالی چائے کو ہم نے بزرگوں کی امانت سمجھ کر ابھی تک منھ سے لگا رکھا ہے" اور آئندہ بھی یہی امکان ہے کہ "چھٹے نہ بلکے گی منھ سے یہ کافر لگی ہوئی" مگر جب بھی اس چائے سے مولانا کی بیزاری کا خیال آتا ہے دل مسوس کر رہ جاتے ہیں۔ بے اختیار جی چاہتا ہے کہ لاؤ، ذرا اس "سفید پری" کو بھی منھ لگا کر دیکھیں جو مولانا کی طبع شورش پسند کو سرمستیوں کی اور فکرِ عالم آشوب کو آسودگیوں کی دعوت دیا کرتی تھی۔

مگر افسوس کہ اس خواہش کی تکمیل میں ہماری ناآسودہ حالی سے زیادہ ہماری کاہلی آڑے آتی۔ ہم کسی قیمت پر محض چائے کی خاطر رات چار بجے بستر چھوڑنے پر آمادہ نہیں کہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب گہری نیند میں خواب

---

[1] White Jasmine

سکتے تھے۔ رفتہ رفتہ ہر ارمان کی طرح ہماری اس خواہش کا دم بھی نکل گیا اور ہم صبر و تحمل سے بیٹھ گئے لیکن ادھر جب سے مولانا آزاد کی صدی تقریبات کا غلغلہ اٹھا تو ہماری مرحوم خواہش ایک انگڑائی لے کر پھر سے جی اٹھی۔ ہم نے سوچا 'اب تو ہر طرف مولانا ہی مولانا ہوں گے، جا بجا ان کی صد سالہ تقریبات منعقد ہوں گی' قدم قدم پر ان کی بے باک صحافت اور بے مثل خطابت کے تذکرے ہوں گے، شہر در شہر، آزادی کی لڑائی میں ان کی عظیم قربانیوں کو یاد کیا جائے گا' صوبہ صوبہ ارباب سیاست ملک کو ان کے بتلائے ہوئے راستے پر چلنے کی تلقین فرمائیں گے۔ اور خود کئی کاٹ جائیں گے ۔۔۔ ہمیں امید تھی کہ جہاں یہ سب ہوگا وہیں ان کی سیال معشوقہ "چنبیلی زادی" کے فنجان بھی لنڈھائے جائیں گے۔ لہذا کسی موقع پر ہم بھی سیراب ہو لیں گے۔ لیکن ہمایوں کہ ابوالکلام کی ویران صدی نے ہمیں بدستور تشنہ کام رکھا اور ہم فنجان بکف بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں، کہیں اس ویرانی کا سبب یہ تو نہیں کہ چنبیلی کی شاخ پر "گلاب" کی ٹہنی غالب آگئی ہے۔

●●

انیس سلطانہ (بھوپال)

ہم بند شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے

کسی فلسفی کا قول ہے کہ آدمی آزاد پیدا ہوتا ہے مگر وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ وہ پیدا ہوا تو سہی مگر اس وقت بھی آزاد کہاں تھا، ماں کی محبت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا ——— اچھا نہ سہی، محبت، بزدلی، اکتاہٹ، نفرت جو دل چاہے نام دے لیجیے۔ کتنے سارے جذبوں کے بیچ میں گھرا ہوا انسان ... مگر معاف کیجیے، فلسفیوں سے دنیا گھبراتی ہے۔ اور اس سے پہلے کہ آپ گھبرا کر صفحہ پلٹ دیں یا اگر ہمیں پڑھ کر سنانے کی اور آپ کو سننے کی توفیق ہو تو اپنے جذبِ خود فراموشی میں چشم بددور ہم تھوڑے ہو جائیں ..... بہتر یہ ہوگا کہ بند شب و روز کی تکرار کا ذکر ہو جائے۔

تو حضرات ہوا یوں کہ جب کارخانۂ قدرت میں ہر چیز آسانی سے مل جایا کرتی تھی، اصلی گھی سے لے کر اصلی چہرے تک اور ان سادہ رو، نیز کھلے دل والے لوگوں نے ایجاد بندہ کی مدد سے کئی بند ایجاد کر رکھے تھے۔ شکار بند اور نظر بند کے ساتھ ساتھ، دل بند، جگر بند حتیٰ کہ سب کو قلم بند کر دیا کرتے تھے۔ ویسے شاید آج کل اسی کام کے لیے وزیر قلم دان کو مقرر کیا گیا ہے کہ ادنیٰ و اعلیٰ واقعہ کو نیکرین کی طرح قلمبند کر لیا کریں مگر ان سادہ دلان و معبند بند کسی کو کوئی اعتراض تھا نہ زندگی سے کوئی شکوہ۔ مزے سے نیا دانہ کھاتے نیا پانی پیتے زندگی کے دن گزار رہے تھے۔

مگر آج کہ زندگی کی وحشت ناکی اور ہولناکیوں نے نت نئے بند ایجاد کر رکھے ہیں۔ ابھی ابھی شہر میں احتجاجی بند ہوا تھا۔ روز نعرے لگتے تھے، دنیا کے شوہرو ایک ہو جاؤ اور آخرکار جو شوہر تھے وہ بھی اور جو عنقریب ہونے والے تھے یا ہوتے ہوتے رہ گئے تھے انھوں نے اس بند میں حصہ لیا اور خواتین کی طرف دیکھنا تک بند کر دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر چوراہے پر ایک دو مرد برہنہ اشتہار دے جاتے۔ اب کیا ہم اشتہار بھی بند کر دیں۔

وقتاً فوقتاً یک طرفہ چند شر پسندوں کو بند کر دیا گیا۔ ہم نے چین کی سانس لی کہ پتہ چلا شہر میں کرفیو نافذ ہے۔ دس دن بڑے اطمینان سے بامشقت کاٹ کر دو چار فاقوں کے بعد جب ہم نے شکر ایزدی بجا لانے کا سوچا تو دو تین بجے آئی تھیں کہ ہمارے وہاں پہنچتے پہنچتے کرفیو پھر شروع۔ ہم پھر بھی تھوڑی دیر ڈٹے رہے کہ بھائی لائن میں دو چار لوگ ہی بچے ہیں، خالی ہاتھ لوٹے تو کیا کھائیں گے۔ سپاہی لاٹھی سے ہنکار رہے تھے۔ ہم نے ڈھیر سے اپنی خالی

تھیلی دکھائی ——— مگر دوکان تک پہنچ کر وہ خالی ہی رہی کہ
کچھ جو نہیں گرہ میں مال کہاں

واضح رہے کہ مال سے مراد پیسہ نہیں بلکہ جنس ہے اور قریب کے دروازے پر پنجرے میں بیٹھا طوطا زور زور سے چلا رہا تھا کہ ہم آزاد ہیں اور آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ہم نے اسے اس کا پیدائشی حق دلا دیا۔ ہماری اس حرکت سے وہی ہوا جس کا ہمیں ڈر تھا۔ یوں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہوا جو ہمارے گمان میں بھی نہ تھا لیکن وہ ہوا جو ہونا تھا، اتنا طے ہے، یعنی برسوں کا پالا ہوا طوطا یوں اڑا جیسے گویا کبھی تھا ہی نہیں اور کہ طوطا بھی ہماری ہی طرح آزادی کا رسیا تھا کہ موقع ملا اور قید و بند سے فرار ہو کر کسی درخت پر جا بیٹھا اور ہمیں سکھا گیا کہ ہم آزاد ہیں اور آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے۔ ہم اس پر آنچ نہ آنے دیں گے چاہے ہمارا گھر جل جائے۔ البتہ اگر دوسرے کا گھر جلے تو ہم ہاتھ تاپیں گے اور دوسرے کہ ہم امن پسند ہیں، چاہے امن ہمیں بالکل پسند نہ کرتا ہو۔ اسی امن پسندی کے اظہار میں ہم نے جلسے کیے، جلوس نکالے اور راتوں رات تیاری کر لی کہ ظلم و تشدد کے خلاف آج سارا بازار بند رہے گا۔ چنانچہ ہر بازار بند رہا . . . . بے آزار بند رہا . . . . اور جیسا کہ ہوتا آیا ہے، ایک طبقہ اس بند میں شریک نہیں ہوا۔ بے آزاری، بیزاری میں بدلی، بیزاری جو تمہاری ہماری اور ہماری ہیں اور پھر سب کچھ ہو جانے کے بعد معزز شہریوں نے پٹاجینٹ کے ہاتھ دکھائے۔ ہتھیار بند پولیس شہر میں کھلے عام گشت کرنے لگی۔

سنا تھا کہ ایک در بند، ستر در کھلے۔ یہاں ایک در بھی بند تھا اور ستر بھی ستر ہی کیوں چوہتر بنگلے[1] بند تھے اور شہر کی مخدوش حالت کے پیش نظر ملٹری تعینات تھی ایسے ہنگامی حالات میں بھی ہم جیتے چلے گئے اور تادمِ تحریر زندہ بھی ہیں اور باکمالانِ ہنر پیشہ کے منتظر بھی کہ جب ہمیں ان آئے دن کے بندوں سے نجات ملے گی۔

علامہ کہہ گئے ہیں:

"بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے"

تو آئیے بندوں کو گنیں اور عبرت حاصل کریں۔ چلتے چلتے گاڑی بند ہو جاتی ہے تو کبھی پٹرول کی کمی اور کبھی کچرے کی زیادتی کا شکر کیجیے کارخانۂ قضا و قدر کے اکثر کل پرزے چلتے چلتے بند ہو جاتے ہیں مثلاً حرکتِ قلب بند ہو جاتی ہے اور دارِ فانی کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ دکانیں بند ہوتی ہیں تو مجرم خوش ہوتے ہیں اور کہیں ناخوش اسپتال بند ہوتے ہیں تو ڈاکٹر اور حکیم کے ساتھ مریض بھی خوش کہ چلو کبھار گی قیدِ حیات و بندِ زندگی سے چھوٹے۔ چونکہ جام گویا ذرائع رسل و رسائل بند ہوتے ہیں تو سڑکیں دعائیں دیتی ہیں کہ گرد و غبار سے آزاد ہیں اور کہ پیدل چلنے کے فوائد پہ تقریریں کی جاتی ہیں کہ دنیا میں ہر قسم کے بند رائج ہیں لیکن تقریر کرنے میں نہ کبھی کوئی بند تھا، نہ ہے نہ ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ مخالفت میں (سیاسی امور کے لیے اشارہ کافی ہے) کچھ کہنے پر مصلحتاً کبھی کبھی کوئی لیڈر بند

---

[1] بھوپال ٹی ٹی نگر میں چوہتر بنگلے پر مشتمل ایک علاقہ جو اسی نام سے پکارا جاتا ہے۔

بھی کردیا جاتا ہے تو وہ جیل میں کاغذ قلم مہیا کرکے انتقام کی آگ بجھاتا اور اپنے شوق کو بھڑکاتا ہے۔

اور تو اور ایک بند، فلمساروں کے ذریعے عمل میں آیا جس کی جھونپڑی میں رہنے والوں کی ہمدردی میں ایک فلم بنائی گئی۔ لاکھوں نہیں کروڑوں کی لاگت سے تیار کی گئی۔ حقیقت کا رنگ دینے کے لیے جھونپڑیوں پر بلڈوزر بھی چلایا گیا اور وقت ضرورت (یہ ضرورت ہمیشہ رہتی ہے) انھیں جلایا بھی گیا۔ جانی نقصان کے ہرجانے میں فی کس دس دس ہزار روپے نقد ادا کرنے پڑے۔ غنیمت ہے کہ اس فلم میں ہوائی جہاز کے اغوا یا پھٹ جانے کا کوئی سین نہیں تھا۔ ورنہ مہلوکین کو ایک ایک لاکھ روپیہ نقد ادا کرنا پڑتا۔ غنیمت والے فقرے سے پہلے اس حقیقی ظلم کا نتیجہ سامنے ہے۔ اسٹوڈیو بند پڑا ہے اور سنا ہے کہ اسٹوڈیو کے مالک اور اس کی ٹیم کے لوگ اپنی کوٹھیوں اور کاروں کو نیلام کرکے نیک "بندوں" میں شامل ہو گئے ہیں۔

پولس نے باغیوں اور دہشت گردوں کی ناکہ بندی کر رکھی ہے تو ان حضرات نے بھی غریبوں کا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ شراب بندی کا قانون لاگو ہوا تو شراب کی کھپت دوگنی ہو گئی۔ عصمت فروشی کا دھندا بند ہوا تو بلیو فلموں کی مانگ چوگنی ہو گئی۔ دل بدلنے پر پابندی لگائی تو دل بدلنے کی کوشش میں اضافہ کردیا۔

مہنگائی سنا ہے آسمان کو چھو رہی ہے اس کی تلاش میں خلا میں ایک راکٹ داغا جاتا ہے۔ خلائی مستقر بنائے جا رہے ہیں تاکہ اسے منا کر اسی سرزمین پر لے آیا جائے اور تاج محل کے پیچھے والے حصے میں جہاں کبھی جمنا بہتی تھی، بند کردیا جائے۔ وہاں اسی مقصد سے ایک فیکٹری بنائی گئی ہے جہاں مسلسل دود کشوں سے تاج محل کا خوب صورت لیکن سوتے آنگن میں مزدور کی آواز پہنچائے گی اور کہ جہاں دو محبت کرنے والے دل بند ہیں۔ یہ دھواں ان کی آہوں کا دھواں ہے کہ تاج محل پر چھانے لگا ہے۔

مہنگائی کے خلاف بھی ایک بند کیا گیا۔ یہ بند شہر کے سبزی فروشوں کی طرف سے تھا ان پر ٹیکس لگایا جانے والا تھا اور یہیں دوکان داروں نے دوکانیں بند کر رکھی تھیں لیکن گھر کی بازو والی گلیوں میں چھپ چھپ کر اپنے بچوں کے ذریعہ سرمایہ داری کے خلاف برسر پیکار تھے۔

یہ ہند کے سمن بر، شیریں مقال بچے

یہ گل عذار بچے، یہ لالہ زار بچے

یہ قیافہ شناس بچے، صرف اسکوٹروں گاڑیوں سے اترنے والوں سے مخاطب ہوتے تھے جو خالی جھولا گلی میں جاتے اور بھرا جھولا لے کر گلی سے واپس آتے کہ جھولا کو بھرنے کا مقصد دو غریبوں میں کہا گیا تھا۔ سماج واد نے یاد کرا دیا تھا کہ ۲۰ سال ضرورت رہتی ہے۔ آٹھ، دس روپے کلو آلو نہیں، پیاز بھی نہیں مونگ اور اس کی قوم کو خدا سے جنگ درپیش ہے دملی سے نوازا ہے کیا نہ دے گا وہ ہی آلو اور پیاز۔ اور کیا ہم نہیں ہیں گنہ گار اور اللہ بڑا کارساز اور معاف کرنے والا ہے۔ ہم چند شب و روز ہی لگائے ہوئے بیٹھے یہ تو جانتے ہی ہیں کہ قید حیات و بند غم اصل میں چار اصل ایک ہیں۔ بھلا اصل میں دونوں کو ایک ہی کہتے ہیں۔ لیکن جب دونوں ایک ہو جائیں حاصل جمع بھی چار اور حاصل ضرب بھی چار ہی ہوتا ہے اور کہ یہ دنیا بھی چار عناصر پر قائم ہے۔ پانچواں عنصر وہ بند غم ہے کہ اصل اساس ہے۔

سر ریٹ حیدرآبادی

چھڑتی ہے جس وقت فرزانوں میں دیوانوں کی بات
خود منفرد ہو کے رہ جاتی ہے فرزانوں کی بات

اور جوانوں سے نہیں ہوتا انہیں مطلب کوئی
رہتی ہے لب پر پولیس والوں کے جرمانوں کی بات

جاڑے کے موسم میں کیجے بھٹیوں کے تذکرے
موسم گرما اگر ہو کیجے خس خانوں کی بات

چاہتے ہیں بھول جائیں پر بھلا سکتے نہیں
کعبے والوں کی زبانوں پہ ہے بت خانوں کی بات

خوش ہیں مرشد مرشدوں کا اس سے قائم ہے بھرم
ہیں مریدوں کی زبانیں اور نذرانوں کی بات

صبح کی تنویر ہوتے ہی عیاں وہ بجھ گئی
روشنی میں شمع کی روشن تھی پروانوں کی بات

کرتا ہوں خاطر تواضع اپنے مہمانوں کی میں
خانۂ دل میں میرے مہمان ہے ارمانوں کی بات

کچھ لپ اسٹک، پاؤڈر، اسنو کا رکھیے انتظام
شانوں پہ زلفیں ہوں، لب پہ بیگم خانوں کی بات

لیلیٰ مجنوں، شیریں و فرہاد کے ہیں تذکرے
داستاں گو کرتے ہیں دن رات افسانوں کی بات

وہ صراحی ہو کہ جام جم ہو کوئی جام ہو
میکشوں کی بزم کا موضوع ہے پیمانوں کی بات

لب پہ سر ریٹ کے فقط ہے ریس کے میداں کا ذکر
وہ نہیں کرتا کسی سے اور میدانوں کی بات

○

جب بھی وہ آتا ہے، آتا ہے طرفدار کے ساتھ
چھپ کے میخانے میں شیخ آتا ہے میخوار کے ساتھ

ہوتا ہے جو ہر تہہ و بالا، کلا کار کے ساتھ
رقص کرتا ہے جہاں، گھنگرو کی جھنکار کے ساتھ

یا رسائی میری، مجھ کو نہ کبھی راس آئی
نہ کبھی میری، کبھی جبہ و دستار کے ساتھ

پارہ پارہ وہی خود ہو کے بکھر جائے گی
ان کی نفرت، اگر ٹکرائی میرے پیار کے ساتھ

خوش نصیبی ہے میرے ساتھ، ہوں میں خوش قسمت
بد نصیبی تو رہا کرتی ہے بدکار کے ساتھ

دانے دانے میں ہے تسبیح کے زنّار نہاں
ازلی ربط ہے تسبیح کا زنّار کے ساتھ

کسی احمق کو میں دل اپنا نہیں دے سکتا
عشق کرتا ہوں ہمیشہ میں سمجھدار کے ساتھ

نیک و بد ہوتا ہے، نیکی و بدی کا مظہر
شخصیت ہوتی ہے انسان کی کردار کے ساتھ

کوئی روزہ میں نہیں رکھتا کسی رمضان میں
تیس دن ربط میرا رہتا ہے افطار کے ساتھ

میں ہوں سر ریٹ اسد انصاری بھی کہتے ہیں مجھے
خود ڈبل رول میں ہوں نام کی تکرار کے ساتھ

انوار انصاری دلی۔ بہار

بچ کر رہیے ۔۔۔ خود سے

جس طرح جھوٹ بولنے کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح خوش گوار زندگی گزارنے کے لیے بچ بچ کر رہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سچ پوچھا جائے تو آج کا دور بھی بچ کر رہنے کا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ گھر میں باپ بیٹے سے بچ کر رہتا ہے۔ بیوی شوہر سے بچ کر رہتی ہے اور جیب و جسم کے درمیان زندگی گزارتی ہے۔ پڑوسی اپنے پڑوسی سے بچ کر رہنے ہی میں اپنی عافیت سمجھتا ہے۔ ڈاکٹر، مریض، وکیل، موکل، استاد، شاگرد، مالک مکان، کرایہ دار، وزیر، امیر، عاشق معشوق سبھی اس کوشش میں مصروف رہتے ہیں کہ بچ بچ کر چلا جائے اور پھونک پھونک کر قدم بڑھایا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے دام میں گرفتار نہ ہو سکیں۔

دورِ حاضر میں جہاں الکٹرانک اور سائنسی ترقی نے انسانوں کو بے پناہ سہولتیں مہیا کی ہیں وہیں صاحبِ عقل لوگوں کے لیے خود سے بچ کر رہنے کی تلقین و ہدایت بھی کی گئی ہے۔ اب انسان کو دوسروں سے زیادہ ڈر نہیں بلکہ خود اپنے آپ ہی سے اس کو خطرہ زیادہ ہے۔ اگر انسان خود سے نہ بچے اور اپنے آپ کی حفاظت نہ کرے تو اس کا جینا دشوار ہے۔ اگر زندہ رہنا ہے تو دوسروں کی غلطیوں پر نگاہ نہ ڈالیے بلکہ خود اپنے گریباں میں منہ ڈال کر جھانکیے اور خود ہی سے بچ بچ کر رہیے ورنہ تیز رفتار زندگی کی آندھی میں انسان سوکھے تنکے کی مانند بکھر کر منتشر ہو جائے گا۔ زندگی کی دندناتی اسپیڈ کو دیکھ کر زبان پر بے اختیار یہ شعر آ جاتا ہے:

یہ دوڑتی زندگی ہے کہ اک برق بلاخیز
شعلہ سا لپک جائے ہے رفتار تو دیکھو

جس طرح شباب اور مفلسی کا اجتماع اتنا ہی بے کیف ہے جتنا مرچوں کا سالن یا بے تمباکو کا پان، اسی طرح زندہ رہنا اور خود سے بچ کر رہنے کا اجتماع بھی اتنا ہی پھیکا ہے جتنا بے نمک کی دال۔ مانا کہ مرچ اور تمباکو صحت کے لیے نقصان دہ ہیں لیکن تندرستی کا مطلب صرف تندرستی کی حفاظت نہیں بلکہ تندرستی سے لطف اندوز ہونا بھی ہے۔ یہی حال زندگی کا ہے۔ زندگی گزارنے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ انسان پرسکون طور پر زندگی گزارے اور ہمیشہ خود سے بچ کر رہے۔ آج کل تو زندگی نام ہے الجھنوں کا، پریشانیوں کا، مصائب کا۔۔۔!!!

خود سے بچ کر نہ رہنے کی وجہ سے یہ خاکسار کئی بار عتاب میں مبتلا ہو چکا ہے۔ دوسروں کے کام میں کیڑے نکالنا، عیب ڈھونڈنا اور تحلیل کرنا میرے نفس کی ایک خصوصیت بن گئی ہے چناں چہ میں اس نشہ میں سرشار ہو کر زندگی کے شب و روز گزارتا ہوں۔ ایک بار عادت سے مجبور ہو کر میں نے اپنے دوست کے خلاف آفیسر سے شکایت کر دی اور دل میں خوش ہوا کہ چلو ایک کام تو کیا مگر وا ری قسمت۔ میری ہی جیسے خصلت والے ایک دوست نے میرے متعلق بھی دفتر سے اکثر دفتر سے غائب رہنے کی شکایت میرے افسر کو کر دی تھی۔ اچانک ایک دن میری طلبی بڑے صاحب کے سامنے ہوئی اور مجھ سے کیفیت طلب کی گئی کہ کیوں نہیں آپ کے خلاف دفتری کارروائی کی جائے۔ میں کیا جواب دیتا۔ خود سے بچ کر نہ رہنے کی وجہ سے لاجواب ہو گیا۔ دوسروں کے لیے کنواں کھود رہا تھا۔ خود ہی اس کنویں میں گر پڑا۔

ویسے خود سے بچ کر رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ یہ ایک مشکل ترین کام ہے۔ میں نے سوچا کہ خود سے بچ کر رہنے کے لیے ضروری ہے کسی انعام یافتہ یا ڈگری ہولڈر استاد کی سرپرستی حاصل کی جائے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم ایک استاد کی تلاش میں لگ گئے لیکن استاد تلاش کرنا بھی کوئی سہل کام نہیں۔ بڑی تلاش و جستجو کے بعد میری نظر ایک ریٹائرڈ بزرگوار پر پڑی جو خود سے بچ کر رہنے کے فن میں طاق تھے اور اسی عنوان پر ان کو پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی ملی تھی۔ دو تین بار ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ حضرتِ استاد خود سے بچ کر رہنے کے تمام گُر سے واقف ہیں اور فن کی باریکیوں پر بھی ان کی نگاہ گہری ہے۔ لہٰذا میں نے ان کو اپنا استاد تسلیم کر لیا۔ ان کے مشورے کے مطابق دن دن بھر گھر سے غائب رہنے لگا اور لوگوں سے ملنا جلنا اور بات چیت بھی کم کر دی۔ میری بدلتی ہوئی حالت دیکھ کر گھر والوں کو تشویش ہوئی اور کسی نہ کسی طرح ان لوگوں نے میرے استاد کا پتہ لگا لیا۔ ایک دن گھر کے تمام بڑے بوڑھے، عورتیں، بچے اور جوان سبھی مل کر مجھ پر برس پڑے۔ کہنے لگے تمھیں شرم نہیں آتی۔ اس نیچ حرام خور، مفت خورے بڈھے کی شاگردی میں رہتے ہوئے۔ اس بڈھے نے تو اپنا سب کچھ گنوا دیا ہے۔ تم اپنی حالت پر نظر ڈالو۔ بال بے ترتیب، ڈاڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئیں، آنکھیں بے نور، چہرہ فق، چال ڈھال میں نمایاں تبدیلی، گفتگو صرف اشاروں اور کنایوں میں۔ کیا یہی زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ میاں ہوش کے ناخن لو، آدابِ زندگی سیکھو اور قرینے سے زندگی بسر کرو۔

گھر میں بیگم جو بمنزلہ حزبِ مخالف کا رول ادا کرنے میں بھرپور کی بازی لگاتی رہتی ہیں اور جو کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہو پاتا ہے اس کو پورا کرنے کے لیے اپنی شکایت ہائی کمان کے پاس یعنی میری ساس صاحبہ کے سامنے پیش کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتی ہیں۔ میں خود سے بچ کر رہنے کی کوشش کرتا ہوں اور بیگم صاحبہ میرا رویّہ دیکھ کر پھر مجھ سے گھبرانے لگتی ہیں اور میرا حلیہ دیکھ کر یہ شعر پڑھتی ہیں:

آنکھ جو کچھ دیکھ سکتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

خود سے بچ کر رہنے میں ایک اور خطرہ ہے آپ خود سے بچ کر رہنے کی کوشش کریں گے اور لوگ آپ پر

جاسوس ہونے کا شبہ کریں گے ۔ طرح طرح کے الزام لگائیں گے اور آپ کو مکر و فریب کے جال میں پکڑ دیں گے
اپنی بے بسی پر اکثر اوقات اندر ہی اندر کھولتا رہتا ہوں ۔ دل میں خواہش ہوتی ہے کہ حریف کو ایسا
چرکہ لگاؤں کہ وہ چاروں شانے چت ہو جائے ۔ کبھی میدانِ عمل میں خم ٹھونک کے مد مقابل پر آنا چاہتا ہوں ۔
دل میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہتی ہے مگر پھر خوف غالب آجاتا ہے ۔ اگر زندہ رہنا ہے تو بچ کر رہیے
خود سے ۔ فکر کو دور رکھئے اور دل کو ایک گونہ سکون کے لیے ضروری ہے کہ انسان کم بولے تاکہ وہ دنیا داری
جھمیلوں میں نہ پڑنے سے بچ بچا کر زندگی گزارتا رہے ۔ سچ ہے طویل عمری کے لیے بھی یہ کارآمد نسخہ ہے یعنی بچ کر
رہیے خود سے ۔

تیز رفتار زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بچ کر رہے خود سے ، اپنے آپ سے ، اپنی
ذات سے ، اپنے ماضی سے ، اپنے برے خیال سے ، اپنے مکر سے ، فریب سے ، ریاکاری سے ، سیہ کاری
سے ، بددیانتی سے غصہ سے ، حسد سے ، کینہ سے :

میں ہوں آوارہ مسافر راہ بے منزل میری

●●

ہمدردی

—— اسرار جامعی ——

ہوٹل میں کسی ٹیبل پہ تنہا ۔ شاعر تھا کوئی اداس بیٹھا
کہتا تھا کہ رات سر پہ آئی ۔ لیکن نہ کوئی مدد کو آیا
کس کو میں غزل سناؤں اپنی ۔ ہے ذہن میں چپقلش سی پیدا
شاعر کی آہ و زاری سن کر ۔ "بیرا" یہ ادب سے اس سے بولا
خدمت کے لیے ہوں دل سے حاضر ۔ گو آدمی ہوں حضور ادنیٰ
کیا غم جو نہیں ہے کوئی شاعر ۔ اشعار میں آپ کے سنوں گا
پر دیجیے "ٹپ" میں پانچ روپے ۔ کم اس سے ذرا بھی میں نہ لوں گا
کم دیجیے گا تو شعر سن کر ۔ سن لیجیے داد میں نہ دوں گا
شاعر بڑی عاجزی سے بولا ۔ ہے جیب میں میرے ایک روپیا
فی الحال اسے قبول کر لو ۔ اشعار ابھی صرف سن لو بھیا
کل باقی رقم اُدھار لے کر
جب دوں گا تمھیں تو "داد" دینا

صاف صاف

منہ پھٹ ناگ پوری

کھا کھا کے گرم گرم جلیبی اُدھار کی ۔ حالت بگڑ گئی ہے دلِ بے قرار کی
یاروں نے جب سے کرسیوں کو لر لگا لیا ۔ صورت اتر گئی ہے نسیم بہار کی
آئی نہ آج رات بھی کل رات کی ٹرین ۔ ہوتی ہے یار حد بھی کوئی انتظار کی
اک آفس ایک گھر میں تو دو دیکھ بھال میں ۔ کیا ہو گیا وزیر نے جو چار چار کی
دو چار سال ہی میں کروڑوں کی ملکیت ۔ تقدیر لائیے تو کسی آمدار کی
گو مال جیب میں نہیں آنکھوں میں دم تو ہے ۔ یارو مجھے شراب پلاؤ اُدھار کی
منہ پھٹ اب اپنے حقے کو تیار کیجیے
قیمت بڑھا رہی ہے حکومت سگار کی

[illegible]
سید عباس متقی حیدرآباد

بس کہ دشوار ہے تحقیق کا آساں ہونا

تحقیق وہ دشوار گزار راستہ ہے جس سے صرف قسمت کے ستائے، تقدیر کے مارے، مقدر کے ہارے بے چارے ریسرچ اسکالرس ہی نبرد آزما رہتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ارضِ نو کی تلاش میں نکلے ہوئے یعنی کہ قطبی نکلے ہوئے، کولمبس اور واسکوڈی گاما کو بھی ایسی پریشانیوں اور ایسی دشواریوں سے سابقہ نہ پڑا ہوگا جو ریسرچ اسکالر کو مدام تادم حصول ڈگری پڑتا رہتا ہے۔ تحقیق کے لغوی معنی اظہارِ حق کے ہوتے ہیں۔ اہلِ جی اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ حق کا نامعلوم سے معلوم ہونا خود ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ سنتے تھے کہ حق کا اظہار اس سے زیادہ دشوار ہے۔ ہم نے سنا تھا کہ حق بہت کڑوا ہوتا ہے، یہ علم الیقین کی حد تھی۔ جب تحقیق کرنے والوں کی پریشانیوں، دشواریوں اور حیرانیوں بلکہ حیرانیوں اور بطورِ خاص ان کی قبر وائیوں کو بچشم سر ملاحظہ کیا تو عین الیقین ہوگیا اور جب ہم نے خود تحقیق کا بیڑا اٹھایا تو کچھ اس طرح سے اچھی خاصی درگت بنی کہ حق الیقین ہوگیا۔ تحقیق کرنے والا حق الیقین سے بھی آگے ایک اور منزل میں ہوتا ہے جسے عرفِ عام میں "ذلّ کل یقین" کہتے ہیں اور یہ منزل دراصل منزلِ مقصود ہوتی ہے جو ہر .Ph.D کرنے والے کو عموماً نصیب ہو ہی جاتی ہے۔

ہم نے جب دوستوں سے قرض لے کر اپنے نام کا لیٹر پیڈ اعلیٰ قیمت پر تیار کروایا تو اپنے نام کے نیچے ریسرچ اسکالر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ لکھوایا اور سر پر غرور کلاہ و دلِ بلند کے ساتھ ہم نے اونچا بھی کر لیا کہ ہمارا نام بھی بہرحال ریسرچ اسکالرس میں شامل ہو گیا ہے لیکن ہمیں کیا خبر تھی کہ یہ چیز باعثِ تعزیت ہے۔ چونکہ زیادہ وقت ہمارا کتب خانوں کی تلاش کے علاوہ قبرستانوں میں قبروں اور کتبوں کی تلاش میں گزرنے لگا تھا اس لیے لوگ ہمیں مجذوب سمجھنے لگے۔ لوگ تحقیق کے ذوق میں بال بچوں کو چھوڑ دیتے ہیں ہم نے بال پر بہرحال اکتفا کیا۔ مثلِ اعظم کے سنگ تراش کی حالت ہوگئی۔ مخطوطات لیے گھنٹوں محوِ مطالعہ رہتے۔ اکثر کسی لفظ کے پیچھے پڑ جاتے تو ٹھہر سے عصر ہو جاتی مگر کاتب کی کتابت سمجھ میں نہیں آتی۔ گھنٹوں دعا اور دوا کے درمیانی نقطہ کو سلجھاتے رہتے یوں معلوم ہوتا کہ "جیسے کوئی معمہ حل کر رہے ہیں۔" ہمیں کسی چیز کی تلاش تھی لیکن جانتے نہ تھے کہ کس چیز کی تلاش جاری ہے۔ لیکن یہ جاننا چاہتے تھے کہ آخر ہم جاننا کیا چاہتے ہیں مگر جانتے نہ تھے کہ یہ جاننے کے لیے کیا جاننا چاہیے۔ کبھی ناموں میں الجھ جاتے تو کبھی

یں حسب میں گرداں رہتے تو کبھی نسب میں ۔ ایک غیر معروف شاعر کا سلسلہ ہم نے بڑی کد و کاوش، کھوج اور جستجو سے ایک ایسے عظیم الشان، نامور بزرگ کے خانوادے سے ملا دیا اور بہت خوش تھے کہ چلیے ایک شاعر کو صوفی بنا دیا۔ تحقیق کا حق ادا ہو گیا۔ اس زور کی تحقیق کی ہے کہ زور بھی کیا زور مارتے ۔ لیکن جب ہم نے ایک پروفیسر پر اپنی یہ نئی تحقیق بہت رازدارانہ انداز میں واکی تو انھوں نے اس سے زیادہ رازدارانہ لہجے میں فرمایا کہ آپ نے اس شاعر کو جن بزرگ کے صاحبزادے کی نسل سے بتایا ہے وہ دراصل لاولد رہے اور آخری عمر میں انھوں نے ایک مثنوی لکھی جس میں ان کے لاولد ہونے کا یقینی ثبوت ملتا ہے ۔ ایسا معلوم ہوا کہ ہماری تحقیق کا جنازہ بڑی دھوم دھام سے نکل رہا ہے گویا وہ تحقیق کا جنازہ نہ ہو کسی منسٹر کا جنازہ ہو ۔

تحقیق کرنا کوئی آسان کام نہیں ناک ۔ چنے چبانے پڑتے ہیں بلکہ ناک ۔ کی حد تک چنے چبانے کو مختص کر دینا گویا محاورہ کو عصری تقاضوں سے محروم کر دینے کے مترادف ہے ۔ سب سے مشکل مرحلہ مواد کی عدم فراہمی ہوتی ہے ۔ ہم نے جس پر تحقیق کیا ہے وہ ایک معروف شاعر کے غیر معروف شاگرد تھے ہم نے پہلے ان کی قبر دیکھی خلوص دل سے فاتحہ پڑھی، تاریخ وصال نوٹ کر لیا ۔ تاریخ ولادت تحقیق میں بہت اہم چیز ہوتی ہے کیوں کہ مشہور ہونے کے لیے مولود ہونا نہایت ضروری ہے ۔ کتب خانہ آصفیہ سے کتب خانہ [illegible] تک جتنے کتب خانے سرکاری اور غیر سرکاری دستیاب ہوئے انھیں سراپا کھنگال ڈالا ۔ مختصر سی تعریف ملی تو واضح تعارف نہ ملتا اور تحقیق میں تعریف سے مکمل تعارف قابل تعریف چیز گردانا گیا ہے ۔ وہ بہت بلند پرواز شاعر تھے ۔ یہ جملہ جب ہم اپنے بارے میں کہہ سکتے تو کیا اس شخص کو محروم رکھیں کے جس پر تحقیق کے بعد ہم کو ایسی ڈگری ملنے کی امید ہے جس کے بعد لکچرر شپ کی بھی امید کی جا سکتی ہے ۔ وہ معرّب اور مفرّس شعر بھی کہتے تھے ۔ یہ ایسے تکی بات تو ہم کلی تلنگنڈوی کے بارے میں تک کہہ سکتے ہیں ۔ موصوف تو اس دور کے آدمی تھے جب فارسی پڑھنے کے بعد تیل بیچنے کی نوبت کم ہی آتی تھی ۔ ان کے پوتے کے صاحبزادے جن کے دو چار پوتے ہیں [illegible] کا مرکز ، ممبی ، مادی ، منبع اور منتہا تھے ۔ ہم حیدرآباد سے بن سنور کر فاضل ساڑھے کا فاصلہ کا پیدل لیے خرم نگر پہنچے اور جب واپس آتے تو حالت نہ صرف غیر ہوتی بلکہ اغیار ہوتی ۔ گرد میں اٹی ہوئی زلفیں، پھٹی ہوئی ٹوپی، کیچڑ آلود کرتا، چہرے پر فاقہ کشی کے اثرات، آنکھوں میں ہندوستان بھر کی تھکن الغرض بیگم ہمیں دیکھتے ہی پردہ فرمالیتیں، ہم اس بات کو سمجھ ہی نہ سکے کہ آخر تحقیق کرتے ہوئے آدمی کیا ہو جاتا ہے ۔ کہ وہ آدمی نہیں رہتا ۔ خرم نگر یوں بھی اسم بامسمی ہے ۔ ہم ہری گھاس دیکھ کافی خوش ہوتے کہ جی میں آتا لوٹنے لگیں ۔ لیکن ہم تحقیق کار تھے اداکار نہیں ۔ یہ ساری خرمستیاں ایک اداکار تو کر سکتا ہے لیکن ایک تحقیق کار نہیں ۔ موصوف سے مل کر ہم بہت خوش ہوئے کہ وہ ہماری طہارت سے لے کر ضیافت تک کا انتظام کرتے ۔ بیگن اکثر کھلاتے شاید ان کے طویل و عریض آنگن میں بیگن کے پودے کچھ زیادہ ہی تھے ۔ خوب سنتے خوب بولتے لیکن ہم سے ہمارے مطلب کی بات نہیں کرتے ۔ مطلب کی بات کرنی شاید لیڈر حضرات کو ہی بہتر آتی ہے وہ اس سے گویے تھے ۔ ہم ان کے دادا کے والد کی بات کرتے اور وہ اپنے صاحبزادے کے ہونے والے

صاحبزادے کا ذکر چھیڑتے۔ ہم پوچھتے آپ کے آبا و اجداد کا پیشہ؟ وہ اپنی ملازمت کے بارے میں بولتے، شادی کے بارے میں بولتے، وظیفے کے بارے میں بولتے اور وظیفے کے بعد کی کارروائی کے بارے میں سناتے اور بہت غم زدہ ہو جاتے اور ان کی زبان پر اپنے وقت کچھ گالیاں بھی شرمانے لگتیں اور واقعی جو وظیفہ خواروں کو پریشان کرتے ہیں حیدرآباد کے مسلم ایریا کی دکنی اردو گالیاں ان کے دامن میں ڈال دینی چاہیے۔ وہ تو بس کم ظرف، نسل بد، ولدالحرام جیسے الفاظ ہی پر اکتفا کرتے۔ ہمیں تو بعض وقت ان کی رام کہانی سنتے سنتے شک ہونے لگتا کہیں وہ خدانخواستہ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ ہم نے ان پر تحقیق کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو ہمارا بیڑا بہر صورت غرق ہو چکا۔ اگر ہمیں زندوں پر تحقیق کرنی ہوتی تو کیا حیدرآباد میں زندوں کی کوئی کمی ہے جو ہم نگر نگر خوشی خوشی چلے آتے۔ ہم نے طے کر لیا کہ اب سوالات کی اس درجہ بھرمار کر دیں گے کہ وہ اپنی چوکڑی بھول کر دادا مرحوم کی چوکڑی یاد کریں گے۔ چناں چہ ہم نے دریافت کی ابتدا کی۔ سن ولادت کیا ہے؟ اٹھا ایک سوال پر اندر گئے۔ لفافوں خطوں، رسالوں، کاپیوں، دیوانوں، کاغذ کے پرزوں کا ایک طویل بنڈل لا پٹخا اور ہم حیران تھے کہ ایسی تحقیق تو بہت دقیق ہوگی۔ یہ بنڈل کہیں ہمیں بنڈل بازی تک نہ پہنچا دے کیوں کہ ہم ایک سچے محقق تھے، جھوٹ کو بھی سچ کر دکھانا خوب جانتے تھے لیکن بنڈل بازی سے ہمیں نفرت ہے اور جب تک ہم ایک محقق کی طرح زندگی گزاریں گے۔ ہمیں بنڈل بازی سے نفرت رہے گی خواہ کوئی ہماری اس بات ہی کو بنڈل کیوں نہ سمجھے۔ بہت دیر تک تلاش جاری رہی۔ ایک مصرع برآمد ہوا گویا تازہ موزوں ہوا ہو۔ پورے وثوق سے کہنے لگے پہلے لوگ اپنی پیدائش پر تک تاریخی مصرع کہا کرتے تھے۔ ہم نے جواب دیا کیوں نہیں جب مرزا غالب اپنی تاریخ وفات کہہ سکتے ہیں تو بھلا آپ کے دادا کیا تاریخ ولادت نہیں کہہ سکتے۔ سبحان اللہ۔ کیا تاریخ ہے۔ ٹیک گئی ہے۔ صدائے بالتفہ ہے وغیرہ۔ ہم تعریف کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ اس کی بھی تعریف سے گریز نہیں کرتے جو تعریف کا کسی طرح سے مستحق نہیں۔ حتیٰ ایں کہ ہم نے اپنی حکومت کی بھی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ اور حکمرانوں کی بھی۔ ہماری تعریف پر کہنے لگے۔ قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔ لیکن بعد میں مشکل یہ آن پڑی کہ اس تاریخ میں اور ان کی شادی کی تاریخ میں محض پانچ سال ہی کا فرق نکل آیا۔ زمانہ کتنا ہی پیچھے کیوں نہ ہو پانچ سالہ لڑکے کی بسم اللہ تو ہو سکتی ہے شادی نہیں۔ ہماری مکمل تحقیق موصوف کی ذات تک محدود اور ان سے لیے گئے انٹرویو تک مسدود رہی۔ ان طویل انٹرویوز میں کئی انٹرول بھی تھے۔ ہم نے دریافت کیا رنگ کیسا تھا۔ کہنے لگے۔ بس گورے چٹے سانولے تھے۔ قد؟ کہنے لگے اونچے ضرور تھے مگر ٹھگنے دکھائی دیتے تھے۔ ہم سر ہی نہیں گردن، سینہ اور اپنی جمال داڑھی پکڑ کر بیٹھ گئے۔ مسکن سے متعلق سوال پر کہنے لگے مسافر کی حیثیت سے زندگی گزار دی۔ مستقل قیام تو اب آخرت میں فرما رہے ہیں۔ بیویاں کتنی تھیں؟ ہمارا سوال بہ اعتبار حال مضحکہ خیز ضرور تھا لیکن ہم جانتے ہیں کہ ماضی میں تمام نہاد مرد نہیں حقیقی شرعی مرد ہوا کرتے تھے جو ڈوائن میپلیٹر سے استفادہ کی صلاحیت بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔ جواب دیا شرع کے پابند تھے ازدواجی امور میں تو بہت پابند تھے۔ اپنا کوٹہ مکمل فرما لیا تھا۔ چار بیویاں تھیں جن کی حیات تک بقید حیات تھیں۔ اولاد؟ فرمایا

کبھی کوئی چیز نہ ملے گی۔ کیونکہ صفر ہے آپ کے پاس۔ ہم حساب میں سدا صفر رہے ہیں۔ تحقیق میں چونکہ قیاس کا اعتبار تحقیق کے اعتبار کے ہم پلہ ہوتا ہے۔ اس لیے اندازے سے لکھ دیا ابھی تو چار سو بیس بیسی کی اور گنجائش نکل سکتی ہے۔ تحقیق کار کا کتب خانوں سے تعلق چولی دامن کا نہیں جالی اور استر کا ہوتا ہے کیونکہ چولی اور دامن میں ایک حد قائم ہو سکتی ہے۔ لیکن جالی اور اس کے استر میں کوئی حد نہیں۔ جہاں تک جالی وہاں تک استر۔ کتب خانوں میں تحقیق کار کا زیادہ وقت کتاب ڈھونڈنے، پھر کتاب کے انتخاب میں اور کسی قدر وقت الٹے سیدھے مطالعے میں گزرتا ہے۔ کبھی محقق کو مطلوبہ کتاب نہیں ملتی۔ اگر ملتی بھی ہے تو مطلوبہ اوراق پھاڑ لیے ہوتے ہیں۔ ہمیں کوئی کتب خانہ ایسا نظر نہیں آیا جہاں کیٹلاگ اور شیلف اور کتابوں میں واقعی یکسانیت ہو۔ کتاب کا نمبر مشرق میں تو کتاب مغرب میں۔ فلسفہ کے خانے میں مزاح کی بے شمار کتابیں اور تاریخ کے خانے میں بچوں کی نفسیات پر مبنی کتب بھی پائے جاتے ہیں۔ مختلف شاعروں کے مجموعے تقریباً ہر شعبے میں شاید اس لیے رکھ دیے جاتے ہیں تاکہ لوگ مخصوص شعبہ سے بور ہو جائیں تو تبدیلیِ ذائقہ کے طور پر ان کتب سے استفادہ کیا جا سکے۔ بعض کتب خانوں میں یہ دیکھ کر ہم مسرت سے دوہرے ہو جاتے ہیں کہ سال بہ سال اخبارات کی بڑی بڑی ضخیم تر جلدیں محفوظ ہیں لیکن ایک جلد کو ہٹا کر دوسری جلد کو نکالنے میں ناشتہ ہضم ہو جاتا ہے۔ ریسرچ اسکالرس چونکہ عموماً بے روزگار رہتے ہیں اس لیے کھاتے کم ہیں اور جلدیں ہٹا ہٹا کر اپنی جلد پسینہ کرتے ہیں۔

الغرض تحقیق کرتے کرتے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دنیا کا کوئی شخص خود کو محقق نہیں گردان سکتا کیونکہ تحقیق ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جب تک کتابیں لکھی جاتی رہیں گی اور ان پر مزید کتابیں لکھی جاتی رہیں گی اور ان لکھنے والوں پر لکھنے والے یقیناً لکھتے رہیں گے اور ان پر تحقیق کرنے والے جب تک کالج ڈگری دینے کی صلاحیت رکھتا ہے تحقیق کرتے رہیں گے۔ جہاں تک ہمارا معاملہ ہے ہم نے یہی تحقیق کی ہے کہ تحقیق وہ سمندر ہے جس کے طول و عرض بشمول عمق کوئی ناپ نہیں سکتا۔ اگر کوئی جامعہ ہماری اس تحقیق پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دے دے تو ہمیں خود کو ڈاکٹر کہلوانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

●●

بابو آر کے، ایلاپد

زندہ بدستِ مُردہ

اپنی شادی کا غم ہلکا ہو اس لیے ہم شادیوں میں شریک رہتے ہیں اور موت کا ڈر کم کرنے کے لیے ہم جنازوں میں شریک رہتے آئے ہیں۔ لیکن جب سے ہم نے جنازے میں شریک لوگوں کی عجیب حرکتوں پہ غور کیا تب سے جنازے میں شریک ہو کر میت کے ساتھ قبر تک جانا ہمارے محبوب مشاغل میں شامل ہو گیا ہے۔ قبر کے اندر مردے کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے یہ تو خدا جانے اور مردہ سمجھے لیکن قبر کے آس پاس جو کچھ ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہمیں بہت بھلا لگتا ہے۔ ایک مردہ کتنے زندوں کو اپنی گرفت میں رکھتا ہے اور ان سے کیسے کیسے کام لیتا ہے اور کیسی کیسی حرکتیں کرواتا ہے اس سے آپ اور ہم سبھی واقف ہیں۔ اب آپ زندہ بدست مردہ کا مشاہدہ خود ہی کر لیجیے۔ لب سڑک ایک جنازہ اپنے آخری سفر کے لیے رواں دواں ہے۔ جنازے میں شامل لوگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ گئے ہیں۔ جنازے کے پاس پاس رہنے والے گروہ پہ مردے کو کندھا دینے کی ذمہ داری لازوی جاتی ہے۔ اور اس ذمہ داری سے بری الذمہ ہونے کے لیے یہ گروہ مردے کو کندھا دینے میں تیزی اور پھرتی دکھانے لگتا ہے جس سے مردے کو کندھے کم اور جھٹکے زیادہ ملنے لگتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دوسرا گروہ بجائے میت کو کندھا دینے کے کندھے اُچکا اُچکا کر مرحوم کی صرف خوبیاں گنوانے میں دل چسپی رکھتا ہے تو کچھ لوگ حکومت، سیاست، موسم، بیماری اور مہنگائی کو آڑے ہاتھ لیے با دل ناخواستہ جنازے کے ساتھ چلنے پر خود کو مجبور پاتے ہیں۔ جنازے میں شریک وہ لوگ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جو ذرا صاحبِ ثروت اور سماجی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کا انداز خرام ایک شاہانہ وقار لیے ہوتا ہے یہ حضرات اپنے نفیس قدم اتنے رکھ رکھاؤ سے اٹھاتے ہیں جیسے یہ خود جنازے میں شریک نہیں بلکہ مرحوم انھیں اپنے جنازے میں شریک کروانے کے لیے ہی اس دنیا سے گزر گیا ہو۔

جنازے کے ساتھ چلتے چلتے تھوڑے وقفے کے بعد ہم لوگوں کے وسط سے نکل کر کندھا دینے ذرا آگے بڑھے ہی تھے کہ جنازے کے عین عقب میں ایک صاحب مرحوم کے قریبی عزیز کے شانے پر ہاتھ دھرے اسے اپنے نرغے میں لے کر یہ کہنے پر مجبور تھے کہ "خدا بخشے، کیا خوبیاں تھیں جی مرنے والے میں، کیا ہی اچھا آدمی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہ کسی سے کبھی جھگڑا نہ کوئی لفڑا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا طبیعت پائی تھی بے چارے نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہم نے ان صاحب کو گھور کے دیکھا ہمیں ان پر غصہ اس لیے آیا کہ ابھی ایک مہینہ قبل مرحوم کے ساتھ لب سڑک بیچ بازار میں ان صاحب کی اچھی خاصی مار ماری ہوئی تھی۔

کتنی گالیاں مرحوم کو انھوں نے دی تھیں۔ اب کروڑ کروڑ جنت کی دعائیں ہیں اور ...... اس دن بھرے کورٹ پہ چھنی دے کر مرحوم کو لہولہان کر کے چھوڑا تھا۔ ہم نے انھیں قائل کرنے کے لیے درمیان میں ٹوکا "اب آپ پر لگی دفعہ ۱۰۷ کا کیا ہوا ...... بولے کون سی؟ ہم نے کہا وہی جو مرحوم اور آپ کے درمیان مارا ماری پر قائم ہوئی تھی۔ اس وقت وہ جھینپ گئے اور ابھی آیا کہہ کر ندامت سے کندھا دینے نکل بھاگے۔

جنازے میں شریک کچھ لوگ جنازے کو کندھا اس وقت تک نہیں دیتے جب تک کہ مرحوم کے گھر والے یا قرابت دار انھیں کندھا دیتے دیکھ نہ لیں۔ اکثر حضرات تو جنازے کو کندھا دینے کے لیے اس قدر مادلانہ انداز سے آگے بڑھتے ہیں کہ مرحوم کے قریبی رشتہ دار کو زوردار جھٹکا دے کر اس کا شانہ چڑھا دیتے ہیں تاکہ جنازے میں ان کی شرکت یاد رہے اور تقریب برائے چہلم کی فہرست میں ان کا نام سرِ فہرست رہے۔ خیر صاحب' ہم جنازے کو کندھا دے کر پلٹے ہی تھے کہ ایک صاحب مرحوم کے بھائی سے جو گفتگو کر رہے تھے اس کا لب لباب یہ تھا ...... ہائے کیا بے ضرر آدمی تھا؟ ...... اپنے ہی راستے چلنا ...... نہ کسی کا لینا نہ دینا. ...... کیا خوبیوں کا مالک تھا ...... آدمی نہیں فرشتہ تھا ...... ان تعریفی جملوں سے مرحوم کے بھائی کو کوئی سروکار نہیں تھا ...... وہ دل پہ سو جبر کر کے یہ واہی تباہی سنے جا رہے تھے ورنہ حقیقت تو وہ بخوبی جانتے تھے کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں سوائے دھوکہ فریب کے کچھ نہیں کیا ...... یہ بھی وہ جانتے تھے کہ مرحوم نے اپنی زندگی میں جتنے گڑھے کھودے تھے وہ سب انھیں ہی بھرنے ہیں۔ اس لیے ان پر ان جھوٹی تعریفوں کا بھلا کیا اثر ہوتا۔ وہ خاموشی سے یہ سب برداشت کرتے رہے اور خون کے گھونٹ پیتے رہے۔

اب صاحب' جنازے کا آخری سفر ایسی ہی جھوٹی سچی باتیں کرتے' پان چباتے اور جھوٹی ہمدردیاں جتاتے ہوئے اپنے اختتام کو پہنچتا ہے۔ جوں ہی قبرستان آتا ہے جنازے میں شریک ہر کوئی مرحوم کی قبر کے دیدار کے لیے دیوانہ وار یوں لپکتا ہے جیسے یہ لوگ مرحوم کی قبر دیکھنے کی حسرت ایک مدت سے اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ اب یہاں لوگ مردے کی تعریف چھوڑ کر قبر کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ جو لوگ راستے بھر مرحوم کی چاپلوسی کرتے ہوئے آئے تھے اب قبرستان آ کر وہ اس کی قبر کی چاپلوسی کا بیڑا اٹھا لیتے ہیں۔ جسے دیکھو وہ قبر کی تعریف کرنے لگتا ہے۔ قبر کی تعریف کرنے کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ قبر کی تعریف کرنے والے اور مرحوم کے اقارب میں جتنا فاصلہ کم ہو اتنا بہتر ہے۔ ایک صاحب لوگوں کو مخاطب کر کے مرحوم کے رشتہ دار کے قریب کھسکتے ہوئے قبر کو حسرت سے دیکھ کر کہتے ہیں ...... جزاک اللہ ...... کیا قبر ملی ہے؟ سبحان اللہ ...... کیسا نورانی مکان ہے ...... واہ ...... اب قبر کتنی نورانی ہے اور کیسی ہے اس کا حال تو بے چارے قبر کھودنے والے مزدوروں سے کوئی پوچھے کہ انھوں نے کتنی مشکل سے قبرستان کی ابڑ کھابڑ جگہ کھودی ہے اور اس ویران قبر کی نوک پلک درست کرنے میں ان کی محنت مشقت کو دخل ہے یا مرحوم کی ذاتِ اعلیٰ صفات کا۔ دوسرے صاحب' قبر کو دیکھ کر مرحوم کے رشتہ دار سے مخاطب ہو کر یوں گویا ہوتے ہیں ...... نیک انسان کی تو بات ہی الگ ہوتی ہے جی ...... پھر قبر سے نکلی ہڈیوں کو مٹی کے

نیچے چھپا کر ... ماشاءاللہ دیکھو تو سہی ...... کیا کوری قبر ملی ہے مرحوم کو ...... الغرض قبر کی تعریف کر کے ہر کوئی مرحوم سے اپنے لگاؤ کے ساتھ ساتھ جنازے میں اپنی شرکت کا احساس بھی دلاتا رہتا ہے ...... اب اس کے بعد جنازے کی نماز کا مسئلہ آتا ہے ...... امام صاحب تیار ہیں اور نیت باندھنے ہی والے ہیں کہ ٹھہرو ..... رک جاؤ کا اذن ملتا ہے ...... وہ فلاں صاحب وضو کر رہے ہیں اور آنے والے ہیں ...... اب جواب میں آدھے لوگ کہتے ہیں کہ وہ صاحب آچکے ہیں اور آدھے بضد ہیں کہ نہیں وہ آنے والے ہیں۔ پھر صفوں کے معاملے میں تین، پانچ، سات کی گنتی کے علاوہ سیدھی نہیں ٹیڑھی اور ٹیڑھی نہیں سیدھی پر تو باقاعدہ صف آرائی ہونے لگتی ہے ...... اور ایسے ہی ہنگاموں کے بیچ، تو صاحب، نماز جنازہ بھی پڑھ لی گئی۔ اب جنازے میں شریک لوگوں کے لیے ایک مشکل سچویشن یہ آتی ہے کہ مردے کو قبر میں لٹانے کے لیے قبر کے اندر کون اترے اس وقت کوئی بھی قبر میں اترنے کے لیے تیار نہیں ہوتا لیکن جیسے ہی کوئی ہمت کر کے قبر میں اترتا ہے تب سے ہرا ایرا غیرا گائیڈ کرنے لگتا ہے اور مشوروں کی بھرمار سے اس کام میں گویا رکاوٹ پیدا کرتا ہے اور بچارہ قبر کے اندر موجود شخص اس مچھلی بازار سے تنگ آکر قسم کھاتا ہے کہ آئندہ وہ کبھی قبر میں اترنے کی غلطی نہیں کرے گا۔

تو صاحب قصہ مختصر یہ کہ موت کے بعد مردہ ہم زندوں سے عجیب عجیب حرکتیں کرواتا ہے۔ موت کے بعد سے تدفین تک ہم زندوں کو اپنی گرفت میں رکھ کر اپنی جھوٹی تعریفیں کرواتا ہے اور جھوٹ بکنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہم نے تو اچھے اچھوں پر مردے کی چاپلوسی کے دورے پڑتے دیکھے ہیں۔ مردے کے لیے زندوں کی ایسی چھچھوری اور جی حضوری نے ہمارے لیے موت کو رنگین اور پُرکیف بنا دیا ہے۔ اسی لیے تو خوشی خوشی جنازوں میں شریک ہو کر قبرستان تک جانا ہمارے محبوب مشغلوں میں شامل ہو گیا ہے۔ ●●

بہاء الدین ریاض (کلکتہ)

بیوی حسین جس کی ہو اونچی ہے اس کی ناک
میں یاس کا شکار تھا بیگم نے رکھ لی ناک

ہم وہ نہیں جو حسن کی خیرات مانگ لیں
ہر [illegible] بچائی ہے ہم نے خودی کی ناک

یہ عشق تم سمجھتے ہو بچوں کا کھیل ہے
آنکھوں سے اشک بہہ گئے رومال اور بہے گی ناک

کچھ کہہ نہ پائے تھوک نگلنے کے باوجود
غصہ تھا ان کی ناک پہ ٹھنڈی تھی اپنی ناک

غیروں کی بن جو آئی تو بہکا دیا اسے
محبوبہ میری گویا کہ اک موم کی تھی ناک

مکھی نہ بیٹھنے کبھی اس پہ دیا ریاض
دامن حیا کا چھوڑا نہ ہم نے کٹائی ناک

لاغر نرملی

صرف سو غزلیں سناؤں گا، زیادہ تو نہیں
صبح تک تم کو جگاؤں گا زیادہ تو نہیں

ماما قاضی کا بھی دھندا ہے بہت مندا مگر
شادیاں چار رچاؤں گا زیادہ تو نہیں

جیت لوں یہ بھی الیکشن تو نواسوں کے لیے
دس نئے بنگلے بناؤں گا زیادہ تو نہیں

کر کے بیمہ میں تری لائف کا اے بنتِ خسر
زہر تھوڑا سا کھلاؤں گا زیادہ تو نہیں

ہجر میں تم نے ستایا ہے بہت، وصل کی شب
میں بھی تھوڑا سا ستاؤں گا زیادہ تو نہیں

میں تو لاغر ہوں بلاتے نہیں کیوں دعوت میں
دم کے دس مرغ دباؤں گا زیادہ تو نہیں

یوسف یکتا (سکندرآباد)

مرغ دم کا کھلا کر دیکھ لینا
ہمیں ٹھرّا پلا کر دیکھ لینا

کٹیں گی مرغیاں لاکھوں ہزاروں
ذرا دھونی رما کر دیکھ لینا

کھلیں گے پھول لاکھوں رنگ برنگی
ہمارا خوں بہا کر دیکھ لینا

فرق یکتا میں اور شبنم میں کیا ہے
غزل دونوں کی گا کر دیکھ لینا

بجیں گے چار سو طبلے ہی طبلے
غزل یکتا کی گا کر دیکھ لینا

رضیہ فصیح احمد (کراچی پاکستان)

میزان

ہم بہ یک وقت کتابوں اور .. فلموں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ تبصرے کے لیے کتاب کی چار جلدیں اور فلم کے لیے پانچ ٹکٹ آنے لازمی ہیں۔

ماہنامہ "چوڑیاں"
مکتبہ معیار ستمگار
سکندر نگر

نسوانی پرچوں کی کمی کے پیش نظر محترمہ فرسودہ بیگم نے یہ رسالہ اپنی صنف کی ادبی خدمت کرنے کے لیے جاری کیا ہے۔ کون واقف نہیں کہ صنفِ نازک ادب کی ہر صنف میں صنفِ قوی کے برابر ہے بلکہ معاشرتی اور رومانی ناول لکھنے میں تو پیش پیش ہے۔ افسانہ نگاری میں بھی کسی سے پیچھے نہیں اور اب تو دامن نظم و غزل بھی اسی زلیخا کے ہاتھوں تار تار نظر آتا ہے۔ فرسودہ بیگم اور ہجو لکھنوی کا نام نامی آج کی شاعری میں سورج اور چاند بن کر چمک رہا ہے۔ ماہنامہ "چوڑیاں" ان تمام فن کاروں کے فن سے لیس ہے۔ جن کا ذکر آج کے نسوانی ادب میں کیا جا سکتا ہے اور عام نسوانی پرچوں کی طرح ادب اور حکمت سے بہ یک وقت عہدہ برآ ہو رہا ہے۔ اسی پرچے میں ادب زدہ خواتین کا علاج پسندیدہ اشعار سے جسمانی مریضاؤں کا علاج "حکمتی چٹکلوں" اور ازدواجی الجھنوں کا علاج نفسیاتی نکتوں سے کیا جاتا ہے۔ ایک صفحہ فیشن زدہ خواتین کے لیے بھی وقف ہے۔ اور نمونہ ملاحظہ ہو:

پسندیدہ اشعار کے عنوان میں اکثر ستمناتی ہیں ؎

یہ بھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا
شاعر:- نامعلوم
بھیجنے والی: سنبل شاہین۔ خورشید خاور قیاس
(یہ ایک ہی نام ہے)

؎ تاج جب سر کے ماتھے پہ نظر آتا ہے یک بہ یک خون بھری آنکھوں میں اتر آتا ہے
شاعر مجاز، ساحر یا جوش ملیح آبادی
بھیجنے والی: بیگم سخن ناشناس

ا جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوتا ہے۔

؎ کہنے لگے کہ اونٹ ہے بھدّا سا جانور — اچھی ہے گائے رکھتی کیا نوک دار سینگ

شاعر: علّامہ اقبال سیالکوٹیا

بھیجنے والی: نامعلوم

اب دو ایک حکمتی نسخے ملاحظہ ہوں:

بہن ماہ لقا اور مہ پارہ نے لکھا ہے کہ ان کے چہروں پر داغ بہت ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ روز صبح 'رات ہونے سے پہلے چھریری میں تیزاب خضاب میں بھگو کر لگائیں۔ انشاء اللہ افاقہ ہوگا۔ اگر نہ ہو تو صبر کریں۔

دل جوڑنے کا نسخہ: بہن دل شکستہ کی خدمت میں عرض ہے کہ آج کل دل ٹوٹنے کی وبا عام ہے۔ اس لیے دگھبرائیں۔ ا... آزمودہ نسخہ پیش خدمت ہے۔ دل کے دونوں کناروں پر ناخونوں کی پالش لگا کر تھوڑی دیر دھوپ میں رکھیں۔ بعداز... کام میں لائیں۔ گرم چیز سے پرہیز کریں۔ اگر استعمال کے لائق نہ معلوم ہو تو بطور سجاوٹ ڈرائنگ روم میں رکھیں نہایت بھلا معلوم ہوگا۔

نفسیاتی علاج: بہن خریداری نمبر ۱ نے لکھا کہ ان کے شوہر دوسری شادی کر رہے ہیں کوئی ایسی ترکیب بتائیے کہ وہ اس حرکت سے باز رہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ اس پرچے کی اشاعت میں غیر معمولی دیر ہونے کے سبب شادی کی تاریخ نکل گئی ورنہ ہم کوئی ایسی ترکیب بتاتے۔ اب آپ خاموشی سے سب کچھ دیکھیے۔ خدا مسبب الاسباب ہے۔

نوٹ: آئندہ ایسی صورت ہونے پر بہن موصوفہ کو چاہیے کہ ایک جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ان چیزوں کے علاوہ ماہنامہ "چوڑیاں" کے باقی مضامین بھی پائے کے ہیں۔ محترمہ ناقص العقل صاحبہ کا لکھا ہوا نفسیاتی مضمون بچوں کو ڈرانے کی ترکیب ... مفید اور بلند پایہ مقالہ ہے۔ شعلہ جوار صاحبہ کا مضمون "معلوماتی بلاؤز" خاصے کی چیز ہے۔ تک بند صاحبہ کی چار نظمیں جو ایک ہی صفحے پر چھپی ہوئی ہیں جو تک بندی کی نہایت عمدہ مثال پیش کرتی ہیں۔ شہ پاروں کے عنوان سے جو ادب مختلف بہنوں نے پیش کیا ہے۔ اگر سمجھ میں آجاتا تو ایک نئی اور اچھی چیز ہوتی۔ فیشن کے صفحے میں الٹا ... سیدھا سوئیٹر اور کڑھیاں چاک بلاؤز قابل غور چیزیں ہیں۔ اگر تصویریں ذرا صاف ہوتیں تو اچھی طرح پتہ چل جاتا کہ کون سا بلاؤز ہے اور کون سا سوئیٹر۔

اس ماہنامے میں بھی ہمارے ادب کی روایت کے عین مطابق کتابت کی غلطیوں سے احتراز نہیں کیا گیا۔ یہ دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ ہر صفحے پر کم از کم آٹھ کتابت کی غلطیاں ہیں جن میں چند ایک یہ ہیں: شیر کو شکر، دید کو دید، خادم کو نادم اور خدا سے جدا کر دیا گیا ہے۔ پسندیدہ اشعار میں غالب کے مصرعے ؎ غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے — کو غمزہ و شکوہ گلا کیا ہے؟؟ بنا دیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کاتب اپنے کام میں ذاتی طور پر دلچسپی لیتا ہے یہ اردو ادب کے لیے نیک فال ہے۔

[1] ہم امید کرتے ہیں کہ ماہنامہ "چوڑیاں" کے آئندہ شمارے بھی اسی طرح ظاہری و معنوی خوبیوں سے کنگال ہوں گے۔

---

[1] یہاں کنگال کی بجائے مالا مال ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں

شرحِ دیوانِ غالب۔
مصنف۔ حضرت شارحِ عام
پبلشرز خالقِ ادب۔ تخلیق پور۔
قیمت پچیس ۲۵ روپیہ۔

شرحِ دیوانِ غالب کے دیباچے میں اس کتاب کو شائع کرنے کی وجہ صاف بیان صاف گوئی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو "گو کہ دیوانِ غالب کی متعدد شرحیں طبع ہو چکی ہیں تاہم ہر چیز میں اضافے کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ جیسا کہ سالہا سال سے رسالوں کے غالب نمبر اور فوٹو نمبر شائع ہو رہے ہیں اور خوش قسمتی سے لکھنے والوں کو ہمیشہ مواد ملتا رہا ہے۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شرح محض اضافے کی خاطر خوش قسمتی سے لکھنے والوں کو ہمیشہ مواد ملتا رہا ہے۔ اگر یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ شرح محض اضافے کی خاطر لکھی گئی ہے۔ کئی باتیں اور بھی ملحوظِ نظر ہیں۔ مثلاً، شارحین غالب کے شعروں میں اکثر کھینچا تانی سے کام لیتے ہیں مگر راقم نے شعر کو بغیر کھینچے ایسے معنی نکال دیئے جو یقیناً اس وقت شاعر کے ذہن میں بھی نہ ہوں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر شرحوں میں ممتحن کی ضرورت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ طالب علم اور طالبات ان اشعار کے عجیب غریب معنی لکھ کر ممتحن کو مذبذب میں ڈال دیتے ہیں۔ اس طرح نہ صرف اس کا قیمتی وقت برباد ہوتا ہے بلکہ الجھن میں پھنس کر وہ کئی طالب علموں اور طالبات کو خواہ مخواہ فیل کر ڈالتا ہے ممتحن کو ان الجھنوں سے نجات دلانے اس شرح میں پوری کوشش کی گئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ ممتحن طبقہ اس شرح کی ہمت افزائی میں کنجوسی نہ کرے گا۔"

یہ ہے دیباچے سے ایک اقتباس قارئین پر اس شرح کی اشاعت کی غرض و غایت واضح ہو گئی ہوگی۔ اب چند اشعار اور ان کی شرح ملاحظہ ہو جس سے اندازہ ہوگا کہ شارح نے کتنی دیدہ دلیری سے کام لیا ہے۔

سر خلِ سر بصحرا دادہ نورالعین دامن ہے ⁂ دل بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

ش دل بے دست و پا یعنی جس کے ہاتھ پاؤں نہ ہوں۔ باقی شعر صاف ہے۔

خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے ⁂ آئی شبِ ہجراں کی تمنّا مرے آگے

یہ بات محبوب عاشق سے کہہ رہا ہے۔ مرے کی جگہ ترے پڑھیے مطلب واضح ہو جائے گا۔
غدر میں جو دیوان تلف ہو گیا اس میں یہ شعر اس طرح دیا گیا ہے۔ یعنی:

ش خوش ہوتے ہیں پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے ⁂ آئی شبِ ہجراں کی تمنّا ترے آگے

ش دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے ⁂ آخر اس درد کی دوا کیا ہے

مرزا کے ابتدائی دور کا شعر ہے۔ شعر میں بلا کا ابہام ہے۔ کئی شارحین نے اس شعر کو مہمل قرار دیا ہے۔ لیکن راقم اس خیال سے متفق نہیں۔ بعض شارحین نے مختلف معنی لکھے ہیں مگر سب کوہ کندن و کاہ برآوردن کے مصداق ہیں۔ ہمارے نزدیک اس شعر کے سیدھے سیدھے معنی یہ ہیں کہ اے دلِ ناداں تجھے کیا ہوا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے۔

ش درد منّت کشِ دوا نہ ہوا ⁂ میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

یعنی دوا سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میں نہ چنگا ہوا نہ مندا ہوا بلکہ جیسا تھا ویسا ہی رہا۔
مرزا نے اپنے عہد کے نیم حکیموں پر کیا خوب طنز کی ہے:

؎ کرے گی فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں　　نکلے خشت مثلِ استخواں بیرون قالب سے

اس مختصر زمین میں ایسا بے ساختہ شعر کہنا مرزا کا ہی حصّہ ہے اور لائقِ صد تحسین ہے۔ شعر ملاحظہ ہو :

؎ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے　　خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

شعر بلاغت سے پُر ہے۔ مرزا نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔

ایک بیوی ہے کہ اپنے گھر کی مفلسی اور تنگ حالی کا رونا روئے جاتی ہے۔ شوہر اس کا کہتا ہے کہ نیک بخت تو کیوں اتنا شور مچاتی ہے کہ سارے پڑوسی سن لیں۔ مجھے بھی تو دیکھ کس طرح خامشی سے ساری مصیبتیں سہتا ہوں اور اف تک نہیں کرتا۔ اس پہ وہ نیک بخت جواب دیتی ہے کہ بولنا عورت کی فطرت ہے اس سے خاموش رہنا ممکن نہیں۔ ہاں تمہاری خاموشی سے فائدہ یہی ہے تاکہ کسی کو حال معلوم نہ ہو تو میں بھی اس قدر تیزی سے بول رہی ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے۔ اس اتنے طویل واقعہ کو دو مصرعوں کی تنگ نائے میں بند کر دینا کمالِ سخن ہے۔ عورت کی فطرت کی کیا صحیح عکاسی کی ہے۔ نکتہ ایک ہے کہ اپنی چرب زبانی سے عورت مرد کو خاموش کر دیتی ہے گویا ثبوت بھی مل گیا اس کی فطرت کا۔ اللہ اللہ — بات میں بات پیدا کرنا اسی کو کہتے ہیں :

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں　　ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

یہ بھی ادبی میاں بیوی کا قصّہ ہے۔ "ورنہ کیا بات کر نہیں آتی" میں عورت خصوصاً بیوی کی بسیار گوئی کی طرف اشارہ ہے :

؎ گدا سمجھ کے وہ چپ تھا میری جو شامت آئی　　اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

کتابت کی غلطی ہے گدا کی جگہ گدھا پڑھیے شعر صاف ہو جائے گا۔

؎ بے خبر گرم ان کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

نہ ہوا کے معنی یہاں ہیں نہ ہونے کے برابر کیوں کہ ہر چیز گھر میں ہو یکلخت غائب نہیں ہو سکتی تا وقتیکہ پڑوسی مانگ کر نہ لے گیا ہو۔ پس قیاس کہتا ہے کہ جو بوریا گھر میں موجود ہے وہ محبوب کے لائق نہیں۔ بوریا بمعنی ٹاٹ کا ٹکڑا ہے۔ تپش یہ بچھانے کے سبب گرم رہتا ہے۔ اس کی رعایت سے بے خبر گرم کہا۔ کیا خوب شعر ہے۔ اپنے استاد مرحوم کا ایک شعر اس وقت یاد آ رہا ہے :

سوتی جامے میں ریشمی ہے بند　　گویا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند

مرزا کا یہ شعر عمدہ ہے مگر استاد کے شعر کا انداز جدا گانہ ہے۔

(یہ شعر برسبیلِ تذکرہ آ گیا ورنہ یہاں استاد کا شعر سنانا مقصود نہ تھا)

یہ نمونے مشتے از خروارے ہیں۔ حقیقت میں اس کی خوبیوں کا اندازہ پوری شرح دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ لکھائی چھپائی کے متعلق کچھ کہنا بے سود ہے۔ ضخامت گوارہ ہے کتاب کی قیمت اس کی ضخامت کو دیکھتے ہوئے کم ہے۔

فلم :— پیٹ اپنا کھیر پرائی
ہلّا گلّا پروڈکشنز لمیٹڈ
اسٹوری رائٹر : قبلہ گشتم پشیمان
ہدایت کار رہبر اعظم
گانے — قاتل قصائی۔

میوزک ڈائریکٹر۔ نہزم
ستارے۔ پرلوک کمار۔
مکینک بھائی اور مس پرتو۔
[illegible] کی شہرۂ آفاق فلم پیٹ اپنا کھیر پانی ایک ایسی فلم ہے جس پر فلم انڈسٹری اور فلم ساز آج تک ناز کرتے ہیں اور فلمی شائقین رہتی دنیا تک سر دھنیں گے تو کم ہے۔ اس کی کہانی نرالی۔ ڈائیلاگ انجانے اور ناچ گانے لازوال تھا۔ کہانی کی واردات الجزائر کی ہے لیکن مصنف اور ہدایت کار کسی قسم کی سیاسی فضا سے متاثر ہوئے بغیر کہانی کو یوں آگے بڑھاتے ہیں جیسے کچھ ہوہی نہ رہا ہو۔ ان کا ملکی معاشرت و تمدن اور سیاسی حالات سے یوں پہلو بچانا اس کہانی کو عالمگیر بنا دیتا ہے۔ یعنی یہ کھیل بلا کسی تبدیلی کے دنیا کے کسی ملک میں کھیلا جا سکتا ہے۔

کہانی یوں ہے کہ ایک صاحبزادے جو چال ڈھال سے یقیناً ہیرو ہیں۔ الجزائر جاتے ہیں کیوں کہ ان کے دادا کسی زمانے میں جا کر الجزائر میں آباد ہو گئے تھے اور ان کی بے تحاشا جاگیر وہاں تھی اتفاق سے دادا کا پتہ کھو جاتا ہے اور مکان ڈھونڈنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے۔ ہیرو گھر گھر خاک چھان کر بھوک پیاس سے نڈھال ہو جاتا ہے آخر آباد دادا کے گھر کے آگے ایک لیٹر بکس بنا یا گیا تھا۔ جوں ہی اسے ایک خوب صورت نئی وضع کی کوٹھی نظر آتی ہے جس کے آگے ایک لیٹر بکس لگا ہوا ہے تو وہ بے دھڑک اندر چلا جاتا ہے کوٹھی کی سجاوٹ دیکھتا ہوا کھانے کے کمرے میں جا پہنچتا ہے جہاں انواع واقسام کے کھانے میز پر چنے ہیں۔ وہ بے تکلفی سے ایک [illegible] کھانا شروع کر دیتا ہے اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک شعلہ جوالہ اندر داخل ہو کر بڑے انداز سے کہتی ہے "خوب پیٹ اپنا، کھیر پانی"۔ پہلے تو ایک الجزائری دوشیزہ سے اردو کے یہ الفاظ سن کر اور حسن جہاں سوز کا عالم دیکھ کر ہیرو گھبرا جاتا ہے لیکن جلد ہی اپنے ہیروانہ وقار کو قائم کرکے الٹا اس سے سوال کرتا ہے کہ اس کے دادا کے مکان میں کیوں آئی ہے۔ جب یہ بات کھلتی ہے کہ اس کے دادا کا نہیں بلکہ اس لڑکی کا مکان ہے اور آج اس کی سالگرہ کا دن ہے (کیا تاریخی دن ہے کہ عموماً ایسی ملاقاتیں اسی دن ہوتی ہیں) تو دونوں فلک شگاف قہقہے لگاتے ہیں۔ جن کی خوش قسمتی سے ایک درجن نوکروں میں سے کسی کو اطلاع نہیں ہوتی ظاہر ہے کہ ہیرو تقریب پر مدعو کر لیا جاتا ہے اور لڑکی کی فرمائش پر ایک گانا گاتا ہے جو اس کے باپ نے اسے سکھایا تھا۔ اتنے میں ایک شخص آکر اسے گلے سے لگا لیتا ہے یہ اس کا دادا ہے جو اس وجہ سے اسے پہچان گیا کہ یہ گانا اس نے اپنے بیٹے یعنی ہیرو کے باپ کو سکھایا تھا۔

ہیرو دادا کے ساتھ اس کے گھر چلا جاتا ہے لیکن پیار کی پھانسی دل میں لگ چکی ہے۔ ادھر الجزائری ہیروئن جس کے پردادا بھی ہندوستان سے آکر بس گئے تھے۔ اس معاملے میں کچھ پیچھے نہیں ہے چناں چہ اس سلسلے میں جو گانے علٰحدہ علٰحدہ اور مل کر گائے جاتے ہیں وہ اس خلش کا بین ثبوت ہیں۔ (اس سے زیادہ ٹھوس دلیل اور بھی کیا ہو سکتی ہے) اب وقت آگیا تھا کہ ٹریجڈی درمیان میں آئے چناں چہ وہ آجاتی ہے۔ ہوٹل کی ایک رقاصہ کی شکل میں (ٹریجڈی کو نہ جانے یہ روپ کیوں اتنا پسند ہے) اپنے ڈھیلے بدن کو چست کپڑوں میں تن تن کر یہ رقاصہ بین الاقوامی ناچ کا مظاہرہ کرتی ہے یہ ناچ انگریزی، ہندوستانی اور الجزائری فن سے مشترک ہے اس فلم کی یہ خصوصیت ہے جو سال ہا سال کی کوشش سے نہ بھلایا جا سکے گا۔ ظاہر ہے کہ رقاصہ کی نظر انتخاب ہیرو پر پڑتی ہے، جو خوب صورت لاابالی اور

بے تحاشا جاگیر کا ہونے والا مالک ہے۔ اس دوران میں چونکہ گانوں کا اسٹاک ختم ہو چکا ہے اور ہیرو ہیروئن کے پاس کرنے کو کچھ نہیں ہے۔ اس لیے ان میں عارضی طور پر غلط فہمی پیدا کرادی جاتی ہے ادھر رقاصہ ہیرو کو آہستہ آہستہ اپنی طرف مائل کر لیتی ہے کیوں کہ اس کے پاس پرانا فلمی خاندانی نسخہ یعنی شراب موجود ہے۔ اگر ہیرو کو اپنی محبوبہ کی طرف سے غلط فہمی ہو چکی ہے اس لیے وہ اس غم کو غرقِ مے ناب کرنے کی کوشش میں رقاصہ کے نزدیک آجاتا ہے۔ رقاصہ سمجھتی ہے کہ مچھلی جال میں پھنسی۔ چناں چہ وہ ہیرو کے دادا کو زہر دوا کر مار ڈالتی ہے تاکہ ساری دولت بھی ساتھ ہاتھ لگے۔ ہیرو قتل کے الزام میں پکڑا جاتا ہے اس خیال سے کہ اس نے دولت کے لالچ میں اپنے دادا کو مار ڈالا ہے۔ اب تو رقاصہ کے پاؤں[1] کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ پھر یہ دیکھ کر کہ اب تو سب کچھ ہاتھ سے نکل گیا وہ ایک دوسرے امیر شخص کی طرف رجوع ہو جاتی ہے جس نے حال ہی میں ہوٹل میں آنا شروع کیا ہے اور خود اس کی طرف کھنچ رہا ہے۔ اس کی امارت کے چند غیر معمولی واقعات سے متاثر ہو کر وہ اس کے ساتھ اس شدت سے عشق کرنے لگتی ہے کہ ایک دن یا ایک رات (یہ سین صاف نہیں اس لیے کچھ نہیں کہا جا سکتا) وہ اس امیر شخص کو قتل کے راز سے بھی آگاہ کر دیتی ہے۔ ادھر دوسری طرف ہیروئن نے رو رو کر اپنی نمبر بڑھا لیے ہیں اس عینک کے جسے وہ کبھی نہیں لگاتی (یاد رکھیے ہیروئن کبھی عینک نہیں لگاتی یہ غیر شاعرانہ حرکت وہ دوسروں کے لیے چھوڑ دیتی ہے) لیکن وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔ سوائے رونے اور گانے کے۔

اب یہ بات کھلتی ہے کہ رقاصہ کا امیر عاشق مصنوعی عاشق تھا۔ اصل وہ پولیس کا آدمی تھا جس نے رقاصہ کو جال دے کر سب کچھ کہلوا لیا اور چپکے سے ریکارڈ بھی کر لیا۔ اب کیا تھا رقاصہ گرفتار ہوئی۔ ہیرو آزاد ہو کر ہیروئن سے بغل گیر ہوا (تالیاں) کہ وہ غلط فہمی جانے کب خود بخود رفع ہو گئی تھی (سچ ہے وقت سب سے بڑا مرہم ہے) تھیٹر میں دیکھتے کیا ہیں کہ دادا چلے آرہے ہیں۔ خوشی کے مارے سب کی چیخیں نکل گئیں۔ معلوم ہوا کہ جسے رقاصہ نے زہر دے کر اور چادر میں لپیٹ کر دریا برد کر دیا تھا۔ وہ تو ان کا نوکر تھا۔ جس کو دادا کی غیر موجودگی میں ان کے کپڑے پہن کر ان کے بستر میں سونے کا شوق تھا۔ (آخر وہ اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا) دادا اس تمام عرصے میں روپوش رہے مگر کیوں؟ اس کی وجہ انھوں نے نہیں بتائی (بزرگوں کی مصلحت وہی جانیں) اب پکچر کو آگے بڑھانا فضول سا معلوم ہوتا تھا۔ اور وقت بھی پورا ہو چکا تھا۔ اس لیے یہاں فلم کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

یہ ہے اس فلم کی اسٹوری جو بین الاقوامی فلمی نمائش میں بھیجی جا رہی ہے۔ یقینی طور پر کئی ایوارڈ کی مستحق ہے۔ مصنف، ہدایت کار، کیمرہ مین کے علاوہ کاسیوسم دینے والے شخص کو بھی ضرور ایوارڈ ملنا چاہیے جس نے ہندوستانی اور الجزائری کلچر کو یوں کپڑوں میں سمویا ہے کہ وہ سمیٹے نہیں سمٹتا۔ شاعر کو ہماری سفارش کی ضرورت نہیں۔ اس کا ایک ہی گانا اس قابل ہے کہ کاغذ کو جس پر یہ گانا لکھا گیا ہے سونے میں تولا جائے یا اس ہیروئن کو جس نے یہ گانا گایا ہے (یہ دوسری چیز ذرا مہنگی پڑے گی) وہ گانا یہ ہے۔

جب پیدا کیا تو مرنا کیا
پیٹ دیا اور روٹی نہیں دی ایسا پیدا کرنا کیا

---

[1] یاد رہے کہ رقاصہ ہے۔

جب پیدا کیا تو مرنا کیا

دوسرے قابلِ ذکر اور قابلِ ایوارڈ گانے یہ ہیں۔

پینا حرام ہے تو ذرا چھپ چھپا کے پی ‌ ‌ ‌ ‌ مجھ کو بلا کے پی یا مرے گھر آ کے پی

اور

سالگرہ پارٹی رنگ لائی ہے ‌ ‌ ‌ ‌ اللہ دہائی ہے دہائی ہے

آخری گانے کی دھن کے لیے میوزک ڈائرکٹر کو جتنی بھی مبارک باد دی جائے کم ہے۔

پرلوک کمار اور گلوگ بائی نے ہیرو ہیروئن کا پارٹ بڑی ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ کبھی ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں ہوتا کہ یہ ہیرو ہیروئن نہیں ہیں۔ مس پرنتو نے ویسے تو کوئی ایک درجن ناچ ناچے ہیں لیکن ایک ناچ ناموافق پیش بھی کر کے انھوں نے فلم انڈسٹری کو ناچ نچا دیا ہے۔ اور جب سے ہی ان کے اوپر کنٹریکٹ کی بارش ہو رہی ہے امید کی جاتی ہے یہ تینوں بین الاقوامی فلمی مقابلے میں اپنا حق لے کر رہیں گے۔

آخر میں ہم ہلڑ گلہ پروڈکشنز کو مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ وہ آئندہ بھی ایسی فلمیں ہمارے تبصرے کے لیے پیش کرتے رہیں گے۔

●●

وحیدہ نسیم (کراچی)

تہذیبِ حاضر الاماں

لوگو صلائے عام ہے غیرت کا یہ نیلام ہے
تہذیب کا پیغام ہے ہر مرد اب گل فام ہے
نکلیں گھروں سے بی بیاں
تہذیبِ حاضر الاماں

اپنے بدن سے جنگ ہے خود اپنا جامہ تنگ ہے
مشرق کی جو فرہنگ ہے مغرب بھی اس پہ دنگ ہے
چپ ہیں زمین و آسماں
تہذیبِ حاضر الاماں

کپڑوں میں بھی عریاں بدن "اسکن کلر" کے پیرہن
ہیں عورتوں کے زیب تن باپ اور بھائی سب مگن
ان میں حمیت ہے کہاں
تہذیبِ حاضر الاماں

بیٹی کے تھے "بوائے فرینڈ" امی کے بھی آئے فرینڈ
"انٹی" نے بلوائے فرینڈ گھر بھر پہ ہیں چھائے فرینڈ
پیاری سہیلی تو کہاں
تہذیبِ حاضر الاماں

غیروں کے آئیں کام جو باہر رہیں ہر شام جو
نظروں سے دیں پیغام جو ہنس ہنس پلائیں جام جو
یہ ہیں بہو اور بیٹیاں
تہذیبِ حاضر الاماں

پھانسے کسی کو جال میں بیٹی جو ناچے بال میں
بابا ہوئے خوش حال ہیں میں کیوں پڑوں جنجال میں
ہو جائیں دونوں کامراں
تہذیبِ حاضر الاماں

ڈیڈی پڑے ہیں بار میں امی گھریں بازار میں
دل کس کا ہے گھر بار میں بچے پلے بیگار میں
بے منزلوں کے کارواں
تہذیبِ حاضر الاماں

کہنے کو بھی ایماں نہیں طاقوں میں بھی قرآں نہیں
سب کچھ تو ہے انساں نہیں اس درد کا درماں نہیں
یہ ناؤ ہے بے بادباں
تہذیبِ حاضر الاماں

تبدیل کعبہ ہو چکا تبدیل قبلہ ہو چکا
طاعت کا سجدہ ہو چکا دل جس کا بندہ ہو چکا
نیویارک ہے وہ آستاں
تہذیبِ حاضر الاماں

پیغام بربادی ہے یہ انعام آزادی ہے یہ
معراجِ صیادی ہے یہ ابلیس کی استادی ہے یہ
سمجھا مگر کوئی کہاں
تہذیبِ حاضر الاماں

انور سدید (لاہور)

۱۹۸۸ء میں انشائیہ اور کالم نگاری

پاکستانی ادب کا جائزہ

انشائیے :

اسے اتفاق کہیے کہ انشائیہ کو ۱۹۸۸ء میں یوں فروغ ملا کہ اس صنف ادب کی ایک کانفرنس لودھراں میں اور ایک سیمینار اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور میں منعقد ہوا۔ انشائیہ کے موضوع پر ٹیلی ویژن نے ایک مذاکرہ کرایا۔ ماہنامہ ادب دوستاں نے انشائیہ نمبر اور اوراق نے انشائیہ کی ببلوگرافی شائع کی جو ڈاکٹر بشیر سیفی نے بڑی محنت سے مرتب کی ہے۔ ڈاکٹر شفیق احمد نے بہاولپور یونیورسٹی سے انشائیہ کی ایک کتاب "انتخاب" شائع کی۔ محمد اقبال انجم کے انشائیوں کا مجموعہ "خوشبو کے قافلے" اس سال کے اوائل میں شہزاد قیصر کے انشائیہ نما "آئینہ بنے ہے پیراہن" ۲۱ دسمبر ۱۹۸۸ء کو منظر عام پر آیا۔ خیر الدین انصاری، سعید خان، بہزاد سحر، محمد ہمایوں خان، سلیم ملک، عابد صدیقی، قمر اقبال اور علی اختر، کو انشائیہ کے میدان میں ابتدائی تعارف کے بعد استحکام ملا۔ اس اجمال میں مزید یہ عرض کرنا ہے کہ اردو کے ممتاز شاعر شہزاد احمد نے ایک "درخت" کے عنوان سے ایک معرکے کا انشائیہ لکھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خیال انگیزی "پل" میں اور جمیل آذر کی نکتہ آفرینی "کیکر" "دریا سمندر" میں ظاہر ہوئے۔ اس سال متعدد اچھے انشائیے لکھے گئے۔ ان میں سے اکبر حمیدی کا "ضمیر کی مخالفت میں" اور "موڑ" ارشد میر کا "ٹوپی" اور "موڈ" حامد برگی کا "عام آدمی" اور سپہر انجم نیازی کا "قل اشاپ" اور "سوچنا" اظہر ادیب کا "گھڑا" محمد اسد اللہ کا "بخار" خان کا "سوال" اقبال انجم کا "سرگوشی" جان کاشمیری کا "تیسری شادی" امجد طفیل کا "تنہائی" رشید احمد گوریجہ کا "ضرب تفریق" کلی اختر کا "گرگٹ" خیر الدین انصاری کا "تقار" اس صنف کے اچھے اور نمائندہ انشائیے ہیں۔ سلیم آغا قزلباش کا "نام میں کیا رکھا ہے" اس موضوع کا انوکھا زاویہ ابھارتا ہے۔ سلیم آغا نے اس سال انگریزی انشائیوں کے تراجم پر مشتمل ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا عنوان مغرب کے انشائیے ہیں۔

مزاح کا ایک بڑا مقصد ہنسی یا مسکراہٹ پیدا کرنا ہے اور ہنسی کی تحریک کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء کے ادبی منظر کو دیکھیے تو پیروڈی، رعایت لفظی، ضلع جگت، پھبتی، تضحیک، بذلہ، رمز، طنز اور صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے اور پڑھنے والوں کو ہنسنے ہنسانے کا سامان فراہم کرنے کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے اور اظہار کے اس انداز کو جن لوگوں نے زیادہ استعمال کیا ان میں سید ضمیر جعفری، مجتبیٰ حسین، یوسف ناظم، ارشد میر، اقبال ساغر صدیقی، محمد کبیر خان منظر، نیاز سواتی، سرفراز شاہد، رشید احمد گوریجہ، عاصی کرنالی، سلیمان عبداللہ، مظفر بخاری، شفیقہ فرحت، ضیا الحق قاسمی، انور مسعود، دلاور فگار، محمد ظفر خان، عاصی سعید، ابن الامام شفتہ، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، مشفق خواجہ، نصر اللہ خان کے نام بہت اہم ہیں۔ ادیب ۱۹۸۸ء میں تہہ تہہ بار نظر آتے ہیں۔ راولپنڈی سے

رسالہ "اردو پنچ" حیدرآباد دکن کے رسالہ "شگوفہ" اور حیدرآباد پاکستان کے رسالہ "ظرافت" نے دو ملکوں کی آبادی میں فی کس مسکراہٹیں زیادہ سے زیادہ تقسیم کرنے کا فریضہ ادا کیا۔ اس سال کا ایک اہم واقعہ خواجہ حمید الدین شاہد کے اہتمام سے طنز و مزاح کانفرنس کا انعقاد ہے۔ ایسی قسم کی ایک کانفرنس کا انعقاد ہے۔ اسی قسم کی ایک کانفرنس نومبر ۸۸ء میں حیدرآباد دکن میں منعقد کی گئی۔

ادبی کالم نگاری:

کالم نگاری کو ابھی تک ادبی گپ شپ کا درجہ حاصل ہے اور اس سے بے پر کی اڑانے کا کام بھی لیا جا رہا ہے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ کالم کا حلقہ خالص ادبی حلقے کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے اور کالم ..... کی بات کو کالم بنتے میں دیر نہیں لگتی۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادبی کالم تو خامہ بگوش کا "سخن در سخن" ہی ہے اس کی تنقید میں جراحت بھی ہے اور شیرینی بھی ۱۹۸۸ء میں احمد ندیم قاسمی نے "رواں دواں" میں ادیب کو موضوع بنانے سے بالعموم گریز کیا۔ منو بھائی کا "گریباں" بھی سیاسی نوعیت کا ہے۔ خالصتاً ادبی کالموں میں مرزا ادیب کا "اذکار و افکار" یوسف حسن کا "قوس در قوس" ملاقی کا "ملاقی ما" رضا ہمدانی کا "قصہ خوانی گزٹ" احمد لطیف کا "سمندر" بیدار سرمدی کا "صبح شام" فیروز شاہ کا "قتل دریا" شعیب الرحمٰن کا "دیکھا ادب" تماشا کیے جا سکتے جیسے حسن رضوی، شہزاد منظر، محمد یاسین بسمل نے زیادہ تر ادبی رپورتاژ لکھنے کا فریضہ سر انجام دیا۔ مرزا ادیب کے کالموں کا مجموعہ "اذکار و افکار" کے نام سے گزشتہ سال شائع ہوا۔ انتظار حسین کے کالموں کا مجموعہ "ملاقاتیں" کی صورت میں سامنے آیا۔

حامد لطیف (بمبئی)

رہیے اب ایسی جگہ .....!

مکان کی تلاش! اور وہ بھی عروس البلاد بمبئی (آبادی ۱۰۰ لاکھ) میں؟ یہ تو بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی خشک گھاس کے بڑے سے ڈھیر میں ایک سوئی تلاش کرے!؟ ہو سکتا ہے ڈھونڈنے والا سوئی پا لینے میں کامیاب ہو جائے مگر لاکھ کوشش کرنے پر بھی یہاں مکان نہیں مل سکتا۔ اور جن کو مل جاتا ہے ان کا شمار انتہائی خوش قسمت انسانوں میں ہوتا ہے۔

بمبئی کی کل آبادی کا ایک چوتھائی سے کچھ زیادہ حصہ ہوٹلوں، گیسٹ ہاؤس، اور گیارہ ماہ کے معاہدے leave and licence پر کسی تنہا رہنے والے کے ساتھ شریک رہتا ہے۔ جس کا کرایہ چھ سو روپیہ ماہانہ سے کسی طرح کم نہیں ہوتا!

بمبئی ایک صنعتی شہر ہے۔ یہاں کا ہر آدمی تیز رفتاری میں مشینوں کو بھی مات دینے پر تلا بیٹھا ہے۔ بس ہر کسی کو ایک ہی دھن سوار ہے! کسی طرح سو کے ہزار، ہزار کے لاکھ اور اگر ہو سکے تو کسی طرح لاکھ سے کروڑ بن جائیں!! اسی کوشش میں لوگ زیادہ تر اپنی عزت، آبرو، دن کا چین اور رات کی نیند تک گنوا بیٹھتے ہیں اور نتیجہ کے طور پر ان کی تجوریاں خالی اور ڈاکٹروں، حکیموں کی جیبیں پُر ہوتی چلی جاتی ہیں اور اپنی خالی جیبیں اور تجوریاں کو پُر کرنے کی خاطر یہ انسان پہلے سے بھی زیادہ لالچی، خود غرض، دھوکہ باز اور کمینہ بن جاتا ہے!!

بھلا دیکھیے میں بھی کہاں سے کہاں جا پہنچا؟ بات ہو رہی تھی بمبئی میں رہائشی مکان تلاش کرنے کی لیکن ذرا ٹھہریے! اس سے پہلے کہ مکان کی قلت کے بارے میں اور کچھ کہا جائے، میں آپ حضرات کو بتا دوں کہ گزشتہ پانچ برسوں سے میں اپنی بیگم کے ساتھ اپنے چھوٹے سے ذاتی فلیٹ میں مقیم ہوں۔ آپ کہیں گے پھر بھلا مجھے اس سلسلے میں Running commentary دینے کی کیا ضرورت ہے؟ تو جناب عرض ہے کہ مکان کی ضرورت مجھے نہیں، میرے ایک دوست کو آپڑی جو ایک صبح بلائے ناگہانی بن کر ہم دونوں پر آپڑے!

اگر [illegible] "ہی زمان" میں تیرا . . . [illegible] کہ مرزا غالب کے گھر [illegible] اپنی غزل کا مقطع کچھ یوں کہتے [illegible]

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام؟
ایک بلائے ناگہانی اور ہے!!

لیکن چونکہ ہم شاعر نہیں ہیں، اس لیے کچھ بھی نہ کہہ سکے! اور اس سے پہلے کہ ہم بستر سے اُٹھ پاتے وہ
صاحب "السلام علیکم" کے نعرے کے ساتھ ہی جوشِ عقیدت میں ہم سے بغل گیر ہونے کے لیے ہمارے برابر
نرم گرم ہو ۔۔ تقریباً لد گئے! بہت کلبلا کر کروٹ بدلی، پہلو گرا تھے تب جا کر بستر سے چھلانگ لگائی اور صندوق سے ادھ کچلے فرش پر لیٹ گئے۔ کپڑے جھاڑ کر اٹھ کر
ہم نے بڑی کوشش کی مگر ہمارے باوجود زبان سے بے ساختہ ادا ہونے والے "لاحول ولا قوۃ" کو کسی طرح نہ روک
سکے! ان کی بیگم اپنی بھابی سے ملنے باورچی خانے میں جا گھسیں اور وہ صاحب بستر سے اٹھ کر ہم سے بہرحال کچھ
اس شدت سے بغل گیر ہوئے کہ ہم نے تو زبان سے کچھ بھی نہ کہا، البتہ ہماری بے زبان اور کمزور پسلیوں
نے "زبانِ بے زبانی" سے ایک صدائے گڑگڑاہٹ بلند کی جسے ان سنی کر کے وہ صاحب گویا ہوئے:
"ارے یار، میں بھی کوئی شیطان ہوں، جو تم لاحول پڑھ رہے ہو، اور اگر پڑھو بھی تو میں بھاگنے والوں
میں سے نہیں ہوں!"

اتنے میں ہماری بیگم حسبِ معمول تازہ اور گرما گرم چائے کا کپ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئیں اور اس
سے پہلے، کہ چائے کا وہ جام ہم تک آتا، ان صاحب نے "شکریہ بھابی" کہہ کر کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ بیگم
نے شرارت بھری نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو ساڑی کے پلو میں چھپاتے ہوئے
باورچی خانے میں جا گھسیں! اور ہم نے دل ہی دل میں چائے کی جگہ ان صاحب کے سفید خون کا گھونٹ پیتے
ہوئے کہا:

مجھ تک مری ہی بزم میں آیا نہ دورِ جام
بیگم نے کاش زہر ملایا ہو چائے میں

کپ خالی کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے بولے "یار، وہ باہر ٹیکسی کھڑی ہے، میرے پاس اس وقت صرف
سو سو کے نوٹ ہیں، ذرا ۔۔۔۔۔ اور ہم نے کوئی بات نہیں کہہ کر تکیے کے نیچے سے پرس نکالا، اور مرے مرے
قدموں سے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

سو کے نوٹ میں سے تیس روپے واپس لے کر ہم نے راہداری میں بکھرے ہوئے سامان کا جائزہ
لیا ہے، تو سر کے اُوپر کا آسمان جگہ بدل کر پیروں تلے کھسکی ہوئی زمین کی جگہ آ ٹکا۔ آپ بھی ملاحظہ
فرمائیے!!

ایک عدد تنا ہوا بستر بند گویا اگر چاہتا، تو صاحبِ بستر بند خود بھی اس کے اندر آسانی سے "بند"
ہو سکتا تھا! دو الماری سائز کے چیتے لگے ہوئے سوٹ کیس! ایک دو نالی بندوق! ایک پانی کی خالی
صراحی! ایک جہازی سائز کا طوطے کا پنجرہ، جس میں ایک بے سر کا طوطا! ہم چونکے اور ذرا قریب جا کر غور
سے دیکھا۔ تو پتہ چلا کہ حضرت نے اپنی چونچ اپنے سینے کے دبیز پروں میں چھپا رکھی ہے اور لمبا قیلولہ فرما
رہے ہیں۔ پنجرے کے قریب ہی ایک چتکبری بلی بیٹھی اپنے اگلے پنجے کو زبان سے چاٹ کر منہ پر پھیر
رہی ہے۔ اسے دیکھ کر یاد آیا کہ ہم نے بھی ابھی تک منہ نہیں دھویا!

ابھی ہم نے بلی کو بھگانے کے لیے ایک بار ہی "ہشش" کیا تھا، کہ وہ حضرت اندر سے لپک کر باہر آئے اور بولے:

"ارے ارے بھائی یہ کیا غضب کرتے ہو یار؟" میں نے زچ ہو کر کہا۔

"غضب نہیں کر رہا ہوں، اس ناہنجار بلی کو بھگا رہا ہوں"۔ بولے،

"ارے یار، یہ میری پالتو بلی ہے"۔ ہم نے کہا۔

"فالتو ہے، اسی لیے تو . . . . . ." ہماری بات کاٹ کر زور سے بولے۔

"اجی صاحب، فالتو نہیں، پالتو ہے، پالتو! اسے تب سے پالا ہے، جب یہ صرف ایک گوشت کا لوتھڑا تھی"

ہم نے جواب سن کر دل میں سوچا کہ اب ہم اس دو نالی بندوق کے بارے میں قطعی کچھ نہ پوچھیں گے۔ ورنہ کچھ بعید نہیں، یہ حضرت جواب میں فرمائیں میری پالتو بندوق ہے، اسے تب خریدا تھا، جب یہ صرف ایک چھوٹی سی پستول تھی!

سامان بہرحال کسی نہ کسی طرح گھر میں لایا گیا!

ناشتے کے دوران، اِدھر اُدھر کی گفتگو کے درمیان، جانے کس طرح پالتو جانوروں کا ذکر چھڑ گیا۔ جس پر میں نے ان سے پوچھا۔

"آپ نے بلی کیوں پالی؟" بدک کر بولے۔

"طوطا جو پال رکھا ہے" میں نے چڑ کر کہا۔

"لیکن جناب میں نے بلی پالنے کی وجہ جاننا چاہی تھی، اور آپ . . . . !"

میری بات کاٹ کر گویا ہوئے۔

"اس طوطے کی حفاظت کے لیے"! جواب سن کر ایسی بلبلاہٹ سوار ہوئی کہ جی چاہا کہہ دوں "تو پھر اس بلی کی حفاظت کے لیے ایک بل ڈاگ اور اس کی نگہداشت کے لیے ایک عدد چیتا یا شیر پال لیا ہوتا! لیکن چار کا گھونٹ ان کا لہجہ تصور کر کے پی گیا!

ایک تو اس بن بلائے مہمان کی آمد نے موڈ خراب کر دیا تھا، دوسرے ستم بالائے ستم یہ کہ ہم نے کل سے پورے آٹھ دن کی چھٹی لے رکھی تھی کہ گھر پہ رہ کر آرام کریں گے اور ایک عرصے سے نامکمل مضمون پورا کر کے ماہنامہ "شگوفہ" میں اشاعت کی غرض سے بھیج دیں گے۔ مگر وائے افسوس اور جب ہم نے مزید یہ سنا کہ یہ حضرت مکان کی تلاش میں آئے ہیں اور مزید یہ کہ ہمیں ان کو آٹھ دس دن کے اندر اندر مکان دلانا ہی پڑے گا تو نہایت بے چینی کے عالم میں ہمارے دونوں ہاتھوں کے کتے طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرتے ہوئے اڑ گئے جس طرح کم سن بچوں کے ہاتھ سے کبوتر! ———!

ہم نے گویا انھیں یہاں مکان لینے کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے کہا

"اجی صاحب، بیچ ہی اکتا دیں سے تلاش کیجیے تو ہو سکتا ہے ایک دن آپ کو حلال جانور مل سکے!"
"ناممکن!!" جواب میں اُلّو بھاتا بت انداز میں ٹھونستے ہوئے بولے "طرح طرح کی آفت طوفان!" (تو پھر آپ کو کس طرح ہو؟) ہم نے جواب میں چائے کا آخری گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا محض اتفاق!

(اور یہ بھی محض اتفاق ہی تھا کہ ہماری نظر اچانک ان کے بشرٹ کی پھولتی پچکتی جیب پر پڑی اور اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھ پاتے ایک عدد زندہ، جیتی جاگتی گلہری ان کی جیب سے برآمد ہو کر میز پر آ بیٹھی اور ہماری سمجھ سے ایک قوس کتر کتر کر کھانے لگی!)

ہائے اللہ جی چا، ہم صاحبِ گلہری سے کہیں:

تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے!

پتہ جانے کیوں؟ اس گلہری کی ہلتی ہوئی دُم دیکھ کر ہمیں اپنے دوست میر نقی میر صاحب کی یاد آ گئی۔ کیا کہا! آپ میر صاحب کو نہیں جانتے! ——— اچھا کچھ دیر کے لیے گلہری اور صاحبِ گلہری دونوں کو بھول جائیے۔ آئیے میں آپ کا تعارف میر صاحب سے کرا دوں!

ان کا پورا نام ہے جناب نقی الحسن خاں صاحب نقی جہاں آبادی حال مقیم بمبئی۔ کیوں صاحب آپ "حال مقیم بمبئی" پر چونکے کیوں! یہ میر صاحب کا مخصوص انداز تحریر ہے کہ وہ جہاں کہیں بھی ہوتے ہیں (وہ جانے کہاں کہاں "ہو" چکے ہیں) اپنے نام کے ساتھ "حال مقیم" لکھ کر اس جگہ کا نام ضرور لکھ دیتے ہیں، جہاں وہ اس وقت موجود ہوتے ہیں۔

ہندوستان اور بیرونِ ہند سے آئے ہوئے ان کے ان گنت خطوط کے جواب میں بارہا ان سے کہہ چکا ہوں کہ:

لگی ہوتی تمہارے پیچھے بھی اک دُم تو کیا ہوتا ؟
ڈبویا تم کو "ہونے" نے، "نہ ہوتے" تم تو کیا ہوتا ؟

میر صاحب دبلے پتلے (دبلے زیادہ پتلے کم) قد آور (قد زیادہ آور کم) سر پہ سیاہ رنگ کی رام پوری ٹوپی کچھ اس شدت سے "جکڑ" کر پہنتے ہیں کہ پہلی نظر میں وہ سر ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے۔ اور چشمہ جس کا ایک شیشہ ہلکے سبز رنگ کا اور عین ٹھوڑی کے درمیان سے دو برابر کے حصوں میں تقسیم "دو شاخہ" داڑھی! جس کا ایک حصہ بالکل سفید اور دوسرا بالکل سیاہ۔ خدائے سخن میر تقی میر کو اپنا جدِ امجد بتاتے ہیں اور شاید اسی بنا پر ان کے اشعار توڑ مروڑ کر اپنے نام سے پیش کر دیتے ہیں۔ ان کا تکیہ کلام ہے "گویا کہ خود بخود"! اسے بات بے بات پر دہرایا کرتے ہیں۔ چال ایسی ہے، گویا ہوا میں لات مارتے ہوئے چل رہے ہوں۔ مجھ جیسے منہ چڑھے اور بے تکلف دوست انھیں "میر حالات" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ جس پر اکثر ناراض ہو کر کہنے والے کو وہیں بھیج دینے کی "برہنہ" دھمکی دیتے رہتے ہیں (کہ آج تک اسی دھمکی کو "جامہ عمل" نہیں پہنا سکے ہیں) غرضیکہ یہ ہیں میرے بہت ہی عزیز اور بے تکلف دوست "میر نقی الحسن خاں نقی جہاں آبادی، حال مقیم بمبئی"۔

... سا شکیل گا؛ تصنیف قدرے طویل مضمون ہو گیا لیکن نہ جانے کیوں تب سے میرا بہت گہرا تعلق ہے.....
اور ان کا جملہ ہے وہ اتنا کہ اس گلہری کی دم دیکھ کر مجھے بے ساختہ میری...... یاد آگئی!

ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ حضرت اخبار بغل میں داب بیت الخلا میں داخل ہو گئے اور میں نے موقع غنیمت جان کر دفتر میں گئے P.C.O کا رخ کیا کہ میں فون کر کے میر کو اس مہمانِ ناگہانی کی آمد سے مطلع کر کے کچھ مشورہ طلب کروں، کہ اس وقت وہ کافی ہاؤس ہی میں دوستوں کے جمگھٹ میں بیٹھے میر تقی میر کے اشعار اپنے لحن سے سنا سنا کر داد وصول کر رہے ہوں گے۔ خوش قسمتی سے وہی ہوا، جیسا میں نے سوچا تھا میر فوراً فون پر آگئے میں نے کہا:

خودکشی کرنے کو تیار رہوں، جلدی آؤ!!
میں مصیبت میں گرفتار ہوں جلدی آؤ!!

بولے "ارے میاں اب ایسی بھی کیا بات ہے، گویا کہ خود بخود" میں نے کہا "تم آؤ تو سہی۔ خود ہی سمجھ جاؤ گے"
بولے، "بس آدھے گھنٹے کے اندر آرہا ہوں، گویا کہ......"
لیکن تب تک میں فون بند کر چکا تھا۔

گھر میں داخل ہوا، تو معلوم ہوا کہ مسٹر اور مسز ناگہانی ہمارے ڈبل بیڈ پر لیٹے نیند کے مزے لوٹ رہے ہیں۔
میں نے اخبار اٹھایا اور باہر نکل کر میر کے انتظار میں گھاس پر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد دیکھا، میر تیز تیز قدموں سے آ رہے ہیں۔ آتے ہی بولے:
"کیا بات ہو گئی منشی؟ تم گویا کہ خود بخود اتنے پریشان کیوں ہو؟"
میں نے انھیں وہیں باہر کھڑے کھڑے سب کچھ بتا دیا۔ سن کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولے۔
"یہ بھی کوئی بات ہے گویا کہ خود بخود؟" میں نے کہا۔
"یار میر، یہ میری جان پر بنی ہوئی ہے، اور تم کو مذاق سوجھ رہا ہے۔"
بولے "مذاق نہیں کر رہا گویا کہ خود بخود، یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے گویا کہ خود بخود"۔ میں نے پوچھا۔
"بھلا وہ کیسے؟"

دائیں ہاتھ سے بائیں طرف کی داڑھی سہلاتے ہوئے بولے
"[illegible] یہ ہے کہ تم اس مہمانِ ناگہانی کو کل صبح گھر پر ہی گویا کہ خود بخود روکے رکھو۔ اور میں گویا کہ خود بخود کل اسی وقت آ کر تم سے گویا کہ خود بخود کہوں گا کہ ابھی ابھی لکھنؤ سے گویا کہ خود بخود ایک آدمی خبر لایا ہے کہ تمہاری ساس کی گویا کہ خود بخود اچانک طبیعت خراب ہو گئی ہے اور یہ کہ تم دونوں کو اسی وقت لکھنؤ جانا ہے، گویا کہ خود بخود! اس طرح یہ مہمانِ ناگہانی فوراً ہی واپس چلے جائیں گے گویا کہ خود بخود، جہاں سے آئے تھے گویا کہ خود بخود۔ سمجھا کہ نہیں، گویا کہ خود بخود۔

سنتے ہی میں نے فرطِ مسرت سے بے قابو ہو کر میر کو گود میں اٹھا لیا اور اسی طرح گھر میں داخل ہوا۔ بیگم نے

جیسے میں کسی طرح اٹھائے ہوئے دیکھا تو سمجھیں کہ شاید انھیں کچھ ہو گیا ہے۔ بولیں ہائے اللہ یہ میر بھائی کو کیا ہو گیا۔ بھائی صاحب میری طرف سے مسکراتے ہوئے بولے "گویا کہ خود بخود کچھ نہیں بھابی، تمہیں خدا بھائی بات پر گویا کہ خود بخود پریشان ہو جایا کرتے ہیں' اور دوسروں کو بھی گویا کہ خود بخود پریشان کر دیتے ہیں۔" بیگم نے مسکرا کر اطمینان کا سانس لیا اور بولیں۔

"میں سمجھی۔ آپ بیٹھیے میں ناشتہ لے کر آتی ہوں۔"

ناشتے کے دوران خاموشی رہی۔ اچانک میں نے میر سے کہا۔

"ایک شعر سنو۔" بولے

"اب تم شعر بھی گویا کہ خود بخود کہنے لگے ہو؟" میں نے کہا۔

"تمہاری صحبت کا گویا کہ خود بخود اثر ہے، سنو،"

"سناؤ" میر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا۔

"عرض کیا ہے"؛

بن بلایا آج جیسا میہماں کوئی نہ ہو،
رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو!

میر کا قہقہہ چند لمحوں تک کمرے کی محدود فضا میں ارتعاش پیدا کرتا رہا۔

●●

عادل اختر عادل

مُلّا بے داغ

(دنیا پرست مُلّاؤں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت)

مُلّا عجیب و غریب مخلوق ہے۔ عدنان بن خیالی کا خیال ہے کہ وہ عجیب زیادہ ہوتا ہے لیکن غریب بالکل نہیں۔ منبر اس کی مسند ہے۔ عمامہ اس کی فضیلت کا نشان، عبادت گاہیں اس کی جائے پناہ ہیں۔ وہیں سے وہ عید کا چاند دیکھتا ہے۔ اور وہیں سے وہ اپنے حلوے مانڈے کی دوامی کے لیے دو گروہوں کو لڑاتا ہے حکومت کرنے کے لیے اس کے پاس سیدھے سادے لوگوں کا جتھہ ہے۔ یہ غریب لوگ آپس میں کٹتے مرتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں لیکن صاحبِ عمامہ و عبا پر آنچ آنے نہیں دیتے۔ یہ جلسے جلوس، یہ محفلیں، یہ ثواب و عذاب کا بھرم سب اسی کے دم سے ہے۔ غرض کہ وہ ایک ایسی شخصیت ہے جس کے اشارے پر ہم جیسے بہت سے بے بہرے کے لوگ ناچتے رہتے ہیں اور فرصت اتنی بھی نہیں ملتی کہ دم مار سکیں۔

وہ بھی کیا دن تھے جب مُلّا بے داغ ہمارے ساتھ تھے۔ ہمارے بیچ وہ ایسے تھے جیسے تاروں کے بیچ چاند۔ بے چارے اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن ان کی یادیں ہمارے ساتھ ہیں۔ کبھی کبھی دل کے کناروں پر ان کی یادیں ہتوڑے برساتی ہیں اور ہم بے حال ہو جاتے ہیں۔ آج انھیں یادوں کو زندہ کرنے کا خیال آیا اور ہم یہ مضمون لکھنے پر مجبور ہو گئے۔

ان کا گھر میرے پڑوس میں تھا۔ میاں خیراتی اور بھائی افغانی بھی پاس ہی رہتے تھے۔ یہ دونوں اپنے گھر میں کم اور ان کے گھر میں زیادہ رہتے۔ میاں خیراتی مُلّاجی کے رابطہ سکریٹری اور بھائی افغانی پروپگنڈہ سکریٹری تھے۔ وقت ملتا تو پاس کی مسجد میں جا کر اذان دے دیتے۔ ان کی محفل میں میرا بھی گزر تھا۔ صحافی ہونے کے ناتے وہ اکثر مجھے بلا کر اپنے گزرے ہوئے واقعات سناتے کوئی اخباری یا ہنگامی بیان شائع کرنا ہوتا تو مجھ سے کہتے۔ میں فوراً ان کے حکم کی تعمیل کرتا مزہ اٹھاتا۔ دعوتیں جو ان کے ساتھ اڑاتا تھا اس کا مزہ الگ تھا۔

مُلّا بے داغ بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے۔ انھیں کسی کام کو سیدھے سیدھے کرنے میں کبھی مزہ نہیں آیا۔ ان کو چاندنی کا بڑا خیال تھا اور اس موضوع کو زندہ رکھنے کے لیے وہ ہر کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے جو ان کے بس کے باہر تھا۔ ایک دن بڑے مزے کا حادثہ پیش آیا۔ ان سے کسی من چلے نے عید کا چاند ۲۸ تاریخ کو نکالنے کی فرمائش کر دی۔ روزے بہت گراں گزر رہے تھے۔ انھوں نے پہلے بہت حیلے بہانے کیے لیکن بعد میں نیم راضی ہو گئے بعد

بدلنے کے لیے بولے کوئی لطیفہ سناؤ۔ ہو سکتا ہے ترکیب کام کر جائے۔ میاں خیراتی نے بڑی تیزی سے دو چار لطیفے سنا ڈالے بھائی افغانی نے افغانستان سے لے کر قبرستان تک کے موضوع پر کئی لطیفے سنا دیئے لیکن ملّاجی پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ میری طرف دیکھ کر اشارہ کیا تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے حال پر نظر رکھتے ہوئے ایک لطیفہ سنایا۔ وہ آپ بھی سن لیں: "ایک صاحب لکھنؤ کی تپتی دھوپ میں گرم اونی لانگ کوٹ پہنے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ راستے میں انھیں دیکھ دیکھ کر لوگوں کی نبض تیز ہو رہی تھی اور پسینے چھوٹ رہے تھے۔ ایسے میں ایک بھلے مانس نے ہمت کر کے ان سے پوچھ ہی لیا۔ کیوں! جناب ایسی شدید گرمی میں یہ لمبا اونی کوٹ؟ وہ صاحب ٹھٹھرتے ہوئے بولے 'عجیب احمق آدمی ہو۔ پتہ نہیں ماسکو میں برف پڑ رہی ہے'۔"

یہ لطیفہ سن کر ملّاجی اچھل پڑے اور کہا! چاند ... آگیا۔

میاں خیراتی ہڑبڑا گئے اور کہا 'اعلان کروں' ابھی وقت ہے۔ چونکہ میں نے ملّاجی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ ۲۸ تاریخ کو چاند کیسے نظر آگیا۔ وہ بولے سب نظر آگیا۔ یہاں نہ سہی ماسکو میں اور ماسکو میں نہ سہی تاشقند میں۔

ملّاجی کا حکم ہو جائے اور اخبار میں بیان دے دو۔ میاں خیراتی سے بھی کہا 'اعلان کر دو محلے میں کہ چاند نظر آگیا ہے اور کل عید ہے۔' یہ خبر سنتے ہی محلہ میں شادیانے بجنے لگے اور دوسرے دن چھوٹے بڑے امیر غریب سب نے خوشی خوشی عید منائی۔ ملّاجی اپنے میں پوری ایک کائنات تھے۔ انھیں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ گھر کے خرچ سے بے پرواہ تھے۔ ٹپ ٹاپ بلڈرس کی طرف سے ہر مہینہ کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی۔ مٹھامل حلوائی ان کے دوست اور طبیعت آشنا تھے۔ ہر مہینے کی تو چندی کو ڈھیر مٹھائی ملّاجی کے یہاں آنا زندگی کے معمول میں سے تھا۔ وہ بس اس بات پر خوش تھے کہ ملّاجی نے جب چاہا مسلمانوں کو آپس میں لڑوا دیا لیکن ہندو مسلم فساد نہ ہونے دیا۔ ہاں داداموجی سے بھی ان کے تعلقات بحال تھے لیکن وہ وقت پڑنے پر ہی مدد کے لیے حاضر ہوتا۔ سچ پوچھو تو ان کے تعلقات سب سے زیادہ اچھے ٹپ ٹاپ بلڈرس سے تھے۔ ابھی ۵ سال پہلے جب ان کے یہاں کسی کی موت واقع ہوئی تھی تو ملّاجی نے ہی نماز وحشت پڑھی تھی اور اس وقت تک سجدے سے سر نہیں اٹھایا جب تک کہ ۲۵ ہزار روپیہ مردے کا چڑھاوا نہ طے پایا۔

ہمارے ملّاجی وعظ کے بہت شوقین تھے۔ جہاں جاتے بڑے اہتمام سے جاتے۔ میاں خیراتی، میں اور بھائی افغانی ضرور ساتھ ہوتے۔ شیر کے ساتھ ہم لوگ بھی شکار میں حصہ دار ہو جاتے۔ یہ آنا جانا آئے دن کا تھا لیکن ایک بار تو ملّاجی نے کمال کر دیا۔ مجلس ٹھاٹ کی پڑھی۔ بیان میں سوکھی روٹیوں اور پانی کا ذکر تھا۔ تقریر کچھ ایسی جادو بھری تھی کہ خود ملّاجی اپنے ہوش کھو بیٹھے۔ ہوش آیا تو اپنے آپ کو بستر پر پایا۔ واہ واہ کی گونج اب بھی ان کے کانوں میں پڑ رہی تھی لیکن سماں بدل گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں ملّاجی بالکل ٹھیک ہو گئے اور جب کھانا دسترخوان پر لگا تو بلا تکلف کھانے بیٹھ گئے۔ دسترخوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ مرغن کھانوں اور بریانی کی خوشبو سے دماغ تر ہوا جا رہا تھا، لیکن ملّاجی کے حساب سے ایک تاب میں فرالگی کی تہ کا کم ... میٹھے میں شاہی ٹکڑا غائب تھا۔ ملّاجی اپنی حسِ ذائقہ نہ دبا سکے، برس پڑے۔ یہ کیسے منتظمین ہیں اور یہ کیسے بانی مجلس ہیں جنھیں

کھانوں میں تری کا بھی خیال نہیں رہتا۔ اسے بھائی میں اتنی تعریف کرتا ہوں، گلا سوکھ جاتا ہے۔ کچھ تو تری نصیب ہو کہ خشکی دور ہو سکے۔ بھائی افغانی نے آہستہ سے کہا! مُلّاجی تری تو سب کھانوں میں ایک انچ سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے بھی بوکھلاہٹ میں مُلّاجی کو یاد دلا دیا۔ وہ تو ثرید وہ سوکھی روٹی اور وہ آپ کیا ہوئے۔ انھوں نے میرے مزاج کی ایک پل بھی گوارا نہیں کیا اور برس پڑے۔ تمہیں اب تک میری محبت کا اندازہ نہیں، بڑے احمق ہو۔ بعد میں کسی طرح بے دلی سے [illegible] لیکن پھر کبھی دوبارہ اس گاؤں میں نہیں گئے۔

میں اور بھائی افغانی [illegible] ایک ہفتہ ان کے گھر نہیں گئے۔ [illegible] میں ڈوبتے دیکھا نہ گیا۔ ادارادہ تھا کہ اب دوبارہ ان کے گھر کبھی نہ جائیں گے لیکن اُدھر کب قرار تھا۔ بے تاب ہو کر ایک دن بلا لیا آب دیدہ ہو کر کہنے لگے تم لوگوں کے بغیر جینے میں کیا مزا! اس دنیا میں جب تک کوئی کرتب نہ دکھاؤ تماشہ نہیں ہوتا۔ ورنہ اس محلے میں ملا بساطی، قطب الدین برساتی، میں عینی سبھی موجود ہیں لیکن ان کی کون سنتا ہے۔ ہمیشہ بت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ ملّاجی کی باتوں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ بھائی افغانی اور میں ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے۔

ملّا بے دماغ کی یادیں ہمارے دلوں میں اتنی زیادہ پیوست ہو چکی ہیں کہ اگر لکھنے بیٹھیں تو امیر حمزہ کی داستان ہو جائے لیکن فرصت کم تھی اور دوسری طرف قاری بھی جلدی میں ہیں۔ وہ بھی میری طرح ملّا بے دماغ سے کسی نہ کسی رشتے سے جڑے ہوئے ہیں۔ نمک خواری اور شرم و حیا انھیں کیا ندے ہوئے ہے۔ وہ بھی میری طرح سب کچھ سہہ سکتے ہیں لیکن ملّا بے دماغ کی برائی بالکل نہیں برداشت کر سکتے۔

●●

معصومہ بیگم
(نسیم سحر)
ریسرچ اسکالر عثمانیہ یونیورسٹی

ماڈرن مشاطہ

ہماری زندگی میں بہت ساری چیزیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں ان میں سے ایک شخصیت مشاطہ کی بھی ہوتی ہے جس سے ہم صدیوں سے متعارف اور مستفید ہوتے آرہے ہیں۔ موجودہ دور ڈسکو کا دور ہے جہاں اور چیزوں میں تبدیلی ہوئی ہے وہیں مشاطہ بھی آپنا حلیہ بدل لیا ہے اور قدیم سے جدید ترین بن گئی ہے۔ آج سے تقریباً نصف صدی پہلے کا تصور کیجیے تو کرتا اور ساری میں ملبوس سر پر پلو ڈالے ہوئے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نظر آئے گی جو اکثر ناخواندہ ہوا کرتی تھی۔ اس کا ایک خاص امتیازی نشان 'پان بٹوا' ہوا کرتا تھا اور وہ چادر اوڑھ کر نکلا کرتی تھی۔ جب وہ کسی کے گھر جاتی تو ایک خاص انداز سے آداب بجالاتی اور پھر فرش پر بیٹھ کر صاحبِ خانہ سے کہتی۔ "اوئی بی، ایک چائے تو پلاؤ نا!" جب صاحبِ خانہ بی مشاطہ کے لیے چائے تیار کرنے کو اٹھتیں تو وہ پھر دبی آواز میں بولتی "دیکھو بی! میں منہ اندھیرے گھر سے نکلی تھی۔ ناشتہ واشتہ بھی نئیں کری۔ اپنے لوگاں کھالیے کیا؟" صاحبِ خانہ کہتیں "نہیں خالہ خالی چائے مت پیو۔ تھوڑا سا ناشتہ بھی کرلو۔ جب مشاطہ ناشتہ اور چائے سے فارغ ہو کر پان کا بٹوا نکال کر کہتی۔ "ائی بی! میں پنکی لانا بھول گئی۔ ذرا پان کوٹ کو دے او نا!" اس کے بعد صاحبِ خانہ کے صبر کے امتحان کا اختتام ہوتا اور بی مشاطہ اپنے موضوع کی طرف آتی۔ "دیکھو بی! میں بی پاشا کے واسطے ایک اچھے لڑکے کا رشتہ لائیوں! لڑکے والے بھوت کھاتے پیتے ہیں۔ لڑکے کا کھیت ہے۔ گھر میں گائے بکری بھی ہے دہی دودھ کی فکر نچ نہیں دیکھو!" یہ تو ہوئی لڑکی والوں کی بات۔ جب وہ لڑکے کے گھر جاتی تو لڑکی کی تعریف میں زمین کے قلابے آسمان سے اور آسمان کے قلابے زمین سے ملادیتی۔ اس کا اثر یہ ہوتا کہ دونوں فریق رشتہ دار بن جاتے۔ رشتے میں منسلک ہونے کی مسرت میں فریقین اس کو ساڑی، کرتا، چوڑیاں وغیرہ سے سرفراز کرتے ـــــ اور وہ ان چیزوں کو لے کر دعائیں دیتی گھر لوٹتی۔ لیکن موجودہ زمانے میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشاطائیں اپنے فرائضِ منصبی فراموش کر بیٹھی ہیں اور اس جملے پر عمل پیرا ہیں:

"اے رشتہ جڑوانے والو تم ترقی نہ کروگے تو مٹ جاؤگے اور تمھاری داستاں تک نہ ہوگی شادی خانوں میں!" آج کی مشاطہ کا حلیہ دیکھیے تو یہ مصرعہ آپ کی زبان پہ بے ساختہ آجائے گا:

عجب تیری قدرت عجب تیرے کھیل

کیوں کہ آج کی مشاطہ کا تعلق فیشن اور بیوٹی کا سمیٹکس سے بھی ہے۔ چناں چہ جو بھی نئے ڈزائن کا لباس نکلتا ہے وہ سب سے پہلے زیب تن کر لیتی ہے۔ جب وہ کسی لڑکے کا رشتہ لے کر جاتی ہے تو وہ خود پہلے لڑکی سے انٹرویو لیتی ہے۔ انٹرویو سے پہلے وہ گھر کا جائزہ لیتی ہے کہ گھر میں صوفہ سیٹ ہے یا نہیں، کلر ٹی وی، وی سی آر، فریج، الماری اور دیگر گھریلو سامان ہیں یا نہیں۔ ان کے علاوہ مشاطہ کی نظر بنک بیالنس پر بھی رہتی ہے جب وہ دیکھ لیتی ہے کہ یہاں سے اچھی آمدنی ہو سکتی ہے تو وہ لڑکی سے انٹرویو لیتی ہے۔ انٹرویو میں وہ پہلا سوال کرتی ہے "تم کون سی زبان میں جواب دینا پسند کروگی مجھے تو انٹرنیشنل لنگویج انگلش پسند ہے!" گویا اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مشاطہ کے علاوہ لڑکی کو بھی اپنی مادری زبان پسند نہیں ہے۔ اب وہ دوسرے سوالات کرتی ہے۔ تمھارا نام کیا ہے؟ تعلیم کہاں تک پائی ہو؟ تمھارا پسندیدہ ہیرو کون ہے؟ تمھاری پسندیدہ ہیروئن کون سی ہے۔ تم ایک مہینے میں کتنی فلمیں دیکھتی ہو۔ کون سے بیوٹی پارلر سے اپنے ہیر سیٹ کرواتی ہو اور شادی کے بعد لڑکے کی ماں بہنوں کے ساتھ رہنے کو ترجیح دوگی یا لڑکے کے ساتھ علحیدہ رہنا پسند کروگی۔ تم کیسے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہو وغیرہ۔

جب لڑکی سے انٹرویو ختم کر لیتی ہے تو ماں، باپ سے بجائے لڑکی کی نام نویسی کے جہیز کی فہرست اور ان کا بینک بیلنس معلوم کر لیتی ہے تاکہ وہ لڑکے والوں کو یہ اطمینان دلا سکے کہ شادی کے بعد لڑکے والوں کو کوئی مصیبت دپریشانی نہیں ہوگی اور وقفہ وقفہ سے لڑکے کو بوقت ضرورت پیسے مل جایا کریں گے۔ اب یہ بھی سن لیجیے کہ آپ اس مشاطہ کی خاطر تواضع اپنی مرضی سے نہیں کر سکتے بلکہ مشاطہ کی پسند پوچھنی پڑتی ہے کہ وہ کیا لینا پسند کرتی ہے۔ ٹھنڈا یا گرم یا کوئی اور چیز؟ غرض مشاطہ کی تواضع کے لیے خاصہ انتظام کرنا پڑتا ہے اور جب وہ شادی طے کرا دیتی ہے تو اس کے بدلے میں جہیز کا دس فی صد کمیشن معاوضہ کے طور پر وصول کر لیتی ہے۔ مشاطہ کی اس ترقی کو دیکھ کر ہماری زبان پہ یہ مصرعہ بے ساختہ آجاتا ہے:

نہ تراشے تک تو پتھر تھے، جو تراشے تو خدا ٹھہرے

خیر یہاں تک تو خیر گزرتی ہے لیکن مشاطہ کی خاص خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ قدیم زمانے کی مشاطہ کی طرح ایک ہی اسم نویسی یا ایک ہی لڑکے کیلیے ایک ہی لڑکی والوں کے جواب کا انتظار نہیں کرتی بلکہ ماڈرن مشاطہ اصل اسم نویسی، جو لڑکے والے اسے دیتے ہیں وہ اسے اپنے پاس ہی رکھتی ہے اور اس کی فوٹو کاپی کروا کر چار یا پانچ لڑکی والوں کو دے دیتی ہے۔ ایک ایسی ہی مشاطہ سے ہم نے سوال کیا کہ "اسے یہ کون سا طریقہ ہے؟" تو اس نے جواب دیا کہ "وقت کی قدر کرو اگر ہم وقت کی قدر نہیں

کریں گے تو ہم کھائیں گے کیا۔ ہمارا کاروبار کیسے چلے گا۔ اس لیے ہم ایک لڑکی کے لیے چار پانچ لڑکیوں کا انتخاب کر لیتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک لڑکی تو لڑکے کی ماں بہنوں کی پسند پر اترے گی اور ہمارا کام تیزی سے چلتا رہے گا۔" ہم نے جب یہ سنا تو ایک چٹکلا یوں ہی چھوڑ دیا: "فرض کرو چاروں لڑکی والے اسی ایک لڑکے کو اپنی لڑکی دینے کے لیے راضی ہو گئے تو؟" مشاطہ نے فوراً جواب دیا۔ "ہم ایک ہی لڑکے سے چار لڑکیوں کی نسبت جوڑ دیں گے تو پھر ہمارا فن، فن کہاں رہے گا؟ اور ہمارے فن کی قدر نہیں رہے گی۔ لوگ ہمیں صلواتیں سنائیں گے۔ اس وقت ہمارے متقدمین کی روحیں کہہ اٹھیں گی:

حسن تو سبھی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اداریہ

متحدہ عرب امارات کے اہم شہروں دوبئی، شارجہ اور العین میں ۱۲ اور ۱۳ اکتوبر کو بین الاقوامی
"مشاعرۂ زندہ دلان" کا انعقاد عمل میں آرہا ہے جس میں ہندوپاک کے علاوہ عرب ممالک کے اہم مزاح نگار اور طنز و مزاح کے
شاعر شرکت کریں گے۔ ڈاکٹر اطہر زیدی نے گزشتہ سال جون کے مہینے میں مسرت و شگفتگی کی تحریک پر متحدہ امارات
میں پہلی بار اس نوعیت کے منفرد اور پرلطف مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا جس کو دوبئی اور شارجہ کے باذوق سامعین
نے بے حد پسند کیا تھا۔ یہ مشاعرے امارات کے کامیاب ترین مشاعرے ثابت ہوئے۔ جن کے ویڈیو کیسٹ
ساری دنیا میں بصد شوق دیکھے جا رہے ہیں۔ یقین ہے کہ اس بار بھی امارات میں منعقد ہونے والے مزاحیہ مشاعرے
طنز و مزاح کے فروغ کا اہم ذریعہ بنیں گے گزشتہ سال کا مشاعرہ دلاور فگار کے اعزاز میں رکھا گیا تھا جبکہ
اس بار دنیائے ظرافت کی بزرگ اور نامور شخصیت ضمیر جعفری کے اعزاز میں یہ محفلیں برپا ہو رہی ہیں۔ جناب
ضمیر جعفری نے طنز و مزاح کے لیے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ان کے مقابل اس طرح کا اعزاز
ایک حقیر نذرانۂ عقیدت ہے۔ تاہم ڈاکٹر اطہر زیدی اور ان کے رفقا کے اس اقدام کو بہ نظر استحسان
دیکھا جائے گا کہ ان حضرات نے بین الاقوامی مزاحیہ مشاعروں کو نامور شخصیتوں سے منسوب کرنے کی ایک
طرح ڈالی ہے۔ اس مشاعرے سے ہماری نیک تمنائیں وابستہ ہیں۔

★ زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب اس سال ۳ اور ۴ نومبر ۱۹۸۹ء کو منعقد ہوں گی۔ ان تقاریب
کی تیاریوں کا آغاز ہو چکا ہے۔ ان تقاریب میں پاکستانی مزاح نگاروں کی شرکت کی بھی توقع ہے۔

زندہ دلانِ حیدرآباد کے صدر اور میر کارواں جناب نریندر لوتھر پچھلے تین ماہ سے علیل تھے۔ دہلی کے
انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں زیر علاج رہے اور اب صحت یاب ہو کر حیدرآباد واپس ہو چکے ہیں۔ ان کے
بغیر حیدرآباد کی محفلیں اداس اداس تھیں ـــــ خدا سے دعا ہے کہ انہیں صحتِ کلی حاصل ہو اور پہلے کی طرح ہشاش
بشاش زندہ دلوں کی رہنمائی کرتے رہیں۔

-٥-

"کھیتی ہے میرا کام"
آزاد بھارت میں ایسے اقدامات کیے گئے
ہیں جن سے کاشتکار کو اس کا مناسب
حق مل سکے
• بہتر قسم کے بیج، آبپاشی و بجلی کی بہتر
سہولیات
کیمیاوی کھاد، جراثیم کش دوائیں سبھی
نرخوں پر دستیاب۔
پیداوار کے لیے وقت پر قرضے اور بہتر قیمت
کو یقینی بنایا گیا۔
کسانوں نے ان سہولیات کا بھرپور استعمال
کیا۔
• سبز انقلاب لانے میں محنت مشقت اور
تکنالوجی
آج بھارت میں غلہ کی پیداوار 17 کروڑ ٹن تک
پہنچ گئی ہے۔ یعنی 1947ء کی پیداوار سے
12 کروڑ ٹن زیادہ
منگا رام کو اپنے پیشے پر ناز ہے۔
• یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو ملک کو خوراک مہیا
کرتا ہے۔
جس سے اسے اچھی آمدنی ہوتی ہے۔
• وہ دور بیت گیا جب زراعت ایک ٹھہرا ہوا
پیشہ
یا گھاٹے کا سودا ہوا کرتا تھا۔
یہ ہم سب کے لئے ایک قابلِ فخر پیش رفت ہے
davp 89/170

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

مدیر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

جلد: ۲۲
شمارہ: ۹

ستمبر ۱۹۸۹ء

قیمت فی پرچہ ۵ روپے
زرِ سالانہ ۵۰ روپے بیرونی ممالک ۱۵۰ روپے

خط و کتابت: شگوفہ ۳۱-۱ معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱
فون آفس: 557716 رہائش: 521064

سب قواموں کا بادشاہ ہے یہ
کیف و لذت کی انتہا ہے یہ
کشمیری قوام
تیار کنندگان:-
پورن داس، رنچھوڑ داس اینڈ سنس
کاروان، حیدرآباد

اس تھیلی کے چٹے بٹے

(فہرست)

(ھیانی گولیس) سفرنامۂ امریکہ

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

پھوڑن (منظومات)

ترقی اردو بیورو کی اہم سرگرمیاں

1- علمی کتابوں کی اشاعت (600) کتابیں شائع ہو چکی ہیں

2- اردو انسائیکلوپیڈیا (12 جلدوں کے مسودے تیار)

3- اردو لغت برائے طلباء (شائع ہو چکی ہے)

4- انگلش اردو ڈکشنری (پانچ جلدوں کے مسودے تیار)

5- اردو اردو ڈکشنری (ایک جلد کا مسودہ تیار)

6- اصطلاحات سازی (10 فرہنگیں شائع ہو چکی ہیں)

7- اردو کتابوں کی ببلوگرافی

8- ترجمے مراکز خوشنویسی (36 مراکز)

9- تحقیقی مجلہ

10- علمی و ادبی انجمنوں کو گرانٹ

11- مصنفین کی کتابوں کی خرید اسکیم

12- اردو دنیا (10 شمارے شائع ہو چکے ہیں)

13- اردو ٹائپ اور شارٹ ہینڈ ٹریننگ کے مراکز

14- اردو کمپیوٹر (وضع کر لیا گیا ہے)

15- ریاستی اردو اکیڈمیوں سے رابطہ

16- کتابوں کی فروخت و نمائش

17- مراسلاتی کورس

18- اردو ٹیلی پرنٹر

19- جنوبی ہند کے لیے بیورو کی ایک شاخ حیدرآباد میں قائم کی گئی ہے۔ اردو میں آندھرا پردیش میں کالج کی نصابی علمی کتابوں کی تیاری کا کام بھی شروع کر دیا گیا ہے اور اب تک چار نصابی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

علمی اصطلاحات کی شائع شدہ فرہنگیں

1- فرہنگ ادبی اصطلاحات

2- فرہنگ اصطلاحات فلسفہ تعلیم اور نفسیات

3- فرہنگ اصطلاحات انسانیات

4- فرہنگ اصطلاحات کیمیا

5- فرہنگ اصطلاحات حیوانیات

6- فرہنگ اصطلاحات لسانیات

7- فرہنگ اصطلاحات ریاضیات

8- فرہنگ اصطلاحات معاشیات

9- فرہنگ اصطلاحات سیاسیات

10- فرہنگ اصطلاحات نباتات

شعبہ فروخت و نمائش:

ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک 1، آر کے پورم، نئی دہلی 110066

یوسف ناظم

ہونا
پیدا
ارادہ
دریافت
امریکہ
کرنے
کا

جناب یوسف ناظم پچھلے سال قلب و دل کے آپریشن کے لئے امریکہ گئے تھے۔ دل کا علاج تو ہوا لیکن 'سفرنامہ' کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ چنانچہ ۱۴ قسطوں پر مشتمل ایک دلچسپ سفرنامہ تیار ہوگیا جن کی دو قسطیں قبل ازیں 'شگوفہ' میں شائع ہوچکی ہیں۔ باقی قسطیں سلسلہ وار اس شمارہ سے 'شگوفہ' میں شائع ہوا کریں گی۔
پہلی قسط نذرِ قارئین ہے ——— (ادارہ)

کہتے ہیں کہ امریکہ، کولمبس نے دریافت کیا تھا۔ اور وہ بھی غلطی سے۔ دراصل وہ ہندوستان دریافت کرنے نکلا تھا لیکن اُلٹی راہ پر چل پڑا، جس کی وجہ سے وہ امریکہ جا پہنچا۔ اس غلطی کے کئی دور رس نتیجے نکلے جن کا خمیازہ آج تک ساری دُنیا بھگت رہی ہے۔ اگر کولمبس غلط راہ اختیار نہ کرتا تو ہندوستان دریافت ہوجاتا، اور آج امریکہ کی بجائے ہندوستان دنیا کا امیر ترین ملک بن جاتا۔ جس کا فائدہ ظاہر ہے ہمیں بھی ہوتا کولمبس کی غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دو قسم کے ہندوستانی وجود میں آگئے۔ ایک 'لال ہندوستانی' جو امریکہ میں ہیں اور دوسرے کالے ہندوستانی جو ہندوستان میں ہیں۔ کولمبس کی غلطی کی تقلید، بہت سے کالے ہندوستانیوں نے بھی کی اور اب بھی کرتے جارہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لاکھوں ہندوستانی امریکہ ہجرت کر گئے ہیں اور وہاں آباد ہیں جبکہ اُن کے خاندان ہندوستان میں برباد ہیں لیکن امریکہ میں بس جانے کے باوجود بھی وہ لال نہیں بن سکے، کالے کے کالے ہی رہے۔ امریکہ کے لال ہندوستانی وہاں محفوظ علاقوں میں بہت سنبھال کر رکھے جاتے ہیں اور کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔

کئی مؤرخ اس رائے سے متفق نہیں کہ کولمبس نے امریکہ دریافت کیا تھا۔ آسکر وائیلڈ کا کہنا ہے کہ بلاشبہ امریکہ، کولمبس سے پہلے کئی بار دریافت کیا جاچکا تھا لیکن مصلحتاً ہر بار اس انکشاف کو چھپا لیا گیا اور کسی کو کوئی خبر نہ ہوئی۔

اس اتفاق [illegible] کی وجہ سے ہمارے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ ہم خود امریکہ [illegible] اسپرٹ میں پڑھالکھا بات پر کیوں اعتبار کریں۔ آہستہ آہستہ یہ خیال [illegible] بن گیا اور پھر ارادہ۔ جب کوئی [illegible] اور ارادہ [illegible] اختیار کر لیتا ہے تو [illegible] کسی نہ کسی طرح پیدا ہو ہی جاتی ہے [illegible] ہماری [illegible] ہو کر رہی [illegible] ویسے طریقے سے کہ [illegible] نہیں [illegible] ہم اسے [illegible] قسمت کہیں یا خوش قسمتی!

بات دراصل یوں ہوئی کہ امریکہ کو نہ دیکھ پانے کے غم نے ہمارے دل پر اتنا اثر ڈالا کہ اس نے ایک [illegible] (WORK TO RULE) کے تحت کام کی رفتار سست کر دی۔ ویسے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ اُس کا یہ کہنا تھا بلکہ [illegible] تھی کہ میں تو کام تندہی سے اور پورے دل کے ساتھ کرتا ہوں لیکن آپ کی رگیں کچھ تنگ ہو گئی ہیں جس کی وجہ سے خون اچھی طرح گردش نہیں کر پاتا۔ نتیجتاً مجھے اور بھی شدت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ آپ کو شاید یاد ہوگا کہ مرزا غالب کو بھی ایسی بیماری لاحق ہو گئی تھی تو انھوں نے طعنہ دیا تھا ؎

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

غالب کا اس طرح کہنا اُس دم کٹی لومڑی کی بات یاد دلاتا ہے جس نے دُم کے خلاف بُرا بھلا کہہ کر اپنی ساری برادری کو دُم کٹا دینے کا مشورہ دیا تھا۔ ہمارے خیال میں خون کا آنکھ سے ٹپکنا بجائے خود ایک خطرناک بیماری ہے جس سے انسان اندھا ہو سکتا ہے۔ بلکہ موت کا خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ ہم رگوں میں خون کی رفتار کی کمی کو اُس کے آنکھ سے لیک (LEAK) ہونے پر ترجیح دیتے ہیں۔ ڈاکٹروں کا بھی یہی خیال تھا کہ اس بیماری کا علاج کروا لینا چاہیئے کیوں کہ خون کو اگر ایک بار سست رفتاری کی عادت پڑ جائے تو وہ آہستہ آہستہ گردش بند بھی کر سکتا ہے اور اس کے نتائج خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ہماری بیماری کی علامت یہ تھی کہ ہم اکثر جلدی تھک جایا کرتے تھے۔ [illegible] لگاتار کام کرنے یا پانچ میل پیدل چلنے یا پھر قطب مینار کی سیڑھیاں چڑھنے پر ہمیں تکان محسوس ہونے لگتی۔ سانس بھی [illegible] پھول جاتی تھی اور بائیں بازو میں ہلکا سا درد بھی ہونے لگتا۔ ہمیں وہ زمانہ بھی یاد ہے جب بغیر کام یا سیر کئے چین نہ آتا تھا۔ گھر کی دس سیڑھیاں چڑھنے پر ہمیں کوئی تکان محسوس نہ ہوتی تھی۔ جب ان معمولات میں فرق آیا تو ہمیں کچھ تشویش ہوئی۔ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ [illegible] آپ کے سارے شکوک و شبہات دور کر کے آپ کو کسی نہ کسی بیماری کے مریض ہونے کا یقین دلا سکتے ہیں ــــــ چنانچہ ڈاکٹروں کے بار بار اصرار پر ہمیں بلکہ سب کو یقین ہو گیا کہ ہمیں واقعی کوئی خطرناک قسم کی بیماری ہے ـــــــــــ اور کثرت رائے سے ہمیں نارمل انسان سے مریض قرار دے دیا گیا۔ جہاں پہلے ہم اپنے مکان کی پہلی منزل سے دوسری اور دوسری سے پہلی (ہمارے مکان میں صرف دو منزلیں ہی ہیں) پر دندناتے پھرتے تھے، اب ایک ہی منزل پر [illegible] ہو گئے۔ اگر کبھی نچلی منزل سے اوپر کی منزل کی طرف نظر بھی اُٹھاتے تو بیوی گھبرا کے پوچھتی کہ کیا چاہیئے میں اوپر والی منزل نیچے لے آؤں گی۔ جہاں پہلے ساری ساری رات جاگ کے کاٹ دیتے تھے، اب [illegible] ہی سونے کا انتظام کیا

جتنا [illegible] ہم [illegible] اب دفتر نے گھر پر کام شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ بچے بھی جو کبھی ہمارے بعد کو پڑھائی کیا کرتے تھے اب بیٹھ کر [illegible] باتیں کرنے کے لیے تیار ہو گئے کہ گھر میں باپ نام کی کوئی چیز بھی ہوتی ہے۔ اس لیے ان سے بھی بات کر لیجیے۔

ان [illegible] دنوں کے [illegible] کو کم ہو جانا چاہیے تھا جیسے ایک ہی اعلان میں بیوی، بچے اور دفتر سبھی سنبھل گئے تھے۔ تو پھر تماشہ کیسا؟ یہ کھچاؤ کہاں کا؟ اور بیماری کا کیا مطلب؟

لیکن ان باتوں کے ساتھ ہی ایک اور بات بھی ہوئی۔ جب یہ خبر شہر کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ ہم علیل ہیں تو خیریت پوچھنے والوں کا تانتا لگ گیا۔ ہمارے دوست اور خیر خواہ نیک تمناؤں کا اظہار کرنے اور ہمارے دشمن اور بد خواہ یہ دیکھنے کے لیے کہ ہمارے بچ جانے کا چانس کتنا ہے، ہمارے دولت خانے پر آ دھمکے جو بہت جلد ہی غریب خانہ بن گیا۔ ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ ہمارے کتنے دشمن ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ہمارا آرام حرام ہو گیا اور ہمارا گھر ایک ایسی پولیٹکل پارٹی کا ہیڈ کوارٹر بن گیا جہاں الیکشن کے امیدواروں کو ٹکٹ دینے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

پھر جب ہم علاج کے لیے راضی ہو گئے تو ڈاکٹروں نے کہا کہ بہتر ہے آپ امریکہ جائیں۔ وہاں علاج اچھا ہوتا ہے۔ حکومت نے بھی ڈاکٹروں کی رائے مان لی اور ہمیں فوراً کوچ کرنے کو کہا۔ جلدی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کسی صاحب نے اعداد و شمار کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ نکالا تھا کہ اس قسم کا آپریشن کرانے والے سو لوگوں میں سے صرف پچانوے ۹۵ بچ جاتے ہیں۔ ان کے حساب سے ابھی تک پچھلے مہینے میں صرف نوے ۹۰ آپریشن ہوئے تھے اور ۹۵ نمبر سے پہلے پہنچ جانے پر ہمارے آپریشن کی کامیابی کی امید کی جا سکتی ہے۔

تو صاحبان، ناظرین، دیکھئے کہ ہمارا امریکہ جانا کس ٹیڑھے اور عجیب طریقے سے ہوا۔

جب ہمارے امریکہ جانے کی بات پکی ہو گئی تو بیگم نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ ان کی [illegible] میں کئی مہینوں سے دھندلا پن تھا۔ ڈاکٹروں کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ موتیا اتر رہا ہے —— موتیے کی علامت یہ ہے کہ وہ بہت آہستہ آہستہ اترتا ہے اور اس کے بعد آرام سے پکتا ہے۔ جب تک یہ دونوں باتیں نہ ہو جائیں ہندوستان میں آپریشن نہیں کیا جاتا۔ جب بات آپریشن کی چلی تو ہم نے بیگم سے پوچھا کہ موتیا کی وجہ سے تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بولیں کہ ایسا لگتا ہے جیسے آنکھ کے اوپر کسی نے ململ کا مہین سا کپڑا رکھ دیا ہو۔ ہم نے کہا کہ آئیڈیل بیوی وہ ہوتی ہے جس کی ایک آنکھ پر نہیں بلکہ دونوں پر ململ نہیں، کھادی کا کپڑا رکھا ہوا محسوس کرے تاکہ وہ شوہر کی حرکتوں کی پردہ پوشی کر سکے۔ ہماری مصیبت تو یہ ہے کہ ہماری بیوی ضرورت سے زیادہ دیکھتی ہے۔ وہ ان واقعات کو بھی دیکھ لیتی ہے جو ابھی ظہور میں نہیں آئے [illegible] [illegible] ہونے اور [illegible] قسم کے واقعات کو بھی دیکھ لیتی ہے۔

ہم نے کہا کہ اگر تمہیں ململ پسند نہیں تو ہم ریشم ڈلوا دیں گے۔ لیکن بیگم اپنی آنکھ پر سے ململ ہٹانے پر مصر تھیں۔ پھر ایک دن انھوں نے ہمیں ایک رسالہ دکھایا جس میں لکھا تھا کہ عین اس قسم

کی بیماری کا علاج امریکہ میں ہوتا ہے۔

سرکار کو جب یہ خبر ملی تو اُس نے بیگم کو بھی آپریشن کروانے کو کہا۔ آج کل سرکار اپنے ملازموں پر کڑی نظر رکھنا چاہتی ہے۔ اس کام کے لیے وہ بیویوں کی خدمات کا استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتی، اور بیویاں ہیں کہ وہ یہ کام مفت کرنے کو تیار ہیں۔ قصہ کوتاہ، امریکہ کی دریافت کی ہماری مہم میں بیگم بھی شریک ہوگئیں۔

مہم کی تیاری کے انتظامات کرتے وقت ہم نے کولمبس کی غلطی کو مدِنظر رکھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جانا تھا مشرق کی طرف تھا اور چل پڑا مغرب کی طرف! غالباً اُس دن مطلع صاف نہیں تھا کہ سورج دکھائی دیتا اس لیے مشرق اور مغرب میں تمیز کئے بغیر وہ اپنی مہم پر چل پڑا۔ بہرحال اتنی بڑی مہم میں ایسی اہم بات کا خیال نہ رکھنا اُس کی بڑی کوتاہی تھی۔ خیر ایسے نااہل اور لاپرواہ سیاح سے اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ ہم نے تو اپنے ٹراویل ایجنٹ کو صحیح اور واضح طور پر بتادیا کہ ہمیں امریکہ جانا ہے۔ احتیاطاً اصرار کے ساتھ یہ بھی کہا کہ کولمبس نے سمندری جہاز سے جانے کی غلطی کی تھی اس لیے ہمیں ہوائی جہاز کا ٹکٹ چاہیئے تاکہ بالفرض وہ غلط سمت پر نکل پڑے تو جلدی سے واپس موڑا جا سکے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہے کولمبس کی غلطی کا اثر آج تک لوگوں کے ذہنوں پر طاری ہے۔ ہمارے ٹراویل ایجنٹ نے پوچھا کہ جناب آپ مشرق سے جانا پسند کریں گے یا مغرب سے۔ ہم نے کہا بھئی یہ کیا بے تکی سی بات کررہے ہو۔ بھلا ایک ہی جگہ دو مخالف سمتوں سے کیسے جاسکتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ تم نشے میں لگتے ہو کل صبح جب "سوبر" ہوجاؤگے تو آکے بات کرنا ورنہ ہم کوئی ایسے ایجنٹ کے پاس چلے جائیں گے جو اس طرح بہکانے والا نہ ہو۔ پھر ہمیں شک ہوا کہ شاید کولمبس بھی اسی کمپنی سے ٹکٹ لے کر نکلا ہوگا! لیکن اس شک کو دُور کرنے کے لیۓ ہم نے ایجنٹ سے پوچھا تو اُس نے قسم کھاکر کہا آج تک اُس نے کولمبس نامی کسی شخص کو ٹکٹ نہیں بیچی۔

خیر! ہم نے کہا کہ ہمیں امریکہ دریافت کرنا ہے ہندوستان نہیں۔ اس لیے مشرق کی بات چھوڑدو۔ ہندوستان کو تو پنڈت نہرو نے دریافت کرلیا تھا اور اس کے بارے میں ایک دستاویزی کتاب بھی لکھی جس کے لیے اُنھیں کئی سال جیل میں رہنا پڑا۔ اور ہمیں ابھی جیل خانے کی کوئی اِچھّا نہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کو بھی مزید دریافت کیۓ جانے کی ضرورت نہیں۔ جتنا دریافت ہوچکا ہے اُتنا ہی سنبھلے تو کافی ہے۔

ایجنٹ اگلے دن آیا اور اُس نے وہی دو رُخی تجویز دُہرائی۔ وہ مُصر تھا کہ امریکہ جانے کے دو راستے ہیں۔ ہم نے کہا کہ آپ تو ایسے شخص لگتے ہیں کہ اگر ہمیں حیدرآباد سے دہلی جانا ہو تو آپ پوچھیں گے کہ آیا ہم ناگپور کے راستے جانا پسند کریں گے یا مدراس کے راستے! لیکن ہمیں حیرانی ہوئی جب ہر ایجنٹ نے ہم سے یہی سوال کیا۔ یہ سب لوگ اندر ہی اندر آپس میں ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ہم نے کرایہ پوچھا تو پتہ چلا کہ مشرق کے راستے کا کرایہ زیادہ ہے۔ ظاہر ہے اگر آپ غلط راہ پر چلیں گے تو اس کی قیمت زائد ہی دینی ہوگی۔

ہم نے آخر یہ فیصلہ کیا کہ ہم مغرب کے راستے ہی امریکہ جائیں گے۔

حضرتِ کاتب

رضا نقوی واہی

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

کیوں آپ کو اربابِ قلم سے ہے عداوت — کیوں آپ بناتے ہیں بچاروں کی حجامت
حجام کی قسمت میں ازل سے ہے جو خدمت — اس میں بخدا آپ کو حاصل ہے مہارت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

اس طرح قلم آپ کا چلتا ہے دھکا دھک — ہے جیسے چھلانگیں کوئی برسات کا مینڈک
یہ لفظ اُڑا اور وہ جملہ ہوا گنجلک — اک جست میں بن جاتی ہے مضمون کی درگت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

پوسا گیا پالا گیا کس آب و ہوا میں — ذہن آپ کا رہتا ہے جو ہر وقت خلا میں
کرتے نہیں فرق آپ خدا اور جدا میں — لفظوں کی الٹ پھیر سے کیا کیا ہے مصیبت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

ہو جاتا ہے آمادۂ اصلاح قلم جب — بن جاتے ہیں استادِ سخن، جہلِ مرکب
اشعار سے ہوتے ہیں وہ مفہوم مرتب — بیچارے سخنور پہ گزر جائے قیامت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

دفتر کبھی آتے ہیں جو بیوی سے جھگڑ کے — رکھ دیتے ہیں مضمون کی ناک آپ رگڑ کر
رہ جاتا ہے ابہام بھی سر اپنا پکڑ کے — الفاظ و معانی کی بس آجاتی ہے شامت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

ہوں اہلِ صحافت کہ مدیرانِ رسائل — ہیں آپ کی ترمیم کے تحریف کے قائل
ہوتا ہے قلم آپ کا جب لطف پہ مائل — رہ جاتا ہے تکتا ہوا منہ زعمِ ادارت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

ہر جملے میں جب تک کہ نہ دو اک غلطی ہو — ہر شعر میں اک رکن کی جب تک نہ کمی ہو
اس وقت تلک کاہے کو خوش آپ کا جی ہو — اس وقت تلک کیسے ہو آسودہ طبیعت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

لکھنے میں ادھر محو ہیں حالاتِ زمانہ — گزرا کوئی اتنے میں یہ گاتا ہوا گانا
اے یار ترے عشق میں مرتا ہے دِوانہ — بس آپ نے جھٹ اس کو کیا جزوِ عبارت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

رہتے تھے بڑے زعم میں خود حضرتِ [illegible] — لکھی تھی مگر آپ کے ہاتھوں سے تباہی
جو کھل کے چہرے پہ لپی جو سیاہی — اک آن میں غائب ہوا کُل رنگِ ظرافت

اے حضرتِ کاتب شہِ اقلیمِ کتابت

عرضِ کاتب

اے حضرتِ وابی، یلِ میدانِ ظرافت
ہم اہلِ کتابت سے ہے کیوں آپ کو وحشت

تصویر کے صرف ایک ہی رخ پر جو نظر ہے
تقصیر معاف، آپ کا یہ ضعفِ بصر ہے

ہم میں سے کوئی شخص نبی ہے نہ ولی ہے
لغزش تو ہر انسان کا حقِ ازلی ہے

دن رات جو لکھتا رہے بیٹھا ہوا اُکڑوں
اس سے یہ توقع، کہ دماغ اس کا ہو موزوں

ہم عالم و فاضل ہیں نہ استادِ سخن ہیں
ہم اہلِ قلم ہیں نہ کوئی ماہرِ فن ہیں

ایسا ہی طاہر تا اگر ہم کو مقدر
کیا ہم نہیں ہوتے کسی پرچے کے ایڈیٹر

مانا کہ کبھی بھول بھی ہو جاتی ہے ہم سے
مانا کہ کبھی چوک بھی ہوتی ہے قلم سے

اک اور بھی منزل ہے مگر قبلِ طباعت
کہتے ہیں جسے منزلِ تصحیحِ کتابت

اور اس کا تعلق ہے فقط ان فضلا سے
سر جن کا ' عبا شہ ' ادارت کی ہوا سے

ہوں خواہ ایڈیٹر کہ اسسٹنٹ ہوں ان کے
جو بھی ہوں وہ پورے ہی ہوا کرتے ہیں گن کے

بس دیکھ لیا ایک ذرا ترچھی نظر سے
تصحیحِ کتابت کی بلا ٹل گئی سر سے

اکثر یہ تماشا بھی ہوا کرتا ہے حضرت
باقی ہے فقط آخری فرمے کی طباعت

ناگاہ ایڈیٹر کو بڑی دُور کی سوجھی
"اک زلف پہ پھبتی شبِ دیجور کی سوجھی"

بس جھٹ سے لکھے چند شذر بار مقالے
اور ان کو بہ عجلت کیا کاتب کے حوالے

ہر پانچ منٹ پر ہوا فرمان یہ صادر
لیجے یہ تصحیح انھیں جلد ہی حاضر

عجلت میں جو لکھا تو قلم کھا گیا ٹھوکر
تاخیر اگر کی تو بگڑ بیٹھے ایڈیٹر

کیا عرض کریں ہم تو سدا مہر بہ لب ہیں
مضمون نگاروں کے حروف اور غضب ہیں

پڑتا ہے کبھی ایسی بھی تحریر سے پالا
کر دیتی ہے جو ہوش ہمارا تہ و بالا

کاغذ پہ فقط چند لکیریں جو رقم ہوں
کیونکر نہ حواس اپنے اڑیں خبط نہ ہم ہوں

ہم لوگ کوئی لال بجھکڑ نہیں صاحب
جو ایسی لکیروں کا نکالا کریں مطلب

جب ایسے مضامین ملیں بہرِ کتابت
ظاہر ہے کریں جائے گی اک اک کی حجامت

تصویر کا یہ رخ بھی اگر سامنے ہوتا
حضرت کا قلم طنز کے نشتر نہ چبھوتا

یہ بات بس اب پایۂ تکمیل کو پہنچی
کم نور کی جورو ہے بھرے گاؤں کی بھابی

عابد معز (حیدرآباد)

آپس کی بات

شادی کے بعد شوہر اور بیوی کو چند باہمی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان ہی میں سے ایک مسئلہ ایک دوسرے کو مخاطب کرنا بھی ہے۔ شوہر بیوی کو کیا کہہ کر بلائے اور بیوی شوہر کو کیسے مخاطب کرے۔ یہ دو سوال اکثر پریشان کیا کرتے ہیں۔

مغرب میں ایک دوسرے کو نام سے مخاطب کرنا عام ہے۔ ہم مشرقیوں میں شرم و حیا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ صنفِ نازک کے حسن کو شرم و حیا دوبالا کر دیتی ہے۔ شرم و حیا کا پاس اتنا زیادہ ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو نام سے مخاطب نہیں کرتے بلکہ "سنیے" اجی، جی، آپ، تم، حضرت، صاحب" میں نے کہا، ارے ہاں، ذرا ادھر، قبلہ، دیکھیے، ہاں جی، اے جی، بھاگیہ وان وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی غیر موجودگی میں بھی نام نہیں لیا جاتا۔ شوہر کہتا ہے "مکان میں، گھر میں، خانہ نشین، میری وائف، میری بیوی" جبکہ بیوی کہتی ہے۔ "ہمارے صاحب، اِنو، صاحب بہادر، وہ" اس کے علاوہ سامنے موجود شخص یا کسی اور سے رشتہ بیان کر کے مخاطب کرتے ہیں۔ جیسے "منّے کی ماں، پپّو کے ابا، پاشو کی ماں، آپ کے بھائی، آپ کی بہن، تمھاری چچی" اگر شوہر کو بیوی کا نام لینا پڑے تو وہ گوارا لیکن بیوی اپنے شوہر کا نام شاید ہی کبھی زبان پر لاتی ہے۔ شوہر کا نام دوسروں کے سامنے تو کجا تنہائی میں بھی زبان پر لانا ہندوستانی بیوی کے لیے نازیبا ہے۔ شرم و حیا سے زبان لڑکھڑانے لگتی ہے۔ آواز حلق میں پھنس جاتی ہے۔ پسینہ آنے لگتا ہے۔ چند بیویاں اس بات پر یقین رکھتی ہیں کہ شوہر کا نام لینے سے شادی کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی خیال کی حامل ایک بیوی سے ہم نے شوہر کا نام دریافت کیا۔ شرماتے ہوئے جواب دیا گیا "وہ جو رات میں نکلتا ہے"۔ پہیلی بوجھ کر شوہر کے نام کا اندازہ کرنا پڑا۔ رات کو چور، الّو اور چاند نکلتے ہیں۔ ہم نے احتیاط برتتے ہوئے کہا "چاند پاشاہ"۔ جواب میں نظریں نیچے کیے گردن ہلا کر ہمارے اندازے کے صحیح ہونے کی گواہی دی گئی۔

جہاں تک نام لے کر مخاطب کرنے کا سوال ہے، ہمیں شوہر خاصے فائدے میں نظر آتا ہے۔ شادی کے وقت شوہر چاہے تو نام بدل سکتا ہے۔ بیوی کو ایسی کوئی سہولت حاصل نہیں ہے۔ انھیں چاہتے ہوئے یا نہ بھی چاہتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ شوہر کے نام کو نتھی کرنا پڑتا ہے۔ بعض شوہر شادی کے وقت اپنی بیوی کے لیے وہ نام تجویز کرتے ہیں جو کنوارے پن میں ان کے خوابوں کی زینت بنا کرتے تھے۔ چند ایک حضرات اپنی ناکام محبت کا نام رکھ کر تجدیدِ وفا

کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہمیں ایک دوست کی یاد آتی ہے جو ایک مشہور فلمی ہستی کا دم بھرا کرتے تھے۔ اس کی فلمیں بار بار دیکھتے اور اسے خطوط لکھا کرتے تھے بلکہ اس سے شادی کا مصمم ارادہ بھی تھا۔ لیکن جناب مجنوں کی شادی کسی اور سے ہوگئی۔ انھوں نے اپنی بیوی کا اچھا خاصا نام تبدیل کرکے اس پری چہرہ فلمی حسینہ کا نام رکھ دیا۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ کس حد تک آپ کی منکوحہ اس فلمی حسینہ سے ملتی ہوتی ہے۔ اس پر انھوں نے فضا میں گھورتے ہوئے افسوس کے ساتھ جواب دیا: "دونوں کے درمیان صرف ایک ہی چیز مشترک ہے اور وہ یہ کہ دونوں کا تعلق صنفِ نازک سے ہے۔"

آزادیٔ نسواں کے اس دور میں بعض عاقبت اندیش شوہر اپنی بیوی کے نام کو اپنے نام کا جز بنا لیتے ہیں۔ ادبی دنیا میں بیوی کے نام کو اہمیت دی جاتی ہے۔ بعض شعرا اپنا تخلص تو چند ادیب حضرات بیوی کے نام کو اپنے قلمی نام کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ ناقص تخلیقات بیوی کے نام سے خوب چھپتی ہیں یا اکثر ادیبوں بیویوں کے نام سے لکھتے گئے ہیں۔

آئیے اب تاریخی پس منظر میں شوہر اور بیوی کے طرزِ تخاطب کا جائزہ لیں۔ ماضی میں بیوی اپنے شوہر کو مخاطب کرنے کے لیے بڑا پُر اسرار راستہ اختیار کرتی تھی۔ گھنٹوں شوہر کی طرف چور نگاہوں سے دیکھتی رہتی کہ کب نظریں ملیں تو عرضِ مدعا کریں۔ نظریں ملنے کے بعد ڈرتے ہوئے دھیمی آواز میں اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔ اکثر شوہر کو کھانا کھلاتے وقت بیوی کو بات کرنے کا موقع میسر آتا تھا۔ وقت کے ساتھ بیویوں کی ہمت بڑھی۔ "سنیے جی" "میں نے کہا" کہہ کر شوہر کی توجہ مبذول کروانے لگی۔ کچھ اور وقت گزرا۔ "منے کے ابا" "پپو کے ڈیڈی" "منی کے باوا" جیسے خطابات سے شوہر کو مخاطب کرنے لگی اور بقول دادی ماں آنکھ کا پانی مرگیا ہے "قیامت کے آثار قریب ہیں" بیوی اپنے شوہر کا نام لے کر مخاطب کرتی ہے۔ ایک وقت دادی ماں کے سامنے بیوی نے ہمارا نام لے کر ہمیں مخاطب کیا۔ دادی ماں غصہ سے لال پیلی ہو کر کہنے لگیں "بیٹا تم نے کسے بلایا نوکر کو یا اپنے مجازی خدا کو؟" ہم دادی ماں کو کیسے سمجھاتے کہ آج کل لوگ حقیقی خدا کو ہی بھلا بیٹھے ہیں، مجازی خدا کس شمار میں ہے۔ ماضی میں شوہر کا طرزِ تخاطب تحکمانہ ہوا کرتا تھا جو بدلتا ہوا "بیگم" "دلہن" یا عاجزانہ انداز میں نام لینے کی صورت اختیار کر گیا۔ آج شوہر، بیوی کو مخاطب کرنے سے پہلے کئی مرتبہ سوچ لیا کرتا ہے اور ہر بار انجان ہونے میں ہی اپنی عافیت جانتا ہے۔

ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کا انداز عمر کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ ہم ایک صاحب کو جانتے ہیں جو شادی سے پہلے اپنی بیوی کو "سویٹی" کہتے اور بیوی انھیں "ڈارلنگ" کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ سویٹی اور ڈارلنگ کا سلسلہ دو بچوں کی پیدائش تک چلتا رہا۔ بچے بڑے ہوئے تو سویٹی اور ڈارلنگ کی آواز پر کان کھڑے کرنے لگے تب شوہر نے بیوی کو سویٹی کہنا بند کیا اور نام سے مخاطب کرنے لگے۔ بیوی نے بھی "ڈارلنگ" کہنا چھوڑ دیا اور "اجی سنیے" کہنے لگیں۔ جب چھ بچے ہوگئے تو شوہر نے بیوی کا نام لے کر مخاطب کرنا بھی بند کر دیا اور "دلہن" کہنے لگے۔ بیوی نے بھی اپنا اندازِ تخاطب بدلا اور شوہر کو "حضرت" "قبلہ" کہنے لگیں۔ بچوں کی شادیاں ہوئیں تو شوہر اور بیوی کبھی کبھار ہی ایک دوسرے کو اشاروں میں مخاطب کرتے تھے اور وہ عمر بھی آئی جب دونوں دادا، دادی اور نانا نانی بنے تب

تب "بیٹے! ملازم کو بلاؤ" یا "نانی اماں سے کہنا"۔ والا طرز تخاطب اختیار کیا جانے لگا۔

محبت کر کے شادی کرنے والے نوجوان ایک دوسرے کو رومینٹک نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ ڈارلنگ، سویٹی، اسارلی، مائی لَو جیسے القاب انگریزی زبان سے مستعار لیے گئے ہیں۔ بہت کم حضرات اُردو زبان کے محبت بھرے القاب استعمال کرتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ محبت کی تشہیر کے لیے انگریزی زبان زیادہ موزوں ہے حالانکہ محبت تو سبھی زبان والے کرتے ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب شوہر بیوی کے لیے سرکا تاج یعنی سرتاج اور بیوی، شوہر کے چرنوں کی داسی ہوا کرتی تھی۔ آج مساوات کا دور دورہ ہے۔ میاں بیوی جس طرح چاہیں ایک دوسرے کو مخاطب کر سکتے ہیں۔ بعض شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو فلمی نام سے ہی مخاطب کرتے ہیں۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا ایک محترمہ اپنے شوہر کو مغل اعظم کہہ کر پکارتی ہیں تو ایک صاحب اپنی بیوی کو "جھانسی کی رانی" کہہ کر بلاتے ہیں۔ تشبیہات اور استعاروں کے ذریعہ بھی شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہیں۔ چاند، گل، بلبل، اور گلاب جیسے نام سے مخاطب کرتے ہوئے ہم نے سنا ہے۔ بعض شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو مخاطب کرنے کے لیے اشارے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست سامنے موجود در و دیوار یا میز، کرسی کو تھپتھپا کر اپنی بیوی کو مخاطب کرتے ہیں۔ . . . . . دوسرے دوست چٹکی بجا کر بیوی کو متوجہ کرتے ہیں۔ اشاروں اور کنایوں میں شوہر سے زیادہ بیوی مخاطب کرتی ہے۔ ایک پازیب کی جھنکار سنا کر اپنے شوہر کو متوجہ کرتی ہے۔ ایک صاحب برتنوں کی آواز اور پیالیوں کی کھڑکھڑاہٹ یا چمچوں کے بجائے سے اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

بعض شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو عجیب و غریب نام سے مخاطب کرتے ہیں۔ ایک صاحب شادی کے بعد بھی اپنی بیوی کو "مس" کہتے ہیں۔ ہماری ایک عزیزہ اپنے شوہر کو "ہوں۔۔ ہوں۔۔" کہہ کر اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ اکثر اوقات اس عجیب و غریب طرز تخاطب کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ بعض وقت یہ ایک قسم کا کوڈ معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے حلقہ احباب میں ایک صاحب اپنی بیوی کا تذکرہ "ہوم ڈیپارٹمنٹ" جیسے لفظ سے کرتے ہیں۔ ہمارے ایک اور ساتھی نے اپنی شریک حیات کو وزیر اعظم کا خطاب دے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ فلاں کی بیوی انھیں پریسیڈنٹ کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ چند بیویاں اپنے شوہروں کو ان کے عہدوں، پیشوں یا ان کے کاروبار کی مناسبت سے مخاطب کرتی ہیں۔ مثلاً وکیل صاحب، ڈاکٹر صاحب، ایڈیٹر صاحب، تحصیلدار صاحب، کلکٹر صاحب، سیٹھ صاحب وغیرہ اس ضمن میں ایک محترمہ کا اعتراض بجا نظر آتا ہے۔ عہدہ کے ذکر سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم عہدیداروں کے بجائے ان عہدوں کی بیویاں ہیں۔

اکثر شوہر اور بیوی ایک دوسرے کو شادی سے پہلے کے نام سے مخاطب کرتے ہیں یا پھر شادی سے پہلے کے نام کو تھوڑا بہت تبدیل کر لیتے ہیں۔ ایک صاحب جمیل سے "جمّو" ہو گئے تو ایک صاحب منظور سے "منّو" ہو گئے۔ ہمارے ایک دوست نے ٹیوشن پڑھاتے پڑھاتے نکاح پڑھوا لیا۔ شادی کے بعد بھی موصوف کی بیوی "ماسٹر صاحب" کہہ کر مخاطب کرتی ہیں۔ غصہ میں صرف ماسٹر کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ صاحب غصہ کی نذر ہو جاتا ہے۔ ایک محترمہ مالک مکان سے شادی کے بعد بھی شوہر کو "مکان دار" کے نام سے مخاطب کرتی رہیں۔ ہمارے ایک دوست نے اپنی سکریٹری سے شادی رچائی

شادی کے بعد بھی بیوی اپنے شوہر کو "بابی" کہہ مخاطب کرتی ہیں جبکہ کئی شوہر بیوی یا سن میں چھوٹی تھیں۔ چند خاندانوں میں قریبی رشتہ داروں سے شادی کرنا عام ہے وہاں شادی سے پہلے کے۔ رشتہ کو تبدیل کرکے مخاطب کیا جاتا ہے۔ ایک محترمہ کی شادی ان کے چچازاد بھائی سے ہوئی جنھیں وہ بھائی جان کہا کرتی تھیں۔ شادی کے بعد وہ اپنے شوہر کو جان کہنے لگیں اور ساتھ ہی جان کھانے بھی لگیں۔ ایک ایسی ہی شادی نے شوہر کو جو پہلے رشتے کے بھائی تھے شادی کے بعد "بھوئی" بنا دیا۔

زبانی طرزِ تخاطب میں خیر کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ مشکل خطوط لکھتے وقت درپیش ہوتی ہے۔ ہم نے کئی شوہر اور بیوی کو دیکھا ہے جو کاغذ اور قلم لیے ادیب اور شاعر کی طرح سوچ میں ڈوبے بیٹھے رہتے ہیں۔ کئی کئی گھنٹے بلکہ چند دن اسی ادھیڑبن میں گزر جاتے ہیں کہ خط کن القاب سے شروع کیا جائے۔ سرتاجِ من سلامت، محرمِ رازِ ہمدمِ دیرینہ کی طرح کے القاب پرانے اور فرسودہ ہو چکے ہیں۔ بعد از اشتیاقِ ملاقات، شوقِ دیدار جیسے لفظ بھی آج کم استعمال ہونے لگے ہیں۔ اکثر خطوط بغیر القاب، تسلیم، آداب سے شروع ہو جاتے ہیں۔ بعض وقت سمجھ میں نہیں آتا کیا لکھوں ...... لکھا جاتا ہے۔ اس جھنجھٹ سے بچنے کے لیے ہمارے ایک دوست اپنی بیوی کو خط لکھتے ہی نہیں۔ تحریر ختم کرتے وقت بھی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ آپ کا اور آپ کی جیسے الفاظ پر اکثر شوہر اور بیوی کی تحریریں ختم ہوتی ہیں۔ کبھی گھسے پٹے اشعار کا بھی استعمال ہوتا ہے۔

مضمون کے اختتام پر ہم پھر کہیں گے کہ رشتۂ ازدواجیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مخاطبت کا انداز منفرد ہونا چاہیے۔ ہم قارئین سے پوچھتے ہیں کہ اس بارے میں ان کا نقطۂ نظر کیا ہے! ــــــ جی کیا کہا یہ ایک خالص نجی اور ڈومسٹک مسئلہ اور آپس کی بات ہے تو پھر جناب ہمارا کہا سنا معاف۔

●●

رؤف خیر حیدرآباد

اب وہ دلّی ہے نہ لاہور چنا جور گرم ۔۔۔ خاک اُڑتی ہے ہر اک اور چنا جور گرم

جنگلوں میں بھی تو بارود بچھا رہتی ہے ۔۔۔ رقص کرتے نہیں اب مور چنا جور گرم

خون میں جس کو نہاتے کا ہنر آتا تھا ۔۔۔ ہے پسینے میں شرابور چنا جور گرم

پھر نکالے ہوئے بُت آکے سرافراز ہوئے ۔۔۔ پھر اٹھا شور چنا جور چنا جور گرم

بابت کی کوکھ سے سورج کو جنم لینا تھا ۔۔۔ ہم نے دیکھی ہی نہیں بھور چنا جور گرم

عزتیں شہر میں نیلام ہوئی جاتی ہیں ۔۔۔ عشق بے چارہ ہے کمزور چنا جور گرم

ہے بستر ظلِ الٰہی پہ گِدھوں کا سایہ ۔۔۔ ہو گئے ڈھیر سبھی ڈھور چنا جور گرم

اک لٹکتی ہوئی تلوار کے نیچے سر ہے ۔۔۔ ٹوٹ جائے نہ کہیں ڈور چنا جور گرم

دم لیا تھا نہ ابھی میر کے گھر والوں نے ۔۔۔ پھر گھٹا چھائی ہے گھنگھور چنا جور گرم

دیر لگتی ہی نہیں رنگ بدلتے رُت کو ۔۔۔ کوتوال آج ہے ہر چور چنا جور گرم

ہجرتیں راس بھلا سب کو کہاں آتی ہیں ۔۔۔ وہ بھی ہیں زندہ در گور چنا جور گرم

خیر صاحب یہ بڑا جوش بُرا ہوتا ہے
آپ بھی ہو گئے منہ زور چنا جور گرم

اقبال ہاشمی حیدرآباد

منہ میں طوفان اٹھاتا ہے چنا جور گرم ۔۔۔ پیٹ میں دھوم مچاتا ہے چنا جور گرم

شعر کے ڈھیر لگاتا ہے چنا جور گرم ۔۔۔ نیند جب میری اڑاتا ہے چنا جور گرم

منقطع ہوتی ہے تہذیب کی ساری دنیا ۔۔۔ راگ جب اپنا سناتا ہے چنا جور گرم

ایٹمی جنگ بھی معمولی نظر آتی ہے ۔۔۔ جب بھی ہتھیار اٹھاتا ہے چنا جور گرم

آج کل شور ہے جس توپ کا اخباروں میں ۔۔۔ آنکھ اس سے بھی لڑاتا ہے چنا جور گرم

جس قدر شوق سے کھاتے ہیں اسے ہر [illegible] ۔۔۔ اس قدر جوش دکھاتا ہے چنا جور گرم

واشنگٹن میں بھی ہر کس و ناکس کو [illegible] ۔۔۔ چین کی بنسی بجاتا ہے چنا جور گرم

سامنے اس کے بھلا ہاشمی کیا چیز ہو تم
خیر و مضطر کو نچاتا ہے چنا جور گرم

پاگل عادل آبادی

نوٹوں بھرا جہاز مرے گھر اُتار دے
قرضہ ہے بال بال جو سر پر اُتار دے

توشک لحاف ریشمی چادر اُتار دے
سونے کو میرے واسطے بستر اُتار دے

رونے لگی ہیں بلیاں روٹی کی بانٹ پر
یارب تو ان کے بیچ میں بندر اُتار دے

ہر روز روز تنخواہ ہو جس میں مرے خدا
ایسا بھی ایک سال کیلنڈر اُتار دے

مانا نزع کا وقت ہے مئے ناب ڈاکٹر
سوئی کے ذریعے تھوڑی سی اندر اُتار دے

جس کے اثر سے شاعری مجھ پر ہوئی سوار
ہے کوئی ایسا مہرباں جو یہ منتر اُتار دے

پاگل اگر ہے بوجھ تو پھر سوچتا ہے کیا
لے جا کے زندہ، قبر کے اندر اُتار دے

تیرے باپ اور بھائی گھر سے نکل نکل کے
کرنے لگے پٹائی جوتے بدل بدل کے

کرنے کو میرا ویل کم جاناں تیری گلی کے
کرتے ہیں سارے کتے بھوں بھوں اچھل اچھل کے

اک بھائی فوج میں ہے اک بھائی ہے پولیس میں
ڈینجر گلی ہے اُن کی گھسنا سنبھل سنبھل کے

ہیں دانت یا ہتھوڑا ہڈی ہو یا ہو نلی
پوڈر بنا رہے ہیں مرشد کچل کچل کے

سسرال میں ہے منڈن وہ جا رہے ہیں خوش خوش
سر منڈ لگا کے لنگی بدل بدل کے

کیوں کر نہ ہو گی بیوہ پھر مرغیاں بچاری
مولانا کھا رہے ہیں مرغے نگل نگل کے

جب سے ہوئی بڑی بی اللہ میاں کو پیاری
خوشیاں منا رہے ہیں حضرت اچھل اچھل کے

گینڈے کی کھوپڑی ہے سمجھا بجھا کے ہارا
آخر بنا ہے پانی بھیجہ پگھل پگھل کے

شادی میں ان کی یارو کیا قاضی کیا براتی
سہگل کے گا رہے تھے گانے ٹہل ٹہل کے

پاگل کے شعر سن کر چپ چاپ ہیں سیانے
اور داد دے رہے ہیں پگلے مچل مچل کے

عبدالرؤف خوشتر (بیدر)

فلمی دنیا میں ری ٹیک پر ری ٹیک ہو رہے ہیں۔ ایسا کئی سالوں سے ہو رہا ہے (فلم مغل اعظم کی طرح) اب یہی ہمارا شغلِ اعظم بن گیا ہے آج بھی یہی شاٹ جاری ہے "دیکھیے" بلکہ "سنیے" وہ کہہ رہی اور میں سُن رہا ہوں۔ دم لینے کے لیے ہی نہیں پان لینے کے لیے وہ ذرا دیر کے لیے چپ ہو گئی تو میں نے موقع جانا اور گلوری لیتے ہوئے پوچھا۔

"پان کی امان پاؤں تو سوال پوچھوں۔ امّاں حوّا نے اس دنیا میں، میرا مطلب ہے اس دنیا میں بیاہ ہو کر سب سے پہلے کیا کہا ہوگا؟"

بولی "سُنیے"

اس خیال سے کہ ہمیشہ کی طرح بیوی نے ہمارے سوال کو نہیں سمجھا ہم نے دوبارہ اپنے سوال کو دہرایا تو پان کو اچھی طرح چباتے ہوئے بولی۔

"اجی وہی ڈائیلاگ جو میں پچھلے اٹھارہ سالوں سے کہتی آرہی ہوں، ارے کٹ! کٹ!! اس سے تو میری عمر کا راز فاش ہو جائے گا۔ چوٹی کے اداکاروں کی طرح میں بھی مکالمہ نگاروں کے مکالمے توڑ مروڑ کر اپنے انداز میں کہوں گی کہ جب ہماری شادی ہوئی ہے تب سے دن رات جو میں کہتی آرہی ہوں وہی یعنی سُنیے! سنیے!!" تو اماں حوا نے بھی باوا آدم سے یقیناً یہی کہا ہوگا "سُنیے"!

تو عزیزو جنّت میں کہی گئی اس تاریخی "سنیے" کی صدائے بازگشت، اب ساری دنیا میں سنائی دے رہی ہے اور کیا عجب ہے کہ قیامت تک سنائی دے۔

شوہر اور جمہور کے لیے سُننا ہی فرضِ اوّل ٹھہرا۔ حاکمِ مکان ہو یا حاکمِ زمان سُنیے ان کا تکیۂ کلام ہوتا ہے۔ کاش کہ وہ کبھی کبھی ہی سہی شوہر اور جمہور کی "سنیے" پر بھی دھیان دیتے تو دنیا کی تاریخ ہی کچھ اور ہوتی۔ لیکن اس یک طرفہ سننے نے وہ ستم ڈھائے ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔ بے حس اور بہرے بادشاہوں کی طویل فہرست ایک طرف، نوشیروان عادل اور جہانگیر جیسے جمہور کی سننے والے بادشاہ شاذونادر اور نادرشاہی "سنیے" کے ہتھیار سے لیس بادشاہ زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بقول نجم الدولہ، بیوی کی "سُنیے" میں جھلاہٹ اور پڑوسن کی "سُنیے" میں حلاوت پائی جاتی ہے۔

"گر روپے کی تعریف یہ ہے کہ کوئی اسے دینے کو تیار نہیں اور لینے سے انکار نہیں تو پھر "سُنیے" کی تعریف یوں ہوگی کہ سنانے سے انکار نہیں اور سننے کو تیار نہیں۔ اب ہر کوئی ایک دوسرے کو سُنیے کہہ کر ڈھیر ساری باتیں سنا کر حیوانِ ناطق ہونے کا چیختا چلاتا ثبوت تبلاتا ہے۔

سُنیے کی خیرات، گھر ہی سے بٹنی شروع ہو جاتی ہے اور گلی کوچوں، بازار، دفتر، ہوٹل، غرض جہاں جائیے گا اسے پائیے گا۔ دینے والے برابر آپ کا پیچھا کرتے رہتے ہیں اور اس وقت تک جانے کا نام نہیں لیتے جب تک آپ کے کانوں کے کشکول کو نہ بھر دیں۔ یہاں دینے والا تھکتا نہیں بلکہ لینے والا تھک جاتا ہے۔ ہم ہیں بیزار اور وہ مشتاق والا معاملہ ہوتا ہے۔ اب نصیحتوں اور احتساب وغیرہ سے جھولیاں بھرنے والوں کی تعداد اتنی ہی بڑھتی جا رہی ہے جتنی خیرات لینے والوں کی، کبھی کبھی تو ہمیں یہ پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ صاحب جو ہمارا پیچھا کر رہے ہیں وہ لینے والوں میں ہیں یا دینے والوں میں۔

ایک دن بازار میں ایک صاحب سُنیے، سُنیے، کہہ کر ہمارا پیچھا کر رہے تھے۔ ہم نے ان کو بغور دیکھا تو لگا کہ سو پشت سے ہے پیشۂ آبا گداگری۔ ریزگاری نکالی اور ان کے ہاتھوں تھمانا چاہا تو بپھر کر بولے۔

اجی صاحب میں آپ کا بہی خواہ ہوں آپ کے بالوں کی سفیدی دیکھ کر ایک اچھا سا نسخہ بتلانا چاہتا تھا۔ کیا آپ نے مجھے فقیر سمجھا ہے۔ اب میں آپ کو بالوں والا نسخہ نہیں بتلاؤں گا، اب آپ کا سر سفید بالوں کی وجہ سے جنوبی آفریقہ بن گیا ہے خدا کرے سارے سفید بالوں کی وجہ سے پورا یورپ بن جائے۔ یہ کہہ کر وہ ایک دوسرے سفید بالوں والے کے پیچھے سُنیے، سنیے کہتے ہوئے دوڑ پڑے۔

اسی طرح ایک دن ایک دوسرے صاحب نے سنیے، سنیے کی پیہم تکرار سے ہمیں روک لیا ہم فوراً انہیں ایک ہوٹل میں لے گئے عزّت سے بٹھایا، چائے پیش کی انہیں منڈیلا کی طرح اپنے سر کو پورا سیاہ فام افریقہ بنانے کا نسخہ پوچھا، چائے کی پیالی پٹختے ہوئے حقارت سے بولے۔

اجی صاحب میں لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اور بالوں میں بھوسا ڈال کر روپے نہیں بٹورتا خاندانی فقیر ہوں اعلانیہ بھیک مانگتا ہوں۔ آپ کے بال اور روپے سفید ہوں یا کالے مجھے اس سے کوئی غرض نہیں، ہیروئن کے کش نہیں لیا ہوں، دم نہ مارنے سے دم اُکھڑا جا رہا ہے، لائیے نشہ کے لیے پانچ روپے دیجیے اور فقیر کی صدا کیا ہے۔

ایک دن تو غضب ہو گیا لینے والا اور دینے والا دونوں ہم سے بہ یک وقت ٹکرا گئے ایک، بھوپال گیس سے متاثرہ افراد کو کتنا معاوضہ مل رہا ہے بتلا رہا تھا دوسرا کہہ رہا تھا کہ مجھے کچھ دیجیے.....

ہم نے لینے والے کو ہم پانچ روپے تھما دیئے اور کہا کچھ دیر یہیں ٹھہر کر ان صاحب سے تفصیلات سُنتا ہمیں دفتر جانا ہے، یہ کہکر ہم وہاں سے چل پڑے وہ فقیر اُن سے اُلجھ پڑا کہ میری کشکول سکّوں کی عادی ہے جنوں کی نہیں، یہ پانچ روپے لیجیے اور مجھے بخش دیجیے میرے دھندے کا ٹائم ہے۔

اس معاملہ میں بوم الدولہ کب چُپ رہتے ہیں وہ تو لفظوں کے جادوگر، قصّوں کے سوداگر اور نصیحتوں کے خوگر واقع ہوئے ہیں وہ اپنی چرب زبانی اور لن ترانی کے حق میں جواز پیش کرتے ہیں کہ۔

حالانکہ ہمارا تو یہ کہنا ہے کہ
خموشیوں سے تو دل اور دماغ جلتے ہیں
وہ چپ رہیں تو میرے دل کے باغ کھلتے ہیں

بوم الدولہ صبح ہی صبح بیوی بچّوں کو سیر شکم سُنا کر اوٹ ڈور شوٹنگ کے لیے گھر سے نکل پڑتے ہیں، گورکھا کی طرح ہر ایک کو ایک خاص انداز میں سلام کرتے اور انشورنس ایجنٹ کی طرح ہر ایک سے ایک خاص انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی بتیسی (اب وہ بتیسی کہاں) دکھلاتے ہوئے صابر سامع کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور یہی وہ وقت ہے اور وقت حبس ہوتا ہے جب ہم اپنی بیوی کے "سُنیے، سنیے" مارننگ پروگرام سے بمشکل رہائی پاکر مکان سے فرار ہوکر، دفتر کی طرف رواں دواں ہوتے ہیں یکایک بوم الدّولہ کا ہاتھ ہمارے بشرٹ کے جیب کے بٹن کی طرف بڑھتا ہے، بٹن سے کھیلتے ہوئے آنکھیں بند کرکے وہ شروع ہو جاتے ہیں ہم حال سنائیں گے۔ سنیے کہ نہ سنیے اور پھر ان کا عالمی سفر شروع ہو جاتا ہے، کبھی واشنگٹن کبھی اسلام آباد کبھی ماسکو تو اور کبھی جلال آباد اور پھر اچانک ہمنا باد ہوتے ہوئے اپنی گلی میں مسائل سمیت نمودار ہو جاتے ہیں، ادھر ہمیں تاخیر کی وجہ سے دفتر میں صاحب کی افسرانہ ناخوش گوار سُنیے کا خیال آتا رہتا ہے مگر بوم الدولہ ہماری التجا بھری سُنیے کو اَن سُنی کرکے اپنی عالمی سنیے کا گرم سیسہ ہمارے کانوں میں انڈیلتے رہتے ہیں ایسے میں ہم چپ چاپ کھڑے دعا مانگتے رہتے ہیں کہ پل بھر کے لیے کوئی انہیں سلام کرنے جھوٹا ہی سہی۔

بوم الدّولہ کی اس روز روز کی سُنیے والی سیچوئیشن سے اکتا گئے تھے۔ بالآخر ایک تدبیر سوجھی۔ مکان سے اپنے ہمراہ اپنے بھتیجے کو لے کر نکلے۔ حلوائی کی دوکان کے سامنے بوم الدّولہ نے ہمیں پکڑا اور حسبِ معمول ہمارے بشرٹ کے جیب کے بٹن پر ہاتھ جماکر اور آنکھیں بند کرکے "سُنیے" کا وظیفہ شروع کر دیا۔ ہم نے نہایت صفائی اور چالاکی سے بوم الدولہ کے ہاتھ کو اپنی جیب سے بھتیجے کے جیب کی طرف منتقل کر دیا جس طرح آج کل قائدین ہوشیاری سے اپنے دھن کو مقامی بینکوں سے سوئس بنک کو منتقل کر دیتے ہیں۔ بوم الدّولہ کے ہاتھوں ہاتھ خیر تو ہوئی ہم اپنے بھتیجے کو دلاسا دلاتے ہوئے دفتر کو چل دیئے یعنی۔

یہ گھنٹہ بھر سُننیے کا دیپی دے گرا نٹرول کے طور پر آنکھیں کھولیں تو حیرت سے کہنے لگے :

بھتیجہ تھا یہ کب چچا ہو گیا
میرے سوتے سوتے یہ کیا ہو گیا

ہاں ہاں آرہا ہوں عزیز واب میں چلتا ہوں، اب پھر وہی شاٹ ہوگا وہی کردار اور پھر وہی مکالمے سنیے بیگم ہیں کہیں سے آواز دے رہی ہیں اور آپ تو جانتے ہیں کہ ان کے رٹے رٹائے ڈائیلاگ کون سے ہیں،

جی ہاں، وہ اس وقت بھی ہمیشہ کی طرح کہہ رہی ہیں اجی !

سُنیے !!!

●●

محبوب مانجوی

شہر اشعار

صبح کا ذب کا وقت تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی، عجیب سنسان سا اسٹیشن تھا میں ہاتھ میں بریف کیس لیے پلیٹ فارم پر اتر پڑا۔ دو ایک آدمیوں کے علاوہ پلیٹ فارم پر کوئی نہ تھا، مگر ایک خوب صورت سائن بورڈ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروائی۔ جلی حرفوں میں اردو میں لکھا ہوا تھا:

"تیری گٹھری میں لاگا چور مسافر جاگ ذرا"

پلیٹ فارم پر بورڈ پر لکھے ہوے اس مصرعہ کو پڑھ کر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ محکمۂ ریل کو دعائیں دیتا ہوا اسٹیشن سے باہر آیا۔ باہر کوئی سواری نظر نہ آئی۔ رکشا، تانگہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایک سیدھی سڑک سامنے نظر آئی، میں اسی سڑک پر ہولیا۔ تھوڑی دور جانے پر ایک دو منزلہ مکان نظر آیا۔ ہوٹل سمجھ کر قدم آگے بڑھ لئے۔ قریب جاکر دیکھا تو اوپری منزل پر ایک بڑا بورڈ نظر آیا جس پر اردو میں ہی تحریر تھا

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود و ایاز

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بڑی خوشی ہوئی پڑھ کر۔ وہاں سے میں آگے بڑھا اور تھوڑی دور جانے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک سائن بورڈ کی تحریر نے مجھے چونکا دیا۔ جلی حروف میں تحریر تھا:

"انگریزی شراب کی دوکان" نیچے غالب کا یہ شعر درج تھا:

بھول پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

مسجد کے زیر سایہ خرابات چاہیے

مسجد کے قریب مے خانہ کو دیکھ کر مسکرا پڑا اور شعروں کے خوب صورت انتخاب کی داد دیتا ہوا آگے روانہ ہوا۔ چند قدم ہی چلا تھا کہ داہنی طرف ایک بہت ہی خوب صورت قدیم مندر نظر آیا۔ مندر بہت ہی نفیس ہندوستانی فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوا۔ مورتیوں سے سجا ہوا بڑا دل کش۔ قریب جاکر غور سے دیکھا۔ چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ دروازے کی پیشانی پر ایک سنگ مرمر کی تختی لگی ہوئی تھی جس میں سیاہ حرفوں سے اردو میں غالب کا یہ شعر کندہ تھا۔

"گو واں نہیں پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبہ سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی!"

یقیناً یہ کسی غالب شناس کی ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت تھا۔ غالباً ہندو مسلم ایکتا اس کے پیش نظر ہوگا۔ اس ارفع و اعلیٰ خیال کی داد دیتا ہوا مسرت سے جھومتا آگے بڑھ لیا۔ بہت دور نکل گیا۔ دفعتاً ایک دوکان پر نظر پڑی، معلوم ہوا شراب و کباب کی دوکان ہے۔ وہاں بھی ایک سائن بورڈ لٹکا ہوا تھا اور نثر و نظم سے مزین تھا:

"دل بہار ہوٹل"

"یہاں شراب و کباب اعلیٰ معیار کے پیش کیے جاتے ہیں۔ آزمائش شرط ہے:

"پینا حرام ہے نہ پلانا حرام ہے
پینے کے بعد ہوش میں آنا حرام ہے"

صرف ایک بار ہمیں اپنی خدمت کا موقع عنایت فرمائیں۔

نوٹ: کباب خالص حلال جانور کے گوشت سے تیار کیے جاتے ہیں۔

میں نے دوکان کے اندر نظر دوڑائی۔ ایک باریش بزرگ کباب بنانے میں مشغول تھے۔ میری طرف دیکھا تک نہیں، ایک صاحب شراب میں دھت پڑے ہوئے تھے۔ ہوٹل کی اندرونی دیوار پر نظر پڑی۔ کسی شوخ نے کوئلے سے لکھ مارا تھا:

"کسی کے آتے ہی ساقی کے ایسے ہوش اُڑے
شراب سیخ پہ ڈالی کباب شیشے میں!"

ماحول کی مناسبت سے بڑا عمدہ شعر لکھا تھا ظالم نے مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ ہنسی کو روکتے ہوئے وہاں سے کھسک گیا۔ آگے جا کر مجھے ایک گلابی رنگ کا گنبد نما مکان ملا۔ الگ تھلگ بڑا پُر شکوہ معلوم ہو رہا تھا مکان۔ یہ سوچ کر کہ شاید یہاں بھی کوئی اچھا شعر پڑھنے کو مل جائے، مکان کے قریب پہنچا۔ معلوم ہوا کسی عامل صاحب کا مکان ہے اور یہاں بھی شہر کی روایت دہرائی گئی تھی۔ میرا مطلب ہے شعر و شاعری کا ذوق یہاں بھی کارفرما تھا اور یوں تحریر تھا:

> سید برکت اللہ شاہ - عامل جنات
>
> ضرورت مند حضرات فوراً رجوع کریں۔ انشاءاللہ مایوسی نہیں ہوگی:
>
> "اے شاہ یہاں وہ زود اثر تعویذ بنایا جاتا ہے
> جن جس سے اتارے جاتے ہیں شیطان بھگایا جاتا ہے"

جن اور شیطان کے ذکر سے ایک خوف سا محسوس ہوا۔ بدن میں ایک جھرجھری سی آئی۔ فوراً وہاں سے فرد وگیارہ ہونا پڑا۔ بارے اپنے آپ کو ایک ویران علاقے میں پایا۔ سامنے ایک خستہ سی کھنڈر نما عمارت میدان کے بیچوں بیچ موجود تھی۔ کبھی چار دیواری بھی رہی ہوگی مگر اب وہاں صرف نشانات ہی رہ گئے تھے۔ بڑی ویرانی برس رہی تھی۔ نعق تجسس نے سر ابھارا۔ قریب گیا۔ آثار وقرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ کبھی بڑی شاندار حویلی رہی ہوگی مگر اب کھنڈر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ صدر دروازے کے اوپر دیوار کے ایک محفوظ حصّے میں کالے رنگ سے کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔ بڑی مشکلوں سے پڑھا گیا۔ تحریر تھا:

"بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھالیا

اس کی بلا سے بوم رہے یا ہما رہے"

آنکھیں بھر آئیں۔ دنیا کی بے ثباتی پر افسوس کرتا ہوا بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے نکل کر سڑک پر آگیا آگے چلتا گیا چلتا گیا۔ دو ایک راہ گیر ملے بھی مگر نہ تو کسی نے مجھ پر توجہ دی نہ میں نے ہی کسی سے کچھ پوچھا۔ اپنی دھن میں آگے بڑھتا رہا۔ سڑک کے دونوں طرف اطراف چھوٹے چھوٹے مکانات بھی تھے۔ مگر میں انھیں نظر انداز کرتا آگے چلتا گیا۔ سامنے ایک خوب صورت دو منزلہ مکان نظر آیا۔ لگتا تھا حال ہی میں سفیدی کی گئی ہے۔ بڑا صاف ستھرا مکان تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر حریری پردے پڑے ہوئے تھے۔ مدّھم سُروں میں ساز اور طبلے کی آوازیں بھی کانوں میں آرہی تھیں۔ سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ پھر بھی ایک منحنی سے شخص نے میرے خیال کی تصدیق کر دی۔ یہ ایک طوائف زادی کا مکان تھا اور دروازے پر فریم کیا ہوا یہ خوب صورت شعر مکین کے باذوق ہونے کا ثبوت دے رہا تھا:

"جذبۂ عشق سلامت رہے انشاء اللہ

کچے دھاگے میں چلے آئیں گے سرکار بندھے"

کون کافر ہے جو اس حسین شعر کی داد نہ دے۔ چناں چہ میں نے داد دی۔ سر دھنتا رہا۔ دل میں خیال بھی آیا کہ آؤ چل کے ذرا حسن کا جلوہ دیکھیں" مگر کچھ سوچ کر واپس لوٹ گیا۔ میں نے شیطان پر فتح پالی تھی۔

ناک کی سیدھ چلتا رہا۔ ایک بس کے اڈے کے قریب پہنچا۔ ایک بس تیار کھڑی تھی۔ پتہ چلا کہ یہ میری مطلوبہ بس ہے جو مجھے میری منزل مقصود تک پہنچا دے گی۔ جلدی جلدی بس کے پاس گیا۔ بس کے سامنے کے حصّے میں شعر لکھا ہوا تھا:

"در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں

خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں"

سفر کی مناسبت سے بڑا عمدہ انتخاب تھا شعر کا۔ میں بس کے اندر سوار ہو گیا۔ لوگ کم تھے ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گیا اور شہر کے بارے میں سوچنے لگا۔ واقعی عجیب شہر تھا اسے "شہر اشعار" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بس ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ ہوئی اور میری زبان پر میر کا یہ شعر خود بخود وارد ہو گیا:

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

بس کی رفتار تیز ہو گئی۔ دفعتاً ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ شاید بس کا کوئی ٹائر پھٹ گیا تھا اور اس آواز کے ساتھ ہی میری آنکھ کھل گئی۔ خود کو اپنے کمرے میں بستر پر پڑا ہوا پایا۔ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ شاید نہیں۔ یقیناً میں نے خواب دیکھا تھا۔

●●●

ضیا حسنی
فتح پور

معاملہ پنشن کا

پنشن اس سرکاری عطیہ ... کہتے ہیں جو تینتیس برسوں کی محنت شاقہ کے بعد پنشنر کو ماہ بماہ اس لیے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے سہارے سائے میں بیٹھ کر زندگی کے آخری ایام بے فکری سے گزارے ایسے میں ناگاہ جو کوئی افتاد سامنے آجائے اور جس کے کرب سے اس کے ماتھے پر قطرے دو قطرے پسینہ ابھر آئے تو وہ سائے میں اسے خشک بھی کر لے۔
تنخواہ اور پنشن دونوں ایک ہی قبیلے کے سلسلے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ تنخواہ تیس دن کی ریاضت پیہم کے بعد ملتی ہے اور پنشن ایک ماہ کے مکمل آرام کے بعد میسر آتی ہے۔ لیکن پنشنر کی بہتری اسی میں ہے کہ وہ مسلسل ہاتھ پیر چلاتا رہے تاکہ دودکتا رہے ورنہ زندگی سے چشم پوشی اور غفلت دکٹ گرا دیتی ہے۔

دور برطانیہ میں بھی سرکاری نوکروں کو پنشن دی جاتی تھی لیکن وہ دال میں نمک کی طرح ہوتی تھی۔ اُن دنوں بیچارہ پنشنر ملازمت کے دور فراغت کو دن میں کئی بار یاد کرتا تھا بات یہ ہے کہ اُسے تنخواہ کم ملتی تھی لیکن ٹھاٹ باٹ زیادہ رہا کرتے تھے۔ بدیسی حکومت اپنے نوکروں کو تھوڑی سی ڈھیل دے کر انھیں گمن رکھتی تھی۔ لیکن جب وہ بوڑھے لگتے تو وہ انھیں معمولی سی پنشن دے کر گھر کا راستہ بھی دکھا دیتی تھی۔ اگر کوئی بدقسمت دوران ملازمت مر جاتا تو اس کے ورثا کو صبح سے شام کرنا مشکل ہو جاتا اور وہ نان شبینہ کو محتاج ہو جاتے۔ انگریز یٹیڈ آفیسر بھی مرتا تو اُس کے وہاں خاک اڑتی دکھائی دیتی۔ اگر وسائل ہوتے تب بھی ان کی زندگی آتی پُر آسائش نہ ہوتی لیکن اب پنشنرس زیادہ پُرسکون دکھائی دیتے ہیں۔ گریجوئٹی کمیوٹیشن بیمہ اور پراوڈنیٹ فنڈ یہ ساری موٹی رقمیں پنشنر کے بینک کے کھاتے کو بھاری بنا دیتی ہیں ایسے میں انھیں فراغت کی ایسی روشنی دکھائی دیتی ہے کہ آگے راستہ ملنے میں ذرا سی دشواری نہیں ہوتی۔ یہ اچھا بھی ہے اس لیے کہ عام طور پر لڑکے جوان ہوتے ہی پردیسی بن جاتے ہیں، کاش! وہ اچھے پڑوسی ہی بنے رہتے لیکن صورت حال یہ ہے کہ ہر دن صبح سویرے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ پھر اپنا رُخ زیبا نہیں دکھاتے۔ چند ایک دوسرے ٹھکانے منتقل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے بارے میں بادثوق طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ساری ذمہ داریاں بڑھ کر قبول کر لیتے ہیں کسب معاش کے سلسلے میں ہر طرح کے پاپڑ بیلتے ہیں۔ کوئی نک سک کی درست لڑکی نگاہوں میں کھب کر بیٹھ گئی تو محبت کی پینگیں بڑھا کر شادی رچا لیتے ہیں اور اس کے لیے جان کی بازی بھی لگا دیتے ہیں۔ لیکن ان سب کا ساروں سے دوہرا خرچ کسی طرح نہیں اٹھتا بات یہ ہے کہ زندگی کافی مہنگی ہے اور اُن کی جیب سکڑی جب نئی زندگی کے تقاضے اکساتے ہیں شوق کے سامان گدگداتے ہیں تو وہ انہیں سینہ سے لگا کر انھیں کے ہو رہتے ہیں۔ ایسے میں والدین طاقِ نسیاں کے حوالے ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ پنشن پنشنر کے بدن میں زندگی کی جوت جگاتی ہے عصائے پیری کا کام دیتی ہے یہ پنشن ہی کا اعجاز ہے کہ ان بوڑھے پنشنرس کے اندر آزادی سے جینے کی رسم چل پڑی ہے یہ سبھی مرنے سے کئی کئی دہے جیئے چلے جاتے ہیں۔ اور ان کے چہرے پر زندگی کے طویل سفر کا تکان دکھائی نہیں دیتا۔ پنشن مرتے مرتے انھیں ہشاش بشاش رکھتی ہے۔

پنشن کے سلسلے میں ہم لوگ فراخ دل بھی ہیں۔ بے سہارا بوڑھے اور بوڑھیاں یتیم اور بیوائیں دوران ملازمت مرنے والے سرکاری ملازمین کے ورثا، معمر ادبا، شعرا اور دانش ور، مجاہدین آزادی، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے سابق ممبر بھی پنشن حاصل کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب جتنے بوڑھے دکھائی دیتے ہیں ان میں پنشن یافتہ افراد کی اکثریت ہے۔ اب اس جود و سخا سے گنتی کے وہی چند افراد محروم ہیں۔ جو اپنی کم آمیزی کے سبب بڑھ کر جام نہیں اٹھاتے یا چند ایک اپنی کم گوئی کی وجہ سے آپ بیتی دوسروں کو سنا نہیں پاتے۔ یہ قصور انہیں کا ہے۔ خدا کی بارگاہ میں بھی ہاتھ اٹھانا پڑتے ہیں تب کہیں مانگی مراد ملتی ہے۔ فی الحال ہم سرکاری ملازمین کو دی جانے والی پنشن کے بارے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ ذرا سوچیئے تو زندگی کے دھندلکے میں جس بوڑھے یا بوڑھی کی مٹھی میں موٹی رقم ہو تو نہ صرف اس کے متعلقین ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اس کی درازیٔ عمر کی دعا مانگتے ہیں بلکہ سبھی دوسرے سن رسیدہ لوگوں کے درمیان کافی دور کی سوجھتی ہے۔ اگر آپ کو یقین نہ ہو تو مالی اعتبار سے ٹھوس کسی پیر فرتوت سے مل بیٹھیئے! اس کے چہرے پر نہ صرف اطمینان و اعتماد کی جھلکیاں دکھائی دیں گی بلکہ اس کی آواز سے یقین اور بھروسے کی ایسی مضبوطی ابھرتی ہوئی لگے گی جو دوسرے کسی بوڑھے کی آواز میں ہرگز نہ ملے گی۔

اب ذرا ہماری روئیداد بھی سنتے چلیے! ہم بزرگ بعقل نہ سہی لیکن بزرگ بہ ہر حال تو ہو چکے ہیں اور تین برس سے پنشن حاصل کر رہے ہیں۔ پنشن سے برس دو برس پہلے ہم کافی فکر مند رہا کرتے تھے۔ عجیب عجیب وسوسے اور طرح طرح کے خدشات ہمارے ذہن میں ابھرا کرتے تھے۔ ایک ہوّا سا ہمارے ذہن میں بیٹھ گیا تھا۔ کاغذات کی بھول بھلیوں سے گزرتے ہوئے کہیں نہ کہیں ضرور الجھ جائیں گے اس رہگذر میں کبھی اپنے آپ اڑچنیں کھڑی ہو جاتی ہیں اور یہ کاغذ والی سے چلتے ہوئے سستانے لگتے ہیں۔ بسا اوقات ہم جس انداز سے سوچتے ہیں اسی طرح ہو بھی جاتا ہے۔ ایک ٹی اے بل کا ذکر کا دفتر جھنکتا رہا اور سن رسیدہ ہو گیا۔ اسے تازہ دم کرنے کے لیے اے جی آفس بھیج دیا گیا وہاں سے ٹی اے بل کی صحیح سالم پہنچنے کی خبر تو موصول ہوئی لیکن سروس بک کی خیر و عافیت نہیں معلوم ہوئی اور ادھر سروس بک سے ہمارا ذہنی لگاؤ بڑھ بھی گیا تھا لہٰذا یہ خبر ہمارے ذہن پر بجلی بن کر گری ہم اس سلسلے میں جس قدر سوچتے رہے اتنا ہی یہ مسئلہ الجھتا چلا گیا اس سے پہلے کہ ہم آگے بڑھیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم دل کے ذرا کچے ہیں صورت حال مضحکہ خیز سہی لیکن بتائے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ادھر پتہ کھڑکا ادھر ہمارا دل دھڑکا کبھی ذرا سا فل عجارہ ہوا اور ہمارا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کبھی اپنے سائے ہی کو دیکھ کر بھاگ نکلتے ہیں۔ اور ناگاہ جو اندھیرے میں مینڈک اور چھپکلی کو دیکھ لیتے ہیں تو سانس کی دھونکنی رکتی ہوئی لگتی ہے۔ غرض سروس بک کے کھو جانے سے ہم نے تصور میں اپنے پنشن کے معاملہ کو گرد در گرد الجھا ہی تو لیا ذرا تصور کی حشر سامانی تو ملاحظہ فرمائیے ادھر ہم سوچ کی گہرائی میں ڈوبتے ادھر ہمارا عضو عضو کانپنے لگتا تھا۔ ایسے زمانے میں جب کہ ہم ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے اور ہمیں متلبس سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا لگتا تھا اسی زمانے میں انہوں نے ہمیں بلوایا اور کافی محبت سے بٹھایا اور اس مختصر وقفے میں انھوں نے ہمارے ڈوبتے دل کو ابھا

میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا اور کافی اعتماد سے یہ یقین دلایا کہ ہر معاملہ پر ان کی نگاہ رہتی ہے اور وہ کسی معاملہ کے تصفیہ میں ذراسی تاخیر گوارا نہیں کرتے اور ہمیں پنشن بروقت ضرور دلائیں گے۔

اگرچہ باس کے ان تسلی بخش جملوں سے ہمیں وقتی راحت تو ملی لیکن ذہن و دماغ میں جو خوف بیٹھ گیا تھا وہ اب بھی کسی کل چین نہ لینے دیتا تھا۔ جہاں ہماری یہ پریشانی اور بے قراری دفتر میں دوستوں سے اُلجھاتی وہاں گھر میں بیگم اور ہمارے خوش گوار تعلقات میں رخنے بھی ڈالتی تھی غرض ہم کتنے دنوں اس طرح اُلجھتے اور سلجھتے رہے۔

آخر وہ دن آپہنچا کہ جب ہم طویل سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہوکر پنشنر بن گئے لیکن خالی ہاتھ گھر نہیں آئے ہیں نہ صرف عارضی پنشن کا پروانہ دیا گیا بلکہ تنخواہ کی معقول رقم کا بھی حکم دیدیا گیا۔ ہمارے لیے وہ الوداعی دن ناقابلِ فراموش بن گیا ہے کہ جب احباب نے دل کی گہرائی سے ہمیں الوداعی پارٹی دے کر رخصت کیا اور باس نے ہمیں ادبی ذوق کی سیرابی کے لیے دو معیاری دلچسپ ناول بھی مرحمت فرمائے ان سبھی کو ہم چرمی بیگ میں سنبھالے ہوئے دفتر کی در و دیوار پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے خوش رہو اہلِ دفتر ہم تو سفر کرتے ہیں: کہتے ہوئے گھر کی طرف چل پڑے۔

جب سے ہم خانہ نشین ہوئے ہیں احباب کو ملازمتی زندگی سے وابستہ کوئی چٹپٹا تجربہ ضرور سناتے ہیں۔ کبھی کوئی اسے دلچسپی سے سنتا ہے اور کبھی کوئی اس غیر متعلق روئیداد کو منہ بنا کر سنتا ہے۔ اور موقع ملتے ہی بھاگ نکلتا ہے ایسے میں بیگم کہہ اٹھتی ہیں۔

" اس عارضی پنشن پر تکیہ کیے نہ بیٹھے رہیے ذرا ہاتھ پیر چلا کر مستقل پنشن منظور کرالیجئے تو بات بنے آپ جب سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ قصے بہت سنانے لگے ہیں۔ مُنی کی شادی سر پر آگئی ہے مُنا دھندے کے لیے روپیے مانگ رہا ہے میں آپ کے کان پر جوں نہیں رینگتی "

مُلا کی دوڑ مسجد تک ہم جھٹ دفتر پہنچتے باس سے منت وسماجت کرتے وہ ہمیں ڈھارس دیتے کہ سروس بک مکمل کی جارہی ہے ابھی پراویزنل پنشن لیتے رہئے۔ تیس سال کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو تقریباً جوڑ دیا گیا ہے۔ ہم فکروں میں ڈوبے گھر واپس آجاتے:

آخر ایک دن اس مایوسی نے دم توڑ دیا۔ اچانک ہماری سروس بک مل گئی جس نے ہماری پنشن کیس کے کاغذات میں جان ڈال دی اور ہمارے سارے کاغذات منظوری کیلئے اے جی آفس بھیج دیئے گئے۔ اس خبر سے ہمیں کافی خوشی ہوئی لیکن انتظار کی گھڑیاں کاٹے نہیں کٹتیں لہذا عالم انتظار میں ہم پھر خزاں جلا کر اس روشنی میں سنبھل کر نا امیدی اور مایوسی کا محل تعمیر کرنے لگے لیکن ابھی دو مہینے نہیں گزر سکتے ہیں فائنل پنشن کا حکم مل گیا۔

غرض اب ہمیں ماہ بماہ پنشن مل رہی ہے اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی بلکہ ہم خود ہی کئی مہینے گزار کر پنشن لیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے بینک بیلنس میں کافی اضافہ ہو گیا ہے اور اس اضافے کے سبب سے اطمینان رہتا ہے۔ ان دنوں گھر میں خوب جی لگتا ہے۔ اخبار و رسائل پڑھا کرتے ہیں۔ ٹی وی سے دل بہلاتے ہیں ہم مذاق دوست مل جاتے ہیں تو ان سے خوش گپیاں کرتے ہیں۔ سچ ہے "من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا"۔

اسماعیل ظریف (حیدرآباد)

یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے

یہ ہم پر جو مصیبت آپڑی ہے — یہ سب اعمال کی اپنے تڑی ہے
نہ چوڑی ہے نہ مسّی کی دھڑی ہے — لپ اسٹک ہے کلائی پر گھڑی ہے
ہے جبکہ بال کٹوانے کا فیشن — یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے
گھڑی اتنی بڑی بھائی کے گھر میں — کسی آفس کی شاید یہ گھڑی ہے
یہی تلوار بن جاتی ہے اکثر — یہ چوٹی میں جو پھولوں کی چھڑی ہے
زمانہ ہے یہ کمپیوٹر کا واعظ — یہ غصہ آپ کا باسی کڑی ہے
کوئی تیراک بن کے جی رہا ہے — کسی کے ڈوب مرنے کی گھڑی ہے
کسی سے کر کے وعدہ بھول جانا — یہ چھوٹی بات بھی کتنی بڑی ہے
شمالی ہند میں کہتے ہیں کھریا — جنوبی ہند میں کہتے کھڑی ہے
ہوئے برباد سٹّے میں نہیں غم — ابھی سسرال میں اک دھنتری ہے
تمھاری شاعری بھی کیا غضب ہے — ظریف ہر شعر گویا پھلجھڑی ہے

★

مزاح کی قدر ہے زندہ دلوں کے دل میں حضور — جو مردہ دل ہیں کہیں گے یہ شاعری کیا ہے
ظریف آپ کے اشعار خوب ہیں لیکن — غزل ہے آپ کی اس کی اتھارٹی کیا ہے

صابر بہاری (رانچی)

لڑکی

ہائے کتنی بدل گئی لڑکی — فلمی فیشن میں ڈھل گئی لڑکی
ماں ہے نرگس تو آپ ہے بابی — ماں سے آگے نکل گئی لڑکی
پانی پانی ہے قیس بھی اس سے — عاشقی کو نگل گئی لڑکی
دادی ماں نے جو اس کو ٹوک دیا — منہ چڑھا کر مچل گئی لڑکی
اچھی صورت لگا کے کرا یہنی — نئے ماڈل میں ڈھل گئی لڑکی
کون پڑھتا ہے زیست کی پستک — نادلوں میں بہل گئی لڑکی

فلم کوئی لگی جو بچّن کی!
سن کے بلیوں اچھل گئی لڑکی

نسیمہ تراب الحسن (حیدرآباد)

ہمارے پڑوسی

غالب نے جنگل بیابان میں بے در و دیوار کا گھر بنا کر ہمسایہ نہ ہونے کی شدید خواہش ظاہر کی تھی لیکن ہر ایک ایسا نہیں کرسکتا - ہماری زندگی میں یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ آپ دوسروں کے ساتھ میل جول سے رہیں بسیں۔ آپ گھر بنائیں یا کرایہ پر لیں یہ بات پیش نظر رہتی ہے کہ محلہ کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ کیوں کہ زندگی کی بہت ساری باتوں کا دارومدار آپ کے پڑوسیوں پر ہوتا ہے۔ آپ کا ہر وقت کا ساتھ ...... آپ کے بچوں کی صحبت ان ہی کی مرہون منت ہوتی ہے - اگر آپ کے پڑوسی اچھے ہیں تو اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں۔ آپ تنہا ہیں، طبیعت خاموشی سے گھبرانے لگے تو چار پڑوسیوں کے ساتھ مل بیٹھیے اور ہلکی پھلکی سی صنرغیبت شروع ہو جائے تو پتہ بھی نہیں چلتا کہ وقت کیسا گزر گیا۔ گھر کی تقریبات کی رونق بڑھانے والے ملنسار پڑوسی ہی تو ہوتے ہیں۔ آپ کے گھر خوشی ہو تو مبارک باد دینے میں پڑوسی پہلے موجود، آپ بیمار ہوں تو عیادت کے لیے خلوص سے دوڑ کر آنے والے آپ کے پڑوسی - اسی لیے انہیں ہمسایہ کہا جاتا ہے کہ زندگی میں ہر قدم پر آپ کا اور ان کا ساتھ ہے۔ لیکن اگر یہی پڑوسی آپ کی روزمرّہ زندگی پر قبضہ جمالیں آپ کی شخصی آزادی کے پہرہ دار بن جائیں اور آپ کی خانگی زندگی پر غیر ضروری تبصرہ کرنے لگیں تو وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ آپ اپنے گھر میں نظر بند ہو جاتے ہیں۔ آپ گھر کب آئے، کب گئے؟ آپ کے پاس کون لوگ آئے ہیں؟ کیوں آئے؟ ان سوالوں کا جواب آپ کے پڑوسی مانگنے لگیں تو زندگی اجیرن ہو جائے۔ وہی پڑوسی جو رحمت کے فرشتے سمجھے جاتے ہیں باعثِ زحمت بن جاتے ہیں۔ یہ جذبہ ان کے دل میں کسی ہمدردی کا باعث نہیں بلکہ کھوج کے لیے پیدا ہوتا ہے بلکہ ان کی بیکاری کا ایک مشغلہ مثلاً آپ نے کسی دن ٹھیلے والے سے زیادہ گاجریں خریدیں یا لوکی تو فوراً پڑوسن کا بچہ یہ پتہ لگانے آئے گا کہ ہمارے پاس کسی کی دعوت ہے اور جو معلوم ہوا کہ دعوت نہیں حلوہ بنے گا تو ان کی ماں یا بھابی ہمارے حلوے کی ترکیب پوچھنے بے چین ہو جائیں گی۔ اتفاق سے ہمارے میاں کی نوکری ایسی ہے کہ سال دو سال بعد تبادلہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ طرح طرح کے پڑوسیوں سے سابقہ رہتا ہے۔ ہماری ایک پڑوسن تھیں جنھیں پتہ نہیں کیوں ہمارے نوکروں سے بے حد ہمدردی تھی - انھیں کیا تنخواہ ملتی ہے - ناشتے میں کیا ملتا ہے؟ کتنی ہانڈیاں وہ پکاتی ہیں؟ عید بقرعید کیا انعام واکرام ملتا

اس کی فکر یہ جانے کیوں پڑوسن کے دل پر رہتی اور نوکر کے لیے ہمدردی کا دریا موجیں مارتا تھا۔ ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر تو ماما یا چھوکرا فراہم کرتے لیکن مہینہ جبر عد ہی وہ غائب ہو جاتا۔ پتہ چلتا کہ ہماری پڑوسن نے اس کی حالت زار پر ترس کھا کر اپنے کسی بھائی یا ماموں کے پاس دو چار روپیے زیادہ تنخواہ کے ساتھ نوکر رکھوا دیا ہے۔ جی تو چاہتا کہ ان سے جا کر تو تو میں میں کریں مگر میاں کا حکم کہ ہمسایوں سے جھگڑا ہرگز نہ کرنا اور ہماری زبان ایسی کہ ان کی طرّاری کے آگے ساتھ نہ دے سکے۔

ایک دوسری پڑوسن کو ہمیشہ یہ فکر دامنگیر رہتی کہ ہمارے گھر میں تنخواہ شوہر کے پرس میں رہتی ہے یا بیوی کے۔ اگر لائٹ رات بھر جل رہی ہے تو یہ سوال کہ ہم کیوں جاگ رہے تھے۔ بتی جلدی بجھ گئی تو یہ الجھن کہ ہم سرِ شام کیوں سو گئے؟ گھر میں کبھی فرصت میں ہنستے بولنے کو جی چاہا اور گر بڑ ہوئی تو یہ شبہ کہ بات کیا ہے۔ کہیں آپس میں جھگڑا تو نہیں ہو رہا۔ مہمان آئے تو اس کی تفصیل انھیں بتانا ضروری کہ میکے والے تھے یا سسرال کے لوگ اگر دونوں نہیں تو پھر قریبی دوست تھے یا صرف شناسائی۔ ہم نے کھانے پر بلایا یا صرف چائے، شربت پر ٹال دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے گھر کا اتا پتہ، خاندانی شجرہ ان کے روزگار کے مسائل سب کی جھڑتی دینی پڑتی ہے۔

بعض دفعہ وقت بے وقت پڑوسیوں کے عجیب و غریب مسائل حل کرنے کے لیے بھی آپ کو تیار رہنا پڑتا ہے۔ شوہر یا ساس نندوں کی شکایتیں سن کر ان کے آنسو پونچھنا۔ تسلی دینا الگ رہا اگر ان کے اصرار پر آپ نے مشورہ دے دیا تو آپ کا نام گواہوں کی فہرست میں آجاتا ہے۔ اور پھر ان کے گھر والے آپ سے نالاں رہتے ہیں۔ آپ پر گمراہ کرنے کا الزام بھی چسپاں کر دیا جاتا ہے اور نیکی برباد گناہ لازم کے ملزم کی طرح آپ دم بخود رہ جاتے ہیں۔ . . . آج کل پانی کا مسئلہ ہر محلے میں قیامت برپا کر دیتا ہے۔ خوش قسمتی سے آپ کے گھر پانی فراوانی کے ساتھ آتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ خدا کی اس نعمت سے دوسرے پڑوسیوں کو بھی سیراب کر دیں۔ پانی لینے کی اجازت دے دیں تو گھر کا نل پبلک نل بن جاتا ہے اور آپس میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ اگر آنکھیں بند بھی کر لیں تو کان میں گالی گلوج اور فحش کلامی کی رکعت پڑتی رہتی ہے۔ گھر کا ماحول ناقابل برداشت ہو جاتا ہے اور بچّوں کا ذہن نئے اور گندے الفاظ سیکھ لیتا ہے۔

اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ بچّوں کو چوری کی عادت سکھانے والے بھی پڑوسی ہی ہوتے ہیں تو غلط نہ ہو گا کیونکہ آج کی زندگی میں اخبار اور دودھ کے پیکٹ فلیٹ کے دروازے پر رکھ کر لوگ گھنٹی بجا کر چل دیتے ہیں۔ یہ عام طریقہ کار بن گیا ہے۔ اب اگر آپ نے اپنا دروازہ کھولنے میں ذرا بھی دیر کی تو بازو والے یا اوپر والے پڑوسی دودھ کا پیکٹ یا اخبار جو ہاتھ لگے لے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے بچّے بڑوں کو ایسا کرتے دیکھ کر یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دوسروں کی چیز بغیر اجازت لے لینا چوری ہے ـــــ وہ بھی باہر پڑے کھلونے یا اپنی پسند جیسی کی چیزیں اٹھا لینے میں کبھی جھجک محسوس نہیں کرتے۔

ان سب باتوں کے علاوہ دو مصیبتیں تو ہم نے خود بخود مول لی ہیں۔ ایک تو ٹیلی فون اور دوسرے ٹی وی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے تو ہم اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف لپکتے ہیں ۔ پتہ چلتا ہے کہ تیسرے گھر سے مجھلے میاں کو بلانا ہے ۔ یا کوئی پیغام پہنچانا ہے یا کوئی پڑوسن اپنے کسی رشتے دار سے بات کرنے آتی ہے اور ہم سب بھول کر اس فکر میں ساتھ لگ جاتے ہیں کہ کہیں STD کا استعمال نہ کرلیں اور ضروری بات صرف ۔ اتنی رہتی ہے کہ چھوٹی آپا سے یہ کہنا کہ بھائی جان نے میڈل ایسٹ سے جو ساڑیاں اور پرفیوم بھیجے تھے وہ سب بھابی ماں دبا کر بیٹھ گئیں ۔

اسی طرح ٹیلی ویژن کا حال ہے ۔ خریدا اس خیال سے تھا کہ اچھے پروگرام دیکھیں گے اور باقی وقت بچوں کو پڑھنے کی ہدایت رہے گی ۔ لیکن ٹی وی کیا آیا بجٹ ۔ ساتھ گھر کا سکون ختم ہو گیا ۔ شام ہوئی اور ہر سائز کی پبلک آجاتی ہے ۔ بچے قالین پر پیشاب کر رہے ہیں ۔ عورتیں صوفے پر اکڑوں بیٹھی ہیں ۔ پروگرام کے ساتھ کامنٹری چل رہی ہے ۔ کسی کا بچہ بھوک سے بلک رہا ہے ۔ کسی کو پیاس لگ رہی ہے اور آپ ہیں کہ سر براہی میں جتے ہوئے ہیں ۔ اگر آپ کا ٹی وی دیکھنے میں دل نہیں یا گھر میں کسی کی طبیعت ناساز ہے تو بھی تمام وقت دروازہ کھولتے بند کرتے گزر جاتا ہے ۔ اور وہ سکون جس کی دل کو تمنا رہتی ہے ایک ہنگامے سے بدل جاتا ہے ۔ دراصل ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پڑوسی سگریٹ پینے والوں کی طرح ہوتے ہیں جو خود سگریٹ نوشی فرماتے ہیں لیکن دھواں آس پاس بیٹھنے والوں کے پھیپھڑے خراب کرتا ہے !

یہ سب سن کر آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہمیں برے پڑوسیوں سے ہی واسطہ پڑا ہے جی نہیں ہمیں اچھے پڑوسیوں کی نعمت بھی ملی ہے ۔ بے وقت مہمان آگئے تو پڑوسن کے پاس سے جا جا یا دہی ہم نے منگا لیا ۔ ہم کہیں باہر گئے ہمارے گھر کے پاسبان ہمارے پڑوسی بن گئے ۔ کسی کے گھر میٹھا پکے یا مچھلی ہمارے دسترخوان پر ضرور موجود ۔ بچے کا عقیقہ یا سالگرہ ، کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے پڑوسن موجود ۔ کوئی مسالہ پیس رہی ہے کوئی بریانی دم دے رہی ہے ۔

الغرض ہم ان اکیلے گھر کے لوگوں سے زیادہ خوش قسمت ہیں جو دنیا میں رہ کر جینے کا لطف نہیں اٹھاتے ۔ ان بس پڑوسیوں سے اتنی گزارش ہے کہ جیو اور جینے دو کے اصول پر عمل کریں تو پڑوسیوں سے زیادہ عزیز اور کوئی نہیں ۔

●●

شاطرؔ گورکھپوری

○

آنکھیں لڑائے جن سے کئی سال ہو گئے
وہ اب تو میری جان کا جنجال ہو گئے

کوڑی کے تین رہ گئے ہم اپنے دیش میں
جا جا کے سنگاپور وہ خوش حال ہو گئے

دنیائے عاشقی کی نہ پوچھو اُتھل پتھل
کتنے ہی شہر حسن کے یہاں بتال ہو گئے

اک پری کٹی سے دل کو لگانے گئے تھے سیٹھ
ایسے لٹے بچارے، کہ کنگال ہو گئے

گھر سے چلے تھے کرتے ہوئے مشق تال سُر
پہنچے مشاعرے میں تو بے تال ہو گئے

ہم عاشقوں کے سر کی طرف دیکھیے مگر
مت پوچھیے کہ کیسے یہ بے بال ہو گئے

آئے تھے بن کے شاعرِ شیریں سخن جو کل
اتنے لٹے کہ آج وہ قوال ہو گئے

شاطرؔ کا احترام کرو، پیر دقت ہے
چھوڑے ہوئے اُسے شراب کئی سال ہو گئے
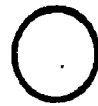
○

گرہ بر طالا

قادرؔ لکھیم پوری

کتوں نے نوچ ڈالا حقیقت نہیں ہے یہ — قادرؔ لکھیم پوری
اے دوست رازِ چاکِ گریباں کچھ اور ہے — رونقؔ صدیقی

یہ ہیں وکیل ان سے نہیں جیت پاؤ گے — قادرؔ لکھیم پوری
کس سے الجھ رہے ہو سوال و جواب میں — یاسؔ یگانہ چنگیزی

دے جائے گی وہ ڈاج مجھے چار سال بعد — قادرؔ لکھیم پوری
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں — غالبؔ

رات کوٹھی کے پردے پہ جنھیں دیکھا تھا — قادرؔ لکھیم پوری
پوچھتے پوچھتے ہم ان کے مکاں تک پہنچے — بیتابؔ عظیم آبادی

جس کی ہمیں تلاش تھی وہ ہی نہیں ملا — قادرؔ لکھیم پوری
لکھا ہوا ہے یوں تو سبھی کچھ کتاب میں — صدرالدین آزردہؔ

جو بات آپ نے چپکے سے کان میں کہہ دی — قادرؔ لکھیم پوری
مزا تو جب ہے کہ یاروں کے روبرو کہیے — علی سردار جعفری

ادھار دینے کا انجام دیکھ لے دنیا — قادرؔ لکھیم پوری
کہ دوست دوست کو دیکھے مگر نہ پہچانے — بہ نظر حسن بخاری

معلوم ہے ٹھلی بیٹھی ہیں یہ ہم جانیں یا وہ جانیں — قادرؔ لکھیم پوری
کیا کس نے کہی کیا اس نے سنی یہ بات زمانہ کیا جانے — آرزوؔ لکھنوی

سید رحیم الدین توفیق حیدرآباد

نان میٹرک

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہر طرف میٹرک کا بول بالا تھا یہ دور میٹرک کا سنہرا دور تھا۔ عام طور پر میٹرک پاس کرنے کو زندگی کی معراج سمجھا جاتا تھا اور پاس کرنے والے کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ ہر نوجوان کی دوڑ ہائی اسکول کی باڑھ تک تھی اس سے آگے اس کا دوسرا قدم کسی سرکاری دفتر میں ہوتا جہاں سے درجۂ سوم کی اسامی بڑی آسانی سے ہاتھ لگ جاتی اور ساتھ میں بالائی آمدنی کے مواقع بھی۔ تعلیم کا مقصد عام آدمی کے لیے ہمیشہ سے روزگار حاصل کرنا رہا ہے اور اتنی ہی کم تعلیم سے گوہرِ مقصود ہاتھ لگ جائے تو پھر اعلیٰ تعلیم کا جھنجھٹ کون مول لے۔ میٹرک کا سرٹیفکیٹ روزگار کی ضمانت ہونے کی وجہ سے انتہائی مقبول تھا اور کافی اہم بھی سمجھا جاتا تھا لیکن نہ جانے کیوں لوگ اس سے خائف بھی تھے۔ عام خیال تھا کہ میٹرک پاس کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہے گویا انگریزی محاورے کے مطابق یہ امتحان تعلیمی دور کی (Bottle Neck) تھا اور جو بھی اس مرحلے سے یوں نکل جاتا جیسے مسکہ میں سے بال تو اعلیٰ تعلیم اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہو جاتی ہے، ایک دو بزرگ حضرات بھی ہمیشہ ہماری برین واشنگ کیا کرتے کہ میاں بس میٹرک پاس کر لو پھر بیڑہ پار ہے۔ اس دماغی دھلائی سے آگے چل کر ہمیں جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا اور جو ہمارا بیڑہ غرق ہوا وہ ایک علاحدہ دلخراش اور عبرت ناک (طالب علموں کے لیے) داستان ہے۔ ایک صاحب جو زمانے کے ستائے ہوئے تھے اپنا شہر چھوڑ کر ہمارے شہر اور شہر میں بھی ہمارے محلے میں آکر بس گئے تھے۔ وہ انگریزی بڑے فراٹے سے بولتے تھے اور ان کی اس زبان دانی سے ہم کافی مرعوب تھے۔ اسی مرعوبیت کے نتیجے میں ایک دن ہم نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ جناب کی تعلیم کہاں تک ہے۔ انھوں نے بڑی سادگی اور انکساری سے جواب دیا جی میں نان میٹرک ہوں۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا یہ کون سی ڈگری یا سرٹیفکیٹ ہے حالاں کہ ہمیں نان (NON) اور میٹرک کے معنی علاحدہ علاحدہ معلوم تھے لیکن دونوں نے مل کر کیا گل کھلایا ہے اس سے ہم ناواقف تھے لیکن وضاحت طلب کرنے کی ہمت نہیں ہوئی کہ کہیں ہماری قابلیت کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے اور وہ ہم پر ہنس کر دیکھو اردو میڈیم کے طالب علم انگریزی میں کیسے نالائق ہوتے ہیں لیکن ہم نے ہمت نہیں ہاری اور کھوج میں لگے رہے۔ لگن سچی ہو تو مقصد حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ چناں چہ ایک دن انھیں نان میٹرک اسٹیکیو پیلیں کی محفل میں ہم بھی مدعو تھے

"نان میٹرک" اس قسمت کے ہیٹے کو کہتے ہیں جس نے میٹرک کے امتحان میں شرکت کی لیکن ستاروں کی الٹی چال یا ممتحن سے اختلافِ رائے کی وجہ سے امتحان میں اٹک گیا ہے۔ ممتحن سے اختلاف ملنے پر ہمیں یاد آیا کہ ہماری ایک رشتہ دار تھیں۔ ان کا لاڈلا کند ذہن، بدشوق اور نالائق نواسہ جب بھی کسی کلاس میں فیل ہو جاتا تو وہ استادوں کو گالیاں دیتیں اور کوستیں کہ کم بختوں نے ان کے ہیرے کو دشمنی سے فیل کیا ہے۔ وہ سب اس سے جلتے ہیں کہ وہ پڑھائی لکھائی میں کلاس میں سب سے آگے ہے جب ہم ان سے پوچھتے کہ اب فیل کرنے میں استادوں کا کیا فائدہ ہے تو وہ آنکھوں میں پانی بھر کر کہتیں اصل میں اس کا چچا ابوجہل اس کا دشمن ہے۔ وہ استادوں کو پیسے دے کر ان کے بچے کو فیل کرواتا ہے (پیسے دے کر پاس ہوتا تو سنا تھا)

بہر حال ہم لفظ "نان میٹرک" کی افادیت کے قائل ہو گئے واہ کیا مختصر اور جامع لفظ ہے منہ سے نکلتے ہی طالب علم کی اگلی پچھلی ہسٹری بیان کر دیتا ہے۔ سننے میں بھی اچھا ہی لگتا ہے۔ قریب قریب میٹرک کے ہم پلہ بھی ہے۔ آخر ان قسمت کے ماروں کی بھی کچھ پہچان ہونی چاہیے (ایک لفظ میں) جن کی کمندیں لب بام ٹوٹی ہیں۔ کیا ہوا اس نے دیوار نہیں پھاندی دیوار پر چڑھنے کی کوشش تو کی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ میٹرک اور "نان میٹرک" کی قابلیت میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ کم از کم امتحان کے آخری دن تک تو نہیں۔ اس کے بعد جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ممتحن ایک سے متفق ہوتا ہے دوسرے سے نہیں۔

پہلے "نان میٹرک" کا لفظ بڑی سختی سے صرف "نان میٹرک" کے لیے ہی استعمال ہوتا تھا۔ یعنی "نان میٹرک" کے معنے "نان میٹرک" ہی تھے واضح رہے کہ اس لقب کو پانے اور استعمال کرنے کے لیے نہ صرف امتحان میں شرکت لازمی ہے بلکہ فیل ہونا بھی شرط ہے اگر غلطی سے کوئی پاس ہو گیا تو وہ اس اعزاز سے محروم ہو جائے گا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس لفظ کے معنی بدلتے گئے بلکہ لوگوں نے اپنے مطلب کے لیے بدل دیئے اور اس کا دائرہ اتنا پھیل گیا ہے کہ اس نے اپنے سایۂ عاطفت میں ان تمام نالائقوں کو لے لیا ہے جن کے لیے الف کا نام بھالا ہے۔ ہمارے ایک واقف کار کی ڈھائی پر ہم دنگ رہ گئے جب ہماری ہی محلے کی میں جائنری اسکول سے بھاگے ہوئے ان نوجوان نے کسی کو بتایا کہ وہ نان میٹرک ہے۔

یہ لفظ ایسے آڑے وقت بہت کام آتا ہے جب ہم اسم نویسی بھیجی جاتی ہے۔ ایک انگوٹھا چھاپ بھی اپنی اسم نویسی میں تعلیم کے خانے میں نان میٹرک لکھ دیتا ہے۔ یہ بڑا معصوم جھوٹ ہے لوگ ایسے دامادوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان کی بچیاں بھی صرف امور خانہ داری میں "ماہر" ہوتی ہیں۔ وہ سوچ لیتے ہیں کہ چلو شادی کے بعد کسی طرح میٹرک پاس کروا دیں گے نہیں تو کہاں جائے گا۔ آخر با عزت روزی کمانے کے لیے مرد کا پڑھا لکھا ہونا بہر حال ضروری ہے۔ لیکن ان قسمت کے مارے سسروں کی مایوسی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی جنھیں بعد میں پتہ ہوتا ہے کہ ان کا داماد "نان میٹرک" تو ہے مگر ہفتم پاس بھی نہیں ہے۔

ایک نان میٹرک نوجوان کی شادی میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا جو انگوٹھا چھاپ تھا۔ قاضی صاحب نے نکاح کے کاغذات مکمل کرکے جب دستخط کے لیے قلم بڑھایا تو جواب میں نوشہ نے بڑی معصومیت سے قاضی صاحب کو انگوٹھا دکھا دیا۔ قاضی صاحب تھے کائیاں، معاملے کی نزاکت کو سمجھ گیے جلدی سے بیگ کھولا ایک پیڈ نکالا اور اس سے پہلے کہ وہ انگوٹھا مہمانوں کی نظروں میں آتا اس کا رخ پیڈ کی طرف موڑ دیا۔ لیکن خسر کے ارمانوں اور امیدوں پر بجلی گر پڑی۔

ایک ایسے ہی نان میٹرک نوجوان کو بر دکھائی کے لیے بلایا گیا تو ہونے والے خسر نے پوچھا میاں کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہے۔ کم از کم نام لکھنا۔ تو نوجوان بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلنے لگا۔ لیکن لڑکے کے باپ نے غصے سے لال پیلا ہوتے ہوئے کہا جناب کیا آپ نے ہمیں دھوکہ باز سمجھا ہے۔ میرا لڑکا نان میٹرک "ہی" ہے میری طرح۔ وہ اُن ہوشیار طالب علموں میں ہے جو بڑی مشکل سے پاس ہوتے ہوتے بچے ہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے آپ اپنا اطمینان کر لیجیے۔ یہ سن کر نوجوان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ آخر امتحان ہی ہے۔ خسر نے کہا جناب مجھے غلط مت سمجھیے میرا یہ مطلب نہیں تھا دراصل بڑی کے معاملے میں دھوکہ کھا چکا ہوں اس لیے پوچھ لیا دودھ کا جلا ہوں نا۔

ہمارے ایک رشتہ دار کی لڑکی کے لیے رشتہ آیا تو "حضرت" نے اسم نویسی میں "نان میٹرک" لکھ دیا شادی کے چند ماہ بعد ضمیر کی ملامت سے مجبور ہو کر انھوں نے جھینپتے ہوئے خود ہی یہ انکشاف کیا کہ انھوں نے صرف پرائمری اسکول پاس کیا ہے لیکن اردو لکھنے پڑھنے میں نہ صرف ماہر ہیں بلکہ ڈرامے لکھتے ہیں اور اسٹیج بھی کرتے ہیں چناں چہ انھوں نے ہمیں اپنے ڈراموں کی کاپی دکھائی اور خصوصاً اپنی لکھائی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانے کی کوشش کرتے رہے کہ بقول مہاتما گاندھی "خوش خطی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی نشانی ہے"۔ اس دلیل سے بے شک وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے لیکن قابلیت کو کون دیکھتا ہے لوگ تو سرٹیفکیٹ مانگتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے عزت بچانے کی خاطر اسم نویسی میں "نان میٹرک" لکھ دیا جو غلط تھا۔

شادی کے چند سال بعد انھوں نے دبی زبان سے بتایا کہ وہ میٹرک کا امتحان دے رہے ہیں کیوں کہ ان کے آفس میں یہ افواہ پھیلی ہے کہ ایسے قابل حضرات جو میٹرک پاس ہوتے ہوئے بھی برسوں سے درجہ چہارم کی تپائی پر چپکے ہوئے ہیں درجہ سوم کی کرسی سے نوازے جائیں گے تاکہ کم از کم باعزت تو ریٹائر ہوں۔ چند ماہ بعد انھوں نے خوش خبری سنائی کہ وہ میٹرک پاس ہو گئے ہیں اور انھیں سرٹیفکیٹ بھی مل گیا ہے اور اس خوشی میں وہ دعوت کرکے پھول پہننے والے ہیں۔ یہ سوال ہمارے ہونٹوں تک آکر رہ گیا کہ جناب پچھلے چھ ماہ میں نہ کوئی امتحان ہوا ہے نہ کسی امتحان کا نتیجہ نکلا ہے۔ آپ نے علی گڑھ سے تو میٹرک پاس نہیں کیا ہے؟ کیوں کہ ایسے نالائق اور کند ذہن نوجوان جو میٹرک کا امتحان دیتے دیتے عاجز آچکے ہیں اور جنھیں امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی وہ اپنے ہیڈ ماسٹروں کے مشورہ پر سیدھا علی گڑھ کا رخ کرتے ہیں۔ اور ایک ہی ہلہ میں کامیاب ہو کر سرخ رو اور

نا وہاں لوٹتے ہیں۔ بعض چالاک نوجوان تو گریجویٹ ہوکر لوٹتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ وہاں کی علمی آب وہوا کا
سید صاحب کی کرامت چل رہی ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ دنیا میں حاسدوں کی کمی نہیں۔ ایک حاسد نے
چپکے سے یہ بات پھیلا دی کہ ان کا یہ سرٹیفکیٹ "اعزازی" ہے جو انھوں نے پانچ سو روپے عطیہ دے کر حاصل کیا
ہے۔ دعوت میں ہم نے ان کی پیٹھ ٹھونک کر کہا کہ اب 'بی' اے بھی اسی طرح کرلو ہم نے اسی پر اتنا زور دیا کہ وہ سٹپٹا گئے۔
اور کہنے لگے اب آپ سے کیا چھپانا ہے۔ فی الحال خاموش رہیے عزت کا سوال ہے۔ اور اب بی اے کر کے کیا کروں گا
یہ امتحان بھی اس لیے پاس کرسکا کہ خدا کو اپنے "نان میٹرک" بندوں پر رحم آگیا اور اس نے چند فرشتوں کو انسان
کے بھیس میں ہماری مدد کے لیے بھیج دیا جنھوں نے ہمارے نام ہدیہ لے کر یہ آسمانی صحیفے (سرٹیفکیٹ) ضرورت مندوں
میں بانٹ دیئے۔ ہدیہ بھی انھوں نے اس لیے لیا کہ وہ انسانی بھیس میں تھے اور اس دنیا میں تھے جہاں پیسے کے بغیر
نہ کام چلتا ہے نہ کام نکلتا ہے۔

●●

پاکستان میں

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے مجموعے

اس وقت ہندوستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین صف اوّل کے طنز و مزاح نگار ہیں ان
دونوں کی ایک ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں۔ پاکستان میں ان کی
تحریریں بہت کم چھپی ہیں اور کتاب تو کوئی نہیں چھپی۔ گزشتہ سال یہ دونوں جب پاکستان
آئے تھے، تو انھوں نے مکتبۂ ہم زباں کراچی کو اپنی تحریروں کے انتخابات شائع کرنے کی اجازت
دی تھی۔ مکتبۂ مذکور نے یہ انتخابات حال ہی میں شائع کر دیئے ہیں، جنہیں معروف افسانہ نگار
رعنا فاروقی نے مرتب کیا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے انتخاب کا نام "قطع کلام" ہے جس میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے ساتھ
شخصی خاکے اور سفرنامے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ رعنا فاروقی نے مبسوط دیباچہ لکھا ہے۔ فلیپ
میرزا ادیب کا ہے

یوسف ناظم کا انتخاب "زیرِغور" بھی طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور شخصی خاکوں پر مشتمل ہے
رعنا فاروقی نے دیباچے میں یوسف ناظم کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ ظاہر مسعود نے فلیپ
[illegible]ا ہے

●○

امجد علی فیض
(گلبرگہ)

آنکھیں میری سب کچھ اُن کا

اب جب کہ ہم سرکاری اسپتال میں داخل ہو رہے ہیں تو ایک خانگی ماہر امراض چشم کے کہے ہوئے کلمات ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کہ ہمارے ہاں ایسے مریضوں کا علاج نہیں ہوتا جن کے ایک مرض کی تشخیص پر کئی امراض یہ احتجاجی نعرہ لگاتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں :

ہماری مانگیں پوری کرو۔۔۔!
ہماری مانگیں پوری کرو۔۔۔!
ورنہ کرسی خالی کرو۔۔۔۔!

اس سے پہلے کہ ہمارا اور مریض کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلکنے لگتا ہم وہاں سے کھسک گئے جب شعبۂ امراض چشم تک پہنچے تو قلب کو سکون نصیب ہوا جیسے یہی منزل مقصود تھی۔ کسی قدر ڈرتے اور سہمتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے ۔۔۔۔۔۔ تو دیکھتے کیا ہیں کہ ہر طرف مریض کرسیوں کی پشت پر سر ٹکائے محو استراحت ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں بھی اپنا بستر بھول آنے کا افسوس ہوا اور دوسرے ہی لمحے یہ احساس بھی کہ کہیں یہ سونا ابدی سونا تو نہیں؟ اچانک گھپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نظر آئی یعنی ایک مہاشے کرسی پر بیٹھے جاگ رہے تھے۔ ہم نے سوچا ہو سکتا ہے یہ ان سب کو تھپک تھپک کر سلانے پر معمور ہوں گے۔ مگر مہاشے نے ہمیں دیکھتے ہی ہانک لگائی:

"آئیے آپ بھی اپنا نام لکھائیے اور آنکھوں میں عرق ڈال کر سو جائیے تا کہ وقت آنے پر آپ کا نام بھی پکارا جا سکے۔"

اس وقت نیند تو ہمیں بھی بڑی زور کی آ رہی تھی مگر ہم نے سوچا یہ بھی کوئی سونے کا وقت اور جگہ ہے جہاں والدین کے جھگڑے ہیں نہ بچوں کی چیخ و پکار، سرہانے مرغ کی بانگ ہے نہ بغل میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر بھلا ایسے میں ہمیں نیند کیسے آئے گی۔

ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ سامنے دیوار پر ایک تختی آویزاں تھی جس پر قومی زبان ہندی میں آنکھوں کے متعلق چند احتیاطی تدابیر رقم تھیں ہم نے پڑھنا شروع کیا:

۱۔ لکڑی کا دھواں آنکھوں کے لیے سخت مضر ہے۔

۳- لیٹ کر کتابوں کا مطالعہ ٹھیک نہیں اور پڑھتے وقت اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کتاب آنکھوں سے ایک فٹ کے فاصلے پر ہو۔ اسی لیے تو ہم کتابوں کو آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ نظروں سے بھی دور رکھتے ہیں۔

۴- افرادِ خاندان سرمہ ایک ہی ڈنڈی سے نہ لگائیں۔ البتہ ڈنٹھے سے لگایا جا سکتا ہے ۔

نوٹ : صفائی کا خاص خیال رکھیں جو صرف گھر اور محلے تک ہی محدود ہے۔ اسپتال یا اس کے اطراف ایسی کسی قسم کی پابندی ضروری نہیں ۔

ابھی ہم صفائی کے متعلق غور فرما رہے تھے کہ پردے سے ندا آئی چلے آؤ اندر' تو ہم اندر چلے گئے۔ اندر کا ماحول باہر سے بھی زیادہ پرسکون دیکھ کر ہماری وحشت میں مزید اضافہ ہوا۔

کمرے کی ایک جانب ٹیبل رکھی ہوئی تھی جس پر آلات یوں رکھے ہوئے تھے جیسے اعلانِ جنگ ہوتے ہی ہم پر حملہ کر دیں گے اسی ٹیبل سے منسلک کرسی پر ڈاکٹر صاحب بیٹھے اتنی بڑی بڑی جماہیاں لے رہے تھے کہ ہمارا دل لرزنے لگا کہیں یہ ہمیں پلک جھپکتے ہی ہڑپ نہ کر جائیں مگر ہمارے قریب جاتے ہی موصوف نے ہمیں سامنے والی کرسی پر یوں چسپاں کر دیا جیسے ہم کوئی فلمی اشتہار ہوں۔

اب جو سوالات کی یلغار شروع ہوئی بس اللہ کی پناہ یکے بعد دیگرے سوالات یوں داغے جا رہے تھے جیسے دشمن کے ٹھکانوں پر بم برسائے جا رہے ہوں :

" پہلے آپ یہ بتائیے یہ مریض کون ہے"؟

" کہاں سے آیا ہے"؟

" کیا چاہتا ہے"؟

" اس کے آنے کا مقصد اور ٹھہرنے کا مقام"؟

" اور یہ کتنے دن سے آپ کے یہاں مقیم ہے ؟"

سوالات کچھ اس نوعیت کے کیے جا رہے تھے کہ خواہ مخواہ مریض پر قریبی رشتہ داری کا گمان ہونے لگا۔ ہم نے مریض کے حالات اور اس کے اغراض و مقاصد سے ڈاکٹر صاحب کو آگاہ کر دیا یہ سن کر وہ ہمارے قریب آئے اور ہم پر زور آزمائی شروع کر دی۔

نبض کو ٹٹولا، زبان دیکھ ڈالی، اب پپوٹوں کو یوں رگڑے جا رہے تھے جیسے اس رگڑ سے چنگاری پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں پھر پلکوں کو اٹھا کر ہماری آنکھوں میں کسی گمشدہ چیز کو کچھ دیر تک تلاش کرتے رہے۔ جب چشم سیر ہو کر دیکھ چکے تو گویا ہوئے ،

" میاں تمہاری آنکھیں کسی جاذب نظر سے لڑی تو نہیں ؟ ہم نے چونک کر کہا قبلہ قطعی نہیں کیوں کہ تاریخ گواہ ہے کہ آج تک جتنی بھی جنگیں لڑی گئی ہیں ان میں آنکھوں کے لڑنے کا ذکر نہیں ملتا تو ہم کیوں کوئی

نئی تاریخ مرتب کرکے آنے والی نسلوں کو گمراہ کریں۔

"پھر تو میاں تمہاری آنکھوں کو دواؤں سے دھونا پڑے گا" اتنا کہہ کر موصوف نے ایک جلن پیدا کرنے والی دوا کے چند قطرے ہماری آنکھوں میں ٹپکائے اور خود سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے۔

ہم نے سوچا خدایا یہ دھونا کیا بلا ہے کہیں اس دھونے کا مطلب بینائی سے ہاتھ دھونا تو نہیں؟؟؟ کچھ دیر بعد آنکھیں کھولیں اور بینائی کو حسب حال بحال پایا۔

اب پھر ایکبار ہماری آنکھوں کی ورق گردانی شروع ہوگئی مگر کانوں کے گرد ایک نازک سی فریم کے اضافے کے ساتھ، اس فریم میں مختلف عدسہ جات یوں بدلے جا رہے تھے جیسے مغربی ممالک کی نیک بی بیاں اپنے شوہر حضرات کو بدلتی ہیں۔ اس دوران روشنی بھی گل کردی گئی۔ اچانک پیچھے سے ایک کرن نمودار ہوئی جو شاید امید کی کرن سے مختلف تھی۔ اب ہمیں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ سامنے دیوار پر ایک تختی نظر آئی جس پر حروف تہجی لکھے ہوئے تھے ہم نے بڑی ہی شان کے ساتھ پڑھنا شروع کیا مگر پتہ نہیں ایک عدسے کے بدلتے ہی اچانک کیا ہوگیا کہ حروف دل عاشق کی طرح پھیلنے اور سکڑنے لگے حتیٰ کہ معدوم ہوگئے ہم نے سوچا کہیں اس کمبخت امراض چشم سے ہم مبتلائے محبت تو نہیں ہو رہے ہیں کیوں کہ سنا تھا کہ محبت اندھی ہوتی ہے۔

ہم یہ سب کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ موصوف نے ہماری آنکھوں سے فریم نکالی اور ساتھ میں ہمیں بھی اس جواب کے ساتھ باہر نکال دیا کہ "میاں تمہاری بینائی تو ٹھیک ہے ہاں اگر عینک لگانے کا اتنا ہی شوق تھا تو بازاری عینک لگاتے جس سے آپ کی بینائی واقعی اس قابل ہو جاتی کہ ڈاکٹر کی تجویز کردہ عینک لگائی جاسکے۔ جائیے ہمارے ہاں مرض کا علاج ہوتا ہے کم فہمی کا نہیں سمجھے!"

بات اب بھی ہماری فہم سے کوسوں دور تھی اس لئے ہم نے چپ چاپ اپنے گھر کی راہ لی۔

حبیب الرحمٰن بزمی
(رانچی)

○

نفرت بھی کر رہے ہو تو کبھی پیار کر رہے ہو
ماں باپ کی نظروں میں مجھے خوار کر رہے ہو
کہنے کو تو کہتے ہو مجھے پیار کر رہے ہو
کیوں میرے رقیبوں سے نظر چار کر رہے ہو
سج دھج کے لبِ بام جو آئے ہو تو سوچو
مسجد کے مؤذن کو خطا وار کر رہے ہو
میں زہر اسی بات پہ کھاؤں گا کسی دن
ہر روز جو جھگڑا سرِ بازار کر رہے ہو
[illegible] میں تو چرچا ہے کہ تم مجھ پہ مرے ہو
دیکھوں بھی ذرا کب اسے ساکار کر رہے ہو
چوکھٹ پہ پڑی اس لیے بیٹھا ہے بزمی
کب دل کی حویلی میں اسے پار کر رہے ہو

○

اس کی بندیا بھی برق و شرر ہو گئی
ایسی چمکی کہ شب میں سحر ہو گئی
میں نے کھانسا تو ان کو خبر ہو گئی
بندگی مستقل دردِ سر ہو گئی
اس گرانی میں مہمان کو دیکھ کر
اپنی حالت تو زیر و زبر ہو گئی
ہال سے دونوں مل کر تو نکلے مگر
بھیڑ میں، میں اِدھر وہ اُدھر ہو گئی
اُن سے ٹکرانے کا کچھ ارادہ نہ تھا
ایک بھرپور ٹکر مگر ہو گئی
اس صداقت سے انکار ممکن نہیں
لیڈری آج نا معتبر ہو گئی
غیر کے ساتھ بزمی نے دیکھا اُسے
آہ! اُس کی دعا بے اثر ہو گئی

اک شخص

بھیڑ کیسی لگا گیا اک شخص
اپنا کرتب دکھا گیا اک شخص
جل گیا شہر، لٹ گئی بستی
آگ ایسی لگا گیا اک شخص
اپنے فنِ دروغ گوئی سے
سب کو بدھو بنا گیا اک شخص
بن کے معصوم گاؤں میں آ کر
سوئے فتنے جگا گیا اک شخص
کام اچھا ریلیف کا نکلا
بینک بیلنس بڑھا گیا اک شخص
میں جو مسجد گیا میاں بزمی
میرا جوتا چرا گیا اک شخص

منظور وقار (گلبرگہ)

شاعر کا خط ڈاکٹر کے نام

عزیز دوست ڈاکٹر کمزور احمد خان طاقت

سلام مسنون!

تمہارے نام خط لکھ کر تمہاری "سہرالی سکونیت" میں خلل ڈال دینے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ کیا کرتا تمہیں خط لکھنا ضروری تھا۔ میں اس وقت بستر پر پڑا زخموں کے درد سے کسی فلاپ فلم کے پروڈیوسر کی طرح بلبلا رہا ہوں۔ آپ سوچ رہے ہوں گے ہندوستانی سیاست کی طرح میری حالت اس قدر خراب کس طرح ہوگئی! تفصیلی واقعات قلمبند کر رہا ہوں۔ آپ میرے کرب کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہوئی کہ آج سے چند روز قبل مجھے تعلقہ پاشا پور کے میونسپل چیرمین جناب رمضان علی گھنگھر والا کے خاص سکریٹری جناب پتھر وبھائی پتھر کا خط ملا تھا جس میں لکھا تھا:

"پاشا پور میونسپل کمیٹی کی جانب سے "پہلا بچہ ابھی نہیں۔ دو کے بعد کبھی نہیں" کے عنوان سے ایک کل ریاستی مشاعرہ منعقد ہونے والا ہے جس میں ریاست کے ممتاز شعراء شرکت کر رہے ہیں آپ کو بھی اس عنوان کے تحت کلام سنانے کی دعوت دی جا رہی ہے اگر آپ راضی ہیں تو اپنے کلام کے ساتھ پاشا پور تشریف لائیں۔ سفر خرچ کے علاوہ کلام سنانے کی معقول فیس بھی دی جائے گی۔ نیز قیام وطعام کا خاص انتظام رہے گا۔

جواب کا منتظر!"

پتھر وبھائی پتھر دکنویز شاہ

خط پڑھنے کے بعد میں پہلے تو پتھر وبھائی پتھر کا نام پڑھ کر حیران رہ گیا۔ کیونکہ مشاعروں کے میدان میں ان کا نام بالکل نیا تھا۔ پھر سوچا جس طرح ہمارے شہر میں آج کل اردو انجمنوں، مشاعروں، ادیبوں اور مشاعرے منعقد کرنے والوں کی پیداوار دکش زور شور سے ہو رہی ہے اسی طرح پاشا پور میں بھی کوئی پتھر وبھائی پتھر کے روپ میں ایک سرگرم خادم اردو کی تخلیق ہوئی ہوگی ویسے مقامی مشاعروں سے لے کر کل ہند مشاعروں کے انعقاد کے پیچھے پتھر وبھائی پتھر جیسے لوگوں کا ہی ہاتھ ہوتا ہے۔ مجھے بھی: سفر خرچ، قیام وطعام اور کلام سنانے کی فیس کے ساتھ دعوتِ سخن دی گئی تھی اس لیے میں اس حقیقت کو جانتے ہوئے بھی کہ میں خود ایک درجن بچوں کا باپ ہوں فیملی پلاننگ کے فوائد پر کلام سنانے کے لیے راضی ہوگیا اور اپنی رضامندی کا خط پتھر وبھائی پتھر کے نام پوسٹ کر دیا۔ جس دن مشاعرہ تھا اسی دن دوپہر دو بجے کی بس پکڑ کر پاشا پور کے لیے روانہ ہوا۔ مشاعرہ رات دس

بجے ہونے والا تھا۔ پاشاپور کا سفر بذریعہ بس تین گھنٹے کا ہے۔ میں نے سوچا کہ بس شام پانچ بجے تک پہنچ ہی جائے گی۔ مگر اس دن بس نے راستے میں ایسے ایسے نخرے دکھائے کہ پانچ بجے پاشاپور پہنچنے کے بجائے رات دس بجے پہنچی۔ بس اسٹانڈ پر میرا کسی نے بھی استقبال نہیں کیا تنہا چھترو بھائی بھترو کے بتائے ہوئے مقام کی تلاش میں نکل پڑا شاید لائٹ فیل ہو چکی تھی اس لیے پاشاپور پہ اندھیرے کا راج تھا۔ گلیوں اور بازار میں سناٹا چھایا ہوا تھا البتہ چبوتروں پر چند معذل پنچایت کے اکڑو بیٹھے ملک کی سیاست پر بحث کر رہے تھے۔ ایک طرف پانچ چھ آوارہ کتوں کا گروپ اونگھنے میں مصروف تھا جو کسی شخص کے نظر آنے پر کچھ دیر بھونک کر خاموش ہو جاتا۔ میں حیران و پریشان بھترو بھائی بھتر کی تلاش میں سہم سہم کر آگے بڑھ رہا تھا کہ کتوں نے مجھے گھیر لیا اور لگے حلق پھاڑ پھاڑ کر بھونکنے گھبراہٹ میں میری زبان سے نکلا "دوستو! میں صرف شاعر ہوں جدید شاعر نہیں!" اتنا سنتے ہی کتوں نے بھونکنا بند کر دیا اور واپس لوٹ گئے۔ میں جان بچی لاکھوں پائے کا نعرہ لگاتا ہوا چند قدم چل پایا تھا کہ میری نظر انسانوں کے ایک گروپ پر پڑی۔ لیکن کہ ان کے قریب پہنچا وہ حیران پریشان انسانوں کا گروپ ہمارے شہر کے شعرا حضرات کا تھا مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے لٹک گئے۔ شاید میری آمد کی انہیں امید نہیں تھی استفسار پر معلوم ہوا کہ سبھی بھترو بھائی بھتر کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں کافی دوڑ دھوپ اور تلاش کے بعد بھترو بھائی بھتر کے مکان کا پتہ چلا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اندر سے ایک پہلوان نما منسٹنڈا لنگی بنیان میں ملبوس نمودار ہوا۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر اس کے سخت اور سیاہ چہرے پر ایک طنز بھری مسکراہٹ کی لہر (جس میں حقارت زیادہ تھی) دوڑ گئی۔ اسکے موٹے موٹے ہونٹوں سے دکھنی ڈائیلاگ ادا ہونے لگے "میرا نام ایچ بھترو بھائی بھتر ہے۔ شاید آپ لوگاں شاعراں ہوں گے۔ معاف کرنا میں آپ لوگاں کو لینے بس اسٹانڈ پر ضرور آتا مگر آج ایچ میری گھر والی کو ساتواں بچہ ہوا ہے۔ گھر پو رہنا ضروری تھا۔ خیر کوئی بات نہیں تم کچھ دیر ٹھہرو میں ابھی آیا"۔ ہم لوگ بھترو بھائی بھتر کے انتظار میں ایک گھنٹہ کھڑے رہے۔ کیونکہ بھترو بھائی بھتر کا "کچھ دیر" ایک گھنٹے کا تھا۔ بھترو بھائی لنگی کے اوپر کوٹ پہن کر گھر سے باہر نکلے ہم سب بھترو بھائی بھتر کے پیچھے پیچھے اس طرح چلنے لگے۔ جس طرح منتری کے پیچھے پیچھے ان کے چمچے چلا کرتے ہیں۔ اس وقت تک لائٹ آچکی تھی پاشاپور کی گلیوں اور بازار میں بلب جل اٹھے تھے۔ چند قدم چلنے کے بعد ایک انتہائی بوسیدہ عمارت (جس کا پلاسٹر خزاں رسیدہ پتوں کی طرح جھڑ چکا تھا) نظر آئی جس پر ایک پرانا بورڈ آویزاں تھا۔ جس پر لکھا تھا "امریکن لاج"۔ بھترو بھائی بھتر "امریکن لاج" کی طرف اشارہ کرکے بولے "آپ لوگاں کے کمرے بک ہیں آپ لوگاں آج کی رات اس لاج میں ایچ کاٹیں مشاعرہ کل رات دس بجے ہوگا کیونکہ آج سیٹھ رمضان علی گھنگھرو والا کی بڑی سالی اللہ کو پیاری ہو گئے"۔ شعرا نے اپنے اپنے کمروں کا جائزہ لیا۔ پلنگ اور بستر کی حالت کو دیکھ کر مجھے لگا میں کسی لاج کے کمرے میں نہیں خیراتی اسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوں۔ رات کھٹملوں سے لڑتے اور انہیں دیواروں پر مسلتے گزر گئی۔ صبح جب تمام شعرا میں اپنے اپنے کمروں سے باہر نکلے تو سب کی آنکھیں سرخ تھیں۔ صبح ہمارے کھانے کا انتظام ایک اڈپی ہوٹل میں کیا گیا تھا۔ تمام شعرا رات سے بھوکے تھے۔ سادہ چاول، دو تین نمونے کی دال، بھاجی، اچار اور نمک پر ٹوٹ پڑے کھانا کھانے کے بعد ہم سب کھیتوں کی ہوا کھانے کے لیے نکل پڑے اور شام تک صرف ہوا ہی کھاتے رہے۔

شام سات بجے ہم سب نے ہاتھ منہ دھوئے۔ کپڑے تبدیل کیے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا، کپڑوں پر عطر چھڑکا اور جھومتے ہوئے مشاعرہ گاہ کی طرف نکل پڑے۔ پاشاپور میں صبح ہی سے ایک ٹریکٹر پہ لاؤڈ اسپیکر کے ذریعہ مشاعرے کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اسی لیے وقت مقررہ سے قبل ہی باذوق سامعین اپنی اپنی دھوتیوں اور گاندھی ٹوپیوں کو سنبھالے اسٹیج کے سامنے بچھائے گئے ٹاٹوں پر بیٹھے بیڑیوں کے دھوئیں سے مشاعرہ گاہ کے ماحول کو معطر بنانے میں مصروف تھے۔ خدا خدا کرکے رات دس بجے میونسپل چیرمین جناب رمضان علی گھنگرو والا کی صدارت میں مشاعرے کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے کنوینر مشاعرہ جناب پتھر و بھائی پتھر نے ایک دکھنی شاعر کو دعوت سخن دی۔ ضلع افسوس نگر سے آئے ہوئے اس دکھنی شاعر کا نام تھا شیخ احمد قہقہہ۔ مسٹر قہقہہ نے ——— فیملی پلاننگ کی اہمیت پر لکھے ہوئے اپنے مزاحیہ اشعار کے وہ چھوے اور چھکے لگائے کہ تمام سامعین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ شیخ احمد قہقہہ کے بعد ضلع سوکھا نگر کے سنجیدہ شاعر خوش دل خاں افسردہ کا نام پکارا گیا۔ خوش دل خاں افسردہ نے "ایک بارہ بچوں والی ماں کی فریاد" کے عنوان سے اپنی ایک طویل نظم ترنم میں سنانے لگے۔ سامعین نے ان کی پھٹے ڈھول جیسی آواز کو کچھ دیر تو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جب نظم طویل سے طویل تر ہونے لگی تو سامعین کے صبر کا پیمانہ ٹوٹ گیا۔ سامعین میں سے نعرے بلند ہونے لگے "بس کر... بس کر ..... بیٹھ جا بیٹھ جا" مجبوراً خوش دل خاں افسردہ کو اپنی جگہ لینی پڑی۔ افسردہ کے بعد ضلع ہیبت واڑی کے ایک محال شاعر رستم میاں مردہ کا نام پکارا گیا۔ رستم میاں مردہ ایک نوجوان جدید شاعر تھے۔ وہ خوش دل خاں افسردہ کی درگت دیکھ چکے تھے اس لیے انھوں نے بجائے اپنی جدید نظم یا آزاد غزل سنانے کے کثیر العیال کے نقصانات پر چند لطیفوں پر مشتمل ہائیکو شاعری سنائی اور ہوٹنگ سے سرفراز ہوئے۔

رستم میاں مردہ کے بعد کنوینر مشاعرہ جناب پتھر و بھائی پتھر خود اپنا کلام سنانے کے لیے ٹھہر گئے اور اپنے موٹے موٹے ہونٹوں سے دکھنی زبان میں چند بے وزن و بے بحر شعر اگلنے لگے۔ اور بھونڈی مثالوں سے فیملی پلاننگ کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوششیں کرنے لگے۔ سامعین سر ہلا ہلا کر داد دینے لگے "واہ پتھرو بھائی واہ" "بہت خوب پتھرو بھائی"۔ "بہت خوب" کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ پتھرو بھائی کے بعد میری باری آئی۔ میرے پاس نہ تو کوئی مزاحیہ کلام تھا اور نہ مجھے لطیفے یاد تھے۔ ویسے مجھے اپنا کلام سنانا ضروری تھا ورنہ کلام سنانے کی فیس اور واپسی کے ٹکٹ سے محروم رہ جاتا۔ میں نے ہمت کرکے اپنی ایک تازہ نظم جس میں میں نے فیملی پلاننگ کی مذمت کو بڑی عمدگی سے سمویا تھا سنانے لگا۔ ابھی دو چار مصرعے سنانے بھی نہ پایا تھا کہ سامعین کے نعرے بلند ہونے لگے "بیٹھ جا" "بس کر، بس کر" اس سے پہلے کہ سامعین مجھ پر ٹوٹ پڑتے میں نے گھبرا کر اسٹیج پر سے چھلانگ لگائی اور ہانپتے ہوئے لاج پہنچا۔ اور پلنگ پر کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑا۔ تقریباً دو گھنٹے گزرنے کے بعد تمام شعراء مشاعرہ گاہ سے واپس لوٹے، پیچھے پیچھے پتھرو بھائی پتھر بھی تھے۔ انھوں نے آتے ہی ایک کیش بیاگ سے روپیے نکال کر شعراء میں تقسیم کیے۔ سب سے پہلے شیخ احمد قہقہہ کے ہاتھ میں سو سو روپے کے چار نوٹ رکھ دیئے۔ پھر رستم

میاں مردہ کے ہاتھ میں سو سو کے تین نوٹ رکھ دیئے۔ دیگر تمام شعرا کے ہاتھوں میں سو سو کے دو دو نوٹ رکھ کر میری طرف سو روپے کا صرف ایک ہی نوٹ اچھال دیا۔ سو روپے کا ایک نوٹ دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا اور میں نے پوچھا "کیوں پتھرو بھائی یہ کیا؟" "آپ مجھے صرف سو روپے دے رہے ہیں؟" پتھرو بھائی گرجے "اجی! سو روپے لیتیں یا نئیں! روتی صورت کلام سنا کو تماں۔ ہسانے ایچ نئیں آتا۔ چیرمین صاحب کے سامنے میری ناک کٹاکو چھوڑے نا!"

پتھرو بھائی کا جواب سن کر مزید کچھ کہنا بے کار تھا۔ فوراً بس پکڑ کر شہر پہنچا۔ مکان میں جب داخل ہوا تو میری حالت دیکھ کر میری بیوی اور بچے رونے لگے۔ بیوی نے روتے روتے پوچھا:

"کیوں جی! تم تو پاشا پور مشاعرہ پڑھنے گئے تھے پھر یہ تمھاری حالت قبر سے نکلے ہوئے مردے کی طرح کیوں ہوئی؟"

میں نے تمام حالات سنائے تو سب خاموش ہو گئے۔ پچھلے دو دن سے بستر پر پڑا کراہ رہا ہوں تمھارے گھر بچے کو بھیجا تھا معلوم ہوا آج کل تم اپنے سسرال حیدرآباد میں بیٹھے سکون کے چند دن گزارنے میں لگے ہو۔ اس لیے یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرا خط ملتے ہی تم فوراً چلے آؤ کیوں کہ تم میرے فیملی ڈاکٹر ہی نہیں میرے قریبی دوست اور شاعر بھی تو ہو۔ ایک بار پھر تمھاری سسرالی سکونت میں خلل ڈالنے کی معذرت چاہتا ہوں۔ فقط

ملّامہ پاگل پاکھنڈی

خامہ بگوش (کراچی)

ذکر ایک کتاب کا جو غنودگی کی حالت میں لکھی گئی

اور

اسی حالت میں پڑھی بھی جا سکتی ہے

ابھی ہم اشفاق احمد کی کتاب "ذکرِ شہاب" کی طلسمی فضا سے باہر نہیں نکلے تھے کہ ان کی بیگم بانو قدسیہ نے بھی قدرت اللہ شہاب کے بارے میں "مردِ ابریشم" کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کرا دی ہے، جسے پڑھ کر ہم ایک خواب آور فضا میں پہنچ گئے ہیں۔ "خواب آور" اس لیے کہ بانو قدسیہ نے شہاب مرحوم کو صرف حقائق ہی کے حوالے سے نہیں دیکھا بلکہ خوابوں کے ذریعے بھی پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ بانو قدسیہ کا ایک خواب ملاحظہ کیجیے:

"ایک پہاڑی علاقے میں ایک کشادہ سڑک ہے، جس پر کار چل رہی ہے اور اس میں شہاب بھائی، میں اور خان صاحب (اشفاق احمد) سوار ہیں۔ . . . ایک ایسے مقام پر جہاں نشیب میں ایک خوب صورت گاؤں اور پشت کی جانب ایک آبشار ہے، کار رک جاتی ہے۔ شہاب بھائی بولے "اس آبشار کو دیکھو اشفاق! اس کا پانی چادر کی طرح گر رہا ہے اور شیشے کی طرح شفاف ہے۔ اس پر چل کر اوپر جانا ہوگا۔" . . . کچھ ہی لمحے گزرے ہوں گے کہ نظر آیا شہاب بھائی آبشار پر اوپر کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔ انھیں جاتا دیکھ کر مجھے کچھ گھبراہٹ ہوئی۔ میں نے خان صاحب کو گھسیٹا اور ہم دونوں بھاگم بھاگ آبشار تک پہنچے۔ شہاب بھائی واپس لوٹے اور بولے۔ "اشفاق وقت بہت ہی تنگ ہے، آؤ چلیں۔"

"لیکن شہاب بھائی، ہم تو پانی پر چلنا نہیں جانتے!"

میں نے کہا۔

"پانی پر چلنا نہیں پڑتا۔ جتنی تیزی سے یہ نیچے گرتا ہے، اسی رفتار سے آپ کو اوپر ڈھکیلتا ہے۔"

. . . . شہاب بھائی مسکرائے اور دونوں ہاتھ لجاجت سے آگے بڑھا کر بولے: "تم دونوں کو کچھ کرنا پڑے گا، بس مضبوطی سے میرے ہاتھ پکڑ لو، پانی تمھیں خود بخود اوپر پہنچا دے گا۔" ہم

ہونوں سے ایک ایک ہاتھ بڑی مضبوط گرفت سے پکڑ لیا اور پھر محسوس ہوا، جیسے نیوٹن کا اصول کارفرما ہے۔ جس تیزی سے آبشار گر رہی تھی، اسی سرعت سے درمیان میں شہاب بھائی، دائیں بائیں خان اور میں آبشار پر اوپر چڑھتے چلے جا رہے تھے۔"

قطع نظر اس کے کہ عالم بیداری میں کرتب دکھانے کی عادت پڑ جائے تو خواب بھی بازی گر بنا دیتے ہیں، اگر بانو قدسیہ یہ نہ بتاتیں کہ مذکورہ واقعہ ایک خواب ہے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اسے سچا واقعہ نہ سمجھتے کیوں کہ بانو قدسیہ نے زیر نظر کتاب میں جتنے بیچ واقعات لکھے ہیں، وہ بیداری کے عالم میں نہیں غنودگی کی حالت میں ہی لکھے جا سکتے ہیں۔

اس کتاب کا مرکزی اور بنیادی خیال یہ ہے کہ قدرت اللہ شہاب کا تعلق بظاہر اسی عالم آب و گل سے تھا، لیکن بباطن وہ کسی اور دنیا کے باشندے تھے۔ جب وہ ــــ "کسی کے خیر خواہ ہو جاتے، کسی پیار کی نظر کی ردا ڈال دیتے، اس کے لیے خیر خواہی کا جذبہ محسوس کرتے، تو پھر ان کی خواہش سے ہی احکام جاری ہوتے کام بننے لگتے۔ حالات سدھرنے لگتے۔ وہ چاہے انشاجی ہوں، خاں صاحب (اشفاق احمد) کا گھرانا ہو، مفتی جی کے گھر والے ہوں ..... سب کی گاڑیاں اپنے اپنے پٹرول سے چلنے لگتیں۔" (ص ۔ ۳۸)

یہی بات بانو قدسیہ نے ایک دوسرے انداز میں یوں لکھی ہے۔ "مفتی جی، اشفاق احمد، انشاجی اور جانے کون کون سے ایسے گھر تھے، جدھر انھوں نے توجہ دی اور رزق، خوشی، اولاد، محبت اور جانے کیا کیا برکتوں سے ان گھروں کو یوں بھر اکہ دروازے بند کرنے مشکل ہو گئے۔" (ص ۔ ۱۱۴) اب تک تو یہی سنا تھا کہ رزق اور اولاد وغیرہ بیچ خدا نوازتا ہے، اب معلوم ہوا کہ خدا کے بعض "برگزیدہ" بندے بھی یہ کام کر سکتے ہیں۔

شہاب صاحب کی نگاہ و توجہ کے کچھ اور مثبت نتائج بھی نکلتے تھے۔ مثلاً "اپنی آپ نوکری کے پروانے آ جاتے۔ گودیوں میں بیٹے پوتے آ جاتے .... اچانک پرائز بونڈ کا انعام نکل آتا۔ چوری کا سامان چور گھر چھوڑ جاتے۔"
(ص ۔ ۳۸)

یہ تو عالم انسانیت پر شہاب صاحب کے احسانات تھے۔ عالم نباتات پر بھی جب ان کی نگاہ مائل بہ کرم ہوتی تو ــ "بانجھ درخت پھل لانے لگتے۔ بیلیں ہری ہو جاتیں خشک ان ڈور پلانٹس میں نئے سرے سے پتیاں نکل آتیں۔ انگوروں کی بیل میں پھل زیادہ آتا۔ میگنولیا کے پودے کو پھول بے تحاشا لگنے لگتے ... . لان کے خشک حصوں میں خود بخود سبزہ پھیلنے لگتا۔" (ص ۔ ۳۸)

افسوس کہ اتنی زبردست روحانی قوت رکھنے والے شہاب صاحب کی نگاہ و توجہ اشفاق احمد اور ممتاز مفتی کے گھرانوں، انگوروں کی بیلوں اور بانجھ درختوں سے آگے نہ بڑھی۔ کاش وہ ملک اور قوم کی طرف توجہ فرماتے تو ہم بہت سی بلاؤں سے محفوظ ہو جاتے۔ بار بار مارشل لا نہ لگتا۔ ۱۹۷۱ء کی جنگ میں ہمیں شکست نہ ہوتی ملک دو حصوں میں تقسیم نہ ہوتا۔

شہاب صاحب صرف اہل لوگوں ہی کو نہیں نوازتے تھے، نااہلوں کی سرپرستی بھی فرماتے تھے۔ ممتاز مفتی

کے صاحبزادے عکسی مفتی نے ایک مرتبہ بانو قدسیہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "قدسی تمھیں معلوم ہے SHAHAB SAHIB IS A POWER اس کی ایک MAGNETIC FIELD ہے۔ اس فیلڈ میں جو بھی داخل ہوتا ہے، اس پر کچھ عادتیں ہونے لگتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ میں اپنی جاب کو DESERVE نہیں کرتا، لیکن چوں کہ میں شہاب کے مقناطیسی دائرے میں ہوں، کوئی مجھ سے نوکری نہیں لے سکتا۔" اس پر بانو قدسیہ نے اس نوجوان کو سمجھایا "اب تم اس قدر خوش بھی نہ ہو جاؤ عکسی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، کچی نوکری اور وہ بھی نیم سرکاری۔ کل بلاسٹ کر دیں تو پتا نہ چلے۔" عکسی نے اس کا جواب دیا "جب تک شہاب نہ چاہے، مجھے کوئی بلاسٹ نہیں کرسکتا۔" (ص۔ ۴۰) ممتاز مفتی کی شہاب صاحب سے "عقیدت" تو والہانہ تھی ہی عکسی مفتی اس سلسلے میں اپنے باپ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا ہے:

اگر پدر نتواند پسر تمام کند

زیر نظر کتاب میں بانو قدسیہ نے اپنے شوہر، اپنے تینوں بیٹوں، بہوؤں، ممتاز مفتی، عکسی مفتی کے اور خود اپنے حوالے سے شہاب صاحب کی شخصیت کے مافوق الفطرت پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور نہایت تفصیل سے بتایا کہ شہاب صاحب کا کس سے کیسا تعلق تھا۔ جوشِ عقیدت میں بعض جگہ ایسا بھی ہوا ہے کہ شہاب صاحب پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور مذکورہ افراد اس طرح نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسے یہ کتاب انھیں کے روحانی درجات کی بلندی کے مناظر دکھانے کے لیے لکھی گئی ہے۔ مثلاً عکسی مفتی کے بارے میں غیر ضروری اور غیر دل چسپ تفصیلات سے قاری اکتا جاتا ہے۔ خصوصاً اس کی دوسری شادی کا واقعہ کوئی قومی و ملی اہمیت کا واقعہ تو نہیں تھا جو بانو قدسیہ اسکے بیان میں لیتیں اور قاری کا وقت ضائع کرتیں۔

مصنفہ نے کتاب میں اپنے اور ممتاز مفتی کے گھر کے ہر فرد کی تصویر شامل کی ہے۔ بچوں کی شادیوں کی تصویریں بھی ہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ کتاب دراصل ایک فیملی البم ہے جو شہاب صاحب کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

شہاب صاحب کے انتقال کے بعد ان کے عقیدت مندوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ ان کا جانشین کون ہے؟ ممتاز مفتی یا اشفاق احمد۔ یہ دونوں بزرگ شہاب صاحب کے بے حد قریب تھے اور دونوں نے ایک دوسرے سے بڑھ کر شہاب صاحب کی خدمت کی ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ کون جانشینی کے اعزاز کا مستحق ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ زیر نظر کتاب میں اس مشکل مسئلے کا حل موجود ہے۔

بانو قدسیہ نے اشفاق احمد کا ایک مضمون بھی اپنی کتاب میں شامل کیا ہے جس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں: "میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہیے اور اس کے کہنے میں کسی قسم کی معذرت یا کسی حیلے کو سہارا نہیں بنانا چاہیے کہ میں قدرت اللہ شہاب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیوں کہ انھوں نے

دو مرتبہ خود اپنی زبان سے واشگاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ اشفاق میرا خلیفہ ہے اور میں اس کے لیے دعا کرتا ہوں۔" (ص۔۶۳)

شہاب صاحب نے "خلیفہ" کا لفظ کن معنوں میں استعمال کیا تھا' اس کی تفصیل بانو قدسیہ نے ان لفظوں میں بیان کی ہے۔۔۔ "شہاب بھائی کے (پیروں کے) انگوٹھوں میں جو ناخن اُگتے وہ ایسے ناہنجار ہوتے کہ سیدھا باہر نکلنے کی بجائے اندر کی طرف مڑ کر گوشت میں پیوست ہونے لگتے۔ یہ ناخن خان صاحب (اشفاق احمد) بالکل پیریت سے، جیسے کوئی لڑکی گڑیا کو کپڑے پہناتی ہے کاٹا کرتے تھے۔" (ص۔۶۱) یہ کام عموماً لاہور میں اشفاق احمد کے گھر پر ہوتا تھا، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اشفاق احمد کو یہ خدمت انجام دینے کے لیے اسلام آباد جانا پڑتا۔ شہاب صاحب فون کر کے بانو قدسیہ سے کہتے۔۔۔ "میرے ناخنوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم میرے خلیفہ کو ایک دن کے لیے بھیج دو کہ آ کر میرے ناخن کاٹ جائے۔" (ص۔۸۰)

اردو ادب کی تاریخ میں ایک اور "خلیفہ" بھی گزرے ہیں۔ یہ اپنے زمانے کے مشہور شاعر اور میرزا سودا کے شاگرد تھے۔ نام عنایت اللہ تھا اور میرزا سودا کے شاگرد تھے اور تخلص حجام۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے، البتہ شاعری میں خاصے شوخ تھے ان کے چند شعر سنیے:

سر منیاں حجام بہتوں کا پھرے تھے مونڈتے
آج اس کوچے میں ان کی بھی حجامت ہو گئی

اس شوخ کے کوچے میں نہ جایا کرو حجام
چھن جائیں گے اک روز یہ ہتھیار تمھارے

دکان کے آگے سے گزر جاتے ہیں بے لوث
سالکوں کو ذرا دیکھو غضب کرتے ہیں کتنا
کہتے ہیں حسینانِ جہاں مجھ کو خلیفہ
حجام نہیں کہتے ادب کرتے ہیں کتنا

آخری شعر میں لفظ "خلیفہ" انھیں معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، جن معنوں میں شہاب صاحب استعمال کیا کرتے تھے۔ ●●

قلمی معاونین سے التماس:
تخلیقات پر اپنا پتہ لکھنا نہ بھولیں

حامد لطیف حامد (بی اے)

"جس طرح کسی عظیم شاعر کے دل و دماغ پر اشعار کا نزول ہوا کرتا ہے، کم و بیش ہو بہو اس ناچیز پر نزلہ کا نزول ہوتا ہے۔ آج چوتھا دن ہے کہ ہم اس نزولی کیفیت سے دوچار ہیں۔

ہمیں اول تو نزلہ ہوتا نہیں، اور ہوتا ہے، تو ایسا زوردار کہ بس کیا عرض کریں! وہ چار رومال ہر وقت الگنی پر چھوٹے بچوں کے پوتڑوں کی طرح لٹکے سوکھتے رہتے ہیں۔ ایک بار تو پوری الگنی پر رنگ برنگے رومال قطار اندر قطار سوکھتے دیکھ کر "مخلوقِ درمیان" (جو عموماً ڈلیوری کے موقع پر وارد ہوتی ہے) دروازے پر آ موجود ہوئی تھی۔ کہ میر اس وقت گھر پر ہی موجود تھے۔ مگر شامتِ اعمال کہ دروازہ ہم نے کھولا۔ جس پر یہ مژدہ سنائی دیا کہ وہ انعام میں روپیہ چار آنہ مانگ رہی ہیں!

ہم نے اُلٹے پاؤں واپس آکر ہمیشہ کی طرح فوراً ہی میر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میر نے جواب میں الٹا ہم سے سوال کیا! بولے "اِنکاموں سے اِنکا الگ کر دو تو کیا بچے گا؟" ہم نے کہا یار میر یہ تو قطعی مولانا آزاد والی بات ہوئی۔

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی!

جواب میں میر اپنی دو شاخہ داڑھی سہلاتے ہوئے بولے "میاں میرے میں گویا کہ خود بخود زمین ہی کی بات کر رہا ہوں، تم گویا کہ یوں سمجھو کہ اِنکام میں سے گویا کہ اِنکا گیا تو بچا خود بخود ایک، اب اس بچے ہوئے پر وہ چار آنے رکھ کر ان کے ہاتھ پر رکھ آؤ گویا کہ خود بخود۔" ہم نے جیب سے جھٹ سوا روپے نکال کر ان کے ہاتھ پر رکھا اور کہا "میر، یار میرے، یہ نیک کام تم ہی کیوں نہیں کر ڈالتے گویا کہ . . . ."

واپسی میں میر اپنے چہرے پر اکتاہٹ کے آثار اور ہاتھوں میں میرے سوکھے اور گیلے رومالوں کا ایک چھوٹا سا بنڈل دبائے واپس پہنچے اور بولے "وہ تو ان کی بھیک مانگنے لینے والی گویا کہ خود بخود بالغ سال ہی ایک ہی بلکہ تھیں پر یہ بدبخت لوگ . . . . یہ لو یہ رہے تمہارے سب رومال۔ اب خدا کے واسطے ان کو باہر رسّی پر مت پھیلانا گویا کہ خود بخود وغیرہ . . . ."

"وہ نیک کام تم ہی نہیں کیا کر ڈالتے گویا کہ خود بخود" ہم نے ہنس کر کہا۔ اور اس سے پہلے کہ میر جواب میں کچھ کہتے

اچانک ایک فرش شگاف چھینک آئی (فلک شگاف اس لیے نہیں کہا کہ دھاڑ کے دھاکڑ چھینکنے والا بھی بروقت چھینک اپنا منہ سوئے فلک نہیں کرسکتا۔) بالکل اسی طرح جس طرح آپ دونوں ہاتھ جیب میں ڈال کر کسی جھٹکے ہوئے انجلنہ راہ گیر کو راستہ نہیں بتاسکتے۔ میری بات پر یقین نہ آئے تو زور سے چھینک کر دیکھیں۔ یا نہ کرسکیں تو کسی بھولے بھٹکے مسافر کو دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال کر راستہ بتا کر دیکھیں!

اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ ہماری چھینک کے impact سے (فرش تو جیسا کا ویسا ہی رہا) میر کے ہونٹوں سے لگا ہوا چائے کا کپ کچھ اس ادائے خاص سے "چھلکا" کہ گرم گرم کھولتی ہوئی چائے بجائے منہ کے اُن کی ناک میں داخل ہوگئی! اور میر ایک کرخت "آہ" کے ساتھ جو کرسی سے اچھل کر پیچھے ہٹے تو ناشتے کی ٹرے لے کر آتی ہوئی ہماری بیگم سے اس بری طرح ٹکرائے کہ ٹرے بیگم کے ہاتھ سے چھوٹ کر اُن کے سر پر گری"۔ ناک سے انجن کے پسٹن کی طرح "فُشوں فُشوں" کی آوازیں نکالتے ہوئے جو منظر ہم نے دیکھا وہ اس طرح تھا کہ بیگم ساڑی کا پلّو منہ میں ٹھونسے صوفے پر اکڑوں بیٹھی ہنس رہی ہیں اور میر زمین پر پیر پھیلائے کچھ یوں "براجمان" ہیں کہ حیرت سے کھلے ہوئے منہ میں ایک اُبلا ہوا انڈا اور سر پر چائے دانی سے اُتری ہوئی "TEA COSY" ٹوپی کی طرح پہنے ہوئے ایک پھیلے ہوئے ہاتھ میں چائے گرم پراٹھے اور دوسرے "دستِ دراز" میں تلا ہوا آملیٹ!! وہ تو پتہ نہیں اور کتنی دیر اسی طرح "مجسم ناشتہ" بنے بیٹھے رہتے کہ ہماری چھینک نے ...... جی ہاں صرف "چھینک" نے انھیں خوابِ خرگوش سے بیدار کر دیا! اور وہ "لاحول ولاقوۃ" "کالغوۃ" کرکے اٹھ کھڑے ہوئے! بیگم بھی اُسی پھرتی سے اٹھیں اور جلدی جلدی فرش سے بکھری ہوئی کراکری اٹھا کر ٹرے میں بھریں اور باورچی خانے کا رُخ کیا اور میر "ٹی کوزی" بدستور ٹوپی کی طرح سر پر سجائے باتھ روم میں جاگھسے۔

اچانک باتھ روم سے ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی میر کی دھاڑ سنائی دی کہ لیے اور حامد گھبرائے گویا کر ذرا یہاں تو آ خود بخود ......!

ہم دوڑ کر باتھ روم تک پہنچے۔ میر نے دروازہ ذرا سا کھول کر ایک آنکھ سے ہمیں گھورتے ہوئے کہا "ارے کم بخت اپنی ایک گویا کر سنگی اور اور کرتا، اور گویا کر خود بخود تولیہ تو لا دے کہ ......" اور ہم "جی ابھی لایا" کہہ کر الماری کی طرف دوڑے!

کچھ دیر بعد میر ہاتھ میں "ٹی کوزی" لیے باتھ روم سے برآمد ہوئے اور اسے میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولے "آج تو تمہارے اس نزلے نے گویا کہ میرا کام ہی قریب قریب تمام کر دیا تھا گویا کہ خود بخود"!

ہم نے ہنستے ہوئے کہا "یار میر یہ تو تم نے غزل کے قافیے دیدیئے "کام ...... تمام"! لو تم بھی کیا یاد کرو گے، شعر سنو عرض کیا ہے۔

میر کے یار کو چھینک بھائی چھینک نے ایسا کام کیا

اس سے پہلے کہ میں شعر پورا کرتا میر بولے مصرعِ ثانی گویا کہ خود بخود مجھ سے سنو عرض کرتا ہوں، کیا زور دار مطلع ہے:

میر کے یار کو چھینک بھائی چھینک نے ایسا کام کیا
گلا دبا کر میر نے آخر یار کا کام تمام کیا

غربت ـــــ جھاپڑ ناگپوری
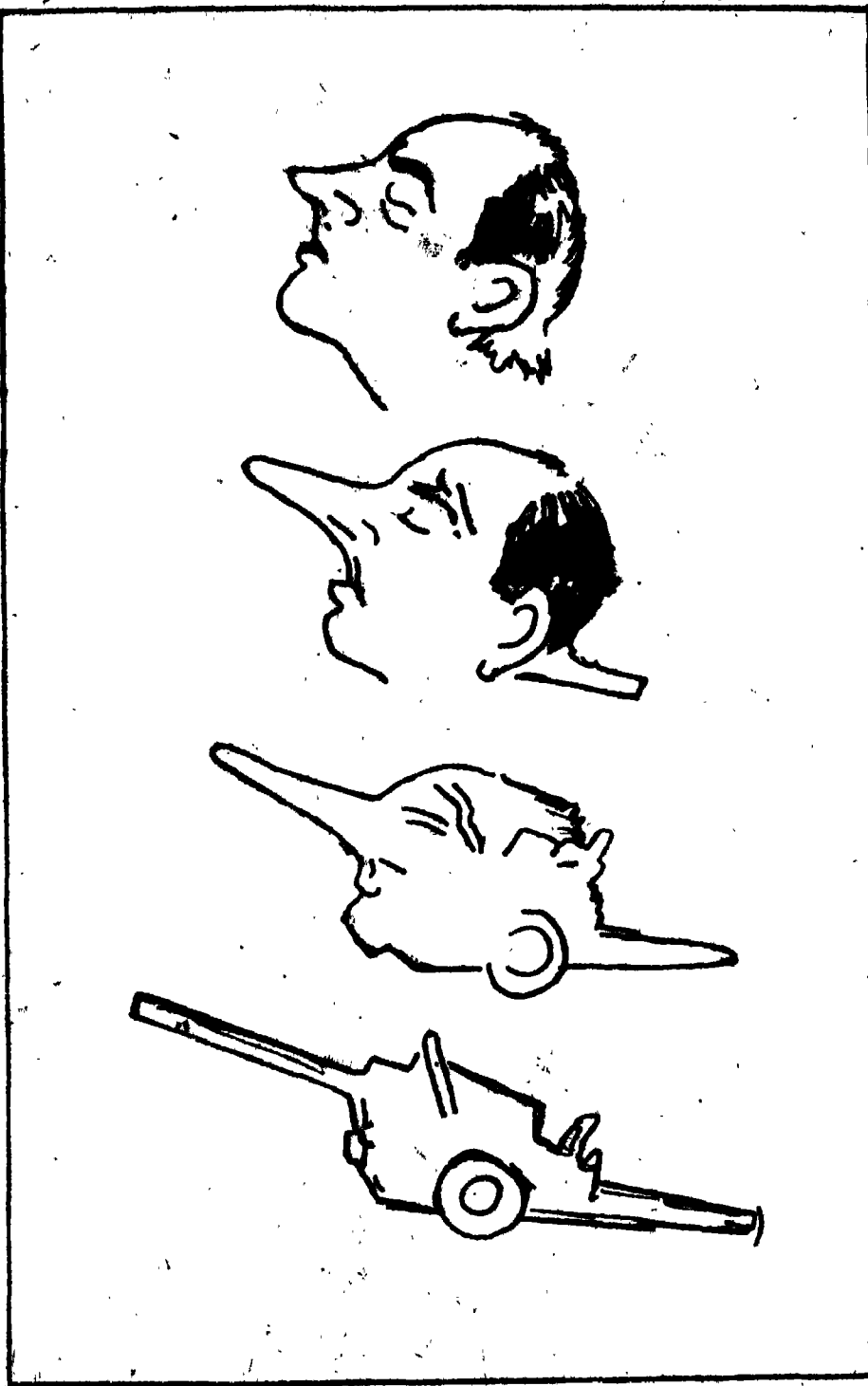
ہر قدم پہ نئی مصیبت ہے　　میری کتنی عجیب غربت ہے

روز لڑتی ہے زندگانی سے　　تنگ ہوں اس کی بدزبانی سے

روز لڑتی ہے جان کھاتی ہے　　بھوک کی آگ میں جلاتی ہے

آرزو کی کلی نہیں کھلتی　　مجھ سے آکر خوشی نہیں ملتی

ہنس کے میں غم کو ٹال دیتا ہوں　　فکر دل سے نکال دیتا ہوں

کس طرح کیا بتاؤں جیتا ہوں　　غم کے میں کڑوے گھونٹ پیتا ہوں

کرتا ہوں پھر بھی شاعری یارو　　میری سنتی ہے کچھ پری یارو

بے اثر ہو گئی دعا میری　　کوئی سنتا نہیں صدا میری

میرا جھاپڑ نصیب کھوٹا ہے

مجھ سے اللہ میاں بھی روٹھا ہے

جوتے ـــــ شبنم کاٹھاری

گھر کے گھر گھر گئے ہیں جوتوں میں　　ہر جگہ آس پاس ہیں جوتے

جوتے مٹی پلید کرتے ہیں　　یعنی عزت کی لاش ہیں جوتے

کون کیسا ہے مرتبہ کیا ہے　　آدمی کا کلاس ہیں جوتے

ہم نے کھولی دوکان جوتوں کی　　اب ذریعہ معاش ہیں جوتے

تھرتھراتے ہیں لوگ جوتوں سے　　باعثِ ارتعاش ہیں جوتے

جوتے ایکسپورٹ ہو رہے ہیں کئی　　ملک کا اتہاس ہیں جوتے

غزل ـــــ اقبال شانہ (سعودی عرب)

کس رسالے سے چرائی وہ غزل کس کی تھی　　آپ نے کل جو سنائی وہ غزل کس کی تھی

لوٹ کر تم کسی شاعر کو چلے داد لیے　　تم کو تو شرم نہ آئی وہ غزل کس کی تھی

ان کے رنگین ڈوپٹے میں گرہ کس کی تھی　　جو دوپٹے میں چھپائی وہ غزل کس کی تھی

میرے محبوب سے پوچھے کوئی جاکر شانہ

آپ کو جو پسند آئی وہ غزل کس کی تھی

محمد منظور کمال (وجے واڑہ)

شہرت کی خاطر

اس میں دو کیا تین رائیں بھی نہیں ہو سکتیں کہ ہر شخص خواہ مخواہ کسی قماش کا ہو یا کسی معیار کا ہمیشہ "شہرت" کی خاطر سرگرداں و پریشاں بلکہ محو حیرت رہتا ہے اور اسی تگ و دو میں اپنے خاکی جسم کی مٹی پلید کرتا ہوا ایک دن مٹی کی تنگ و تاریک کوٹھری میں پہنچ جاتا ہے۔ آپ جدھر بھی چلے جائیے ہر طرف جو ایک گہما گہمی نظر آئے گی اس کے پس پشت اسی شہرت کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔ اگر کوئی پیسہ کما رہا ہے تو اس لیے کہ وہ دولت مند بن جائے تاکہ شہرت حاصل ہو۔ علم حاصل کر رہا ہے تو اس لیے کہ وہ عالم بن کر مسندِ شہرت پر جلوہ افروز ہو سکے۔ کوئی خدمت خلق کر رہا ہے تو اس لیے کہ اس کا نام اخباروں میں شہ سرخی کے ساتھ نظر آئے۔ حتیٰ کہ کجروی اور شر انگیزی کے پیچھے بھی یہی مقصد کارفرما ہے کہ بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ یہاں تک کہ نسل کو فروغ دینے کے پیچھے بھی یہی جذبہ کارفرما ہے کہ بعد مرنے کے نام لینے والوں کی ایک کثیر تعداد دنیائے دنی میں موجود رہے اور نقشِ باپ "نقشِ آب" کی مانند مٹنے سے رہ جائے خواہ اس جہدِ مسلسل میں وہ خود ہی کیوں نہ مٹ جائے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص کے دل کے نہاں خانے "یا دماغ کی نچلی سطح جسے تحت الشعور کہتے ہیں" میں شہرت کا وائرس بدرجۂ اتم موجود رہتا ہے اور اپنے مریض کو موقعہ بے موقعہ اکساتا رہتا ہے۔ جب شہرت کے اس وائرس نے مجھے بھی نشانہ بنایا تو میں خود کو اس کے اثرات سے نہ بچا سکا اور شہرت کے قطب مینار پر پہنچنے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔ بار بار سوچا بلکہ بے طرح سوچا لیکن کوئی سبیل نکلتی نظر نہ آئی۔ بالآخر مجبور ہو کر اپنے ایک دوست سے مشورہ کرنے کی ٹھانی۔ جنھیں ہمیشہ ایسے موقعہ پر نہ صرف خوب سوجھتی ہے بلکہ دُور کی بھی سوجھتی ہے۔ ایسے آڑے وقتوں کے لیے وہ چند ریڈی میڈ حل سدا جیب میں لیے پھرتے ہیں کہ پتہ نہیں کب، کس کو، کہاں ضرورت پڑ جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے آڑے وقتوں کے مشورے کبھی آڑے اتھوں لیے جانے کا بھی سبب بن جاتے ہیں۔ (جس کا ذکر آگے آئے گا) آمدم برسرِ مطلب، جب میں نے اپنا مسئلہ ان کے روبرو رقت آمیز لہجے میں پیش کیا تو وہ اچھل پڑے اور پورے جوش و خروش سے اس مسئلہ کو اپنا مسئلہ سمجھتے ہوئے سمندرِ فکر میں غوطہ زن ہو گئے (ویسے آج تک میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ "غوطہ" کے لیے "زن" کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں غوطہ مرد زن ہو تو ایک الگ بات ہے۔ چناں چہ جب وہ سمندرِ فکر سے عرق ریزی کے بعد نکلے تو گوہرِ آب دار کی شکل میں ایک حل موجود تھا۔ کہنے لگے تم واقف ہی ہوں گے کہ دورِ حاضر میں شہرت حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے

بس ایک یا دو سیمینار یا کانفرنس کروا ڈالو پھر شہرت تمھارے در کی لونڈی ہوگی۔ آج وقت کی ایک اہم ضرورت فیملی پلاننگ ہے۔ تم ایسا کرو کہ "فیملی پلاننگ وقت کی ایک اہم ضرورت" پر ایک مذاکرہ کا اہتمام کرو۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تم شہر بھر میں مشہور ہو جاؤ گے بلکہ سرکاری نگاہ میں بھی وقعت حاصل کر لوگے۔ بس پھر کیا تھا۔ میں تن من دھن سے اس کام میں لگ گیا۔ اللہ اللہ کرکے وہ دن آپہنچا۔ پورا پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ڈائس پر نیتا، سماج سیوک اور ریفارمر بیٹھے تھے۔ سب سے پہلے ایک بزرگوار نے جو ایک اہم [illegible] کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، تقریر شروع کی "بھائیو اور بہنو! سب سے پہلے میں جناب منظور کمال صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنھوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھتے ہوئے ملک کی سالمیت کی بقا کے لیے ایک مذاکرہ کا انعقاد کیا ہے۔ جس میں ایک اہم اور سلگتے ہوئے موضوع "فیملی پلاننگ وقت کی ایک اہم ضرورت" کو موضوع بحث بنانے کی دعوت دی گئی ہے۔ یہ ایک ایسا سلگتا موضوع ہے جو نہ صرف گھر اور سماج کو سلگانے کا ایک اہم فریضہ انجام دے رہا ہے بلکہ ملک کی ملکوتی فضا کو بھی مسموم کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ سوچیے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج ملک میں انتشار، تشدد اور بربریت کا دور دورہ ہے۔ اس کی واحد وجہ کثیر آبادی ہے۔ یہ کثیر آبادی نہ صرف زمین کا قافیہ تنگ کرنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے بلکہ ہم جیسے مہذب انسانوں میں تنگ نظری، تعصب اور مکر و فریب کو خود رو پودوں کی طرح پھلنے پھولنے کا موقع بھی فراہم کر رہی ہے۔ آپ اپنے گھروں میں جھانک کر دیکھیے، گھروں میں جو سکون غارت ہوتا نظر آئے گا اس کے پس پشت اسی کی کارفرمائی نظر آئے گی۔ آپ نے اکثر بار دیکھا ہوگا کہ ماں باپ کے مرنے کے بعد اولاد کی میں جائیداد کے بٹوارے کے لیے خون خرابہ ہوتا ہے۔ بچوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے مار دھاڑ کی نوبت اتنی ہی زیادہ آتی ہے۔ کچھ تنگ نظر اور جاہل لوگوں کا خیال ہے کہ اگر خدانخواستہ بچوں کی پیدائش فیملی پلاننگ کے مطابق کی گئی اور کسی روگ یا حادثہ کے سبب بچے کی موت ہوگئی تو پھر ماں باپ کی گود نہ صرف سونی ہو جائے گی بلکہ ان کی زندگی بھی۔ شاید ایسے لوگوں کو علم نہیں کہ اگر کسی وجہ سے بچہ مرنے کے بعد دوسرے بچے کی پیدائش میں دقت ہوئی تو سائنس کی مدد لے کر ٹیوب (ٹیسٹ ٹیوب) سے بچہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ان دلائل عقلی کی روشنی میں "فیملی پلاننگ" پر عمل وقت کا ایک اہم تقاضہ ہے . . . . . "

اس کے بعد اسٹوڈنٹس یونین کے صدر مائک کے سامنے تشریف لائے اور کچھ یوں گل افشانی کی۔

"بھائیو اور بہنو! ابھی ہمارے ایک بزرگوار نے اپنی تقریر کے ذریعہ فیملی پلاننگ کی اہمیت اور افادیت کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ میں ان کے اس دعوی سے کلی طور پر متفق ہوں کہ فیملی پلاننگ کا نفاذ نہ صرف گھر اور سماج کے لیے ضروری ہے بلکہ ملک کی فلاح کے لیے بھی لازمی ہے مگر جہاں تک طریقہ کار کا تعلق ہے میں اختلاف کرتا ہوں۔ میرے سوچنے کا انداز نہ صرف جداگانہ بلکہ انوکھا بھی ہے۔ میں آنے والی نسل پر پابندی لگانے کے حق میں قطعاً نہیں ہوں۔ کیوں کہ ایسا کرنا نہ صرف سماج اور ملک کے لیے نقصان دہ ہے بلکہ انسانیت کی بقا کے لیے بھی ایک عظیم خسارہ ہے۔ کیوں کہ آنے والی نسل میں کوئی عظیم مفکر اور دانش ور

پیدا نہیں ہوسکے گا۔ ایسی حالت میں آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسانی برادری کا کتنا عظیم نقصان ہوگا۔
تب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آخر اس مسئلہ کا حل کیا ہے؟ اگر آپ مجھے کہنے کا حق دیں تو میں بے باکانہ انداز میں کہنا چاہوں گا کہ اس کا واحد حل ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ جو اشخاص ساٹھ سال کی عمر سے تجاوز کر چکے ہیں انھیں اس دنیا سے رخصت کر دینے کی اسکیم پر غور کرنا چاہیے۔ کیوں کہ ایسا شخص کسی کام کا نہیں رہتا ہے۔ گھر میں وہ بڈھا اور بڈھی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ معاشرے کے افراد انھیں اس لیے اہمیت نہیں دیتے کہ وہ اگلے وقتوں کے لوگ ہیں اور انھیں ریٹائر کر دینا چاہیے۔ آخر ایسے لوگوں کو دنیا میں رہنے کا کیا جواز ہے؟ آپ نے سنا ہوگا کہ ریس کا گھوڑا جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے گولی مار دی جاتی ہے۔ مصرف شدہ اشیا جب بے کار ہو جاتی ہیں تو انھیں کباڑی کی دوکان کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان بڈھوں اور بڈھیوں کو بھی ......"

ابھی اتنی ہی تقریر ہو پائی تھی کہ ہر طرف سے ایک ہنگامہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگ ڈائس پر چیختے چلاتے چڑھ آئے۔ مارو، پکڑو کی آوازوں سے پورا پنڈال گونجنے لگا اور پھر مت پوچھیے کیا نہیں ہوا۔ میں کسی طرح جان بچا کر بے تحاشہ بھاگ نکلا۔ وہ دن اور آج کا دن پھر کبھی شہرت کی تمنا نہ کی:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

●●

سجمی بھوپالی کا انتقال

محترمی

السلام علیکم

اشک بار آنکھوں اور سوگوار دل کے ساتھ ہم آپ کی خدمت میں یہ افسوس ناک خبر ارسال کر رہے ہیں کہ ہمارے والدِ محترم جناب سیّد ساجد علی رضوی معروف بہ ساجد و سجمی لکھنوی نے ۱۲ محرم الحرام ۱۴۱۰ھ بروز شنبہ مطابق ۱۵ اگست ۱۹۸۹ء کو اس دارِ فانی سے سفرِ آخرت فرمایا۔ اِنّا للہ واِنّا الیہ راجعون۔

ہمیں امید ہے کہ آپ [illegible] کے اس حوصلہ شکن ماحول میں آپ مرحوم کے پس ماندگان کے لیے دعائے صبر اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت فرمائیں گے۔

خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

والسلام

سیّد عابد علی رضوی

مکان نمبر ۱۱۔ گلی نمبر ۲ نزد ریلوے اسٹیشن

بھوپال

دے کے خط ...

(مراسلے)

... شگوفہ برابر مل رہا ہے۔ اِدھر یوسف ناظم صاحب کی غیر حاضری کھلنے لگی ہے۔ مجتبیٰ حسین اور دوسرے سینیر لکھنے والوں کی تخلیقات ہر دوسرے تیسرے مہینے شایع ہونی چاہئیں فیاض احمد فیضی کا رپورتاژ خاصے کی چیز تھی۔ اس بلدی رپورتاژ میں عجیب لطف ہے۔ مسیح انجم اور پرویز یداللہ مہدی کے مضامین کم کم ہی لیکن پڑھنے کو مل جاتے ہیں، یہی غنیمت ہے۔ شگوفہ نے اس گرانی اور خاص طور سے کاغذ کی گرانی کے دور میں جو معیار پایا اور اعتماد حاصل کیا ہے اس کی مثال رسالوں کی دُنیا میں نہیں ملتی۔

قمر احسن، سری نگر

مکرمی۔ السلام علیکم، اگست ۸۹ء کا شمارہ وصول ہوا اس دفعہ بھی "منظومات" کا پلڑا "نثر" پر بھاری ہے دیگر، یوں محسوس ہوا کہ "شگوفہ" ابھی ابھی جوان ہوا ہے "کشتہ جات" (اقبال ہاشمی) اور اس کے لوازمات "دم کا مرغ" اچار اور پھر "چنا جور گرم" ـــ بھائی میرے تو منہ میں پانی بھر آیا۔ برادم مضطر مجاز کی شرکت سے "محفل شگوفہ" کی رونق دو بالا ہوگئی۔

یوسف یکتا، سکندرآباد

جولائی ۸۹ء کا "شگوفہ" نوازش ہوا۔ پیروڈی شامل اشاعت کی آپ نے۔ شاعری میں اسماعیل ظریف، مرزا کھونچ، اقبال ہاشمی، پاگل عادل آبادی خاص طور سے پسند آئے۔ نثر میں اظہر حسن صدیقی "بنگالی شادی میں" رشید الدین "ہم نے اپنے بچوں کو پڑھایا" دلاور فگار "ہم سے سنئے شباب کی باتیں" خاص طور سے مزا دے گئے۔ زندہ دلانِ حیدرآباد شگوفہ کی شکل میں ہر ماہ مزاح و طنز کا جو ایٹم بم چھوڑ رہے ہیں، اُن کے "مضراثرات" ایک دن بنارس تک بھی پہنچیں گے، امید ہی نہیں اس کا یقین بھی ہے۔ مخلص:

روشن لال روشن، راماپورہ بنارس

محترم کمال صاحب آداب!

اگست ۸۹ء کا شمارہ ملا۔ زیرِ نظر شمارے کی جان ہے "چائے کی خاطر"۔ مصنف کو میری طرف سے دلی مبارکباد

حامد لطیف حامد۔ بمبئی

مکرمی کمال صاحب!

ماہ جولائی کا شمارہ نظر سے گذرا۔ نہایت پسند آیا۔ خاص طور پر 'دلاور فگار' کا مضمون نہایت دلچسپ لگا۔ غزلوں، نظموں اور دیگر مضامین کا انتخاب آپ کی ذہانت کی دلیل ہے۔

تسلیم غوری، بدایوں

برادرم ڈاکٹر صاحب!

شگوفہ (شمارہ اگست) بہ دست ہوا۔ اب تک مغز اچھا رہتا تھا اب تو گوشت کے ساتھ پوست بھی مزیدار، دیدہ زیب اور دلکش ہے۔ سُنا ہے چہرے کو دل کی کتاب کہتے ہیں۔ اداریہ میں یہ خوشگوار خبر پڑھنے کو ملی کہ اب مڈل ایسٹ میں مزاح اپنا سکہ جما رہا ہے۔ وہاں سے پیٹرو ڈالر یہاں آرہے ہیں تو آپ یہاں سے بدلے میں مزاح ڈالر بھیج رہے ہیں اور اس طرح آپ مزاح ایکسپورٹ ڈائرکٹر بن گئے ہیں۔ خدا کرے دنیائے ادب میں مزاح کا بول بالا ہو اور تیسری جنگِ عظیم ٹل جائے۔ مسرور مسلم (جن کے مضامین کی وجہ سے ہم ہندوستانی مزاح نگار اب مسرور مسلم کہلا سکتے ہیں، پاکستانی مزاح کی اجارہ داری اب ختم ہو رہی ہے) کا مضمون حاملہ شمارہ ہے (کاش اسے آپ پہلی جگہ دیتے) ویسے چائے کا نمبر بعد میں آتا ہے۔ واہ صاحب! کیا انداز ہے کیا تحریر ہے کیا جادو ہے خاص کر آخری جملہ کہیں اس دیوالی کا سبب یہ تو نہیں کہ چنبیلی کی شاخ پر گلاب کی ٹہنی غالب آگئی ہے، یہ جملہ اقلیتوں پر بڑی سی بڑی کتاب پر بھاری ہے۔

رؤف خوشتر، بیدر

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

جلد ۲۲ اکتوبر ۸۹ء شمارہ ۱۰

زندہ دلان حیدرآباد کا ترجمان

ایڈیٹر:
ڈاکٹر سید مصطفیٰ کمال

مجلس ادارت:
حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

منیجر اعزازی (بمبئی):
فیاض رفیقی

فی پرچہ ۵ روپے زرسالانہ ۵۰ روپے

بیرونی ممالک سے ۶۰ روپے، عرب ممالک سے ۱۶۰ روپے

خط و کتابت کا پتہ: [illegible] کارنر، معظم جاہی مارکٹ حیدرآباد ۵۰۰۰۰۱

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد

فون رہائش: 521064
فون آفس: 557716

حیدرآباد

۴ نومبر ۱۹۸۹ء

شعرا اور ادیب

میدان حیدرآباد

آسیہ

اس تھیلی کے چٹّے بٹّے (فہرست)

شگوفہ کا آئندہ شمارہ

سووینیر ہوگا

خوبصورت رنگین سرورق ۔۔ نمائندہ تخلیقات سے مزین

قیمت ۷ روپے

"سچی جمہوریت مرکز میں بیٹھے ہوئے بیس افراد کے ذریعہ نہیں چلائی جاسکتی۔ اسے نچلے کی سطح سے ہر گاؤں کے لوگوں کو چلانا ہوگا۔"
— گاندھی جی
عوام کے لئے اختیارات
اہم خصوصیات
پنچایتی راج بل
• گاؤں، بلاک اور ضلعی سطحوں پر پنچایتیں قائم کرنا۔
• الیکشن کمیشن کی زیر نگرانی تینوں سطحوں پر تمام نشستوں کو براہ راست انتخاب کے ذریعہ بھرنا۔
• پنچایت کے کام کرنے کی میعاد — ۵ سال
اگر کسی پنچایت کو اس میعاد سے پہلے منسوخ کیا جاتا ہے تو چھ ماہ کے اندر اس کی تشکیل نو کے لئے انتخاب کرایا جانا۔
• درج فہرست ذاتوں/قبائل کے لئے ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کرنا۔
• خواتین کے لئے 30 فیصد نشستیں محفوظ کرنا۔
• پنچایتوں کا سماجی انصاف کے ساتھ ساتھ مقامی ترقی کے منصوبے تیار کرنا اور انہیں لاگو کرنا۔
• پنچایتوں کو اپنا کام چلانے کے لئے کافی فنڈس مہیا کرنا۔
نگر پالیکا بل
• تین قسم کی نگر پالیکائیں قائم کرنا: نگر پنچایتیں، میونسپل کونسلیں اور میونسپل کارپوریشنیں۔
• الیکشن کمیشن کے زیر نگرانی براہ راست انتخاب کرانا۔
کام کرنے کی میعاد ۵ سال۔
• میونسپل تنظیموں کے لئے کافی رقم مہیا کرنا۔
ترقی اور جمہوریت کو گھر گھر میں پہنچانے کے لئے ایک انقلابی قدم
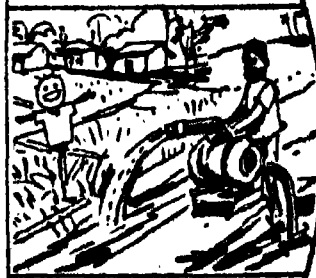
نریندر لوتھر

اگلے وقتوں میں انگلستان جانے والے کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سات سمندر پار گیا ہے۔ اس حساب سے ہم آٹھ سمندر پار جا رہے تھے کہ انگلستان اور امریکہ کے درمیان ایک اور سمندر ہے اور وہ بھی بہت بڑا۔ اور پھر امریکہ خود بہت بڑا ملک ہے۔ رقبہ میں ہندوستان سے تین گنا بڑا۔ وہاں ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے میں سات آٹھ گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ ہمیں بوسٹن جانا تھا جو نیویارک سے چار گھنٹے کی اڑان ہے۔

فاصلے کے لحاظ سے ہمارے خیر خواہوں کا مشورہ تھا کہ اتنا لمبا سفر ایک ہی جست میں نہ طے کیا جائے۔ اس سے زیادہ تکان ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ ہم حیدرآباد سے دہلی، دہلی سے لندن، لندن سے نیویارک، نیویارک سے بوسٹن جائیں اور ہر جگہ رُکتے ہوئے ــــــــــ

جانا ہمارا آٹھ سمندر پار

قسط ــ ۲

سفر کے تمام انتظامات مکمل ہوگئے۔ روانگی کے دن حیدرآبادی روایات کے مطابق کئی دوستوں نے گھر پر اور چند نے ہوائی اڈے پر آکر ہمارے بازوؤں پر امام ضامن باندھے۔ ہم اور بیگم جب اتنے سارے ضامنوں کے ساتھ ہوائی جہاز کے اندر داخل ہوئے تو بہت سے لوگ تعجب سے ہماری طرف دیکھنے لگے۔ کچھ لوگوں نے سمجھا کہ ہمیں پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ شاید لڑائی جھگڑا ہوا ہوگا۔ بعض نے سوچا شاید بلڈ پریشر کو قابو میں رکھنے کا یونانی طریقہ ہے۔ کچھ مسافروں اور ہوائی عملہ نے آخر پوچھ ہی لیا ہم نے جب امام ضامن کے پیچھے کارفرما جذبات کا ذکر کیا تو وہ بہت متاثر ہوئے۔ ایک سینٹی منٹل قسم کی ہوائی حسینہ کی تو آنکھ میں آنسو آگئے اور اس وجہ سے ہوائی جہاز لیٹ بھی ہوگیا۔ ہم نے اُسے ایک امام ضامن دیا کہ اُس کے آنسو سکھائے تو وہ کام کرنے کو تیار ہوئی

بیماری کا پورا سماں باندھنے کے لیے کچھ احباب نے ہوائی اڈے پر پہیوں والی کرسی کا انتظام بھی کروا دیا تھا۔ حیدرآباد میں تو کرسی کے آنے میں اتنی دیر ہوگئی کہ ہم عادت سے مجبوراً تراسے مارتے ہوئے بغیر توقف کے ہوائی بس کی

جا بیٹھتے تھے۔ لیکن دہلی میں وقت پر کرسی کا انتظام ہو گیا۔

کرسیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ چار ٹانگوں والی اور دو پہیوں والی۔ ٹانگوں والی کرسی ایک ہی جگہ جمی رہتی ہے۔ اپنی غرض کو اس کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اس کرسی کی خصلتوں اور خوبیوں سے ہم بخوبی واقف ہیں کیوں کہ ہماری زندگی کا زیادہ حصہ اسی پر ایسی ہی کرسیوں پر گزرا ہے۔ لیکن پہیوں والی کرسی سے یہ پہلا پہلا تعارف تھا۔ ٹانگوں والی کرسیوں کے برعکس یہ کرسی متحرک ہوتی ہے اور جس پر بیٹھے ہوئے شخص کو جگہ جگہ لیے پھرتی ہے۔ پیدل چلنے والے شخص کو "کیو" میں کھڑا ہونا پڑتا ہے لیکن پہیوں والی کرسی کو دیکھتے ہی احتراماً 'کیو' کی صفیں ہٹ جاتی ہیں۔ اس اعتبار سے متحرک کرسی نشین کو دوسرے تمام سازوں پر ترجیح رہتا ہے۔ 'امیگریشن' ہو، 'پاسپورٹ کنٹرول' ہو، 'کسٹم' ہو ہر جگہ وہی برتری، وہی ترجیحی سلوک، وہی سبقت، وہی خوش خلقی۔ ہمیں ایسا لگا جیسے ہم کوئی معذور مغل بادشاہ ہیں جو متحرک تخت پر ہر جگہ لیے جا رہے ہیں۔ 'اعوذ علیا' ادب و احترام سے راستہ صاف کر دیتی ہے۔ ہم نے سین مکمل کرنے کے لیے بیگم کو مشورہ دیا کہ وہ نقیب بن کر اعلان کرتی جائیں..

"باملاحظہ ہوشیار... لیکن بیگم نے کہا کہ جتنا ڈرامہ ہو رہا ہے اتنا ہی کافی ہے اور ہمیں اب یہاں سے جلدی نکلنا چاہیے۔ لوگ باگ بھی بجائے ہمارے خلاف پروٹسٹ کرنے کے ہماری طرف ہمدردی سے دیکھنے اور راستہ صاف کرنے لگے تھے۔ کچھ لوگوں نے تو کرسی کو دھکیلنے کی پیش کش بھی کی۔ سچ ہے۔ کرسی کرسی ہوتی ہے۔ چاہے ٹانگوں والی ہو کہ پہیوں والی اس کا اپنا جادو ہوتا ہے۔ ہم نے خدا کا لاکھ شکر ادا کیا کہ انھوں نے ہمیں ٹانگوں والی کرسی سے اٹھایا تو پہیوں والی کرسی پر بٹھا دیا یا اس کے بجائے وہ اگر کرسی ہی کھینچ لیتا تو ہم کیا کر سکتے تھے یا اگر اٹھاتے وقت اتنا اٹھا لیتا کہ ہم اس کی جوارِ رحمت میں پہنچ جاتے تو ہم کچھ بھی نہ کہہ پاتے۔ یہ سارا کھیل تو جوارِ رحمت سے بچنے کا تھا۔

پہیوں والی کرسی کی تعظیم اور اس پر بیٹھے ہوئے شخص کے تئیں اہلکاروں کی خوش خلقی دیکھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ یہ جو حکومت گاہے بہ گاہے "کرٹسی ویک" (COURTESY WEEK) مناتی ہے اور اہلکاروں کو جنتا کے ساتھ خوشگوار سلوک کی تلقین کرتی ہے ہمیشہ رائگاں ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بجائے اگر وہ جنتا کو پہیوں والی کرسیاں مہیا کروے تو یہ بد خلقی کا مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہم نے یہ تجویز حکومت کو بھیج دی ہے اور اب ہمیں روز اس انعام کے اعلان کا انتظار رہتا ہے جو ایسی مفید تجویزیں بھیجنے والوں کو حکومت دیتی ہے۔

ہندوستان سے لندن جانے والے جہاز عموماً ہندوستانی انگریزوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ یعنی وہ ہندوستانی جو انگلستان کے شہری بن گئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر پنجاب کی شلوار قمیض پہنے ہوئی عورتیں یا بال کٹے سکھ یا گجراتی ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کو انگریزی صرف "یس" "نو" "ویری گڈ" "تھینک یو" کی حد تک ہی آتی ہے۔ بس وہ آدھ درجن لفظوں پر ہی گزارہ کر لیتے ہیں۔ مشکل انھیں اس وقت ہوتی ہے جب کچھ لکھنا پڑتا ہے۔ ہوائی جہاز میں جب انھیں لینڈنگ فارم بھرنے کو کہا جاتا ہے تو وہ چپ چاپ فارم ہمسائے کی طرف بڑھا دیتے ہیں اور صرف آنکھوں سے ہی التجا کرتے ہیں کہ اسے بھر دیجیے۔

ایسے ہی ایک صاحب کا قصہ ہے کہ انھیں دہلی ایئرپورٹ پر ایک فارم پر دستخط کرنے کو کہا گیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ دستخط تو میں کر نہیں سکتا۔ آفیسر نے کہا اچھا تو پھر انگوٹھا لگا دیجیے، جب وہ انگوٹھا لگا رہے تھے تو

سو بھی چکے تھے اور ابھی وہیں سستا رہے تھے کہ پھر وہی پنجابن بزرگ بڑی افراتفری کی حالت میں ہمارے پاس آئیں اور پیشتر اس کے کہ ہم ان کو یہ بتا سکتے کہ ہم آپ کے بیٹوں کے برابر ہیں آپ ہمارا پیچھا کیوں کر رہی ہیں۔ وہ کہنے لگیں۔ بیٹا، میری ٹکٹ نہیں مل رہی۔ اگر ٹکٹ چیکر آگیا تو میں کیا کروں گی؟ ہم نے کہا ماں جی گھبرایئے نہیں۔ یہاں کوئی ٹکٹ چیکر نہیں آئے گا۔ انھوں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ یقین مانو بیٹا۔ میں نے ٹکٹ خریدی تھی .... لیکن اگر میری ٹکٹ نہ ملی تو.... .... ایک بار میرے ساتھ ٹرین میں ایسا ہی ہوا تھا تو ٹی ٹی نے اُسی وقت گاڑی روک کر مجھے نیچے اتار دیا تھا کیونکہ جرمانے کی رقم ادا کرنے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ کہیں یہاں بھی تو اتار نہیں دے گا بیٹا۔ میں تو مر جاؤں گی۔ ہم نے انھیں پھر دلاسا دلایا کہ یہاں کوئی ٹی ٹی نہیں آئے گا اور نہ ہی اُترنے پہ کوئی ٹکٹ پوچھے گا۔ آپ کو یہاں اُتارنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ اس اونچائی پہ دروازہ کھلتے ہی ہم سب بہ شمول آپ کے اور ٹی ٹی کے فوراً مر جائیں گے اس مجموعی موت کے حوالے پر اُن کی جان میں جان آئی لیکن پھر بھی ایک وعدہ انھوں نے ہم سے لے لیا کہ اگر اُترنے کے بعد بالفرض کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو ہم ان کی مدد کریں گے بلکہ ضمانت بھی دیں گے۔ ہمارے تیقن کے بعد انھوں نے ہمیں لڈو کھانے کو کہا۔ اور ہمارے لاکھ انکار پر بھی انھوں نے اپنا ڈبہ کھول کر اُس میں سے دو لڈو نکال کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے۔

اتنے میں ایک غیبی نسوانی آواز آئی کہ ہم تھوڑی ہی دیر میں لندن میں اُترنے والے ہیں اس لیے اپنی کرسی کی پیٹی باندھ لیں۔ اس بار نہ تو محترمہ نے پیٹی کے بارے میں ہم سے پوچھا اور نہ ہی ہم نے مدد کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ انھوں نے خود ہی اپنی پیٹی لگالی اور بڑے اطمینان سے بیٹھ گیئں۔ اب وہ ٹرینڈ ہو چکی تھیں۔

ہم دس گھنٹے سے زائد سفر کر چکے تھے اور ہماری گھڑی کی سوئیاں سات کا ہندسہ پار کر چکی تھیں لیکن لندن میں ابھی ڈیڑھ ہی بجا تھا۔ گھڑی دیکھتے ہی ہمیں اچانک لنچ کا خیال آیا اور بھوک بھی لگی۔ لیکن اب ہوائی عملہ ہمیں لنچ دینے کے موڈ میں نہیں تھا۔

لندن میں جس ایرپورٹ پر ہم اُترے تھے اُس کا نام "ہیتھرو" "HEATH ROW" ہے۔ ایرپورٹ کیا ہے پورا بازار کا بازار ہے۔ وہاں لوگوں کو ادھر ادھر جانے کے لیے زمین پہ متحرک پٹیاں لگی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی شخص پہلی بار ان پہ کھڑا ہو جائے تو وہ یہی محسوس کرے گا کہ اُس کے پیروں تلے اُسے زمین نکل گئی ہے۔ خیر ہمارے لیے وہاں بھی کرسی کا انتظام تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُسے چلانے والا انگریز تھا اور اُس نے سوٹ پہن رکھا تھا۔ لندن کی کرسی نے بھی اپنا جادو دکھایا۔ ہماری تمام راہیں ہموار ہوتی گیئں اور ہم سب "کیو" پھلانگ کر جلد ہی ایرپورٹ کے باہر آگئے۔ وہاں ہمارے میزبان اور پرانے دوست جے جے سنگھ آئے ہوئے تھے بغل گیر ہوئے۔ ہم نے پوچھا کہ اس سفید فام قلی کو کیا کیا جائے کہ انگریز ہمارے آقا رہ چکے ہیں۔ انھوں نے کہا جو ہمارے آقا تھے وہ سب مر کھپ چکے۔ اس کو مبلغ ایک پاؤنڈ دے دو۔ یہ تمھیں سلام کرے گا۔ اور ہوا بھی ویسا ہی۔ اُس نے سلام کیا، شکریہ ادا کیا، ہماری صحت کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور یہ بھی بتایا کہ آج موسم بڑا اچھا ہے آپ خوش قسمت ہیں۔ اس آخری بات سے ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارا قلی واقعی انگریز ہے کیونکہ انگریز اور کسی دوسری قوم کے فرد میں یہی فرق ہوتا ہے کہ انگریز پہلی ملاقات پہ، ہر ملاقات پہ اور

اور وداع ہونے کے وقت موسم پر تبصرہ ضرور کرے گا۔ عموماً اُسے اور کوئی بات سوجھتی بھی نہیں۔ انگلستان میں ایک بار ایک سروے کیا گیا تو پتہ چلا کہ ۹۰ فی صدی انگریز اپنی سہاگ رات کو بھی اپنی نئی دلہن سے سب سے پہلے موسم کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ اور ان میں سے دس فیصدی تو موسم کو ہی چھیڑتے چلے جاتے ہیں اور جب چھیڑتے چھیڑتے تھک جاتے ہیں تو سو جاتے ہیں اگلی صبح جب بیدار ہوتے ہیں تو پھر وہی موسم کے ذکر سے دن شروع کرتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہیں کہ نئی شادیاں جو چھ مہینے کے اندر ٹوٹ جاتی ہیں اُن کی شرح بھی دس فی صدی کے آس پاس ہے۔ اس طرح انگلستان میں موسم شادیوں اور طلاق کے لیے یکساں طور پر ذمہ دار ہوتا ہے۔

'ہیتھ رو' ایرپورٹ کے بارے میں خاص بات یہ ہے کہ وہاں کچھ انگریز بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ورنہ ایسا لگتا ہے کہ اس ہوائی اڈے پر ہندوستانی اور کالے لوگوں کا قبضہ ہے۔

خیر! اس انگریز کی دو پہیوں والی کرسی سے ہم جے جے سنگھ کی چار پہیوں والی کار میں منتقل ہو گئے۔ تقریباً پانچ بجے شمالی لندن میں واقع اُن کے خوبصورت گھر پہنچے۔ گھر پہنچنے پر ان کی بیگم گیتا نے ہمارا استقبال کیا اور ملتے ہی کہا کہ ہندوستانی وقت کے مطابق تو اب لنچ کا وقت ہونے والا ہے۔ کھانا تیار ہے۔ ہم نے کہا دیکھئے آج ہم نے دو بار ناشتہ کیا ہے۔ شام کی چائے بھی پی چکے ہیں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچے ہیں۔ اب ہمیں ہندوستان کی یاد نہ دلایئے۔ اب پورس کے تاریخی جواب کے مطابق ہمارے ساتھ وہی سلوک کیجئے جو ایک انگلستانی دوسرے سے کرتا ہے۔ ڈاکٹروں نے ہمارے کھانے پر پابندی لگا رکھی ہے اور آپ ہیں کہ ہمیں دوہرا لنچ کھلانے پر تلی ہوئی ہیں۔ کافی بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ چائے ایک بار پھر پی لی جائے اور تیار شدہ لنچ کو مناسب وقت پر بطور ڈنر استعمال کیا جائے۔ چائے پینے کے بعد ہمیں تھوڑا آرام کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ جو ہم نے بادل نخواستہ قبول کر لیا۔ باقی کے لوگ خوش گپیوں میں لگ گئے۔ تھوڑی دیر تک تو اُن کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر نہ جانے کب ہم نے گھوڑے بیچ دیئے۔

جب ہمیں جگایا گیا تو ہماری میزبان گیتا ہاؤس کوٹ پہنے، ہاتھ میں چائے کا پیالہ لیے ہمارے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ہم نے پروٹسٹ کیا۔ یا خدا پھر یہ چائے۔ ہم اور چائے نہیں پئیں گے۔ اب صرف ڈنر کھائیں گے گیتا مسکرائی اور گویا ہوئی۔ جناب یہ رات کا وقت نہیں، صبح ہے۔ ڈنر تو آپ نے سو کر گنوا دیا۔ ہم نے کہا کہ یہ سراسر دھوکہ ہے۔ کہاں ایک دن میں دو کھانے اور کہاں ایک ڈنر بھی غائب۔ یہ کیسی مہمان نوازی ہے؟

گیتا نے جواب دیا کہ آپ آرام سے سو رہے تھے اور اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ آپ کو ڈسٹرب نہ کیا جائے کیونکہ کھانے سے زیادہ آپ کو آرام کی ضرورت ہے اور ویسے بھی آپ کو معلوم ہے کہ

"جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے" ہم لاجواب ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد ہم نے یہ طے کر لیا کہ آئندہ کھانے کی آفر کو کبھی رد نہیں کریں گے۔

ہوش و حواس کی باتیں کیسے کر سکتا ہے؟!

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کے باوجود اگر لوگ غالب کے ہر شعر میں کوئی الہامی کیفیت محسوس کرنے کی خواہ مخواہ کوشش کریں تو اس کا کیا علاج ہے؟"

"رشید صاحب کے اس نظریئے کو سن کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیوں کہ اس نے میری غلط فہمی کو دور کر دیا جو مجھے غالب کی شاعری اور اس سلسلے میں اپنی جہالت کے متعلق ہوتی جاتی تھی۔ اور جب:

نقشِ نازِ بتِ طناز بہ آغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

یا

از مہر تا بہ ذرّہ دل و دل ہے آئینہ — طوطی کو شش جہت میں مقابل ہے آئینہ

جیسی گتھیوں کو سلجھانے کی نوبت آئی تو میں نے سمجھ لیا کہ یہ اشعار مہینے کی آخری تاریخوں میں کہے گئے ہوں گے۔

غالب کے بعد اقبال کے کلام میں بھی مجھے ان ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن پروفیسر رشید احمد صدیقی کا نظریہ یاد تھا۔ میں نے اقبال کے کلام کو سمجھنے سے پہلے ان کے خانگی حالات کی تفتیش شروع کی اور جب مجھے معلوم ہو گیا کہ غالب کی طرح تو نہیں، لیکن ان کو بھی مالی مشکلات سے دوچار رہنا پڑتا تھا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ علامہ اقبال کے ہر شعر میں زبردستی معنی پیدا کرنا ان کی شاعری کی توہین اور اپنے قیمتی وقت کو برباد کرنا ہے۔"

جیسا کہ لکھ چکا ہوں، ہمارے دور میں بے معنی اشعار کی صنعت کا تجربہ بیشتر میں خود شرف عظیم آبادی نے یوں کیا۔ لکھتے ہیں:

"چند سال ہوئے مجھے ایک تقریب میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا۔ حسبِ دستور نوشاہ کی شان میں سہرے پڑھے جا رہے تھے اور تعریفیں ہو رہی تھیں۔ اس سلسلے میں جب ایک صاحب نے فلسفیانہ سہرا ارشاد فرمایا اور واہ واہ سے چھت پھٹنے لگی تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے ایک دوسرے کمرے میں جا کر فوراً سہرے کی جگہ پر ایک مسدس کہا اور اسے ایک لمبی چوڑی تمہید کے بعد حاضرین کے سامنے پیش کیا۔ میرے اس شاہکار نے مجمع کو کس درجہ متاثر کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مشہور شاعر نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگا لیا اور فرمانے لگے کہ "میاں خدا تمھیں زندہ رکھے۔ اس عمر میں اور یہ بلند خیالی۔ تمھارے کلام سے انیس و دبیر کی روحیں خوش ہوتی ہوں گی۔ اب ذرا اس مسدس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

ابھی بہارِ چمن محرمِ کلیسا تھی — ابھی نگارِ حنا زمزمِ مسیحا تھی

ابھی شعارِ دہن شبنمِ زلیخا تھی — ابھی شمارِ سخن برہمِ چلیپا تھی

ادھر شفق کی طرف چشمِ یار اٹھی تھی

ادھر ضیائے کرم جھکے بار اٹھی تھی

بہارِ نو ادھر آئی اُدھر ترانہ بنی — زباں ہلی بھی نہ تھی اور ادھر فسانہ بنی
کسی کی محویتِ شوق آشیانہ بنی — نگاہِ ناز ترنم کا اک نشانہ بنی

زمیں میں پھرسے مئے گلعذار آنے لگی
کفِ خمار کہیں میں بہار آنے لگی

فضا میں جب گلِ سرشار لہلہانے لگے — فسوں گرِ گلہریار مسکرانے لگے
خمارِ نرگسِ بیمار تلملانے لگے — اِدھر اُدھر سے دلِ نو بہار آنے لگے

جہاں میں شور ہے جنت رسا کے آنے کا
نیازِ دلکشِ شوق آزما کے آنے کا

خوشا وہ روز کہ ہے شادیٔ فضائے سخن — خوشی ہے اس کی کہ ہے امتحانِ جائے سخن
مکین و مصدرِ بحرِ طلسمائے سخن — نسیمہ ہنسنے لگی آگئی ہمائے سخن

سخنوروں کے لیے عشوۂ جوانی ہے
نیازِ بحرِ سلیماں کی کامرانی ہے"

اشعارِ بے معنی کے اس کامیاب تجربے کے بعد منڈلی کے دیگر اشخاص نے اس صنعت کو مزید فروغ دینے کا تہیہ کیا۔ چناں چہ غالباً ۱۹۳۸ یا ۱۹۳۹ء میں جب حضرت نانک چند نانک لکھنوی، پٹنہ تشریف لائے اور یہاں کے اعزاز میں اہلِ عظیم آباد نے ایک مشاعرہ منعقد کیا تو ہم لوگ بھی اس مشاعرہ میں شریک ہوئے۔ یہاں یہ عرض کردوں کہ نانک لکھنوی اردو رسم الخط سے نابلد تھے، اپنا کلام ہندی میں لکھتے تھے۔ اس زمانے میں "ہستی" کے متعلق ان کی رباعیات رسائل میں شائع ہو کر مقبول ہو رہی تھیں۔

اسی مناسبت سے پنچایتی کوشش سے دو تین بے معنی رباعیاں لکھنے کے علاوہ، نانک صاحب کی شان میں بھی ایک قصیدہ لکھا گیا اور یہ سب کچھ اتنے ہی عرصے میں ہوا، جتنی دیر میں ہم لوگ وسط پٹنہ سے بذریعہ بس مشاعرہ گاہ تک پہنچے۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

دلکش ہے بہت بسکہ نگارِ ہستی — نذر اس کی ہوئی آہ بہارِ ہستی
وارفتگیٔ شوق سے ہائے افسوس — پائینِ مزار ہے وقارِ ہستی

—

حلوائے حیات ہے ایاغِ ہستی — تسبیح و صلوٰۃ ہے دماغِ ہستی
برباد تفکر ہے یہ دنیا سے نمود — اب تک نہ ملا مجھ کو سراغِ ہستی

قصیدہ ۲۷-۲۸ اشعار کا تھا۔ چہرہ اختر اورینوی نے لکھا، ساقی نامہ تجلی نقوی نے اور مدحیہ اشعار راقم الحروف نے درمیان میں شرف نمتائی اور اظہر نے بھی کہیں کہیں ایک دو اشعار جوڑے۔

کہ ایک بے معنی غزل پر انھوں نے انعام دیا ہے تو بہت خفیف ہوئے ۔ اس کے بعد تو مظفر نقوی کا حال یہ ہوا کہ مشاعروں میں اچھا سے اچھا کلام بھی پڑھتے تو بعض حضرات اشعار کو بے معنی سمجھ کر انھیں انعام کا مستحق نہیں سمجھتے۔

مشہور خاتون افسانہ نگار شکیلہ اختر سے اختر اورینوی کی شادی محبت کا نتیجہ تھی ۔ دونوں ایک دوسرے کو بے حد چاہتے تھے ۔ ہماری منڈلی کے کل افراد شکیلہ سے بے تکلف تھے ۔ اختر کے دوستوں کو وہ اپنا عزیز سمجھتی تھیں ۔ ہم لوگ جب بھی ان کے گھر جاتے ، وہ سراپا میزبان بن جاتیں ۔ ہم لوگ کھل کر ان سے مذاق کرتے اور وہ ترکی بہ ترکی جواب بھی دیتیں ۔ ایک بار میں نے اور شرف عظیم آبادی نے ان کے ساتھ بڑا سنگین مذاق کیا اور مذاق کا وسیلہ بھی صنعت معرّیٰ من المعنی بنی ۔ ۱۹۳۸-۱۹۳۹ء کا زمانہ تھا ۔ لاہور سے اختر شیرانی ماہنامہ 'رومان' نکالا کرتے تھے ۔ ہر ماہ اختر اورینوی کی رومانی نظم اس میں شائع ہوا کرتی ۔ ایک بار ان کی نظم بعنوان "اجتناب" شائع ہوئی ۔ نظم کا مفہوم یہ تھا کہ محبوب سے مخاطب ہو کر شاعر کہہ رہا ہے کہ ــــ اے میرے محبوب اب تجھ میں رعنائی جمال باقی نہیں ، لہٰذا میں تجھ سے اجتناب کرنے پر مجبور ہوں ۔ شرف اور میں اسمبلی کے دفتر میں ملازم تھے ۔ جب ہم نے رومان میں یہ نظم پڑھی تو ایک شرارت سوجھی ۔ اس نظم کا جواب ، شکیلہ اختر کے نام سے بعنوان "اجتناب نہ کر" مشترکہ کوشش سے لکھا گیا ۔ ایک مصرع "مرے حبیب محبت میں کم نگاہ نہ بن" کو چھوڑ کر پوری کی پوری نظم بے معنی تھی ۔ مفہوم یہ تھا کہ ــــ اے میرے پرانے عاشق اب جب کہ میں شباب کی منزل سے گزر چکی ہوں تو تو اپنے پچھلے وعدے اور پچھلی محبتیں بھلا رہا ہے ، اس سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ تو محبت میں مخلص نہیں تھا ، وغیرہ وغیرہ ۔

نظم صاف کر کے 'رومان' میں اشاعت کے لیے بھیج دی گئی ۔ اختر شیرانی نے نظم بڑے نمایاں طور سے شائع کی ۔ ان دنوں اختر اپنی سسرال اروَل میں قیام پذیر تھے ۔ وہاں 'رومان' کا وہ شمارہ پہنچا تو شکیلہ نے بڑے اشتیاق سے اس کی ورق گردانی شروع کی ۔ جب انھیں اپنے نام کے تحت "اجتناب نہ کر" کی سرخی نظر آئی تو اختر صاحب کو وہ نظم دکھائی ۔ پہلے تو وہ لوگ سمجھے کہ اختر شیرانی نے شکیلہ کی بھیجی ہوئی کسی نظم کی سرخی بدل کر نظم شائع کی ہے ۔ لیکن پوری نظم پڑھنے کے بعد وہ دونوں ہماری شرارت کی تہہ تک پہنچ گئے ۔ دوسرے دن میرے اور شرف کے نام سخت غصے سے بھرا ہوا خط ، اختر نے دفتر کے پتے پر لکھا کہ تم لوگوں نے یہ کیا بیہودگی کی ہے ۔ ایک شریف خاتون کے نام سے بیہودہ سی نظم چھپا کر انھیں رسوا کیا ۔ خط ملنے کے بعد ہم دونوں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا اور نظم کے متعلق اپنی لاعلمی ظاہر کی ۔ ادھر اختر اورینوی نے اختر شیرانی کو خط لکھ کر صورت حال سے آگاہ کیا اور لکھا کہ آئندہ شمارے میں تردیدی نوٹ شائع کر دیں کہ یہ نظم شکیلہ نے نہیں بھیجی تھی بلکہ کسی شخص کی شرارت تھی ۔

اگلے ماہ تردیدی نوٹ تو شائع ہو گیا ۔ لیکن اس وقفے میں لاہور کے ادبی حلقوں میں "اجتناب" اور "اجتناب نہ کر" کا خوب خوب چرچا ہوتا رہا ۔ بعض لوگوں نے اختر کی مذمت کی کہ انھوں نے اپنی محبوبہ کے ساتھ بے وفائی کی ۔ شکیلہ کی تعریف کی کہ ایک مشرقی خاتون ہوتے ہوئے بھی انھوں نے اپنے بے وفا شوہر کو آڑے ہاتھوں لیا ہے ۔ جب اختر اور شکیلہ اروَل سے پٹنہ آئے تو ہم دونوں سے کئی دنوں تک منہ پھلائے رہے ۔ شکیلہ نے کبھی اس نظم کا تذکرہ

چھپوا دیں کہ ہم لوگ اقبال جرم کرلیں۔ لیکن عرصہ دراز تک ہم میں سے کسی نے زبان نہ کھولی۔

ایک اور دلچسپ واقعہ کا ذکر کرتا چلوں۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، بہار کے گورنر تھے۔ گورنمنٹ ہاؤس میں ۲۶ جنوری اور ۱۵ اگست کو مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے جن میں زیادہ تر مقامی شعرا مدعو کیے جاتے۔ ۲۶ جنوری سے دو تین روز قبل شام کے وقت ارتضیٰ کریم ہوش (مرحوم) دفتر سے لوٹتے ہوئے میرے یہاں آگئے۔ ہوش ایک منجھے ہوئے پرگو شاعر تھے، بڑے زندہ دل [illegible] تھے اور یار باش بھی۔ دفتر تعلیمات عامہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انہوں نے کہا کہ گورنمنٹ ہاؤس میں مشاعرہ ہونے والا ہے، کیوں نہ اس موقع پر کوئی [illegible] کی جائے۔ چناں چہ طے پایا کہ [illegible] میں جمیل مظہری، پروفیسر اجتبیٰ رضوی، پروفیسر اختر اورینوی، پروفیسر پرویز شاہدی اور کاظم حسین زار عظیم آبادی کے اسلوب میں بے معنی غزلیں لکھ کر ۲۶ جنوری کے اخبارات میں چھپوا دی جائیں۔ غزلیں قلم برداشتہ لکھی گئیں۔ کچھ اشعار ہوش کے تھے کچھ میرے [illegible] بالخصوص لب و لہجہ تھا اور جن لفظیات کو یہ حضرات استعمال کرتے تھے انھیں مختلف مصرعوں میں سمو کر ان حضرات کے اسلوب نگارش کی نقل کی گئی۔ اس کے بعد کلام صاف کر کے پٹنہ کے پانچ چھ روزناموں کو برائے اشاعت بھیج دیا گیا۔ خط میں مدیروں کو لکھا گیا کہ کلکتہ میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا جس میں بہار کے یہ چار شعرا شریک ہوئے۔ ۲۶ جنوری کے خصوصی شماروں میں دو کالمی سرخی کے تحت پورے صفحہ پر چاروں غزلیں شائع ہو گئیں۔

اسی روز شام کے وقت گورنمنٹ ہاؤس میں مشاعرہ ہونے والا تھا۔ طے یہ پایا کہ میری قیام گاہ سے گورنمنٹ ہاؤس قریب ہے، اس لیے مدعو شعرا دوپہر کا کھانا میرے یہاں کھائیں اور شام کو یہ قافلہ باجماعت مشاعرہ گاہ پہنچے۔ جمیل مظہری، اختر اورینوی، کاظم حسین زار، ہوش عظیم آبادی، شہزاد [illegible] اور چند دیگر شعرا وقت مقررہ پر میرے یہاں آگئے۔ اجتبیٰ رضوی اور پرویز شاہدی جو علی الترتیب دربھنگا اور کلکتہ میں رہتے تھے، پٹنہ میں موجود نہیں تھے۔

صبح کے اخبارات میز پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اختر اورینوی سے کہا کہ آج کلکتہ کے ایک طرحی مشاعرے کی روداد چھپی ہے، جس میں بہار کے چار نامور شعرا نے ہم طرح غزلیں لکھ کر شرکت کی تھی۔ اختر صاحب صاحب نے ہاتھ بڑھا کر ایک اخبار اٹھا لیا اور لطف لے کر پڑھنے لگے۔ جمیل صاحب کا ایک مصرع تھا:

یہ خودی خدا نہیں ہے یہ دھواں ہے نقش پا کا

اجتبیٰ رضوی کا ایک شعر تھا:

مری تشنگی میں ہے ربوبیت کا عالم
کہ قدم رکا ہوا ہے سفر گریز پا کا

پرویز شاہدی کا مطلع تھا:

کہیں انقلاب نو کا نہ ہوا ابھی دھماکا
کہ [illegible] ہے [illegible] کہ [illegible] کا	([illegible])

زار عظیم آبادی کا ایک شعر تھا:

مری تشنگی بجھائی نہ کبھی تری نظر نے
نہ دعا کا آسرا ہے نہ سوال ہے ادا کا

یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ جمیل مظہری فکری طور پر غالب سے متاثر تھے، اجتبیٰ رضوی، فلسفہ، تصوف اور جمالیت کے دلدادہ تھے، پرویز شاہدی کٹر قسم کے کمیونسٹ اور ترقی پسند تھے اور زار عظیم آبادی روایتی شاعر تھے۔ اسی مناسبت سے ہر شاعر کا کلام اس کے مخصوص رنگ میں لکھا گیا تھا۔

غزلیں پڑھنے کے بعد اختر اورینوی نے جمیل مظہری صاحب کو مخاطب کرکے کہا، جمیل بھائی کیا خوب غزل کہی ہے آپ نے۔ جمیل صاحب نے پوچھا کون سی غزل اختر بولے وہی غزل جو کلکتہ کے طرحی مشاعرے میں آپ نے پڑھی تھی، آج کے اخبار میں شائع ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا، میں تو ایک عرصے سے کلکتہ گیا ہی نہیں ہوں مشاعرہ میں غزل اور وہ بھی طرحی غزل پڑھنے کی بات کہاں سے آگئی۔ اچھا سنیے تو دو ایک شعر۔ اختر صاحب نے مطلع سنایا، دوسرے شعر کا پہلا مصرع ہی پڑھا تھا کہ جمیل صاحب نے ایک زور دار قہقہہ لگایا، کہنے لگے اختر صاحب آپ نے لغو اور بے معنی کلام کو میرا کلام کیسے سمجھ لیا۔ یہ تو آپ کے دوستوں میں سے کسی صاحب کا مذاق ہے۔ اختر بڑے حاضر جواب تھے، انھیں اپنی غلطی کا فوراً احساس ہوگیا کہنے لگے کہ جمیل بھائی میں تو کہہ رہا تھا کہ آپ کے نام سے جس نے بھی یہ بے معنی غزل چھپوائی ہے، اس نے آپ کے اسلوب کی کیا شاندار نقل کی ہے، ہر شعر کے دونوں مصرعے بالکل رواں دواں ہیں کہیں کوئی جھول نہیں، لفظیات بھی آپ جیسی استعمال کی گئی ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ کسی شعر سے کوئی مطلب برآمد نہیں ہوتا۔ جو لوگ موجود تھے، سب نے چاروں معرکۃ الآرا غزلیں پڑھیں اور لطف اندوز ہوئے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ دوسرے روز دربھنگا سے اجتبیٰ رضوی صاحب پٹنہ آئے تو ان کے چند دوستوں نے مطبوعہ طرحی غزلوں کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ اجتبیٰ صاحب آپ کے کلام کا کیا کہنا، لیکن حسبِ معمول بعض اشعار میں آپ نے چند ایسے مغلق الفاظ نظم کیے ہیں کہ ہمیں لغت میں بھی وہ الفاظ اور ان کے معنی نہیں مل سکے۔ اجتبیٰ صاحب چونکے۔ کہا کہ میں تو مشاعروں میں شرکت ہی نہیں کرتا، کلکتے کے مشاعرے میں طرحی غزل پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کے سامنے اخبار پیش کیا گیا تو چاروں غزلیں پڑھنے کے بعد اجتبیٰ صاحب نے برہمی سے کہا کہ یہ ایک بہت بڑی سازش رچی گئی ہے، خصوصاً میرے خلاف، تاکہ جہاں جہاں کے لوگ یہ اخبار پڑھیں گے سب یہی سمجھیں گے کہ اجتبیٰ رضوی پاگل ہوگیا ہے، اول فول بکنے لگا ہے۔ میرے کچھ دشمن مجھے کالج سے ہٹانے کی بھی سازش کریں گے (اس زمانے میں وہ ملّت کالج دربھنگا کے پرنسپل تھے)

اس کے بعد وہاں سے اٹھ کر وہ سیدھے میرے یہاں آگئے۔ چہرے پر ملال کے آثار تھے۔ آتے ہی کہنے لگے ــــ "رضا میاں نکالیے جوتے اور میرے سر پر جتنے مار سکیے مار لیجیے۔" میں ہکا بکا رہ گیا۔ فوراً اٹھ کر

ان کے قدم پکڑ لیے اور عرض کیا کہ اجتبیٰ بھائی آپ میرے بزرگ ہیں، آخر مجھ سے ناراضگی کا سبب کیا ہے؟ جب تک آپ نہیں بتائیں گے میں آپ کے قدموں سے نہیں اٹھوں گا۔ انھوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے میرے نام سے بے معنی غزل چھپا کر سارے ملک میں مجھے تماشا بنا دیا کر میں دیوانہ ہو گیا ہوں، یہ کیوں کیا؟ اور اس کی تلافی کیسے ہوگی۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ ایک بے ضرر مذاق نے serious صورت لے لیا ہے۔ میں نے دست بستہ عرض کیا کہ حضور غلطی ہوگئی، لیکن یہ اشعار پڑھنے والوں کو بدنام کرنے کے لیے ہم نے نہیں لکھے ہیں بلکہ محض تفنن طبع اور دوسروں کی سخن فہمی کا امتحان لینے کے لیے آپ نے جدید ترین شعرا کے اسلوب اور طرز نگارش کی پیروی کی ہے، آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔ بڑی مشکل سے ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ لیکن مجھے آج تک ندامت ہے کہ اجتبیٰ صاحب کو تھوڑی ہی دیر کے لیے سہی، لیکن مجھ سے رنجش ہوگئی تھی۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ صنعت مہملات عن المعنی میں مشاقی کے باعث نوبت یہ پہنچی کہ کبھی کبھی اپنے با معنی اشعار پر بھی بے معنی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لیے کسی نظم کی اشاعت سے قبل اس کے با معنی ہونے کی سند اپنے سخن فہم دوستوں سے لینی پڑتی تھی۔

●●

محبوب انجمی

استاد

اک پھڑکتی سی غزل کوئی سنا دیں استاد
واہ وا واہ سے چھت ساری اڑا دیں استاد

چند غزلیں ہی مجھے کہہ کے تھما دیں استاد
مجھ کو بھی شاعرِ بے مثل بنا دیں استاد

اپنا بے مثل ترنم ہی سنا دیں استاد
تک دھنا دھن ہی سے بس مست بنا دیں استاد

سب ہیں مشتاق بہت، سننے کو سب ہیں بے تاب
رنگ اپنا بھی ذرا آکے جما دیں استاد

اردو والے ہوں تو ہندی میں سنا دیں غزلیں
ہندی والے ہوں تو اردو میں سنا دیں استاد

اہلِ محفل پہ ذرا رعب جمانے کے لیے
اپنا حضرت ہی کو استاد بتا دیں استاد

کون سمجھے گا غزل کس کی ہے کس کا ہے کلام
کہہ کے اپنا اسے بے کھٹکے سنا دیں استاد

محفلِ شعر میں جھنڈے جو ہیں گاڑے اب تک
اس کی تفصیل سے روداد سنا دیں استاد

لوٹ لوں لال قلعے کا میں کوی سمیلن
ایسا تگڑم کوئی اس بار لگا دیں استاد

جانشینِ حضرتِ محبوب کو کہہ دیں اپنا
ان کو استاد دِلی کا استاد بنا دیں استاد

⊙

یہ کہہ کے بیوی نے برقعہ اتار ڈالا ہے
اب اس سے کا ہے کا پردہ یہ رکشے والا ہے

ذرا سا لنگ ہے پاؤں میں رنگ کالا ہے
مگر حسین ہے وہ کیوں کہ پیسے والا ہے

نظر نہ آئیں گے انسان شاعروں کے سوا
مجھے یقین ہے وہ دن بھی آنے والا ہے

بہشت میں تھی خبر کیا غریب آدم کو
زمیں پہ اگتے ہی چکی میں پسنے والا ہے

خلاف اس کے ہوئے فیصلے عدالت کے
وہ تُس سے مَس نہ ہوا کس قدر جیالا ہے

یہاں وہاں ہیں مخالف ہزار دل اس کے مگر
جہاں بھی دیکھیے اردو کا بول بالا ہے

شاہد صدیقی

انیس سلطانہ
(بھوپال)

دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے بڑھاپا

مگر جب دوستوں پر بُرا وقت آپڑے تو کیا کریں — ؟ اور نہ دوست نہ دشمن ' اپنی ذات بابرکات جب پہاڑ تلے آئی تو بچنا محال —!! آئینہ یوں بھی کبھی کبھی دیکھتے تھے ' سنگھار میز ہو تو اس سے بچ کر گزر جائیں مگر یہ جو خانۂ بے تکلف آئینہ خانہ بنا ہوا ہے ' اس کا کیا کیا جائے۔ چنانچہ الماری میں بھی آئینہ لگایا جانے لگا ہے۔ گویا ہمارے خلاف اچھی خاصی سازش تیار ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے آئینہ سامنے ہو تو نظر پڑ ہی جاتی ہے۔ ایک دن خدا دل لگا کر اپنی صورت دیکھی۔ کانوں کے پاس کچھ سفیدی کا دکھائی دی۔ آنکھیں مل مل کے دیکھا۔ سفیدی بدستور تھی۔ دل ہر چند کہ جوانی کی قسمیں کھا رہا تھا ' مگر ہم لرز ہی تو گئے ' ان چند لمحوں میں ہمارے سامنے اپنی زندگی کی رنگا رنگ تصویریں البیلی اداؤں کے ساتھ گزر گئیں۔

پہلے ہم اکثر و بیشتر ہلکے ' سبک رنگوں کے اور بیشتر سفید رنگ کے کپڑے پہنا کرتے تھے ' اور سادہ روش نیز... اونچے خیالات پر عمل پیرا تھے۔ اب ڈھونڈ ڈھونڈ کر رنگین کپڑے پہننے لگے۔ کیونکہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے ' جیسے جیسے کانوں کے پاس کی سفیدی نے مانگ کی طرف سفر شروع کیا۔ کپڑوں کے رنگ شوخ اور بھڑک دار ہوتے چلے گئے۔ گویا ہم غرق البحر تک ہو چکے تھے۔

ہائے ہائے ایک زمانہ وہ بھی تھا کہ دوست ' پیارے ہمیں شوخ رنگ پہننے کی تلقین کرتے تھے تو ہم شرما کر رہ جاتے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ سب ہمیں کو دیکھ رہے ہیں......... لیکن اب ..... کوئی یہ نہیں کہتا کہ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — ؟ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں۔

البتہ سرخ رنگ زیب تن کرنے سے ہم کچھ کچھ ڈرتے ہیں ' پتہ نہیں کیوں۔ ہماری بے رنگی بارش میں بدل چکی تھی ' مگر زلفِ دراز سیاہ کو سفید کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ہم نے اپنی کھوئی ہوئی ہمت کو یکجا کیا اور

بیوٹی پارلر کا رُخ کیا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کم فرصتی کے اس عہد میں جہاں دن رات صرف چوبیس گھنٹے کے ہوں تو ہوں، سارا دن اگر افزائش حسن کی نذر ہو جائے تو تنگی دل کے ساتھ ساتھ تنگی اوقات کا گلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ سو وہ ایک قیمتی دن ہم ضائع کر چکے تھے۔ اور دورانِ آرائش جن جن مراحل سے گذرنا پڑا، ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ عقل نے مہمیز کیا کہ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔

اب بھی کبھی کبھی یارانِ نکتہ داں سفیدی دیکھ کر آزردہ ہو جاتے ہیں تو ان کا دل رکھ لینے کو کبھی کبھی کالک پوت لیتے ہیں۔ نتیجہ میں سیاہ و سپید کے مالک بننے کا ڈھنگ تو ہم نے سیکھ ہی لیا ہے۔ مگر ہوتا یوں ہے کہ جب سیاہی شاملِ حال ہوتی ہے اس وقت بھی اور جب سفیدی غالب آتی ہے تب بھی ایرے غیرے جب اماں اماں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو دلِ حزیں کے ٹکڑے اس تیزی سے بکھرتے ہیں کہ ہم سنبھالتے ہی رہ جاتے ہیں۔

عمرِ عزیز کے دو چار سال اور گھٹا کر بتا دیتے مگر یہاں تو سرکاری نوکری ٹھہری ——— اسی لئے تو دادی اماں نوکری کرنے کی مخالفت کرتی تھیں۔ کہتی تھیں "لڑکیوں کے چہرے بے رونق ہو جاویں ہیں باہر نکلنے سے۔"

ایک اور معاملہ بھی ہے کہ پنشن کے سال گنتا شروع کیجئے، بال اپنے آپ سفید ہونے لگتے ہیں۔ ہر بار سینیارٹی لسٹ میں اپنی عمر کا شمار کرتے رہیئے، چھپانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی کہاں نکلتا ہے کہ ہم وقت سے پہلے بوڑھے سمجھ لئے جائیں۔

غضب تو اس وقت ہوا جب ہمارے پڑوس میں رہنے والے مولوی صاحب نے ہمیں خالہ کہہ کر مخاطب کیا تو کیا ہم نہ ہوتے بے ہوش ..... ذرا انصاف سے کہئے ..... خیر تو ہم بے ہوش ہوتے ہوتے بچے۔ کیونکہ ان مولوی صاحب سے ہمیں شرف تلمذ حاصل تھا۔ اور آج ایک عرصہ بعد دیکھنے پر وہ ہمیں ہماری والدہ سمجھے نیز آداب بجا لائے۔

ہم نے بہت غور کیا، فکر بھی کی۔ کہیں ضرور کچھ کسر رہ گئی تھی۔ حالانکہ ایک بال بھی سفید نہ رہ گیا تھا۔ اور ہم ازراہ انکسار اپنے کو اپنی بیٹی سے بھی خورد تر، بلکہ اس سے بھی چھوٹا سمجھنے پر تیار تھے ..... دانت بفضلہ پورے کے پورے موجود تھے۔ بلکہ وہ جو دو چار ہونٹوں پر دھرے رہتے اور دوستوں کو خوش مزاجی کا نمونہ و نکتہ نوازوں کو ہاتھی کے دانت دکھائی دیتے تھے، انھیں بھی منہ کے اندر رہنا اور اس مظلوم زبان کو قابو میں رکھنا آگیا تھا۔ تمام داڑھیں اور دو چار دانتوں کو عضوِ زائد سمجھ کر نکلوا چکے تھے، تو کیا ہوا کہ آج بھی ہم بڑھاپے کے آثار ہیبت ناک سے محفوظ تھے ..... کہ زندہ باد چینی دندان ساز۔

چشمہ بار بار ناک سے پھسلتا، نیز ہماری بڑھتی ہوئی عمر کی چغلی کھاتا، اس لئے ہم نے آنکھوں میں کنٹکٹ لینس لگوائے، پھر بھی مولوی صاحب کو ہم پر کسی اور کا شک ہوا ——— تف برایں میک اپ۔ اور وائے برایں مشاغل ———!!

حادثے دونوں یہ ہم پہ ہی گذرنا تھے اگر
بعد میک اپ کے تو بوڑھا نہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا

لفظ بعنوان پھر یاد آیا کہ لڑکپن ایک حادثہ تھا اور بڑھاپا دوسرا! اور بعد ظہور پیری، تمنائے شباب تیسرا اور آخری مرحلہ کہ شباب تو اس ڈالڈائی زمانہ میں اصل عمر میں بھی نہیں آتا۔ پہلے ریڈیو اور پھر ٹی۔ وی کے اشتہارات نے طبیعت کو بیک کہنا شروع کر دیا ہے۔ اور بچہ بچہ کو بوڑھا بنا دیا ہے تو ادھر کچھ اٹھارہ سال والی کھیل کود کی عمر کو حق رائے دہندگی کے شوق نے مہمیز کیا ہے ——!!

رہ گئے ہم اور ہم جیسے سال خوردہ حضرات، سو ان کی کیا گنتی اور کیا شمار —— سو ہم نے اپنی موسپیدی کو بڑھ جانے دیا کہ بہرحال خون کی سفیدی سے بالوں کی سفیدی بہتر ہے۔

مگر آج ہمیں ایک عدد سمینار اٹینڈ کرنا تھا۔ جھما جھم فوٹو کھینچے جاتے ہیں۔ ادھر بالوں کی سفیدی نے اعلانِ بزرگی کر رکھا ہے، کیمرہ کا رخ بھلا ہماری طرف کیونکر ہوگا اور اگر ہوگا بھی تو سفید بال کیا چھپ سکیں گے۔

سو آج ہم صبح سے تیاریوں میں مصروف تھے۔ غریب خانہ کہ خانۂ بے تکلف ہے اور کہ جس کے دروازہ کبھی بند نہیں ہوتے، انھیں کھلا چھوڑ کر ہم ایک بار اور اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے پر تیار ہو گئے۔

واپسی میں مہمان ہمارے انتظار میں آنکھیں بچھائے اور دسترخوان اٹھائے بیٹھے تھے کہ ہم شام کے لئے کچھ روزی روٹی کی فکر کریں۔ مگر آج تو ہمارے پاس واقعی وقت نہ تھا۔ اس لئے دو چار بسکٹ کھا کر اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ جینے کے لئے اتنا ہی بہت ہے۔ لوگ صرف ایک وقت کھانا کھا کر زندہ رہ لیتے ہیں اور پھر ہم تو ٹھہرے پڑھے لکھے، آج روحانی غذا سے ہی سیری حاصل کی جائے۔

جلسہ گاہ پہونچ کر حاضرین باتمکین میں جنھوں نے ہمیں عرصہ بعد دیکھا، کسی کسی نے یہ فقرہ ضرور کسا کہ "تم بالکل نہیں بدلیں —— " مگر جو اکثر دیکھتے رہتے ہیں وہ ہرگز روزِ روشن کو شب تاریک سمجھنے پر راضی نہ تھے۔ چنانچہ ہمیں دیکھ کر کچھ کچھ بدلے۔ خیر ہم کہاں نوٹس لیتے ہیں، ایسی باتوں کے تو ہم عادی ہو چکے ہیں۔

ہوا یوں کہ آج ہم کیل کانٹے سے لیس تھے۔ اور ہمہ تن کان بنے ہوئے، جلسہ کی کاروائی سے لطف لے رہے تھے۔ کیمرہ کی جھم جھماہٹ سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ مگر کیمرہ کا زاویہ تو جھا ہی رہا۔ آگے جانے کا کوئی بہانہ چاہیئے تھا۔ برسوں بعد ایک محترمہ جو یونیورسٹی میں ڈین ہوا کرتی ہیں، نظر آگئیں ان سے ملاقات کا بہانہ کر کے ہم اٹھے۔ کیمرہ نے پہلو بدلو بدلا! لہٰذا اپنے صاحبوں کے آگے کی لائن کو کور کر چکنے کے بعد پیچھے کا (نسبتاً پیچھے) رُخ کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک ہی جگہ بیٹھے ٹانگیں درد کرنے لگی تھیں۔ مسلسل چار گھنٹے ایک ہی جگہ بیٹھے پیروں نے جواب اور آنتوں نے سوال کرنا شروع کر دیا تھا۔ علمیت اور کسب علم کا کوئی موقع ہم چھوڑنا نہ چاہتے تھے۔ ویسے بھی اس وقت مقرر انگریزی میں تقریر کر رہے تھے، اس وقت اُٹھ جانا تو اپنی جہالت کا اعلان کرنا تھا، اس لئے محض نشست بدلنے پر اکتفا کی۔ اور بدیدہ ایک عدد فوٹو کھنچ جانے کی تمنّا ہمارے دل میں انگڑائیاں لے رہی تھی۔

نتیجہ ظاہر ہے، روحانی غذا سے مستفید ہونے کے بعد، تل دھار اوپر دھار پانی میں شرابور،

ہو کر نان شبینہ کے محتاج تھے، گھر پہنچے۔

دوسرے دن کے اخبار میں ہماری فوٹو تصویر آئی تھی مگر ایسا لگ رہا تھا، جیسے ہم جلسہ گاہ کے بجائے کھو کھو کے میدان میں زقند لگا رہے ہوں۔ کیمرہ نے صرف نشست بدلتے وقت ہمیں بہ شکل رکوع محفوظ کیا تھا۔ اور ہم اپنے آپ کو محض ساڑی کے پرنٹ کی وجہ سے پہچان پائے کہ نشست بدلتے وقت ساڑی کا پلو چپل میں دب کر تار تار ہو چکا تھا، اور پیچھے سے پھٹا ہوا دامن جو کیمرہ نے محفوظ کر لیا تھا، حسن پرستی کا ثبوت تھا۔

--

رؤف پارکھ

(کراچی)

ریلوے بمقابلہ اونٹ

خدا جانے دیر آید درست آید کا مقولہ کسی مرد دانا کی تخلیق ہے، اس کا خالق ضرور کسی سرکاری محکمے کا افسر ہوگا اور محکمہ بھی کون سا؟ ریلوے! جس کی کوئی کل سیدھی نہیں۔ ریلوے سے تو اونٹ بہتر ہے، کل تو خیر اس کی بھی ایک آدھ ہی ... سیدھی ہوگی لیکن اونٹ کے سفر میں صبر و برداشت اور ضبط و تحمل کی قوتوں کو نسبتاً کم بروئے کار لانا پڑتا ہے۔ پھر اونٹ کے سفر میں ہری جھنڈی بھی ہلانا نہیں پڑتی۔ بس خود ... اونٹ بغیر کھائے پیے کئی روز تک سفر کر سکتا ہے۔ ریلوے والے بغیر کھائے پیے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ ریزرویشن تک نہیں کرتے۔

بات ہو رہی تھی مقولے "دیر آید درست آید" کی۔ ریلوے والوں نے اس مقولے کو غالباً اپنا شعار بنا رکھا ہے۔ غالباً بالکل اسی طرح جس طرح پی آئی اے والوں نے اپنا موٹو "بے کمال لوگ لاعلاج سروس" رکھا ہے۔ مقولے تو اور بھی ہیں مثلاً "صبر تلخ است لیکن بر شیریں دارد" شکر ہے کہ ریلوے والوں نے اسے اپنا موٹو قرار نہیں دے دیا۔ اسی طرح انتظار گاہ کی دیوار پر "ان اللہ مع الصابرین" کے الفاظ کندہ کروائے جا سکتے تھے۔ یا ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر "یہ منہ اور مسور کی دال" لکھوایا جا سکتا ہے۔ سیٹ پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پر عمل ہوتا ہی ہے۔

کہتے ہیں کہ اونٹ صحرا کا جہاز ہے۔ ہوگا، لیکن رفتار میں ریل کو نہیں پہنچ سکتا۔ مثلاً اگر ایک اونٹ اور ایک ٹرین کراچی سے بہ یک وقت لاہور روانہ کیے جائیں تو لاہور پہنچنے میں اونٹ پانچ دن لے گا، لیکن ٹرین اس سے پہلے لاہور پہنچ جائے گی۔ یعنی صرف چار دن میں۔ اور یہ جو اونٹوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بغیر کھائے پیے کئی روز تک سفر کر سکتے ہیں۔ تو اونٹوں کو چاہیے کہ وہ اپنی اس تحسین پر مغرور نہ ہوں، کیوں کہ ان سے کہیں زیادہ لاغر و ضعیف اور قد میں کوتاہ حیوانات، مثلاً ٹرین کے مسافر کئی کئی روز تک بغیر کھائے پیے اور سوئے سفر کرتے ہیں۔

ریلوے کے مسافروں کے بغیر کھائے پیے سفر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ریلوے کا کھانا اس قابل نہیں ہوتا کہ اسے حلق سے نیچے اتارنے کی جرأت یا حماقت کی جائے۔ اگر شوق فضول اور جرأت رندانہ سے کام لے کر چند لقمے معدے میں پہنچا دیے جائیں تو اس سفر کے سفر آخرت میں تبدیل ہونے کے خاصے روشن امکانات موجود رہتے ہیں۔ ایک دفعہ کا تجربہ کا ... جب ... ریلوے کی محبت سے مجبور ہو کر ہم نے ٹرین کا لنچ کھا لیا تھا، ایک ہفتہ درد شکم میں مبتلا رہ کر ریلوے والوں کی جان و مال کو دعائیں دیتے رہے۔

اس ... میں جو کچھ پیش کیا گیا تھا اس کا احوال بھی سن لیجیے۔ سالن کے نام پر سرخ مرچ کا پانی رکابی میں پڑا تھا جس میں ...

گوشت کے دو نمونے مدرسے خرم کے منہ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن شوربا تھا یا پانی یا پانی نما شوربا اتنی کم مقدار میں تھا کہ مرغوبہ گانے کی عادت ہوتی اس میں ڈوب کر مرنے سے قاصر تھی۔

ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بوٹی ربڑ کی بنی ہوئی تھی۔ اسے دانتوں میں دبا کر چبانے اور توڑنے کی کوشش کی تو مجھے غالب کا یہ مصرعہ یاد آگیا

کر جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

اس ربڑ کی بوٹی کو آپ کتنا ہی کھینچیے، نہ ٹوٹنے کی ضمانت ہے۔ دراصل ریلوے کے سالن میں اعلیٰ قسم کا درآمدی ولایتی ربڑ استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا کوئی چھوٹی موٹی اور عام قسم کی بتیسی اسے توڑنا تو کجا چھونے کا بھی خیال دل میں نہ لائے۔ ایک ہم سفر بزرگ نے ہمارے سامنے کوشش بھی کی، بوٹی کو دانتوں میں دبا کر زور سے کھینچا تھا کہ بتیسی کھٹاک سے نکلی اور غلیل سے نکلے ہوئے پتھر کی طرح ٹکٹ چیکر کو جا لگی، جس نے سراسیمہ ہو کر کہا "بزرگوار! کاٹ کھانے کو کیوں دوڑ رہے ہیں آپ؟ صرف ٹکٹ ہی تو مانگا ہے"۔

اس لنچ میں پلاسٹک کی بنی ہوئی دو عدد روٹیاں بھی شامل تھیں۔ جن کے بارے میں طعام گاہ والوں کو خوش فہمی تھی کہ یہ روٹیاں شوربے میں تیرتی ہوئی اس ناقابلِ ہضم اور ناقابلِ فہم شے کے ساتھ کھائی جا سکتی ہیں جسے وہ آلو کہنے پر مصر تھے، حالانکہ اس آلو کو چبانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف تھا۔

چاول البتہ اچھے تھے۔ اصل میں یہ ہے کہ اندھوں میں کانا راجا، چاول چونکہ دیگر اشیا کے مقابلے میں کم خراب تھے، اس لیے اچھے لگے۔ بس ان کو کھاتے ہوئے دانتوں کے استعمال میں ذرا احتیاط برتنا پڑتی تھی کہ کچے چاول کو ہضم کرنے میں معدہ ٹال مٹول سے کام لیتا ہے۔ البتہ پانی کا گلاس ساتھ رکھنا ضروری تھا کہ جب دانتوں میں ریت کرکرانے لگے تو لقمے کو پانی سے دھکا دے کر حلق سے نیچے اتارا جا سکے۔

ریلوے والوں کا خیال ہے کہ وہ لنچ کے ساتھ فرنی بھی دیتے ہیں۔ جسے ان کے بدخواہ بھوسی ٹکڑے والی لئی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بہرحال اس فرنی کا ایک فائدہ تو ہم نے اٹھایا اور وہ یہ کہ اپنی کتاب کی پھٹی ہوئی جلد اس سے چپکا لی۔

پینے کا جو پانی لنچ کے ساتھ فراہم کیا گیا تھا اس میں صرف ایک قباحت تھی اور وہ یہ کہ اسے پیتے ہوئے آنکھیں بند اور دل کھلا رکھنا پڑتا تھا تاکہ اس کا گدلا پن اور اس میں تیرتے ہوئے بے شمار ناقابلِ شناخت اجزا بعد میں رہ رہ کر یاد نہ آ سکیں۔ اس پانی میں ایک سہولت اس کا درجۂ حرارت بھی تھا۔ اس پانی کے گلاس میں اگر تھوڑی سی چائے کی پتی ڈالی جائے تو خوش ذائقہ قہوہ تیار ہو سکتا ہے اور اگر سفر میں ان اشیا کی فراہمی مشکل ہو تو یوں ہی نوشِ جاں کیجیے کہ گرم پانی صحت کے لیے مفید ہوتا ہے اور معدے کے تمام جراثیم فوری ہلاک کرتا ہے۔

ہم خود وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ "مینو" اگر کسی اونٹ کو بھی پیش کیا جائے تو وہ اسے کھانے سے انکار کر دے گا۔ اونٹ کو قدرت کی طرف سے یہ آسانی مہیا کی گئی ہے کہ وہ کئی دن کی بھوک ہڑتال کے بعد بھی مستانہ چال چل سکتا ہے، ریلوے کا محتاج نہیں۔ اشرف المخلوقات انسان بے چارا اس قسم کے تجربات کا متحمل نہیں ہو سکتا اور اگر ہو بھی جائے تو جانبر نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ٹرین میں اس کھانے کے ساتھ سفر کرنا بھی خاصی کشور کشائی کی مہم ہے۔

رہی سونے کی بات، تو ٹرین میں سو[illegible] ہے جیسا غالب کے لیے وصال:

کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں ہو تو کیوں کر ہو

آپ دن بھر کے سفر کی صعوبتوں سے نڈھال ہیں اور اپنی سیٹ پر اکڑوں بیٹھے سونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ برتھ مل نہیں سکی، کیوں کہ وہ سب قلیوں نے بک کروالی تھیں۔ آپ پاؤں بھی زمین پر نہیں رکھ سکتے کہ اس سے بعض مسافروں کے آرام میں خلل پڑے گا۔ یہ بعض مسافر وہ ہیں جو موقع پا کر آپ کی سیٹ کے آگے فرش پر پورے بستر بچھا کر پڑے ہیں اور آپ سے زیادہ آرام میں ہیں۔ نیند بھی آرہی ہے، لیکن سامان چوری ہو جانے کا دھڑکا بھی لگا ہوا ہے۔ ایک آنکھ بند ہے اور دوسری سامان پہ لگی ہے۔ ادھر ایک ہاتھ دل پر ہے اور دوسرا جیب پر کہ،

ہزار راہ زن امیدوار راہ میں ہیں

بشری تقاضوں سے مجبور ہو کر آپ کی آنکھ لگتی ہے کہ ٹرین ایک دھچکے سے کسی بیابان میں رک جاتی ہے اور دریافتِ احوال پر معلوم ہوتا ہے کہ انجن فیل ہو گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ریلوے انجنوں میں فیل ہونے کا فیشن نہیں تھا، لیکن آج کل یہ وبا کچھ زیادہ ہی پھیل رہی ہے۔ کہتے ہیں کہ اگلے وقتوں میں اونٹوں کے قافلے کے ساتھ حُدی خواں بھی ہوا کرتے تھے۔ ان کا کام گا کر اونٹوں کو ہانکنا تھا۔ اونٹ ان کا گانا سن کر مسلسل چلتے رہتے تھے اور ان کی رفتار میں فرق نہیں آتا تھا۔ (یہاں اونٹ ایک بار پھر ریلوے پر بازی لے گئے) اب حُدی خوانوں کا زمانہ تو لد گیا ہے (اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اونٹ اتنے باذوق نہیں رہے کہ محض گانا سن کر اپنی دھن میں مست چلتے چلے جائیں) ریلوے والوں کو چاہیے کہ وہ اپنے انجنوں کی دل بستگی کے لیے موسیقی کا بندوبست فرمائیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے فیل ہونے کی وجہ موسیقی سے محرومی ہو۔

انجن فیل ہونے کے کئی پہر بعد جب قریبی جنکشن سے متبادل انجن آئے گا تو گاڑی چلے گی۔ چلتی کا نام گاڑی ہے، لیکن یہ زیادہ تر نہیں چلتی۔ ڈرائیور بس آپ کے سونے کا انتظار کرے گا، جیسے ہی آپ کی آنکھ لگے گی، گاڑی کو جھٹ کسی اسٹیشن پر اس مہارت سے جھٹکا دے کر روکے گا کہ برتھ پر رکھا ہوا سارا سامان اور سوئے ہوئے کم وزن مسافر دھڑام سے نیچے آن رہیں گے۔ اس طرح ٹرین کے مسافر سو کر اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے سے باز رہتے ہیں یہ جھٹکا [illegible] کو عین نماز کے وقت بیدار کرنے کا موجب ہے۔

آ گیا ریل گاڑی میں اگر وقتِ نماز

کششِ ثقل کی مدد سے محمود و ایاز کو ایک صف میں کھڑا کر کے ڈرائیور انھیں یہ موقع بھی دیتا ہے کہ نماز کے بعد اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں، کیوں کہ منزلِ مقصود سے قبل راستے میں کئی اسٹیشن پڑتے ہیں اور ڈرائیور بریکوں کی کارکردگی ضرور آزمائے گا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ہم جیسے کم زور جُثّہ والے ہر آزمائش میں پورے اتریں۔

رات تین بجے کا عمل ہے۔ ٹرین خدا جانے کون سے اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ غالباً ڈونگہ بونگہ یا شاید ڈنگا بونگا۔ مسافروں کو تہجد کے لیے بیدار کرنے میں پھیری والے پیش پیش ہیں۔ بے شمار صدائیں آپ کے ساتھ آپ کی ہوس [illegible] کو بھی بیدار کر رہی ہیں۔ پکوڑوں اور حلوہ پوری [illegible] مژدۂ جاں فزا سنانے والوں سے تجاہلِ عارفانہ برتتے ہوئے آپ منہ لپیٹ کر پڑے ہیں اور سونے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں کہ ایک صاحب [illegible] کھڑکی میں سر ڈال کر پوری طاقت سے چلائیں گے، "ٹھنڈی ٹھنڈی کھلی بوتل" اس صبر آزما کوشش کر کے [illegible] کے مارے [illegible] جائیں گے اور آپ دل ہی دل میں سوچیں گے کہ بھلا یہ بوتل پینے کا کون سا وقت ہے۔ جلدی کا

اس کا جواب ایک صاحب ذوق کی طرف سے آئے گا۔ جب وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھیں گے اور چند ہی لمحوں میں ٹھنڈی میٹھی کلفی [illegible] چڑھ جائیں گے۔

دھڑ دھڑا کر کے ٹرین چلے گی اور اسٹیشن کے ہنگاموں سے جان چھوٹے گی۔ خوش قسمتی سے اگر آپ کو نیند آ بھی گئی تو جلد ہی بیدار ہونا پڑے گا، کیوں کہ کوئی آپ کا شانہ زور زور سے ہلا رہا ہوگا۔ آپ ہڑبڑا کر اٹھیں گے تو سامنے ایک صاحب کو پائیں گے جو آپ کو بڑی رازداری سے اطلاع دیں گے کہ قیامت بہت جلد آنے والی ہے۔ ان کے دعوے کا یہ عالم ہوگا گویا قیامت کا تعین اگلے اسٹیشن کا ذکر رہے ہوں۔ پھر آپ کو سمجھائیں گے کہ وقت بہت کم ہے۔ جلدی سے ایک مسجد کی تعمیر کے کارِ خیر میں حصہ لے کر جنت میں محل خرید لیں۔ یہ مسجد خدا جانے کون سے اسٹیشن پر بجانے کتنے سالوں بلکہ صدیوں سے بن رہی ہے۔ آپ انھیں یاد دلائیں گے کہ اس مسجد کا چندہ تو طویل عرصے سے وصول کیا جا رہا ہے، اب تک کیوں نہیں بن پائی؟ تو وہ سرد آہ کھینچ کر کہیں گے کہ یہی تو رونا ہے لوگ شقی القلب ہو گئے ہیں۔ کارِ خیر میں حصہ نہیں لیتے۔ قیامت واقعی قریب ہے۔

آپ کچھ دے دلا کر ابھی آپ کو شاباشی دے ہی رہے ہوں گے کہ ایک اور صاحب وارد ہوں گے۔ یہ بھی آپ کو جگائیں گے اور نابینا ہونے کا دعویٰ کر کے آپ کی نیک کمائی میں برکت کی دعائیں دیں گے۔ جس کا فوری نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی نیک کمائی میں ایک آدھ روپے کی کمی ہو جائے گی۔

اسٹیشن آتے ہی یہ صاحب اپنی کمائی گنتے ہوئے اسٹیشن کا نام پڑھ کر اطمینان سے بھیڑ میں گم ہو جائیں گے۔

اسی طرح سوتے جاگتے صبح ہو جائے گی۔ صبح دم دروازۂ خاور کے کھلتے ہی ایک صاحب کھٹی میٹھی گولیاں فروخت کرنے تشریف لائیں گے اور کمپنی کی مشہوری کے لیے آپ کو تقریباً مفت [illegible] عنایت فرمائیں گے۔ ان کے جاتے ہی ایک حضرت السا [illegible] لے کر نازل ہوں گے جو ہاضمے کی خرابی، کھٹی ڈکاروں، گیس، کھانسی، نزلہ، [illegible] جلن، بخار اور سرطان کا علاج ہوگا۔

اونٹ کے سفر میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ کوئی پھیری والا اونٹ پر گھوم پھر کر سودا نہیں بیچ سکتا۔ نہ کوئی جیب کترا آپ کی جیب کاٹ سکتا ہے۔ اونٹوں کے حق میں یہ دلائل سن کر آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کراچی اور لاہور کے درمیان کوئی اونٹ سروس چلانے والے ہیں، جس کے لیے یہ ساری اشتہار بازی ہو رہی ہے۔ رفعِ شر کی خاطر اونٹ کے چند عیوب بھی بیان کرتے چلیں۔ مثلاً یہ کہ آپ اونٹ پر پاؤں پسار کر کتاب نہیں پڑھ سکتے اور نہ اونٹ پر ٹہل سکتے ہیں۔ اس طرح کے شتر غمزوں کا اونٹ متحمل نہیں ہو سکتا۔ اگر ہو بھی جائے تو آپ کی صحت کے لیے خطرناک نتائج و عواقب کا حامل ہوگا۔ مزید برآں اونٹ ہر چند کھانے پینے سے بے نیاز رہ سکتا ہے مگر اس کے سواروں کو پیٹ بھرنے کا جتن کرنا ہی پڑتا ہے۔ (یہ ساری برائیاں پڑھ کر کسی اونٹ کی دل آزاری ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں۔)

اس طرح ٹرین کے سفر میں بھی کچھ نہ کچھ کھانا ہی پڑتا ہے چاہے اس کے لیے دل پر کتنا ہی جبر کیوں نہ کرنا پڑے۔ "تیج" کھا کر ہمیں خاصی عبرت حاصل ہو چکی تھی۔ "آزمودہ را آزمودن جہل است" چناں چہ ناشتہ ہم نے کسی اسٹیشن پر کرنے کا فیصلہ کیا۔ پھیری والے سے کچھ کیک اور بسکٹ خریدے۔ ہر دو علی الترتیب ضرورت سے زیادہ سخت اور نرم تھے۔ بسکٹ ہم نے غذائی بینک کی نذر کر دیے جن کی سختی گزشتہ روز ہڈی چبانے کے خاتمے میں کام آ سکی تھی۔ حق بہ حق دار رسید۔ ان نرم بسکٹوں کو کھانے کے لیے دانتوں کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ [illegible] دیکھ کر دل بے حد خوش ہوا۔ آخر ہم نے بھی اتنی ترقی کر لی ہے کہ بچوں کی خوراک کے [illegible]

سے طرح طرح کی غذائی اشیاء دیکھ کر تجھ سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔ یورپ اور امریکہ والے اس سے زیادہ نرم خوراک بنا کر دکھائیں تو مانیں۔

اس کے بعد کیک کی باری آئی۔ چھ کھانے کے لیے ہم نے چھری تلاش کرنا شروع کیا۔ تلاش بسیار کے بعد نا مرادی اختتام آخر اسی چھری والے سے کیک کا پرچہ ترکیبِ استعمال طلب کیا تو مسکرا کر بولا "صاحب" سامنے پٹری پر رکھ دیجیے۔ ابھی دس منٹ میں چھبیس میل آتی ہوگی مگر جانے تو کچھ اٹھا لیجیے گا اور چائے میں ڈال کر چمچے سے کھا لیجیے گا۔ ایمان سے بڑا لذیذ ہوتا ہے"

اس حیرت انگیز کیک کو اگر ڈاکٹر حضرات آپریشن سے پہلے استعمال کریں (مریض پر) تو کلوروفارم کا فالتو خرچ بچ سکتا ہے۔ بس آپریشن سے پہلے کیک کی پیٹی پر مریض کی گس کر مار دیا جائے تو چند لمحوں میں بے ہوش ہو جائے گا۔ اور گھنٹوں بے حس و حرکت پڑا رہے گا۔ مزے سے گردے، پھیپھڑے، دل اور دیگر اعضائے رئیسہ تھام لیجیے۔ نشتر کی تیزی آزمائیے۔

بسکٹ اور کیک پر فاتحہ پڑھ کر چائے پر توجہ کی۔ چائے سے پہلے ہمیں ایک گلاس میں نیم گرم اور گدلا پانی دیا گیا۔ ہم نے پوچھا "یہ کیا ہے اور چائے کہاں ہے؟" پہلے مسکرائے کہ

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا

پھر ہنس کر بولے، "یہی چائے ہے" چائے کے نام پر چنے کے چھلکوں کا عرق شیریں زہر مار کر کے جب واپس ٹرین میں چڑھے تو اپنی سیٹ پر ایک پہلوان جی کو براجمان پایا۔ ان کی مونچھیں پیتا قد و قامت کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ طاقت کو سب سے ٹھوس دلیل سمجھتے ہیں۔ ان کے تن و توش کو مدِنظر رکھ کر ہم ان کی دلیل کے قائل ہو گئے۔ اس سیٹ پر ہم نے اس وقت تک جو سفر کیا وہ محض ان کی خوش اخلاقی، ہمدردی اور وسعتِ قلبی کا نتیجہ تھا ورنہ چاہتے تو پہلے ہی گھسیٹ کر اٹھا دیتے۔ یہ تو ان کی مہربانی اور فیاضی تھی کہ ہمارے اٹھنے کا انتظار کیا۔ بھلے آدمی تھے۔ ورنہ لوگوں میں اتنی مروت کہاں رہی ہے بھائی بھلمنساہت سے کام لے کر انھوں نے ہم سے کوئی رقم طلب نہ کی ورنہ انداز سے صاف ظاہر تھا کہ غنڈہ ٹیکس وصول کرنا ان کا ذریعہ "بد معاش" ہے۔

بقیہ سفر ہم نے پہلوان جی کے قدموں میں بیٹھ کر کیا۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمارے سوٹ کیس پر پہلوان جی کی صحت مند ٹانگوں کے بعد جو تھوڑی بہت جگہ بچ گئی تھی وہاں اپنی جانِ ناتواں کو بصد کر احتیاط سے رکھ دیا۔ اونٹ کے سفر میں ایک دقت یہ ہے کہ اونٹ پہ اتنی جگہ نہیں ہوتی کہ آدمی اس پر اپنی جان اور سوٹ کیس کے ہمراہ ایک پہلوان جی کی ٹانگیں اور اس کے نخروں کو بھی رکھ سکے۔ تاہم اگر سفر میں سامان "پہلوان" ہمراہ نہ ہوں تو اونٹ سے بہتر کوئی سواری نہیں۔ نہ ٹکٹ کا تردد، نہ قلیوں کی بک بک جھک جھک، نہ سگنل کا جھگڑا، نہ انجن کا اخلاص، دل کی فکر۔ بس منہ اٹھائے چل دیے اونٹ کی طرح۔ ○●

ڈاکٹر رشید موسوی کے انشائیوں کا مجموعہ

کاغذی ہے پیرہن

بتوسط شگوفہ قیمت ۲۰ روپے

غزل — اقبال ہاشمی (حیدرآباد)

مرغ و ماہی کا جہاں دل میں خیال آتا ہے
آپ ہی آپ مرے منہ میں خلال آتا ہے

آپ کے پیچھے پولس پھرتی ہے کتنے بے فکر
آپ ملتے ہیں تو ہم سب پہ وبال آتا ہے

ڈسکو مرشد کی ہر اک بات نرالی دیکھی
ان کو ہر چھوٹی بڑی بات پہ حال آتا ہے

چٹکلیں کر لیجئے جی بھر کے جوانی ہے ابھی
ضعف آتا ہے تو رہ رہ کے ملال آتا ہے

کچھ نہ کچھ بات ہے اس بات کے پیچھے ورنہ
آپ کے چہرے پہ کب رنگ گلال آتا ہے

ایک پل پاس سے آنکھیں میں لڑا لیتا ہوں
دوسرے پل وہی روٹی کا سوال آتا ہے

ہاشمی جب بھی وہ آتا ہے مرے گھر مہماں
آخر ماہ میں مع اہل و عیال آتا ہے

غزل — رؤف رحیم (حیدرآباد)

جائز ہے اپنے واسطے سب کا لیا دیا
سرکار نے مزاج ہی ایسا بنا لیا

ہم ڈگمگا رہے تھے غزل کس طرح لکھیں؟
مرحوم کی کتاب نے پھر آسرا دیا

شہرت کے آسمان سے گرنے سے بچ گئے
استاد نے ہمارا جو مصرعہ اٹھا دیا

کل خیریت جو پوچھ رہا تھا خلوص سے
اس شخص ہی نے آکے مرا گھر جلا دیا

چندے کا دھندہ زوروں پہ چلتا ہے ان دنوں
میں نے بھی اپنے بیٹے کو لیڈر بنا دیا

روتے ہوئے کسی کو بھی دیکھے گا کس طرح
موقع ملا رحیم کو، اس نے ہنسا دیا

غزل — سید عباس متقی (حیدرآباد)

بنجارہ ہلز پہ اک کوٹھی مجھے دلا دے
کب تک رہوں میں "ٹیچر"، لیڈر مجھے بنا دے

یارب یہ التجا ہے، مقروض ہوں میں جن کا
ان کا تبادلہ ہی اس شہر سے کرا دے

ریکھا نے راج ببر سے کر لیا ہے "میرج"
اب اور ہی کی جانب دل کو مرے لگا دے

عہدے سے کیا غرض ہے مطلب کمائی سے ہے
مجھ کو نہیں "منسٹر" تو "کونسلر" بنا دے

مسجد سے میکدہ تک چرچا ہے ایک تیرا
اے متقی تو اپنا چہرہ ذرا دکھا دے

دے اللہ — ساغر شولاپوری

روٹی کپڑا مکان دے اللہ
مجھ کو گینڈے کی جان دے اللہ

میں ہوں گرڈکا کمھارا اَن اِمپلائیڈ
مجھ کو زینت امان دے اللہ

لائن لگ جائے گی میرے آگے
راشننگ کی دکان دے اللہ

اک بہو مانگتی تھی رو کے دعا
ساس کو بہرے کان دے اللہ

"شیخ" بڈھے نے یہ دعا مانگی
مجھ کو بیگم جوان دے اللہ

انوار انصاری
(رانچی)

سنبھل کر چلیے شہر کے بازاروں میں

شہروں کی رنگا رنگی تو صرف انسانوں کی وجہ ہی سے قائم و دائم ہے انسانوں کی کثیر آبادی جو کہ شہروں کی زینت میں [illegible] دن اضافہ کر رہی ہے اس لیے شہروں میں زندگی کی بھاگ دوڑ کا کیا کہنا۔ یہاں تو پل پل اور گھڑی گھڑی میں زندگی کبھی سمٹتی ہوئی ملے گی اور کبھی کراہتی ہوئی۔ کبھی کوئی ننھی کلی پھول بننے کی حسرت میں دم توڑتی ہوئی تماشائی نظر آئے گی تو کبھی کوئی بھکارن زندگی کی خاطر ہاتھ پھیلاتی ہوئی دکھائی دے گی۔ کہیں خوشی کے نغمے سنائی دیں گے تو کہیں غم میں گھٹتی ہوئی آواز بھی محسوس ہوگی۔ شہروں میں تو صبح سے شام تک بھاگ دوڑ ہی کی زندگی انسان کے مقدر میں ہے اس لیے میرا مشورہ ہے کہ شہروں میں سنبھل کر چلیے شہر کے بازاروں میں تو پھونک پھونک کر قدم رکھیے۔

میری شادی کو کئی برس ہو چکے تھے۔ بیگم گاؤں میں رہتی تھیں۔ شہر میں جب پاپڑ بیلنے کے بعد بڑی مشکلوں سے دو کمرے کا مکان ملا تو بیگم اور بچوں کو شہر لے آیا۔ دل میں خواہش ہوئی کہ ایک بار بچوں اور بیگم کے ہمراہ شہر کے بازار کی سیر کرنے چلوں۔ پروگرام بنا کہ ہلکی پھلکی تفریح کے بعد سنیما دیکھ کر کسی ہوٹل میں کھانا کھا کر گھر واپس آجائیں گے۔ لہٰذا سبھی بن ٹھن کر بازار کی سیر کو نکلے بازار کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر ایک ہی نظر میں بیگم کی خوشی دوبالا ہو گئی۔ بچے بھی خوشی سے پھولے نہ سمائے۔ ان لوگوں کی خوشی کا احترام کرتے ہوئے میں نے ان کی پسند کی ہوئی بہت سی ایسی چیزیں بھی خریدیں جن [illegible] فی الحال قطعی ضرورت نہ تھی۔ پھر [illegible] کا پروگرام بنا۔ پکچر نئی نئی لگی تھی اور کافی رش تھا۔ کاؤنٹر سے ٹکٹ لینا ناممکن تھا لہٰذا بلیک سے ٹکٹ لیا۔ فلم دیکھنے کے دوران بھی ہلکا پھلکا ناشتہ چلا۔ فلم دیکھ کر ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھانے گئے۔ ہوٹل میں پہنچتے ہی بیگم اور بچوں نے اس طرح آرڈر دینا شروع کیا جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہوں اور ہوٹل کی ساری [illegible] چیزیں ان کی ملکیت ہوں۔ کھانے کا بل بھی ضرورت سے زیادہ ہوا۔ گھوم پھر کر جب گھر واپس آیا [illegible] کا حساب کرنے لگا تب پتہ چلا کہ آدھے مہینے کی تنخواہ صرف ایک دن کی سیر و تفریح کی نذر ہو چکی ہے۔ لہٰذا دل میں عہد کر لیا کہ آئندہ چھ ماہ تک بازار کی طرف سیر کی غرض سے جاؤں گا ہی نہیں اور اگر غلطی سے سیر کا سودا سمایا تو سنبھل کر

قدم رکھوں گا۔

کیجیے شہر کے بازاروں کی ایک جھلک تو دیکھیں۔ یہاں سڑکوں پر تیز رفتار گاڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ رکشہ، ٹیمپو، اسکوٹر، کار، جیپ، بس، منی بس سب ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی دوڑ میں مشغول ہیں۔ فٹ پاتھ پر پیدل چلنے والوں کا ایک لمبا قافلہ ہے جو اپنی اپنی دھن میں محو خرام ہے۔ سائیکل سوار بھی کسی سے پیچھے نہ رہنے کی قسم کھائے بیٹھے ہیں۔ جگہ جگہ ٹریفک پولیس بھی
موجود ہے کہیں ہارن بجنے کی آواز آ رہی ہے تو کہیں ضرب بجنے کی صدا گونج رہی ہے۔ کہیں لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہو رہا ہے تو کہیں ٹیپ ریکارڈ پر
بجنے کی آواز آ رہی ہے تو کہیں ضرب بجنے کی صدا گونج رہی ہے۔ کہیں لاؤڈ اسپیکر سے اعلان ہو رہا ہے تو کہیں ٹیپ ریکارڈ پر گانا بج رہا ہے۔ شہر کے بازاروں کی رنگینی اور دلکشی کا کیا کہنا۔ یہاں اشتہار کے نئے نئے طریقے اپنائے گئے ہیں اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی تصویریں بھی خالی جگہوں پر چسپاں کی گئی ہیں اور "عورت" کی نمائش بھی ہو رہی ہے کہیں جلوس نکالا جا رہا ہے۔ کہیں نعرہ بازی ہو رہی ہے، کہیں فساد کی تیاری ہو رہی ہے۔ کہیں پرچم لہرائے جا رہے ہیں۔ کہیں رام نومی کے جلوس نکالنے پر جھگڑا ہو رہا ہے کہیں [illegible] پر پابندی لگائی جا رہی ہے [illegible] کی جا رہی ہے۔ ایسی حالت میں شہر کے بازاروں میں انسان اگر سنبھل کر نہ چلے تو قدم قدم پر اس کو ٹھوکر لگ سکتی ہے۔

ٹھوکر کی جب بات آ گئی تو میرے دوست کا ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ میرا دوست شہر کے بازار میں خاص موقع پر خاص موقع پر خاص قسم کی خریداری کرنے گیا۔ ان کی پانچویں لڑکی کی شادی جب طے ہو گئی اور حضرت داماد کی خریداری کا مسئلہ جب سامنے آیا تو اپنے ہونے والے داماد کے رشتہ داروں کے ہمراہ شہر کے بازار گیا اور داماد کے رشتہ داروں کے ہاتھ بری طرح لٹ گیا۔ کیوں کہ ان لوگوں نے سب سے مہنگے داموں والے کپڑے پسند کیے۔ پیسہ دینے کے بعد میرے دوست پر بازار ہی میں نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اگرچہ میں ایک چھوٹے قصبے کا باسی ہوں لیکن کئی بار بڑے شہر کے [illegible] میں بھی سیر سپاٹے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک بار کا واقعہ یوں ہے کہ یہ خاکسار مہانگر کی ایک چہل پہل شاہراہ سے گزر رہا تھا۔ اس وقت شاپنگ کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ شاپنگ کے لیے ایک دوکان پر گیا۔ وہاں ایک خوب صورت بچی پر نگاہ پڑی۔ اس کے معصوم اور دلکش چہرے بال کی خوب صورت بناوٹ سے میں بے حد متاثر ہوا۔ میں نے بچی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا بیٹی بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟ یہ سوال سن کر معصوم نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور خاموشی سے زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ جب میں نے بار بار اس سے نام پوچھنے کی کوشش کی تو اس کے پاس ہی کھڑی ہوئی ایک اسمارٹ شخصیت نے بتایا کہ جناب یہ بچی نہیں بلکہ میرا بیٹا ہے۔ یہ سن کر میں بے حد شرمندہ ہوا۔ کیوں کہ لمبے لمبے بال، رنگین کپڑے، نازک قد و قامت نے مجھے فریب دیا تھا۔ میں اپنی شرمندگی مٹانے کے لیے بولا۔ خوشی کی بات ہے کہ آپ اس خوب صورت بیٹے کے باپ ہیں۔ اتنا سنتے ہی وہ اسمارٹ شخصیت ناک بھوں سکیڑتے ہوئے اور تیوری پر بل ڈال کر غصے سے منہ چلائے مجھ سے یوں مخاطب ہوئی "اے مسٹر ذرا زبان سنبھال کر بات کریں۔ جان نہ پہچان خالہ کو سلام۔ میں اس بچے کا باپ نہیں بلکہ ماں ہوں۔" اتنا سنتے ہی میں حیرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگا اور شہر کی رنگ برنگی جھلک دیکھ کر دل ہی دل میں شرمندہ ہوا اور شاپنگ کو خیرباد کہہ کر آگے بڑھ جانے میں اپنی خیریت سمجھی ورنہ مجھے بھی خوف ہونے لگا کہ شہر میں

کہیں میری جنس بھی تبدیل نہ ہو جائے۔

شہر کے بازاروں میں نت نئے کرشمے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک طرف ہاتھ کی صفائی، طوطے کا کمال، جیب کتروں کی جادوگری کا کارنامہ دیکھنے کو ملے گا تو دوسری طرف جو بہت کے دھندے، چیزوں پر ملمع کاری اور پیسوں کی بربادی کا منظر بھی دکھائی دے گا۔ ایک طرف شراب کی دکان ہوگی تو دوسری طرف کولڈ ڈرنک ملے گا۔ اگر انسان شہر میں پھونک پھونک کر قدم نہ بڑھائے اور سنبھل کر نہ چلے تو سمجھیے انسان کی آبرو ہر وقت خطرے میں ہے۔ شہر میں لٹنے کا بڑا خوف رہتا ہے۔ کیوں کہ یہاں دھوکہ اور فریب پر ہی کچھ کاروبار چلتا ہے۔

بڑے بڑے شہروں میں مہانگر کے بازاروں میں عیش و عشرت کے تمام لوازمات پیسے کے بل بوتے پر منٹوں میں حاصل کیے جاتے ہیں۔ شہر میں لوٹ کھسوٹ، خوشامد، مار دھاڑ کا بازار ہر وقت گرم رہتا ہے۔ شہر میں تو انسان ہوا، پانی، سورج کی روشنی کے لیے بھی ترستا ہے۔

آج کل زندگی کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے۔ خاص کر یہ تیزی شہر کے پُر رونق بازاروں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ میں اپنے ہی قصبے کے بازار میں اپنے بیمار بچے کے لیے دوا خریدنے جا رہا تھا۔ ابھی خاص شاہ راہ پر پہونچا ہی تھا کہ یکایک بھگدڑ شروع ہوگئی۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لیے بے تحاشا بھاگنے لگے۔ دوکانیں دھڑا دھڑ بند ہونے لگیں۔ معمولی بات پر فساد ہوگیا تھا۔ چشم زدن میں بازار ویران ہوگیا۔ رونق ختم ہوگئی۔ سڑک بیوہ کی مانند اداس ہوگئی۔ میں دوا بھی خرید نہ سکا اور میرا بچہ فساد کی نذر ہوگیا۔ سچ ہے :

وقت کا انتظار کون کرے
آج کل شہر میں کیا نہیں ہوتا

شہر والے اس پر بڑا ناز کرتے ہیں کہ شہر میں رونق اور چہل پہل کی وجہ سے زندگی خوشگوار ہوگئی ہے مگر سچ ہے شہر میں ہنسنا، بولنا، لڑنا، جھگڑنا، بگڑنا، سنورنا، مرنا جینا بھی ایک تماشا کی صورت اختیار کر گیا ہے۔ اب تو شرافت، ذلت، عفت، عصمت، بہادری، بزدلی شہر کے بازاروں میں خریدی اور بیچی جاسکتی ہے۔ شہروں میں انسان کی زندگی مصنوعی لگتی ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ سنبھل کر چلیے شہر کے بازاروں میں ورنہ ڈر ہے کہ کہیں زندگی بکھر نہ جائے۔ ☐

غزل

مدن لال روشن بنارسی

اک مصیبت ہے آپ کی کرسی
اک قیامت ہے آپ کی ٹوپی

کل غلامی سے اک بغاوت تھی
اب سیاست ہے آپ کی ٹوپی

سر کی زینت اسے سمجھتے تھے
سر پہ لعنت ہے آپ کی ٹوپی

جھوٹ دھوکا فریب کی روشنی
اک علامت ہے آپ کی ٹوپی

○

پبلک کو حکومت سے گلا ہے بے کار
جمہور کا یہ دور ہے اے میرے یار
سرکار بچاری تو پریشان ہے خود
جنتا کی حکومت ہے کرے کیا سرکار؟

○

ملّا نہ ہوئے قوم کے معمار ہوئے
لیڈر نہ ہوئے ملک کے سردار ہوئے
تاجر نہ ہوئے جگ کے خریدار ہوئے
شاعر نہ ہوئے سب کے گنہگار ہوئے

مونڈن

شاہین سہسرامی

کہیں ہے جان کا مونڈن کہیں سامان کا مونڈن
جدھر دیکھو اُدھر اب ہو رہا انسان کا مونڈن

ادھر ہے روس کے ہاتھوں تباہی اہلِ کابل کی
اُدھر صیہونیوں نے کر دیا لبنان کا مونڈن

حجامت بن رہی ہے اک طرف بغداد و بصرہ کی
مسلسل ہو رہا ہے اک طرف ایران کا مونڈن

نہ ہم کو چین کا ڈر ہے نہ اسرائیل کی پروا
ادھر آیا تو ہو جائے گا ہر شیطان کا مونڈن

مجھے آزاد غزلیں دیکھ کر لگتا ہے یوں جیسے
کسی نے کر دیا ہے میرؔ کے دیوان کا مونڈن

بڑے بھیاّ کی شادی ہو کہ چھوٹے بھائی کی ختنہ
ہر اک موقع پہ ہو جاتا ہے ماموں جان کا مونڈن

رہے گا کب تلک شاہیںؔ گرانی کا یہی عالم
کہاں تک ہوگا یوں ہی دل کے ہر ارمان کا مونڈن

غزل

م۔ آصف آروی

کلیر کلیر بات ہے میری اس بچے کا فیوچر گول
ہر سبجکٹ میں جس کے آئے انڈے جیسا نمبر گول

فلم چلی تھی ٹی وی پر تو لائین نے ڈسٹرب کیا
سب کا فیس تھا اُلّو جیسا انٹرول سے پکچر گول

اگلی سیٹ پہ کوئی عورت بیٹھی ہوئی تھی بیوٹی فل
بس کے اندر جس نے دیکھا بہتوں کا کیریکٹر گول

پکچر کا پرمیشن لینے لڑکا پہنچا فادر سے
امّی بولیں بیٹا تم سے ہوئے ہیں پہلے فادر گول

کچا آنگن پانی برسا ہو گئی تازی پھسل گئی
میں نے ہنس کے کہا کہ بیگم تم نے کیا ہے کلیر گول

اتنا فیشن وائف پہ آصفؔ جاگ پڑا ہے ففٹی میں
خوف لگے ہے پیری میں ہو کہیں نہ میرا بستر گول

حیدر بیابانی (یوت محل)

آہ چائے! واہ چائے!!

چائے کی کسے چاہ نہیں ہوتی۔ امیر ہو یا غریب، راجہ ہو یا رنگ سبھی اس کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ رنگ برنگے لوگوں کی چائے بھی رنگا رنگ ہوتی ہے۔ جا بجا لوگ کالی چائے، سفید چائے، مٹ میلی چائے یا لال چائے پیتے گلابی چائے پیتے یا شربت پیتے نظر آتے ہیں۔

چائے پینے والوں کے نخرے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ کوئی بغیر شکر کی چائے پیتا ہے تو کوئی میٹھی، کوئی کم شکر کی چاہتا ہے تو کوئی زیادہ شکر کی، کسی کو کڑک چائے پسند ہے تو کسی کو "درمیانہ"، کچھ لوگ بغیر دودھ کی چائے کے عادی ہوتے ہیں تو کچھ لوگ دودھیا چائے کے۔ غرض جتنے قسم کے لوگ اتنے اقسام کی چائے۔ کسی کے گھر اگر مختلف قسم کے دس بارہ چائے نوش جمع ہو جائیں اور ان سب کو چائے پلانے کا مرحلہ درپیش ہو تو الگ الگ قسم کی چائے پلواتے، پلواتے میزبان کا حال پتلا ہو جائے۔

چائے کی ابتدائی شکل کیا تھی یہ ہم نے نہیں دیکھا لیکن اکثر و بیشتر ریلوے اسٹیشنوں کی بے مزہ چائے پی پی کر اندازہ ہوا کہ شاید ایسی ہی روکھی پھیکی ہوتی ہوگی۔ آج کل چائے نے بڑی ترقی کر لی ہے اور کیا سے کیا ہو گئی ہے۔ دودھ ملائی اور شکر ڈال کر خوب ابالی ہوئی چائے حلوے کی ہی کوئی قسم لگتی ہے اب تو اس مشروب کو گھی سے بگھارنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ چائے کے اس طرح مائل بہ ترقی ہونے سے یقین ہو جاتا ہے کہ وہ دن بھی قریب ہی ہے جب چائے میں مختلف میوہ جات کی آمیزش کر کے اسے اصلی گھی سے بگھارا جانے لگے گا۔

ہمارے ایک دوست چائے کو شجر ممنوعہ گردانتے ہیں اور اسے کبھی منہ نہیں لگاتے کیوں کہ انھیں اس بات کا پتہ ہے کہ "چھُٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی" لیکن یہ بات ہم آج تک نہیں سمجھ پائے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ چائے نہ تو مضر صحت ہے اور نہ اتنی بُری کہ اس سے دُور بھاگا جائے اگر ایسا کچھ ہوتا تو اس کے دیدہ زیب پیکٹوں پر یہ وارننگ ضرور سرخ الفاظ میں لکھی ہوتی کہ "چائے پینا صحت کے لیے مضر ہے۔" جیسا کہ دوسری مضر صحت اشیاء کے پیکٹوں پر لکھا ہوتا ہے۔ چائے کے خوب صورت پیکٹوں پر تو "آہ چائے، واہ چائے" جیسے شوق کو ہوا دینے والے الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ اسے تو سنہری پتہ (گولڈن لیف) اور پیارا (لپٹن) جیسے لفظوں سے نوازا گیا ہے۔

چائے کی کہانی آسام اور دارجلنگ کے باگانوں سے شروع ہو کر گھر گرہستی اور سنائی (بنائی اور بنوائی) جاتی ہے۔ چائے کی نزاکت اور عورت کی نازکی کا رشتہ بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ایک کلی اور پتوں کا گچھا یکی ہوئی چائے کی جھاڑیوں سے بکمال نزاکت کے ساتھ اپنی نازک نازک انگلیوں سے توڑنے کا نازک کام ایک عورت ہی نفاست سے انجام دے سکتی ہے اگر یہی کام مرد کریں تو آبگینوں کو ٹھیس لگ جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔

چائے روزی رساں بھی ہے۔ . . . . . وہ ایک زمانے کو کام سے لگائے ہوئے ہے چائے باغات کے مالک اسی کے بل بوتے امیر سے امیر ترین بنتے جاتے ہیں، مزدور عورتیں چائے کا پتّہ پتّہ بوٹا بوٹا توڑ کر اپنے خاندان کے لیے روٹی کا ٹکڑا ٹکڑا جٹا پاتی ہیں مختلف کمپنیاں چائے کو سجا سنوار کر دلہن بنا کر مارکیٹ میں لاتی ہیں اور پیسہ بناتی ہیں، چائے خانوں کے سیٹھ چائے پلوا کر نوکر بچے چائے سر دکر کے روزی روٹی کماتے ہیں اور مختلف فیکٹریاں چائے کی خوب صورت پیالیاں اور قسم قسم کے ٹی سیٹ بنا کر اپنا کاروبار بڑھاتی ہیں۔

چائے کے طلبگاروں کی دنیا ہی نرالی ہوتی ہے، ویسے ہر خاص و عام چائے کا طلب گار ہوتا ہے لیکن عادی چائے نوشوں کی بات ہی الگ ہے۔ کچھ لوگ مخصوص ہوٹل کی مخصوص چائے پینے کے عادی ہوتے ہیں جب تک انھیں اپنے برانڈ کی چائے نہ ملے چین نہیں آتا۔ دن بے کیف ہو جاتے ہیں اور جماہیاں لیتے راتیں گزرتی ہیں۔ ایک ایسے ہی مخصوص ہوٹل کے عادی چائے نوش عالم نزع میں تھے تو ان کے متعلقین کو شک ہوا کہ شاید بڑے میاں کی جان سید صاحب کی ہوٹل کی چائے میں اٹکی ہوئی ہے اس لیے فوراً اسی ہوٹل کی ایک کپ چائے منگوا کر بند بعیر چمچہ بوند بوند حلق سے اتاری گئی اور واقعی معجزہ ہو گیا یعنی ادھر چائے حلق سے اتری ادھر فرشتۂ اجل نے نقارہ بجا دیا۔ بعد میں یہ بھی سنا گیا کہ مرحوم کے چہلم کی فاتحہ پر بھی اسی ہوٹل کی چائے رکھی گئی تھی۔

چائے کے مختلف اشتہارات میں یا چائے خانوں کے در و دیوار پر چائے کی شان میں بڑے دل چسپ اور پرکشش نعرے اور اشعار وغیرہ لکھے ہوتے ہیں لیکن ہمیں سب سے زیادہ اس شعر نے امپریس کیا جو ہمارے شہر کی ایک ہوٹل میں جلی حرفوں میں لکھا ہوا تھا :

"مریضانِ محبت کو ہماری چائے کافی ہے
صدا پیالی سے آتی ہے ہو اللہ شافی ہے"

اگر کوئی چائے کمپنی مالک اس شعر کو ملاحظہ فرمائے تو یقیناً وہ زرِ کثیر دے کر اس کے جملہ حقوق بحق کمپنی محفوظ کروا لے چائے کا تصور ہی گرماہٹ کا حامل ہوتا ہے گرما گرم چائے کا ایک پیالہ چستی اور پھرتی کا ذریعہ بن جاتا ہے لیکن جب ایک انگریز چائے بیوپاری کو گرما گرم موسم میں گرما گرم چائے بیچنا دقت طلب مسئلہ لگا تو بطور تجربہ برف ملی ہوئی ٹھنڈی چائے شوقینوں کے سامنے پیش کی تو یہ تجربہ بہت کامیاب رہا۔ آج کئی امریکی برفیلی چائے پینے کے عادی ہیں۔ چائے ویسے تو ہمارا بھی پسندیدہ مشروب ہے لیکن ایک قسم کی چائے کا نام سن کر ہی ابکائیاں آنی شروع ہو جاتی ہیں اسے Bed tea (بستر کی چائے) کہتے ہیں لیکن ہم اسے Bad tea (گندی چائے) گردانتے ہیں۔ بغیر دانت صاف کیے، بغیر کلی کیے صبح صبح بستر میں لیٹے لیٹے رات بھر سے بند منہ بساند منہ سے چائے سڑپنا گندگی کی حد نہیں تو اور کیا ہے اور ایسے کسی منظر

کا تصور ابکائیوں کا پیش خیمہ نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔

آپ کسی کے گھر جائیں اور وہ چائے پانی تک کے لیے نہ پوچھے تو لوگوں کے خیال میں اس سے بڑا بے مروت اور کوئی نہ ہوگا۔ مہمان کو چائے ناشتہ پیش کرنا اعلیٰ اخلاق کی نشانی ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ کہنا کہ معاف کرنا آپ کی خدمت میں چائے کے سوا اور کچھ نہ پیش کر سکا" سب سے بڑی مہمان نوازی ہے۔

چائے میں بڑی چاہت اور طاقت ہے اس کی ایک پیالی دشمن کو بھی دوست بنا لیتی ہے۔ بگڑے کام بن جاتے ہیں شادی بیاہ کے سلسلے جڑ جاتے ہیں اور برسوں کے الجھے ہوئے مسئلے سلجھ جاتے ہیں۔ ایک کپ چائے کی شیرینی آفس کے بڑے بابو کے منہ کا مزہ بدل دیتی ہے اور نیچے دبی ہوئی فائل چھلانگیں مارنا شروع کر دیتی ہے اس کے باوجود بڑے بابو ہر کسی سے کہتے پھرتے ہیں" کیا سمجھتے ہیں وہ لوگ! کیا مجھے ایک کپ چائے میں خرید لیں گے۔"

کچھ بزرگ جو بذات خود چائے کے معاملے میں بلا نوش واقع ہوئے ہیں لیکن اکثر یہ کہتے ہیں کہ "انگریز تو چلے گئے مفت چائے بانٹ بانٹ کر لیکن ہم ہندوستانی آج تک انگریزوں کی نہ سہی ان کی چائے کی غلامی ضرور کرتے چلے آرہے ہیں . . . ." بزرگ لوگ ویسے بھی ساٹھ کے بعد سٹھیائی ہوئی باتیں کرتے ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق اگر کچھ لوگ چائے کے غلام ہوں تو ہوں لیکن ہم بالکل نہیں، جی چاہا تو پی لیا نہیں تو کہہ دیا" معاف کرنا بھائی ابھی بابو بھائی کے یہاں سے چائے لے کر آرہے ہیں۔" اس طرح چائے کے ہم غلام نہ ہو کر چائے ہماری غلام ہو گئی۔

ویسے چائے کا چلن اتنا عام ہے کہ ہر خاص و عام جوان بوڑھا، عورت مرد، بچہ بڑا، سب اس کے رسیا ہیں۔ گویا چائے نے امیر غریب، چھوٹا بڑا اور اونچ نیچ کے سارے فرق مٹا دیئے ہیں۔ جگہ جگہ چائے خانے آباد ہیں اور ایسا لگتا ہے اگر ساری دنیا برباد ہو جائے تو چائے خانے ضرور آباد رہیں گے۔

نیاز جیراجپوری

رشتہ مطلوب ہے

موٹے حرفوں میں چھپا اعلان یہ بھی خوب ہے
ایک شاعر کے لیے رشتہ کوئی مطلوب ہے

سنیے کہ پڑھ کر سناتا ہوں میں اس کو آپ کو
ساٹھ سالہ اک کنوارے شخص کے آلاپ کو

شاعری پیشہ ہے اس کا، چائے نوشی شوق ہے
عشق اِک سٹھ کر چکا ہے آدمی با ذوق ہے

ملکیت اس کی یہی ہے صاحبِ دیوان ہے
شاعری تو اس کی اپنی ہے مگر بے جان ہے

ایک لڑکی نے محبت میں دیا دھوکا اسے
آج تک اس حادثہ نے شادی سے روکا اسے

لڑکیوں سے پٹتے رہنے کا تجربہ ہے اسے
گالیاں بھی سنتے رہنے کا تجربہ ہے اسے

یادِ جاناں میں جوانی اس کی ساری بہہ گئی
بس اذیت ناک بن کر زندگانی رہ گئی

دوستوں کے مشوروں پر ہے عمل کرنا اسے
الغرض کہ موت سے کچھ پہلے ہے مرنا اسے

نام زندہ رکھنے کو اولاد ہونی چاہیے
بعد مرنے کے کوئی روداد ہونی چاہیے

صاحبِ اولاد بننے کی تمنا ہے اسے
دوستوں کے مشوروں نے گھیر رکھا ہے اسے

قید کوئی شکل و صورت کی نہیں اعلان میں
نام کا اک پھول ہونا چاہیے گلدان میں

ایک لڑکی چاہیے جس کو یہ بیوی کہہ سکے
بچہ یا بچوں کی اپنے جس کو امی کہہ سکے

وہ پٹائی بھی کرے اس کی، اسے منظور ہے
گھر سے اپنے دور رہنا بھی اسے منظور ہے

ہاں! مگر یہ شرط ہے وہ شاعری اس کی سنے
داد دے، کہہ کہہ کر مکرر مسکرائے سر دھنے

گود میں لپٹا ہوا دیوان اس کا پڑھ سکے
اور پھر تعریف میں دو چار جملے گڑھ سکے

خامہ بگوش (کراچی)

ایک کتاب کا صدمہ محو نہیں ہوتا کہ ان کی دوسری کتاب چھپ جاتی ہے

حمزہ فاروقی خاصے پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ وہ کہاں تک پڑھے ہیں اس کا علم انھیں کو ہوگا۔ لیکن جہاں تک ان کے لکھنے کا تعلق ہے ہم اس کے عینی شاہد ہیں۔ اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اتنی ہی زیر طبع ہیں۔ ان کی کتابیں لکھنے کا طریقہ دنیا سے نرالا ہے۔ کبھی تو وہ مہینوں کے لیے گھر سے غائب ہو جاتے ہیں اور جب واپس آتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں کسی نئی کتاب کا مسودہ ہوتا ہے۔ کبھی مہینوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیتے ہیں بلکہ یوں کہیے کہ دنیا ترک کر دیتے ہیں اور جب گھر سے باہر نکلتے ہیں۔ تب بھی کوئی نئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں وہ ملکوں ملکوں گھومتے ہیں، نئی منزلوں اور نئی وادیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں، پھر اپنے اس مشاہدے کو صفحۂ قرطاس پر سفرنامے کی صورت میں منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے تین سفرنامے شائع ہو چکے ہیں جو ان کی آوارہ گردی کا دستاویزی ثبوت ہیں۔ یہ سفرنامے مقبول ہی نہیں ہوئے، مصنف کی رسوائی کا سبب بھی بنے ہیں، کیوں کہ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحقیقی کتاب "اردو سفرنامے" میں ان سفرناموں کی خاصی تعریف کی ہے۔ مصنف کے اور ہمارے بعد، ڈاکٹر انور سدید تیسرے آدمی ہیں جنھوں نے ان سفرناموں کو اردو ادب میں اضافہ قرار دیا ہے۔ جب تک کوئی چوتھا آدمی ہم تینوں کی رائے میں اختلاف نہیں کرتا، اس وقت تک کے لیے انشاءاللہ یہ سفرنامے اردو ادب میں اضافہ شمار ہوتے رہیں گے، خواہ ان کے بوجھ سے اردو ادب کی کمر ٹوٹ جائے۔ واضح رہے کہ ہم تینوں کی رائے سے اختلاف کرنا آسان نہیں ہے۔ اس کے لیے حمزہ صاحب کے سفرنامے پڑھنے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہفت خواں طے کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

حمزہ فاروقی اپنے طلب توڑ کر اور دنیا سے منہ موڑ کر گوشۂ تنہائی میں جو کام کرتے ہیں، وہ تحقیقی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس قسم کا ان کا پہلا کام "سفرنامۂ اقبال" کی صورت میں منظر عام پر آ چکا ہے۔ اس میں اس سفر کی روداد ہے جو علامہ اقبال نے دوسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں ۱۹۳۱ء میں کیا تھا۔ اس سفر سے متعلق معلومات اس زمانے کے اخبارات میں بکھری ہوئی تھیں۔ حمزہ صاحب نے ان منتشر معلومات سے ایک مربوط اور مکمل سفرنامہ مرتب کر دیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے حمزہ صاحب شروع سے آخر تک علامہ کے رفیق سفر رہے ہوں۔ حالانکہ یہ واقعہ حمزہ صاحب کی پیدائش سے پہلے کا ہے، لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر علامہ اقبال اپنی شاعری میں اپنے سے صدیوں پہلے کے مشاہیر سے ہم کلام ہو سکتے ہیں تو حمزہ فاروقی اپنی پیدائش سے چودہ، پندرہ سال پہلے علامہ

اقبال کے ساتھ گول میز کانفرنس کے لیے سفر کیوں نہیں کر سکتے۔

"سفرنامۂ اقبال" کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہاں تک کہ بعض اہلِ قلم نے اس کتاب کے بہت سے حصے اپنی کتابوں میں شامل کر لیے لیکن یہ سرقہ انھیں راس نہ آیا۔ اس کی تفصیل "سفرنامۂ اقبال" کے دوسرے ایڈیشن سے معلوم ہوتی ہے جو پہلے ایڈیشن بہت سے اضافوں کے ساتھ حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس کے دیباچے میں حمزہ صاحب لکھتے ہیں . . . . "بہت سے اہلِ علم نے حوصلہ افزائی کی اور اس کے حوالے اپنی کتابوں میں دئیے لیکن بعض مصنفین نے حوالہ دئیے بغیر میری کتاب کے مندرجات کو بلا تکلف اپنی تصانیف میں سمو دیا۔ اگر وہ ہمت کر کے اصل ماخذ تک رسائی حاصل کرتے تو عین ممکن تھا کہ وہ میری کتاب کے پہلے ایڈیشن کی خامیوں اور غلطیوں کی نشان دہی کرتے۔ کتاب کی اشاعتِ ثانی کے بعد میں توقع رکھتا ہوں کہ وہ حضرات بھی اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لیں گے جو سفرنامۂ اقبال اشاعتِ اول کی تقلید میں ان کی تصانیف میں راہ پا گئی ہیں"۔

جو مصنفین "سفرنامۂ اقبال" کے دوسرے ایڈیشن سے بلا حوالہ استفادہ کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کی آگاہی کے لیے عرض ہے کہ ممکن ہے، اس ایڈیشن میں بھی حمزہ صاحب نے دانستہ بہت سی غلطیاں باقی رہنے دی ہوں، تاکہ تیسرے ایڈیشن کے دیباچے میں وہ استفادہ کنندگان کو شرمندہ کر سکیں۔

حمزہ صاحب کی ایک اور ضخیم کتاب "حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے" ری سرچ سوسائٹی آف پاکستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور نے شائع کی ہے۔ کتاب کا نام ایسا سنسنی خیز ہے کہ فوراً اس طرف دھیان جاتا ہے کہ اس میں اقبال سے متعلق بہت سے سربستہ رازوں کو فاش کیا گیا ہوگا اور کچھ نہیں تو سابق نام نہاد دانشور اور موجودہ وفاقی وزیرِ تعلیم غلام مصطفیٰ شاہ کی تقلید میں اقبال کی "عیش کوشی" کے چشم دید واقعات جمع کیے گئے ہوں گے۔ افسوس کہ یہ ایک سنجیدہ علمی کام ہے اور اقبال کی سماجی، ادبی اور علمی سرگرمیوں کے بارے میں نادر معلومات کا ذخیرہ ہے۔

روزنامہ "انقلاب" لاہور میں اقبال کی زندگی میں جو ان کے بارے میں شائع ہوا تھا، اسے اس کتاب میں یک جا کر دیا گیا ہے۔ بہت سی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، جن سے اقبال کے سوانح نگار عام طور پر بے خبر ہیں۔ یہ ایک ایسا تحقیقی کام ہے جو بے مثال محنت کا نمونہ ہے۔ حمزہ صاحب نے "انقلاب" کے کئی ہزار شماروں کا بالاستیعاب مطالعہ کر کے اقبال کے بارے میں ایک ایک لفظ کو محفوظ کر دیا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے، وہ تحقیق کرتے ہیں لیکن حمزہ صاحب نے اس بات کو غلط ثابت کر دکھایا ہے۔ وہ تحقیق بھی کرتے ہیں اور بہت سے دوسرے کام بھی، جن میں مکتوب نگاری سرِ فہرست ہے۔ ہر ہفتے ان کا ایک خط ہمارے نام ضرور آتا ہے، جو ہمارے کالم کے بارے میں ہوتا ہے۔ جس ہفتے ہم کالم نہیں لکھتے، اس ہفتے وہ پرسشِ احوال لکھتے ہیں۔ کالموں سے متعلق خطوں میں وہ ہماری لفظی و معنوی اغلاط کی نشان دہی کے ساتھ مفید مشورے بھی دیتے ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان کے مشوروں پر عمل کرنے کی توفیق ہمیں کبھی نہیں ہوئی، کیوں کہ عمل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کالم نگاری ترک کر دیں گے۔

کبھی کبھی حمزہ صاحب کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہیں اور ان کی خواہش ہوتی ہے کہ ہم ان کا خط اپنے کالم میں شائع کر لیں اور ہم خود بھی اس موضوع پر اظہارِ خیال کریں۔ ایک ایسا ہی خط انھوں نے مولانا کوثر نیازی کے بارے میں لکھا ہے، جس میں ان کی نئی تصنیف "ذوالفقار علی بھٹو" کا ذکر ہے۔ حمزہ صاحب کی خواہش ہے کہ ہم بھی اس کتاب کو پڑھیں اور اپنے

تاثرات قلم بند کریں۔ فی الحال حمزہ صاحب کا خط شائع کیا جارہا ہے، جس کے مندرجات سے ہمارا تو کیا مولانا کوثر نیازی کا بھی متفق ہونا ضروری نہیں۔ ہم اپنے تاثرات اگلے ہفتے پیش کریں گے۔

....

جناب خامہ بگوش صاحب۔ سلام مسنون

مولانا کوثر نیازی کی تازہ تصنیف "ذوالفقار علی بھٹو" پڑھ کر جی بے حد خوش ہوا۔ اس خوشی کے اظہار کے لیے یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو اگر آپ میرے اس مراسلے کو اپنے کالم میں شائع کریں۔ آپ کے قارئین اگر کبھی کبھار کوئی بہتر تحریر پڑھ لیں، تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔

مولانا کوثر نیازی تصنیف و تالیف کے میدان میں، جس کامیابی سے جھنڈے گاڑ رہے ہیں۔ اس کی مثال ملنی محال ہے۔ ایک کتاب کا صدمہ حافظے سے محو نہیں ہوتا کہ ان کے قلم عجوبہ رقم سے دوسری تصنیف منصۂ شہود پر آجاتی ہے۔ مولانا سے بے پناہ عقیدت کے باوجود ہمیں ان قارئین سے دلی ہمدردی ہے، جو موصوف کی تصانیف کی زد میں ہیں۔

اپنی تازہ ترین تصنیف "ذوالفقار علی بھٹو" میں مولانا صاحب نے خلافِ معمول غور و فکر اور مصلحت اندیشی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے اسی موضوع پر "دیدہ ور" بھی لکھی تھی۔ جب "دیدہ ور" شرمندۂ اشاعت ہوئی تھی تو مولانا صاحب ایک جمہوری آمر کے سائے تلے کامیابی کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ پانچوں انگلیاں دولتِ دنیا کے گھی میں اور سر وزارت کی کڑاہی میں تھا۔ اس صورتِ حال کو قائم رکھنے کے لیے "دیدہ ور" جیسی کتاب کا لکھا جانا، بجائے خود دیدہ وری کا ثبوت تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ وہ بزم رہی نہ اہلِ بزم۔ مولانا صاحب پیپلز پارٹی میں شمعِ محفل کی حیثیت رکھتے تھے، لیکن اب یہی پارٹی ان کے لیے محفلِ اغیار بن گئی۔ اس صورتِ حال میں "دیدہ ور" کو واقعی نظرِ ثانی کی ضرورت تھی۔ اب یہ کتاب نئے عہد کے تقاضوں کے مطابق نئے روپ میں جلوہ گر ہوئی ہے۔

مولانا صاحب کی شخصیت رنگا رنگ خصوصیات کی حامل ہے، لیکن ہم ان کی دو خوبیوں کے بطورِ خاص معترف ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنا اسمِ مبارک بجلی کی روشنائی سے مسلسل دیکھتے رہنا پسند کرتے ہیں۔ عام سیاست دانوں کی طرح وہ صرف گفتار کے غازی نہیں، تحریر کے مردِ میدان بھی ہیں۔ اپنے افکار و خیالات کو سپردِ قرطاس کرنے میں وہ ملک کے تمام سیاست دانوں میں منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ مولانا صاحب کی دوسری خوبی جو ہمیں پسند ہے وہ یہ ہے کہ جب حالات سازگار تھے اور فلکِ ناہنجار ان کا مخالف نہ تھا اور ٹیلی ویژن کا درِ دل کشا ان پر وا تھا، تو وہ ٹی وی کے اسکرین پر ایک صاحبِ کمال کی طرح جلوہ گر ہوتے تھے۔ لوگ انھیں دیکھنے اور سننے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ لیکن ہم چوں کہ کمزور دل کے آدمی ہیں، اس لیے ہم ٹی وی بند کر دیتے تھے۔ اندیشہ رہتا تھا کہ موصوف جوشِ خطابت میں اسکرین توڑ کر باہر نہ آ جائیں۔

مولانا نے کچھ عرصہ قبل شخصی خاکوں کا ایک مجموعہ "جنھیں میں نے دیکھا" شائع کیا تھا۔ اس میں انھوں نے ان تمام دعوتوں کا ذکر کیا تھا جو ان کے ممدوحین نے ان کے اعزاز میں انھیں دی تھیں۔ کہیں بگھارے بینگنوں کا ذکر تھا اور کہیں بہاری کبابوں، قورمے اور بریانی کے مسالوں کا تذکرہ تھا۔ نہاری کے چٹخاروں کا ذکر پڑھ کر تو ہمیں بھی اپنے اوپر قابو نہ رہا۔ یہ الگ بات ہے کہ مولانا کی تقلید کے نتیجے میں معدہ کئی روز تک آہ و فغاں کرتا رہا اور ہم ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنے رہے۔ اس تصنیفِ لطیف

کے مطالعے سے یہی خیال آیا کہ کاش ہم میں بھی اتنی استطاعت ہوتی کہ مولانا چند پُرتکلف دعوتیں کرتے اور اس طرح کتاب کے کسی حاشیے میں ہمارا ذکر بھی آجاتا۔

خاکوں کے اس مجموعے کو پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صاحب کی طبیعت میں بے صد انکسار ہے، وزارت کے منصب عالیہ تک پہنچنے اور پولیس ماسٹروں جیسی وردی پہننے کے باوجود بہت عاجزی کے ساتھ اہلِ علم سے ملتے تھے، حالاں کہ آپ جس منصب پر فائز تھے اس کے حوالے سے اچھے اچھوں کو عاجز کر سکتے تھے۔ سچ پوچھیے تو ہمیں مولانا کی وزارت سے زیادہ وزارت والی وردی اچھی لگتی تھی۔ یقیناً یہ وردی ان کے پاس اب بھی ہوگی۔ کیا اچھا ہو اگر وہ اس وردی کو کراچی کے نیشنل میوزیم میں جمع کرا دیں جہاں زمانۂ قدیم کے بادشاہوں کے لباس محفوظ ہیں۔ جب کبھی مولانا صاحب سے ملنے کو جی چاہے گا' ہم ان کی وردی کی زیارت کر لیا کریں گے۔

مولانا صاحب کے کمالات کی فہرست بہت طویل ہے سیاست، شاعری، مضمون نگاری اور صحافت کے ساتھ ساتھ لیڈری بھی ان کا خاص میدان ہے۔ جس کا بہترین اظہار لاہور کی لوئلٹن مارکیٹ میں ہوا تھا۔ شورش کاشمیری مرحوم کے بالمقابل مولانا صاحب نے جس طرح دادِ شجاعت دی تھی، اس کی کوئی دوسری مثال ہماری تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس معرکے کی تفصیل مولانا صاحب نے اپنی کتاب "جنھیں میں نے دیکھا" میں دی ہے۔ یہ ان کی منکسر المزاجی تھی کہ اس معرکے میں اپنی جیت کا ذکر آپ نے دبے لفظوں میں کیا ہے اور زیادہ تر شورش مرحوم کی خوبیاں بیان کی ہیں۔

مولانا نے اپنے دورِ کمال میں "دیدہ ور" لکھی اور دورِ زوال میں روس کا سفرنامہ تحریر فرمایا۔ دونوں میں واقعہ نگاری سے زیادہ شاعری کا حق ادا کیا گیا ہے۔ ایک میں ان کے ممدوح بھٹو تھے اور دوسری کتاب میں گورباچیف۔ ان کتابوں کی موجودگی میں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا صاحب، جس کو پسند فرماتے ہیں اسی کے گن گاتے ہیں۔ حاسدین بدانجام ان کو ٹیڑھیاں سناتے ہیں۔ لیکن اللہ نے چاہا تو حاسدین خائب و خاسر رہیں گے اور مولانا اپنے محسنوں کے گن گاتے اور قلم بجاتے رہیں گے۔

مخلص۔ حمزہ فاروقی۔

اختر سعیدی
(رانچی)

جا ـــ ا ـــ ا ـــ ڑا

ہمارے ہاں کے تین خاص موسموں میں جاڑا ہی ایک ایسا موسم ہے جس کی یاد آتے ہی بوڑھے جسموں میں کپکپاہٹ اور جوان دلوں میں "گرماہٹ" بلکہ سنسناہٹ تک دوڑ جایا کرتی ہے!

شاعروں اور ادیبوں نے جاڑے کی ایک جمالیاتی شاخ "گلابی جاڑے" کے نام سے اگا رکھی ہے۔ یہ حضرات اپنے گلابی جاڑے کی ایسی دل فریب منظر کشی کرتے ہیں کہ پڑھ کر جواں سال کے دل میں کم از کم ایک سرور انگیز افسانوی جاڑا کسی شریک کے ساتھ گزارنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے!

سردیوں کے حملہ سے قبل لوگ اس سے بچاؤ کی مختلف تدابیر اختیار کرنے میں لگ جاتے ہیں۔ کچھ گرم پاکٹ والے حضرات "اینٹی فریز" یعنی اونی کپڑوں کے انتظامات میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ کمبل، شال، سویٹر وغیرہ کی خریداری جم کے ہونے لگتی ہے! یہ الگ بات ہے کہ گرم کپڑوں کی چاہ میں جیبیں سرد ہو جاتی ہیں اور پھر ایک موسم تک کے لیے مزید بار برداشت کرنے کے قابل نہیں رہتیں!

چند "ٹو ان ون" مزاج والے دل کے جوان جاڑے کا مقابلہ کرنے کے لیے شادیاں کر ڈالتے ہیں ـــــــ وہ بھی سسرال کے ہی خرچ پر!

ایسے لوگوں پر یہ مثال صادق آتی ہے کہ "ہلدی لگے نہ چونا اور رنگ چوکھا آئے"۔

آج سے سو پچاس سال اُدھر امرا کے گھر آتش دان باعثِ راحت ہوا کرتے تھے اور غربا میں چوپال کی لہری کا چلن عام تھا! لیکن آج کل یہ عالم ہے کہ امریکہ کے بھتیجوں نے "ایرکنڈیشنر کی گود میں پناہ ڈھونڈلی ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ گرمی کے دنوں میں ککڑیاں اور جاڑے میں لکڑیاں ایک ہی بھاؤ بکا کرتی ہیں!

چناں چہ ہر روز پسینہ بہانے اور غم کھانے والے غریب لوگ ہر رات، سرد بستر پر اس انقلاب کے خواب دیکھا کرتے ہیں جس انقلاب کے بعد ہر شخص نواب واجد علی شاہ کی طرح پان کی گلوریوں میں خالص کستوری استعمال کر سکے۔

رانچی میں ٹھنڈک کی یلغار کچھ شدید ہی ہوا کرتی ہے ـــــــ نومبر، دسمبر میں تو اس قدر زبردست ٹھنڈک پڑتی ہے کہ بالکل برفستان کا سماں ہوتا ہے! ایک افسانہ نویس نے اپنے ایک دوست کے خط میں رانچی کی ٹھنڈک کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

"اگر کچھ دنوں اور اسی طرح سورج کی گرمی کا گھٹنا اور سردی کا بڑھنا بدستور رہا تو پھر وہ دن دور نہیں جب ہمارا

تھرمامیٹر "قطب شمالی" میں تبدیل ہو کر کولڈ اسٹوریج بن کر رہ جائے گا!

کچھ نیم حکیم و نیم مولوی قماش کے دانشوروں کا خیال ہے کہ ـــــ آجکل سورج کی انرجی سے مصنوعی سیارے اُڑائے جارہے ہیں اس لیے حرارت اُدھر خرچ ہورہی ہے اور سورج کی بچی کھچی شعاعیں جو ہم تک پہنچتی ہیں ان میں مسلسل کمی ہو رہی ہے، اس لیے یہ دم توڑتی ہوئی کرنیں ٹھنڈک کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہیں!

سردیوں میں ہمارے ہاں برف جمانے کی ضرورت نہیں ہوتی، کیوں کہ نل سے جو پانی آتا ہے وہ آدھا جما ہوا ہی ہوتا ہے! کوئی جیالا مرد ٹھنڈے پانی سے اگر صبح کو اشنان سے لطف اندوز ہونے کی جسارت کر بیٹھے تو وہ فعلِ حماقت کہی جائے گی۔ اور غسل کرنے والا "قلفی ملائی" میں تبدیل ہو جائے گا۔

میرے شہر میں اگر نہار منہ باسی پانی پینے کی ڈاکٹر مصلاح دے تو سمجھدار لوگ دانت نہ ہلنے کی دوا بھی ساتھ ہی مانگ لاتے ہیں!

پچھلے زمانے میں کچھ چیزیں ایسی بھی تھیں جن کے استعمال سے جسم میں گرمی اور زبان میں نرمی خود بخود پیدا ہوجاتی تھی جیسے چلغوزے لیکن آج کل چلغوزہ کی گرانی اس قدر ہے کہ ہم صرف دکان دار سے دام ہی پوچھ سکتے ہیں۔ ہاں قیمت سن کر آہیں بھرنے پہ کوئی پابندی نہیں!

جسم میں توانائی لانے کے لیے ایک چیز ہوا کرتی تھی "دیسی انڈا"! فی الحال حالہ ایسا ہے کہ آج کے بازار میں بچے بھی نقلی آنے لگے ہیں، تو اصلی انڈے . . . کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

چلتے چلاتے ایک دلچسپ واقعہ سن لیجیے۔ میرے ایک شاعر دوست کو کڑاکے کی سردی میں غزل لکھنے کی سوجھی بس پھر کیا تھا ـــــ موصوف قلم، کاغذ، چشمہ، سوئٹر، لحاف وغیرہ سے لیس ہو کر بستر پر جم گئے، کافی دیر ہوگئی، پر کوئی شعر نہ ہوا، تب انھوں نے گنگنا کے کہنا چاہا لیکن اس طرح حضرت کو ایک نیا تجربہ ہوا، ان کے گنگنانے کی آواز گلے سے یوں خارج ہو رہی تھی جیسے کوئی شخص راگ ملہار الاپنے کی پہلی کوشش کر رہا ہو، سردی اس قدر کہ دانت پہ دانت جمانا مشکل ہو رہا تھا، بالآخر جھنجھلا کر بیت الخلا میں جا بیٹھے، مگر واہ ری قسمت کہ ایک مصرع بھی نہ ہوسکا، آخرش اپنی بے بسی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

ٹھنڈک سے ہوں نڈھال غزل کس طرح کہوں
یارو برا ہے حال غزل کس طرح کہوں
کیسے میں اپنی فکر کے چولہے میں آنچ دوں
ٹھٹھرا سا ہے خیال غزل کس طرح کہوں

قلمی معاونین براہِ کرم تخلیقات پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھیں۔

امجد علی فیض

(گلبرگہ)

نشتر کہیں جسے

فاروق نشتر ــــــــ!

پہلی مرتبہ جب میں نے ان کا نام سنا تو جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہو گئی جو عموماً ہلکی سی خراشیں آنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور پھر بعد میں جب یہ اطلاع ملی کہ یہ گلبرگہ تشریف لا رہے ہیں تو مارے خوف کے میری جو حالت ہو گئی تھی اس کے لیے مرغ بسمل کی مثال ہی موزوں ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں یہ بھی اسم بامسمّٰی نکلے تو میرا کیا بنے گا کیوں کہ میں ٹھہرا ایک غریب موٹا تازہ نہتا آدمی! اور گلبرگہ میں مرہم نامی کوئی ادیب بھی تو نہیں رہتا کہ ان سے ملاقات کے فوری بعد اس کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے اور زخموں کو بڑھنے سے روکا جائے مگر میں نے ان سے ملنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ میں خواہ مخواہ ان سے ڈرا جا رہا تھا کیوں کہ یہ نشتر تو کجا ــ کھلونا بھی نہیں ہیں جسے بچے نشتر بنا کر کھیلا کرتے ہیں ہاں۔ البتہ ان کی تحریروں میں جگہ جگہ نشتریت نمایاں ہے جس سے زخم تو نہیں لگتے البتہ گدگدیاں ضرور پیدا ہوتی ہیں جن سے ہنسی کے فوارے چھوٹتے ہیں اور مسکراہٹوں کے پھول کھل کھل جاتے ہیں۔

میرے ان سے دیرینہ مراسم تو نہیں البتہ اتنی ملاقاتیں ضرور ہوئی ہیں جو دوست بننے ۔ بنانے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کافی ہوتی ہیں ــــ

سجے سنورے بال، نکلتا ہوا قد، صحت مند جسم، رنگ سلونا، چہرہ گول، رویہ ہمدردانہ، لہجہ خطیبانہ پیرہن شریفانہ، مزاج ظریفانہ اور ذہن فلسفیانہ پایا ہے۔

آنکھوں میں فکر و طمانیت کا ملا جلا احساس، چہرے پر ترشی ہوئی مونچھیں اور فرنچ کٹ ڈاڑھی آنکھوں پہ چوڑے عدسوں کی عینک گردن کو دائیں جانب اٹھائے ذہن میں نت نئی شرارتیں بُنتے ہوئے اپنی دُھن میں مگن اطراف و اکناف کے ماحول سے بے خبر تیز مگر مضبوط قدم ڈال کر یوں چلتے ہیں جیسے دنیا والوں سے خفا ہو کر بن باس تشریف لے جا رہے ہوں۔

ہمیشہ انشرٹ کیے ہوئے ملیں گے ان کی ذات میں چند چیزوں کی کمی رہ گئی ہے اور وہ یہ کہ اگر ان کے ہاتھ میں (Representative Bag) اور گلے میں ٹائی کا اضافہ کر دیا جائے تو یہ کسی دوا ساز کمپنی کے تشہیری نمائندے نظر آئیں گے۔

یہ اپنے ننھیال حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میسور میں ہوئی اور اپنی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے گلبرگہ ہی

میں مقیم رہے ۔ اس دوران یہاں کی ایک انجمن، انجمن اربابِ ادب سے ان کی وابستگی رہی ۔ بی اے پاس کرنے کے بعد میسور یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا چند مہینے اسلامیہ عربک کالج منصورہ ہاسن میں بحیثیت لکچرار کام کیا اور اب یہ مدرسہ معینیہ میسور میں صدر مدرس اور میسور کی ہی ایک سرگرم ادبی تنظیم انجمن ارتقائے ادب کے معتمد کی حیثیت سے اپنی علمی وادبی خدمات انجام دے رہے ہیں ۔ ادبی ذوق تو انھیں اپنی والدہ سے ورثہ میں ملا ہے جو ایک اچھی شاعرہ ہیں اور یہ موروثی جرثومہ کالج میں داخل ہوتے ہی ایک مرض کا روپ اختیار کرکے ان کے دل و دماغ پر اثر انداز ہونے لگا۔

انھوں نے افسانہ نگاری کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا مگر زندگی کی ناہمواریوں اور معاشرہ کی ناانصافیوں نے انھیں طنز و مزاح نگار بنا دیا۔

افسانہ نگاری میں کرشن چندر، شاعری میں ندا فاضلی اور مزاح نگاری میں عظیم بیگ چغتائی سے بے حد متاثر ہیں۔ پسندیدہ ڈش کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ "اب نہ ایسی عمر ہے اور نہ ہی حالات کہ کسی ڈش کو پسند کرسکوں۔ کیوں کہ میرا ایقان ہے کہ پسندیدہ ڈش نصیب میں ہو تو خود ہی مجھے ڈھونڈ کر چاٹ لے گی یعنی ہر ڈش کو اس طرح پسند کرتا ہوں جس طرح بارش کے ایک قطرے کو کسان۔"

طبیعت میں صد درجہ انکساری پائی جاتی ہے مگر ایسی انکساری بھی کس کام کی جو بریانی کی خواہش پر دال روٹی اور سگریٹ کی طلب پر بیڑی کا مزہ چکھوائے۔

ہمارے کچھ احباب نے فیشن میں آکر داڑھی چھوڑ لی ہے اور داڑھی کیا چھوڑی نماز بھی چھوڑی ہے روزہ بھی چھوڑا ہے مگر سنا ہے کہ انھوں نے جب سے داڑھی رکھی ہے تب سے نماز روزہ کا اہتمام بڑی پابندی اور خشوع وخضوع کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔

دوست بنانے کے معاملے میں بڑی عجلت سے کام لیتے ہیں ادھر ہاتھ ملانے والے کو اپنا دوست سمجھ کر اس پر جان ومال لٹانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ یہ ان کی شخصیت کا خاص وصف ہے جس کی وجہ سے یہ کئی بار نقصان میں بھی رہے مگر دوستی پر آنچ نہ آنے دی۔

مصلحت پسندی کو روا نہیں رکھتے دو ٹوک سُناتے ہیں اور جب بھی سنانے پر اتر آتے ہیں تو سناتے ہی چلے جاتے ہیں کبھی تلخ، تو کبھی شیریں سلیمان خطیب مرحوم کے حوالے سے تو کبھی مجتبیٰ حسین کے مضمون کے اقتباس سے کبھی ندا فاضلی کی غزل سے تو کبھی یوسف ناظم کے مضامین سے اور کبھی کبھی احادیث کی روشنی میں بھی گوہر فشاں ہوتے ہیں۔ ان کی گفتگو کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ یہ موقع، محل کی نزاکتوں کو سمجھے بغیر ہر بات کو مزاح کا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہیں حالاں کہ میں نے ان سے کئی بار اس کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فاروق بھائی جب ہم آپ کو سچے دل سے طنز و مزاح نگار سمجھتے ہیں تو یہ پھر آپ بات بات پر خواہ مخواہ اپنے آپ کو مزاح نگار جتلانے کی کوشش کیوں کرتے ہیں تو یہ ہر بار مسکرا کر خاموش ہوتے گئے یہ بات بات پر یوں مسکراتے ہیں جیسے مسکرانا ہی ان کی زندگی کا نصب العین ہو۔ میں نے انھیں اس طرح بات بات پر مسکراتے اور قہقہے لگاتے

دیکھا تو ایک روز اپنے کمرے کے ایک گوشے میں لے جا کر رازدارانہ لہجہ میں دریافت کیا کہ فاروق بھائی سچ سچ بتائیے جب آپ پہلی مرتبہ معصیت میں گرفتار ہوئے تھے یعنی نکاح کے وقت قاضی جب آپ سے ایجاب وقبول کروا رہا تھا کہ " فلاں بنت فلاں کو مہر کے ساتھ اپنی زوجیت میں قبول کیا" تو اس وقت آپ کیا کر رہے تھے تو انھوں نے بڑی معصومیت سے کہا " اس وقت بھی میں مسکرائے جا رہا تھا۔

پس اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان میں ہر مصیبت و پریشانی کو مسکرا کر جھیلنے کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔

ان کا آبائی وطن میسوسا اور گلبرگہ ان کی سب سے بڑی کمزوری رہا ہے پتہ نہیں یہ گلبرگہ اس قدر عزیز کیوں رکھتے ہیں۔

انھیں خدمت خلق کا بہت شوق ہے اور چلتے پھرتے کسی بھی راہ گیر کو اپنے قیمتی مشوروں سے نوازنا ان کی عادت ہے۔

"بی بی! آپ کے جوڑے سے پھول گر رہا ہے اُسے درست کیجیے!"

"میاں آپ کی موٹر سیکل کی ہیڈ لائٹ جل رہی ہے اس کا بٹن آف کر دیجیے!"

"آپ بہت دبلے ہوتے جا رہے ہیں وقت پر کھانا کھائیے!"

"آپ بہت لمبے ہوتے جا رہے ہیں اپنے قد کو قابو میں رکھیے ورنہ ایک دن آپ کا شمار بھی دنیا کی گنی چنی میناروں میں ہونے لگے گا۔

"او رکشا والے تم بہت تھک گئے ہو اب آرام اور رکشا چلانے کی ذمہ داری مجھ پر چھوڑ دو میں رکشا چلاؤں گا!

" وغیرہ وغیرہ۔

چہرے پر اس قدر بزرگی چھائی ہوئی ہے کہ اپنے ہی دادا یا پھر چاچا نظر آتے ہیں اور گھر والے بھی ان کی بزرگی سے بخوبی واقف ہیں چناں چہ جب کوئی نوجوان ان کے گھر پر آواز لگاتا ہے تو ان سے کہا جاتا ہے " حضرت آپ کا شاگرد آیا ہے اور اگر کوئی ضعیف العمر شخص ان کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تو انھیں بتلایا جاتا ہے " قبلہ آپ کے دوست آئے ہیں"۔

یہ مزاح نگار ہونے کے ناطے اپنے آپ پر ہنسنا بھی خوب جانتے ہیں اور اپنے بارے میں کئی ایک لطیفے سناتے ہیں جن میں سے ایک آپ حضرات کی نذر ہے۔

"جب ان کے رشتہ کی بات چلی تو ان کی مرحوم خوش دامن انھیں دیکھنے کے لیے تشریف لائیں یہ اس وقت عینک لگائے کرسی پر تشریف فرما تھے تو مرحومہ نے ان سے کہا" بھلا دیکھیں تو سہی آپ عینک نکالیے تو موصوف نے عینک نکال کر ان کے ہاتھوں تھما دی اور خود اٹھ کر باہر چلے گئے۔

فاروق شتر کہتے ہیں خدا بڑا کارساز ہے مرحومہ ومغفورہ نے عینک دیکھ کر مجھے اپنی دامادی میں قبول کر لیا ہے۔

دوستوں کو خط لکھنا، بیوی کی شکایتیں سُننا اور "ایقان" کا "زیر و زبر" کالم لکھنا ان کے معمولات ہیں یہ الفاظ دیگر ایقان کا "زیر و زبر" بیوی کی شکایتوں کا ردّ عمل ہوتا ہے اور پچھلی بار ان ہی کی زبانی جب یہ معلوم ہوا کہ یہ مقامی روزنامہ "کوثر" میں مزاحیہ کالم چٹخارے بھی لکھ رہے ہیں۔

جہاں تک مہمان نوازی کا تعلق ہے یہ سنّت کی پیروی کرتے ہوئے مہمان کے آگے پہلے بکری کا دودھ پھر بکری

پیش کرنے والی نظر آتے ہیں اور پھر بھی یہ گلبرگہ آتے ہیں اہل گلبرگہ کو میسور آنے کی دعوت ضرور دیتے ہیں اور جو دعوت سے نہ مانے اُسے دھمکیاں بھی دیں گے "میاں اگر تم خود نہ آؤ گے تو میں تمہیں اٹھا کر لے جاؤں گا" اور جب کوئی ان کا مہمان بنتا ہے تو اس کی بڑی خاطر تواضع کرتے ہیں اس کے گھومنے پھرنے کا خیال رکھتے ہیں اور مہمان اگر ادیب ہو تو اس کے اعزاز میں ادبی اجلاس منعقد کروانے سے بھی نہیں چوکتے اور مہمان کو اس قدر کھلائیں گے، پلائیں گے اور سلائیں گے کہ واپسی میں وہ خود ہی نہیں اس کی جسمانی حالت بھی پھولے نہیں سمائے گی مجھے بھی کئی بار ان کی اوپر والی دھمکیاں ہی موصول ہوتی رہیں۔ مگر میں میسور جانے سے اس لیے بھی گھبراتا ہوں کہ میرا وزن پہلے سے ہی کچھ زیادہ ہے جس میں مزید اضافہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

(یہ خاکہ فاروق نشتر کی اولین تصنیف "دراصل" کی رسم اجرا میں پڑھا گیا۔) ◘

زندہ دلانِ حیدرآباد کا ترجمان

ماہنامہ

شگوفہ

حیدرآباد

[سوونیر]

جلد : ۲۲ — شمارہ : ۱۱

ایڈیٹر

ڈاکٹر سید مصطفےٰ کمال

نومبر ۱۹۸۹ء

فی پرچہ : ۷ روپے
زرسالانہ : ۵۰ روپے ، لائبریریوں سے ۵۵ روپے

سرورق : طالب خوندمیری
کتابت : محمد غالب ، محمود سلیم

طباعت : نیشنل فائن پرنٹنگ پریس ، چار کمان ، حیدرآباد ۵۰۰۰۰۲

ترسیلِ زر و خط و کتابت کا پتہ : شگوفہ ، ۳۱ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ ، حیدرآباد ۱ فون : 557716 رہائش : 521064

زندہ دلانِ حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے موقع پر
نیک تمنائیں

پانچ سال مکمل

بی بی جنرل ہاسپٹل

اینڈ کینسر سنٹر

گورنمنٹ پرنٹنگ پریس، روڈ ملک پیٹ حیدرآباد، آندھراپردیش
ملحقہ یہج میموریل ہاسپٹل، کیلی فورنیا (امریکہ)

فونس: 528122 - 528133 - 528134 - 550051

بانی و صدرنشین:
عالمی شہرت یافتہ کینسر اسپشلسٹ **ڈاکٹر نثار سیّد** جیسے امریکہ کے کینسر اسپشلسٹس کی مسلسل ماہرانہ خدمات کے علاوہ ہندوستانی ماہرین کی ہمہ وقت موجودگی ★ وہ دواخانہ جس میں کینسر کے علاج کی تمام عصری سہولتیں جو امریکہ میں رائج ہیں، مہیا کر دی گئی ہیں اور ان سہولتوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے

دو نئے آپریشن تھیٹرس عصری آلات کے ساتھ کام کر رہے ہیں جہاں جنرل سرجری کی سہولت بھی مہیا ہے

ملک میں پہلی بار INTRA CAUITARY APPLICATION اور INTER STITIAL IMPLANT کے علاج کی بھی سہولتیں ★ تشخیص کے لیے نیوکلیر اسکین مکمل باڈی [گاما کیمرہ GAMMA CAMERA کی آندھراپردیش میں پہلی مرتبہ درآمد ★ پہلے سے موجود سہولتیں ● ریڈیشن ● کیموتھراپی ● دو ہائی پاور کوبالٹ یونٹ ● اسکریننگ کے ذریعہ ابتدائی مراحل میں کینسر کی شناخت اور اس کا صحیح اور موثر علاج ● پیتھالوجیکل لیب ● عصری ایکسرے یونٹ وغیرہ ● ان پیشنٹ کے لیے اطمینان بخش سہولتیں ● فرحت بخش صاف ستھرا ماحول

نوٹ: اضلاع سے آنے والے مریضوں کے لیے خصوصی سہولیات اور مراعات ____

زندہ دلانِ حیدرآباد

صدر: جناب نریندر لوتھر
نائب صدور: جناب رشید قریشی
جناب مصطفےٰ علی بیگ
جناب طالب خوندمیری
معتمد عمومی: جناب بوگس حیدرآبادی
نائب معتمدین: ڈاکٹر حبیب ضیا
جناب احمد سلطان
خازن: جناب محمد سلیمان
اراکین: جناب حمایت اللہ
ڈاکٹر مصطفےٰ کمال
جناب مسیح انجم
جناب اسمٰعیل ظریف
جناب رشید الدین
جناب اسلم فرشوری
جناب حبیب محمد خان
کنوینر ارگنائزنگ:
جناب وہاب قیصر
کنوینر پروگرام کمیٹی:
جناب صلاح الدین نیر

۲۰ ویں سالانہ تقاریب

ذیلی کمیٹیاں

کنوینر اسٹیج: جناب سعادت علی خاں
ارکان: ظہیر الدین عثمانی
آصف محی الدین
کنوینر بکنگ: جناب محمد سلیمان
ارکان: مرتضیٰ
حسین محی الدین سلیم

بیسویں سالانہ تقاریب ۲، ۳، ۴ نومبر ۱۹۸۹ء

محفلِ لطیفہ، ادبی اجلاس اور مشاعرہ

کنوینر رابطہ: جناب احمد سلطان
ارکان: اشرف خوندمیری
محمد شفیع
کنوینر بک اسٹال: جناب مرزا نقی علی بیگ
ارکان: طارق زبیری
عبدالحق
کنوینر طباعت: جناب وہاب قیصر
رکن: خان اطہر
کنوینر نشرواشاعت: جناب حفیظ خاں مذاق
ارکان: معین امر بمبو
رؤف رحیم
کنوینر شعبۂ خواتین: محترمہ ڈاکٹر حبیب ضیا
انچارج: محترمہ مقبول فاطمہ
اراکین: تسنیم فاطمہ، خورشید خاتون
کنوینر انتظامات: جناب ام۔ اے۔ قیوم
ارکان: محمد یوسف، وہاب قیصر
کنوینر ہلت کیٹی: ڈاکٹر حبیب الرحمٰن خاں
ارکان: حسین محی الدین
مرزا اسلم علی بیگ

محفلِ لطیفہ

۲ نومبر ۸۹ء۔ گاندھی بھون

صدارت: جناب مجتبیٰ حسین
مہمانِ خصوصی: جناب دلیپ سنگھ
لطیفہ گو: خواہ مخواہ ۔ بیگ احساس
بالاپرشاد گوڑ ۔ ڈاکٹر رام پرشاد
ذہانت علی بیگ ۔ رچا سنگھ ۔ اظہر افسر
حفیظ خاں مذاق ۔ عرفان خوندمیری۔
بے بی فاریہ ۔ اور زندہ دلان و
فائن آرٹس کے فن کار
کنوینر: دولت رام

ادبی اجلاس ۔ ۴ نومبر ۸۹ء نمائش کلب

صدارت: جناب ہاشم علی اختر
مضامین: جناب مجتبیٰ حسین
جناب یوسف ناظم
جناب نریندر لوتھر
جناب رشید قریشی
جناب دلیپ سنگھ
جناب مسیح انجم
جناب پرویز یداللہ مہدی
جناب فیاض احمد فیضی
محترمہ حلیمہ فردوس
ڈاکٹر حبیب ضیا
جناب سید عباس متقی
کنوینر: جناب مسیح انجم

مشاعرہ ۔ ۴ نومبر ۸۹ء نمائش میدان

صدارت: نواب شاہ عالم خاں صاحب
شعرائے کرام:
ڈاکٹر مفلس فاروقی (اکولہ) خواہ مخواہ (بمبئی)
مختار یوسفی (مالیگاؤں) ۔ پاپولر میرٹھی
تنگ عنایت پوری (بہار) پاگل عادل آبادی
فرید انجم (عادل آباد) سراج نرملی۔
محمد حمایت اللہ ۔ مصطفےٰ علی بیگ
طالب خوندمیری ۔ اسمٰعیل ظریف
سرپٹ حیدرآبادی ۔ صبغت اللہ بمباٹ
رشید عبدالسمیع جلیل ۔ احمد سلطان
آن پڑھ بھونگیری ۔ رؤف رحیم
معین امر بمبو ۔ اقبال ہاشمی
اشرف خوندمیری ۔ حفیظ خاں مذاق
بوگس حیدرآبادی
کنوینر: آن پڑھ بھونگیری

اِس تھیلی کے چٹّے بٹّے

(فہرست)

ہوائی کولمبس (سفرنامہ امریکہ)

مالِ مفت (انشائیے)

تعارف

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

چُورن (منظومات)

شریمتی کمود بین جوشی
گورنر آندھرا پردیش
— مہمان خصوصی، ہند پاک مزاحیہ مشاعرہ

نواب شاہ عالم خاں صاحب
صدر، ہند پاک مزاحیہ مشاعرہ
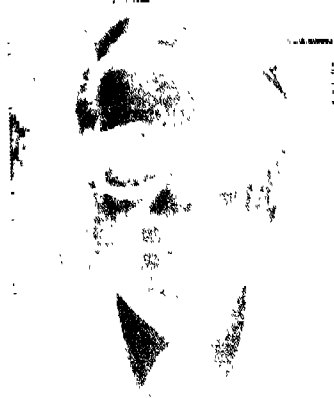
جناب سید ہاشم علی اختر
صدر ادبی اجلاس

جناب اسمٰعیل ظریف، رکن

جناب رشید الدین
رکن

جناب وہاب قیصر کنوینر، آرگنائزنگ کمیٹی

جناب صلاح الدین نیّر کنوینر پروگرام کمیٹی

جناب اسلم فرشوری، رکن

جناب اَن پڑھ بھونگیری کنوینر مشاعرہ

جناب عابد علی خاں

مہمانِ خصوصی، ادبی اجلاس

جناب نریندر لوتھر

صدر زندہ دلانِ حیدرآباد
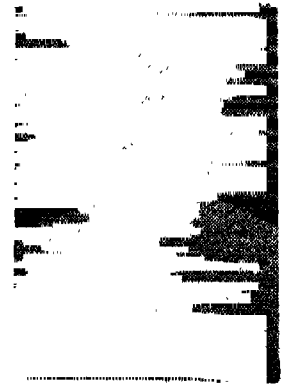
جناب سی۔ نارائن ریڈی

مہمانِ خصوصی، ہندپاک مزاحیہ مشاعرہ

داہنے سے بائیں: سعادت علی خاں۔ نقی علی بیگ۔ محمد سلیمان۔ طالب خوندمیری۔ رشید قریشی۔ بوگس حیدرآبادی۔ مصطفیٰ علی بیگ۔
صلاح الدین نیر۔ حفیظ خاں مذاق۔ وہاب قیصر۔ آن پڑھ بھونگیری۔ احمد سلطان۔

جناب مجتبیٰ حسین

جناب یوسف ناظم

جناب دلیپ سنگھ
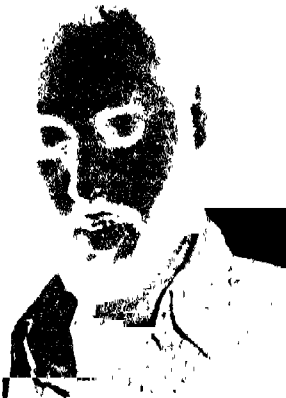
جناب پرویز یداللہ مہدی
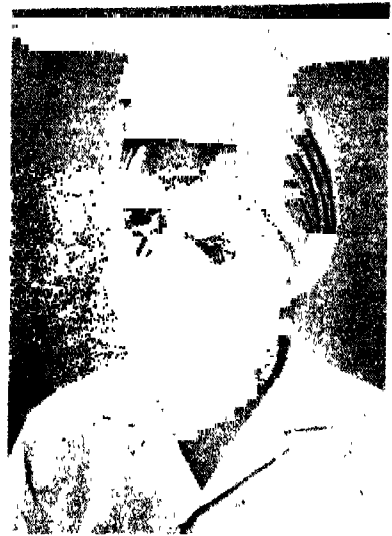
جناب فیاض احمد فیضی

جناب خالد عرفان (کراچی)

جناب خواہ مخواہ (بمبئی)

پروفیسر انور مسعود (اسلام آباد)
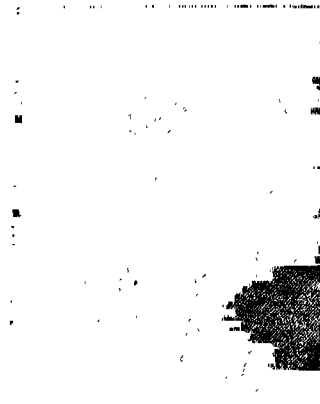
جناب میر واصف علی (کراچی)

جناب مفلس قارونی (اکولہ)

ڈاکٹر حبیب ضیا، نائب معتمد

جناب احمد سلطان، نائب معتمد

جناب محمد سلیمان، خازن

جناب حمایت اللہ، رکن

جناب مسیح انجم، رکن

جناب محمد منظور احمد رکن مجلس ادارت 'شگوفہ'
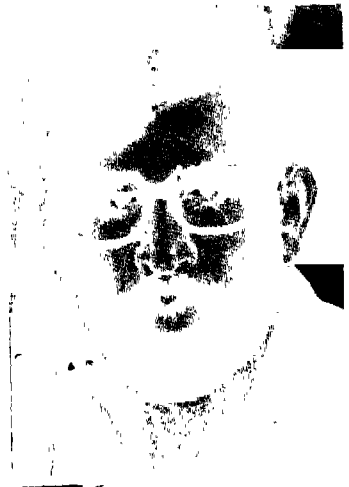
جناب رشید قریشی، نائب صدر

جناب طالب خوندمیری، نائب صدر

جناب مصطفیٰ علی بیگ، نائب صدر

جناب بوگس حیدرآبادی، معتمد عمومی

جناب پاگل عادل آبادی

جناب تنگ عنایت پوری (سیوان)

نریندر لوتھر

سفرنامۂ امریکہ　　　　(تیسری قسط)

گورے بنیے

لندن میں ہم نے دو دِن آرام کیا۔ یعنی لندن کی سَیر کی۔ ہم تو ابھی چند ماہ پہلے دس دن وہاں رہ چکے تھے لیکن بیگم بیس سال بعد انگلستان آئی تھیں۔ اس لیے اُنہیں سَیر کا اور خاص طور پر شاپنگ کا اشتیاق زیادہ تھا۔ ہماری صحت، بلکہ "عدم صحت" کا خیال رکھتے ہوئے، ہمارے میزبان ہمیں ہر جگہ کار میں ہی لے جایا کرتے تھے۔ ہم پچھلی بار لندن آئے تھے تو وہاں اُردو کی ایک ادبی نشست ہوئی تھی۔ اور ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا جس میں ہندو پاکستان کے کئی ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی تھی۔ یہ ایک ایسا طرۂ امتیاز تھا جس کی وجہ سے ہم ہندوستان کے بڑے بڑے شاعروں سے بھی بازی لے گئے تھے۔ اُردو شاعری کے آغاز سے آج تک کتنے ایسے شاعر گزرے ہوں گے جنھوں نے لندن میں انڈو پاک مشاعرے میں شرکت کی ہو! لندن میں اُردو کے اچھے شاعر ہیں اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ تمام کے تمام خوشحال ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ وہ سب لوگ کام کرتے ہیں اور شاعری اُن کے لیے ذریعۂ عزت و لذّت ہے نہ کہ روزگار کا وسیلہ۔ وہاں ہمیں یہ جان کر بھی تعجب ہوا کہ لندن سے کئی اردو اخبار اور رسالے نکلتے ہیں اور سب سے زیادہ کثیر الاشاعت رسالے کی سرکولیشن چالیس ہزار ہے۔ وہ دِن دور نہیں جب اردو کے اخبار اور رسالے سب سے زیادہ ہندوستان یا پاکستان میں نہیں بلکہ انگلستان میں چھپیں گے! اب بھی انگلستان میں براڈ فورڈ وغیرہ ایسے علاقے ہیں جہاں کئی سرکاری اداروں اور ٹیلی فون کے بوتھ پر اُردو میں ہدایات لکھی ہوئی ملتی ہیں۔ براڈ فورڈ کو تو پاکستان کا دوسرا دارالخلافہ کہا جاتا ہے۔

وہاں ہم نے سُنا کہ جب ۱۹۶۵ء میں ہند و پاکستان جنگ ہوئی تو اس وقت

کے وزیراعظم جنڈلال بہادر شاستری نے اس وقت کے پاکستانی صدر ایوب کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر آپ نے لڑائی بند نہ کی تو ہم براڈفورڈ پر بمباری کریں گے۔ اس دھمکی سے ایوب ڈر گئے اور انگلستان کے وزیراعظم ولسن نے بھی ایوب پر جنگ بندی کے لیے دباؤ ڈالا۔ اور اس طرح وہ جنگ ختم ہوگئی۔

خیر ان دونوں ملکوں کے سیاسی تعلقات سے قطع نظر انگلستان میں ہندوستانی اور پاکستانی بڑے گھل مل کے رہتے ہیں اور اکثر ایک ہی گھاٹ پر شراب نوشی کرتے ہیں۔ ویسے دونوں ملکوں کی حکومتوں کے زیر سرپرستی علٰحدہ علٰحدہ ادارے بھی ہیں جو بہ وقتِ ضرورت اپنی اپنی حکومتوں کی تائید اور دوسری حکومت کی مذمت میں بیان شائع کرتے ہیں اور نعرے لگاتے ہیں۔ لندن بی۔بی۔سی کی اردو سروس میں بھی دونوں ملکوں کے ادیب موجود ہیں۔ اور وہ مل جُل کر اردو سے اپنی خدمت کروا رہے ہیں۔

پچھلی بار ان میں سے کئی ادیبوں سے ملاقات بھی ہوئی تھی اور ایک شام ہم نے عمران فاروقی کے گھر افطار کی دعوت بھی کھائی تھی اس سے پہلے وہاں ادبی نشست بھی ہوئی تھی۔ عمران فاروقی انگلستان کے شہری ہیں اور انھوں نے ایک جرمن خاتون سے شادی کی ہے۔ داد دینی پڑتی ہے۔ اس جرمن خاتون کو کہ اس نے انگلستان میں رہ کر نہ صرف اردو بلکہ مشرقی مہمان نوازی بھی سیکھی۔

اس بار معلوم ہوا کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی ہمارے آگے آگے لندن پہنچے ہیں اور پھر وہاں سے امریکہ جائیں گے۔ اُن سے فون پر بات ہوئی اور وہ بھی ایرپورٹ سے۔ ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ فون کٹ گیا۔ ہمارے پاس مزید سکّے نہیں تھے۔ اس ادھوری بات چیت کا افسوس رہا۔ لیکن جس شخص کے پاس پیسہ نہ ہو وہ صرف افسوس ہی کرسکتا ہے فون نہیں ہماری باقی کی بات ابھی تک نہیں ہوئی کیونکہ ہر جگہ نارنگ صاحب ہم سے آگے آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب ان سے بات پوری ہوجائے گی تو ایک اور مضمون لکھیں گے یا اسی مضمون کو دوبارہ لکھیں گے یا وہ کتاب جس میں یہ مضمون شامل ہوگا۔ اس کا ایک نیا ایڈیشن چھپائیں گے۔ اس سے ناظرین کو یہ اندازہ ہوجائے گا کہ ہمارے دل میں نارنگ صاحب کے لیے کتنی عقیدت ہے۔ آپ کہیں گے کہ بات لندن کی ہورہی ہے اور اس میں ہندوستان، پاکستان اور نارنگ کہاں سے آگئے تو عرض ہے کہ یہ ہماری کرنی نہیں، تاریخ کی کروٹ ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب انگریز ہندوستان آئے تھے۔ اب ہندوستانی، انگلستان پہنچ گئے ہیں۔ انگریزوں نے یہاں آکر حکومت کی، اب ہندوستانی وہاں جاکر ان کی خدمت کررہے ہیں۔ سکول، ہسپتال، بسیں گویا ان کا تقریباً سارا سسٹم ہندوستانیوں کے سہارے چلتا ہے۔ انگریزوں کو بھی اپنا کام خود کرنے کی عادت نہیں پڑی اور ان کے سابق غلاموں کو اب بھی اپنے پرانے آقاؤں کی خدمت کرنے میں سکون اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ ایک ہندوستانی مزدور نے ہمیں بتایا کہ انگریز ہمارے خلاف کچھ بھی کہہ لیں لیکن پرائیویٹ طور پر وہ ہمیں کہتے رہتے ہیں کہ اگر کوئی تمہارا بھائی بھتیجا ہو تو اسے بلالو۔ ہم اُسے نوکری دیں گے۔

برسوں پہلے کی بات ہے جب ہماری بیگم انگلینڈ میں پڑھاتی تھیں۔ ایک بار ان کے ایک انگریز طالب علم نے یہ پوچھنے پر کہ ہندوستانیوں کی انگلستان پر یورش کی وجہ کیا ہے، تو بیگم نے جواب دیا تھا کہ کبھی آپ لوگوں نے ہمارے ملک پر حملہ کیا تھا اب یہ ہمارا جوابی حملہ ہے۔ بیگم اور ایسے بے شمار ہندوستانی ٹیچر انگریز بچوں کو غلط تعلیم دے کر ان کے مستقبل کو خراب کررہے تھے اور کررہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی قوم کی دو سو سال کی غلامی کا بدلہ لے رہے ہیں۔

انگریز اُس چال کو سمجھ نہیں پائے۔ سمجھیں بھی تو کیسے ؟ ایسی چالیں اُنہیں کی تو سکھائی ہوئی ہیں۔ اس معاملہ میں امریکن حکومت انگریزوں سے زیادہ ہوشیار ہے وہ سکولوں میں غیر ملکی ٹیچروں کو پڑھانے کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ اپنے بچوں کا مستقبل خود اپنے ہی ٹیچروں سے خراب کروانا پسند کرتی ہے۔ البتہ غیر ملکی اُستادوں کو یونیورسٹی سطح پر ایسے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

آپ ہندوستان سے انگلستان جاتے ہیں تو بار بار اور جگہ جگہ یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ ابھی ہندوستان سے باہر نکلے ہی نہیں یا ہندوستان بھی آپ کے ساتھ ہی آگیا ہے۔ دور کیوں جائیں لندن سے ایک گھنٹہ کی مسافت کی دوری پر ساؤتھ ہال کی بستی براڈ فورڈ ہے جسے پاکستان کا دوسرا دارالخلافہ کہا جاتا ہے ویسے ہی ساؤتھ ہال کو انگلستان کا جالندھر کہا جاتا ہے۔ وہاں سڑکوں پر دکانوں پر بسوں پر پنجابی سنائی دیتی ہے۔ اسٹیشن پر ٹکٹ دینے والا سردار جی ہے جو چند انگریز دکاندار وہاں بچ گئے ہیں، انھوں نے بھی پنجابی سیکھ لی ہے۔ مارکٹ میں ایک انگریز نے ہم سے پوچھا کہ ہمیں مرغی چاہیئے یا مُرغا۔ یہ سن کر ہمیں خیال آیا کہ نپولین نے انگریزوں کو دوکانداروں کی قوم جو کہا تھا واقعی اُس میں بڑی سچائی تھی۔ انگلینڈ میں اور خاص طور پر ساؤتھ ہال میں ہر وہ چیز جو ہندوستان میں ملتی ہے یا جس کی ہندوستانیوں کو ضرورت ہوسکتی ہے، ملتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں ہر چیز خالص ہوتی ہے چنانچہ نئے آنے والے ہندوستانیوں کو شروع شروع میں تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ اُن کو بھی خالص چیزیں کھانے اور استعمال کرنے کی عادت پڑجاتی ہے چونکہ ہمیں انگلستان میں صرف چند دن ہی رہنا تھا اس لیے تشویش نہیں ہوئی۔ دوچار دن کے لیے تو انسان ہر قسم کی تکلیف برداشت کرسکتا ہے۔ ہم نے تو خیر ہندوستان میں بھی کئی جگہ اور کئی بار خالص چیزیں چکھی اور استعمال کی ہیں۔ ڈر تو ہمیں امریکہ سے لگ رہا تھا جہاں ہمیں زیادہ عرصہ رہنا تھا اور جہاں کے بارے میں ہم نے سُن رکھا تھا کہ وہاں بھی ہر چیز خالص ہوتی ہے حتیٰ کہ دوائیوں میں بھی کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ یا خدا ایسے ملک کے لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں ؟ ان کا ذریعہ آمدنی کیا ہوتا ہے ؟ اور بیمار ہونے کی صورت میں وہ اپنا علاج کیسے کرواتے ہیں ؟ اور علاج کروانے پر ایسی خالص دوائیوں سے ٹھیک کیسے ہوجاتے ہیں ؟

ساؤتھ ہال بالکل ہندوستان کا ایک حصہ لگتا ہے۔ عام دوکانوں کے علاوہ، وہاں ساڑیوں کی دکانیں، حلوائی اور چاٹ کی دکانیں بھی پائی جاتی ہیں۔ پان اور سگریٹ کی دکانیں بھی ہیں اور سینما ہالوں میں ہندی یعنی اُردو فلمیں بھی دکھائی جاتی ہیں۔ پہلی پیڑھی کے ہندوستانی، انگریزی کے دوچار ضروری الفاظ سے قطع نظر اپنی مادری زبان ہی بولتے ہیں۔ دوسری پیڑھی کے لوگ گھر میں مادری زبان کے دوچار الفاظ کے علاوہ عموماً انگریزی ہی بولتے ہیں اور وہ بھی انگریزوں ہی کی طرح۔ غیر ملک میں اپنے آپ کو اڈجسٹ کرنے کا بار زیادہ تر نئی پیڑھی پر ہی پڑتا ہے۔ ہندوستان اور انگلستان دونوں کی کلچرل قدروں کو ساتھ ساتھ نبھانا بہت مشکل ہے مثلاً جہاں انگریز لڑکیاں شام دیر گئے تک اپنے یاروں کے ساتھ پبوں میں گھومتی پھرتی ہیں وہاں ہندوستانی لڑکیوں کو سورج ڈھلے سیدھے گھر آنے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ چونکہ انگلستان میں سورج یا تو طلوع ہی نہیں ہوتا، اور اگر ہوتا بھی ہے تو فوراً ڈھل جاتا ہے، اس لیے یہ لڑکیاں ہمیشہ گھر کی طرف ہی بھاگتی رہتی ہیں۔ اس بے وقوفی کی وجہ سے اُن کو اپنی سہیلیوں کے طعنے سُننا پڑتے ہیں۔ پھر شادی کے معاملے میں بھی ہندوستانی بہت دقیانوسی ہیں۔ وہ اِس کوشش میں رہتے ہیں کہ دلہن ہندوستان سے ہی درآمد کیا جائے۔ ہندوستان میں پلے ہوئے

لڑکے اور لڑکیاں وہاں کے بچوں کو بہت آزاد طبیعت پاتے ہیں اور اس لیے بیشتر شادیاں جلد ہی ٹوٹ جاتی ہیں۔ کئی نوجوان بغاوت کا علم بلند کرکے وہیں کسی انگریز سے شادی کر لیتے ہیں لیکن ایسی شادیاں بھی اکثر ناکام رہتی ہیں نتیجتاً عام طور پر نوجوان نسل کے لوگ فیض کے مصرعے "جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے" کے مصداق شادی کے منڈپ سے نکلتے ہیں تو طلاق کی عدالت کی طرف چل پڑتے ہیں۔ اس طرح ان کی زندگی میں ہمیشہ گھما گھمی رہتی ہے اور ان میں وہ پھیکا پن اور افسردگی نہیں آپاتی جس کی وجہ سے اکثر شادیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ دراصل اس میں ان کا بھی کوئی قصور نہیں یہ گرہستی ہے ہی ایسی چیز کہ اس کا چلانا بڑا جوکھم کا کام ہے نہ جانے ہم ہندوستانی کیسے ایک ہی شادی پر تکیہ کئے ہوئے ہیں! ہم سے وہاں ایک انگریز نے ہندوستانی شادیوں کی کامیابی اور طوالت کا راز پوچھا۔ ہم نے کہا بیگم سے پوچھئے اس نے بیگم سے پوچھا تو انھوں نے جواب دیا۔ جب میرے خاوند نے آپ کو سب کچھ بتا دیا تو میرے پاس بتانے کو کیا رہ گیا!

ساؤتھ ہال کے ساتھ ایک خاص قسم کا امیج چسپاں ہوگیا ہے۔ وہاں ہندوستان اور خاص طور پر پنجاب کے نچلے طبقے کے لوگ آباد ہوگئے ہیں۔ یہ ہجرت تقسیم ہند کے وقت شروع ہوئی جب پنجابیوں نے روزگار کی تلاش میں سارے جہاں کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ ان کے متعلق یہ کہاوت مشہور ہوگئی تھی کہ پنجابی ایک ایسا جانور ہے جو دنیا کے ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ ایک لطیفہ تو یہ بھی ہے کہ جب نیل آرم سٹرانگ چاند پر پہلے انسان کی حیثیت سے اُترا تو اُس نے وہاں بڑے فخر سے امریکی جھنڈا گاڑا۔ وہ چاروں طرف فاتحانہ انداز میں نظر دوڑا ہی رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر دُور اُفق پر ایک انسان کا سایہ پر پڑی۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک سکھ ہل چلا رہا ہے اور اس کی بیوی پاس بیٹھی مکئی کی روٹی بنا رہی ہے۔ آرم سٹرانگ کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے پوچھا "سردارجی آپ یہاں کیسے؟" اس نے کہا "جناب جب ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور ہم لوگ پاکستان سے نکلے تو کوئی اِدھر بھاگا، کوئی اُدھر۔ ہم نے سوچا کہ کیوں نہ ہم چاند پر جائیں۔ یہاں تو کافی عرصہ تک فساد ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ چاند کے بعد جس خطّے کو پنجابیوں نے پسند کیا، وہ لندن تھا اور جو لوگ یہاں آئے وہ زیادہ تر، ان پڑھ، مزدور پیشہ لیکن ہوشیار اور محنتی تھے۔ اُن کا نصب العین صرف ایک ہی تھا۔ پیسہ بنانا۔ وہ اوور ٹائم لگاتے، ہر قسم کا کام کرتے اور انگریزوں سے تین چار گنا پیسہ کماتے لیکن پیسہ کمانے کے ساتھ انھوں نے اپنا وطن یاد رکھا بالکل اسی طرح جیسے ہر یہودی کے دل میں یروشلم جانے کی تمنّا کبھی نہیں مرتی۔ ان لوگوں کا خواب یہ تھا کہ خوب پیسہ کماکر واپس اپنے گاؤں جائیں اور خوشحالی کی زندگی بسر کریں۔ کئی لوگ تو اسی خواب کو ساتھ لیے پردیس کی مٹی میں مل گئے۔ کئی لوگ ایسے بھی ہیں جو وہاں اتنی زیادہ مدّت تک رہنے کے بعد یہ محسوس کرنے لگے کہ اب وہ ہندوستان میں رہنے کے قابل نہیں رہے بلکہ ہندوستان ان کے رہنے کے قابل نہیں۔ کئی لوگوں نے بجائے یہاں آنے کے وہیں اپنے رشتہ داروں کو بلالیا۔ اور اس طرح وہیں ایک نیا سنسار بسالیا۔

گورے لوگوں نے پہلے تو اس یورش کی پرواہ نہ کی، پھر جب ہندوستانیوں کی تعداد بڑھنے لگی تو انھوں نے مزاحمت کی جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو پھر آہستہ آہستہ انھوں نے وہ علاقے چھوڑنے شروع کر دیئے جس میں ہندوستانیوں کی اکثریت تکلیف دہ حد سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔ اس طرح ساؤتھ ہال ایک ہندوستانی گھیٹو مشہور ہوگیا۔ انگریز اُسے خوف اور نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ساؤتھ ہال ایک ایسا علاقہ ہے جہاں دوسرے درجے کے شہری آباد ہیں جو

صرف پیسہ کمانے آئے ہیں اور جو اس ملک کو اپنا ملک نہیں سمجھتے جن کا رہن سہن اور طرز زندگی ناشائستہ اور غیر مہذب ہے۔ ایسے امیج کی ترویج کچھ تو خود ہندوستانیوں نے کی ہے اور کچھ انگریزوں نے بھی اُسے اچھالا ہے۔ ہندوستانیوں نے وہاں اپنا لوہا منوانے کی کوشش کی ہے جس میں وہ کافی حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ تنہا (ISOLATE) بھی ہو گئے ہیں۔

ہمارا ایک بھتیجا بھی وہاں رہتا ہے پچھلی بار ہم نے دو دن اس کے ساتھ گزارے تھے۔ وہ ہندوستان کا گریجویٹ انجنیئر ہے اور وہاں اس نے ایک ہندوستانی لڑکی سے شادی کی تھی۔ ایک سال کے اندر طلاق کی کارروائی شروع ہو گئی۔ ہم نے اُسے مشورہ دیا کہ اگر تمھیں انگلستان میں رہنا ہے تو ساؤتھ ہال کو چھوڑ دو۔ وہاں کا ماحول، وہاں کے لوگوں کی ذہنیت، وہاں کا امیج ایسا ہے کہ تم پورے طور پر پنپ نہیں پاؤ گے۔ ہندوستان میں تو ہم ایسے لوگوں سے میل جول نہیں رکھتے۔ صرف ملک بدلنے سے اُن کی ذہنیت نہیں بدل سکتی۔ ہماری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب وہ لڑکا ہماری رائے سے متفق ہو گیا اور وہ بھی فوراً۔ زندگی میں پہلی بار ہمارے کنبہ کے کسی نوجوان نے ہماری نصیحت پر آمادگی ظاہر کی جس کے نتیجے میں ہمیں ساؤتھ ہال میں ذہنی آسودگی کا احساس ہوا۔ سچ ہے ہمارے ملک میں ہماری قدر نہیں کرتے پھر ہمیں خیال آیا کہ اگر ہمارے ساتھ بیرونی ملکوں میں ایسا ہی سلوک ہوتا رہا تو ہماری صحت مکمل طور پر ٹھیک ہو جائے گی اور یہ بیماری کا خاتمہ ہو جائے گا۔

آخر ساؤتھ ہال کی بڑھتی ہوئی ہندوستانی آبادی کو روکنے اور انگلستان کی نسلی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے ہم نے ایک ٹھوس قدم اُٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اور "سفر کی اگلی لات" یعنی لندن سے نیویارک کو روانہ ہوئے اور آٹھواں سمندر پار کرنے کے لیے سامان باندھ لیا ——

رضا نقوی واہی

"زمانہ نہیں اچھا"

(شاد عظیم آبادی کے ہم عصروں میں ایک بہت اچھے شاعر شوق نیموی بھی گزرے ہیں، مشہور طبیب تھے۔ مکان کے بیرونی کمرے میں مطب تھا جس کا عقبی دروازہ اندر حویلی میں کھلتا تھا۔ صبح سے دوپہر تک مریضوں کا اژدہام رہتا تھا ان سے فارغ ہونے کے بعد وہ دن کا کھانا کھانے کے لیے اندر جاتے تھے۔ ایک دن ایک طوائف بھی مطب میں آئی۔ اتنے میں بارش ہونے لگی جو کھلنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ مرد مریض تو دوا لے کر بھیگتے ہوئے اپنے اپنے گھر چلے گئے، لیکن طوائف دور سے آئی تھی، بارش کی وجہ سے بیٹھی رہ گئی۔ اخلاقاً حکیم صاحب بھی بیٹھے رہے۔ کھانے کا وقت گزرتا جا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ نے ایک دو بار خادمہ کو باہر بھیج کر حکیم صاحب کو بلوانا چاہا، لیکن ہر بار خادمہ نے واپس جا کر بیگم صاحبہ سے کہا کہ مطب تو خالی ہے، صرف ایک نوجوان بیگم وہاں بیٹھی ہوئی ہیں۔ بیگم صاحبہ نے پردے کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا تو خادمہ کی بات کی تصدیق ہوگئی۔ غصّے کے عالم میں اندر جا کر بیٹھ گئیں۔ گھنٹوں بعد جب بارش رُکی تو حکیم صاحب نے اپنی مریضہ کو رخصت کیا اور پھر گھر کے اندر ماحضر تناول کرنے کے لیے گئے۔ بیگم صاحبہ رقابت کی آگ میں جل بھُن رہی تھیں، حکیم صاحب کو دیکھتے ہی برس پڑیں۔ بے چارے اپنی صفائی میں سر پیر مارتے رہے، لیکن ایک نہیں چلی۔ عاجز آ کر ٹھنڈا کھانا زہر مار کرنے کے بعد گھر کے مردانہ حصّے میں واپس آئے اور صورتِ حال کے پس منظر میں ایک غزل لکھی جس کا مطلع تھا ؎ دل، شوق، حسینوں سے لگانا نہیں اچھا

ہو جاؤ گے بدنام زمانہ نہیں اچھا

۱۵ اکتوبر ۸۹ء کو پٹنہ کی ایک انجمن نے اسی غزل کے مصرعِ اول کو مصرعِ طرح قرار دے کر ایک مشاعرہ رکھ دیا اور شرکت کے لیے زبردستی مجھے بھی پکڑ کر لے گئے۔ اس زمین میں، مَیں نے جو چند اشعار لکھے وہ درج ذیل ہیں)

شاعر کی ہے تنبیہ ــــ "زمانہ نہیں اچھا"　　"دل، شوق، حسینوں سے لگانا نہیں اچھا"

موسم ہے بہت گرم، فسادات کا ہر سُو　　بے وقت کی شہنائی بجانا نہیں اچھا

شعلوں کی زباں چاٹ رہی ہے در و دیوار　　اِس حال میں ذہنوں کو سُلانا نہیں اچھا

گجرات و بدایوں کی لہو رنگ فضا میں　　نیرو کی طرح جشن منانا نہیں اچھا

سڑکوں پہ جو فرہاد بنے پھرتے ہو یارو　　حالات سے نظروں کو چُرانا نہیں اچھا

بے وردی خواتین پولس گھوم رہی ہیں　　اُن سے نگہِ شوق لڑانا نہیں اچھا

مجنوں صفتی کام نہ آئے گی تمھاری　　شعر، اُن کو سرِ راہ سُنانا نہیں اچھا

چالان نہ کر دیں کہیں اوباش سمجھ کر　　اپنے کو مصیبت میں پھنسانا نہیں اچھا

شاعر ہو، ضمانت بھی نہ لے گا کوئی جا کر

حاجت میں پڑے، خود کو سڑانا نہیں اچھا

قطعات

لوگ کہتے ہیں تیری خوشحالی
کالے کرتوت کی مدد سے ہے
تیری پہچان آج کل نیتا
چار سو ۴۲۰ بیس کے عدد سے ہے

لگا کے منہ سے ساغر بولتے ہیں
بڑے بے باک ہو کر بولتے ہیں
اگر بیوی چلی جاتی ہے میکے
تو گھر میں صرف شوہر بولتے ہیں

باس نے اپنے محاسب سے کہا
کیوں پھنسیں ہم مشتبہ حالات میں
آج تک جتنا غبن ہم نے کیا
ڈال دو سرکاری اخراجات میں

جیبوں میں اپنے جتنی بھی رشوت اُتاریئے
سب سے بچا کے آنکھ بہ عجلت اُتاریئے

دسترپہ مُرغ و ماہی زیادہ سہی مگر
اپنے شکم میں حسبِ ضرورت اُتاریئے

آئینہ جانتا ہے حقیقت حضور کی
میک اَپ سے پہلے اپنی فطرت اُتاریئے

جُوتے پہن لیے ہیں اگر بھول کر مرے
ہوگی ذرا سی آپ کو زحمت اُتاریئے

دعویٰ قد آوری کا کریں شیخ بعد میں
منبر سے پہلے خود کو تو حضرت اُتاریئے

طالب خوندمیری

خالد عرفان (کراچی)

ٹیلی ویژن تھا کبھی اب مارک ٹیلی ہو گیا

ٹیلی ویژن عہدِ حاضر کا اک افلاطون ہے
لگ گیا ہے جو ہمارے منہ کو یہ وہ خون ہے
اس طرح ٹیلی ویژن کا ہر ڈرامہ ہو گیا
جیسے لازم شیروانی پر پجامہ ہو گیا
اشتہار اس طرح لازم ہے خبرنامے کے بعد
جیسے فل اسٹاپ کی موجودگی کامے کے بعد
اک مفکّر نے بتایا ہے اگر دیکھا کرو
نیند لانے کے لیے نیلام گھر دیکھا کرو
اک ڈرامہ نشر ہوتا ہے جو آدھی رات میں
وہ بہت مقبول ہے اس عہد کے جنّات میں
جس جگہ ٹائم بچا تھوڑا سا گانا دے دیا
رات کے بارہ بجے قومی ترانہ دے دیا
محفلِ شعری کو آدھی رات میں بھگتا دیا
بھیرویں کا راگ پونے نو بجے چپکا دیا
یہ ڈرامہ جس پروڈیوسر کا اک شہکار ہے
اس کی بیوی کا تو اس میں مرکزی کردار ہے
آج پھر فنّی خرابی ہو گئی دو چار بار
انتظار و انتظار و انتظار و انتظار
ٹیلی ویژن ہو گیا سنگین بیوی کی طرح
اور بیوی ہو گئی رنگین ٹی وی کی طرح

ہر محلہ ہے منوّر لیڈ کے اک تار سے
کتنے ٹی وی چل رہے ہیں ایک وی سی آر سے
جب سے چینل انڈیا کا ترجماں ہونے لگا
بچّہ بچّہ وقت سے پہلے جواں ہونے لگا
ٹیلی ویژن گھٹ کے گیندے سے چنبیلی ہو گیا
ٹیلی ویژن تھا کبھی اب "مارک ٹیلی" ہو گیا

یوسف ناظم
(بمبئی)

شیرو کا خط جھبّو کے نام

حیدرآباد
۳ر نومبر ۱۹۸۹ء

جھبّو ڈارلنگ۔ میں ان دنوں حیدرآباد میں ہوں۔ تم تو سال کیا صدیاں ہوگئیں کہ حیدرآباد نہیں آئے۔ آؤ اور حسین ساگر کو از سرِ نو دیکھو۔ حسین ساگر پر اب لوگ پانی نہیں دیکھتے۔ پانی کی مخالف سمت میں کئی پرکٹی مجسمے کھڑے ہوگئے ہیں (یہ خود بخود نہیں کھڑے ہوئے نصب کیے گئے ہیں) میں نے گنے نہیں لیکن بہت ہیں (اسی لیے نہیں گنے) ان میں دو مجسمے مجھے بہت پسند آئے۔ ایک قلی قطب شاہ کا اور ایک اپنے مخدوم محی الدینؒ کا۔ مجسموں میں تھوڑی سی قباحت ہے۔ مخدوم محی الدین کے ایک ہاتھ میں بساطِ رقص ہونی چاہیے تھی۔ قلی قطب شاہ کی بھی 'علامت' پوری ہوجاتی۔ قلی قطب شاہ تو بساطِ رقص کے بادشاہ تھے۔ (تمھیں کیا معلوم)

حیدرآباد کے قلبِ شہر میں معظم جاہی مارکٹ واقع ہے۔ یہ تمھیں یاد ہوگا کیوں کہ تم جب یہاں تھے تو اپنی مارکٹ سے پھل اور مکھیاں خریدنے جایا کرتے تھے۔ یہ اب بھی برقرار ہے۔ اس کی اصل وجہ اس شہر کی وضع داری ہے۔ لیکن ایک وجہ اور بھی ہے جسے ماحولیات کہا جاتا ہے۔ یہ موضوع حال حال کی پیداوار ہے اور اس پر تحقیقی کام بھی ہوا ہے۔ لیل بھی تحقیقی کاموں سے ہمیں بے حد رغبت ہے۔ یہ حد کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اتنی حدِ کمال کہ حدِ مصطفیٰ کمال کہنا مناسب ہوگا (ترکی والے مصطفیٰ کمال جو اتا ترک تھے اور لوگ اس زمانے میں پوچھا کرتے تھے کہ ترکی میں سب ترک ہوتے ہیں یہ اتا ترک کیسے ہوگئے) میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس معظم جاہی مارکٹ میں جو گھڑی اس کی تعمیر کے وقت لگائی گئی تھی اب بھی ثابت و سالم ہے۔ یہ حیدرآبادی بگ بن ہے۔ پورے ہندوستان میں اسی گھڑی کے مطابق کام ہوتا ہے۔ کام ہوتا ہے سے مراد یہ کہ نقل و حرکت ہوتی ہے ہمارے یہاں کام کے یہی معنی ہیں۔ گھڑی بند ہوجاتی ہے لیکن نقل و حرکت بند نہیں ہوتی سو نقل تو ہرگز بند نہیں ہوتی) ___ تم جب یہاں تھے تو ان دنوں نقل کرنے کے نمبر ۴۰، ۴۵ فی صد سے زیادہ نہیں ہوا کرتے تھے۔ ۴۵ فی صد نمبر حاصل کرنے والوں کو تو لوگ حیرت سے دیکھتے تھے۔ اب اس کام کے نمبر ۹۰ اور ۹۵ فی صد ہوگئے ہیں۔ ۹۵ فی صد سے کم نمبر حاصل کرنے والے طالب علم کی سزا یہ ہوتی ہے کہ اسے نہ تو ڈاکٹر بننے دیا جاتا ہے نہ انجینیر ___ ڈاکٹروں کی ویسے بھی اب ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ کئی سرکاری اسپتالوں میں جہاں خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک پھیلی ہوئی ہے جو آپریشن ہوتے ہیں وہ ڈاکٹروں کے نہیں نائیوں کے دستِ شفقت کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ نہیں سمجھے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ ان اسپتالوں میں نائی آپریشن فرماتے ہیں۔ (یہ مکمل حجامت) ہوتی ہے۔ یہ طریقہ اسی دہائی کی دین ہے (سب دہائی دے رہے ہیں)۔ تمھارا کینیڈا

تو یہ صد فیصد پس ماندہ ملک معلوم ہوتا ہے۔ مجھے تو ایسے ملک کہتے ہیں نہ بھی تامل ہوتا ہے ملک ہوتا تو اب تک تقسیم ہو چکا ہوتا تقسیم کی بات جانے دو اس کی تو کبھی بند ہونے کی خبر بھی نہیں آتی ـــــ کیا یہ مُردوں کی بستی ہے۔ بند کے بغیر تم لوگ زندگی کیسے گزارتے ہو۔ ہندوستان میں پہلے جو بند ہوا کرتے تھے وہ آب پاشی کے کام آیا کرتے تھے اب جو بند ہوتے ہیں وہ لہو پاشی کے لیے مفید مانے گئے ہیں ـــــ ہر بند میں لاٹھی چارج ضرور ہوا کرتا ہے۔ خون اسی سے زیادہ بہتا ہے۔ یہ تو برسرِ عام ہوا جو لوگ بند میں حصّہ لینے سے انکار کرتے یا اس کی مخالفت میں ایک دو لفظ بولتے ہیں ان کا بھی خون اس بند میں کام آتا ہے۔ یہاں ہر دوسرے تیسرے ماہ ایک بند ضرور منعقد ہوتا ہے اور عوام اور خواص دونوں اس میں دل کھول کر حصّہ لیتے ہیں۔ کبھی کبھی تو خود سرکار بھی بند منعقد کرتی ہے۔ عدالتیں بھی بند ہونے لگی ہیں۔ جس دن یہ بند ہوتی ہیں اس دن گواہوں کو چُست ہونے کا موقع نہیں ملتا ـــــ بند کے موقعوں پر کبھی کبھی اشک آور گیس بھی استعمال کی جاتی ہے (اب یہ بنائی گئی ہے تو اسے استعمال بھی کرنا چاہیے)۔ اس گیس کا فائدہ البتّہ کم ہوتا ہے کیوں کہ یہاں تو لوگ پہلے ہی سے آٹھ پہر روتے رہتے ہیں۔ اس گیس پہ کیا روئیں گے ـــــ غالب صاحب یاد آ گئے انھوں نے ان عوام کے بارے میں کیا خوب صورت مصرع کہا ہے:

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

تمھارے کنیڈا میں کیا بازار میں اناج وغیرہ بھی ملتا ہے۔ یہاں بھی پہلے ملا کرتا تھا۔ شکر بھی جو ں کہ ہندوستان میں پیدا ہوتی ہے اس لیے اکثر مل جایا کرتی تھی۔ پیدا تو شاید اب بھی ہو رہی ہے لیکن ملتی نہیں ہے۔ یہ زندگی کے نشیب و فراز کی بات ہے اور یہاں نشیب کا سلسلہ دراز ہے۔ فراز ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ نشیب کے کئی فائدے ہیں فراز میں اتنے فائدے نہیں ہیں) نشیب کی وجہ سے کمر بھی جلد جھک جاتی ہے۔ یہ مودّب ہونے کی علامت ہے مودّب ہونا اس لیے اچھا ہے کہ ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں۔ ہم سب ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں تم کنیڈا والے اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے ـــــ جب یہاں کوئی فساد ہوتا ہے (فساد کب نہیں ہوتا) اور کسی خاص فرقے کا شخص کسی دوسرے فرقے کے شخص کی جان بچاتا ہے تو اس کی خبر اخبار میں ضرور چھپتی ہے۔ سب لوگ اس عمل کی تعریف کرتے ہیں اور فساد کو فوراً بھول جاتے ہیں۔ نہ صرف بھول جاتے ہیں بلکہ جلد ہی دوسرے فساد کا اہتمام کرتے ہیں تاکہ ایک خاص فرقے کا شخص، دوسرے فرقے کے شخص کی جان بچائے اور اخبار میں خبر چھپے۔ کیا تمھارے یہاں اس قسم کی محبت کے مظاہر ہوتے اور مناظر برپا ہوتے ہیں ـــــ اب مانو گے کہ تمھارا ملک پسماندہ ہے۔

میں یہ سب کچھ تمھیں کیوں لکھ رہا ہوں۔ جانتا ہوں کہ نہ تم پڑھو گے نہ سمجھو گے ـــــ چلو کچھ اور باتیں کریں۔ جیسے جیسے قاری کم ہوتے جا رہے ہیں کتابیں زیادہ چھپ رہی ہیں۔ یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا۔ ادیب اور شاعر ایک دوسرے کو پڑھتے ہی نہیں تھے اب پڑھنے لگے ہیں۔ مجبور ہیں۔ یہی ادیب وہی قاری۔ صحافیوں نے البتّہ پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ ان دنوں کیا لکھا جا رہا ہے۔ کاتب بھی اب پڑھ کر کتابت نہیں کرتے کسی اور سے سنوا کر کتابت کرتے ہیں۔ اب ادیب کے املے کے علاوہ خود ان کا اپنا املا۔ کریلا تو تم نے کھایا ہی ہوگا لیکن یہ کریلا نیم کے درخت کا چڑھا ہوتا ہے ـــــ نیم کا درخت بھی شاید اُدھر نہیں ہوتا۔ تمھیں نبولیاں یاد آتی ہوں گی۔ وہی نبولیاں جو پڑوس کے

گھر کے آنگن میں ٹپکا کرتی تھیں ۔ ادھر ممولی ٹپکی اور ادھر تمھاری رال ٹپکی (بدیسی کہیں کے)
الفانسو آموں کا خمیر بھیج رہا ہوں جسے تم لوگ مینگو پلپ کہتے ہو ۔ پلپ کتنا ثقیل بلکہ کریہہ لفظ ہے ۔ یہاں بھی یہی لفظ
چلتا ہے ۔ یہاں کیا نہیں چلتا ہے ۔ تازہ ترین خبر یہ ہے کہ گرداب کالجوں کی حدود سے نکل کر مدرسوں کے احاطے میں داخل ہوگئی ہے
(یہی گرداب یہاں اڑائی جا رہی ہے) مدرسوں کے طالب علموں کا بھی اس پر حق ہے کیوں نہ ہو جب انھیں ۱۸ سال کا
ہو جانے کی وجہ سے ووٹ دینے کا حق مل گیا ہے تو گر دلینے کا حق بھی ملنا چاہیے —— ہندوستان کتنی ترقی کر گیا
ہے اور وہ پڑوس میں چین والے ابھی تک افیون ہی کھا رہے ہیں —— چلو چین چلیں ، کی تحریک دوبارہ شروع ہونی
چاہیے ۔ اب تو وہاں حالات بھی پرسکون ہیں —— وہ ولولہ تھا یا زلزلہ ۔ جو بھی تھا گزر گیا —— بر سر آدم تو یہ ہوتا ہی
رہتا ہے ۔

بھابی سے آداب کہو ۔ اس مینگو پلپ میں ان کا حصہ نصف بہتر ہے ۔ تمھارا
شیرو

فصل ووٹوں کی اُگانے کے زمانے آگئے

مفلس قاروقی
(بارسی ٹاکلی)

ڈگڈگی بھونپو بجانے کے زمانے آگئے نت نئے کرتب دکھانے کے زمانے آگئے
پھر دہی مجمع لگانے کے زمانے آگئے ناچنے گے اور نچانے کے زمانے آگئے
قوم کو اُلّو بنانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اُگانے کے زمانے آگئے

چل پڑی ہیں پھر سیاسی مسخروں کی ٹولیاں لے کے اپنے اپنے نعرے اپنی اپنی بولیاں
ووٹ کی خاطر پسارے اپنی اپنی جھولیاں دے کے وعدوں کی تسلی میٹھی میٹھی گولیاں
پھر سے پبلک کو سلانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اگانے کے زمانے آگئے

اپنے اپنے راگ ہوں گے اپنی اپنی ڈفلیاں پھر اُچھالی جائیں گی اک دوسرے کی پگڑیاں
عزت و ناموس کی پھر سے اڑیں گی دھجیاں تہمتیں، اسکینڈل، الزام، طعنے، پھبتیاں
بر سرِ مجمع لگانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اُگانے کے زمانے آگئے

ہر گدا اگر مرغ و ماہی کھائے گا لیل و نہار دیں گے ہر مزدور کو ہم ایک بنگلہ ایک کار
ایک جو پاتا ہے وہ پائے گا اکیاون ہزار پھر وطن میں آئی ہے رنگین وعدوں کی بہار
ہند کو جنت بنانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اگانے کے زمانے آگئے

پھر سیاسی شعبدہ بازوں کے چمچوں کے لیے پیٹ کے بندوں کے یعنی زر پرستوں کے لیے
ہر در دولت پہ ہر پل جھکنے والوں کے لیے سارے دادا دُں، لفنگوں اور غنڈوں کے لیے
ڈبیاں گھی میں لگانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اگانے کے زمانے آگئے

نام لیوا دھرم کے مذہب کے ٹھیکیدار اب بیچ دیں گے قوم کی عزت سر بازار اب
نفرتوں کا عام ہوگا ہر گھڑی پرچار اب خوب چل نکلے گا ووٹوں کا یہاں بیوپار اب
دور کھانے کا۔ کمانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اُگانے کے زمانے آگئے

اپنے بنگلوں سے نکل کر دوارے آئیں گے بھیک لینے ووٹ کی جھولی پسارے آئیں گے
جتنے ہیں بگلہ بھگت نیتا ہمارے آئیں گے ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے آئیں گے
صدر کی خاک اڑانے کے زمانے آگئے
فصل ووٹوں کی اگانے کے زمانے آگئے

مسیح انجم

داڑھی سے پہلے ' داڑھی کے بعد

جب کبھی داڑھی کا ذکر چھڑتا ہے تو مجھے اپنا گانو یاد آتا ہے۔ اور جب گانو یاد آتا ہے تو مجھے اپنی داڑھی کا قِصّہ یاد آتا ہے اور جب داڑھی کا قصہ یاد آتا ہے تو مجھے بے ساختہ ایک لطیفہ یاد آتا ہے۔ دراصل یہ ایک نفسیاتی معاملہ ہے۔ فی الحال نفسیات کو رہنے دیجئے اور وہ لطیفہ سُن لیجئے۔

ایک جلسے میں ایک صاحب " داڑھی اور اخلاقیات " کے موضوع پر تقریر کر رہے تھے۔ تقریر کیا کر رہے تھے گویا اچھا خاصا واعظ فرما رہے تھے۔ اتفاق سے ان کی داڑھی سائز میں چھوٹی تھی۔ سامعین میں ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ بلند آواز میں کہا:

" موصوف کو دیکھئے۔ داڑھی اور اخلاق پر تقریر تو کر رہے ہیں لیکن خود کو اپنی داڑھی کے سائز کی خبر نہیں۔!"

معترض کے بازو ہی ایک ایسے صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کی داڑھی کافی بڑی تھی ان کو اُس شخص کا اس طرح ٹوکنا بہت بُرا لگا چنانچہ معترض سے کہا:

" قبلہ! آپ ذرا خاموش رہیئے اور دوسروں کو تقریر سُننے دیجئے۔ اگر آپ تقریر سُننا نہ چاہتے ہوں اور صرف داڑھی دیکھنا پسند کرتے ہوں تو پھر میری داڑھی دیکھئے جو بفضلِ تعالیٰ سائز میں کافی بڑی ہے"

اس لطیفے کو بیان کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہمارا شمار بھی داڑھی رکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہماری داڑھی سائز کے عین مطابق نہیں ہے لیکن یہ اتنی چھوٹی بھی نہیں ہے کہ "خشخشی داڑھی" کی تعریف میں آئے اور جسے دیکھ کر کوئی شاعر محترم اس کی صفائی کا منظوم مشورہ دیں۔ جس طرح اگلے وقتوں میں ایک منہ پھٹ بند شاعر نے شہاب جنگ کی ملازمت سے تنگ آکر ایک شعر

موزوں کیا تھا ؎
خشخشی داڑھی سے صفائی بہتر
شہاب جنگ کی نوکری سے گدائی بہتر

خواہ، داڑھی چھوٹی ہو یا بڑی، باوجود بے جان ہونے کے اپنے اندر اظہار کی ایک بے پناہ طاقت بھی رکھتی ہے اور داڑھی رکھنے والے کی شخصیت عیاں ہو جاتی ہے۔

ہماری داڑھی کی کہانی بھی بڑی عجیب وغریب ہے۔ "عجیب" اس لیے کہ اس نے تولد ہونے میں کافی دیر لگادی تھی اور" غریب" اس لیے کہ مجھ غریب کو بڑے صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑا تھا۔ یوں تو ہمارے جوان ہونے میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں تھی لیکن داڑھی کو شائد ہمارے بالغ ہونے کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی جبکہ ہمارے ہم عمر ساتھیوں نے اپنی داڑھیوں کی کئی فصلیں کاٹ ڈالی تھیں۔ یہی نہیں، ہم سے جونیروں تک نے اپنے چہروں کو بلیڈوں سے چھیل چھیل کر " ریگ مال" میں تبدیل کر لیا تھا۔ پتہ نہیں، ہماری داڑھی کو کیا ہوگیا تھا جو برآمد ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔

ہماری داڑھی کی فکر ہم سے زیادہ ہمارے دوستوں کو تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک بہترین موضوع ان کے ہاتھ لگا تھا۔ چنانچہ جب کبھی موقع ملتا وہ ہم پر فقرے کستے :

" میاں! تم ہمارے ساتھ کیوں رہتے ہو؟ بالغوں کے ساتھ نابالغ کا رہنا مناسب نہیں۔ یا تو دوستی چھوڑ دو یا کسی نائی سے رجوع کر کے داڑھی اُگانے کا نسخہ حاصل کرلو!"

بالغوں کی فلم دیکھنے کے لیے نکلتے تو طعنہ دیتے :

برخوردار، تم کو ساتھ رکھتے ہوئے شرم سی آتی ہے۔ جاؤ مصنوعی داڑھی لگالو۔

اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم نوجوان کا سا میک اَپ کرلو۔ اگر یہ بھی ناممکن ہو تو اپنے ساتھ میٹرک کی سند کی " ٹروکاپی" رکھو تاکہ "کیو" سے نکالے جانے کی نوبت آجائے تو عمر کی تصدیق ہو سکے۔!"

ہم دوستوں کے طعنوں کو خوشگوار موڈ دے کر برداشت کر لیا کرتے، مجبور جو تھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ شادی کے فوری ایک سال بعد لڑکی کی گود ہری بھری نہ ہو جائے تو سسرال میں بڑی بھیانک قسم کی چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں اور مختلف قسم کی افواہیں گشت کرنے لگ جاتی ہیں۔ ایسی ہی کچھ افواہیں ہمارے دوست نما دشمنوں نے پھیلادی تھیں جن کا تدارک داڑھی برآمد کئے بغیر ناممکن تھا۔ یہ کوئی اولاد کا مسئلہ تو نہیں تھا جو کسی کا بچہ گود لے کر حل کر لیا جاتا۔ یہ تو صاحب ریش کہلانے کا مسئلہ تھا جو کسی کی داڑھی مستعار لے کر حل نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جب دوستوں کے شرارت آمیز تبصرے حد سے تجاوز کر گئے تو ہم نے یہ سوچ کر کہ ہر شر میں خیر کا کوئی نہ کوئی پہلو پوشیدہ رہتا ہے۔ داڑھی نہ ہونے کی کوتاہی کا بڑی سنجیدگی سے جائزہ لیا تو ہمیں بعض خاص قسم کی سہولتیں اور رعایتیں حاصل ہوتی نظر آئیں جو ہمارے دوستوں کو کسی قیمت حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ ہمیں ایک خاص قسم کی سہولت " ہاف ٹکٹ" کی حاصل تھی جسے ہم بے خبری میں فراموش کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ ہم نے اس سہولت سے استفادہ کرنا شروع کر دیا۔ بس کے سفر میں جہاں کنڈکٹر ہمارے دوستوں کو فل ٹکٹ چارج کرتا، ہم تھوڑی سی رَد و قدح کے بعد ہاف ٹکٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور ہمارے دوست منہ دیکھتے رہ جاتے۔ یہ بچت ہمارے جیب خرچ کے کام آتی۔

ہیں ایک اور خاص قسم کی سہولت اور رعایت بھی حاصل تھی جس کا تعلق جمالیاتی ذوق کی تسکین سے ہے ـــ جب کبھی کوئی حُسن کا دربار سجتا تو ہم وہاں بے روک ٹوک اور بے خطر پہنچ جاتے جبکہ ہمارے دوست اور ساتھی اپنے رنگیلی چہروں کی وجہ سے گیٹ پر ہی دھرلیئے جاتے اور خوب رُسوا ہوتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جہاں سے ہمارے دوستوں کی پرواز ختم ہوجاتی، وہاں سے ہماری پرواز کا آغاز ہوتا۔ شادی بیاہ کے موقع پر جب خواتین سے ہمارا آمنا سامنا ہوتا تو وہ کوئی نوٹس نہ لیتیں اور بچہ سمجھ کر درگزر کرجاتیں۔ اس کے برعکس ہمارے دوست بڑے بے آبرو ہوکر نکلتے۔ ہماری ان فتوحات کو دیکھ کر ہمارے دوست جل کے کہتے کہ "یہ بدمعاش عیب کو ہُنر بناکر استفادہ کرتا جارہا ہے!"

بڑی منتوں اور مُرادوں کے بعد ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہماری ٹھوڑی پر دو چار بال نکل آئے۔ ہم مارے خوشی کے دوڑے دوڑے دوستوں کی محفل میں جا پہنچے اور اپنی دو چار بال والی "جمال داڑھی" پر ہاتھ نہیں، انگلیاں پھیر کر نعرہ لگایا کہ "لو آج ہم بھی صاحبِ ریش ہوگئے!"

اس نعرے پر ہمارے ایک دوست نے ہمارے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے یہ فقرہ کسا:

"یہ دو چار تنکے بھی کوئی داڑھی ہے؟ اس سے اچھی داڑھی تو بعض عورتیں پیدا کرلیتی ہیں۔ جاؤ فوراً بلیڈ سے صاف کر آؤ ورنہ چین کی راہ لو۔ وہاں اِس قسم کی داڑھیاں بڑی پاپولر ہیں۔ کیا عجب کہ چین پہنچنے کے بعد اخباروں میں یہ سُرخی لگے ـــ

"ہیون سانگ کی واپسی"

ہم نے اس تلمیح طلب فقرے کا یہ مطلب نکالا کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس چینی سیّاح ہیون سانگ کا ذکر ملتا ہے، اس کی داڑھی ہماری داڑھی سے ملتی جُلتی تھی لیکن ہم نے چین جانے کے مشورے کو اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہاں پہلے ہی سے آبادی کی کثرت ہے اور ہم اس کثرت میں اضافے کا سبب بن کر غلّہ کی قلّت کا باعث بنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ دوسرے روز ہم نے اپنی دو چار تنکوں والی داڑھی کو خیر باد کہہ کے اپنے چہرے کو غیر آباد کرلیا۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جب کوئی نوجوان دو تین روز شیو نہ کرے تو اس کے چہرے پر کالی چیونٹیاں سی نمودار ہوجاتی ہیں۔ ایک بار کچھ ایسا ہوا کہ کسی مجبوری کے تحت ہم تین چار روز شیو نہ کرسکے۔ پانچویں روز کیا دیکھتے ہیں کہ ہمارے چہرے پر دونوں گالوں کی حفاظت کے لیے کالے یونیفارم میں سپاہیوں کا ایک لشکرِ جرّار کھڑا پہرہ دے رہا ہے۔ ہم نے اس پہرے کو ہٹانے کے لیے جوں ہی چہرے پر برش سے صابن لگایا، دل کی گہرائیوں سے ایک آواز اُبھری:

"اے نوجوان! تُو یہ کیا ظلم کرتا ہے۔ تُو ہر روز ہم کو بُلاتا ہے اور پھر ہمارا قتلِ عام کرتا ہے۔ کیا داعی کا یہی فریضہ ہے؟"

ہم نے یہ سوچ کر کہ یہ ایک نفسیاتی اُلجھن ہے، اس طرف کوئی دھیان نہیں دیا لیکن رفتہ رفتہ وہ

آواز ایک خاموش چیخ میں تبدیل ہوگئی۔ پھر تو ہم نے دل کی آواز پر لبیک کہا، اور پھر داڑھی چھوڑ دی۔

داڑھی چھوڑنا ہی تھا کہ گاؤں کے لوگ ہم کو مُلّا اور مولوی قسم کا آدمی سمجھنے لگے۔ گاؤں والوں سے مشکل یہی ہے کہ وہ داڑھی والے نوجوان کو دیکھ کر اُسے مُلّا یا مولوی سمجھ لیتے ہیں چنانچہ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس طرح بے کاری اور بے روزگاری میں زبردست مصروفیت نکل آئی۔ شاید ہی کوئی ایسا دن گزرتا کہ کوئی نہ کوئی حاضری نہ دیتا۔ ـــــ کبھی کوئی لڑکا آکر درخواست کرتا کہ ذرا گھر چل کر فاتحہ دیجئے۔ گھر میں کوئی بڑا آدمی نہیں ہے (اور ساتھ ہی تھوڑا سا تبرک بھی چکھ لیجئے) کبھی کوئی بڑی بی آکر گوش گزار کرتیں کہ داماد صاحب تشریف لائے ہیں۔ ان کے حلق سے روٹی اور دال اُترنے والی نہیں۔ ذرا چل کر مرغی کی خبر لیجئے۔ کبھی کوئی بڑی بوڑھی خاتون آکر پوپلے مُنہ سے یہ مژدہ سُناتیں کہ بہو کو بچہ ہوا ہے۔ ذرا گھر چل کر نومود کے کان میں خدا کی بڑائی بیان کیجئے۔ مختصر یہ کہ جب تک ہم گاؤں میں بے روزگار رہے ہماری داڑھی نے ہمیں بے حد مصروف رکھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم نے اس کارِ خیر کو اپنی انکم کا ذریعہ نہیں بنایا۔

داڑھی کے ذکر پر یاد آیا کہ داڑھی کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جیسے خشخشی داڑھی، فرنچ کٹ داڑھی، جھالرنما داڑھی، بکرے کی داڑھی، گرد داڑھی، حنائی داڑھی، جمالی داڑھی، کمالی داڑھی، جلالی داڑھی، سوالی داڑھی وغیرہ۔ ہاں! ایک سیاسی داڑھی بھی ہوتی ہے کہ جب جی چاہا بڑھالو اور جب جی چاہا مونڈ لو (یا مونڈ دو) ـــــ ان تمام داڑھیوں میں ہمیں سوالی داڑھی پسند نہیں۔ ہمیں وہ داڑھی پسند ہے جس میں کوئی تنکا نہ ہو!

▲▲

قطعہ
CONFESSION —

اُردو اُردو پکاروں میں بن میں
سچّی فیلنگ (FEELING) نہیں میرے من میں
اپنے بچوں کو انگلش پڑھا کر
رکھا اُردو کو مَیں نے کفن میں

نظم
ADJUSTMENT —

مجھے رشوت نہ دو
بس تم
میرا اِک کام کردو
میری ڈاٹر* کی شادی ہے
ذرا سی ذمہ داری تم اُٹھالو
جو ڈاؤری* اُس کا دولہا مانگتا ہے
اُس کو دلوا دو
مجھے رشوت نہ دو
میں تو کبھی رشوت نہیں لیتا

* DAUGHTER
* جہیز

مصطفیٰ علی بیگ

غزل کا ٹریلر

فلمی دُھن میں شعر کہوں گا میری مرضی
وزن گرا تو ڈانس کروں گا میری مرضی

دیس کی دولت لُوٹوں یا چچوں میں بانٹوں
مَیں لیڈر ہوں کچھ بھی کروں گا میری مرضی

بوڑھے فیس (FACE) پہ میک اپ کرنا شوق تمھارا
میں بالوں کو ڈائی کروں گا میری مرضی

جب بھی کوئی پیار کی روڈ پہ ہرڈل (HURDLE) آئے
گاڑی کو ریورس میں لوں گا میری مرضی

راشن کی یہ شاپ ہے میری کارڈ تمھارا
غلّہ دوں گا یا نئیں دوں گا میری مرضی

ووٹ کی مجھ سے ہوپ (HOPE) نہ رکھنا مسٹر لیڈر
اب کے بھیجہ یُوز (USE) کروں گا میری مرضی

داد میرے شعروں پہ دینا ڈیوٹی تمہاری
اَلّم غلّم کچھ بھی کہوں گا میری مرضی

خواہ مخواہ
(بمبئی)

ہمارا حال گو بہتر نہیں ہے
غنیمت جانیئے اَبتر نہیں ہے

خدا جانے ہمیں کیا ہوگیا ہے
تمیز و فرقِ خیر و شر نہیں ہے

دلوں میں ان دنوں خوفِ خدا بھی
بہت کم ہے مگر اکثر نہیں ہے

مرے کانوں نے یہ کہتے سُنا ہے
کہیں جانے سے یہ بہتر نہیں ہے

چلو چل کر خدا کو یاد کرلیں
کہ ٹی وی پر کوئی پکچر نہیں ہے

ترے سجدے ہیں سب بے کار واعظ
اگر دل میں خدا کا ڈر نہیں ہے

دلِ مشکور بھی مسکن ہے اُس کا
فقط مسجد خدا کا گھر نہیں ہے

یہ کیسا شہر ہے کوئی بتائے
کوئی حاکم کوئی افسر نہیں ہے

یہاں تو سب کے سب زخمی ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں خنجر نہیں ہے

مجھے پتھر سے مارا ہے اُسی نے
وہ جس کے ہاتھ میں پتھر نہیں ہے

ہے اتنی سی حقیقت خواہ مخواہ کی
سخنور ہے، بڑا شاعر نہیں ہے

قطعات

نیاز و ناز کے جذبوں سے بے خبری ہے
گلے تو چھوڑیئے، نالے بھی بے اثری ہے
وہ مائیکے میں رہیں ہم بھی اپنے گھر ہی رہے
نکاح کر تو لیا، پھر بھی بیچلر ہی رہے

دلِ بے تاب کو سینے میں مچلتے دیکھا
گرنے والوں کو بھی گر گر کے سنبھلتے دیکھا
خواہ مخواہ شیخ بھی ٹپکانے لگے رال اپنی
جب ترے جسم کو انگڑائی میں ڈھلتے دیکھا

دن ہیں رنگین تو ارمان بھری راتیں ہیں
کیوں نہ ہو، روز حسینوں سے ملاقاتیں ہیں
خواہ مخواہ نام تو کر جاؤگے مردانے میں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

دلیپ سنگھ

دودھ کی مکھی

کچھ روز پہلے جب میں نے اخباروں میں چرنجی لال کی موت کی خبر پڑھی تو مجھے بے حد دکھ ہوا۔ ویسے چرنجی لال کی موت کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جس سے کسی کو دکھ ہو۔ مرنے کے وقت وہ پچانوے سال کے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ پچانوے سال خاصی عمر ہوتی ہے۔ اس دھرتی پر گزارنے کے لیے۔ موت تو آنی ہی تھی۔ کوئی آبِ حیات تو پی نہیں رکھا تھا اُس نے۔ اور پھر چرنجی لال نے اپنی زندگی میں بہترے تماشے دیکھے اور کیے تھے۔ جب گاندھی جی نے اندولن چلایا کہ ہندوستانی بدیشی کپڑا نہیں پہنیں گے تو چرنجی لال نے بھی اپنا پندرہ سال پرانا کوٹ، جو اسے اپنے دادا سے ورثے میں ملا تھا، نذرِ آتش کر دیا تھا۔ اُسے ۱۹۴۲ء کے اندولن میں ایک لاٹھی بھی لگی تھی جس کی وجہ سے اُس کی چھاتی پر ایک زخم کا نشان بن گیا تھا۔ آزادی کے بعد وہ پرانا جلایا ہوا کوٹ اور چھاتی پر بنا ہوا لاٹھی کا نشان اُس کی روٹی روزی کا سہارا بن گیا۔ وہ نشان دکھا دکھا کر اس نے ایک دوکان، ایک کوٹھی اور کئی بار سکوٹر اور کاریں الاٹ کروائیں۔ جس پولیس کے سپاہی نے اُسے لاٹھی ماری تھی۔ اس بیچارے کو کیا معلوم تھا کہ وہ چرنجی لال کو لاٹھی نہیں مار رہا، اُس کی چھاتی پر ایک ایسا تمغہ ٹانک رہا ہے تو چرنجی لال کو مالا مال کر دے گا۔ اگر پتہ ہوتا تو وہی لاٹھی وہ اپنے سر پہ نہ مار لیتا۔

چرنجی لال کو بھگوان نے پانچ بیٹوں سے نوازا۔ ان بیٹوں نے اپنی زندگی میں خوب ترقی کی جس میں اُن کی قابلیت سے زیادہ چرنجی لال کی چھاتی پر لگے ہوئے لاٹھی کے نشان کا دخل تھا۔ بیٹوں کو شاید اس بات کا احساس تھا اسی لیے وہ اپنے والد کی بے حد عزت کرتے تھے۔ سب نے اپنی بیویوں کو ہدایت کر رکھی تھی کہ صبح اٹھ کر سسر جی کے پاؤں چھوا کریں۔ سال میں ایک آدھ بار وہ خود بھی یہ حرکت کر گزرتے تھے۔

چرنجی لال کو ویڈیو والے اکثر دعوت دیتے تھے کہ وہ بھارت کے بچوں اور نوجوانوں کو ۱۹۴۲ء کے اندولن کا حال بتائیے۔ بتلائیے کہ گاندھی جی کے چرنوں میں بیٹھ کر اُس نے کیا سیکھا۔ بتلائیے کہ بھارت کی آزادی کے لیے اُس نے کیا کیا قربانیاں دیں۔

چرنجی لال اگر آزادی کے پندرہ بیس سال بعد مر گیا ہوتا تو اُس کی موت پر ہزاروں جلسے ہوتے۔ بڑے بڑے لیڈر اُسے شردھانجلیاں دیتے۔ سرکار اس کے لڑکوں کو اور کوٹھیاں الاٹ کرتی۔ کیونکہ بقول شاعر

وطن پر مٹنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا۔

لیکن چرنجی لال سے ایک بھاری غلطی ہو گئی۔ اُسے مناسب وقت پر موت نہیں آئی۔ وہ جیتا ہی چلا گیا۔

یہ درست ہے کہ موت پر کسی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اپنی مرضی سے نہ کوئی جیتا ہے اور نہ کوئی مرتا ہے۔ لیکن فرق اس سے بہت پڑتا ہے۔ چرنجی لال اگر آزادی کے دس سال بعد مرجاتا تو اُس کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ لوگ احسان مند تھے کہ اُس نے دیش واسیوں کو انگریزوں سے آزادی دلوائی۔ لیکن آزادی کے دس سال بعد لوگوں کو احساس ہونے لگا کہ آزادی کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں تھی۔ خواہ مخواہ ہی لے لی۔ اگلے دس سالوں میں انھیں احساس ہوا کہ جو لوٹ انگریزوں نے مچا رکھی تھی وہ تو بہت کم تھی اپنے حکمرانوں کے مقابلے میں۔ انھیں نکال کر ہم تو گھاٹے میں رہے۔

لوگوں کا بس چلتا تو وہ بہلا پھسلا کر انگریز کو واپس لے آتے لیکن ایسا چونکہ ممکن نہیں تھا اس لیے لاکھوں کی تعداد میں لوگ ہندوستان چھوڑ کر انگریز کے دیش میں جا بسے۔ یہ خواہش کچھ اتنی شدت پکڑ گئی کہ انگلینڈ کا ویزا بیس بیس ہزار میں بکنے لگا۔ اپنے آزاد دیش سے دوڑنے کے جذبے میں کچھ ایسی کشش تھی کہ جو انگلینڈ نہ جا سکے وہ سری لنکا میں جا بسنے کو تیار ہو گئے۔

چرنجی لال اب بھی ریڈیو بلکہ ٹی وی سے جنگ آزادی کی کہانیاں سناتا تھا لیکن سننے والے پتہ نہیں کہاں گم ہو گئے۔ لوگ چرنجی لال کی تقریر کو بے وقت کی راگنی کہنے لگے۔ گاندھی جی کو تو لوگ بھلا نہ سکے کہ ان پر ایک سمجھدار انگریز پروڈیوسر نے ایک بہت اچھی فلم بنا دی تھی اور فلمیں تو آپ جانتے ہیں ہمارے نوجوان بہت دیکھتے ہیں اور اُن سے اثر لیتے ہیں لیکن اس چکر میں بے چارہ چرنجی لال مارا گیا۔

چرنجی لال جب کہتا کہ میں چرنجی لال ہوں تو لوگ پوچھتے "کون چرنجی لال" جب وہ کہتا کہ "جنگ آزادی کا سپاہی"۔ تو لوگ پوچھتے۔ "کون سی جنگ آزادی" جب وہ کہتا کہ وہ آزادی جو ہم لے کر آئے تھے تو لوگ پوچھتے کہ اگر لے کر آئے تھے تو پھر وہ چلی کہاں گئی۔

چرنجی لال کی اولاد نے جب دیکھا کہ یہ سکہ اب چل نہیں سکتا تو وہ اپنی جیب میں اس کا بوجھ محسوس کرنے لگے۔ گھر کی بہوؤں کو ایک دن احساس ہوا کہ گو سسر جی کے پاؤں چھونے سے وہ سورگ میں تو جا سکیں گی لیکن یہ بھی تو خطرہ ہے کہ اتنے غلیظ پاؤں چھونے سے انھیں کوئی بیماری لگ جائے اور وہ قبل از وقت ہی سورگ لوک میں پہنچ جائیں۔ یہ تشویش جب انھوں نے اپنے خاوندوں پر ظاہر کی تو انھوں نے فکرمند ہو کر یہ راستہ نکالا کہ پتا جی کی عزت تو دل میں ہونی چاہیئے۔ پاؤں چھونا تو پرانے یگ کی ایک روایت ہے جس کا آج کے یگ میں کوئی مقام نہیں۔

کوٹھی جو چرنجی لال نے بنوائی تھی اُس کے باہر تو اسی کا نام لکھا رہا لیکن کوٹھی کے اندر آہستہ آہستہ اس کا نام و نشان مٹتا چلا گیا۔ پہلے ڈرائینگ روم میں نہ صرف چرنجی لال خود بیٹھا دکھائی دیتا تھا بلکہ اُس کی ایک بڑی سی تصویر بھی آویزاں رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ اُس کا اپنا اور اس کی تصویر کا وجود کوٹھی کے بہتر کمروں سے ہٹتا گیا۔ آخر میں تصویر کا تو پتہ نہیں کیا بنا لیکن خود چرنجی لال کا بستر کوٹھی کے ایک مختصر سے سٹور میں پہنچ گیا۔ اُس نے جب اپنے بڑے بیٹے سے شکایت کی کہ اُس کمرے میں تو وہ اپنے پاؤں بھی اچھی طرح پھیلا نہیں سکتا تو فرمانبردار بیٹے نے جواب دیا کہ "پتا جی آپ نے خود ہی ہمیں سکھایا ہے کہ انسان کو ہمیشہ چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانے چاہئیں۔

چرنجی لال نے جب دیکھا کہ پاؤں پھیلانے کے لیے گھر میں جگہ کم ہو گئی ہے تو اس کا زیادہ وقت گھر کے پاس ایک پارک کے بیچ پر گزرنے لگا۔ شروع شروع میں کئی لوگ اُس کے پاس آ بیٹھتے تھے۔ چرنجی لال کی مشکل یہ تھی کہ وہ چپ نہیں بیٹھ

سکتا تھا۔ جہاں چار آدمی دیکھتا، بھاشن شروع کر دیتا۔

ایک دن بھاشن کے جوش میں اقبال کے اس شعر کی تشریح کر رہا تھا۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

تقریر کے جوش میں کہنے لگا کہ ۱۹۴۷ء میں ہم ہندوستانی یعنی ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ایک ہی گلاس سے پانی پیتے تھے اور ایک ہی تھالی سے کھاتے تھے۔ اُس کے سننے والے چونکہ اخبار پڑھتے تھے اس لیے انھیں لگا کہ چرنجی لال یا تو کسی اور ملک کی بات کر رہا ہے، یا پھر اُس کا دماغ سٹھیا گیا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کے پاس سے کھسک گئے اور پھر کبھی نہ دیکھ نہ پھٹکے۔ اب چرنجی لال تھا اور پارک کے بیچ کا ایک کونہ۔ دور دور تک سامعین کا نام ونشان نہ تھا۔

انسان بھی ایک عجیب طرح کی مشین ہے۔ بات کرنا اُس کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا روٹی کھانا۔ چرنجی لال کے پاس جب بات کرنے کو کچھ نہ رہا تو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے وہ خود سے باتیں کرنے لگا۔ ویسے تو خود سے باتیں کرنے میں کوئی برائی نہیں لیکن مشکل اس میں یہ ہے کہ بولنے والا تو تھکتا نہیں لیکن سننے والا بہت جلد بور ہو جاتا ہے۔ چرنجی لال آہستہ آہستہ اپنے بھاشن سے بور ہونے لگا، سننے والے چرنجی لال نے ایک دن بولنے والے چرنجی لال کو ڈانٹ دیا کہ یار اب بند کر میں تنگ آگیا ہوں تیری بکواس سنتے سنتے۔ بولنے پر پابندی لگ گئی تو چرنجی لال بیمار رہنے لگا۔

اچھے بھلے کو جب کوئی گھر میں رکھنے کو تیار نہیں تھا تو بیمار کو کون رکھتا۔ چرنجی لال کے بیٹے اسے ہسپتال میں بھرتی کر آئے۔ ڈاکٹر کے اس بیان سے انھیں بہت تسلی ہوئی کہ ایسے مریض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ بس پڑا رہے گا جب تک اس کا آخری وقت نہیں آتا۔ گویا چرنجی لال سے رشتہ چھوڑے بغیر اُن کی جان چھوٹ گئی۔

چرنجی لال کئی مہینے ہسپتال کے جنرل وارڈ کے ایک کونے میں پڑا رہا۔ بستر پر اس لیے نہیں لکھا کہ ایسے مریض کو عام طور پر بستر نہیں ملتا جس کے زندگی کے پروگرام کے بارے میں ہسپتال والے بے خبر ہوں۔ وہ تو اس مریض میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جو کچھ دنوں کے بعد یا تو اپنے گھر چلا جائے یا بھگوان کے گھر۔ ہسپتال تو ایک طرح کی سرائے ہے۔ مستقل سکونت کا اس میں کوئی انتظام نہیں۔

پتہ نہیں چرنجی لال نے اپنے مرنے کی دعا مانگی یا ویسے ہی بھگوان کو رحم آگیا۔ وہ ایک دن اچانک اس جہانِ فانی سے کوچ کر گیا۔

اس کی موت نے ایک طرح سے اسے زندہ کر دیا۔ ایک دم رشتہ داروں کو، یار دوستوں کو اور سب سے زیادہ دیش کے نیتاؤں کو خیال آیا کہ چرنجی لال بھی کوئی تھا۔ اس کی موت کی خبر اخبارات میں تصویر کے ساتھ شایع ہوئی۔ اور یہی خبر تھی جسے پڑھ کر مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ کئی لیڈروں کے بیان تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔

"چرنجی لال کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ شاید کبھی بھرا نہ جاسکے۔"

مجھے دکھ اس لئے ہوا کہ کیوں اس خلا کو بھرنا مشکل ہے۔ ایک کوٹھی کے ایک چھوٹے سے سٹور کو، پارک کے بیچ کے ایک حصے کو ہسپتال کے جنرل وارڈ کے ایک کونے کو بھرنا کیوں مشکل ہو گیا ہے۔ کیا ہمارے یہاں ایسے لوگ ہی معدوم ہو گئے جو اس خلا کو بھر سکتے ہیں۔ ●●

اعجاز الدین پاپولر میرٹھی

اکیسویں صدی

فریاد کرنے والوں کے کام آ رہے ہیں ہم
لنکا میں جھنڈا امن کا لہرا رہے ہیں ہم
دنیا کو اپنا حوصلہ دکھلا رہے ہیں ہم
آپس میں اپنی قوم کو لڑوا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

خورشیدِ آرزو کی کرن بیچتے ہوئے
ہے جس میں آشیاں وہ چمن بیچتے ہوئے
غیروں کے ہاتھ رازِ وطن بیچتے ہوئے
کرسی پہ کتنی شان سے منڈلا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

فتنہ کہیں اٹھا ہے تو کیا گھر کی بات ہے
خاطر شکن فضا ہے تو کیا گھر کی بات ہے
پنجاب جل رہا ہے تو کیا گھر کی بات ہے
ہٹلر کی داستان کو دوہرا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

امریکہ اور روس کی خیرات کی قسم
تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی رات کی قسم
ہر روز ہونے والے فسادات کی قسم
دنیا کو یکتائی کی طرف لا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

بیکار ہے یہ رنج کہ ہے کوئی پائمال
یہ فکر کس لیے ہے کہ روشن نہیں ہے حال
بس ارتقا کی دوڑ میں اتنا رہے خیال
بھارت کو انتر کش میں لے جا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

مخصوص اضطراب کا عالم لیے ہوئے
غارت گری کا دل میں نیا غم لیے ہوئے
ہاتھوں میں اپنے امن کا پرچم لیے ہوئے
دنیا میں پُر وقار نظر آ رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

سمجھو ذرا بغور ہمارے بیان کو
چھو کر ترقیوں کے بلند آسمان کو
دے کر زبان وعدوں کی اردو زبان کو
سلجھے ہوئے دماغوں کو الجھا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

پاک اور بنگلہ دیش جلا ہے تو کیا ہوا
تبت کو چین چھین چکا ہے تو کیا ہوا
نیپال آج ہم سے خفا ہے تو کیا ہوا
بتلاؤ! اس کے باپ کا کیا کھا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

قاتل ہمارے ساتھ، مسیحا ہمارے ساتھ
پبلک کا ٹھاٹھیں مارتا دریا ہمارے ساتھ
ہے کتنے اعتماد سے جنتا ہمارے ساتھ
ہستی بے ثبات پہ اترا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

محدود ہو کے رہ گیا سوچوں کا دائرہ
ہندوستان بند کا کرکے مظاہرہ
اب ان کی برتھ ڈیٹ پہ پڑھ کر مشاعرہ
بدنام شاعری کو بھی کروا رہے ہیں ہم
اکیسویں صدی کی طرف جا رہے ہیں ہم

اقبال ہاشمی
(حیدرآباد)

نیک مشورہ

جتنے گھپلے کر سکتے ہو کر لو تم
جتنا گھر کو بھر سکتے ہو بھر لو تم
جنتا تو ہے اچھی خاصی ہریالی
نیتا داجی بھر کے اس کو چر لو تم

افلاطونی حادثہ

بیل سے ٹکرا گئے تھے ایک افلاطون کل
آج تک لیٹے ہوئے ہیں روڈ پر میرے حضور
سوچتے ہیں حادثہ کا کون ذمہ دار ہے
ان کا اپنا دوش ہے یا بیل کا اپنا قصور

پتھریلا انکشاف

ایک صاحب شہر سے پہنچے کسی دن گاؤں میں
حظ اٹھاتے پھر رہے تھے ٹھنڈی ٹھنڈی چھاؤں میں
اتفاقاً اس جگہ کتوں کی ٹولی آ گئی
صاحب موصوف پر اک تھرتھری سی چھا گئی
ڈھونڈتے تھے ہر طرف پتھر، کہیں ملتا نہ تھا
ہاتھ آ جاتا کوئی پتھر تو وہ ہلتا نہ تھا
چڑھ کے فرمایا نرالے لوگ ہیں اس گاؤں کے
پتھروں کو باندھ کے رکھتے ہیں اور کتے کھلے

پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

عنایت علی خاں
حیدرآباد
(سندھ)

میاں! ہے پڑھائی کی منزل کٹھن   بھلا یہ دماغی مرض اور یہ سِن
جوانی کی راتیں مُرادوں کے دِن   کوئی کام رُکتا ہے تعلیم بِن
کرو یوں نہ توہینِ عہدِ شباب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

جو پڑھ لکھ گئے کچھ تو پچھتاؤگے   مشقّت کے کاموں سے شرماؤگے
رہوگے جو اَن پڑھ کما کھاؤگے   کمیٹی کے ممبر تو بَن جاؤگے
اٹھاؤگے ٹھیکے بنوگے نواب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

میاں! مشورہ ہم سے انمول لو   دوبئی کے لیے تم بھی پَر تول لو
کسی "مِس" سے دو بول ہی بول لو   چلو! کیسٹوں کی دکان کھول لو
کرو خلق کو خوش کماؤ ثواب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

بنو بیٹس مین اور بالر بنو!   میاں داد و عمران و قادر بنو
الیکشن میں جیتو منسٹر بنو!   اگر ہار جاؤ گورنر بنو!
ترقی کے چوپٹ کھلیں تم پہ باب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

چلو اور اک مشورہ مان لو!   کسی سیٹھ پر ماؤزر تان لو!
مگر اس کی ہرگز نہ تم جان لو   فقط آٹھ دس لاکھ تاوان لو
پولیس کو بھی لیکن کرو خوش شتاب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

میاں زہر ہے جس کو سمجھے ہو قند   ہیں عالم سے جاہل کے درجے بلند
جو سُنتے نہیں پھر بھی تم حرفِ پند   تو کردیں گے ہم سارے اسکول بند
شرارت کا کرنا تو ہے سدِّ باب
پڑھوگے لکھوگے تو ہوگے خراب

پرویز یداللہ مہدی

(جگ بیتی)

تصویر کا تیسرا رُخ

یہ سچ ہے کہ بعض اوقات تصویر کھنچوانا کھال کھنچوانے سے کم نہیں، اس کے باوجود اپنی ہی کسی ادا کو تصویری روپ میں ڈرائنگ روم میں کسی صلیب سے ٹنگا دیکھنے کی خواہش اس قدر شدید ہوتی ہے کہ آدمی ہنستے ہنستے یہ کرب بھی سہہ جاتا ہے۔ چنانچہ بچپن کی معصومیت، جوانی کی رعونت اور بڑھاپے کی ندامت کو تصویروں کی شکل میں محفوظ کر کے اپنے ورثا کی عبرت کے لیے دیگر مال و متاع کے ساتھ ضخیم البم چھوڑ جانے کا رواج برسوں سے چلا آرہا ہے ــــ!

ایسے خاندانی اصحاب جن کی شخصیت بدقسمتی سے اس قابل نہیں ہوتی کہ دوسروں کو مرعوب یا متاثر کر سکے، وہ آبا و اجداد کے البموں کو بیساکھی بنا کر اپنے درجات بلند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسے ہی ایک منحنی سے خاندانی میزبان اپنے ہاں پہلی بار آئے ہوئے مہمان کو اپنے خاندانی دبدبے سے مرعوب کرنے کے لیے پرکھوں کا البم بمعہ اپنی کومنٹری کے دکھلانے لگے کہ "یہ تلوار کٹ مونچھوں والے ہمارے دادا ہیں فلاں یار جنگ، یہ ان کی بغل میں خنجر کٹ داڑھی والے ہمارے نانا ہیں۔ فلاں خان بہادر اور یہ شمشیر کٹ ابرو والے ہمارے فلاں فلاں ہیں۔ . . . . "

ابھی آدھا البم بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ مہمان نے طنزیہ لہجے میں پوچھا ـــ یہ البم آپ نے کتنے میں خریدا" جس جادوئی پٹاری کے ذریعہ تصویر کھینچی جاتی ہے وہ عرف عام میں کیمرہ کہلاتی ہے۔ کیمرہ چاہے سستا قول مراد آبادی یعنی خالص دیسی ہو یا اسمگل شدہ امپورٹیڈ، اس کے صرف ایک ہی آنکھ ہوتی ہے، چناں چہ یہ سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے جو لوگ اس "فتنہ یک چشم" کو اپنے قابو میں کر لیتے ہیں وہ فوٹوگرافر تخلص فرماتے ہیں ہمارا خیال ہے ملک الموت کسی ذی روح کی روح قبض کرنے کے لیے اگر کوئی آسمانی آلہ استعمال کرتے ہوں تو یقیناً کیمرے کی چشم واحد سے آنکھ نہیں ملانے دیتا لہٰذا جب

بھی کوئی مجبوری کیمرے کے روبرو لے گئی ہم نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ ہمارا دعویٰ ہے کوئی چاہے کتنا ہی اکڑو اور ڈینگ باز کیوں نہ ہو، اس کی صحیح نفسیاتی اسٹڈی کرنا ہو تو اسے کسی شیر کے پنجرے، طوائف کے کوٹھے یا فوٹوگرافر کے کیمرے کے سامنے پہنچا دیجیے۔ ہم نے اچھے اچھے سورماؤں کو کیمرے کے روبرو پہنچ کر بھیگی بلی بلکہ سوکھا چوہا بنتے دیکھا ہے، اکثر سورما تو گھبراہٹ کے مارے "مُر" بھول کر صرف "ماں" "ماں" پکارنے لگتے ہیں۔ اس اعتبار سے فوٹوگرافر اور اس کے شکار کو بجا طور پر عامل اور معمول کہا جا سکتا ہے، چناں چہ کبھی کبھی عامل حضرات، معمول کے ساتھ ایسی عملی شرارتیں کر جاتے ہیں جن کا پتہ تصویر کے ہاتھ میں آنے پر ہی چلتا ہے، مثلاً معمول کی شخصیت میں نکھار اور چہرے پر وقار لانے کے لیے یہ ستم ظریف حضرات بڑی فراخدلی سے معمول کی خدمت میں کچھ دیر کے لیے اپنے ذاتی وارڈ روب (WARD ROBE) سے کوٹ ٹائی ہیٹ کا وغیرہ سپلائی کرتے ہیں جو بیس پچیس برس پہلے اسٹوڈیو کے افتتاح کے وقت کسی کباڑیے نے انھیں سپلائی کیے تھے ہو سکتا ہے اس کوٹ اور ٹائی میں خود معمول کے والد بزرگوار نے تصویر کھنچوا کر معمول کی والدہ ماجدہ کے گھر رشتے کی غرض سے بھجوائی ہو۔ مانگے کے ان اجالوں کی مدد سے معمول کی معمولی شخصیت میں چار چاند لگ جانے کے بجائے گہن لگ جاتا ہے۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ کچھ برس پہلے کی بات ہے کہ ہمارے ایک دوست کے رشتے کی بات چل رہی تھی۔ موصوف نے ایک ماہر فوٹوگرافر کے اسٹوڈیو میں جا کر بڑے اہتمام کے ساتھ ایک عدد تصویر کھنچوائی اور پھر اسے لڑکی والوں کے پاس بھجوا دیا۔ دو روز بعد اس عجیب و غریب اعتراض کے ساتھ تصویر لوٹا دی گئی کہ ہمیں اپنی لڑکی کے رشتے کے لیے لڑکا درکار ہے، ریگستانی اونٹ نہیں ——" اس اعتراض کی روشنی میں جب ہم نے موصوف کی معرکۃ الآرا تصویر دیکھی تو واقعی ایسا لگا جیسے ایک عدد اونٹ اپنے بدن پر طویل و عریض خیمہ لپیٹے، آسمان کی طرف سر اٹھائے ہوئے، یہ سچ مچ جگالی کر رہا ہو —— ہم نے اپنے دوست سے جھنجلاہٹ کے لہجے میں پوچھا —— "بھلے آدمی تصویر کھنچواتے وقت یہ ریگستانی خیمہ اوڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی تمہیں ——؟"۔

موصوف نے روہانسے لہجے میں جواب دیا۔ "تصویر میں جو ریگستانی خیمہ نظر آ رہا ہے وہ اصل میں "اوور کوٹ" ہے جسے فوٹوگرافر نے مجھے زبردستی پہنا دیا یہ کہہ کر کہ اس سے میرا دبلا پن نظر نہیں آئے گا، اور پھر اس کے کالر بھی کھڑے کر دیے کہ اس سے میری لمبی گردن کا عیب بھی چھپ جائے گا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے ان پیشہ ور عاملوں کی مہربانیاں، کس طرح حیوانِ ناطق کو خالص حیوان بنا دیتی ہیں ——

میلوں اور ٹھیلوں کے موقع پر یہ گروہ حضرات نئی نئی مضحکہ خیز جدتوں کا مظاہرہ کر کے شائقین کو خوب اُلو بناتے ہیں ان کے فٹ پاتھی اسٹوڈیوز کو اگر ارجنٹ کھنچوائی و دھلوائی کے چلتے پھرتے مرکز کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کیونکہ گھنٹے آدھ گھنٹے میں تصویر آپ کے ہاتھ میں ہوتی ہے یہ اور بات ہے کہ تصویر میں اپنے آپ کو پہچاننا راکٹ معمہ حل کرنے یا شوہر کی نبض دیکھ کر بیوی کے مرض کا پتہ چلانے سے کم نہیں۔ ایک مرتبہ بڑا عجیب تماشا ہوا، ایک صاحب فٹ پاتھی فوٹوگرافر کے ہاں تصویر کھنچوانے کے گھنٹہ بھر بعد حسبِ وعدہ تصویر لینے پہنچے تو دیکھا کہ بڑی بھیڑ لگی ہے یہ جیسے ہی بھیڑ بھاڑ کو چیر پھاڑ کر فوٹوگرافر کے نزدیک پہنچے تو بھید کھلا کہ وہ ان ہی کی تصویر کو امریکی خلاباز کی تصویر کہہ کر لوگوں کو اُلو بنا کر اپنا اُلو سیدھا کر رہا ہے، انھوں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، چلا چلا کر اسے اپنی تصویر ثابت کرنے کی کوشش شروع کر دی، فوٹوگرافر کے کرتے

بھلا کب چپ رہتے ان پر لوٹ پڑے اور ہر تصویر میں خلاباز نظر آنے والے کو زمین پر آتی پٹخنیاں دی گئیں اتنی قلابازیاں کھلائی گئیں کہ بالآخر انھیں اس بات کا احساس ہو گیا کہ وہ خلاباز نہیں "قلاباز" ہیں۔ ــــــ!

ان ستم پیشہ بندوں کی مختلف النوع ستم ظریفیوں سے قطع نظر جس مشترکہ طرحی مصرع کی کسوٹی پر یہ حضرات آپ کی سخن فہمی کو پرکھتے ہیں وہ بظاہر بڑی دل خوش کن ہے، یعنی فوٹو "کلک" کرنے سے چند ثانیے بیشتر اسمائیل پلیز (SMILE PLEASE) عرف ذرا مسکرائیے کی فرمائش ضرور کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو موقع محل کی نزاکت کو شعوری طور پر سمجھنے کے باوجود غیر شعوری طور پر بے موقع یہ مصرع موزوں فرما دیتے ہیں، ہمیں وہ دن کبھی نہیں بھولتا جب ایک قریبی دوست کا پروانۂ آزادی بحکم قاضی بذریعہ نکاح منسوخ کر دیا جا کر عمر بھر کے لیے اُسے کسی کی غلامی میں دے دیا گیا تھا۔ اس سانحۂ عظیم کے موقع پر جب فوٹوگرافر نے تصویر کشی کے دوران دلہا میاں سے خصوصی طور پر اسمائیل پلیز کی فرمائش کی تو اپنی تمام تر کوشش کے باوجود مسکراہٹ کی ہلکی سی رمق بھی بے چارے کے ہونٹوں پر اجاگر نہ ہو سکی بلکہ الٹا دلہا کی آنکھوں سے جوار بھاٹا (جواری اور بھٹے کے ملے جلے دانوں کی شکل میں بہنے لگا۔ ہم سے اس زندہ بہ دست مردہ کے آنسو دیکھے نہ گئے ہم نے فوراً فوٹوگرافر کو ڈانٹ پلائی ــــ" میاں عجیب احمق آدمی ہو، اس غریب سے ایسی چیز کی فرمائش کر رہے ہو جسے یہ ہمیشہ کیلئے گنوا چکا ہے، معلوم ہوتا ہے تمہارا خانہ ابھی تک خالی ہے۔ جب بربادی کی صورت میں آباد ہو گا۔ تب پتہ چلے گا کہ شادی سے پہلے جو دوسروں پر ہنستا تھا شادی کے بعد دوسرے اُس پر ہنستے ہیں ــــ!

یہ تو خیر خوشی کے موقع کا ذکر ہوا، انتہائی سنجیدہ بلکہ رنجیدہ موقعوں پر بھی یہ پیشہ ور حضرات اس طرح مصرع کو ارشاد فرمانے سے باز نہیں آتے۔ ایک مرتبہ ایک مشہور سوشیل ورکر کے جنازے کی تصویریں لیتے ہوئے فوٹوگرافر نے مرحوم سے بھی اسمائیل پلیز کی فرمائش کر دی، مرحوم تو خیر کیا مسکراتے البتہ جتنے بھی لیڈران قوم میت میں شریک تھے بے اختیار اپنے ہونٹوں پر پیشہ ورانہ مسکراہٹ لے آئے یوں بھی لیڈر حضرات چاہے کسی بھی موڈ میں ہوں تصویر کھنچواتے وقت مسکرانا ہرگز نہیں بھولتے بلکہ ایسا لگتا ہے جیسے مسکراہٹ کی چڑیا کیمرے سے نکل کر سیدھے ان کے ہونٹوں پر جا بیٹھتی ہے۔ عام آدمی میں چونکہ اس چکناہٹ اور ڈھٹائیت کا فقدان ہوتا ہے جو ان چلتا پرزہ لیڈروں میں تلوے سے تالو، تک کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اس لیے وہ غریب مسکرانے کے موقع پر بھی ٹھیک سے مسکرا نہیں پاتا۔

جس طرح ایک خلائی راکٹ کو چاند تک پہنچنے کے لیے مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے اسی طرح تصویر کھنچوانے کے دوران ایک اچھے بھلے شخص کو بھی کئی مراحل طے کرنے پڑتے ہیں سب سے پہلا مرحلہ تصویر کے سائز اور پوز POSE کے انتخاب کا ہے۔ عوام الناس کی سہولت کے لیے انھیں مختلف نام دیئے گئے ہیں مثلاً پاسپورٹ سائز پوسٹ کارڈ سائز، کیبنٹ سائز دیوارگیر سائز وغیرہ وغیرہ۔ پاسپورٹ سائز، پاسپورٹ و دیگر شناختی کارڈس کے علاوہ پولیس اسٹیشنوں کے وانٹیڈ کے بورڈس پر بھی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ پاسپورٹ سائز میں البتہ ایک خامی یہ ہے کہ اس میں صرف ایک طرح کا پوز ہوتا ہے، "ناک کی طرح سیدھا"، چنانچہ جو حضرات و خواتین اپنے دل کو کرکٹ کی گیند کی طرح اِدھر اُدھر "اسپن" (SPIN) کرنے کے عادی ہوتے ہیں وہ پاسپورٹ سائز کی جگہ پوسٹ کارڈ سائز کو ترجیح دیتے ہیں، ایک تو اس سائز میں ہر مرتبہ پوز بدلنے کی سہولت حاصل رہتی ہے۔ دوسرے اس سائز میں کھنچی تصویروں کا

تبادلہ پوسٹ کارڈوں کی طرح بذریعہ ڈاک بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی شادی شدہ جوڑے بھی اس سائیز میں کنواروں کو ورغلاتے نظر آتے ہیں تاہم بیشتر جوڑے پوسٹ کارڈ کے بجائے راشن کارڈ سائیز زیادہ پسند فرماتے ہیں جو عرف عام میں کیبنٹ سائز کہلاتا ہے۔ اس سائیز کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں شادی شدہ جوڑے میاں بیوی کے علاوہ سب کچھ نظر آتے ہیں' کوئی جوڑا اتفاقاً میاں بیوی معلوم ہوتا بھی ہے تو چہرے کے تاثرات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں یا تو طلاق ہو چکا ہے یا طلاق کے لیے درخواست دے چکے ہیں' البتہ جہاں تک پوز کا تعلق ہے شادی شدہ جوڑوں کے کچھ مخصوص اور مقررہ پوز ہوتے ہیں، کسی پوز میں بیوی کرسی پر قابض ہوتی ہے اور شوہر اسٹانڈنگ امیدوار یعنی استادہ' تو کسی پوز میں اس کے برعکس ایسے پوز عموماً اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ایک فریق دوسرے پر حاوی ہے کسی کسی پوز میں کرسی ایک دم خالی ہوتی ہے اور میاں بیوی دونوں سانس کھینچے بالکل استادہ نظر آتے ہیں' ایسے جوڑے عموماً ہم پلہ و ہم غلہ ہوتے ہیں، لیکن سب سے اچھا پوز وہ ہوتا ہے جس میں کسی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ دونوں کھڑے ہیں بیٹھے ہیں یا فضا میں معلق ہیں ——— اب رہے ایسے خواتین و حضرات جن کو لیڈری یا اداکاری کے جراثیم ورثے میں ملے ہوں' انھیں قد آدم، بلکہ قد آدم و حوا سائیز بہت بھاتا ہے، چنانچہ ایسی ہستیاں اکثر اسی مخصوص سائیز میں ڈھلی ڈھلائی نظر آتی ہیں البتہ ان کے اس جہانِ فانی سے کوچ کر جانے کے بعد ان کی مغفرت اور آئندہ نسلوں کی عبرت کے لیے قد آدم سائیز کو دیوارگیر سائیز میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ دیوارگیر سائیز کے بارے میں عموماً یہ بات مشہور ہے کہ یہ بحر سے خارج ہونے کے باوجود اس قدر باوزن ہوتا ہے اس کی وجہ سے دیوار کے ارکان بحر سے خارج ہونے لگتے ہیں اور اگر اس کی اصلاح بروقت نہ کی گئی تو پوری دیوار کسی بڑے شاعر کی پھسپھسی غزل کی طرح بیٹھ جاتی ہے جس کی زد میں آنے والا قسمت اچھی ہوئی تو بچ سکتا ہے لیکن بدقسمتی سے اگر تصویر کی زد میں آجائے پانی نہیں مانگتا بلکہ راست جام شہادت نوش فرماتا ہے گویا مرحومین کی دیوارگیر تصاویر پر یہ مصرع پوری طرح صادق آتا ہے
ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔

تصویر کھینچنا تو خیر آرٹ ہے ہی لیکن تصویر کھنچوانا اس سے بھی بڑا آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مرد، عورتوں سے بازی نہیں لے جا سکتا ویسے بھی ہر مرد پیدائشی آرٹسٹ نہیں ہوتا جبکہ ہر عورت پیدائشی آرٹسٹ ہوتی ہے چنانچہ کیمرے کے روبرو پہنچ کر کر دو عورت بھی شیرنی بن جاتی ہے اور ایسے ایسے پوز دیتی ہے کہ اچھے اچھے صاحب سمجھ مرد جن کی سمجھ شادی کے بعد رخصت ہو جاتی ہے اور جو صرف نام کے صاحب رہ جاتے ہیں، تصویر اور حقیقت کے فرق کو یکسر نظر انداز کر کے تصویر والی کے فراق میں میر و غالب سے جوش و فراق تک سب کے دیوان' دیوانہ وار آنسوؤں سے دھونے کی کوشش کرتے ہیں اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتے جب تک کہ تصویر والی شیرنی کو اپنے گھر نہیں لے آتے اور پھر ایک مکاربلی کو شیرنی سمجھنے کی پاداش میں زندگی بھر کسی چوہے کی طرح سہمے سہمے اپنی بل میں بلبلاتے رہ جاتے ہیں۔ ہماری تحقیق عمیق کے مطابق ہر صحیح الدماغ آدمی زندگی میں کم از کم تین عدد غلطیاں ضرور کرتا ہے پہلی غلطی شادی کی صورت میں دوسری اولاد کی شکل میں اور تیسری تصویروں کے روپ میں بلکہ حماقت میں۔

آخر الذکر غلطی کا مقصد شاید یہ ہو کہ وہ اپنی آیندہ نسلوں کو ان غلطیوں سے باز رکھنا چاہتا ہو کم از کم ہم نے تو یہ غلطی اسی مقصد کے تحت کی ہے اور جب جب اس غلطی کا خمیازہ تصویری روپ میں ہمارے ہاتھوں میں آیا، اپنی جگہ کسی دائم المریض کے بگڑے ہوئے چوکھٹے کو دیکھ کر آنکھوں میں بے اختیار آنسو اور زبان پر بے ساختہ یہ شعر آیا ہے ؎

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنھیں تصویر بنا آتی ہے

سرپٹ حیدرآبادی

قطعات

سرپٹ ہے میرا نام، رواں اور دواں ہوں میں
ہونا کہاں تھا آج مجھے، اب کہاں ہوں میں
معراج ہے یہ عشق کی اور فیض حسن کا
چوراسی سال کا ہوں اگر نوجواں ہوں میں

اپنے سوا، کسی کو بھی میں مانتا نہیں
ٹکر کا میری، اور کوئی سرپھرا نہیں
فریاد کر رہا ہوں میں گھبرا کے ہجر سے
کمسن ہوں، عاشقی کا مجھے تجربا نہیں

ہو کے بے قابو، وہ قبضے سے نکل جاتی ہے
چکنی صورت پہ طبیعت جو پھسل جاتی ہے
رہتا ہوں اس کے تصور میں شب و روز مگن
دل بھی لگتا ہے، طبیعت بھی بہل جاتی ہے

کم نظر آتا ہے مجھ سا نظر آنے والا
غم و اندوہ میں بھی ہنسنے ہنسانے والا
میں ہوں بے مثل، ملے گا نہ کہیں میرا جواب
اپنے کرتوتوں سے گت اپنی بنانے والا

مجھ کو تو ہوتا ہے غم اپنے کو بڈھا دیکھ کر
خوش مگر ہوتی ہیں امی مجھ کو بچا دیکھ کر
سیکڑوں پیچھے تھے لیکن ان کی تھی مجھ پر نظر
چھچھوں کی جھرمٹ میں مجھ کو خاص چھچا دیکھ کر

مختار یوسفی
(مالیگاؤں)

دستورِ قدیم

جس نے کی محنت اُسے رستہ دکھایا جائے گا
مفت میں مرغِ مسلّم مولوی کھا جائے گا

وصل وصیّا اس سراپا ناز کا شیوا نہیں
کیا خبر تھی مجھ کو دھوکے سے بلایا جائے گا

چیئرمین کے ہیں وہ رشتے دار یہ بھی سوچ لو
اُن کو نوٹس دینے والا خود نکالا جائے گا

وڈیو بینی پہ بچّوں کو کرے گا سرزنش
آخری شو میں مگر چپکے سے بوڑھا جائے گا

مولوی صاحب کے گھر کا ہے یہ دستورِ قدیم
ہو اکیلے کی جو دعوت پورا کنبہ جائے گا

داد بڑھ بڑھ کر مجھے دینے پہ وہ مجبور ہے
ورنہ اُس کے چائے پانی کا سہارا جائے گا

ایک گھنٹے تک مسلسل مشق کر کے آیا ہے
آئے گا جس وقت مائک پر تو گھبرا جائے گا

شعراء جسے کہتا ہے مختار اس سے کیا غرض
گا کے پڑھتا ہے تو محفل میں بلایا جائے گا

آپ مجھے حکومت کا ایجنٹ کہیں یا غدار لیکن بخدا میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہماری حکومت نے عوام کے لیے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں وہ پچھلی کسی بھی حکومت نے نہیں کیے۔ جدھر دیکھیے یہی شکایت کہ سڑکیں بہت خراب ہوگئیں۔ سڑکوں کی خرابی کے بارے میں لیڈر اپنے جلسوں میں حکومت پر لعنت ملامت کررہے ہیں اے تنقید کرنے والو! اس بات کی گہرائی میں جاکر دیکھو کہ آخر اس کے پیچھے حکومت کا مقصد کیا ہے۔ کیا آپ نے یہ شعر نہیں سنا؟

رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد
سرخرو ہوتا ہے انساں ٹھوکریں کھانے کے بعد

میں یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ حیدرآباد کا ہر پیدل چلنے والا شخص "سرخ رو" ہورہا ہے۔ اگر ہماری حکومت ان ٹھوکر لوانا اونچی نیچی سڑکوں کی مرمت کرادیتی تو نہ ہم ٹھوکریں کھاتے اور نہ سرخ رو ہوتے۔ حکومت پر کیچڑ اچھالنے
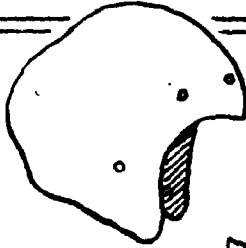
والو! کیا یہ ہماری حکومت کا کارنامہ نہیں کہ وہ پوری قوم کو سرخروئی سے نواز رہی ہے۔ اب رہی سڑکوں کو درست کرانے والی بات۔ تو بھیا ابھی ۳۵ فی صد لوگوں کا سرخرو ہونا باقی ہے۔ پتہ نہیں یہ لوگ سرخرو ہونے میں کیوں دیر لگا رہے ہیں۔ بس اب پوری قوم کے سرخرو ہونے کا انتظار ہے پھر دیکھیے حکومت جنگی بنیادوں پر سڑکوں کو کس طرح درست کروائے گی۔ ٹھوکریں کھا کر تو سب سرخرو ہوتے جارہے ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ کئی سال سے مہنگائی اور معاشی پریشانیوں کی چکی میں پسنے والی جنتا حنا کی طرح کب رنگ لاتی ہے۔

ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ حکومت نے کس قدر دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے کئی سال پہلے ہلمٹ پہننے کو قانوناً ضروری قرار دیا۔ گویا حکومت کو اس بات کا پورا پورا اندازہ تھا کہ آج ہماری سڑکوں کا یہ حال ہونے والا ہے۔ آج کل نہ موٹر سے اسکوٹر ٹکراتی ہے اور نہ کوئی گاڑی دوسری گاڑی سے بلکہ گہرے گڑھے کھدی ہوئی نالیاں اور بغیر ڈھکی والے ہول زیادہ تر ایکسیڈنٹ کا باعث ہیں۔ اب ایسے میں ہلمٹ نہ ہو تو گرنے والوں کے سروں پر

چوٹ آئے گی اور آپ تو جانتے ہیں کہ سر کی چوٹ موت کا پیغام لاتی ہے۔

بغیر ہلمٹ سکوٹر اور موٹر سیکل چلانے والوں کا چالان کیا جا رہا تھا۔ ایک بحث کرنے والے اسکوٹر راں سے پولیس کے جمعدار نے کہا کہ دیکھیے صاحب ہلمٹ پہننے میں آپ ہی کی بھلائی ہے۔ ہلمٹ نہ ہو تو ایکسیڈنٹ میں سر پر چوٹ لگے گی اور اس سے آپ کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ چالان کی چھٹی لیتے ہوئے اسکوٹر راں نے کہا جمعدار صاحب! کئی حادثوں میں تو ہلمٹ پہنا ہوا آدمی بھی اللہ کو پیارا ہو گیا" ــــــ جمعدار نے فوری بات کو کاٹ کر کہا پھر تو وہ IS I مارکہ ہلمٹ نہیں ہو گی۔ اسی لیے تو ہم انھیں بھی چالان کر رہے ہیں جن کی ہلمٹ پر IS I مارکہ لیبل نہیں ہوتا ــــــ "آپ IS I مارکہ لیبل کی بات کر رہے ہیں۔ اسکوٹر راں نے کہا وہ تو دو روپیوں میں مل جاتا ہے جمعدار نے حیرت سے کہا پھر لگا کیوں نہیں لیتے صاحب اس سے جان تو بچ جائے گی" اسکوٹر راں نے اسکوٹر اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "جمعدار صاحب جب IS I لیبل سے جان بچتی ہے تو ہلمٹ کی بجائے اس کو ہم اپنے سر پر لگائیں گے"۔

بھائی صاحب اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ ہلمٹ نے تو قومی یک جہتی کا ایک سماں باندھ دیا ہے۔ ہلمٹ پہنے ہوئے لوگوں میں یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں ہندو کون ہے مسلمان کون اور عیسائی کون۔ دیکھا اسی کو قومی یک جہتی کہتے ہیں۔ ہلمٹ نے وہ کام کر دکھایا جس کو بڑے بڑے لیڈر نہ کر سکے۔ ہلمٹ پہنے ہوئے لوگوں کا منظر دیکھ کر مزاح نگار حبیب ضیا نے کیا خوب کہا:

شودر ہو یا ہووے نائی ہندو مسلم اور عیسائی
سر پر ہلمٹ جب ہوتی ہے لگتے ہیں سب بھائی بھائی

یہی نہیں ہلمٹ کے اور بھی فائدے ہیں۔ لونا موپیڈ چلانے والوں کے لیے ہلمٹ کی پابندی نہیں ہے لیکن میں نے دیکھا کہ ایک صاحب لونا پر ہلمٹ پہنے چلے جا رہے ہیں۔ مجھے تشویش ہوئی کہ شاید لونا چلانے والوں پر بھی ہلمٹ کی پابندی لگ گئی ہے۔ میں نے اپنی لونا کی رفتار کو تیز کیا اور قریب پہنچ کر دیکھا تو وہ میرے پرانے دوست نکلے۔ میں نے پوچھا میاں یہ لونا پر ہلمٹ کیسی؟ کہیں قانون تو نہیں بدل گیا؟ وہ بولے قرض خواہوں سے بچنے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔ ہلمٹ میں وہ مجھے نہیں پہچان سکتے اور میں اطمینان سے ان کے سامنے سے گزر جاتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرے چند ایسے بھی دوست ہیں جو مجھے روک کر فضول باتوں میں میرا وقت اور کام خراب کیا کرتے تھے۔ ہلمٹ نے مجھے ان سے بھی نجات دلائی۔ پھر بولے بھائی لونا پر بیٹھنے والے بھی تو حادثوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ احتیاطاً ہلمٹ پہن لینے میں حرج ہی کیا ہے۔

پتہ نہیں ہماری حکومت نے ہلمٹ کا لزوم اسکوٹر اور موٹر سیکلوں پر بیٹھنے والوں کی حد تک کیوں محدود رکھا۔ اب دیکھیے نا لاٹھی چارج میں نوے فیصد لوگوں کے سروں پر چوٹیں لگتی ہیں۔ ان کے سروں کو بچانا بھی تو حکومت کا فرض ہے لہٰذا حکومت یہ قانون بھی پاس کر لے کہ آئندہ ان ہی انجمنوں کو ہڑتال کی اجازت دی جائے گی جن کے ہڑتالیوں کے پاس ہلمٹ ہو۔ بلکہ ہمارا تو یہ مشورہ ہے کہ حکومت خود ہلمٹ خریدے اور ہڑتال کرنے والی انجمنوں کو کرائے پر دے۔

پندرہ بیس ہڑتالوں میں ہلمٹ کی قیمت نکل آئے گی اور پھر اس کے بعد ہونے والی تمام ہڑتالوں کی آمدنی خالص منافع ہوگی۔ حکومت کے خسارہ میں کچھ تو کمی ہوگی۔ ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ لاٹھی چارج ہلمٹ پر نہیں ہوگا۔ اگر ہوگی بھی تو لاٹھی ہلمٹ کو تھا کرے گی۔ اس طرح ہمارے ہڑتالی عوام سر کی چوٹوں سے بھی بچیں گے اور موت سے بھی۔ بغیر ہلمٹ ہڑتال میں شریک ہونے والوں کا چالان بھی ہو سکتا ہے اور جرمانوں سے کثیر رقم جمع ہو سکتی ہے اور اس رقم کو چاول کی سبسیڈی میں جمع کر کے غریبوں کو ڈیڑھ روپیہ کیلو چاول دیا جا سکتا ہے۔ اخباروں میں اکثر خبر چھپتی ہے کہ پولیس ناکہ میں تفتیش کے دوران ملزم فوت ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے ملزم کے سر پر چوٹیں آتی ہوں گی۔ پولیس کو ہمارا مشورہ ہے کہ ملزم کو ہلمٹ پہنا کر تفتیش کریں تو پھر یہ بدنامیاں نہیں ہوں گی۔ پچھلے دنوں دیکھا گیا کہ اسمبلی میں ہمارے ہر دل عزیز ایم ایل اے حضرات نے چپل جوتے لکڑی اور مائیکروفون کا آزادانہ استعمال کیا۔ قوم کے منتخبہ اتنے قیمتی سروں پر چوٹیں! یہ ہم کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم ہماری حکومت سے پر زور اپیل کرتے ہیں کہ ایم ایل اے چاہے کسی پارٹی کا ہو، چاہے کسی بھی رنگ کا اور سٹائل کا لباس پہنے، وہ ہلمٹ ضرور پہنے اور چاہے تو اپنے لباس کے رنگ والی ہلمٹ پہنے بلکہ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہی شخص الکشن میں کھڑا ہو جس کے پاس ہلمٹ ہو۔ وہ اپنے الکشن کے جلسوں کو ہلمٹ پہن کر مخاطب کرے۔ دیکھیے اس میں بھی سر کو بچانے کی مصلحت ہے۔ ہر منتخب ہونے والا شخص اسمبلی میں ہلمٹ پہن کر داخل ہو۔ کیا پتہ کب فضا بگڑ جائے؟

رشید عبدالسمیع جلیل
(حیدرآباد)

O

حریرہ پی کے لکھی ہے غزل ہم نے بڑے بھائی
تبھی تو اس میں ٹپکی ہے ظرافت کی یہ چکنائی
'شگوفہ' کے ایڈیٹر نے غزل شاعر سے جب مانگی
زمیں شعروں تلے نکلی ردیف اڑتی نظر آئی
ادب کا ذوق قائم ہے نہ شعری ارتقا جاری
گزشتہ چند برسوں سے نحوست سر پہ ہے چھائی
دماغی الجھنوں سے ہم حقیقت میں پریشاں ہیں
ذرا کچھ سوچنا چاہا تو آفس میں بھی نیند آئی
ہمیں گم سم سمجھتے ہیں اگر احباب تو سمجھیں
کبھی منہ کھول دیں اپنا تو خلل ہو تماشائی
ترنم ہم بھی سیکھیں گے ترنم باز شاعر سے
بہت سوں کو شکایت ہے غزل اب تک نہیں گائی
غزل کہتے ہیں ہم لیکن غزل پڑھنا نہیں آتا
بنا سکتے نہیں اپنا لب و لہجہ ذرا مائی
کوئی مصرعہ کھٹکتا ہے کہیں کچھ حرف دیتا ہے
وہی اصلاح کی سوچے ہو پیشہ جس کا آبائی
عذاب قبر بھی شاید جلیل ایسا نہیں ہوتا
سزا جیسی کہ ترپن دل کی این جی اوز نے پائی

ولی قادری انجینئر
(حیدرآباد)

O

بھروسہ کیا ہے اپنی نوکری کا
ارادہ کیجیے چمچہ گری کا
کیے وہ کارنامے جب بھر کے
لقب ہم کو ملا بد ماشری کا
میں بولوں آم وہ کہتا ہے املی
ملا بڈھا ہمیں بھی کر کری کا
نہ بچوں کی پڑھائی کی ہے فکر اب
نہ کرتا ہے ٹھکا نہ چھوکری کا
وہ چکر میں الکشن کی پڑا ہے
ہوا ہے شوق اس کو لیڈری کا
کسی کی ماننے والا نہیں ہے
بہت چالو ہے الٹی کھوپڑی کا
ادھر کھانے کو کھانا بھی نہیں ہے
یہ عالم ہو گیا ہے مفلسی کا
ادارہ ہے اقلیت کا صاحب
نہ ہو کیوں داخلہ ہم کو فری کا
فرشتوں کے معلم کے ہیں چیلے
کریں دعویٰ نہ کیوں پیغمبری کا
ولایت ہے نہیں تو اور کیا ہے
جو چرچا ہے ولی کی شاعری کا

ڈاکٹر حبیب ضیاء
(حیدرآباد)

ہوائی جہاز کا سفر

ہوائی جہاز کے مسافروں کی فطرت کا تجزیہ کرنے کے لیے ہم نے کئی بار ہوائی جہاز کا سفر کیا ہے۔ اور ہر دفعہ نت نئی باتوں کا انکشاف ہوا۔ اکثر حضرات ایر ہوسٹس کو ایک سے زاید بار بلانے کے مختلف بہانے تراشتے ہیں۔ جیسے درد سر کے بہانے کافی منگوانا یا فرضی جاڑے میں مبتلا ہوکر بلانکٹ تکیے کی فرمایش کرنا۔ یہ ایر ہوسٹس بڑی خوش اخلاق ہوتی ہیں۔ کبھی ان کی پیشانی پر بل نظر نہ آئے گا۔ خندہ پیشانی سے پیش آنا ان کا ایمان ہوتا ہے۔ ان کی خانگی زندگی کتنی ہی پریشان کن کیوں نہ ہو وہ ہمیشہ مسکراتی ہی رہتی ہیں۔

ایک دفعہ ہم نے ایک ایسے صاحب کا انٹرویو لیا جو ایر ہوسٹس کی مسکراہٹوں سے اپنی جھولی بھر رہے تھے۔ وہ انھیں بار بار بلا رہے تھے۔ انھوں   سال میں چار بار ہوائی جہاز کا سفر کرتے ہیں۔ وجہ یہ بتائی کہ اپنی بدمزاج بیوی کو درست کرنے اور جلانے کے لیے کسی وقت غلطی سے انھوں نے ایر ہوسٹس کی مسکراہٹ کا حوالہ دے دیا بس پھر کیا تھا........ گھر میں مہابھارت چھڑ گئی ـــــ بیوی کی بدمزاجی تو دور نہیں ہوئی۔ انتقامی سفر کی وجہ سے گھر کا بجٹ ضرور متاثر ہوا۔ ہر سواری کے کچھ آداب، کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ہم نے دیکھا، ہوائی جہاز کے بے حساب اصول ہوتے ہوئے بھی کوئی ان کی پابندی نہیں کرتا ـــــ سیٹ بلٹس کا استعمال لازمی ہوتا ہے چنانچہ ماں باپ خود کو سیٹ سے باندھ کر بچوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ کلٹی بچے کبھی ایر ہوسٹس کو دھکا مار کر چائے چھلکاتے ہیں تو کبھی بازو بیٹھے مسافر کا سفر حرام کر دیتے ہیں۔ کچھ نہیں تو آنکھ مچولی کھیلنے کا پروگرام بنا بیٹھتے ہیں۔ شاید ایسے ہی بچوں کے لیے کسی ایر ہوسٹس نے تنگ آکر کہا تھا۔ " کھیلنا ہے تو کھیلو نہیں تو باہر چلے جاؤ۔

ہوائی جہاز میں ہر سیٹ کے بازو ایک انچ کا چھوٹا سا خانہ ہوتا ہے۔ ڈھکن کو دبانے پر خانہ کھل جاتا ہے۔ عموماً اس میں چاکلیٹ کے کاغذ سگریٹ کی راکھ یا ایسی ہی چھوٹی موٹی چیزیں ڈالی جاتی ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے بازو بیٹھی ہوئی ایک خاتون نے کھانا کھانے کے بعد پورے اہتمام سے لوازمات کے ساتھ پان کھایا۔ اس کے بعد بے دھڑک انھوں نے اس معصوم چھوٹے سے خانے کو بطور اگالدان استعمال کیا۔ ہمیں بڑا تعجب ہوا، بلکہ ان کی حاضر دماغی سے خوشی بھی ہوئی۔ ان کی جگہ کوئی دوسری خاتون ہوتیں تو بلاوجہ گھنٹی بجاتیں اور اگالدان منگواتیں۔

بہت سے لوگ ہوائی جہاز کے سفر سے ڈرتے ہیں۔ ہوائی جہاز جیسے ہی زمین کو چھوڑ کر آسمان کی بلندیوں کی طرف بڑھتا ہے، ان کی توجہ ہٹانے کے لیے ایک اعلان ہوتا ہے کہ ایمرجنسی کی صورت میں ہر سیٹ کے اوپر خانوں میں

گی آکسیجن کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اس اعلان کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ طریقہ استعمال بتانے والی ایر ہوسٹس کی ہوتی ہے
وہ بہت ہی دلنشین انداز میں ایکٹنگ کر کے بتاتی ہے کہ خطرہ کی حالت میں کیا کرنا چاہیئے۔ ایمرجنسی کا ذکر سن کر لوگ
پریشان ہونا ہی چاہتے ہیں کہ خوب صورت کشتیوں میں چاکلیٹ، سونف اور روئی کے پیکٹ لیے حور اور غلمان آجاتے ہیں۔
مسافر ایک چاکلیٹ منہ میں اور دو تین جیب میں ڈال کر سونف گھونٹتے ہیں اتنے میں کھانا کھلانے کی تیاریاں شروع
ہو جاتی ہیں۔ کھانا پہنچنے تک لوگ خوشبو سے دل بہلاتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کرنے والے گھرانوں میں بچے جس طرح کم جگہ میں دبکے، سوتے نظر آتے ہیں اسی
طرح ہوائی جہاز میں بھی چھوٹی سے کشتی میں کئی لوازمات سر جوڑے، مسافروں کے سامنے آتے ہیں۔ دوپہری کا غذوں
میں ہر چیز نفاست سے بند رہتی ہے جو مسافروں کی رفتار کھانے میں تیز ہوتی ہے وہ ایک ہی آن میں تمام چیزوں پر
سے کاغذ نکال کر کھانا شروع کر دیتے ہیں بلکہ جلد سے جلد کھا کر بازو بیٹھے مسافر کے طور طریق پر نظریں گاڑ دیتے ہیں۔
کھانے کے نہ صرف برتن پلاسٹک کے ہوتے ہیں بلکہ چمچے، کانٹے اور چھریاں بھی نفیس پلاسٹک سے بنی ہوتی ہیں
ہم ایک عرصہ تک یہی سمجھتے تھے کہ آئس کریم کے چمچوں کی طرح ہوائی جہاز میں سامنے آنے والے چمچوں کو گھر لایا جا سکتا ہے۔
پتہ نہیں کیوں یہ چمچے ہی کچھ ایسے ہوتے ہیں کہ بے اختیار طبیعت چاہتی ہے کہ انھیں پرس میں رکھ لیں۔ کئی برس ہمارا یہی
شغل رہا۔ لیکن بعد میں ہم نے غور کیا کہ یہ حرکت ناپسندیدہ ہے۔ اب ہم صرف اچار کی خوب صورت پیک کی ہوتی ڈبی گھر لاتے
ہیں۔ دو چار دن دیکھ دیکھ کر خوش ہونے کے بعد نوکرانی کو دے دیتے ہیں۔
ہم یہ بتانا بھول گئے کہ کھانے کی چھوٹی سی کشتی میں چائے کی پیالی اور دو چھوٹے پیکٹ ہوتے ہیں۔ ایک پر Salt
دوسرے پر Sugar لکھا ہوتا ہے۔ ہم نے Sugar والا پیکٹ ہاتھ میں لیا۔ شکر اتنی کم تھی کہ نمک کا گمان ہو رہا تھا۔ ہم نے ایک
میٹھے چہرے والی لڑکی کو بلا کر پوچھا۔

تم تو کہتی ہو کہ پیکٹ میں شکر ہے
کہاں ہے کس طرف کو ہے کدھر ہے

اس نے ہمارے ہاتھ سے شکر کا پیکٹ لے لیا، کھول کر ہلکے رنگ والی چائے میں جھٹک کر کہنے لگی، یہی شکر
ہے ابھی دیکھ کر پیتے جاییئے چائے پھیکی نہ لگے گی۔ اس دن کو ہم بھول نہیں سکتے کیوں کہ اس دن ہم نے ہوائی جہاز کا
پہلا سفر کیا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ کھانا ختم ہوتے ہی ایک دم چہل پہل شروع ہو گئی۔ آداب جہاز کو بالائے طاق رکھ کر لوگ
تیز رفتاری سے اپنی سیٹوں سے اٹھنے لگے۔ ہم نے دل میں کہا یقیناً انھیں کھانے سے کچھ INFECTION ہو گیا
ہے۔ تب ہی یہ ٹائیلٹ کے آگے لائن لگا رہے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ لوگ ڈالر لے کر بیرونی ممالک کی نایاب اشیاء
جیسے شراب، سگریٹ، سینٹ وغیرہ خریدنے کے لیے ٹوٹ پڑ رہے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں دو شراب کی بوتلیں ضرور
تھیں۔ پینے کے لیے اتنے بے چین تھے گویا زندگی کا آخری جام ہو۔ شراب کی بوتلیں خرید کر خوش ذوق لوگ وہیں پی
کر بہکنے لگے اور بعض بہکنے کے ڈر سے پینے کے بدلے شراب کو بریف کیس میں چھپا کر مگن بیٹھ گئے۔ بیرون ملک جانے
والے مسافروں کو ہوائی جہاز میں ایک چھوٹے سے فارم کی خانہ پری کرنی ہوتی ہے۔ یہ فارم ہندی اور انگریزی میں

ہوتا ہے۔ جن کے پاس قلم ہوتا ہے وہ جھٹ پٹ لکھ لیتے ہیں اور جن کے پاس قلم نہیں ہوتا یا یوں کہیے کہ جو اہل قلم نہیں ہوتے وہ آگے پیچھے، دائیں بائیں دیکھ کر فارم اور ضرورت ہو تو پاسپورٹ تھما دیتے ہیں۔ بعض صورتوں میں ایرپورٹ پر بھی فارم دیا جاتا ہے جسے مکمل کر کے واپس کرنا ہوتا ہے دو چار لوگوں کی درخواست پر ہم نے اُن کے فارم بھر کر دے دیئے۔ اس کے بعد ایک لڑکا اپنا فارم لے آیا اور ساتھ ہی اُس نے پانچ کا نوٹ تھما دیا۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ لوگ اس قسم کے فارم بھر کر ایرپورٹ پر بھی پیسے بنا لیتے ہیں۔

ہوائی جہاز پر گفتگو کا آغاز ایرپورٹ سے ہونا چاہیئے تھا۔ چند برس قبل تک بھی ایرپورٹ کا جو تصور ہوتا تھا اس میں اب نمایاں تبدیلی آگئی ہے یہاں ہوائی جہاز میں بیٹھنے والے کم اور الوداع کہنے والے زیادہ آتے ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے ایرپورٹ اور صفائی اب دو متضاد باتیں لگتی ہیں۔ ایک طرف کھانے پینے کی چیزوں کا کچرا اور پھول کی پتیاں اور ٹوکریاں جا بجا بکھری پڑی رہتی ہیں۔ ہوائی جہاز کے ہر مسافر کا اپنا کیمرہ مین ہوتا ہے جو اُسے پھولوں کے ہار اتارنے نہیں دیتا۔ بعض مسافر ایسے ہوتے ہیں جو فرمایش کر کے یا خود پیسے دے کر پھول کے ہار منگواتے ہیں اور دوسروں کے ہاتھوں سے پہنتے ہیں۔

ویسے ہر روز پھولوں سے لدے کئی "بے جوڑ جوڑے" ایرپورٹ پر طوفان بدتمیزی مچاتے ہوئے ہوائی جہاز پر دھاوا بولتے ہیں۔ ہم ہوائی جہاز میں انھیں دیکھ کر خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ کم از کم انھیں ہندوستانی لڑکیوں اور ان کے ماں باپ کا تو خیال ہے۔ یہ غیرت دار بھی خود بکنے کے بجائے کچھ خریدنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ••

پاگل عادل آبادی

(۰)

تھے تو پہلے بہت بندوق چلانے والے
رہ گئے اب تو فقط ڈھول بجانے والے

خود کو بتلاتے ہیں گاما کے گھرانے والے
ڈر سے جورو کے گر مونچھ منڈانے والے

اب یہ عالم ہے پٹاخے سے بھی ڈر جاتے ہیں
اُن کے باوا تھے کبھی توپ چلانے والے

ہنہنانے وہ لگے باندھ کے سر پہ سہرا
بانجھ مرغی کی طرح شور مچانے والے

کھول کر بیٹھے ہیں جوتوں کی دکانیں وہ بھی
جوتیاں مندر و مسجد سے چُرانے والے

تجھ کو مالک کسی حجّام کے پلّے باندھے
اپنی سینڈل سے میری تالو کھجانے والے

اپنی مرغی کے بھی نخروں پہ ذرا ڈال نظر
میرے مرغے پہ ہی الزام لگانے والے

نہ ادا کار ہیں کوئی نہ اداکاری ہے
نام پر فن کے ہیں کولھوں کو ہلانے والے

کیوں مخالف ہیں بڑھاپے میں وہ نس بندی کے
اپنی نس بندی جوانی میں کرانے والے

کر رہے ہیں وہی اُبلے ہوئے انڈوں سے پرہیز
مرغیاں اپنے محلّے کی چرانے والے

وہ بھی کرتے ہیں طلب آج جہیز میں موٹر
پنکچراں بیٹھ کے سڑکوں پہ بنانے والے

سُن کے پاگل کا ترنّم یہ کہا رات ڈھلے
آ گئے لیجیے سحری کو جگانے والے

(۰)

میرا دشمن تو مقدّر کا سکندر نکلا
کیا کروں میں کہ مرا لک ہی پھٹیچر نکلا

وہ جواں ہو کے تو صورت کا چھچھوندر نکلا
اور شریر اتنا کہ شیطان کا فادر نکلا

آج تک لفٹ کسی ماہ جبیں نے نہ دیا
مجھ سے روٹھا ہوا خود میرا مقدّر نکلا

بھاگ چلنے کو مرے ساتھ وہ نکلے جوں ہی
ہاتھ میں ڈنڈا لیے ان کا برادر نکلا

بارہیں پی کے لگایا تھا میں تھپیڑ جس کو
کیا کروں میری منگیتر کا وہ فادر نکلا

دیکھا پنڈت نے مہورت جو مری شادی کا
ہیا ڈلک دیکھیے اکتیس نومبر نکلا

سُوٹ اور بوٹ میں رہتا تھا ہمیشہ ہی سراج
اب الکشن کے دنوں پہن کے کھدّر نکلا

سراج نرملی

حلیمہ فردوس
(بنگلور)

گاڈ پر ایمان لانے کے بعد گائیڈ کی حقیقت آپ پر خود بخود واضح ہو جاتی ہے۔ گائیڈ ولی اور شیطان دونوں حیثیتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ ایک نیکی کا راستہ بتاتا ہے تو دوسرا بدی کی طرف لے جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے ابنِ آدم کو دو گائیڈوں کو حوالے کر کے عجیب آزمائش میں مبتلا کیا۔ معلومات میں اضافے کی نیت سے آپ کو یہ بتا دوں کہ ہابیل اور قابیل جینے کے سلیقے سے واقف نہ تھے لیکن ایک کوّے نے انھیں مرنے کا سلیقہ سکھایا۔ اگر خدائے تعالیٰ نے کوّے کو گائیڈ بنا کر نہ بھیجا ہوتا تو فضائی آلودگی کا مسئلہ ہزاروں سال پہلے ہی پیدا ہو جاتا۔

گائیڈ جان دار بھی ہوتے ہیں اور بے جان بھی۔ اگر بے جان گائیڈ سے آپ متعارف ہونا چاہتے ہیں تو کسی کتب فروش کے پاس جائیے کیوں کہ وہ اس کی حقیقت خوب جانتا ہے۔ اس کی دکان نصابی کتابوں سے زیادہ مختلف مضامین کے گائیڈس سے پر ملے گی۔ اسکولوں میں معصوم بچے کتابوں کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اس قدر تھک جاتے ہیں کہ کالج کی آزاد فضا میں پڑھنے میں ان کا جی ہی نہیں لگتا۔ کالج میں تو بس سال میں تین بار یعنی ایڈمیشن الکشن اور ایگزامنیشن کے وقت آباد نظر آتے ہیں۔ ایسے منجھے ہوئے طلبا کو لکچرس کے گائیڈنس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انھیں تو بس گائیڈ کا سہارا چاہیے جو امتحان ہال میں ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ پچھلے زمانے میں گائیڈ کے وجود کو معیوب سمجھا جاتا تھا آج کل بڑے بوڑھے بھی اس کے حامی بن گئے ہیں۔ تبھی تو وہ گائیڈ کے چکنے چکنے پات کو امتحان ہال میں بیٹھے ہوئے ہونہار سپوتوں تک پہنچانے میں عار نہیں سمجھتے اور پولس کی ڈنڈا خوری کو بھی برا نہیں سمجھتے۔ آج ہر طالبِ علم کی زبان پر بس یہی ہے کہ:

کیوں نہ گائیڈ کو ساتھ لے جائیں
گائیڈ پڑھنے کی بھی عادت نہ سہی

ہوا خوری تندرستی کے لیے ضروری ہے تو گائیڈ خوری موظف اساتذہ کے لیے نعمت ہے۔ یہ حضرات فرضی ناموں سے گائیڈ لکھ کر اپنے شوق کو پورا کرتے ہیں۔ اردو میں غالب اور اقبال

کے کلام کی ضخیم شرحیں لکھی گئیں لیکن انھیں چوری چھپے امتحان ہال میں لے جانے کی کسی میں ہمت نہیں۔ اردو کتابوں کی طرح اردو گائیڈ بھی خال خال ہی فروخت ہوتے ہیں۔ سننے میں آیا ہے کہ جب پبلشروں نے اس پر دھیان نہیں دیا تو اردو کے بہی خواہوں نے اردو اکاڈمیوں کے دفتر پر ہلہ بول دیا اور نعرے بازی شروع کر دی کہ "اردو گائیڈ شایع کرو ورنہ اکاڈمی بند کرو"۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ عوام کا پیسہ کم از کم رفاہ عام کے لیے تو خرچ ہو۔

یہی نہیں ادبی معموں کے حل کے لیے بھی گائیڈ دستیاب ہیں۔ حتیٰ کہ کئی حضرات اپنی ازدواجی زندگی شروع کرنے سے پہلے گائیڈ کا مطالعہ کرکے اپنی ازدواجی زندگی کو جنت بنانے کے خواہاں رہتے ہیں۔ ہمارا مشورہ ہے کہ اب معصوم شوہروں کو ان گائیڈوں سے زیادہ قانونی کتابوں کے مطالعے کی ضرورت ہے۔ آج کل میاں کی ذراسی نوک جھونک پر بیوی برہم ہو کر جہیز ایکٹ کے تحت انھیں قیدخانے میں جھونک سکتی ہے۔

آپ اپنی مشینی زندگی سے بیزار ہو کر سکون کے لیے سیر و تفریح پر نکل جائیے تو وہاں بھی گائیڈ آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ تاج محل کی سیر کیجیے یا گول گنبد کی تفریح۔ گائیڈ تو سائے کی طرح آپ کے پیچھے لگا رہے گا۔ حالانکہ انھیں دیکھ کر پنجرے کے طوطے اور جاپان کی گڑیا کا خیال آتا ہے۔ وہ اپنے معلومات کے خزانے کو اس تیزی کے ساتھ اگلتا چلا جاتا ہے کہ آپ کی آنکھیں اور دماغ دونوں بند ہونے لگتے ہیں اور اس وقت اپنی کم مائیگی کا احساس کچھ اور شدت اختیار کر جاتا ہے۔ سیاح کو گائیڈ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو اپنے تئیں معلومات حاصل کرتا ہے۔

ہم دنیا کے آٹھویں عجوبے کو تعجب سے دیکھ رہے تھے کہ وہاں ایک باریش بزرگ آن پہنچے۔ ہم نے مودبانہ عرض کیا کہ مولانا آپ کی نگاہ میں تاج محل کس خوبی کا حامل ہے۔ انھوں نے بڑی بے دلی سے جواب دیا گھر میں مرغی بھی ہو اسے دال برابر قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں تو اس سے بھی محروم ہوں۔ اب تاج کے بارے میں کیا بتاؤں۔ یہاں تو بس دو گنبد مسجدوں اور چار مزاروں کے علاوہ کوئی خوبی نہیں۔ ہم ان کے جواب پر دل کھول کر قہقہہ لگا رہے تھے کہ ایک گائیڈ مسافروں کی ٹولی لیے شاہجہانی عہد کی تاریخ اور محنت و مشقت کی اہمیت پر تقریر کرتا ہوا وہاں آپہنچا۔ اور شعر کے حوالے سے تاج محل کی حقیقت سمجھانی شروع کی۔

ایک شہنشاہ نے بنوا کے حسیں تاج محل
ہم غریبوں کو محنت کی نشانی دی ہے

ہم تاج کے بارے میں اس قدر تو جانتے تھے کہ کسی نے اسے محبت کی نشانی کہا تو کسی نے اسے محبت کا مذاق قرار دیا۔ گائیڈ کی اس نئی تفسیر پر ہم سر دھنتے رہ گئے۔ کیونکہ گائیڈ کا فرمایا ہوا مستند ہوتا ہے۔

گائیڈ کی اپنی اہمیت ہوتی ہے۔ چاہے وہ گائیڈ تاریخی مقامات کا ہو یا یونیورسٹی کے کسی شعبے کا ہو۔ تاریخی مقامات پر چلنے والے گائیڈ سے تو آپ صرف دو چار گھنٹوں یا دو چار منٹوں میں پیچھا چھڑا سکتے ہیں لیکن ڈاکٹر آف فلاسفی بننے کے لیے تین سال تک گائیڈ کے حلقے سے نکلنا دشوار ہوتا ہے۔ یہاں آپ کی قابلیت نہیں دیکھی جاتی اگرچہ کہ مسابقتی امتحان دینا ضروری ہے۔ اس کے لیے صرف گائیڈ کی سفارش ہی قابل قبول ہوتی ہے۔ آپ اس معینہ مدت میں کچھ لکھیں یا نہ لکھیں گائیڈ

کے گھر کا لائٹ کا بل اور بچوں کے اسکول کی فیس کا انتظام کردیں تو بس دیکھتے ہی دیکھتے ڈاکٹر بن جائیں گے ۔ یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ محقق کا کام گڑے مردے کھودنا ہے نقاد کا کام بال کی کھال نکالنا مگر جامعات میں ہونے والی تحقیق کے لیے اس کی ضرورت نہیں وہاں تو بس ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے" حیات، شخصیت اور کارنامے" کے تحت معروف اور غیر معروف مردہ و زندہ غرض کسی فنکار کو بھی منتخب کیا جاسکتا ہے لیکن حق انتخاب کا صرف اور صرف گائیڈ پر انحصار ہوتا ہے۔ پرانی تحقیق کے تحت اردو کا سلسلہ تو کشمیر سے کنیا کماری تک تھا پر اب انڈومان و نکوبار تک پھیل گیا ہے۔ ایسی ناگزیر صورت میں ریاستی و صوبہ جاتی ادب کی ہی تحقیق کیوں ہو جبکہ اب گلی کوچوں کی ادبی خدمات پر بھی تحقیق کی جاسکتی ہے ۔ تحقیق کے لیے چند موضوعات ملاحظہ ہوں :

(۱) حالی کی پیرانہ سالی اور ادبی سرگرمیاں ۔

(۲) اخلشام نگر کی ادبی خدمات (1950ء سے 1985ء تک)

(۳) مولانا آزاد کے صدسالہ تقریبات کا سیاسی اور ادبی مقصد

(۴) نور الایمان شخصیت اور کارنامے

(۵) رحمان بے رنگی کے تنقیدی نظریات

اس قسم کی تحقیق کے لیے اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کی ضرورت ہی نہیں - البتہ گائیڈ کے اشاروں پر ناچنا ضروری ہے۔ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ کاٹھ کے اُلّو سے گائیڈ کے ہاتھوں کٹھ پتلی بننا بھلا ہے ۔ پر یہ تماشا محققین اور ناقدین سے ایک آنکھ دیکھا نہ جائے گا۔ وہ بس گائیڈ کی پول کھولتے میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں یہ تحقیقی مقالے دھوبی کے کپڑوں کے انبار اور تحقیقی موضوعات معر بہ طرح کے مصداق نظر آتے ہیں ۔ نقادوں کو شکایت ہے کہ ان مقالوں میں کام کی باتوں کے سوا سب کچھ ہوتا ہے ۔ ہم نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ناقدین و محققین اول تو انھیں ہاتھ نہیں لگاتے اگر ہاتھ لگاتے بھی ہیں تو ان مقالوں کو الماریوں کے سب سے نچلے خانے میں رکھتے ہیں تاکہ جلد سے جلد انھیں کیڑے چاٹ کھائیں ۔

ہمارے ایک معتبر نقاد نے جہان ادارہ میں اعتراض کیا ہے کہ اس مرکب کو تیار کرنے میں ایسے اصحاب سے تبادلہ خیال کیا جاتا ہے جہاں سب کی اوپری منزل کرائے کے لیے خالی ہے ۔ اس اعتراض کی روشنی میں تو بس ہم یہی کہتے ہیں کہ ناقد وہ قاضی ہے جسے سارے شہر کی فکر رہتی ہے اور گائیڈ وہ ملّا ہے جسے اپنے حلوے مانڈے کا ہی خیال رہتا ہے ۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کو بھی گائیڈ کی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہوگا ۔

گائیڈ ہی کا پرتو ہے کہاں نہیں ہے ، جب گائیڈ ہی نہیں تو دونوں جہاں نہیں ہے۔ ●●

حفیظ خاں مذاق (حیدرآباد)

تجکو پوچھا کیا بن دنیا میں دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں
بانگاں دیتی مرغی دیکھوں، انڈے سیکتا مرغا دیکھوں

ارمانوں کی ڈولی پو میں مجبوری کا لاشا دیکھوں
سترہ سالہ دولن کا میں ستّر سالہ دولا دیکھوں

دیکھنے کی تو حد بھی گزر گئی اپنی سکّی آنکھوں سے میں
سپٹمبر کے مہینے میں جب گنڈی پیٹ کو پیاسا دیکھوں

سانس کی تبریو جا کو فوراً لھوّے کا پنجرہ ڈلوائیوں
جب سے اک مُردہ خانے میں مردے کو میں زندہ دیکھوں

کیا بتلاؤں حال بیا تھا مولانا کے بند کمرے کا
چاکنے کے دو خالی ڈوپتے سعیدی کا اک بدنا دیکھوں

میرے جیسے عاشق کاں ہیں آج کے یہ بے صبرے پوتے
چودہ برس تک اُن کے گھر کا دُور سے بس دروازہ دیکھوں

پتّر دلنگ کے پولس والے ناحق منیجے دال لئیں تا
میری غلطی اتنیچ تھی بس اُن کو رشوت لیتا دیکھوں

پُرسہ دینگے جا کو اُس کو ڈھونڈو کاں ہے مذاق بچارا
آج وہ شاعر بن گیا کیسے کل تک اچھا خاصہ دیکھوں

غالب ثانی (حیدرآباد)

اب تک جو ہم کو دوست ملے کیسہ بُر ملے
کیا کیا نہ جیب کاٹنے کے اُن کے گُر ملے

سیٹی بجائی مُنہ سے تو ہم آئے جال میں
صیّاد کے دو بول جو میٹھے مدھُر ملے

جب عصری حرب ضرب سے ہم آشنا ہوئے
جُوڈو کراٹے اور بھی کچھ ہم کو گُر ملے

ہم کو گرا گرا کے وہ کرتے رہے سلام
دنگل میں پہلوانوں کو کیا کیا نہ گُر ملے

کمپونڈر تھے اپنے وطن میں جو کل تلک
جدّہ پلٹ ہوئے تو بنے ڈاکٹر ملے

سالم رہیں گی شیخ کی کیسے طہارتیں
بدرو سے سارے راستے لب ریز دیر ملے

ملتے ہیں بھانت بھانت کے باریش با وقار
فل گیر، ہاف گیر، کچھ اہلِ بجگر ملے

ملنے لگی ہیں ناف سے نیچے بھی داڑھیاں
اَبرو سے آنکھ مونچھ سے رُخسار پُر ملے

اقرب جو لوگ ہیں تو وہ عقرب ہیں اصل میں
سینے ہمیشہ اُن کے تو کینے سے پُر ملے

رن میں حسینؑ کی طرف آئے نکل کے حُر
اب تک ہے آرزو کہ کہیں کوئی حُر ملے

تجھ کو ضرور غالبِ ثانی کہیں گے لوگ
جب ہر غزل میں لفظ معانی سے پُر ملے

یوسف نسیم

پروفیسر انور مسعود

(پاکستانی طنز و مزاح نگار)

انور مسعود اک نہایت ہی ہمہ جہت شخصیت کا نام ہے۔ آپ فارسی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں، پنجابی زبان کے بے حد مقبول و ممتاز شاعر ہیں جن کی پنجابی شاعری پر مبنی مجموعہ "میلہ اکھیاں دا" کے اب تک کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں اور جن احباب خوش مذاق تک یہ کتاب نہیں پہنچ سکی۔ وہ اس کے پبلشرز سے یہاں تک گزارش کرتے ہیں کہ انور مسعود کی فلاں فلاں نظم کی کم ازکم فوٹو کاپی ہی انھیں بھیج دیں۔ پنجابی زبان میں کہیں مشاعرہ ہو اور اس میں پروفیسر انور شریک نہ ہوں، ایسا ممکن ہی نہیں ہے۔ اکثر لوگ ان کی خاطر مشاعرہ میں شریک ہوتے ہیں۔ پاکستان میں چونکہ اُردو اور پنجابی عام طور پر اک بڑے حلقے میں یکساں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس لیے پنجابی زبان کے مشاعروں میں انور مسعود سے اردو تخلیقات اور اردو مشاعروں میں پنجابی تخلیقات بڑے شوق اور اصرار سے سُنی جاتی ہیں۔ ان کی مقبولیت کے پیش نظر دِلاور فگار نے کہا تھا کہ ؎

کھلاڑی انور مسعود جیسا مل نہیں سکتا
اگر یہ پچ پہ جم جائے تو کوئی ہل نہیں سکتا

فی الحال ہم اُن کی پنجابی شاعری سے اپنی محرومی کا ازالہ اُن کی اردو شاعری ہی سے کر سکتے ہیں۔ پروفیسر انور مسعود ذاتی طور پر نہایت خوش مذاق اور حاضر جواب ہیں اس لیے ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ وہ بات میں بات پیدا کرنے کا سلیقہ جانتے ہیں اور طنز و مزاح میں یہ سلیقہ ہی کام آتا ہے۔ اردو شاعری میں پروفیسر انور مسعود کے شعری مجموعہ "قطع کلامی" کی مقبولیت پنجابی مجموعے سے کچھ کم نہیں۔ ڈاکٹر نظیر صدیقی کے خیال میں مزاح نگار ہنستا ہے اور طنز نگار ڈستا ہے اور انور مسعود کہیں بھی افراد یا اداروں کو ڈستے نظر نہیں آتے بلکہ ان کی حماقت اور خباثت پر ہنستے ضرور دکھائی دیتے ہیں۔

انور مسعود استفادے کے معاملے میں قرآنی تلمیحات کو بھی نہیں چھوڑتے۔ اُن کا مشہور زمانہ قطعہ ہے ؎

قسم ہے گزرتے ہوئے وقت کی کہ انسان بے شک خسارے میں ہے
یہ ارشادِ باری، مجھے یوں لگا ہمارے بجٹ ہی کے بارے میں ہے

باری اور بارے کا لطف بھی اٹھائیے۔ مذہبی اصطلاحات سے استفادہ کرنا اُردو ادب میں بالکل اجنبی کبھی نہیں رہا۔ اقبالؔ تو اس کی بیّن مثال ہیں ہی۔ بعض مذہبی اصطلاحات یا تلمیحات طنز و مزاح کے لیے برتنا دو دھاری تلوار کی طرح ہے جو کبھی صاحبِ شمشیر کو بھی زخمی کر سکتا ہے مگر انور مسعود کی نیّت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان میں یہ روایت رہی ہے کہ ہر اخبار یا تو طنز و مزاح سے بھرپور کوئی کالم لکھتا ہے یا حالاتِ حاضرہ کے پس منظر میں کوئی طنزیہ قطعہ ضرور چھاپتا ہے۔ اس طرح صحافتی ادب سے دامن بچاکر اگر انور مسعود اپنے لیے کوئی راستہ نکالتے ہیں تو یہ بڑی کامیابی ہے۔ مزاح نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ انسانی صورتِ حال اور سیاسی پس منظر سے کوئی نکتہ اٹھاتا ہے اور اسے کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

ٹی وی کے اشتہارات سے جو بدمزگی پیدا ہوتی ہے وہ انور مسعود کی زبانی سنئے:

وقفہ گزرتا گیا کہ قیامت گزر گئی! — دس بیس تیس بار مجھے دیکھنے پڑے
ٹی۔وی پہ رات خیر ڈرامہ جو تھا، وہ تھا — لیکن جو اشتہار مجھے دیکھنے پڑے

"قطع کلامی" کے قطعات پڑھ کر محض ہنسی نہیں آتی بلکہ صورتِ حال کی سنگینی پر جو طنز انور مسعود نے کیا ہے اس پر ایک حساس دل تڑپ اٹھتا ہے اور یہی حربہ اک مزاح نگار کو کامیابی دلاتا ہے۔ سلیمان خطیب کی شاعری اس کی ایک اعلیٰ مثال ہے کہ دکنی زبان میں وہ ہنسا ہنسا کر رلاتے ہیں۔

انور مسعود کا طنز ملاحظہ فرمائیے:

جو چوٹ بھی لگی ہے وہ پہلی سے بڑھ کے ہے — ہر ضربِ کربناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا — بل اتنے مل گئے ہیں کہ میں بلبلا اٹھا

WATER & POWER DEPT. (ہمارے ہاں کے نل اور لائٹ کے محکموں کی طرح) پہ طنز دیکھئے:

ہر ایک عہد میں زندہ ہے میر کا مصرع — کسی سے جس کی صداقت ڈھکی چھپی نہ رہی
نظام برق لیا "واپڈا" نے ہاتھوں میں — "پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی"

خاندانی منصوبہ بندی کے موضوع کو انشار کے مصرع سے جوڑ کر کیا لطف پیدا کیا ہے:

کل اک بچوں کی مجلس میں کہا اک شوخ بچے نے — ہماری تاک میں دشمن بڑے ہوشیار بیٹھے ہیں
عزیزو، ساتھیو، منصوبہ بندی کے زمانے میں — "غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں"

تمام تر بلاغتوں اور فنی رچاؤ کے ساتھ خوش مذاقی سے مذاق کا پہلو برآمد کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے اور یہ مرحلہ اور زیادہ نازک صورتحال اختیار کر جاتا ہے۔ جب طنز نگار کو مذہب کے حوالے سے بات کرنی ہوتی ہے واعظ کی تعریف انور مسعود سے سنیئے:

جو ہے اوروں کی وہی رائے ہماری بھی ہے — ایک ہو رائے سبھی کی یہ کچھ آسان نہیں
لوگ کہتے ہیں فرشتہ ہیں جنابِ واعظ — ہم بھی کہتے تو وہی ہیں کہ وہ انسان نہیں

رویتِ ہلال پر انور مسعود کا طنز ملاحظہ ہو:

چاند کو ہاتھ لگا آئے ہیں اہلِ ہمت — ان کو یہ دھن ہے کہ اب جانبِ مریخ بڑھیں
ایک ہم ہیں کہ دکھائی نہ دیا چاند ہمیں — ہم اسی سوچ میں ہیں عید پڑھیں یا نہ پڑھیں

"قطع کلامی" پر "تائیدِ ضمیر" کے عنوان سے سید ضمیر جعفری نے اک بھرپور دیباچہ لکھ کر انور مسعود کو —

"شاعروں کا دلیپ کمار" کہا ہے۔

انور مسعود کا ایک بہت مشہور شعر آپ نے سُنا ہوگا ؎

یہی انداز دیانت ہے تو کل کا تاجر برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

اقبالؔ، غالبؔ، میرؔ، انشاؔ، وغیرہ کے بعض مصرعوں کو تو انور مسعود نے گویا اپنا لیا۔ کچھ قطعات سُنیئے :

ہے ایک چیز تیز تو 'اِک چیز تیز تر موجِ خرامِ یار سے بڑھ کر کہیں جسے
پہلی تو شئے وہی ہے کہ ٹیکسی ہے جس کا نام اور دوسری وہ چیز کہ میٹر کہیں جسے

معنیٔ تازہ بہ تازہ کی ضمانت ٹھہرا کسی مضمون کا غالبؔ سے ادا ہوجانا
آج ٹونٹی کے لبِ خشک سے شوں شوں سن کر "یاد آیا ہمیں پانی کا ہوا ہوجانا"

رہے گا یاد فقط ایک کاغذی پُرزہ بھرے جہان میں پھر اور کچھ نہ سوجھے گا
عجیب دشمنِ لطفِ سفر ہے کنڈکٹر بری رقم کا بقایا ٹکٹ پہ لکھ دے گا (لالکا میں للا)

اسے سوجھے گی نارنگی نہ گاڑی اسی تکلیف میں کھویا رہے گا
سُنا دو کوئی نثری نظم ان کو کبیرا حشر تک روتا رہے گا (کرب کبیرا)

حفیظؔ جالندھری نے ایک بار پنجاب یونیورسٹی میں ایک جلسے میں انور مسعود کو سُنا تو کہا کہ " انور مسعود کی شاعری میری حسرتِ اظہار ہے۔" اور سید محمد جعفری نے انور مسعود کی پنجابی شاعری پڑھ کر کہا تھا کہ " یہ خوش آئند بات ہے کہ پنجابی کو اب پڑھے لکھے لوگ اپنا رہے ہیں۔"

کنگ سائز کے۔ یل۔ سہگل کے نام

انور مسعود

ظرف کا حجم دیکھ کر انور چارہ جوئی کو فرصت ہے بنی آدم کی
اک تاثر سپرد خامہ ہے یہ ایجاد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا
یہ جو بوتل ہے کوکا کولا کی گھاس کا ذائقہ سبزی میں چلا آیا ہے
کوکا کولا کا سالنامہ ہے کھاد برباد کرے گی ہمیں معلوم نہ تھا

صبغت اللہ بمباٹ (حیدرآباد)

دوسری شادی

اک شوخ حسینہ کے چکر میں پڑے یارو
اک شادی ہی کیا کم تھی اک اور کرے یارو
کس موڑ پہ لائی ہے یہ زندہ دلی اپنی
ہم حُسن کے خنجر سے دوبارہ مرے یارو

یوں پیار کی گاڑی میں دو چاک لگا ڈالے
اک چاک ہے سیکل کا اک چاک ہے بنڈی کا
دو پھولوں کا گلدستہ قدرت نے دیا ہم کو
اک پھول دھتورہ کا اک پھول ارنڈی کا

اب اپنا ٹھکانہ تو گھر ہے نہ باہر ہے
طوفاں کا یہاں خطرہ شعلوں کا وہاں ڈر ہے
ممکن نہیں دونوں کے احکام کی پابندی
اک ہوم منسٹر ہے اک چیف منسٹر ہے

یہ زیست کی سرکس ہے میں تار پہ چلتا ہوں
اک سمت میں دلدل ہے اک سمت میں کھائی ہے
دو مکڑیاں ڈستی ہیں اک مکھی کو جالے میں
اللہ دہائی ہے، اللہ دہائی ہے

جی کہتا ہے آخر یہ اک چھوٹا سا گاؤں ہو
اک چھوٹی سی کٹیا ہو اور پیڑ کی چھاؤں ہو
آزاد رہوں جس میں میں شام و سحر تنہا
دونوں کی نہ صورت ہو دونوں کی نہ چھاؤں ہو

قطعہ

عشق ہر سو کامراں ہے ان دنوں
حُسن کتنا مہرباں ہے ان دنوں
دل تو پہلے سے جواں ہے اس کے ساتھ
کاش ہو جاتے جواں ہم ان دنوں

عباس متقی (حیدرآباد)

مُردوں کا انتقال

عثمانیہ دواخانہ، شہر حیدرآباد کی ایک مشہور و معروف اور خوب صورت عمارت ہے جہاں کارکرد دواؤں سے زود اثر علاج ہوتا ہے جہاں ڈاکٹرس مہربان اور نرسس ان سے زیادہ مہربان اور وارڈبوائے وغیرہ ان سب سے زیادہ مہربان ہیں یہ اور بات ہے کہ مریض پریشان ہیں۔ حالت مرض میں پریشانی عین فطری عمل ہوتا ہے - اب عثمانیہ کا حقیقی باب الداخلہ بند کر دیا گیا ہے ورنہ اس عمارت کا حسن نمایاں تھا۔ لوگ دواخانہ کے پچھلے راستہ کو آمد و رفت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ زمانے میں جس تیزی سے سامنے کے راستے بند ہو رہے ہیں اسی تیزی سے پچھلے راستے کھل رہے ہیں" کھڑکیاں" جو اس تعطل کے دوران استعمال ہوتی ہیں اُن کی حقیقی اہمیت تو وہی جانتے ہیں جو انھیں آئے دن وقت ضرورت استعمال کرتے ہیں۔ ہم نئے دور کے پرانے آدمی ہیں باب الداخلہ ہی سے داخلہ کا ذوق رکھتے ہیں اس لیے دریچے کے دروازوں کو استعمال کرتے ہیں نہ آزو یاد کی کھڑکیوں کو لیکن اس کے باوجود جب بھی عثمانیہ دواخانہ جاتے ہیں مجبوراً اسی راستہ کو اختیار کرتے ہیں جو کبھی عقبی گیٹ کہلاتا رہا ہوگا۔ اس گیٹ سے گزرنے کے لیے پہلے ایک طویل راہ داری سے گزرنا پڑتا ہے جو مردہ خانے سے شروع ہوتی ہے۔

مردہ خانے سے گزر کر دواخانہ پہنچتے پہنچتے ہم یہ ضرور سوچتے ہیں کہ یہ معاملہ جو ناگفتہ بہ حد تک غیر پسندیدہ ہے، کہیں اس بات کی طرف اشارہ تو نہیں کہ جو دواخانہ جائے مردہ خانے سے گزر کر جائے تاکہ انجام کا احساس آغاز ہی سے ذہن و فکر میں نمایاں رہے۔ لیکن جب یہ احساس تفکر کی حدیں پار کرتا ہوا تعفن کی صورت اختیار کر گیا تو صرف ہم ہی نہیں سارا شہر بے چین ہو گیا۔ آئے دن اخبارات میں مراسلے شائع ہونے لگے کہ جو لوگ ٹھکانے لگ چکے ہیں ان کی نعشوں کو ٹھکانے لگا دیا جانا چاہیئے تاکہ دوسرے ٹھکانے لگنے سے محفوظ رہ سکیں۔ لوگوں کا اس راہ سے گزرنا مشکل ہو گیا ہے بلکہ جو لوگ اس راہ سے مجبوراً گزر رہے ہیں وہ گزرتے جا رہے ہیں۔ پولیس والے تک اس تعفن کی تاب نہ لا کر بیمار ہو گئے ہیں اور سند کے طور پر انھیں اسی دواخانہ میں شریک کروا دیا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کبھی اس طرح کے بھی جذبات منظر عام پر آئے کہ چیف منسٹر سے خواہش کی جاتی ہے کہ زندوں کے لیے مردوں کا خیال کریں۔ کبھی کوتوال بلدہ سے اپیل کی جاتی ہے کہ مردے زندوں کو تکلیف دے رہے ہیں۔ مردوں سے زندوں کو بچایا جائے۔ نہیں معلوم مرتے ہی جسم سے تعفن کیوں پھوٹتا ہے۔

ممکن ہے یہ کرتوت کا پھل ہو۔ لیکن کوئی پھل اتنا بدبودار نہیں ہوتا۔ ہمیں ایک دن افضل گنج سے گزرنا تھا۔ لب سڑک کھڑے سوچ رہے تھے کہ آخر کیا کریں۔ اسی تذبذب میں تھے کہ ایک بیل گاڑی ہمارے بازو آکر رک گئی۔ بیل بڑی بڑی آنکھوں سے ہم کو گھورنے لگا، ہمیں اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی ہمت نہ ہوئی بیلوں کی جفاکشی اور کتوں کی وفاکیشی کے ہم صدق دل سے قائل ہیں۔ گاڑی بان پہلے تو سمجھ میں آنے والی بولی میں اسے ڈانٹا بیل نے بیل کی طرح اس کی ڈانٹ سنی ان سنی کردی۔ گاڑی بان نے دو تین کوڑے رسید کئے۔ اس پر بھی جب کوئی اثر نہ ہوا تو وہ حربہ آخر میں نکالا اور لکڑی کی نکیلی کیل چبھو کر اس کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ گاڑی بان کو حیرت تھی کہ آخر بیل کو کیا ہوا آگے بڑھ کیوں نہیں رہا ہے۔ ہم بیل کے مافی الضمیر کو کچھ کچھ تاڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ شائد وہ اس شہرہ آفاق تعفن سے متنفر ہے۔ بیل واپسی پر راضی لیکن آگے بڑھنے سے معذور۔ ہمیں بہت حیرت ہوئی کہ ہمارے شہر کے بیل بھی کس قدر حساس ہو گئے ہیں کہ انسانوں کی نعشوں کی بدبو سے نبرد آزمائی کو تیار نہیں خواہ مار مار کر ان کا کچومر ہی کیوں نہ نکالا جائے۔ بیل کی قوت شامّہ پر حیرت بھی ہوئی کہ ابھی عثمانیہ ایک فرلانگ دور ہے اور بیل نے یہیں اپنے قدم روک لیے ہمیں حیا آئی کہ جس راستے سے بیل کو گزرنا منظور نہیں، ہم گزر جائیں۔ ہرگز نہیں۔ سیدھے سسرال پہونچ گئے۔

آج جو اخبار دیکھا تو مراسلہ نگاروں سے لے کر چیف منسٹر کو تک ہم یکے بعد دیگرے دعائیں دینے لگے۔ خبر کا لب لباب یہ تھا کہ مردوں کا انتقال عمل میں لایا جارہا ہے اور تصویر دی گئی کہ انسانوں کی نعشوں کو کچرے کے ڈھیر کی طرح ایک لاری میں لادا جا رہا ہے۔ غنیمت ہے کہ مردے زندے نہیں ہوتے، یہ واقعہ تو یوم الواقعہ ہی وقوع پذیر ہوگا۔ خوشی ہوئی کہ اب ہم افضل گنج سے گزرتے ہوئے روایتی تعفن سے دوچار نہیں ہوں گے۔ اب سواریاں ہارن دیئے بغیر ایک دوسرے کو اوور ٹیک نہیں کریں گی اب ہم اس راستے پر اپنے معمول کی رفتار سے چل سکیں گے۔ مردوں کا انتقال جو ہو گیا تھا۔

ان دنوں مردہ خانے میں مردوں کی نعشیں پوری رفتار سے سڑ رہی تھیں۔ اور یہ سڑنا اس لیے بھی تھا کہ بقول اخبارات مردہ خانہ کا ایرکنڈیشنر خراب ہو گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ زندوں کو ایرکنڈیشنڈ میسر نہ آئے یا نہ آئے کوئی بات نہیں۔ مردوں کو اس کی بہت ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ زندے ایرکنڈیشن کے بغیر مر نہیں جاتے، مردے ایرکنڈیشن کے بغیر سڑ جاتے ہیں۔ ایک تعفن کا مارا۔ مردہ خانے سے گزرکر دواخانہ آیا تاکہ اپنے سالے کی عیادت کرسکے ابھی وہ خیریت ہی پوچھ رہا تھا کہ اس کی خیریت غیر ہونے لگی۔ نبض تیز ہوگئی۔ پریشر بڑھ گیا۔ سانس مشکل سے چلنے لگی ہوش جاتے رہے۔ بیٹھے بیٹھے مریض کے پہلو میں گر گیا۔ مریض گھبرایا ہوا ڈاکٹر کو بلا لایا۔ وہ تو خیر گزری کہ بازو کا پلنگ خالی تھا۔ فوراً شریک کرلیا گیا۔ دھیرے دھیرے جب ہوش آیا تو اپنا جائزہ لینے لگا۔ گلوکوس چڑھ رہا ہے۔ اطراف ڈاکٹرس کھڑے ہیں اور جس کی عیادت کو وہ آیا ہے وہ پوری مستعدی سے تیمارداری میں مشغول ہے۔ بہت حیران ہوا کہ وہ تو اپنے سالے کی عیادت کو آیا تھا۔ مریض میں کیسے تبدیل ہو گیا۔ سمجھ گیا۔ نیا دور ہے، جب ایک لوفر راتوں رات منسٹر اور روڈی ہاتھوں ہاتھ کونسلر بن سکتے ہوں تو اس کے ہاتھوں ہاتھ مریض بن جانے میں کون سی حیرت کی بات ہے۔ ڈاکٹر قریب آیا خیریت پوچھی، کہنے لگا معلوم ہوتا ہے تم کو "لو" لگ گئی ہے۔ اس نے لجاجت سے ڈاکٹر کی نفی کی اور کہنے لگا۔ ڈاکٹر

صاحب مجھ کو "لو" نہیں "بو" لگی ہے۔

مُردوں کی جب سے یہ بے حرمتی دیکھی ہے۔ چاہتے ہیں کہ مرگی کے مریض کی طرح ایک پیتل کی تختی اپنے گلے میں لٹکائے پھریں جس پر خطِ جلی میں یہ قطعہ لکھا ہو۔

مجھے دفن کرنا مسلمان ہوں میں — میں اک دل جلا ہوں جلایا نہ کرنا
مری التجا للہ یہ ہے یہی ہے — کبھی نعش میری سڑایا نہ کرنا

اشرف خوندمیری

تین منزلہ دکنی غزل

بیٹھے بیٹھے جھر جھریاں لیکو کتے — ہلو ہلو کد گلیاں لیکو کتے

ڈھانس لیکو ہور دھماں لیکو کتے — زندگی میں مرچیاں لیکو کتے

یہ ٹیک ریں سو چیتاں لیکو کتے — ٹھنڈے ٹھنڈے آنسو واں لیکو کتے

اِتّے لمبے مچھیاں کیٹکو کتے — "ہاتھ خالی نفتے خاں" لیکو کتے

بھکّے پیاسے رہ کو بیٹاں ریں — خالی پیلی ڈھکلیاں کیٹکو کتے

آنگ خط جا کو لفافہ بن گیا — چپ چپلتے آنگ بڑیاں لیکو کتے

ایک ہے سواس کو خوش رکھ کیو جفت — گھر میں دو دو جورواں لیکو کتے

دو پچ پو کنٹرول نئیں رکھ ریں تو پھر — سوکنوں پو سوکناں کیٹکو کتے

خواب تو ڈوغن سمندر بن گئے — خوب صورت سیپیاں کیٹکو کتے

اپنے بغلوں میں تمیں خود جھانک لیو — اِن کی اُن کی ڈڈیاں لیکو کتے

قوم کے غم میں بلا ریں شیخ جی — ایکٹنگ کی ہچکیاں کیٹکو کتے

کپڑے رہ کو بی شرم باہر جھٹیے — ڈھانپنے کو چندیاں کیٹکو کتے

بے شرم بکیچ بن گئے تو میاں — آنگ پو دو چیریاں کیٹکو کتے

زندگی میں تیر مارو خیر خاں — خالی بندر بھپکیاں کیٹکو کتے

(رشوت خوروں کے لیے) شارک مچھی کا کرو جم کو شکار — چھوٹے موٹے پرکلیاں لیکو کتے

سر دیئے دکنی میں چوٹی شان سے — پن کی سر پو مسلّاں کیٹکو کتے

پچ ادب کے ٹھیکیداراں بول ریٔں — مسخرے زندہ دلاں کیٹکو کتے

دل کے تنٹے کدڑ گردوں پو رات بھر — گنگنا ریٔں سپلکاں لیکو کتے

پیار کی لوگڑی میں پھرتے تیر ریٔں — ڈبتے جا ریٔں اپلیاں لیکو کتے

ڈوبنے والوں کو بٹھا کر تل میں خود — ناؤلے ریئے سسکیاں لیکو کتے

دل کے سنگ جا ریٔں سوز خاں ہوچ ریٔں — اِتّے سکے کھیلیاں کیٹکو کتے

پوؤں کے نیچے سے زمیں سرکا دیئے — سر کے اوپر آسماں کیٹکو کتے

گڑگڑا ریٔں بھوت اپنی ڈھیٹ پو تم
وو تری اشرف میاں کیٹکو کتے

بابو آر کے (اچ پور)

ادبی جگالی

اخبار بینی کے دلدادہ لوگ کئی خوبیوں کے پیکر ہوتے ہیں۔ رنگا رنگ صفات کے حامل یہ لوگ مختلف گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ جس طرح گلے، بیل یا دیگر چوپائے، یہ مقصدیوں ہی جگالی کرتے ہیں، بالکل اسی طرح کچھ لوگ تفریحِ طبع کے لیے اخبارات کا جائزہ لے کر فضول اپنا وقت اور انرجی برباد کرتے ہیں۔ اس کے برعکس بے چارے کچھ لوگوں کی اپنی مجبوری بھی ہوتی ہے جنھیں خواہ مخواہ خود کو مہذب پوز کروانا ہوتا ہے۔ یہ لوگ علی الصبح بستر پر نیم دراز ہو کر اخبار کے مطالعے کو چائے کی چسکیوں کے ساتھ اس حد تک خلط ملط کر دیتے ہیں کہ پہلی نظر میں انھیں دیکھ کر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے اخبار پیا جا رہا ہو اور چائے پڑھی جا رہی ہو۔ اور کچھ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو اخبار کے مطالعے کو آکسیجن سمجھ کر اس کی ہر سطر اور ہر جملے کا آموختہ کرتے جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں صحافت کے پہلے دن آج تک اخبار خریدے بغیر پڑھنے کی وبا انتہائی عروج پر ہے۔ اگر اس وبا سے تحفظ کے لیے انجکشن وغیرہ دریافت کر لیے جائیں اور تمام پرائمری مدارس میں ویکسینیشن کے ساتھ اسے بھی لازمی قرار دے کر طلبا کو انجکٹ کر دیئے جائیں تو ہمارا دعویٰ ہے کہ ہندوستانی اخبارات اپنے تابناک صحافتی مقام کو پا جائیں۔ ہمارے ایک واقف کار ہیں جو اخبار بینی کے شغف میں یکتا اور لاجواب ہیں۔ اخبار خرید کر پڑھنے کو وہ کفر سمجھتے ہیں۔ بڑے ہی پرانے کھلاڑی ہیں اس میدان کے۔ کسی کے ہاتھ میں اخبار دیکھ کر اس قدر مضطرب ہو جاتے اور اس قدر مچلتے ہیں کہ...... خدا کی پناہ! اس وقت ان کی بے چینی یہ ظاہر کرتی ہے جیسے اخبار، کتابت، پرنٹنگ، پبلشنگ اور سرکولیٹنگ کے تمام جھمیلوں سے محض اس لیے گزرا ہے کہ وہ ان کے ہاتھوں میں آ کر معراج پا لے۔ اخبار ان صاحب کی آنکھوں کا سرمہ اور دل کا چین ہے۔ یہ صاحب اخبار کو بلاناغہ یاد کرنے کی حد تک پڑھتے ہیں۔ پان کی گلوری منہ میں اور چشمہ...... ! تو چشمہ کے فریم میں پچیس جوڑ اس سے منسلک کانوں پہ رکھنے کے لیے صرف ایک ڈانڈی اور دوسری جانب دھاگے کا پھندا یعنی بے قصور کان کے لیے خواہ مخواہ پھانسی کا سامان۔ جس کا ایک شیشہ کریک تو دوسرا ان فٹ۔ کریک شیشہ کو سنبھالیں تو ان فٹ نیچے۔ اب اسے اٹھانے جھکیں تو ان فٹ شیشہ فرش پر اس قدر چھناکے کے ساتھ پھٹنی کھائے کہ:

اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا

خیر صاحب کسی کی خوش فہمی سے پہلی کیا لینا ، ہزار ستم سہہ کر ہم بھی اسے چشمہ کہہ لیتے ہیں ۔ یہ صاحب چشمہ آنکھوں پر چڑھائے اخبار آنکھوں سے اس قدر قریب رکھتے ہیں گویا اخبار آنکھوں میں پہنا جا رہا ہو ۔ ان صاحب کا معمول یہ ہوتا ہے کہ آنکھوں میں وحشت ، چہرے پہ پریشانی ، پسینہ سے تربتر ، اکھڑی پھولی سانسوں کے ساتھ ہماری دوکان میں چڑھنے سے پیشتر ہی گھٹی گھٹی آواز میں کہتے ہیں ۔ لائیے دکھائیے اخبار اور جملہ ختم ہونے سے قبل ہی اخبار ہاتھوں سے اُچک سینے سے لگا لیتے ہیں ۔ خیر صاحب اس بداخلاقی کو ہم اپنی ہی خطا (اخبار خرید کر پڑھنے کی) سمجھ کر برداشت سے کام لیتے ہیں ۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ۔ اب جناب اخبار خوب کھنگال کر پڑھا کم اور پھاڑا زیادہ جاتا ہے پھر تب سے نئے اندازسے بیدردی کے ساتھ یوں مروڑا جاتا ہے جیسے یہ کسی شریف انسان کی کمائی سے خریدا ہوا اخبار نہ ہو بلکہ ان کے کسی دیرینہ دشمن کی مکروہ گردن ہو ۔ الغرض اس قدر شدید پنجہ آزمائی کے بعد جب اس کی حالت لیس پڑھنے لایق ہو جاتی ہے تب اسے رکھ دیا جاتا ہے اور . . . . .

یہاں سے سلسلہ شروع ہوتا ہے اخبار کی خبروں کی تصدیق کا رونا رویا جاتا ہے ایڈیٹوریل کی صحت کا اور اردو صحافت کی کسمپرسی کا ۔ دُکھڑے سنائے جاتے ہیں اردو صحافت کی زبوں حالی کے اور قارئین کی سرد مہری اور کنجوسی کے ۔ قصہ مختصر کہ اس قسم کی لاحاصل بحث میں الجھو اور ان کے ساتھ اپنا بھی بھیجہ پھوڑو اور اخبار خرید کر پڑھنے کی غلطی کو شجرِ ممنوعہ کی خطا سے عظیم سمجھ کر پچھتائے جاؤ . . . . ایک دن اسی طرح وہ اخبارات کی گرتی ساکھ کا دکھڑا سنا چکے تو ہم نے کہا " آپ کے ان تمام اعتراضات کے بعد تو اخبار کی قیمت کچھ زیادہ محسوس ہوتی ہے " یہ سنتے ہی وہ حقارت سے ٹیڑھا منہ بنا کر کہنے لگے " اجی میاں ، اسی نوّے پیسے یہ بھی کوئی قیمت ہوئی ۔ اتنے پیسوں میں تو میاں آج ایک کپ چائے بھی سلیقے سے کہاں ملتی ہے ؟ ہوش کے ناخن لو برخوردار یہ بھی کوئی قیمت اخبار کی ہوئی ؟ " ان کی یہ بات سن کر طبیعت جھنجھلا اٹھی کہ قیمت بھی زیادہ نہیں اور خرید کر پڑھنے کی قسم ٹوٹی بھی نہیں ۔ ہم نے تلملا کر کہا " اجی قبلہ ، اتنی کم قیمت ہونے کے باوجود بھی اخبار مانگ کر پڑھنے والوں کا ایک زبردست ریوڑ ہے ۔ سمجھے آپ ! اب یہ صاحب فوری دفاعی مورچہ سنبھالتے ہوئے گویا ہوئے ۔ " اجی آپ ریوڑ کہتے ہیں اجی میاں میرے خیال میں تو پوری ایک امت ہے ۔ ایسے لوگوں کی اور ایسے لوگوں نے تو صحافت کے معاشی دامن کو تار تار کیا ہے ایسے ہی ناہنجار قارئین نے تو اخبارات کی زندگی دوبھر کر کے رکھ دی ہے " وہ مزید نمک پاشی کرتے ہوئے کہنے لگے " میں تو کہتا ہوں جتنا قصور ان لوگوں کا ہے اتنا ہی ستم آپ جیسے حضرات کا بھی ہے ۔ میں کہتا ہوں آپ ایسے لوگوں کو اخبار پڑھنے کے لیے دیتے ہی کیوں ہیں ؟ ان لوگوں کے حوصلے آپ جیسے حضرات نے ہی بڑھائے ہیں اور صحافت کے سینے میں خنجر اتار رہے ہیں سمجھے ! " ہم نے ہاتھ آئے موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا : " دیکھیے آپ کو اخبار پڑھنے کے لیے نہ دیتے تو بھلا آپ کیا سوچتے ؟ " اب وہ کسی قدر چڑ کر کہنے لگے " اجی میاں ، چولہے میں جائے یہ اخبار ۔ آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہم روزانہ اخبار پڑھنے کے لیے ہی آپ کی دوکان میں تشریف لاتے ہیں ۔ خدا تمھیں نیک توفیق دے اور صحیح سمتوں میں عمدہ سوچنے کی راہ سجھائے ۔ اجی میاں یہ اخبار کا مطالعہ تو محض ایک بہانہ ہے ۔ دراصل خیر خیریت کا جذبہ بھی تو کوئی چیز ہے آخر . . . . اور وہ کیا کہتے ہیں :

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے!"

اب تو وہ جیسے مخالفت کے سب سے آخری زینے پر اتر آئے کہنے لگے۔ "دوسری بات آپ کو یہ حق یقیناً ہے کہ آپ اخبار خرید کر پڑھیں لیکن آپ کو یہ اجازت کس نے دی کہ آپ ہم کو اخبار خریدنے کا درس دیں اور خود کو اخبار کا ہمدرد ثابت کریں۔" اس وقت مارے طیش کے ہماری حالت غیر ہو گئی۔ غیض و غضب کے عالم میں ہم نے اخبار مٹھیوں میں بھینچ ڈالا..... اور اس حد تک سوچنے لگے کہ اے کاش اگر آج ہم اس بے ضرر اخبار کی بجائے کسی قبر کا وزنی کتبہ پڑھ رہے ہوتے تو... اچھا ہوتا اور پھر اس موقعہ پر یہ ہوتا کہ ہم اس کتبہ کو زمین سے کھینچ کر ان کے منہ پر دے مارتے اور خود تھانے میں جا پیش ہوتے تاکہ اگلے روز کے اخبارات مانگ کر اخبار پڑھنے والے کی درگت کا ڈھنڈورہ جلی حرفوں میں پیٹ رہے ہوتے۔ ہماری یہ حرکت ایسے لوگوں کے لیے ایک قسم کی تنبیہہ بھی ہوتی۔

○●

گیسٹ ہاؤز یا گھوسٹ ہاؤز

احمد سلطان

دے کے دعوت کسی نے بلوایا
کہیں موقع نہ جانے کا بھی دیا
مان لیں کیا کسی کے کہنے سے
دل میں سناٹا رہتا ہے پورا
کتنے مہمان ہوں گے چن لیجے
بڈھے کے مہمانوں سے ملازم ہیں
پھینک کر جال بیٹھ جاتے ہیں
آنے والوں کو کہتے ہیں ویلکم
لوگ تنہائیوں سے ڈرتے ہیں
خاموشی ایسی جیسے گور میں ہے
کہیں بجتا نہیں ہے کوئی ساز
میلے جب مچھروں کے لگتے ہیں
کہیں کرسی تو بلب کم ہے کہیں
تین بیروں میں ایک بہرا ہے
بات کب کام کی یہ سنتا ہے
کام چلتا نہیں ہے عرضی سے
کوئی ڈھب ہے نہ کچھ سلیقہ ہے
گھولتے منہ میں رہتے ہیں پانی
پھر ادب سے یہ لیتے ہیں آڈر
دونوں رہتے ہیں درپئے آزار
سستی سبزی یہ چن کے لاتا ہے
کانٹے چمچے پلیٹ سے پہلے
پچھلے ہفتے بریڈ لایا تھا
یہ سمجھتے ہیں سب نہلے یا دہلے
یہ نہیں بھاگتے ہیں خود بھاگو
دودھ میں پانی تو ملاتے ہیں
سچ کی بات میں نہیں کرتا
ایسی سروس پہ کیوں نہ دیں تالی
شامت آئی تھی اس لیے آئے
سامنے سے تو ایک جنگلہ ہے

اور مہمان خانہ بھجوایا
پورا رہنے کا بندوبست کیا
نام مہمان خانہ رکھنے سے
رات میں دل بہت ہے گھبراتا
رات الّو کی بولی سن لیجے
گویا مہمانوں کے وہ حاکم ہیں
پھنس کے مہمان جس میں آتے ہیں
جانے والوں کا کرتے ہیں ماتم
تنگ مچھر بھی خوب کرتے ہیں
گھپ اندھیرا بھی کاریڈور میں ہے
واپس آتی ہے اپنی ہی آواز
ٹیلی ویژن نہ دیکھ سکتے ہیں
کسی کمرے میں وارڈروب نہیں
ایسا لگتا ہے اس کا پہرا ہے
یا پ میوزک پہ سر یہ دھنتا ہے
چیز آتی ہے اس کی مرضی سے
کام کا اپنا ہی طریقہ ہے
پہلے لاتے ہیں چائے یا کافی
ایک اندر ہے دوسرا باہر
تیسرا رہتا ہے سرِ بازار
گندے انڈے ٹماٹے کھاتا ہے
ٹوسٹ ہے آملیٹ سے پہلے
کلیرنس سیل سے بٹر آیا
بڈّی ہے ناشتے سے کچھ پہلے
پانی دو تین بار جب مانگو
یہاں پانی میں دودھ پاتے ہیں
اور ڈنر سے تو فاقہ ہے اچھا
حال ہے شان دار پر خالی
آکے مہمان خانہ پچھتائے
پاس سے دیکھو بھوت بنگلہ ہے

رؤف رحیم (حیدرآباد)

○

کوئی لاحول بھیجے دل ہی دل میں کہ ٹل جائے نحوست کی گھڑی ہے
دلیوالی بن گئی ہیں ساری راتیں پڑوسن میری جیسے پھلجھڑی ہے
خزانوں پر بلے ہیں ناگ دائم یہ چوٹی کس لیے پیچھے پڑی ہے
جواں بنتے ہیں کھا کر شیخ جس کو وہ آخر کون سی بوٹی جڑی ہے
اطاعت اس لیے کرتا ہوں اس کی کہ بیگم عمر میں مجھ سے بڑی ہے
جو بن جاؤں منسٹر تو سمجھ لو مرے ہاتھوں میں جادو کی چھڑی ہے
یہ شاگردی کا ہوگا فیض شاید غزل استاد سے میری لڑی ہے
طرح میں ہے غزل لکھنا رحیم اب روایت پھر اسی کی چل پڑی ہے

○

اے مرے معبود مجھ کو بخش دے لوگ کہتے ہیں مجھے بخشا ہوا
شعر استادوں کے ہیں دیوان میں "مستند ہے میرا فرمایا ہوا"
ہر طرف بیگانگی کا ہے چلن اس لیے لہجہ مرا تیکھا ہوا
اُن کی محفل میں بھی کھائیں گالیاں "ہر جگہ میرا جنوں رسوا ہوا"
میں نے لڑکی جان کر چھیڑا رحیم اس کے فیشن پر مجھے دھوکہ ہوا

○

معین امر بمبو

تمھیں جانا ہے جا کو، اماں سے مل لیئو مرے گھر میں کائی کو قیامت بلا دئیں
میرے دل کی دنیا میں ہو رائے اندھیرا
اُنوں کالے ہونٹوں پو مستی لگا رئیں

ان پڑھ بھونگیری

دو شعر

سرکاری ہسپتال جو پیشنٹ جائے گا — سمجھو وہ گھر کو پھر کبھی واپس نہ آئے گا
سسرال مجھ کو جانا ہے اور آدھی رات ہے — انعام اس کو دوں گا جو آٹو دلائے گا

تین شعر

(حیدرآباد میں پیش آئے ایک واقعہ سے متاثر ہو کر جس میں ایک دولہن نے شادی کی پہلی رات کو اپنے دولہے پر چاقو سے وار کر کے زخمی کر دیا تھا)

اس شرط پر ہی میں تمھیں دولھن بناؤں گا — پھر عمر بھر خلوص سے رشتہ نبھاؤں گا
پہلے مجھے یقین دلاؤ کہ ہاتھ میں — چاقو اگر نہیں ہے تو گھونگھٹ اٹھاؤں گا
کچھ ہو گیا تو یہ مرا اپنا نصیب ہے — ویسے بھی کلمہ پڑھ کے ہی کمرے میں جاؤں گا

دید و باز دید

زود اندیش

○ مجتبیٰ حسین ایک درویش کی طرح مسکراہٹیں لٹاتا ہے۔

○ محرومیاں انسان کو طنز نگار بناتی ہیں۔

○ مزاح نگار دوسروں کا غم سمیٹتا ہے

مجتبیٰ حسین سے دہلی میں پہلی ملاقات ہوئی تو وہ مجھے مزاح نگار کے بجائے مقالہ نگار محسوس ہوئے اور مقالہ نگار بھی آتھی عبدالودود کی قسم کے۔ چہرے پر گمبھیرتا طاری رہتی لیکن نظر کتاب کے متن کو دیکھتی ہے اور جب تک کوئی غلطی پکڑی نہ جائے نظر اوپر اٹھتی ہی نہیں، میرے دائیں طرف حسن رضوی اور بائیں طرف رحمٰن نیّر بیٹھے تھے اور تقریب ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی سالگرہ کا جشن تھا جس میں شرکت کے لیے صلاح الدین پرویز سعودی عرب سے آئے تھے۔ اس لیے پوری محفل قہقہہ بہ لب تھی لیکن مجتبیٰ حسین کا عالم یہ تھا کہ قہقہہ لطیفے سے برآمد ہوتا اور پوری محفل زعفران زار بن جاتی تب بھی ان کے ہونٹوں پر خاموشی کا قفل رہتا۔ آنکھوں کے گوشے حیا آمیز انداز میں جھک سے جاتے۔ میں بات کرتا تو وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتے۔ میں نے دل میں سوچا کہ اپنی تحریروں میں تو مجتبیٰ حسین مزاح کو اس طرح کروٹ دیتے ہیں کہ انسان کو اپنے آپ پر بھی ہنسی آجاتی ہے۔ چناں چہ میرزا ادیب نے تو انھیں قطع کلام کے فلیپ پر قہقہوں اور مسکراہٹوں کا درویش قرار دے ڈالا ہے اور درویش کی توجیہہ یہ کی ہے کہ

"درویش ہوتا ہی وہ شخص ہے جو اپنی پوری متاع فراخدلانہ دوسروں کے حوالے کر دیتا ہے اور لٹا دیتا ہے۔"

میں نے انھیں بے تکلّف محفل میں لب بستہ دیکھا تو پوچھ لیا۔ "کیا آپ کا تعلق بھی کسی دینی گھرانے سے ہے؟ اور یہ احساس تو بارِ گراں نہیں بن گیا کہ اتنے اونچے گھرانے کا فرد ہو کر آپ لوگوں کو ہنسانے پر مامور ہیں؟" یہ سنتے ہی مجتبیٰ حسین کی ہنسی پھوٹ پڑی اور وہ اتنا زور سے ہنسے کہ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر جمیل جالبی اور محمود ہاشمی بھی ان کی طرف متوجّہ ہو گئے۔ مجتبیٰ حسین بولے:

"انور سدید مزاح زندگی کی محرومیوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ محرومیاں اکثر انسان کو حریص بنا دیتی ہیں، اسے زندگی پر مسکرانے کا موقعہ نہیں دیتیں۔ اس قسم کا انسان طنز نگار بن جاتا ہے۔

ہر طرف نفرت آمیز نظروں سے دیکھتا ہے۔ مطمئن لوگوں کا نشانہ طنز بنتا ہے اور اپنی پیدائشی محرومیوں کا انتقام لیتا ہے۔ مزاح نگار کی زندگی کرب و محرومی کا شکار بھی ہو تو وہ اس سے مسکراہٹیں برآمد کر لیتا ہے اور پھر انھیں بے دریغ تقسیم کرتا چلا جاتا ہے تاکہ روتے بسورتے لوگوں کا غم سمٹ جائے اور وہ اپنے پھیپھڑوں کو تازہ آکسیجن سے بھر کر زندگی کی جد و جہد میں پھر سے شامل ہو جائیں۔

اس وقت مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کا مابہ الامتیاز بیان کر رہے تھے۔ بحر طویل میں غزل لکھ رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ میں نے انھیں مقالہ نگار غلط تصور نہیں کیا بلکہ وہ تو ایسے مقالہ نگار ہیں جن کی چپ ٹوٹتی ہے تو لفظوں کا پہاڑ ریزہ ریزہ ہو کر نیچے آنے لگتا ہے۔ میں یہ سب باتیں بھول گیا تھا۔ خدا جانے مجتبیٰ حسین نے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے کون سے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن ان کا مفہوم وہی تھا جو آج میری لوحِ دماغ پر بے ساختہ ابھر آیا ہے اور اس کا باعث یہ ہے کہ میرے سامنے پاکستان میں چھپی ہوئی مجتبیٰ حسین کے منتخب مزاحیہ مضامین کی کتاب "قطع کلام" پڑی ہے۔ ایک مجتبیٰ حسین اس کتاب کے اندر موجود ہے اور ہمیں زندگی کی ناہمواریوں پر انسان کی بوالعجبیوں پر اور معاشرے کے تضادات پر ہنسنے اور مسکرانے پر مائل کرتے ہیں۔ دوسرا مجتبیٰ حسین اس کتاب کے بیرونی سرورق پر تصویر کی صورت مجسم ہے اور یہ وہی مجتبیٰ حسین ہیں جن سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی تھی اور جو مجھے ایسے لب بستہ نظر آئے تھے کہ مجھے ان پر قاضی عبدالودود جیسے جابر نقاد کا گمان ہوا۔ مجتبیٰ حسین زندگی [illegible] صورتیں دلآویز ہیں۔ وہ مزاح نگار بھی اچھے ہیں کیوں کہ وہ زندگی کی صداقت سے گریز نہیں کرتے اور قاری کو قہقہہ بار کرنے کے لیے انھیں گدگدانے کی ضرورت محسوس ہی نہیں ہوتی اور ان کی متین صورت بھی بڑی معنی خیز ہے، کیوں کہ وہ زندگی کو غیر سنجیدہ عمل شمار نہیں کرتے اور زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہیں تو قاری لطافت بار ہو جاتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کی یہ کتاب رعنا فاروقی نے مرتب کی ہے۔ رعنا فاروقی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انتخابِ مضامین کے لیے صرف قینچی سے کام لینے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس مقصد کے لیے اپنی نظر بھی استعمال کی ہے اور طنز و مزاح کے ذوق کو بھی اپنا راہنما بنایا ہے۔ اور بیشتر مجتبیٰ حسین کے وہ مزاح پارے منتخب کیے ہیں جو ان کے نمایندہ ادب پارے ہیں اور جن کی گونج ایک طویل عرصے سے ادبی دنیا میں سنی جا رہی ہے یوں لگتا ہے کہ رعنا فاروقی نے ایک مصروف صحافی ہونے کے باوجود وقت کے جتنے لمحات نکالے وہ سب کے سب مجتبیٰ حسین کی کتابوں کی معیت میں گزارے اور جب مجتبیٰ حسین کا فن ان کے رگ و ریشے میں سما گیا تو رعنا فاروقی نے یہ کتاب مرتب کر ڈالی جس کی ترتیب میں مجتبیٰ حسین کی ہر کتاب نے ایک ضروری جزو کا کردار سرانجام دیا ہے۔ ان اجزا سے جو کل مرتب ہوا اس کا نام "قطع کلام" ہے اور اس کا دیباچہ اس محبت کا مظہر ہے جو اچھی کتاب کا مصنف قاری کے دل میں بے ساختہ انداز میں پیدا کر دیتا ہے۔ رعنا فاروقی نے مجتبیٰ حسین کو پڑھنے سے پہلے خامہ بگوش کا کالم پڑھا تھا۔ اور خامہ بگوش کا کالم ہے کہ بڑا ادیب خود پڑھے تو مصلحت آمیز خاموشی اختیار کر لیتے ہیں بڑا اور کلاں پڑھے تو خود غزنوی بن جاتے ہیں اور قلمدان پکڑ کر استاد لاغر مراد آبادی کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ نوجوان ادیب پڑھتا ہے تو اس کے جملے ادبی محفلوں میں اقتباس کرتا ہے۔ بوڑھا شاعر پڑھتا ہے تو خامہ بگوش کو اپنا دیوان بھجوا دیتا ہے کہ ایک کالم اس ناچیز کی کتاب پر بھی رقم فرمایئے" ہم نے دیکھا ہے کہ ادھر خامہ بگوش کا کالم چھپا، ادھر کتاب کی "نوٹ سیل" شروع ہو گئی، ہاں ایک کتاب ایسی بھی تھی جس پر خامہ بگوش کا کالم چھپا تو اس کے سرورق کی مانگ

بڑھ گئی۔ اہل ادب نے کتاب پرے پھینک دی۔ رعنا فاروقی نے خامہ بگوش کا کالم پڑھا تو وہ مجتبیٰ حسین کی کتاب تک پہنچنے کے لیے بے تاب ہوگئیں" جاپان چلو" پڑھ چکیں تو انھیں مزید کتابوں کی طلب پیدا ہوگئی بہت سی کتابیں پڑھ چکیں تو مصنف سے ملنے کا شوق پیدا ہوگیا! اور اب تو یوں لگتا ہے کہ مجتبیٰ حسین خواجہ حمید الدین شاہد کی طنز و مزاح کانفرنس میں شرکت کے لیے کراچی نہیں آئے تھے رعنا فاروقی کا شوقِ دید انھیں کھینچ لایا تھا۔ رعنا فاروقی اس ہمدم دیرینہ سے ملیں تو ملتے ہی شکایت کی۔

"آپ کی تصانیف پاکستان میں بآسانی دستیاب نہیں ہیں جس کی وجہ سے ہمارے یہاں کا عام قاری آپ کو فرضی شخص سمجھے ہوئے ہے"

رعنا فاروقی کا خدشہ درست تھا۔ پاکستان میں مجتبیٰ حسین نام کے ایک نامور نقاد بھی ہوگزرے ہیں۔ مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی کوئی تحریر چھپتی تو لوگ داد نقاد مجتبیٰ حسین کو دیتے اور وہ منہ چھپانے کی کوشش کرتے، نقاد مجتبیٰ حسین کا مقالہ ہندوستان کے کسی پرچے میں شائع ہوتا تو مزاح نگار مجتبیٰ حسین سے پوچھا جاتا۔

اک دسترس سے تیری تنقید بچ گئی تھی
اس کو بھی تو نے آخر چرکا لگا کے چھوڑا

اور مزاح نگار مجتبیٰ حسین نہ تائید کرتے نہ تردید ـــــ نہ ہاں کرتے نہ ـــــ نہ کرتے ـــــ سوچتے نقصان مایہ تو ہم نہیں رہا۔ شماتت ہمسایہ کی پرواہ کیوں کریں؟ ادھر خامہ بگوش نے کالم لکھا تو ہندوستان میں مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی اور پاکستان میں نقاد مجتبیٰ حسین کی شخصیت مشکوک ہوگئی اور آخر نقاد مجتبیٰ حسین نے اس دنیا سے تھام جھام ہی اٹھا لیا اور ایسے گئے کہ ابد تک واپس نہیں آتے۔ اہل پاکستان انھیں اب تک بھی یاد کر رہے ہیں۔

رعنا فاروقی کی مجتبیٰ حسین سے ملاقات مسیحا و خضر کی [illegible] سے بہتر تو نہیں تھی لیکن مجتبیٰ حسین نے اس کا فائدہ ضرور اٹھایا اور جب رعنا فاروقی نے کہا۔

"کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ تحریروں کا ایک انتخاب پاکستان میں بھی شائع کرا دیں"۔ تو مجتبیٰ حسین نے فی الفور جواب دیا۔

"یہ فریضہ اگر آپ کے سپرد کر دیا جائے تو کیا آپ اس کو فرض کی طرح نبھا سکیں گی؟"

رعنا فاروقی نے اسے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور اب مکتبہ زبان کراچی نے یہ انتخاب "قطع کلام" کے خوب صورت عنوان سے چھاپ دیا ہے تو احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے یہ فریضہ فرض کی طرح ہی سرانجام دیا ہے اور اتنی اچھی کتاب مرتب کی ہے کہ مجتبیٰ حسین کے مزاح کے سب زاویوں سے بیک نگاہ ملاقات ہو جاتی ہے تکلف برطرف، قصہ مختصر، قطع کلام، بہر حال، آدمی نامہ، جاپان چلو اور سو ہے وہ بھی آدمی جیسی کتابوں کے سب نو لکھے ذہن و خیال میں اتر آتے ہیں، ہم اس کتاب سے صرف ایک اقتباس پیش کرتے ہیں تاکہ آپ ایک دانہ چکھ کر پوری دیگ کے ذائقے کا اندازہ لگا لیں۔ کنھیا لال کپور کے خاکے میں لکھتے ہیں۔

"کپور صاحب کو خود بھی اپنے لمبے قد کے متعلق کچھ خوش فہمیاں اور کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ لال قلعے کے باب الداخلہ کے نیچے سے گزرنا ہو تو اپنے سر اقدس کو خم دے کر پیٹ پر رکھ لیتے ہیں اور غلط فہمی کا یہ عالم ہے کہ فکر تونسوی کے گھر میں پانچ فٹ طول والی چارپائی پر سو جانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں .... کبھی پوچھا تو نہیں کہ ناپ تول کے حساب سے ان کا قد کتنا ہے۔ تاہم ایک بار شدید گرمی میں دہلی آئے اور میں نے دہلی کے موسم کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ بولے "سینہ تک تو موسم بڑا جانا لیا ہے۔

البتہ گردن اور سر کے آس پاس موسم خاصا خوشگوار رہنے۔ ہم نے جغرافیہ میں پڑھ رکھا تھا کہ آدمی سطح سمندر سے جوں جوں بلند ہوتا جائے گا اس کے اطراف موسم خوشگوار ہوتا جائے گا۔ اس لیے کپور صاحب کی بات پر فوراً ایمان لے آئے۔"

اب آخر میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح میں اپنے خاندان کے واحد چشم و چراغ نہیں۔ اس صنف میں ان کے برادر بزرگ ابراہیم جلیس بھی نام پیدا کر چکے ہیں لیکن وہ برادر کلاں سے روشنی حاصل کرنے کے بجائے طنز و مزاح میں اپنی جوت بکھیرتے رہے ہیں اور ایسی بات بھی نہیں کہ برادر خورد کا نام لیں تو برادر کلاں کی پہچان ہی ختم ہو جائے ابراہیم جلیس اور مجتبیٰ حسین دونوں نے طنز و مزاح میں اعزاز و امتیاز حاصل کیا ہے۔
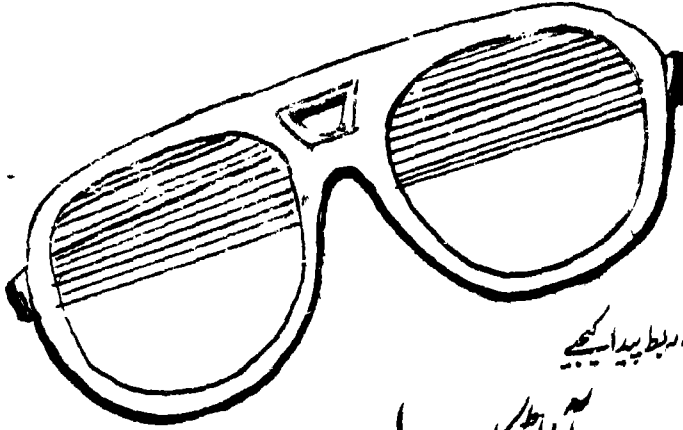
جلد: ۲۲
شمارہ ۱۲،۱۵

مجلس مشاورت:
بھارت چند کھنہ
نریندر لوتھر
یوسف ناظم
مجتبیٰ حسین

منیر اعزازی (بمبئی)
فیاض احمد فیضی

مجلس ادارت:
محمد حمایت اللہ
محمد منظور احمد
مسیح انجم
طالب خوندمیری

کتابت:
محمد غالب۔ محمود سلیم

فی پرچہ: ۵ روپے
زر سالانہ: ۵۰ روپے
لائبریریوں سے: ۵۵ روپے

طباعت: نیشنل فائن پرنٹنگ پریس چارکمان حیدرآباد ۲

ترسیل زر و خط و کتابت کا پتہ: شگوفہ ۳۱۲ بیچلرز کوارٹرز معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد۔
فون: 557716، رہائش: 521064

اس تھیلی کے چٹے بٹے (فہرست)

ہوائی کولمبس (سفرنامہ)

نہیں آتی تو یاد اُن کی (یادرفتگاں)

مالِ مفت (انشائیے)

مالِ مسروقہ (ڈائجسٹ)

چورن (منظومات)

نریندر لوتھر

سمندر کا سفر ہوائی جہاز سے

لندن سے نیویارک کی اڑان کے بارے میں تشویشناک بات یہ ہے ساری کی ساری اڑان سمندر کے اوپر سے ہے۔ بالغرض اگر ہوائی جہاز کو کچھ ہو جائے تو اسے پانی پر اترنا پڑے گا اور ہم یہ بخوبی جانتے تھے کہ آج تک کسی بھی ہوائی جہاز نے تیرنا نہیں سیکھا۔ ابھی کچھ عرصہ ہی پہلے ایر انڈیا کے ہوائی جہاز کنشک کو بھی تیرنا نہ آنے کی وجہ سے سمندر میں ڈوب مرنا پڑا۔ وہ نہ صرف خود ڈوبا بلکہ اپنے ساتھ تین سو سے اوپر مسافروں کو اور عملہ کو بھی لے ڈوبا۔ ویسے اتنی بلندی پر سے چاہے جہاز زمین پر گرے یا سمندر میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہم زمین پر اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہیں یہ شاید اس لیے کہ ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ دھرتی ہماری ماں ہے آج کل تو ریاستوں کو بھی ماں کا درجہ دیا جانے لگا ہے۔ مثلاً آندھرا پردیش کو تیلگو ماں کہا جاتا ہے۔ آئندہ شاید ضلع اور گاؤں کو بھی ماں کہا جانے لگے گا۔ اس طرح ہماری بے شمار مائیں ہو جائیں گی وسیع و عریض سمندر کے ساتھ ہمارا کیا رشتہ ہے یہ ابھی تک واضح نہیں کیا گیا۔ اسی لیے ہم سمندر پر زیادہ بھروسہ نہیں رکھتے ہو سکتا ہے کہ ہمارے دماغ میں ایسے دقیانوسی خیالات اس وجہ سے آئے ہوں کہ ہم بحر اوقیانوس پر پرواز کر رہے تھے۔

ہمارا خیال ہے کہ سمندر کا سفر سمندری جہاز سے ہی کرنا چاہیئے۔ پہلے ایسے ہی ہوا کرتا تھا۔ سند باد جہازی جس سے قارئین بخوبی واقف ہوں گے ہمیشہ ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ اب بھی کچھ لوگ ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن بہتیرے لوگوں نے اڑنے کا نیا طریقہ اپنا لیا ہے۔ کچھ عجب نہیں اگر ایسے لوگ ایک دن ہوائی سفر کے لیے سمندری جہاز استعمال کرنا شروع کر دیں۔ آج کل کے زمانہ میں ہر چیز ممکن ہے۔

خیر ہمارا ہوائی سفر کامیاب رہا سفر کے دوران کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی سوائے اس کے کہ امریکن ہوائی حسینہ کو ہم نے بہت اجڈ اور بد دماغ پایا۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ اتنی بلندی تک پہونچ جاتے ہیں ہمارے خیال میں وہ صرف سمندری جہاز کی ایر ہوسٹس ہونے کے قابل تھی بلکہ اس سے بھی نیچے ڈبکی کشتی کی اور وہ بھی ایسی کہ ایک بار ڈبکی مارنے تو پھر ابھرنے نہ پائے۔ شاید وہ یہ کہہ رہی تھی کہ ہم ایسے تاریک الوطن ہندوستانی ہیں جو تلاش روزگار کے سلسلہ میں امریکہ جا رہے تھے۔ ہم نے اس کے ایسے رویّے کی زیادہ پرواہ نہ کی کیونکہ ہم اس دیش کے باسی ہیں جس دیش میں [illegible] گنگا بہتی ہے اور اس گنگا کی آج کل صفائی ہونا شروع ہو گئی ہے۔ جب تک وہ صفائی پوری نہیں ہو جاتی خاموشی ہی بہترین پالیسی ہے۔

جب ہم نیویارک کے کینیڈی ہوائی اڈے پر اترے تو دیکھا کہ ابھی صرف ڈھائی ہی بجے تھے۔ ہم حیران

اڑان ساڑھے سات گھنٹوں کی تھی اور شروع دوپہر کے بارہ بجے ہوئی تھی۔ شاید ہماری گھڑی رک گئی تھی۔ ہم نے ایک امریکن سے پوچھا۔ اس کی گھڑی بھی ڈھائی بجا رہی تھی۔ اس نے ہماری پریشانی بھانپتے ہوئے کہا۔ ہنے نا جادو۔ ساڑھے سات گھنٹے کی اڑان اور ڈھائی گھنٹے میں ختم۔ پھر اس نے سمجھایا کہ نیویارک کا وقت لندن سے پانچ گھنٹے پیچھے ہے۔ تو ہمارے پانچ گھنٹے مزید چوری ہو گئے۔ ساڑھے سات گھنٹے کی محنت اور ڈھائی گھنٹے کی اجرت یہ ہے سرمایہ داری کا استحصال اور ابھی تو ہم سرمایہ داری کے گڑھ میں داخل ہی ہو رہے تھے۔

کینیڈی ایرپورٹ پر بھی کالے لوگوں کی کثرت دکھائی دی۔ چند لمحوں کے لیے تو لگا کہ ہم امریکہ کی بجائے آفریقہ پہنچ گئے ہیں لیکن یہ شک دور ہو گیا۔ جب ایک حبشی نے ہمارے ہاتھ میں ایک فارم تھماتے ہوئے مسکرا کر کہا " امریکہ میں خوش آمدید"۔

اس فارم میں جو ہر مسافر کو بھرنا پڑتا ہے امریکہ آنے کی وجہ بھی بتانی پڑتی ہے۔ اس سوال کے جواب کے دو میں سے ایک وجہ ہمیں بتانی پڑتی ہے اور وہ وجوہات ہیں۔ "بزنس یا تفریح" ہم پر ان میں سے کوئی وجہ بھی لاگو نہیں ہوتی تھی کیوں کہ ہم تو بغرض علاج آئے تھے اور علاج ہمارے لیے نہ بزنس تھا نہ تفریح۔ ہاں ڈاکٹروں کے لیے یہ دونوں وجوہات مناسب تھیں کچھ دیر سوچنے کے بعد ہم نے اس کالم کے سامنے لکھ دیا۔ "مصیبت" اس حبشی افسر نے فارم پڑھ کر ہم سے قدرے درشتگی سے پوچھا۔ یہ کیا لکھا آپ نے ؟ ہم نے واضح کیا کہ ہمارے آنے کی وجہ بزنس یا تفریح نہیں بلکہ علاج معالجہ ہے۔ یہ سن کر وہ قدرے مسکرائی اور ہمارے جواب کو کاٹ کر اس کی جگہ تفریح کر دیا۔ اور ساتھ ہی ہمیں " مزے کرو" کہہ کر چلتا کر دیا۔ یہ تو وہی بات ہوئی کسی کی جان جا رہی ہے اور آپ کی دل لگی ہو رہی ہے۔ باہر نکلے تو ہمارے استقبال کے لیے دو تین کاریں آئی ہوئی تھیں۔ سانس میں سانس آئی کیوں کہ نیو یارک میں اکیلے جا پہنچنا آسان کام نہیں۔

ایرپورٹ کے باہر کاریں زیادہ اور انسان کم دکھائی دیئے۔ کئی کاریں تھیں جن میں سیٹوں کی دو کے بجائے تین قطاریں ہوتی ہیں اور ان میں ٹیلی ویژن فون اور بار بھی ہوتا ہے۔ وہاں ایک کار کی قسم دوسری سے نہیں ملتی تھی۔ دنیا کے ہر ملک کی کاریں وہاں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہندوستانی کاروں میں ماروتی کار کا اوت کنل ماڈل بھی دیکھا لیکن امریکہ میں عموماً بڑی کاریں ہوتی ہیں۔

ایرپورٹ سے شہر آتے آتے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ راستہ میں کئی پل اور سرنگیں، پارکس جلوہ ہاں دیواروں پر اشتہار اور نعرے بھی لکھے ہوئے تھے۔ سڑکیں بھی کئی جگہ بوسیدہ حالت میں تھیں اور جگہ جگہ گڑھے دکھائی دیتے تھے۔ ان کو دیکھ کر دلی کی یاد تازہ ہوئی ایک دریا کے نیچے سے سرنگ کے ذریعے گئے اور دوسرے دریا کے اوپر پل سے گزرے راستے میں "ہارلم" سے بھی گزرے ہمارے میزبان نے اشارے سے بتایا کہ یہ حبشیوں کا گڑھ ہے۔ ہم نے سن رکھا تھا کہ وہاں کسی بھی وقت کسی غیر سیاہ فام کا جانا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے ہم نے میزبان کو گاڑی تیز چلانے کو کہا۔ اس نے ہنس کر کہا چلتی گاڑی میں کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں پیدل نہیں آنا چاہیئے۔ ہم نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا اور ڈائری اپنے اوور کوٹ کے نیچے پہنی ہوئی جیکٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ اسے رکھتے ہوئے ہم نے ٹٹول کر دیکھ لیا کہ ہمارا بٹوہ ابھی تک محفوظ تھا۔

گھر پہونچے تو ہمارے میزبان نے جو ایک کنوارا نوجوان تھا چائے کے لیے پوچھا۔ ہم نے کہا ہم چائے تو پی لیں گے لیکن یاد رہے کہ یہ ہمارا ڈنر کا وقت ہے اور ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمیں سلا کر آپ اکیلے ڈنر کھالیں۔ اس نے کہا آپ اطمینان رکھیں۔ آپ کو کھانے کے لیے باہر لے جاؤں گا۔ ہماری بیگم نے کہا ہے کہ باہر جانے کی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ کی اس ساتویں منزل سے ہم نیویارک کا بیشتر حصہ دیکھ سکتے ہیں۔ چائے پی کر میں خود کھانا بناؤں گی اور آپ کو گھر کا اپنے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھلاؤں گی۔ وہ نوجوان ہندوستانی کھانے کو واقعی ترسا ہوا لگتا تھا۔ اسی لیے بلا سوچے بیگم کے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا کھانے کو تیار ہو گیا۔ اس کے بعد ہم سو گئے اور جب ہماری آنکھ کھلی تو ہندوستانی کھانے کی بھینی بھینی خوشبو کمرے میں آ رہی تھی۔ ہم بھاگ کر باہر گئے کہ کہیں ہم پھر کھانے کی بس مِس تو نہیں کر گئے لیکن لیکن ہم خوش قسمت تھے کہ اس کی بس کنڈکٹر ہماری بیوی تھی۔ اسے کہتے ہیں خویش پروری۔

نیویارک میں ہمارا قیام صرف ایک دن کا تھا۔ یہ بھی صرف اس لیے کہ لمبا سفر دو حصوں میں بانٹا جائے اور تکان کے امکان کو کم کیا جاسکے۔ اب تک ایک ملک سے دوسرے ملک پہنچنے تک ہی وقت میں کمی بیشی ہوتی تھی امریکہ پہنچ کر پتہ چلا کہ اس ملک میں ایک ہی وقت پر کم از کم تین مختلف اوقات ہوتے ہیں۔ اہم طور پر ایک مشرقی وقت جو اوّل الذکر سے ایک گھنٹہ پیچھے ہے۔ اور تیسرا مغربی وقت جو دوم الذکر سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ اگر آپ مغرب سے حساب لگانا شروع کریں تو پیچھے کی بجائے آگے بڑھیے۔ قصہ کوتاہ، مغرب اور مشرق میں تین گھنٹے کا فرق ہے ویسے ہم نے سنا ہے لیکن چوں کہ سنی سنائی بات پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے اس لیے مزید اطمینان کے لیے پڑھا بھی ہے کہ امریکہ میں وقت کے [illegible] خطے ہیں اور پہلے اور آخری خطے میں چھ گھنٹے کا فرق ہے۔ اس معاملے میں روس بھی امریکہ سے پیچھے نہیں وہاں وقت کے بارہ خطے ہیں۔ وقت کے معاملے میں امریکہ اور روس کے مقابلے میں ہندوستان کی اوقات ہی کیا ہے۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی وقت ہے ایک جھنڈا، ایک سکہ ایک وقت۔ وقت کے لحاظ سے ہندوستان میں مکمل قومی یک جہتی پائی جاتی ہے۔ یہ تو کچھ علاقوں نے، کچھ مذہبوں نے، کچھ زبانوں نے یک جہتی پر اپنے سائے ڈال دیئے ہیں ورنہ ہندوستان ان بہت کم ملکوں میں سے ہے جہاں سورج ایک وقت طلوع ہوتا ہے اور ایک ہی وقت غروب ہوتا ہے۔

خیر ہمارا مدعا آپ کو یہ بتانے کا تھا کہ گو نیویارک سے ہوسٹن کی پرواز صرف دو گھنٹے کی تھی۔ لیکن مصنوعی وقت کے لحاظ سے چار گھنٹے کی تھی۔ ہماری اڑان رات کو تھی۔ اس لیے ہمارے پاس نیویارک دیکھنے کے لیے تقریباً پورا دن تھا۔

نیویارک کو ایک دن میں دیکھ لینے کا خیال بھی اس شہر کی توہین ہے۔ اس لیے یہ خیال خام ہم نے اپنے دل خام سے نکال دیا اور اسے اچھی طرح دیکھنے کا پروگرام ہم نے اپنے علاج کے بعد تک اٹھا رکھا ابھی صرف فلک بوس عمارتوں کو ہی دیکھا۔ یہ لمبی لمبی عمارتیں ابھرتی تو زمین سے ہیں لیکن باتیں آسمان سے کرتی ہیں۔ اس شام کو ہم نے چاند دیکھا تو وہ کئی عمارتوں سے نیچے تھا۔ خیر نیویارک کا تذکرہ ہم بعد میں کریں گے اس بار تو مسافر یہاں سے گزر رہا تھا اور مسافر کو کسی شہر سے دل نہیں لگانا چاہیے۔

نیویارک میں ایک دن میں یکے بعد دیگرے دو ہندوستانی دوستوں نے ہمیں ہندوستانی کھانے کھلائے۔ شام کا کھانا اتنا پُر تکلف تھا کہ ہم بمشکل تمام ہوائی جہاز پکڑ پائے۔ دن کا زیادہ حصہ ہم نے ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے

میں کہوں گا کہ نیویارک دوریوں کا شہر ہے۔ بس سمجھ لیجیے امریکہ کی بمبئی ہے۔

بڑی افراتفری میں جہاز پر چڑھے اور ہمارے بڑھتے ہی جہاز نے ہوسٹن کی طرف اڑان بھری۔ ہوسٹن ایرپورٹ پر ہمارے لیے ایک استقبالیہ کمیٹی کھڑی تھی وہاں جن صاحب کے پاس ہمیں ٹھہرنا تھا ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے انھوں نے اپنا حلیہ کپڑوں کے رنگ اور کار کے نمبر سے ہمیں پہلے ہی واقف کر دیا تھا۔

ہندوستانی کو اور خاص طور پر جب اس کی ساڑی میں ملبوس بیوی اس کے ساتھ ہو پہچاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی لیکن اس وقت تین چار ہندوستانی جوڑے وہاں موجود تھے۔ اس لیے ہم سوچنے لگے کہ اپنے میزبان کو کیسے پہچانیں ہم یہ بھول گئے تھے کہ جو فارمولا ہم اپنے میزبان کی پہچان کے لیے استعمال کر رہے تھے وہ ہم پر بھی لاگو ہوتا تھا۔ ایک ہندوستانی جوڑا مسکراتے ہوئے ہماری طرف بڑھا اور ہم نے بغیر ان کا نام پوچھے ان سے ہاتھ ملانا شروع کر دیا۔

ابھی یہ ہاتھ ملانے اور مسکرانے کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ ان صاحب نے جن سے ہم مصافحہ کر رہے تھے، اچانک ہمارا ہاتھ ایسے چھوڑ دیا جیسے ہمارا ہاتھ یکدم گرم پکوڑہ بن گیا ہو یا انھیں یکدم علم ہو گیا ہو کہ ہمیں کوڑھ کی بیماری ہے۔ ہمیں چھوڑ کر وہ ایک اور ہندوستانی مسافر جوڑے کی طرف رجوع ہو گئے۔ ہم بوکھلا گئے۔ لیکن جوں ہی ہم نے منہ موڑا تو ایک اور ہندوستانی جوڑا تیز قدمی سے ہماری طرف بڑھا۔ ہمارا نام بتانے پر پھر انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور گرم جوشی سے ہمارا ہاتھ تھام لیا۔ پھر انھوں نے یہ وضاحت کی کہ جس جوڑے نے ہمیں پہلے ریسیو کیا تھا۔ وہ اکثر ایرپورٹ پر ہندوستانی مسافروں کو یونہی خیرسگالی کے طور پر ان کا استقبال کرنے چلے آتے ہیں۔ ہمارے اصل میزبان یہ صاحب تھے۔

ہوسٹن ایرپورٹ بہت بڑا ہے۔ یہ شہر ریاست ٹیکساس میں ہے۔ وہاں ایک بہت بڑا دیو قامت چمچہ اور کانٹا لگا ہوا ہے۔ جس کے نیچے لکھا ہوا ہے "ٹیکساس کا چمچہ"۔ ایک بہت بڑا کاؤبوائے ٹائپ کا ہیٹ بھی تھا جس کے نیچے لکھا ہے "ٹیکساس کا ہیٹ" گویا ٹیکساس کی ہر چیز بڑی ہوتی ہے۔ اس طرح نووارد سیاحوں کو ایرپورٹ پر ہی ایک قسم کا احساس کمتری ہو جاتا ہے۔ ہمیں ایسا لگا کہ ہم انسانوں کے نہیں دیووں کے شہر میں پہنچ گئے ہیں۔ ٹیکساس کے لوگ بڑے بڑے زمین دار ہیں۔ جہاز سے اترنے کے آدھے گھنٹے بعد ہم اپنے میزبان کے عالی شان بنگلے میں پہنچ گئے۔ یہ شہر سے باہر تھا اور یہاں چاروں طرف کھلے پارک اور ہریالی تھی۔ کار گیراج کے پاس پہنچی تو گیراج کا گیٹ خود بہ خود کھل گیا۔ ہم نے کہا آپ کا نوکر بہت اسمارٹ ہے ہمیں تو ہارن بجا کر اپنے نوکر کو بیدار کرنا پڑتا ہے۔ تب کہیں جا کر وہ دروازہ کھولتا ہے ہمارے میزبان جن کا نام راجو تھا مسکرائے۔ بولے یہاں نوکروں کو بھول جائیے۔ یہ تو میں نے خود آٹومیٹک طریقے سے گیٹ کھولا ہے یہ کہہ کر انھوں نے ہمیں "ریموٹ کنٹرول" کا آلہ دکھایا اب ہمیں معلوم ہوا کہ علی بابا چالیس چور میں "کھل جا سم سم" کہہ کر چوروں کا سردار کیسے غار کا گیٹ کھول لیتا تھا۔ اس کے پاس بھی ضرور ایسا ہی ریموٹ کنٹرول کا آلہ ہوگا اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ امریکہ نے یہ ٹیکنالوجی عربوں سے حاصل کی تھی جسے وہ اب اپنی جتلا کر دوسروں کو بیچتے ہیں۔ ہمارے میزبان ایک ممتاز سائنٹسٹ تھے۔ ہم نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ مسئلہ امریکہ میں زیر بحث رہا ہے اور اس پر کافی ریسرچ بھی کی گئی ہے ایک سیاہ فام امریکی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ "کھل جا سم سم" [illegible] جس کو [illegible] الیکٹرانکس کہتے ہیں عربستان سے ہی آئی ہے۔ یہ کیسے آئی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ مختصراً یہ کہ چالیس چوروں سے یہ ٹکنالوجی علی بابا نے چرائی۔ علی بابا کے ایک پڑپڑپڑپوتے کو ایک سفر کے دوران سمندری لٹیروں نے قید کر لیا اور اسے غلام

بنا کر امریکیوں کو بیچ دیا اس نوجوان میں بھی علی بابا کی سی ہوشیاری تھی۔ اس نے ریموٹ کنٹرول ٹکنالوجی کا راز امریکیوں کو بتا کر رہائی حاصل کرلی۔ صرف خربوزہ ہی خربوزے کو دیکھ کر رنگ نہیں پکڑتا ہے بلکہ یہ خصلت ہر چیز میں ہے۔ اس طرح ایک ٹیکنالوجی سے دوسری نکلی اور دوسری سے تیسری۔ نتیجہ یہ کہ اس دن سے آج تک امریکہ نے ٹیکنالوجی کے ہر شعبے میں اپنی سبقت بنائے رکھی ہے۔ لیکن اس تھیوری کے بعد ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ چالیس چوروں نے یہ ٹیکنالوجی کہاں سے حاصل کی۔ راجو نے ہمیں بتایا کہ یہ سوال اور لوگوں کو بھی سوجھا ہے اور اب ایک اور ریسرچ چل رہی ہے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ چالیس چوروں والی ٹکنالوجی اصل میں ہندوستان سے آئی تھی۔ کیوں کہ عام عقیدہ یہی ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان تمام ملکوں سے آگے تھا اور دنیا کی اکثر چیزیں ہندوستان میں ہی ایجاد ہوئی تھیں۔ ہم نے راجو صاحب سے کہا کہ بخدا اس ریسرچ کو بند کروائیے۔ کہیں یہ ثابت نہ ہو جائے کہ چوروں والی ٹکنالوجی ہندوستان سے ہی آئی ہے بلکہ کو شک ہی رہنے دیجیے۔ یقین میں نہ بدلیے۔ جہاں تک ایجادات اور دریافتوں کا تعلق ہے ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ ہندوستان میں صرف صفر کی دریافت کی گئی۔ باقی سب ہند سے دوسرے ملکوں نے دریافت کیے ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تک ہر شعبے میں ہم عادتاً صفر ہی دریافت یا ایجاد کرتے آرہے ہیں۔ باقی دریافتوں یا ٹکنالوجی کے لیے ہم دوسرے ملکوں سے درآمد کے معاہدے کرتے ہیں۔

ہماری کار گیراج میں جا کر رکی ہم اس سے باہر نکلے تو گیٹ پھر خود بخود ہی بند سم سم ہو گیا۔ راجو ہماری طرف دیکھ کر مسکرایا اور ہم سب پچھلے دروازے سے ان کے گھر میں داخل ہو گئے۔ وہاں پہلی منزل پر ہی ہمارے لیے ایک کمرہ بہت ہی قرینے سے آراستہ کر کے تیار رکھا گیا بلکہ رکھوایا گیا کیوں کہ ہماری بیماری کی وجہ سے ہمیں کوئی شخص سامان اٹھانے نہیں دیتا تھا۔ اس ملک میں جہاں ہر شخص اپنا کام کرتا ہے سب لوگ ہمارا کام کرنے میں مستعد تھے۔

راجو کی بیوی چھایا نے جو ایرپورٹ تک ہمارا استقبال کرنے اپنے خاوند کے ساتھ آئی تھی کھانا پروسا۔ کھانا جنوبی ہند کا تھا اور بہت ہی مزے دار۔ چھایا بڑی چنچل اور غیر رسمی قسم کی عورت تھی۔ اس کا باپ تلگو کا ادیب تھا اور ہم اس سے مل چکے تھے۔ چند ہی لمحوں میں ایسا لگا کہ ہم انھیں کئی برسوں سے جانتے ہیں۔

ضیاء الحق قاسمی
کراچی

ٹیلی فون

آج تک ہوتا رہا ہے میرے ارمانوں کا خون — دس برس کے بعد آخر لگ گیا ہے ٹیلی فون

[illegible] ڈیمانڈ نوٹس ہکا بکا رہ گیا — اور مری آنکھوں سے خوشیوں کا سمندر بہہ گیا

دیکھ کر ڈیمانڈ نوٹس میری آنکھیں پھٹ گئیں — ساعتیں جب بے قراری کی تھیں آخر کٹ گئیں

ڈاکیے نے دی مبارک کچھ عجب انداز سے — بحث کیا کرتا میں اس سرکاری حیلہ ساز سے

میرے گھر اہلِ محلہ شام تک آتے رہے — اور مبارک بادیوں کے پھول برساتے رہے

میری بیوی اور میرے بچے سب کے سب حیران تھے — منہ کھلے ہی رہ گئے تھے جیسے روشن دان تھے

اک پڑوسی کو تو لگتا تھا کہ سکتہ ہو گیا — میں محلے بھر کی نظروں میں بھی یکتا ہو گیا

گھر میں لانا فون کا لانا ہے جیسے شیر کا — یہ کرم مجھ پر ہوا ہے کاتبِ تقدیر کا

[illegible] کی عزت ہے جہاں میں جس کے گھر میں فون ہے — ایسے لاکھوں ہیں کہ جن کی حسرتوں کا خون ہے

خوش نصیبی ہے کہ جیتے جی مجھے یہ مل گیا — اور گریباں چاک تھا جو وہ بھی آخر سل گیا

میرے اللہ ہر پڑوسی صاحبِ ٹیلفون ہو — ہر دوا خانے میں جادو کی یہی معجون ہو

میرے اللہ اس کی گھنٹی اب سدا بجتی رہے — ان سُروں سے محفلِ دل رات دن سجتی رہے

اچھی خبریں یہ مجھے ہر وقت پہنچاتا رہے — اور مناسب سا مہینے بھر کا بل آتا رہے

[illegible] بل ہمیں [illegible] رہیں
پیٹ بھرنے کے لیے پھر ہم [illegible] رہیں

تارا سنگھ کامل (نئی دہلی)

فکر تونسوی کی بذلہ سنجی
ـــــ ذاتی زندگی میں

حضرات فکر تونسوی کی شخصیت کے جس پہلو سے مجھے دوچار ہونا پڑا ہے ۔ وہ پہلو نہایت پُر خطر ہے ۔ یعنی فکر تونسوی کی ذاتی زندگی میں بذلہ سنجی کا پہلو ۔ ذاتی زندگی میں یوں تو بہت کچھ ہوتا ہے اور اُسے بیان کرنا تک بھی ناممکن ہے مگر ذاتی زندگی کا طنز و مزاح سماج کی مقرر کردہ حدود کو ذاتی زندگی میں اکثر پار کر جاتا ہے ۔ اس لیے ذرا سنبھل کر بات کرنا ضروری ہو گیا ہے ۔ اس مضمون میں جہاں کہیں کھل کر بات کی گئی ہے وہ بے حد ضروری ہے ۔ ورنہ مضمون میں وہ چٹخارہ پیدا نہ ہوتا جو فکر تونسوی کے ضمیر میں ہی تھا ۔

وہی بات لب و لہجہ کی ۔ اس کے لیے میں بھی باقی پنجابی اہل قلم کی طرح معذرت خواہ ہوں ۔ ویسے فکر تونسوی کا لب و لہجہ بھی مجھ سے مختلف نہ تھا ۔ پنجابی اکثر ولولہ کو ولولا ۔ مکروہ کو مکردہ ۔ محبت کو محبت ، توقع کو توق اور فکر تونسوی کو فکر تنسی پڑھ جاتے ہیں ۔ فکر تونسوی ۔ دیویندر ستیارتھی ۔ ہزارہ سنگھ گوردا سپوری اور میں 1960ء میں انڈو پاک رائٹرز کانفرنس لاہور پاکستان میں شریک ہوئے ۔ ہماری اردو لب و لہجہ سے متاثر ہو کر جناب وقار انبالوی کہنے لگے ۔ سکھ جب اردو بولتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے جھوٹ بول رہا ہے ۔

فکر تونسوی کے ساتھ بے شمار محفلیں جمیں ۔ کناٹ پلیس کے کافی ہاؤس میں شام کو سب دوست اکٹھے ہوتے تھے ۔ ایک دن کافی ہاؤس میں بیٹھے تھے ۔ اردو ادب کے بارے میں بات چل رہی تھی ۔ بلراج مینرا نے فکر تونسوی سے پوچھا ۔ فکر صاحب اگر اردو ادب کا ڈھیر لگا کر اسے آگ لگا دی جائے تو اس میں سے آپ کون سی کتاب کو بچانا چاہیں گے ؟

" دیوان غالب " ! فکر نے کہا ۔

مینرا کے ہاتھ میں کماریاشی صاحب کی کتاب تھی ۔ اسے دکھاتے ہوئے مینرا نے پوچھا ۔

کماریاشی صاحب کی اس کتاب کا کیا ہوگا ؟

فکر فوراً بولے " اس کتاب کی وجہ سے ہی تو اردو ادب کو آگ لگانا پڑے گی "

ایک شام جناب مخدوم محی الدین فکر کے ساتھ کافی ہاؤس میں تشریف لائے ۔ شام ہوئی تو ان سے کچھ سننے سنانے کا بندوبست کیا گیا ۔ ایک پارک میں محفل جمی ۔ ابھی دوسرے پیگ تک بھی نہ پہنچے تھے کہ پولیس کی ایک جیپ

ہماری غراتی ہوئی آ پہنچی۔ اُس میں سے ایک ایس آئی اُترا۔ ہم ڈر گئے۔ ایس آئی۔ صاحب نے آتے ہی سیلوٹ مارا اور کہا۔ "جناب ایم ایل اے صاحب (اشارہ مخدوم صاحب کی طرف تھا) آپ اطمینان سے پئیں۔ میں نے ایک کانسٹیبل کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔ ادھر کوئی نہیں آئے گا۔ فکر تونسوی نے یہ سُنا تو خوش ہوتے ہوئے تھانیدار کی طرف شکریہ کا ہاتھ بڑھایا اور بولے۔ آپ بھی ہماری محفل میں شامل ہوں۔ مجھ خاکسار کو فکر تونسوی کہتے ہیں"۔
تھانیدار نے مخدوم صاحب سے پوچھا۔ "یہ کون صاحب ہیں"؟
" فکر ہم سے مخاطب ہوا ——— "سالو۔ تم تو کہتے تھے کہ میں بہت مشہور رہوں۔ یہ تھانیدار تو مجھے جانتا ہی نہیں۔

ایک دفعہ میں نے فکر تونسوی سے پوچھا۔ فکر صاحب۔ جب بھی کوئی شخص آپ سے کچھ سنانے کو کہتا ہے آپ اپنی غزل ترنم سے ضرور سناتے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟
فکر کہنے لگا۔ "میں بچپن سے ہی کمزور الجثہ ہوں۔ اس لیے جب بھی سٹیج پر جاتا ہوں تو میرا ترنم نکل جاتا ہے۔ یہ نکل جانا کی ترکیب خالص پنجابی ہے۔

فکر تونسوی ماضی اور حال کی دراڑ میں اُگا پیڑ تھا جس کی شاخیں دونوں طرف لہلہاتی تھیں۔ اُس نے عہد گزشتہ میں بھی جھانکا ہے اور عہد جدید کے سماج میں پھیلی اوہام کی تپتی دھوپ کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اُن کے ہاں جو شگفتگی اور ظرافت پائی جاتی ہے وہ اُن کے خمیر میں تھی۔ لیکن یہ فکر تونسوی کی گفتگو سے کم اور اس کی تحریروں میں زیادہ اُبھر کر سامنے آتی ہے۔
ہم لوگ۔ یعنی مخمور جالندھری، بلراج کومل۔ دلیپ سنگھ، اوتار سنگھ جج، مورتی جڈھا، ہردیو سنگھ اور دوسرے لوگ شام کے وقت جمع ہو کر ٹہلا کرتے تھے۔ شام کی محفل اور اِدھر اُدھر کی تانک جھانک کے بعد اپنے اپنے گھروں کی پناہ گاہوں تک چلے جاتے۔ مگر فکر تونسوی اچانک ہی چلتے چلتے کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ ایک شام ہم نے فکر کا پیچھا کیا۔ چلتے چلتے وہ ایک پیڑ کی اوٹ میں غائب ہو گئے۔ جب دیکھا کہ یاروں کی ٹولی دور نکل گئی ہے تو درخت کی جڑوں سے نمودار ہوئے۔ سگریٹ سلگائی اور کش لیا۔ اور مخالف سمت کی ایک ویران سڑک پر سر جھکائے چلنے لگے۔ کچھ دور ایک سانڈ کو گاؤ تکیہ بنائے ایک بھکاری لیٹا ہوا تھا۔ فکر تونسوی قریب پہنچے اور سانڈ کے کان میں پوچھا ——— سگریٹ پیو گے سانڈ بابا؟ سانڈ نے کان پھڑپھڑائے۔ بھکاری بولا ——— ارے بھائی کا ہونے دے۔ اِدھر لا سگریٹ مجھے دے۔ فکر تونسوی نے اُس بھکاری کو سگریٹ تھمایا اور اپنے سگریٹ سے سلگا دیا۔ بھکاری نے اطمینان سے سگریٹ کا کش لیا اور دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "بچو۔ آ... ہا سالے سگریٹ دے کر ثواب مانگتے ہیں........ فکر تونسوی چونکا۔" ارے۔ ہمارا سگریٹ پیتا ہے اور ہمیں ہی میاؤں؟ بھکاری نے سگریٹ ہونٹوں سے نکال کر دور پھینک دیا۔ اور بولا ——— لے۔ لے جا [illegible] بابا۔ [illegible] ہم تجھے داتا بننے دیں گے۔"

ایسے کردار فکر تونسوی کو بہت عزیز تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ خود دان یا کسی کا احسان لینے سے پرہیز کرتے تھے۔

بلراج کومل کا پہلا مجموعہ کلام جس کا نام بعد میں "رشتہ دل" رکھا گیا جب شائع ہو رہا تھا تو کوئی موزوں سا نام سوجھ نہیں رہا تھا۔ کسی نے کہا اس کتاب کا نام "پھول اور کانٹے" رکھ لیجیے۔ فکر تونسوی نے منع کرتے ہوئے کہا یہ نام مت رکھو۔ نقادوں کے ہاتھ خواہ مخواہ ایک فقرہ آ جائے گا کہ اس کتاب میں پھول کم اور کانٹے زیادہ ہیں۔

رجالندھری اور فکر تونسوی جالندھر سے دلی چلے آئے اور ایک روزنامہ اردو اخبار میں ملازمت اختیار کر لی۔ آہستہ آہستہ دوستوں اور مداحوں کا ایک حلقہ بن گیا۔ حسب معمول ادبا و شعرا کی میٹنگیں ہونے لگیں۔ کوئی نظم یا غزل سناتا تو کوئی افسانہ ان پر کھلے دل سے تنقید کی جاتی۔ بعض اوقات کسی کسی کو توبہ رگڑوا دیا جاتا۔ اگر سہہ جاتا تو اسے پاس سمجھ لیا جاتا۔ اگر نہ سہہ سکتا تو دوبارہ ادھر کا رخ کبھی نہ کرتا۔ میٹنگ جلد ختم کرنے کی کوشش کی جاتی کیونکہ اس کے بعد اصل محفل آراستہ ہوتی تھی۔

جب بہت سے میٹنگیں ہو چکیں اور حاضری بھی ضرورت سے زیادہ ہونے لگی۔ بلکہ بھیڑ سی ہو گئی تب ایک روز مخمور رجالندھری نے فکر تونسوی کی طرف معنی خیز نظروں سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "فکر میرا خیال ہے کہ اب ان سب کو ڈگریاں بانٹ دیں اور سکول میں پانچ سات سال کی چھٹیاں کر دی جائیں۔" فکر نے کہا۔ ٹھیک ہے لیکن ان سے چھٹیوں کی ایڈوانس فیس وصول کر لی جائے۔

ایسی ہی ایک میٹنگ میں فکر تونسوی نے ایک خاکہ پڑھا۔ اس خاکے پر ایک نقاد نے سخت تنقید کی۔ فکر تونسوی اس کو بار بار ٹوکتے رہے۔ مخمور نظامت کر رہے تھے۔ انھوں نے فکر سے کہا۔ "فکر صاحب آپ خاموش رہیے۔" فکر جھٹ سے بولے ——— "ہمنوا میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں؟"

ایک سفارت خانے میں ایک ڈرنک پارٹی چل رہی تھی۔ جام اور سنیکس کی بھرمار تھی۔ فکر اسی شام معمول سے زیادہ پی گئے اور ایک کونے میں لیٹ گئے۔ مخمور نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔ کل کو اخبار کا کالم کون لکھے گا؟

ستندر سنگھ کہنے لگا۔ فوٹوگرافر کو بلاؤ اور فکر تونسوی کی تصویر کھینچ لو۔ اخبار کے کالم کی جگہ اس کی تصویر چھاپ دینا اور اس کے نیچے کیپشن لکھ دو۔ جناب فکر تونسوی آج آرام فرما رہے ہیں۔

ہمارے اس گروپ میں کیمسٹری کے ایک پروفیسر صاحب بھی تھے۔ ان کا نام لینا مناسب نہیں ہے وہ اکثر ایسی سفارتی پارٹیوں میں جاتے اور سنیکس وغیرہ اپنے کوٹ کی جیبوں میں بھر لیا کرتے تھے۔ ظاہر

ہے کو کو، گھی اور تیل کی وجہ سے خراب ہو جاتے۔ ایسی پارٹیوں میں وہ ہماری سرپرستی کے جذبے کا اظہار بڑی بے تعلقی سے کرتے۔ کوٹ کی جیبوں میں سے ٹکٹیں نکال کر ہمیں دینے کے لیے ہمارے پیچھے بھاگتے اور ہم ان کی سرپرستی سے بچنے کے لیے کسی نہ کسی ڈھنگ سے انھیں طرح دے جاتے تھے۔ ایک پارٹی میں ہمیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ پروفیسر صاحب کے کوٹ کی جیبیں خالی ہیں۔ فکر نے پوچھا۔ پروفیسر صاحب آپ کی جیب میں کچھ مال وال نظر نہیں آتا۔ کیا وجہ ہے؟ پروفیسر بولا۔ فکر صاحب آج کل ڈرائی کلنگ بہت مہنگی ہو گئی ہے۔ فکر نے تجویز کیا کہ جناب آپ پلاسٹک کا لفافہ جیب میں رکھیں اور لفافے کا منہ باہر رہے۔ جس میں ہم سب کے لیے دانا دُنکا ڈال لیا کریں۔ اگر آپ ہماری سرپرستی نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟

ایک سکھ لیڈر ہیں جن کا مشغلہ دہلی کی دیواروں پر عجیب و غریب نعرے لکھوانا ہے۔ اور وہ خالی دیواروں کی طرف یوں لپکتے ہیں جس طرح آج کے ادیب اور نقاد سرکاری انعام کی طرف لپکتے ہیں۔ وہ لیڈر صاحب سکھ لیڈروں کی روایت کے عین مطابق اَن پڑھ ہیں۔ مگر انھیں اپنے آپ کو پڑھا لکھا ثابت کرنے کا خبط سوار رہتا ہے۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے ہمیں فکر تونسوی سے ملوا دیجئے۔ انھیں بہت سے لوگ پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے ایک روز ان کو فکر صاحب سے ملوا دیا۔ ان سکھ لیڈر صاحب کا خیال تھا کہ فکر صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اس لیے وہ اپنی گفتگو میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کہنے لگے۔ تونسوی صاحب پنجاب کا مسئلہ حل کرنے کے لیے میرے پاس بہت سی سکیمیں ہیں اور اس کی بھی ایک وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ میرا دماغ بہت زیادہ فرٹیلائزر ہے۔

فکر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سردار جی۔ فرٹیلائزر تو آپ کے دماغ میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔

اس سکھ لیڈر نے فکر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ یہ تو آپ کی انکساری ہے تونسوی صاحب جو میری اتنی تعریف کر رہے ہو۔

الیاس صدیقی
(مالیگاؤں)

سر بہ زانو

ن۔ م راشد کی ایک نظم زیر مطالعہ تھی جس کا عنوان ہے "سلیمان سر بہ زانو اور سبا ویراں" — نظم چونکہ جدید تھی اور بھی نثری، اس لیے اس کا سمجھنا تو جیسے قیاس تھا ہی، لیکن عنوان نے ایک عجیب حیرت بخش روشنی میرے اندر بکھیر دی۔ حیرت "سبا ویراں" کے ٹکڑے پر ہرگز نہیں تھی کہ دورِ حاضر میں سینکڑوں ویران سباؤں کی بہار سے ہمارے آس پاس موجودگی نے حیرت کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی! حیرت "سلیمان سر بزانو" پر تھی کہ معنوی تہہ داریوں سے بھرپور ایسی تراکیب اب خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

سر بزانو کی ترکیب میں شامل سر اور زانو اور اردو شعر و ادب کے لیے نئے نہیں ہیں۔ سر مدتِ دراز سے کٹانے یا اوکھلی میں دینے کے لیے اور زانو بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتے رہے ہیں لیکن جب دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے میرے سامنے سے گزرے تو معنی کے بے شمار رنگ قوس قزح کی طرح نظروں میں بکھر گئے۔

سر بزانو کا جو پہلا تصور ذہن کے پردے پر اُبھرتا ہے وہ ایک خوب صورت دوشیزہ کا خوب صورت تصور ہے جس کی خوب صورت آنکھوں میں آنسوؤں کے موتی چمک رہے ہیں۔ رخساروں پر اشکوں کی لکیریں ہیں جن میں ہلکا سا سرمئی رنگ بھی شامل ہے زلفیں لوبان کے دھوئیں کی طرح بکھری ہوئی ہیں قریب ہی ایک شمع جل رہی ہے جو بجھنے کے قریب ہے دور کہیں تصور کی تاریک فضاؤں میں ستارے جھلملا رہے ہیں اور وہ اپنے زانو پر سر رکھے غالباً نہیں یقیناً کسی کا انتظار کر رہی ہے .... وغیرہ وغیرہ۔

مندرجہ بالا سطروں میں ایک دوشیزہ کے منظر اور پس منظر کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ سر بزانو نام کے کیمرے سے کھینچی گئی ہے۔ اتنا طویل پیراگراف دیکھتے ہوئے اگر صرف "سر بزانو" لکھا جاتے تب بھی وہی سب کچھ پردہ تصور پر اُبھرتا ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کے انتظار میں سر بزانو ہونا یعنی بیٹھنا کوئی لازمی چیز نہیں ہے انتظار کرنا، آنسو بہانا، زلفیں بکھرانا یہ تمام کام کھڑے ہو کر بھی کیے جا سکتے ہیں جواب یہ ہے کہ اوپر جو بیان کیا گیا ہے وہ سر بزانو کا کلاسیکی تصور ہے۔ اُس وقت کا تصور جب سینما ہال راشن کی دوکانیں اور بسیں ایجاد نہیں ہوئی تھیں اور مرد و زن قطاروں میں کھڑے ہو کر انتظار کرنے کی لذت سے ناآشنا تھے۔

اہل نظر جانتے ہیں کہ سر بزانو آج اگر کسی دوشیزہ سے وابستہ ہو تو وہ دوشیزہ لازمی طور پر کسی دیہات یا گاؤں کی ہونی چاہیے کیونکہ شہری دوشیزاؤں میں اب صرف ایک کا انتظار کرنے کی بدعت قریب الختم ہے۔ چند سال

پیشتر "تو نہیں اور سہی" کا رواج شروع ہوا تھا۔ اب "اور نہیں اور سہی" کا چلن عام ہے اور ہمارے عہد کا غالب رجحان ہے جس کا مرزا غالب سے کوئی تعلق نہیں۔

کچھ لوگ تو اس پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ موجودہ دور میں دراصل کسی دوشیزہ کا کسی کے انتظار میں "سربزانو" رہنے کا تصور ہی ناممکن ہے اب اس دوشیزہ کو لے لیجیے۔ (یہ جملہ انھیں معنوں میں استعمال ہوا ہے جو آپ کو پسند ہے لیکن ہم دونوں کے لیے قابل عمل) جس کا وہ انتظار کر رہی ہے وہ ایک مسافر تھا اور مسافر کو راستے میں کہیں نہ کہیں شام تو ملتی ہی ہے جیسا کہ موٹر لاریوں کے پیچھے اکثر لکھا ہوتا ہے۔ ع میں مسافر ہوں میری صبح کہیں، شام کہیں...... اس لیے ڈنر کھانا بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے۔ گھر پر کھایا ہوٹل میں کھایا، اسم ہی کی [illegible] پڑتا ہے۔

ٹھیک ٹھیک نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دوشیزہ کسی ہرجائی کا انتظار کیوں کر رہی ہے؛ اگر اس کے پیچھے پاکیزہ جذبہ محبت کی تعمیل کی کوئی چیز ہے جس کا امکان ایک فی صد بھی نہیں) تو موجودہ دنیا پر یہ طنز کر حیرت کے چند دلوں کا پورا سلسلہ ٹوٹ پڑے گا۔

بہرحال انسانیت (آج والی) کا تقاضا یہ ہے کہ سربزانو دیکھنے والے اس ہرجائی کا مستقل رہائشی پتہ لے کر اسے تار دے دیں یا فون سے اطلاع پہنچا دیں۔ جیب سے تھوڑی سی رقم جائے گی لیکن اس دوشیزہ سے تعارف کے ساتھ ساتھ اس کی ہمدردی بھی حاصل ہو جائے گی۔ اس طرح سے اس کی دلجوئی کرنے سے ممکن ہے کہ وہ چند ہی دنوں کے بعد اپنے پہلے محبوب کو بھلا کر ثانیاً آپ کا انتظار کرنے والے کے انتظار میں سربزانو ہو جائے انسانیت کی اس سے بڑی خدمت اور کیا ہو گی۔

سربزانو کا دوسرا تصور بھی عورت ہی سے متعلق ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ عورت کنواری نہیں ہے (کنواری تو شاید وہ بھی نہیں تھی۔ آپ کا کیا خیال ہے) بیاہتا ہے اور اس کے شوہر نے اسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا ہے۔ یہ آپ کی قوت متخیلہ پر منحصر ہے کہ آپ اسے سڑک پر سربزانو دیکھیں یا اپنے میکے میں کسی عورت کو اس طرح زبردستی سربزانو کر دینے کے بہت سے اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً لڑائی جھگڑے، بدچلنی، جلی روٹی، شراب یا طلاق۔ اس سربزانو کے عناصر ترکیبی میں بھی انتظار جزو عظیم ہے۔ اوپر بیان کی گئی وجوہات میں سے آخری وجہ کو چھوڑ کر باقی وجوہات کی موجودگی کی صورت میں اپنے ظالم شوہر کا انتظار اور طلاق کی صورت میں کسی دوسرے کا ——

سربزانو کا تیسرا واضح تصور مرد سے متعلق ہے۔ آج کے چمن میں جہاں آزادانہ اختلاط رنگ و بو سے اکثر بات بن جایا کرتی ہے، کسی مرد سے وابستہ سربزانو کا تصور عصری تقاضوں سے میل نہیں کھاتا لیکن بعض مواقع پر اسے خارج از امکان بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اخبارات و رسائل میں اکثر آپ نے اس قسم کے اشتہارات بڑی دلچسپی سے پڑھے ہوں گے۔ مثلاً ——

شادی سے پہلے، شادی کے بعد، ملیے یا لکھیے، خط و کتابت راز میں رکھی جائے گی۔ آپ کا ہمدرد۔

ڈاکٹر مظفر .... وغیرہ' اس تمہید کے منطقی نتیجہ کے طور پر ایک مرد کو بھی (آپ اس کی بجائے کوئی دوسرا مناسب نام دے سکتے ہیں) سربزانو ہوجانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ سربزانو اپنی روٹھی ہوئی قسمت کے علاوہ کسی کا انتظار نہیں کرتا بلکہ جو اس کے انتظار میں راتوں کو سربزانو جاگتا ہے اسے بھی گھر بھیجنے کے چکر میں ہوتا ہے غور طلب امر یہ ہے کہ جہاں مرد و زن سربزانو ہوں وہاں زندگی گزارنے کی سبیل اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ مونث اپنے مذکر سے نجات پالے اور مذکر اپنی زندگی سے ـــــــ

ایک اور سربزانو ہے جو اکثر پانچ برسوں کے بعد دنیا کے سامنے آتا ہے۔ یہ الیکشن میں شکست خوردہ امیدوار ہے ان میں مرد بھی شامل ہیں اور خواتین بھی۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ یہ لوگ چن کر نہیں آتے اس لیے سربزانو ہوتے ہیں۔ دراصل لوگ ان کو اس لیے نہیں چنتے کہ اگر منتخب ہو جائیں تو پوری قوم کو پانچ سال تک سربزانو رہنا پڑے۔ قوم کے ذکر پر یاد آیا کہ صرف افراد ہی سربزانو نہیں ہوتے کبھی کبھی آباو اجداد کی ماضی کی غلطیاں مستقبل کی بے قصور نسلوں کو مدتِ دراز تک سربزانو رہنے پر مجبور کر دیتی ہیں (شکر ہے ہماری نسل محفوظ ہے)

ابھی تک جتنے "سربزانو" ہمارے سامنے آئے اُن میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ یہ کہ "سر" بھی ان کا تھا اور "زانو" بھی۔ سربزانو کے ایک اور خوب صورت تصور میں سر اور زانو کے مالک دو علٰحدہ افراد ہوتے ہیں۔ عام طور پر اُن کی صنف بھی علٰحدہ ہوتی ہے لیکن محمود و ایاز کے افسانے سے عیاں ہے کہ اس میں تذکیر و تانیث کی کوئی قید نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سربزانو ہونے کا یہ طریقہ سب سے زیادہ اعلیٰ، نفیس اور پُرکشش ہے۔ ایسا سربزانو فرد (یا مرد) دماغ اور راتوں کا بلا شرکت غیرے مالک ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ البتہ نیند کا معاملہ مشکوک ہو جاتا ہے کیونکہ اس سربزانو میں اور نیند میں بعد المشرقین ہے۔ غالب کا یہ فرمانا کہ ـ

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے شانوں پر پریشاں ہو گئیں

اس شعر میں عاشق اور کچھ بھی ہو سربزانو نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس صورت میں محبوب کی زلفوں کا اس کے شانوں تک پہنچنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غالب کو چونکہ دماغ اور راتوں کے ساتھ نیند بھی شامل کرنا مقصود تھا (جو خلاف واقعہ ہے) اس لیے وہ سربزانو جیسی خوب صورت اور جامع ترکیب سے محروم رہا۔ مجبوراً زلفوں کو شانوں تک پہنچا کر رخصت لے لی (یعنی سو گیا)

یہ طے کرنا سخت مشکل ہے کہ وہ کون کون سی حالتیں ہیں جب ایک کی زلفیں دوسرے کے شانوں (یعنی دونوں شانوں) پر آسانی سے پریشان ہو سکتی ہیں چونکہ یہ حالتیں سربزانو کے دائرہ کار سے خارج ہیں اس لیے ہمارا قلم انھیں بیان کرنے کا پابند ہے اور آپ کا تخیل ان کے بارے میں اندازہ لگانے کے لیے آزاد۔

سربزانو کے کچھ سماجی پہلو بھی ہیں۔ ایک سوشیالوجسٹ کا قول ہے کہ انسان سماجی جانور ہے۔ یہ جانور

جاہے جس طبقہ میں پایا جائے سربزانو ہی رہتا ہے۔ مزدور سربزانو ہے کہ تنخواہ کیسے بڑھے؟ سرمایہ دار سربزانو ہے کہ منافع میں اضافہ کیسے ہو؟ استاد سربزانو ہے کہ طلبا لکھتے پڑھتے نہیں؟ طلبا سربزانو ہیں کہ پڑھنے لکھنے سے فائدہ کیا ہے۔ مدیر رسالہ سربزانو ہے کہ ادب کی صحت مند روایات کہاں کھو گئیں؟ تخلیق کار سربزانو ہے کہ اپنی تخلیق کس رسالے میں اور کس کے وسیلے سے شائع کروائے؟ سربراہان مملکت سربزانو ہیں کہ اگلا الیکشن کیسے جیتا جائے؟ رعایا سربزانو ہے کہ حکومتیں درست کیوں نہیں ہوتیں... وغیرہ وغیرہ......

قدیم عقیدہ یہ تھا کہ دنیا انسانوں کے رہنے بسنے کی جگہ ہے۔ مسلسل جنگوں اور فسادات کے بعد اس نظریہ کو رد کر دیا گیا ہے جدید ترین خیال یہ ہے کہ دنیا سربزانوؤں کی آماجگاہ ہے۔ یہی وہ قدر مشترک ہے جو ہر انسان میں بلا تفریق مذہب و ملت پائی جاتی ہے۔ قومی یک جہتی، جذباتی ہم آہنگی اور عالمی بھائی چارے کی اگر کوئی ٹھوس بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ ہے سربزانوئیت! یہ رشتہ وہ عجیب رشتہ ہے جو سب کو ایک کر دیتا ہے اور ایک ہونے کے لیے محمود و ایاز کی طرح ایک صف میں کھڑے ہونا بھی ضروری نہیں۔ آؤ ہم بھی اخلاص نیت کے ساتھ سربزانو ہو جائیں کہ دنیا کا امن اور سلامتی اسی میں پوشیدہ ہے۔

سید عباس متقی
(حیدرآباد)

خدا بچائے اس کرکٹ سے

نہیں معلوم کرکٹ جیسا لغو، بے معنی اور غیر موزوں کھیل کس احمق نے ایجاد کیا ہے کہ آج تک بے شمار لوگ اس کھیل کے ذریعہ مسلسل بے وقوف بنتے اور اپنی دنیا مع عاقبت خراب کرتے آ رہے ہیں۔ ہمارے خیال میں کھیل وہی اچھا ہے جو مختصر اور مفید ہو جیسے "اٹھا چما" سبحان اللہ کیا گیم ہے کاپی کے ایک ہم دستہ کاغذ اور پنی املی کے دو عدد بیج درکار ہوتے ہیں چولہے پر چاول رکھ کر میاں بیوی کھیلنے بیٹھیں تو ابال آنے سے پہلے پہلے کھیل ختم یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ ایک ایک دن (دو دو دن) اور تین تین دن چل رہا ہے۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر کرکٹ تمام ہوتی ہے

کرکٹ کھیلنے والوں پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں کہ وہ کھیلتے ہیں کیونکہ وہ صرف کرکٹ کھیلنے ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں جیسے ہم شوہر ہیں تو شوہری کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ اعتراض دیکھنے والوں پر ہے کہ کس انہماک سے دیکھتے اور کس اہتمام سے سنتے ہیں کہ حیرت کے ہمالہ ٹوٹنے لگتے ہیں۔ ٹی وی پر کرکٹ دیکھنے والا دوسری جانب نہیں دیکھتا، خواہ دوسری جانب پری رو خواتین بے پردہ ہی کیوں نہ کھڑی ہوں۔ ریڈیو پر کرکٹ کامنٹری سننے والا کوئی اور بات سنتا ہی نہیں خواہ اسے موٹی موٹی گالیاں ہی کیوں نہ دی جا رہی ہوں۔

جب سے کرکٹ کی ہوا چلی ہے۔ کیا چھوٹا کیا بڑا اور کیا منجھلا سب ہی اس ذوق لطیف سے متصف دکھائی دیتے ہیں۔ مولوی، منشی، استاد، حجام، کلرک، موچی، قصاب، میکانک، وکیل، بھنگی، پروفیسر، شاعر، بیروزگار، مرشد، مرید، افسر، چپراسی سارے کے سارے کرکٹ کے دیوانے ہوگئے ہیں ہمارا خیال ہے کہ اگر مجنوں اس دور میں ہوتا تو وہ جنگل کی راہ لینے کی بجائے کسی اسٹیڈیم کی راہ لیتا اور ہائے لیلیٰ کرنے کی بجائے ہائے چوا ہائے چھکہ کرتا۔ چلئے اس کھیل نے تو تفریق من و تو ختم کردی۔ اب آفیسر کو چپراسی سے اسکور پوچھنے میں عار ہے نہ چپراسی کو اسکور پوچھنے میں کوئی تامل اب تو سب ہی کرکٹ کے طفیل ایک صف میں ایستادہ ہیں۔

ایک کرکٹ کے ہیں دیوانے یہ محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

میچ کے دنوں ہم دیوان خانے میں چائے نوشی کرتے ہوئے مزاحیہ مضامین لکھتے ہیں یا سنجیدہ غزلیں کہتے ہیں

اب یہ ہماری شامت ہی آئی تھی کے عین میچ کے دن ہم گھر سے باہر نکلے۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان میچ کھیلا جا رہا تھا سڑکیں سنسان تھیں۔ ہُو کا عالم طاری تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ چوطرف کرکٹ کرفیو لگا ہوا ہے جس طرح گڑ کے اطراف مکھیاں جمع رہتی ہیں۔ یہی کچھ ہر ٹی وی کا عالم تھا۔ ہمیں اس کھیل سے خدا واسطے کا بیر ہے ہم عقل مندوں کی طرح وقت کو دولت عظیم تصور کرتے ہیں۔ گو غربت کے طفیل گھڑی نہیں رکھتے لیکن گھڑی گھڑی کی قدر جانتے ہیں۔ ادھر اُدھر گھومتے ہوئے ایک حجامت خانے کا رخ کیا۔ حجام ہاتھ میں استرا لیے گم سم کھڑا تھا گویا اسے تو وہانی: حجامت کا شوق چرایا ہے۔ ہم نے جمعراتی کی طرح آواز دی کیا بابا ـــــ حجامت بناؤ گے۔ ایک نہ دو۔ استاد! کوئی توجہ نہیں: ہم سمجھے کہ کرسی کے پیچھے کھڑا ہے ہم نے جھلا کر زور سے چیخا۔ کام کرنا ہے یا آگے جاؤں۔ وہ چونک پڑا۔ آیئے صاب آیئے۔ ذرا کمنٹری سن رہا تھا ـــــ جب ہوٹل والے اسپیشل کو سپیشل کہتے ہیں تو حجام کے کامنٹری کو کمنٹری کر دینے پر ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوا۔ حسب قاعدہ اس نے جھٹکی سے کرسی جھٹکی ہم اونچی کرسی پر جم کر بیٹھ گئے۔ اس نے پوری مشاقی سے ہمارے گلے میں کفنی باندھ دی اور ہم منتظر ہیں کہ اب حجامت شروع ہوگی تب حجامت شروع ہوگی۔ گلے سے کفنی بندھتی ہے۔ آئینہ میں خود کو گھورتے بیٹھے ہیں۔ لوگ سر سے کفن باندھتے ہیں اور حجامت کروانے والا گلے سے اور پوری حماقت کا ثبوت دیتا ہے اور وہ اس وقت کس درجہ مجبور ہوتا ہے یہ ہمارے قارئین بہتر جانتے ہیں ہم بہر صورت بیکس اور حجام ہے کہ مکر راسترا ہاتھ میں لیے محو کامنٹری۔ ہم نے پہلے زور سے کنکھارا، پھر ایک ہاتھ میلی کفنی سے باہر نکال کر چٹکی بجائی۔ کوئی اثر نہ ہوا۔ بیک وقت تمام دونوں ہاتھ باہر نکال کر تالی بجائی۔ کوئی شنوائی نہیں۔ جی میں آیا کہ اس کے تیز استرے سے اس کے کان کاٹ دیں۔ کمبخت کفنی کی گانٹھ پیچھے تھی ورنہ کھول کر بھاگ جاتے۔ آخر عقل ہمیں ایک ترکیب سوجھی آہستہ سے ہم نے اپنا سیدھا ہاتھ حجام کی ران کے قریب کر دیا اور زور سے چٹکی بھری۔ چٹکی لیتے ہی اس نے کام شروع کر دیا گویا ہم نے اسے آن کر دیا ہو۔ ہم اپنی زلفوں کے اسیر ہیں۔ کان کی لو کو چھوتی ہوئی زلفیں رکھتے ہیں حجام کامنٹری کی رفتار سے قینچی چلانے لگا۔ شاید ادھر چوکے اور چھکے اڑ رہے تھے اور حجام ادھر ہماری زلفیں اڑا رہا تھا۔ ہم ہائیں ہائیں کرتے رہے اور اس نے ہماری خشخشی بنا دی۔ یہاں بیٹ سری کانت کے ہاتھ میں تھی اور ادھر تیز استرا حجام کے ہاتھ میں۔ وہ ہمارا سر اس شدت سے پکڑ رکھا تھا گویا وہ ہمارا سر نہ ہو کرکٹ بال ہو اور ہم گھور رہے تھے کہیں وہ وکٹ پر دے مارنے کی تیاری نہ کرے۔ لیکن وہ سنبھل کر ہماری داڑھی کی خبر لینے لگا۔ خط بناتے بناتے جب غل مچا تو اس کا تیز استرا ہماری ناک کے عین قریب آکر رک گیا اور ہم دعا کرنے لگے کہ اب کوئی رن آوٹ نہ ہو ورنہ ہماری ناک آوٹ ہو جانے کے قطعی موقف میں تھی لیکن جہاں چوروں کا خوف ہوتا ہے وہیں شام ہوتی ہے کوئی بدبخت ادھر رن آوٹ ہوا اور ادھر ہماری ایک جھٹکے سے آدھی مونچھ صاف ہو گئی۔ اُدھر حجام نے پاپ سنگر کی طرح شیطانی چیخ ماری اور ادھر ہم نے آدھی مونچھ لیے مع کفنی دوکان سے فرار ہونے میں کامیابی حاصل کی۔ ہم بھوت کی طرح بھاگے جا رہے تھے اور بچے ڈر کر ہم سے بھی تیز بھاگ رہے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ جب ہم گھر میں گھسے تو سب ٹی وی پر میچ دیکھ رہے تھے اس حلیے میں کسی نے ہم کو

نہیں دیکھا۔

کرکٹ دیکھنے میں لوگوں کی محویت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ چور اچکے بآسانی ان کی جیب صاف کر دیتے ہیں۔ یہ کھیل ایک المیہ بن کر میں ساری دنیا پر چھا ہا ہے اور ساری دنیا مختلف المیوں کی طرح اس المیہ کو بھی برداشت کر رہی ہے۔ سنتے ہیں کہ حال ہی میں کوئی اسٹیڈیم کھیل دیکھنے والوں کی ادھم کو برداشت نہ کر سکا اور دھم سے زمین پر آ رہا اس طرح شایقین کی ایک معتد بہ تعداد فنا فی الشوق ہو گئی۔ ایک دن ہم نے کرکٹ کا گولا اپنے ہاتھوں میں لے کر دیکھا خدا جھوٹ نہ بلوائے کم از کم ½۱ کلو تو رہا ہوگا۔ ہم سوچتے ہیں اگر یہ کسی بدنصیب کے سر پر گر پڑے اور وہ اتفاق سے گنجا ہو تو کیا ہو۔ چندھیا واقعی چاند ہو جائے گی۔ اسے تو جنگ کے موقع پر یونیورس میں استعمال کیا جانا چاہیئے نہ کہ تفریحی مقامات پر۔ ویسے تعجب کی کوئی بات نہیں جب تفریحی مقامات پر مشین گن استعمال ہو رہی ہو تو کرکٹ کا گولہ کس شمار میں۔

ایک معتبر راوی نے یہ قصہ سنایا کہ ایک تھانہ میں جب کامنٹری زور و شور سے سنی جا رہی تھی اور پولیس والے نہایت عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے قیاس آرائی میں مشغول تھے ایک خطرناک ملزم فرار ہو گیا۔ میچ کے اختتام پر ہوش ٹھکانے لگے۔ سیٹیاں بجا دی گئیں۔ وائرلیس نے اپنا مفوضہ کام شروع کر دیا۔ شہر کے تمام ناکوں کو چوکس کر دیا۔ ملزم نہ ملا۔ سیمی فائینل میں ملزم فرار ہوا اور عین فائینل کے روز وہ اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ ایک ہوٹل میں نہایت انہماک سے کامنٹری سن رہا تھا۔ راوی کا کہنا ہے کہ اسے پکڑنے والے چند عقل مند پولیس والے تھے جنھیں کرکٹ سے سخت نفرت تھی۔

ہمیں تعجب اس وقت ہوتا ہے جب عورتوں کو بھی کسی موزونیت کے بغیر اس کھیل سے متعلق پاتے ہیں۔ اب یہی دیکھیے کدھر بی پاشاہ اور کدھر کرکٹ لیکن کیا کیا جائے ایک وبا ہے کہ چل رہی ہے۔ بڑی بی برقعہ کا نقاب الٹ کر پوچھ رہی ہیں "باوا اسکور کیا ہے"۔ ایک دن تو ہم نے جل کر کہا۔ اماں تم اپنی سنچری پوری کر رہی ہو۔ رن آوٹ ہونے میں کچھ دن رہ گئے ہیں۔ تمھیں یہ کرکٹ کا شوق کیسا۔ یہ بے روزگاروں کا مشغلہ ہے۔ کہنے لگیں باوا میں کرکٹ کے سہارے ہی جی رہی ہوں۔

ایک کرکٹ کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ اقبال نے صدفی صد درست فرمایا کہ عورتوں کا وجود کائنات کی رنگینی کے لیے ہے نہ کہ بے فیض کھیل اور کامنٹری کے لیے جو خود سراپا کھیل ہو بلکہ کھلاتی ہوں انھیں اور کوئی کھیل کس لیے لیکن کیا کیجے شوق بُرا ہے۔ ایک خاتون کو ان کے میاں نے طلاق دے دی۔ گویا ازدواجی زندگی کا بال پیچ ہو گیا۔ قصور محض یہ تھا کہ ہانڈی جل گئی تھی اور ہانڈی اس لیے جل گئی تھی کہ وہ چولھا پھونک کر میچ دیکھنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔ گویا ٹی وی نے ان کی گود ہری رہنے نہ دیا۔ ایک خاتون کی تو یہ عادت ثانیہ بن چکی تھی کہ نماز کا سلام پھیرتے ہی وہ بجائے ربنا آتنا پڑھنے کے اسکور پوچھتی تھیں اور یہ عادت شریف یہاں تک چلی کہ بعد میں اس کے جواب میں کہنا پڑا کہ "آپا آج کل سیزن نہیں ہے"۔

جب سیمی فائینل یا فائینل کرکٹ میچ چل رہے ہوں تو عقلمندوں کو یہ مشورہ ہے کہ وہ بے وقوفوں کی طرح

کسی کے گھر نہ جائیں کیوں کہ یقیناً صاحب خانہ ٹی وی میں مشغول ہے اور آپ کو دروازہ پیٹ پیٹ کر اپنا سر پیٹ لینا پڑے گا۔ ہم بے وقوف تو ہرگز نہیں لیکن ہر عقلمند کی طرح کبھی کبھی بے وقوفی سے دوچار ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ اک طرح کا فیشن چل پڑا ہے۔ ایک دفعہ مجبوراً ہمیں کسی کے پاس چلے جانا پڑا۔ دراصل وہ قاضی صاحب تھے اور اسی دن ہمارا عقد ثانی تھا۔ ہم جب در دولت پر پہنچے تو اندر ایک غل کا عالم تھا۔ کامنٹری چل رہی تھی ہم ہیں کہ پکارے جا رہے تھے اور کامنٹری تھی کہ چل رہی تھی۔ جناب قاضی صاحب یہ پھر شاندار چوا۔ اظہرالدین نے پورے کانفی ڈنس سے بلا گھمایا تھا اور پھر......... جناب قاضی صاحب فیلڈنگ کرنے والے پوری رفتار سے دوڑ رہے ہیں تاکہ گیند کو روک سکیں قاضی جی لیکن یہ ہر بار کھڑک مرغی کی طرح کھراٹے میں گھسی قاضی صاااحا اا اب عمران خاں نے پوری توانائی کا استعمال کیا تاکہ وکٹ آوٹ کر سکے لیکن مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے وہی ہوا جی حضرت..... منظورِ خدا ہوتا ہے۔ لیجئے پھر گیند میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئی جس طرح پہلا شاعر کلام سنا کر مشاعرہ سے بھاگ جاتا ہے اور پھر چھکا۔ اب تو سنچری......... ہمارے قاضی جی.....

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قاضی صاحب کا گھر نقار خانہ ہے اور ہم طوطی کی بول رہے ہیں۔ ہم تھک ہار کر قاضی صاحب کے دروازہ پہ ہی سر تھام کر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ عقد ثانی کے ارادہ ہی سے پریشانی شروع ہو گئی ہے جب میچ ختم ہوا تو قاضی صاحب باہر نکلے جیسے فال دیکھنے والے کے پنجرے سے طوطا باہر نکلتا ہے۔ ہمیں دروازے کے سامنے اکڑوں محو یاس دیکھا تو ان کا ہاتھ جیب میں چلا گیا۔ جب باہر آیا تو اس میں ایک مصری کی ڈلی تھی۔ کہنے لگے مجھے اطلاع ہے کہ آپ بہت دیر سے گدھے کی طرح پیخے جا رہے ہیں۔ حلق خشک ہو گیا ہوگا۔ یہ عقد ثانی کی مصری ہے۔ اسے کھو لیے۔ میں ذرا میچ دیکھ رہا تھا۔ آخری چوا تو بس غضب کا تھا۔ کیا سپنس تھا۔ گویا اس چوا کے آخر پر ہی فتح و نصرت کا دارومدار تھا۔ کیا غضب کا ہاتھ مارا ہے۔ خدا نے میری دعا سن لی......... اجی حضرت..... واقعی دعائے سحری بیکار نہیں جاتی۔ مجھے دو رکعت شکرانہ ادا کرنا ہے۔ ہم نے ان کی طویل بے معانی گفتگو کو عقد ثانی کا خوب صورت موڑ دینا چاہا لیکن وہ عقد اولیٰ ہی میں گرداں تھے۔ ہم نے گڑگڑایا قاضی صاحب۔ آج بعد مغرب خاکسار کا عقد ثانی ہے۔ آپ کی تشریف آوری بے حد ضروری ہے۔ کہنے لگے۔ خطبۂ نکاح واجب نہیں ہے۔ ایسا کیجیے میں دو راتوں سے اُلّو کی طرح جاگا ہوا ہوں۔ انگلینڈ میں میچ چل رہا تھا کہیں عقد ثانی کی بجائے طلاق متعلقہ کی کاروائی نہ کرنے لگوں۔ آپ اپنا خطبہ نکاح خود ہی پڑھ لیجئے اور نکاح ثانی ہے۔ چوری سے کر رہے ہوں گے۔ ہم نے اس جملے پر اس طرح سر ہلایا گویا وہ انسپکٹر ہو اور ہم عادی مجرم۔ کہنے لگے۔ اب لوگوں میں اتنی ہمت، جرات، شجاعت کہاں کہ عقد ثانی کو عقد اولیٰ کی طرح بر بانگ دہل کریں۔ اب یہ کار شرعی چوری چوری ہوا کرتا ہے۔ اب رہا آپ کا ایجاب و قبول تو عقد ثانی ہے۔ دونوں تجربہ کار ہیں یہ کہہ کر انھوں نے ہماری طرف تصدیق طلب نگاہوں سے گھورا۔ ہم نے کہا ہاں موصوفہ قدرے ضعیفہ ہیں دو شوہروں کو جنت رسید کر چکی ہیں۔ تیسرے نے انھیں تین طلاق دے کر مہر معاف کروالیا ہے۔ مسکرایا ہاں عقد ثانی کسی مرد کا کسی کنواری لڑکی سے ہو تو اس دور میں ایسے ہی ناممکن ہے جس طرح پاگل خانے میں ووٹنگ۔ اپنی اولاد کو گواہوں میں لیجئے۔ میں ایک آدھ ہفتہ بعد خانہ پری

کر دوں گا۔ جی جل اٹھا۔ دل میں آیا کہ چھکے کے بال کی طرح اڑ جائیں اور کرکٹ کے خلاف ایک مشاعرہ کریں اور جتنے بلے اور گیندیں اور وکٹیں ہاتھ لگیں انھیں چولھے میں جلا کر اس پر چائے بنا کر شعرائے کرام کو پلائیں۔ نہ جانے یہ کرکٹ ہمارا کیا حشر کرے گا۔ کرکٹ کے طفیل یہ کام ملتوی وہ کام ملتوی کہیں ایسا نہ ہو کہ مردوں کی تدفین بھی ملتوی ہونے لگے۔ چنانچہ ہم ایک دن ایک صاحب کے ہاں کسی کے انتقال کی اطلاع پہنچانے گئے دیکھا کہ وہ میچ میں گم بلکہ گم سم ہیں۔ ہم نے پوری الم (ناک) کی تمہید باندھی...... وہ جو آپ کے نانا حضرت کے خسر کے بڑے بھائی تھے...... وہی جنھوں نے آپ کے والد..... وہ سگریٹ سلگاتے ہوئے..... خوب چوا ہے .... فنٹاسٹک جنھوں نے آپ کے والد کے ماموں کو اپنی گود میں ڈبل روٹی کھلائی ہے...... وہ آج صبح ٹھیک سات بجکر ستاون منٹ پر جب سیلون سے سہگل کا گیت بج رہا تھا... چل بسے۔ چل بسے کے ٹکڑے پر انھوں نے ادھر کا رخ کیا جیسے ہم نے ان کے آگے تازہ گوشت کا ٹکڑا اچھالا ہو۔ بولے ہاں! بڑی عمر میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ دعائے مغفرت کریجئے...... اس کے علاوہ آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ اتنا کہہ کر پھر ٹی وی پر اپنی بیٹنگ کے دونوں بلے گاڑ دیئے۔

کرکٹ کھیلنے والے کس انداز سے اللہ کو پیارے ہوتے ہیں یہ ہم سے زیادہ شائقین کرکٹ زیادہ جانتے ہیں۔ البتہ کرکٹ دیکھنے والے اچانک غیر متوقع کرکٹ کو پیارے دیکھتے دیکھتے خدا کو پیارے ہو جاتے ہیں چنانچہ ایسے ہی شائقین کے بارے میں کسی شاعر نے کہا کہ جب مردے سے منکر نکیر سوال و جواب کے لیے قبر میں حاضر ہوئے تو مردے نے ان کے سوال سے پہلے ہی یہ سوال کیا سکور کیا ہے؟ الغرض ایک اخبار میں یہ اطلاع شایع ہوئی کہ ایک شائق کرکٹ کا دل کامنٹری دینے والے کے لفظ و بیان کا اس حد تک ساتھ دیتا رہا کہ جب اس نے کہا انڈیا پاکستان صرف ۳ رنز سے ہار گیا وہ زندگی کی بازی ہار گیا۔ ڈاکٹر کو بلایا گیا معلوم ہوا کہ قلب پر کرکٹ کا اثر ہوا ہے۔ ان کے کان میں زور زور سے یہ کہو کہ انڈیا جیت گیا یہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر بھارت میں کرکٹ پر امتناع عاید کر دی جائے تو قلب کے دورے صرف ان لوگوں کے لیے مختص رہیں گے جو انکم ٹیکس چراتے ہیں۔

ہمارے ایک مصنف دوست نے ہمیں یہ صلاح دی کہ خدا کے لیے آپ کرکٹ کی برائی کرنا چھوڑ دیجئے اور مجھے کچھ کام کرنے دیجئے۔ اس بے ربط جملے پر ہمیں فوراً مارے گھٹنا پھوٹے آنکھ والا محاورہ یاد آگیا۔ کہنے لگے بات دراصل یہ ہے کہ میچ کے دنوں میں آرام اور سکون سے تصنیف و تالیف میں مشغول رہ سکتا ہوں۔ نہ کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے نہ میں کسی سے ملنے جاتا ہوں۔ حتی کہ میرے گھر پرندہ بھی پر نہیں مارتا خواہ رات ہی کیوں نہ ہو۔

سارا سماج کرکٹ کا شکار ہے۔ پان کے ڈبہ پر کرکٹ، ہوٹل میں کرکٹ۔ سینما میں کرکٹ، مدارس میں کرکٹ کالج میں کرکٹ، رسم میں کرکٹ، شادی میں کرکٹ، میت میں کرکٹ چہلم کی دعوت میں کرکٹ، یہ کرکٹ ہے یا کوڑا کرکٹ کرکٹ نے اقوام عالم کا ستیاناس کر دیا ہے۔

ورنہ یہ اقوام بھی تھیں کام کی۔

اس دور میں کرکٹ کے علاوہ کسی اور چیز کی اہمیت نہیں حتی اس کے عظیم الشان عیدوں کی بھی نہیں ہم نے ایک ذہین نوجوان سے جو راتوں کو جاگ جاگ کر کرکٹ دیکھنے کے سبب قدرے چندلا رہا تھا دریافت کیا۔

آپ کیا بننا چاہتے ہیں اس نے ایک سرد آہ بھری اور میرا من کے پہلے درویش کی طرح کہنے لگا۔ حضرت قبلہ تمنا کسی عہدہ کی ہے نہ جاہ وثروت کی آرزو کسی کو بھی کی ہے اور نہ کثیر دولت کی۔ ارمان اس قدر ہے کہ کرکٹ کی دنیا میں نام پیدا کروں۔ سنچری بنانے کے ریکارڈ میں نئی صبح نئی شام پیدا کروں۔ اور پھر وہ دو تین منٹ آنکھیں بند کئے مونگیری لال کی طرح خود کو گواسکر اور اظہر الدین سمجھتا رہا اور کرکٹ کھیلتا رہا۔ نئی نسل کی کرکٹ پرستی کا یہ عالم ہے کہ ہر لڑکا گیند بلا سنبھالے گھر کے باہر نکل جاتا ہے اور جہاں ہم سیکل بڑی مشکل سے چلا سکتے ہیں اس گلی میں کرکٹ کھیلتا ہے اور لوگوں کے سر پھوڑتا ہے۔ اس طرح ہلمٹ کی ضرورت بڑی سڑکوں سے زیادہ مختصر گلیوں میں محسوس کی جانے لگی ہے۔

ہم ایک دفعہ خوشی کے عالم میں تیز گاڑی چلاتے ہوئے ہوا سے حل لگی کر رہے تھے۔ کوئی ڈر کی بات نہیں تھی کیوں کہ لائسنس موجود تھا، کاغذات حاضر، نمبر پلیٹ واضح۔ لائٹ روشن انشورنس فل لیکن کم بخت ایک پولیس والے نے روک ہی لیا۔ ہم نے جھلا کر کہا سب ہے۔ اس نے پوچھا اسکور کیا ہے۔ ہم نے کہا ۲۰۴ اور آگے بڑھ گئے۔ بلوا... شاید سب بے وقوف کا نمبر ۲۰۴ ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کوئی شبہ ہو تو اپنی تصدیق کر لے۔

حد تو یہ ہے کہ فقیروں اور بھکاریوں میں بھی کرکٹ بہت پاپلر ہو رہا ہے۔ ایک فقیر یوں صدا لگا رہا تھا بابا! دو پہر سے بھوکا ہوں۔ صرف ۲، ۳ چائے اور ۴، ۶ بن پر ہوں۔ زردے کا پان بھی نہیں کھایا خدا کے لیے کوئی ایک روپیہ دے دے، اگر روپیہ نہیں دے سکتا تو کم از کم اسکور بتا دے۔ انڈیا کا سوال ہے بابا۔ انگلینڈ کی جھولی میں دس رن کے سوا کیا ہے۔ خدا بھارت کا بھلا کرے دو پہر سے بھوکا ہوں اسکور بتا دے بابا۔ اسکور بتا دے وہ کچھ اس لہجے سے یہ الفاظ دہرا رہا تھا کہ ہمیں معاً نثری نظم یاد آ گئی۔ عین ممکن ہے کہ نثری نظم کسی فقیر نے ایجاد کی ہو۔ ہمیں فقیر کے اس درجہ کرکٹ کے اشتیاق پر بہت غصہ آیا۔ اس کا کشکول بجا کر پوچھا۔ بابا! تمہیں بھی کرکٹ کا شوق ہے۔ اس نے ہم سے کہا کس کم بخت کو شوق ہے۔ البتہ میں جس پر روپیہ لگاتا ہوں اس کی فتح و کامرانی کی دعا کرتا ہوں۔ اب ہم سمجھ گئے اس طرح "کرکٹ سٹہ" بھی چل رہا ہے

الغرض ہم کرکٹ سے بہت نالاں وحیراں ہیں، ترساں ولرزاں ہیں۔ ہم اپنے ملک کے باشندوں کو یہ مشورہ دیں گے کہ اس گیم سے یکلخت ہاتھ اٹھالیں۔ ہاتھ ہی پر کیا موقوف ٹانگیں، دیدے، گردے، زبان اور دماغ سب اٹھائیں اور اپنے وجود کو جو وقت کی طرح گزر رہا ہے۔ گیا گزرا بننے سے بچائیں تاکہ زندگی کا مقصد جو ہرگز کرکٹ نہیں ہے بہتر طور پر سمجھ میں آسکے۔ ●●

محمد نسیم الدین ریسرچ اسکالر
(حیدرآباد)

کچھ ہلمٹ کے بارے میں

واضح ہو کہ فی الحال ہمارا مقصد نہ ہلمٹ پر کیچڑ اچھالنا ہے اور نہ سنگ باری کرنا ہے اور نہ ہم ہلمٹ پر ایک عدد جدید نظم لکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے ہم شاعر ضرور واقع ہوئے ہیں لیکن گھبرایئے نہیں ہماری شاعری میں آپ کو کمرہ سگریٹ۔ بوتل۔ دھواں یا آسیب سے سابقہ نہیں پڑے گا۔ ہمارے شعر آپ بآسانی سمجھ سکتے ہیں کیونکہ ہمیں علامتوں کی سنگل بازی سے کم ہی دلچسپی ہے اس کے علاوہ ہم ترسیل کا المیہ کی تصویر بھی بننا نہیں چاہتے ورنہ کب کے منظر عام پر آچکے ہوتے۔ ذہن میں بھی ہیں ایک ذرا جنبش قلم کی دیر ہے۔ اور بس نظموں کا مجموعہ اشاعت کے لئے تیار ہے۔

ہمارے ایک دوست ہیں عبدالغفور، خاصے بھلے مانس تھے بااعتبار پیشہ تاجر اور دل لہسن تھے۔ ایک دن یہ ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے۔ "اب مجھے شاعر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" ہم نے پوچھا۔ کیوں؟ کیا وجہ ہوئی۔ کہنے لگے وہ جو اپنا چھوٹا ہے نا۔ دودھ بیچنے والا اب تو وہ بھی شاعر بن گیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ حیدرآباد کی سڑکوں اور بھینسوں کو ادب میں زندہ جاوید کر دے گا۔ ہم نے کہا "میاں۔ وہ تو ٹھہرا پانی میں دودھ ملانے والا۔ زندگی کو بھینس پر سوار کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے۔ مگر تم کیا کرو گے؟ بلاتامل کہنے لگے "چوک سے منفی ترنم کی کتاب "پیمانہ اور افسانہ" خرید لوں گا۔" ہم نے کہا "پھر؟؟" کہنے لگے "اس میں جدید ترین لفظیات کا جو عموماً کسی کی سمجھ میں نہیں آتیں ذخیرہ ہے استعمال کروں گا اور یقین ہے کہ میری نظمیں بھی کسی کے پلے نہ پڑیں گی مگر جدیدیت کا شاہکار ہوں گی۔"

بہر حال وہ شعر موزوں کرنے لگے۔ اور شاعر کی حیثیت سے تسلیم بھی کئے جانے لگے۔ لیکن آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اس تمہید بے ربط کا مقصد کیا ہے۔ ہم صرف اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ ہلمٹ اور شاعری میں تعلق ہے کیونکہ ہلمٹ جب سے "پنر جنم" ہوا ہے شعراء سب سے زیادہ خوش دکھائی دیتے ہیں اور ماڈرن شاعر تو لیڈروں کی طرح اپنی بغلیں بجاتے ہیں کیونکہ آج کل مشاعروں اور جلسوں میں ہلمٹ کی ایسی ہی ضرورت لاحق ہے جیسے کسی زمانے میں پیدان کو ڈھال کی تھی۔ چنانچہ اب شاعروں کو جو دعوت نامے وصول ہو رہے ہیں ان میں کرایہ آمد و رفت اور قیام و طعام کی صراحت کے ساتھ بطور خاص یہ بھی لکھا جا رہا ہے کہ ڈائس پر ہلمٹ کا انتظام رہے گا۔ اب ہلمٹ کے رنگوں کی وجہ سے شاعروں کو پہچاننا بھی آسان ہو گیا ہے۔ اب ناظم مشاعرہ یوں اعلان کریں گے۔

"مسند صدارت کے بائیں بازو لال ہلمٹ ہے یقین ہے کہ وہ دلی دلدار نامہ ہی ہیں۔ دائیں جانب سبز ہلمٹ پہنے ہوئے دبیز میرٹھی ہیں۔ ارغوانی رنگ کی ہلمٹ میں تمہارا تیرہ تنکوی ہیں اور وہ رنگ برنگ چھینٹوں والی ہلمٹ میں محترم چم چم ہیں۔"

...ہی آدمی کی شخصیت بدل جاتی ہے۔ چشم زدن میں وہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق معلوم ہونے لگتا ہے ہمارا ننھا جب بازار گھمانے کے لیے ضد کرتا ہے تو ہم فوراً ہلمٹ پہن لیتے ہیں اور وہ سہم کر ماں کی گود میں چھپ جاتا ہے ہلمٹ پہن کر ملک الموت اور پولیس کے سوا ہر ایک سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے۔ حکومت کا کہنا ہے کہ ہلمٹ ملک الموت کی نظر سے بھی محفوظ رکھتی ہے یعنی سر کی حفاظت کرتی ہے گویا :

سر سلامت ہے ہزار جنوں

ویسے ہلمٹ سے سبھی ناخوش نہیں ہیں ہمارے دفتر کے ساتھی عنایت شریف الطاف شریف ایک دن گویا مستقبل خواہ مخواہ ہی ہلمٹ کو کوستے ہیں۔ حالاں کہ یہ بڑی کارآمد اور مفید شے ہے۔ ہم نے ان کی رائے پر کوئی تبصرہ نہیں کیا لیکن ... کہ ہلمٹ کی اس قدر طرفداری کیا معنی رکھتی ہے ؟ ہم دیکھتے آرہے تھے کہ موصوف نے جب سے ہلمٹ کا استعمال شروع کیا تھا ان کے سر اور پیشانی پر اگنے والے گومڑوں کی کاشت رک گئی تھی۔ بعد میں دفتر کے چپراسی نے جس کا اولین فریضہ ملازمین دفتر کے نجی معاملات کی تفتیش و تشہیر ہے ، یہ راز افشا کیا کہ موصوف دراصل بیوی زدہ ہیں جن کا سر ہلمٹ کی وجہ سے بیلن کی کراکری کے حملوں سے محفوظ ہو گیا ہے۔ تبھی تو وہ ہلمٹ کی تائید میں کمربستہ بلکہ سربستہ رہتے ہیں۔

ہلمٹ کی ایجاد سے بزرگوں کی پیشین گوئیوں کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً بڑے بوڑھوں نے کہا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اچھے اچھوں کے ہاتھ میں کشکول ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ کشکول صرف ایک مصرف کے لیے استعمال کیا جاتا تھا لیکن یا کشکول "ہمہ مقصدی" ہے۔ چناں چہ بزرگوں ہی کی بات ہے کہ ہم ایک صاحب کے دیوان خانے میں بیٹھے صاحب خانہ سے محو گفتگو تھے کہ اندر سے ان کی بیگم نے آواز دی "ذرا آپ کی ہلمٹ بھیجیے ننھے کے پوتڑے دھونے ہیں۔ یہ سننا ہی تھا کہ انھوں نے اپنی ہلمٹ اندر بھیج دی۔ ایک اور صاحب ہیں جنھیں بطخیں، مرغیاں اور بکریاں پالنے کا بڑا شوق ہے چناں چہ وہ اپنی ہلمٹ ہی میں اپنے ان پیاروں کو پانی پلاتے ہیں۔

اگر مجنوں ہمارے زمانے میں ہوتے تو انھیں سر نہیں ہلمٹ یاد آتی کیوں کہ میاں مجنوں ہلمٹ پہن کر لیلیٰ کی گلیوں کے چکر لگاتے اور لیلیٰ کو یہ کہنا پڑتا :

کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

ہلمٹ سے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ اب عاشق کو محبوب کی گلیوں یا رقیب کے محلے سے گزرنے میں کوئی باک نہیں فی زمانہ عاشقوں کا قول ہے کہ :

ہم کوچۂ رقیب میں ہلمٹ کے بل گئے

قلمی معاونین تخلیقات پر اپنا پتہ ضرور لکھیں

افروز عالم (دربھنگہ)

ہماری تھیسیس

اس عنوان کو وقار عظیم کی کتاب "ہماری داستانیں" کی پیروڈی نہ سمجھا جائے۔ کوئی ادیب کسی ناقد کا نہ تو مذاق اڑا سکتا ہے نہ ہی اس کے گھر ڈاکہ ڈال سکتا ہے۔ یہ توارد بھی نہیں، سرقہ بھی نہیں اور ناچیز کو وقار عظیم کی ہمسری کا دعوی بھی نہیں۔ وقار عظیم اپنے مخصوص عبادت بریلوی پن کے باوجود صرف پڑھے جاتے ہیں بلکہ حوالے کے طور پر بھی استعمال کئے جاتے ہیں اور یہ خاکسار تو ابھی (بزعم خود) عندلیب گلشن ناآفریدہ ہے۔ وقار عظیم کی عظیم الہیئت کتاب کے عنوان سے اس کمس قامت مضمون کے عنوان کی مشابہت محض اس لیے ہے کہ داستانوں اور تھیسیسوں میں ایک خاص مناسبت پائی جاتی ہے۔ اس لیے اس مضمون کی ایک مستقل بالذات حیثیت تسلیم کی جانی چاہیئے اور یہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ مضمون ایک اہم علمی اور ادبی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے۔ کیونکہ اُردو میں طویل، مختصر، مطبوعہ غیر مطبوعہ، نقد اور ارزاں قدر تھیسیسوں کا ایک قابل لحاظ اور ناقابل اعتبار سرمایہ ہے۔

تھیسس کو اب تک مستقل صنف کا درجہ نہیں دیا گیا ہے لیکن مجھے اس کے ایک کارآمد اور معیاری صنف ہونے پر اصرار ہے۔ اب تک تھیسس کی صنفی حیثیت اور اس کے فنی لوازم و مقتضیات پر بھی کوئی مقالہ نہیں لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی میری یہ اولین کاوش تاریخی اہمیت کی حامل ہے۔ میں نے تھیسس کو ایک مستقل صنف اس لیے کہا ہے کہ اس میں تمام گزشتہ موجودہ اور آیندہ اصناف کے مقابلے میں زیادہ وسعت، تنوع اور لچک ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ یہ تمام اصناف زندگی کو ایک خاص انداز سے دیکھتی ہیں اس کے برعکس تھیسس زندگی کو ہر رنگ میں دیکھتی ہے ع

چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔ یہ زندگی کو غزل کی شکل میں بھی دیکھتی ہے اور قصیدہ کی شکل میں بھی۔ مثنوی کی شکل میں بھی اور دو مرثیہ کی شکل میں بھی، ناول اور افسانہ کی شکل میں بھی اور ڈرامہ کی شکل میں بھی ——

اس طرح اردو کی گزشتہ اور موجودہ اصناف میں صرف داستان ہی اس کی ہمسری کا دعوی کر سکتی ہے لیکن اب داستانوں کا دور ختم ہو چکا ہے۔ آیندہ اصناف میں، میری پیشین گوئی ہے کہ اس کے مقابلے کی کوئی صنف پیدا نہیں ہوگی۔ ایسی صورت میں تھیسس کو ایک مستقل صنف نہ ماننا ایک ادبی بے ادبی ہے۔ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ جب تمام اصناف ختم ہو جائیں گی تو ہم صرف تھیسس کی بدولت اردو کو زندہ رکھ سکیں گے۔

تھیسس کا فن بڑا ہی مشکل ہے۔ تاہم اس کا مزاج خاصا جمہوری ہے۔ کیونکہ یہ جاگیرداری کے عہد کی پیداوار

نہیں۔ بلکہ بقول شخصے "صنعتی دور کی عوامی ضروریات کی پیداوار ہے"۔ تھیسس بڑی بامروت صنف ہے۔ اس کا مسلک صلح کل ہے۔ ہر غزل گو شاعر قصیدہ نگار نہیں ہو سکتا۔ میر کے قصیدے اسی لیے پھسپھسے ہیں۔ ہر افسانہ نگار اچھے ناول نہیں لکھ سکتا۔ پریم چند کے افسانے ان کے ناولوں سے بہتر ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصناف کو برتنے کے معاملے میں ہر شخص ہمہ جہت نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام اصناف کی جہتیں متعین ہوتی ہیں لیکن تھیسس ایک ایسی ہمہ جہت صنف ہے جسے ایک بے جہت شخص بھی برت سکتا ہے اور اسے برت کو شش جہاتی کہلا جا سکتا ہے۔ دیگر اصناف سے یہ بھی اس کا ایک بڑا امتیاز ہے۔

تھیسس زیادہ سے زیادہ نو اور کم سے کم پانچ ابواب پر مشتمل ہوتی ہیں۔ کسی تھیسس نگار پر آثار قدیمہ کا محکمہ مہربان ہو جائے تو صرف دو باب سے اس کا کام چل جاتا ہے۔ ابواب کی فراوانی یہ سہولت فراہم کرتی ہے کہ لاحقوں اور سابقوں کی مدد سے نفس مضمون کو زیادہ معنی خیز بنا لیا جاتا ہے اسے داستان کی اصطلاح میں "قصے کو روکنا" کہہ لیجیے۔ سیاق و سباق موضوع اصلی کو Madame Body کی طرح گھیرے رہتے ہیں۔ لیکن آپ چاہیں تو Madame Body کی موجودگی میں بھی اس کا اغوا کر سکتے ہیں کیوں کہ اس کے باڈی گارڈز زیادہ طاقتور نہیں ہوتے۔

ابواب سے پہلے ایک پیش لفظ بلکہ پیش باب بھی ہوتا ہے۔ اس تحقیق اور تنقید سے الگ ہٹ کر اپنی تسکین کی باتیں کی جاتی ہیں۔ موضوع کے فضائل کا ذکر کیا جاتا ہے ——— یہ بتایا جاتا ہے کہ بے شمار موضوعات کی موجودگی میں متعلقہ موضوع کے انتخاب کا کیا سبب ہے۔ منتخبہ موضوع پر تھیسس لکھی جانے کی علمی و ادبی عظمت و اہمیت کا احساس دلایا جاتا ہے۔ یہ رہنمائی کی جاتی ہے کہ تھیسس کو کس زاویہ اور کس ذہنی سطح سے پڑھا جائے۔ اپنے نگران کے تبحر علمی اور اپنی کم علمی (کبھی کبھی لاعلمی) کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ مددگاروں کے شکریے ادا کیے جاتے ہیں۔ بعض تھیسس نگاروں پر مددگاروں کے اتنے احسانات ہوتے ہیں کہ ایک ضخیم تھیسس لکھنے کے بعد محسنوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کے پاس الفاظ نہیں رہ جاتے اور یوں بیچارہ تھیسس نگار شکریہ ممنون کررہ جاتا ہے۔

اردو میں لفظ تھیسس کا ایک عدد ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ لیکن اصناف کا ترجمہ کرنے سے ان کی آفاقیت میں کمی آ جاتی ہے۔ اردو میں تھیسس کا ترجمہ "تحقیقی مقالہ" اس کی بہترین مثال ہے۔ یہ ترجمہ ایک بڑی غلط فہمی کو جنم دیتا ہے۔ کیونکہ ہر تھیسس تحقیقی مقالہ نہیں ہوتی۔ بعض تھیسس تنقیدی مقالہ بھی ہوتی ہیں اور اگر گستاخی کے نام سے آپ کا دل دھڑکنے نہ لگتا ہو تو یہ انکشاف بھی کرتا چلوں کہ بعض تھیسس محض تعریفی مقالہ اور بعض محض تاریخی مقالہ ہوتی ہیں۔ تحقیقی اور تنقیدی شعور کے بغیر تحقیقی یا تنقیدی مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔

"علامت ایک لمحے کی حقیقت کو صدیوں پر پھیلی ہوئی حقیقت کا مخزن بنا دیتی ہے"۔ تھیسس بھی ایک ایسی ہی علامت ہے۔ یہ ساعت بھر کو جہانگیر کر دیتی ہے۔ بڑے ادیب و شاعر اور اہلِ علم دریا کو کوزہ میں بند کر کے علم و ادب کی دنیا میں جو تنگی، مفلسی اور قحط پیدا کرتے ہیں، تھیسس نگاران کوزوں کو پھر سے دریا میں بدل دیتا ہے۔ ماہر تھیسس نگار کوزے کو سمندر میں بدلنے کا فن بھی دکھا جاتے ہیں۔

اردو میں احسن فاروقی اور نورالحسن ہاشمی نے مشترک ادبی کارنامے انجام دینے کی داغ بیل ڈالی۔ اس

سے ادبی یک جہتی کو فروغ ہوا۔ یہ اور بات ہے کہ دہلوی اور لکھنوی دبستان کی سطح پر یہ یک جہتی ممکن نہ ہو سکی۔ تھیسس نگار بھی اسی مشترک طرز کی توسیع ہے۔ یہ کام تنہا نہیں ہوتا۔ ان کے پورے چار ستون ہوتے ہیں۔ تب ایک تھیسس نگار معرضِ وجود میں آتا ہے۔ مت سہل ہمیں جانو!

ہمارے تھیسس کے موضوعات میں خاصا تنوع ہے۔ اتنا تنوع کہ "تنوع" کا لفظ تنہا اس کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ پاتا اور یوں ان کے موضوعات کے بیان کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ ہماری تھیسس کے موضوعات میں اتنا تنوع ہے جتنے آسمان میں تارے بھی نہیں۔ جو صنف زندگی کو غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، ناول، افسانہ، ڈرامہ ہر رنگ میں دیکھے اس کی وسعتوں کا کیا کہنا۔ زمین سے آسمان تک (بشمول فیض کا پاجامہ، اور آزاد ہند، جبرئیل کے پر، عزرائیل کے ہاتھ) کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر اردو میں تھیسس نہ لکھی گئی ہو۔ جب ایک زمین اور ایک آسمان کا سفر پورا ہو جاتا ہے تو علامہ اقبال کے نسخے کی مدد سے نئی زمین اور نئے آسمان پیدا کر لیے جاتے ہیں اور ستاروں سے آگے کے جہاں تلاش کیے جاتے ہیں۔ اس وقت اردو تھیسس کے موضوعات نیچے بحرِ ظلمات میں اور اوپر "آسماں اور بھی" کا سفر کر رہے ہیں۔

اردو میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تھیسسوں کا ناقابل شمار سرمایہ ہے۔ کچھ لکھ کر اسے منظرِ عام پر لے آنا روایت اور مسلک کے مطابق اپنی رسوائی ہے۔ چناں چہ ہماری تھیسسوں کی اکثریت اپنی رسوائی برداشت نہیں کرتی۔ اسی لیے نقاب پوش رہتی ہیں۔ یوں بھی ہماری تہذیب پردے والی تہذیب ہے۔ ہماری تھیسس اپنی تہذیب کی پاسدار ہیں۔ وہ سر سید کی نہیں، اکبر کی قائل ہیں اس لیے چراغِ محفل کے بجائے خاتونِ خانہ بننے کو ترجیح دیتی ہیں۔ تاہم جس طرح حامدہ آشنائے انگلش ہو کر چمک اٹھیں اسی طرح ہماری بعض تھیسس زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر بن گئیں طباعت واشاعت کی اس رسوائی میں بعض تھیسسوں کے اپنے میلانِ طبع کو دخل ہے اور بعض میں اداروں کے مالی تعاون کو

تھیسس طویل بھی ہیں اور مختصر بھی۔ داستانوں ہی کی طرح اردو میں طبع زاد تھیسس کم ہیں۔ ہماری بیشتر تھیسس فسانۂ عجائب کی طرح اخذ واستفادے کی کامیاب مثالیں ہیں۔ نوطرزِ مرصع، باغ و بہار اور قصۂ چہار درویش کی طرح مختلف عنوانات سے ایک ہی قصّہ کو دہرانے کی بھی وافر مثالیں ملیں گی۔ طویل تھیسس سے قطع نظر مختلف تھیسسوں میں "[illegible] حیات [illegible] کارنامے خواجہ بندے نواز کی ادبی خدمات، احوال و آثار علامہ گمنام، کلیم الدین احمد کی خاموشی۔ ایک جائزہ۔ اختر اورینوی کی لفاظی۔ ایک مطالعہ، مجاز کی شراب نوشی کا نفسیاتی تجزیہ، نقاد کی شاعری" وغیرہ ہماری ایسی تھیسس ہیں جنہیں دنیا کی کسی بھی زبان کی تھیسس کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

الف لیلہ، بوستانِ خیال اور داستانِ امیر حمزہ کی طرح اردو میں ایسی تھیسس بھی ہیں جو کئی تھیسس نگاروں کا تختۂ مشق رہی ہیں۔ یعنی ان کی مختلف کڑیاں مختلف مقامات پر مصنفین کے ذریعہ تحریر کی گئی ہیں۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا "بہار میں اردو نثر کا ارتقا" اس کی صرف ایک مثال ہے۔

تھیسس کے بے شمار فوائد ہیں۔ ان کے سیاسی، معاشی، سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی پہلوؤں پر مستقل کتابیں لکھی جاسکتی ہیں۔ مدرس تھیسس لکھ کر promotion پاتا ہے۔ غیر مدرس، مدرس بن جاتا ہے۔ تھیسس لکھنے کے بعد آدمی کا سماجی مرتبہ بڑھ جاتا ہے۔ حکومت کی طرف سے بڑے بڑے پروجیکٹ پر کام کرنے کی پیش کش ہوتی ہے۔ لیکن تھیسس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ مثلاً اگر محکمۂ تعلیم کو کسی شخص کے ڈاکٹر ہوجانے کی خبر نہ ہوسکی تو اس کی قدر دانی نہیں ہوپاتی۔ اس کا مقام عالی اسے ہل چلا کر ملکی معیشت کو مضبوط کرنے سے بھی باز رکھتا ہے۔ اس طرح وہ بے چارہ نہ گھر کا رہتا ہے نہ گھاٹ کا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنا بھی نہیں رہ پاتا اور اپنی ادبی ہستی کو نیستی میں تبدیل کرکے مرثیہ کا موضوع بن جاتا ہے۔ دوسرا نقصان یہ ہے کہ تھیسس لکھ لینے کے بعد آدمی کو اپنے نام اور دستخط کے ساتھ ڈاکٹر بھی لکھنا پڑتا ہے۔ بعض ایسے لوگ جنھیں مختصر نویسی کی عادت ہوتی ہے، انھیں ڈاکٹریٹ کی سند ملنے کے قبل سے ہی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنے کی مشق کرنی پڑتی ہے۔ جو وقت بھی ضائع کرتا ہے اور جگہ بھی زیادہ لیتا ہے۔ حالاں کہ اردو رسم الخط اس عیب سے پاک ہے۔

تھیسس بہت پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں لکھتے، کم پڑھے لوگ بھی لکھتے ہیں۔ اگر آپ کم پڑھے لکھے ہونے کا معیار میٹرک پاس ہونے کو مان لیں تو یہ سمجھ لیں کہ ہر میٹرک پاس شخص تھیسس لکھ کر ڈاکٹر بن سکتا ہے کیوں کہ جس نے میٹرک پاس کیا۔ جس نے انٹر پاس کیا وہ گریجویٹ ضرور ہوگا۔ جو گریجویٹ ہوگا وہ پوسٹ گریجویشن ضرور کرلے گا اور ہر پوسٹ گریجویٹ ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ہر میٹرک پاس ڈاکٹر بن سکتا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ عہد ماضی میں اس کلیے کو غلط ثابت کرنے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ عہد جدید میں اس کلیے نے سچوں سے بھی اپنی صداقت تسلیم کرالی ہے۔ اس لیے اب تھیسسوں کے فروغ میں رخنہ ڈالنے کا کوئی نامساعد واقعہ پیش نہیں آتا۔ جو لوگ اب بھی اس کلیے کی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے وہ بھی بعض معاوضہ میں ڈاکٹریٹ ایوارڈ کر دیتے ہیں۔ اختر انصاری مرحوم نے مطالبے سے تنگ آکر ایک محترمہ کو ڈاکٹریٹ کی سند اس لیے دے دی تھی کہ آخر کار ان کی ڈگری سالے کے ساتھ پس کر چولھے میں مل جائے گی۔ بڑے لوگ غصے میں بھی بڑے کام کر جاتے ہیں۔

اردو میں شاعری کے دو ہی بڑے دبستان رہے ہیں۔ تھیسسوں کے کئی بڑے دبستان پائے جاتے ہیں۔ پھر ہر دبستان کی کئی ذیلی شاخیں بھی ہیں۔ اس طرح ہمارے یہاں تھیسسوں کے دبستان در دبستان موجود ہیں۔ دلی، علیگڈھ، لکھنو، حیدرآباد، بمبئی، مدراس، کلکتہ، پٹنہ، الہ آباد وغیرہ دبستان تھیسس کے بڑے بڑے نام ہیں۔ دبستان تھیسس کا ایک نمایاں وصف یہ ہے کہ دبستان شاعری کی طرح کسی ایک دبستان تھیسس کا کوئی ایک رجحان نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی دبستان میں مختلف رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اس طرح رجحان در رجحان تھیسس کی ایک پہچان ہے۔ تھیسسوں کے مذکورہ صنعتی مراکز کے علاوہ گھریلو صنعت کے طور پر چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی بے شمار تھیسسیں تیار کی جاتی ہیں۔ چھوٹی صنعتوں پر بھی حکومت کی خاص توجہ ہے۔ جب بڑی صنعتیں ختم ہوجائیں گی تو صرف چھوٹی صنعتیں باقی رہ جائیں گی

رضا نقوی واہی کا کہنا ہے کہ ؎

کس نے تحقیقی مقالہ لکھا، کس کے نام سے
کون دلی جاکے پوچھے گا یہ مالک رام سے

گویا واہی صاحب کا یہ دعویٰ ہے کہ کس نے کس کے نام سے لکھا، اس علم میں مالک رام صاحب وحدہٗ لاشریک ہیں۔ حالاں کہ خاکسار نے اپنی صرف ایک آنکھ اور صرف ایک کان سے "کس نے" اور "کس کے" کئی ایسے واقعات دیکھے اور سنے ہیں کہ اگر واہی صاحب ناچیز سے رابطہ قائم کرتے تو تحقیق سے متعلق ایک غیر تحقیقی بیان کبھی نہ دیتے۔

تھیسسوں نے اردو زبان وادب کی بڑی خدمت کی ہے اردو کی کوئی ایسی ادا اور کوئی ایسا ادا کار نہیں جس پر تھیسس نہ لکھی گئی ہو۔ اس لیے تھیسسوں کو اردو کی آبرو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

●●

اعجاز وارثی

چنڈو خانے کا مشاعرہ

آئی جو چنڈو خانے کے ماحول میں بہار
نشہ کا راگ چھیڑتے ہی ساز مل گئے
بھبکے اُڑے افیون کے کمرے مہک اٹھے
اک بولا کوئی جشنِ خرافات چاہیے
قطعِ کلام کر کے ہوا دوسرا اخل
بزمِ سخن کی آج ہی بنیاد ڈالیے
جم جائے اک مشاعرہ فی الفور و فی البدیہہ
شاعر اگر نہیں ہے کوئی اس جگہ تو کیا
چل جاتا ہے مشاعروں میں تیر بے کماں
ہو جائے جشن اگر تو متاعِ حیات ہے
دورِ غزل شروع ہوا قصہ مختصر
اک جی حضوریے کو نظامت ہوئی سپرد
ضیغم بنا کوئی کوئی عصفور بن گیا
بد ذوق ایک ذوق کا پس خوردہ بن گیا
بازارِ زندگی میں جو کوڑی کے تین تھے
یلغار تھی کلام کی شعروں کا زور تھا
مفلوج بحریں ہو گئیں مصرعے سسک گئے
اظہارِ تمکنت پہ تفاخر پہ واہ وا
نشہ چڑھا تو لفظوں کے راہی بھٹک گئے
ناگاہ ایک چیخ فضا میں ہوئی بلند
پینک کا جھونکا آیا توازن بگڑ گیا
چہرہ لہولہان تھا مضروب پسلیاں
ہر چند سارا کھیل بد انجام ہو گیا

ہر چنڈو باز دوشِ ہوا پر ہوا سوار
مریل پرندوں کو پرِ پرواز مل گئے
طائرِ تخیلات کے سوئے فلک اُٹھے
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے
فرمایا، کوئی سلسلہ قائم ہو مستقل
تخییل و فکر و ذہن کے گوشے کھنگالیے
آوازیں! کوئی غم نہیں شیریں ہوں یا کریہہ
بندھ جاتی ہے کبھی کبھی نا اہلوں کی ہوا
ہو انتظامِ داد تو کودن بھی نکتہ داں
استاد ہونا بھی کوئی دشوار بات ہے؟
صدر الصدور بیٹھ گئے اک تپائی پر
شطرنج کی بساط پہ جو تھا مثالِ "برد"
انگوٹھا جو لگاتا تھا "دکتور" بن گیا
مغلوب ایک غالبِ آزردہ بن گیا
اس اجتماعِ خاص میں وہ سامعین تھے
تحسین و شادیانوں کا ہر سمت شور تھا
پیراہنِ عروض کے بخیے اُدھڑ گئے
شعروں کے ابتذال و تفاخر پہ واہ وا
لب وا ہوئے تو ناک میں مصرعے اٹک گئے
دیکھا تو فرشِ خاک پہ تھے صدرِ ارجمند
بوڑھا درخت آندھی میں جڑ سے اکھڑ گیا
ٹانگیں پھنسی ہوئی تھیں تپائی کے درمیاں
بایں ہمہ مشاعرے کا نام ہو گیا

اس حادثے کی جیسے ہی مجھ کو خبر لگی
میری زباں سے نکلا کسی کی نظر لگی

دسمبر ۱۹۸۹ء
خامہ بگوش (کراچی)

ان کی تصانیف کے بوجھ سے اردو کی گردن جھک گئی ہے

ایک مرتبہ ہم نے فضیل فرحت کے حوالے سے لکھا تھا کہ ہندوستان میں طنز و مزاح کا حال خاصا پتلا ہے لیکن جب ہمیں یہ معلوم ہوا کہ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین بارہ بارہ کتابوں کے مصنف ہیں، تو ہمارے دل میں ہندوستان کے اردو قارئین کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ان بیچاروں کا حال بھی خاصا پتلا ہوگا!

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی ہمت کی داد دینی چاہیے کہ ایک ایسے زمانے میں جب اپنا لکھا آپ پڑھنے کی روایت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، انھوں نے بارہ بارہ کتابیں لکھ کر اردو زبان کی ناقابلِ فراموش خدمت کی ہے۔ ان کا یہ احسان ہمیشہ اردو زبان کی گردن پر رہے گا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس احسان کے بوجھ سے اردو کی گردن جھک جائے۔ واضح رہے کہ "گردن جھکنا" ایک محاورہ ہے جس کے دو معنی ہیں۔ ایک احسان سے زیر بار ہونا اور دوسرے شرمندہ ہونا۔ ہم نے یہ محاورہ پہلے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بھی ان ہی معنوں سے سروکار رکھیں۔ دوسرے معنوں کو لغت نویسوں کی غلطی سمجھیں۔ آخر لغت نویس بھی ہماری آپ کی طرح کے انسان تھے اور انسان خطا کا پتلا ہوتا ہے۔ لغت لکھی جائے یا کوئی عام کتاب، ایک کتاب لکھی جائے یا بارہ کتابیں، غلطی کا امکان بہرحال ہوتا ہے۔ لیکن صورتِ حال اس وقت سنگین ہو جاتی ہے، جب بارہ کتابوں کے بعد تیرھویں کتاب بغیر لکھے وجود میں آ جائے۔

ممکن ہے بعض لوگ اس پیراگراف کا آخری جملے کو مہمل قرار دیتے ہوئے یہ پوچھیں کہ کوئی کتاب لکھے بغیر کس طرح وجود میں آ سکتی ہے۔ ہم پورے پیراگراف کو مہمل ماننے کے لیے تیار ہیں لیکن آخری جملے کو نہیں۔ اس کے بامعنی ہونے کا ثبوت اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین نے جو بارہ بارہ کتابیں تصنیف کی ہیں، ان کے انتخابات حال ہی میں شائع ہو گئے ہیں جس کے نتیجے میں اب وہ تیرہ تیرہ کتابوں کے مصنف ہو گئے ہیں۔

تفصیل میں جانے کی یہ ہے کہ آج کل ہندوستان میں یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے ناموں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ (معلوم نہیں خود بجا رہے ہیں یا یہ دونوں کھڑے ہی بجا رہے ہیں) جس رسالے کو اٹھائیے اس میں ان دونوں کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین، شخصی خاکے اور سفرنامے نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں طنز و مزاح کا تذکرہ ہوتا ہے اور ان کا منفرد سبیل کی کامیابی کا سہرا انھی دونوں کے سر بندھتا ہے۔ رشید احمد صدیقی، کنہیا لال کپور اور فکر تونسوی کی وفات کے بعد اردو طنز و مزاح میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے ان

دونوں نے نہایت ہی خوش اسلوبی سے پر کیا ہے ۔ خلافِ قانون ادیبوں [illegible] کی کوششیں ہیں ۔ پچھلے سال یہ دونوں پاکستان تشریف لائے تو ان کی بڑی دھوم ہوئی تھی ۔ ہر محفل میں انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور ان کے مضامین ذوق شوق سے سنے گئے ۔ پاکستانیوں کو اس پر حیرت ہوئی کہ ہندوستانی ادب کے خاکستر میں ایسی چنگاریاں بھی ہیں ۔ اس پر مزید حیرت ہوئی کہ [illegible] دونوں کی کوئی کتاب پاکستان [illegible] ہندوستان کی ہر اچھی کتاب کا جعلی ایڈیشن یہاں چھپ جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ان حضرات کی جو کتابیں ہندوستان میں چھپی ہیں ان میں [illegible] طباعت و کتابت کچھ ایسی [illegible] ایڈیشن [illegible] ہیں ۔ ظاہر ہے کہ پاکستانی پبلیشر [illegible] جعلی ایڈیشنوں کے جعلی ایڈیشن چھاپیں ۔

[illegible] یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کا قارئین سے لاعلم رہنا افسوسناک ہے ۔ ان [illegible] کہ وہ اپنی کتابیں پاکستان میں چھپوائیں ۔ دونوں نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ انھیں جو زرِ مبادلہ ملتا [illegible] کتابیں چھپوائی جا سکیں ۔ خواجہ حمید الدین شاہد سے کہا گیا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھائیں ۔ [illegible] فرمایا کہ اُن کے پاس ادبی کاموں کے لیے تھوڑا بہت جو سرمایہ تھا ، اسے طنز و مزاح کانفرنس لے ڈوبی ۔ یہ وہی طنز و مزاح کانفرنس ہے جس میں شرکت کے لیے دونوں مصنف پاکستان تشریف لائے تھے ۔

اکادمی ادبیات سے رابطہ قائم کیا گیا تو وہاں سے یہ جواب ملا کہ اکادمی صرف معذور ادیبوں کی مدد کرتی ہے ۔ ایسے ادیبوں کی مدد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو معذور بھی نہ ہوں اور پھر پاکستانی بھی نہ ہوں ۔ اگر یہ دونوں پاکستانی [illegible] تو انھیں بہت سے صحت مند پاکستانی ادیبوں کی طرح معذور ادیبوں کے فنڈ سے مدد دی جا سکتی تھی ۔

واضح رہے کہ اکادمی کے پاس معذور ادیبوں کی مدد کرنے کے لیے جو فنڈ ہے اس کا بڑا حصہ صحت مند ادیبوں پر صرف ہو جاتا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو ادیب معیاری ادب تخلیق نہ کر سکیں ۔ انھیں بھی معذور ادیب تصور کیا جاتا ہے ۔

مایوسی کے اس عالم میں راغب [illegible] امید کی کرن بن کر طلوع ہوئے اور انھوں نے اپنے مکتبہ ہم زبان کی طرف سے یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابات شائع کرنے کی پیشکش کی جو فوراً قبول کر لی گئی ۔ فوراً اس لیے کہ راغب صاحب کو [illegible] پیشکش پر نظرِ ثانی کا موقع نہ مل سکے ۔ ویسے اس کا امکان نہیں تھا کیونکہ راغب صاحب کتابوں کی اشاعت کا کام محض شوق کی بنا پر کرتے ہیں ۔ تجارت ان کا مقصد نہیں ۔ اسی لیے وہ کتابیں چھاپ کر گودام میں رکھ دیتے ہیں ۔ اُن کا خیال ہے کہ کتاب اس وقت تک فروخت نہیں ہوتی جب تک اُسے چھپے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر جائے ۔ کتاب پرانی ہو جائے تو اُس کا شمار نوادر میں ہوتا ہے اور نوادر باآسانی فروخت ہو جاتے ہیں ۔

یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابات شائع کرنے پر راغب شکیب کی آمادگی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک مرتبہ انھیں کہیں سے جامعہ عثمانیہ کی پرانی مطبوعات کے کچھ نسخے مل گئے تھے ۔ ان پرانی کتابوں کو انھوں نے منہ مانگے داموں فروخت کیا ۔ چونکہ مذکورہ دونوں ادیب جامعہ عثمانیہ کے فارغ التحصیل ہیں ۔ اس لیے راغب صاحب نے سوچا ہوگا کہ اُن کی کتابیں [illegible] جامعہ عثمانیہ کی مطبوعات کی طرح ہاتھوں ہاتھ اور منہ مانگے داموں فروخت ہو جائیں گی ۔

[illegible] دونوں کی خوش قسمتی جاننا چاہیے کہ انھوں نے ایک مفید کام کی ذمہ داری

[illegible] دبستان سرگودھا کے رکن رکین کی حیثیت سے وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے جو دبستان مذکور کے نقطہ نظر [illegible] یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کے بارے میں یقیناً انھوں نے تحقیق کرلی ہوگی کہ ان دونوں کا آبائی [illegible] جب حیدرآباد دکن کے مہاراجہ کشن پرشاد شاد کے آبا و اجداد سیالکوٹ کے ہو سکتے ہیں [illegible] دونوں کا آبائی وطن سرگودھا کیوں نہیں ہو سکتا، کوئی تعجب نہیں کہ خود مجتبیٰ حسین نے راغب شکیب کو شیشے میں اتارنے کے لیے یہ بات کہی ہو۔ مجتبیٰ حسین اس کام میں خاصے ماہر ہیں۔ راغب شکیب تو خیر راغب شکیب ہیں، انھوں نے ابھی کچھ دنوں پہلے تک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھی شیشے میں اتار رکھا تھا۔ سننے میں آیا ہے کہ اس شیشے میں بال آگیا ہے ... ڈاکٹر نارنگ مجتبیٰ حسین کے شیشے سے نکل کر بعض دوسرے شیشہ بازوں سے میل جول [illegible]۔

[illegible] یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریروں کے انتخابات کی جو "ترتیب" "زیر غور" اور "قطع کلام" [illegible] شائع ہوئے ہیں۔ انتخابات کا کام رعنا فاروقی نے انجام دیا ہے جو معروف صحافی اور افسانہ نگار ہیں۔ ان کی شہرت کا سبب کہانیوں کا وہ مقبول سلسلہ ہے جو "تین عورتیں تین کہانیاں" کے نام سے چھپتا رہا ہے [illegible] ناظم اور مجتبیٰ حسین کے انتخابوں کو اسی سلسلے کی ایک کڑی نہ سمجھا جائے۔ یہ بالکل مختلف نوعیت کا کام ہے۔ [illegible] فاروقی کی ہمت قابل داد ہے کہ انھوں نے پہلے دونوں مصنفوں کی دو درجن کتابوں کو پڑھا اور پھر ان میں سے اپنی تحریروں کو الگ کیا جو ان کے نزدیک بہترین ہیں۔ ہمت کی داد ہم نے اس لیے دی ہے کہ دو درجن کتابوں کو پڑھنے کے بعد بھی وہ اس لائق رہیں کہ برے بھلے میں تمیز کرسکیں۔ اُن کی جگہ ہم ہوتے تو تحریروں کا انتخاب قرعہ اندازی سے کرتے اور پڑھنے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال دیتے۔ ویسے بھی یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین کی تحریریں سراپا انتخاب ہوتی ہیں۔ انتخاب کا انتخاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے دیگ میں سے کچھ چاول نکال کر کہا جائے کہ یہ باقی چاولوں سے بہتر ہیں حالانکہ دیگ میں سب چاول ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔

بہر حال پاکستانی قارئین کے لیے ان انتخابات کی ضرورت تھی۔ ان سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دونوں مصنفین کی وہ تحریریں جو نگاہ انتخاب میں اعتبار حاصل نہ کرسکیں، کیسی ہوں گی۔ انھیں پڑھنے کی خواہش بھی دل میں پیدا [illegible] کتابوں کے دیباچوں میں نہایت عمدگی سے ان کے مصنفین کی ادبی خصوصیات [illegible]۔ اس کے لیے رعنا فاروقی اور دونوں مصنفین مبارکباد کے مستحق ہیں۔ رعنا فاروقی اس لیے کہ انہیں خوبیوں کی تلاش میں ناکامی نہیں ہوئی، یوسف ناظم اور مجتبیٰ حسین اس لیے کہ بالآخر اُن کی تحریروں کی [illegible] یہ اچھا ہی ہوا کہ اردو کے محقق جو کام دو سو سال بعد کرتے وہ آج ہمارے سامنے انجام پاگیا۔

[illegible] وہ مضامین اور چار شخصی خاکے ہیں۔ ان مضامین کا تعلق معاشرے کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں سے ہے کچھ مضامین ادب اور ادبی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ یوسف ناظم کا کمال یہ ہے کہ ان کی نظر انھیں گوشوں [illegible] جہاں عقل کے خلاف کوئی بات نظر آتی ہے۔ وہ پہلے سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر نہایت معصومیت کے ساتھ مسئلۂ زیر بحث کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

شگوفان کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات کیوں کہلاتا ہے۔ وہ نہایت غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اشرف اخوت اور بہادری وغیرہ کے اوصاف کی وجہ سے انسان اس کا مستحق ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کہلائے۔ پھر وہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتے ہیں اور انسانوں میں ان خوبیوں کی تلاش کر لیتے ہیں۔ کس طرح؟ اس کی ایک مثال یہ ہے ــــ "دلیری اور بہادری میں انسان کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔ کسی کی جیب کاٹ لینا، مکان لوٹ لینا، فساد برپا کروا دینا، چھری مار دینا، مندر سے مورتی اور مسجد سے جوتے اٹھا لینا انسان کے [illegible] کام ہیں . . . . ایسے کام انجام دینے سے ایک سکون سا محسوس ہوتا ہے۔"

ادب اور ادبی مسائل پر لکھتے ہوئے بھی انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ "غالب کی صحت جسمانی" ایک دلچسپ مضمون ہے جس میں انھوں نے کلام غالب سے ثابت کیا ہے کہ غالب گوناگوں امراض کا شکار تھے اور ساری زندگی مختلف بیماریوں میں گزری۔ ہمارے محققین، خصوصاً غالب پر تحقیق کرنے والوں کو یہ مضمون ضرور پڑھنا چاہیے اور اس موضوع پر مزید تحقیق کرنی چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غالب زیادہ بیمار تھا یا اس کے محقق۔

اس کتاب میں جو چار شخصی خاکے ہیں، وہ باقر مہدی، سلیمان ادیب، راجندر سنگھ بیدی اور کرشن چندر کے ہیں۔ ان میں سے آخری تین اب ہمارے درمیان موجود نہیں اور باقر مہدی، خدا انھیں سلامت رکھے، پہلے سے زیادہ موجود ہیں۔ انھیں اپنی کالی غزلوں اور بیہی تنقید سے اتنی شہرت نہیں ملی جتنی یوسف ناظم کے خاکے سے ملی ہے بلکہ ہم تو یہاں تک کہیں گے کہ یوسف ناظم کی شہرت میں بھی اس خاکے کا بڑا حصہ ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ چل کر باقر مہدی اور یوسف ناظم اسی خاکے کی وجہ سے یاد رکھے جائیں۔

مجتبیٰ حسین کے انتخاب "قطع کلام" میں مضامین اور خاکوں کے علاوہ سفرنامے بھی شامل ہیں۔ موصوف "جہاں دیدہ" ہیں۔ انھوں نے محاورتاً دنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے۔ اس لیے ان کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انھوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابن انشا سے لی ہے۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں ان کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ عام لکھنے والے موضوعات سے متعلق طرح طرح کی باتیں بیان کرتے ہیں، لیکن مجتبیٰ حسین نقادوں کے بارے میں بھی طرح طرح کی نادر باتیں لکھتے ہیں اور اس کی داد زیادہ تر انھیں سے ملتی ہے جن کے بارے میں یہ باتیں لکھی جاتی ہیں۔

وہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔ ان کے بیشتر بلکہ تمام مضامین انشائی نوعیت کے ہیں جن میں وہ دلچسپ واقعات اپنے دلچسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان میں اس قسم کے معنی خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں ــــ "اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا۔ اسے ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ یہی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے [illegible]

"تجلی کلام" میں تیرہ مضامین، چار شخصی خاکے اور دو سفرنامے ہیں۔ شخصی خاکے راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، صادقین اور مشفق خواجہ کے ہیں۔ سفرنامے جاپان اور روس کے ہیں۔ مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے، ان کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا انداز بیان ہے۔ وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے اور اس کیفیت سے اس وقت آزادی حاصل کرتا ہے جب مضمون ختم ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ کاش مجتبیٰ حسین مضمون ختم نہ کرتے، اپنی بات جاری رکھتے۔ صادقین کا خاکہ ایک ایسی ہی تحریر ہے۔ صادقین کی شناخت کے لیے ان کی بنائی ہوئی تصویروں کو دیکھنے کے ساتھ اس خاکے کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ تصویروں میں صادقین کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ اس خاکے میں ہم جیتے جاگتے صادقین سے ملتے ہیں۔

مولانا حالی نے محمد حسین آزاد کے بارے میں لکھا تھا کہ وہ گپ بھی ہانکتے ہیں تو وحی معلوم ہوتی ہے۔ ہم اس قدر مبالغے سے تو کام نہیں لیں گے، لیکن یہ ضرور عرض کریں گے کہ مجتبیٰ حسین واقعہ کو افواہ بنائیں یا افواہ کو واقعہ، دونوں صورتوں میں ان کے اسلوب بیان کی دلکشی برقرار رہتی ہے۔ ●○

مہان لیکھک اوپندر ناتھ اشک ۸۱ برس کے جوان رعنا ہیں

ممتاز ہندوستانی ادیب اوپندر ناتھ اشک ایک طویل عرصے سے پانچ حصوں پر مشتمل ناولوں کا ایک سلسلہ لکھنے میں مصروف ہیں۔ اس سلسلے کا پہلا ناول "گرتی دیواریں" اور تین دوسرے ناول شائع ہو چکے ہیں۔ پانچواں ناول زیر تحریر ہے۔ ان میں لاہور کے ان علاقوں کا تفصیلی ذکر ہے، جہاں آج سے پچاس برس قبل اشک صاحب کا قیام تھا۔ ان علاقوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھنے کے لیے وہ لاہور آئے تھے۔ اکادمی ادبیات نے انھیں اسلام آباد اور کراچی کی بھی سیر کرا دی۔ پچھلے دنوں کراچی میں ان کی وجہ سے بڑی رونق رہی۔ وہ یہاں کے ادیبوں سے ملے اور ان کے اعزاز میں کئی ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔

اشک صاحب، چشم بد دور ۸۱ برس کی عمر میں بھی اپنی حرکات و سکنات سے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے اس کے ہندسوں نے اپنی جگہ تبدیل کر لی ہو۔ دیکھنے میں وہ بزرگ ہیں، لیکن بات کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی جوان رعنا بول رہا ہے۔ تقریر کرتے ہیں تو جوان رعنا بھی ان کے سامنے گھاس کاٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ گھنٹوں بے تکان تقریر کرتے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہو کر سنتے ہیں اور جب تقریر ختم ہوتی ہے، تو یہ محسوس ہوتا ہے، تقریر نہ تھی، غالب کا دریائے معاصی تھا جو تنک آبی سے خشک ہو گیا۔

کراچی میں انجمن ترقی اردو اور ادارہ یادگار غالب کی طرف سے ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ منعقد کیا گیا۔ اشک صاحب کو دیکھنے اور سننے کے لیے دور دور سے اتنے لوگ آئے کہ جلسہ گاہ میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی۔ جلسے کا آغاز مختار زمن کے مضمون سے ہوا۔ انھوں نے اشک صاحب کے بارے میں بہت ہی دلچسپ باتیں بتائیں۔ مختار زمن ڈیڑھ سال پہلے الہ آباد میں اشک صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔ اس ایک ملاقات کے حوالے سے انھوں نے موصوف کی ایسی تصویر کھینچی، جیسے ان کی آدھی نہیں تو چوتھائی زندگی اشک صاحب ہی کے ساتھ گزری ہو۔

وہ ہمارے کھڑے رہنے کے اسٹائل پر مسکرایا پھر بولا۔

"آپ بہت ہی شریف آدمی ہیں، ہم آپ کو نہیں لوٹیں گے۔"

"سچ ——— !" ہمارا انگ انگ فرطِ مسرت سے ابھی جھوما ہی تھا، ابھی ہم "سچ" کہنے کے بعد یہ سوچ ہی رہے تھے کہ سچ مچ شرافت رائیگاں نہیں جاتی کہ وہ اپنے لبوں پر زہریلی مسکراہٹ سجا کر بولا . . . "آپ خود اپنے ہاتھوں لٹ جائیے۔ یعنی اپنے ہاتھ سے اپنی جیبیں خالی کر کے ہمیں دے دیجیے ——— آج کے زمانے کے سچے حاتم طائی بن جائیے ——— اگر آپ نے جیبیں خالی کرنے میں بے ایمانی کی تو یاد رکھیے ہم آپ کو نہیں بخشیں گے کیوں کہ خدا بھی بے ایمانوں کو نہیں بخشتا اور ہم خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔"

"اوہ وہ پولیس والا!" ہم نے لرز کر پوچھا۔

"وہ بھی خدا کو مانتا ہے ——— بہت ایمان دار آدمی ہے وہ بھی اس لیے جلدی کرو!!"

کرخت لہجے میں ایک ملٹری افسر کی طرح اس نے ہمیں آرڈر دیا اور ہم نے اپنی جیبیں خالی کرنے میں تھوڑی بھی بے ایمانی نہیں کی۔

اس حادثے کے بعد ہم نے قسم کھائی تھی کہ اس شانتی مارگ پر کبھی نہیں رکیں گے چاہے ہمیں کوئی کتنی ہی آواز دے ——— کتنا ہی بلائے۔ ہم پلٹ کر بھی نہیں دیکھیں گے۔

وہ ہمیں آواز دے رہا تھا "او صاحب ——— رکیے صاحب!!" اور ہم ہیں کہ اپنی رفتار تیز کرتے جا رہے تھے۔

"او صاحب ——— !" جیسے ہی اس کی آواز ہمیں اپنے کانوں کے قریب محسوس ہوئی ہم بغیر پلٹ کر دیکھے بھاگنے لگے . . . . .

شانتی مارگ طویل تھا . . . . اور سنسان بھی، صرف ہم ہی اس پر اپنی حفاظت کے لیے دوڑ رہے تھے اور وہ ہمارا تعاقب کر رہا تھا۔

ہماری سانسیں پھولنے لگی تھیں۔ بدن پسینے سے چپچپانے لگا تھا۔ پھر بھی ہم بھاگ رہے تھے . . .

پیچھے پلٹ کر ہم نے دیکھا، وہ ہمارے بالکل قریب آگیا تھا۔

"او صاحب! رکیے۔ میں کوئی بدمعاش نہیں ہوں، لٹیرا نہیں ہوں ——"

وہ بھاگتے ہوئے اپنے کریکٹر سے ہمیں آگاہ کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

"سالے سب بدمعاش ایسا ہی بکتے ہیں سالے . . . ." ہم دل ہی دل میں اسے گالیاں بک رہے تھے کہ اس نے پیچھے سے ہمارا کالر پکڑ لیا اور اپنی پھولی پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"صاحب بالا برج کے سے میں آپ کا پیچھا کر رہا ہوں، جب آپ امبریلا سے نکلے اور جیب سے رومال نکالا

بعد ارشاد فرمایا ——— "برخوردار! اس غزل کا تو ہر دوسرا مصرع لنگڑا تا ہے۔ ایسا لگتا ہے اس غزل کو پولیو ہو گیا ہے۔ تم شروع سے پہلے ہی فاعلاتن فاعلاتن کے پولیو ڈراپس کیوں نہیں دیتے۔ بہر حال اب بھی کچھ نہیں گیا۔ میں اس کی ہر لڑکھڑاتی ہوئی ٹانگ کاٹ کر نئی فٹ کر دیتا ہوں۔"

میں نے کہا "حضور! ایسا غضب نہ کیجیے۔ اس کی اسی معذوری کی وجہ سے تو ہر اسٹیج لوگ متوجہ ہوں گے۔ آخر ہم بھی توجہ ہی کے طالب ہیں۔ ہر مشاعرے میں شاعر غریب توجہ چاہتا ہوں، توجہ چاہتا ہوں کی رٹ لگا کر ہلکان ہوتا ہے "مگر کوئی متوجہ نہیں ہوتا!" پھر میں نے ایک نیا پتہ یہ کہہ کر پھینکا کہ "دیکھیے میرے پاس ایک پابند غزل بھی ہے۔" (یہ وہی غزل تھی جو صنم آزری نے مجھے مشاعرے میں پڑھنے کے لیے دی تھی)

علامہ نے غزل پڑھنے کے بعد اظہارِ خیال فرمایا۔

"میاں! اس غزل میں تو کئی اسقام موجود ہیں۔ تمہاری فکر ابھی ناپختہ ہے، تشبیہات اور استعاروں کی چولیں ڈھیلی ہیں، ہر مصرعے میں الفاظ خرمستیاں کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا تم قدیم اور جدید شاعروں کا کلام پڑھو اور شعر کہنا سیکھو جس طرح ہم نے سیکھا۔"

پھر ایک ضخیم کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "یہ لو، اس میں منتخب شعرا کا کلام ہے۔ میں صنم آزری سے مانگ کر مطالعے کے لیے لایا تھا۔"

میں وہ کتاب گھر لایا۔ ورق گردانی کی تو مجھے اس میں وہ نظم نظر آئی جو میں نے مشاعرے میں پڑھی تھی اور ایک مشہور جدید شاعر کے نام تلے وہ غزل بھی مل گئی جو علامہ کو اصلاح کی غرض سے دی تھی۔ ●●

سرپٹ مرحوم کو خراجِ عقیدت

مصنف رحیم

زندہ دلوں سے طنز کا پیکر چلا گیا
وہ قہقہہ نواز وہ دلبر چلا گیا

زندہ دلوں کی ٹیم کا وہ اوپنر رہا
اپنے مشاعروں کا گو سکر چلا گیا

رونق مشاعروں کی رہا عمر بھر مگر
سب کو ہنسانے والا رُلا کر چلا گیا

اب دھر گھسیٹ اپنی نظر کو عزیز ہے
غزلوں کا اپنی چھوڑ کے دفتر چلا گیا

[illegible] سی کو یاد
[illegible] کر چلا گیا

[illegible] مگر تمام عمر
[illegible] کر چلا گیا

[illegible] رحیم اب
دل میں [illegible] کے دفتر چلا گیا

[illegible] کر اللہ کی ٹکٹ سے چلا جاتا ہے

چوراسی سال کا نوجوان
سرپٹ حیدرآبادی

سرپٹ تھا اس کا نام سدا دوڑتا رہا
ہر دوڑ میں جوانوں سے آگے نکل گیا
دیکھا کسی کو سست قدم تو یہ کہہ دیا
"موڑو زمانہ چال ظرافت کی چل گیا"

دعویٰ تھا بے تحاشہ حسینوں سے عشق کا
چوراسی سال میں بھی سدا نوجواں رہا
احساس کم سنی میں رہا مبتلا فقط
رہنا کہاں تھا اس کو مگر وہ کہاں رہا

خوددار تھا کسی سے وہ کرتا بھی کیا سوال
تحسین و آفریں کے سہارے ہی جی گیا
کچھ سمجھ کے زیست کو قانع رہا مدام
غم کو نہاری پائے کے دن رات پی گیا

دعوت مشاعرے کی ملی آسمان سے
دیدے مشاعرے کی صدارت بھی [illegible]
شاعر تھا نادرہ [illegible] گرمیں وہ [illegible]
کردے نصیب اجر شہادت بھی [illegible]

رشید عبدالسمیع جلیل

حیدر بیابانی (اچل پور)

تیل کے کھیل

تیل کے کھیل نرالے ہوتے ہیں ۔ تیل کی ساری دنیا میں حکومت ہے ۔ قلت کے زمانے میں لوگ تیل والوں کی خوشامد کرتے ہیں اور تیل پیدا کرنے والے ملکوں سے بڑی بڑی حکومتیں خوف کھاتی ہیں ۔

اگلے وقتوں میں تیل بیچنے اور نکالنے والا تیلی کہلاتا تھا ۔ لیکن اب ہل مالکوں میں گنا جاتا ہے پہلے تیل اور تیلی کا رشتہ بڑا گہرا تھا لیکن زمانے کے الٹ پھیر نے اس رشتہ کے بیچ ایک بڑی گہری کھائی پیدا کر دی ہے ۔ اب تیل گھانی کا تصوّر ہی پتھر کے زمانے کا لگتا ہے ۔ آنکھوں پر پٹی بندھے بیل کا گول گول گھومنا اور گھانی کی چرچوں چرچوں کے ساتھ تیل کا بوند بوند نکلنا خواب کی بات ہو گئی ہے ۔

تیل کئی قسم کے ہوتے ہیں ۔ اور تقریباً تمام چیزوں سے نکالے جاتے ہیں ۔ ہر جاندار اور بے جان چیز سے تیل نکالا جاتا ہے ۔ مٹی سے لے کر آدمی تک سب میں تیل ہوتا ہے اور بوقت ضرورت نکالا جاتا ہے ۔

پکوانوں کو لذت دار بنانے کے لیے مونگ پھلی ، جوس ، سویابین ، تل اور سرسوں وغیرہ کا تیل کام میں لایا جاتا ہے ۔ سرسوں کا تیل ایک اور کام میں آتا ہے پہلوان لوگ اس سے جسم کی مالش کرواتے ہیں لیکن مالش کم اور جسم زیادہ چمکاتے ہیں ۔ دیہاتوں کے ہفتہ وار بازاروں میں سڑک چھاپ دوا فروش ایک اور خاص قسم کا تیل بیچتے نظر آتے ہیں اور "تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو" ۔ ۔ ۔ ۔ کہہ کہہ کر سادہ لوح لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں ۔

بالوں میں لگانے کے لیے ناریل کا تیل " ہیئر آئیل " کے نام سے فروخت ہوتا ہے لیکن ملاوٹ کرنے والے زیادہ تر اس میں " موبل آئیل " مکس کر دیتے ہیں یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو ہر قسم کے استعمال میں آنے والے تیلوں میں ملاوٹ کر کے اچھی خاصی انسانی صحت دجوانی کا تیل کر دیتے ہیں لیکن کبھی کبھار پکڑے بھی جاتے ہیں تب سرکاری افسران کا اچھا خاصا تیل بھی نکال لیتے ہیں ۔

تیل کی قلت کے زمانے میں سیٹھ غریب داس کی اجاڑ ماری صورت دیکھ کر سرکاری افسران ان کے گوداموں کو یہ کہہ کر نظر انداز کرتے رہے ہیں کہ ان تلوں میں تیل نہ ہوگا لیکن جب ایک منچلے افسر نے محض خانہ پری کی غرض سے سیٹھ جی کے ایک ٹوٹے پھوٹے خستہ حال گودام کو چیک کر ہی لیا تو ہزاروں من تیل بھر بھر نکل آیا ۔

[illegible] بیچ ، کا نا [illegible] حاصل کرنے کے لیے ایک شریف آدمی کو بہت سارے پاپڑ بیلنے [illegible]

افسروں کی خوشامدیں کرنی پڑتی ہیں اور انھیں رشوتیں دے دے کر منانا پڑتا ہے اس طرح لائسنس حاصل کرتے کرتے بیچارے کا تیل نکل جاتا ہے۔ یہ تیل نکل جانا گندم نکل جانے جیسا ہی ہوتا ہے اور اس عرصے میں وہ شریف آدمی شریف بدمعاش بن جاتا ہے۔

پرانے زمانے میں بغیر تیل کے اندھیری رات میں اجالے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اب جبکہ چاروں طرف بجلی کا بول بالا ہو گیا ہے لیکن یہ محاورہ یعنی نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی اب بھی زبان زد ہے۔ مُرالفساد مرض میں تیل ڈالنا پڑتا ہے جبکہ آگ میں تیل کہتے ہیں۔

تیل بہتا بھی ہے۔ جلتا بھی ہے اور رلاتا بھی ہے۔ ہندوستان میں ہمیشہ اور ہر جگہ فرقہ پرستی کی آگ بھڑکتی رہتی ہے اور فرقہ پرست جماعتیں اس آگ میں تیل ڈالنے کا کام کرتی رہیں۔ فسادات کے دوران تیل سے ایک دوسرے کے گھر جلائے جاتے ہیں اور امن کے زمانے میں بہوئیں جلائی جاتی ہیں۔

تیل انسان کی اہم ضرورتیں پوری کرتا ہے۔ کھانے کے علاوہ سر پر بادام کے تیل کی مالش بھی کی جاتی ہے۔ سر درد دور کرنے کے لیے پیشانی پر تیل لگا دیتے اور تکھاڑی کا تیل لگایا جاتا ہے خوشبو کے لیے خوشبودار تیل استعمال کرتے ہیں اور بطور جلاب اندی کا تیل پیتے ہیں۔ لڑکیاں بال بڑھانے کے لیے قسم قسم کے تیل سروں میں ڈالتی ہیں اور عورتیں روکھے پھیکے چہروں کو تیل چپڑ چپڑ کر چمکیلا کر رکھتی ہیں۔

انسانوں کی طرح چوہوں کو بھی تیل بہت مرغوب ہوتا ہے اور پھر ان کا تیل پینے کا انداز تو ساری دنیا سے نرالا ہوتا ہے یعنی تیل کے ڈرم کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ میں یہ مخلوق اپنی دُمیں ڈبو ڈبو کر باہر نکالتی ہے اور انھیں چوستی ہے یا بار بار ڈبوتی ہے اور بار بار چوستی ہے اس طرح منوں تیل ختم ہو جاتا ہے انسانوں کا حق مار مار کر اسٹاک کیا ہوا تیل چوہوں کے پیٹوں میں چلا جاتا ہے۔

تیل کا کھیل قیامت تک چلتا رہے گا۔ روزانہ نہ جانے کتنا تیل نکالا جاتا ہے اور نہ جانے کتنا برباد ہوتا ہے۔ سائیکل اور موٹر سائیکل سے لے کر روبوٹ اور انسان سب تیل کے مرہونِ منت ہیں۔

●●

شمیم زیدی (بمبئی)

شگوفے

★ جناب علی عباس امید نے اپنا انگریزی شعری مجموعہ بیگم ممتاز امید کو اس نوٹ کے ساتھ پیش کیا: "اپنی اکلوتی بیوی کی خدمت میں اس شکریے کے ساتھ کہ اس نے مائکے جا کر مجھے اس کتاب کو مکمل کرنے کا وقت دیا۔"

★ یہ ان دنوں کی بات ہے کہ امید صاحب مسلم یونیورسٹی میں شعبہ معاشیات میں ایم اے فائینل کے طالب علم تھے۔ علی گڑھ کی مشہور زمانہ نمائش شباب پہ تھی۔ امید صاحب پوری رات مشاعرہ میں گزار کر صبح کلاس میں پہنچے تو سو گئے۔ پروفیسر بنرجی نے دیکھا تو ان کے پاس پہنچ کر غصہ میں بولے "ویل" میری کلاس میں تم سو نہیں سکتے۔" "سر، سو تو سکتا ہوں۔ اگر آپ ذرا آہستہ لکچر دیں"۔ امید صاحب نے غنودگی بھری آواز میں جواب دیا۔

★ اتوار کی صبح سات بجے سے جمع ہوئے دو لوگ گیارہ بجے جانے کے لیے اُٹھے تو امید صاحب زینوں تک انھیں چھوڑنے کے لیے اُٹھ پڑے۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب بولے۔ ارے ارے۔ آپ زحمت نہ فرمائیں۔ "آپ لوگوں کو پہنچانا زحمت نہیں رحمت کا سبب ہے۔" امید صاحب نے خلوص کے ساتھ کہا۔

★ معروف ہندی شاعر دشینت کمار کی اہلیہ نے ان کی شراب نوشی پر خفگی ظاہر کرتے ہوئے کہا "انھیں کون سمجھائے کہ شراب سلو پائزن ہوتی ہے؟"
"یہ بات تو ان کو معلوم ہے مگر انھیں کوئی جلدی نہیں ہے۔" امید صاحب نے سمجھایا۔

★ ردی والے نے دروازہ پر آ کر پوچھا: "صاحب کچھ جو پرانا سامان ہوگا؟"
"ہاں ہے تو" امید صاحب نے جواب دیا اور بیگم کو آواز دی۔
وہ آئیں تو ردی والے سے بولے "بس یہی ہیں" اور وہ بیچارہ شرمندہ ہو کر بھاگ گیا۔

★ امید صاحب عنایت عباس کے لیے ہاف پلیٹ لائے تو بیگم نے کہا "ارے، اس میں تو بٹن لگے ہیں۔ زِپ والا لینا چاہیئے تھا۔"
"یاد نہیں، پرسوں کس بری طرح سویٹر کے زپ میں اس کی ٹائی پھنس گئی تھی۔" امید صاحب نے سبب بتایا۔

ڈاکٹر حامد حسین نے کہا "ان دنوں اُردو رسائل میں شعرا کی یکمشت تخلیقات شائع کرانے کی وبا بے حد تکلیف دہ ہو گئی ہے۔"

"صاحب یک مشت تخلیقات سے زیادہ اذیت اُن پر شائع دو مشت تبصروں سے ہوتی ہے۔" امتیاز صاحب کا خیال تھا۔

●●

مرزا کھونچ (بیتیا)

غزل

بڑی بدقسمتی تھی، میں نہیں تھا
جہاں تاڑی بٹی تھی میں نہیں تھا

ہوا مقروض میں جس کی بدولت
وہ میری عاشقی تھی میں نہیں تھا

شہیدوں میں ہے میرا نام لیکن
جہاں گولی چلی تھی میں نہیں تھا

چھڑایا قید سے غنڈے کو جس نے
کسی کی پیروی تھی میں نہیں تھا

غلط معنی تمھیں جس نے بتائے
لغاتِ کشوری تھی میں نہیں تھا

تمھیں گدھے سے اک انساں بنایا
وہ مرزا کی چھڑی تھی میں نہیں تھا

غزل

ہے شاق تم پہ اتنا مرا انتظار کیوں
ہوتا نہیں ہے ہاتھ تو کرتے ہو پیار کیوں

عزت سے بھی عزیز ہے تجھ کو خمار کیوں
پینا پلانا نقد ہے غلہ اُدھار کیوں

آتا ہے جب شباب حسینوں پہ اے خدا
رہتا نہیں کمر پہ انھیں اختیار کیوں

یہ پیٹ ہے جناب کا گنڈی پیٹ ہے؟
بن بیٹھے ہو "مصنوعی" کا تم اشتہار کیوں

لاغر ہیں نعرے امن کے نوکِ زبان پر
ذہنوں میں پل رہا ہے مگر انتشار کیوں

لاغر ترملی

تبصرہ نگار : مضطر مجاز

فصیل (کرناٹک اردو اکیڈیمی کا ترجمان)

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

کرناٹک اردو اکیڈیمی جنوبی ہند کی واحد فعال اردو اکیڈیمی ہے۔ یوں بھی کل ہند سطح پر دیکھا جائے تو شاید دلی اور یوپی اکیڈیمی کے بعد کرناٹک اردو اکیڈیمی کا نام لیا جاسکتا ہے جو اپنے محدود بجٹ کے باوجود اردو کی بڑی ٹھوس خدمت انجام دے رہی ہے۔ سمیناروں، مباحثوں، مشاعروں کے علاوہ اپنا ایک ترجمان بھی رکھتی ہے۔ "فصیل" جو وقفے وقفے سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتا ہے اب تک اس کے چار پانچ شمارے سامنے آچکے ہیں۔ زیر نظر شمارہ مولانا ابوالکلام آزاد نمبر (خبرنامہ کو ملاکر) پانچواں شمارہ ہے۔ جس میں ان تمام مقالوں کو یکجا کر دیا گیا ہے جو اکتوبر ۸۸ء میں مولانا آزاد صدی تقاریب کے موقعے پر پڑھے گئے۔ اکیڈیمی نے ہندوستان بھر سے مولانا آزاد کے ماہرین کو جمع کیا تھا جن میں صاحب طرز ادیب ڈاکٹر ظ۔ انصاری اور ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی کے علاوہ ڈاکٹر امیر عارفی، پروفیسر قدیر امتیاز، حکیم شاکر اور ڈاکٹر شفیع احمد شریف جیسے دانشور شامل ہیں۔

اس شمارے میں پانچ وقیع مقالوں کے علاوہ ڈاکٹر ظ۔ انصاری کا خطبۂ صدارت اور ڈاکٹر لیئق خدیجہ صدر اکیڈیمی کا خطبۂ استقبالیہ بھی شامل ہے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے مولانا آزاد کے ذہنی اور فکری سفر کا بڑے جامع انداز میں جائزہ لیا ہے اور بعض داخلی شہادتوں کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مولانا کی کوششیں "اپنوں" کی ہدفِ تنقید کا شکار ہوئیں اور جب کھیل ختم ہوا تو کھلا کہ مولانا کے بدترین اندیشے پورے ہوئے مختصر یہ کہ مولانا کی وہ عظیم شخصیت تھی کہ:

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا
اور اپنے "سلیقے" سے اپنی محبت نبھا دی۔

ڈاکٹر سید مجاور حسین رضوی نے بڑی تفصیل سے مولانا کی اس شخصیت کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو انھیں بحیثیت مجاہد آزادی حاصل تھی۔ مولانا کی شخصیت ایسی ہمہ جہت تھی کہ اس میں ایک اعلیٰ پائے کا ادیب اور انشا پرداز بھی تھا، شعلہ بیان مقرر بھی اور بیباک صحافی بھی —— لیکن ان کی تمام حیثیتوں کا خمیر اٹھا تھا تو ان کے جذبۂ آزادی سے اگر وہ مجاہد آزادی نہ ہوتے تو شاید بڑے ادیب ہوتے نہ مقرر، نہ صحافی۔ ڈاکٹر رضوی نے اپنے کسی قدر طویل مقالے میں اپنے موضوع کا بہ احسن الوجوہ حق ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر امیر عارفی نے مولانا کے آزادی کے بعد سیاسی موقف پر قلم اٹھایا ہے۔ یہ مولانا کا وہ زمانہ ہے جسے میر کے الفاظ میں:

ہو گئے خاک انتہا ہے یہ

میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ ہر لحاظ سے بڑا نازک تھا۔ ڈاکٹر عارفی نے بتلایا ہے کہ کس طرح اس مخالف اور متخالف احول کا مولانا نے پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا۔

مابقی تین مقالے مولانا کی ادیبانہ اور صحافیانہ حیثیتوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان کی صحافتی زندگی بھی ابلاغ عامل کے دو عہدوں میں بٹی ہوئی ہے جس پر ان مقالوں میں سیر حاصل روشنی ڈالی گئی ہے۔

کرناٹک اردو اکیڈیمی اپنے اس علمی کارنامے پر اہل علم و دانش کی جانب سے ہر آئینہ مبارکباد کی مستحق ہے۔

ملنے کا پتہ: کرناٹک اردو اکیڈیمی ۲/۱۴ کنارا فینانس کارپوریشن کامپلکس ٹرد چنگا روڈ بنگلور ۵۶۰۰۰۱

صغیر احمد سحر سندیلوی

تین شعر

حل کیا پرچہ مری بیگم نے تھا		ممتحن نے ہیں دیئے نمبر مجھے

میں بھی بن جاتا کسی دن منتری		کاش کر آتا جو یہ منتر مجھے

اے سحر دار العلوم عشق کا
سب سمجھتے ہیں پروفیسر مجھے

اداریہ

یہ خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی کہ حیدرآباد کے بزرگ اور نامور مزاحیہ نگار حضرت سرپٹ حیدرآبادی کا سڑک کے ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا۔ شام کے وقت وہ کچھ خریدنے کے لیے گھر سے نکلے تھے کہ ایک لاری نے انھیں ٹکر دے دی۔ یہ حادثہ جان لیوا ثابت ہوا۔ اس حادثے کا دوسرے دن صبح علم ہو سکا جبکہ سرپٹ صاحب کے گھر نہ لوٹنے پر ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک پڑوسی کے ذریعہ پوچھ تاچھ کروائی۔

مرحوم سرپٹ حیدرآبادی کا نام اسد حسن انصاری تھا۔ وہ ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ علوم شرقیہ کی مختلف ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد انھوں نے حکمت کی تعلیم حاصل کی اور عرصۂ دراز تک مطب چلاتے رہے۔ ۱۹۱۹ء سے سنجیدہ شعر کہنے لگے اور اسد تخلص اختیار کیا۔ ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور (جو ان کے چچا تھے) کے مشورے پر مزاحیہ شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ اور آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد کی جانب سے "زندہ دلان حیدرآباد" کے زیر عنوان منعقدہ پہلے مزاحیہ مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا۔

سرپٹ حیدرآبادی صاحب روز اول سے ہی ادارۂ زندہ دلان حیدرآباد سے وابستہ رہے اور زندہ دلان کے تمام مشاعروں میں شرکت کرتے رہے۔ "شگوفہ" کے لیے بھی سرپٹ صاحب بڑی پابندی کے ساتھ اپنا کلام عنایت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا مزاحیہ کلام "دھرگھسیٹ" کے نام سے شائع ہوا۔

اس سال زندہ دلان حیدرآباد کی سالانہ تقاریب کے موقع پر [illegible] سوونیر شائع ہوا اس میں ان کا ایک قطعہ شامل ہے جس میں ۸۴ سال کی عمر کو پہنچنے کا ذکر ہے۔ اس قطعہ میں ایک مصرعہ اس طرح کا ہے:

ع ہونا کہاں تھا آج مجھے، اب کہاں ہوں میں

وہ قطعہ انھوں نے ۴ نومبر کو منعقدہ "ہند پاک مزاحیہ مشاعرہ" میں سنایا بھی تھا۔ سرپٹ صاحب نے کبھی بھی اپنے بڑھاپے کا رونا نہیں رویا۔ ۸۴ سال کی عمر ہونے کے باوجود ان میں بڑا دم خم تھا۔ مشاعروں میں جب بھی کلام سنانے جم کر سناتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی نوجوان جھوم جھوم کر اپنا کلام سنا رہا ہو۔ انھیں حاضرین کی بے پناہ داد ملتی۔ ان کے انتقال سے زندہ دلان حیدرآباد کے مشاعروں کا ایک کامیاب شاعر اور شگوفہ کا ایک اہم قلم کار و بہی خواہ ہم سے جدا ہوگیا۔ ہماری دعا ہے کہ خدا انھیں اپنی رحمت سے نوازے اور ان کی بیگم کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

قطعہ

(دہلی کی نیالی میں)

حالات حاضرہ ——— غالب ثانی (حیدرآباد)

طوفان الکشن کا ہے یا یہ فسول خانہ ہے
ہڈیاں ہڈیاں کا پانسہ پلٹ کو جو خانہ ہے
آندھر اگا مالی اب تلیٹ ہمیا میدان سوں
چنا ہیڈی پھیر گا مائے تلنگانہ ہے

R. No. 15822/68 SHUGOOFA Hyderabad-1 Postal Regd. No. H
Vol. 22 Copy 12 December '89 Phone :